

دھند



باقی سکنول

اپنے نندوتی (مرحوم) محمد وسیم جعفری کی اس آزاد نظم کے نام
جس میں مجھے ”دُھند“ کی شنا نظر آتی ہے۔ !

رات کچھ ایسے ہی عالم میں کٹی
جس کو بیچینی تو کہہ سکتے نہیں۔
چین سے تعبیر دے سکتے نہیں۔ !!
آنکھ لگنے پر سکونِ قلب تھا۔
آنکھ کھلنے پر مجسمِ اضطراب۔ !!
گویا ساری رات دو متضاد خواب۔
آنکھ کی پلکوں ہی پر کھیلا کئے۔ !!!

کیا عرض کروں.....؟

دانشوروں کا قول ہے کہ جہاں ”خاتون خانہ“ کا معاملہ درپیش ہو وہاں ”ایک خاموشی ہزار بلا ٹال سکتی ہے۔“ مگر محمد علی قریشی بھند ہیں کہ میں ”دھند“ کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور تحریر میں لاؤں۔ چنانچہ سب سے پہلے اس کا برملا اقرار کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ محترمہ بلیقیں کنول میری شریک حیات ہیں اور افسانوی ادب میں مجھ سے کہیں زیادہ بلند مقام رکھتی ہیں۔ مجھ سے زیادہ بہتر لکھتی بھی ہیں اور کبھی کبھی یہ بھی برملا کہتی ہیں کہ..... ”فلکن، پراسرار کہانیاں، طلسمی اور ہولناک قسط وار کہانیاں (جو میں انوار صدیقی کے نام سے لکھتا ہوں) افسانوی ادب کے مقابلے میں زیادہ آسان ہوتی ہیں۔ جہاں مصنف کو کچھ اور نہیں سوجھتا، چھو منتر کر کے کوئی مافوق الفطرت کردار پیدا کر لیتا ہے مثلاً ”انکا“، ”اقابا“، ”سونا گھاٹ کا پجاری“، غلام روحمیں“ وغیرہ وغیرہ..... اور پھر اسے ڈگ ڈگی بجا کر اپنے اشاروں پر نچاتا رہتا ہے۔ مزید آسانی کی خاطر کبھی کوئی پنڈت یا پجاری پکڑ لاتا ہے جو مصنف کے اشارے پر دشمنوں کا کریا کریم کرتا رہتا ہے۔ دو چار سال تک معصوم عوام کو..... ”پھر کیا ہوا.....؟ آئندہ قسط میں ملاحظہ فرمائیے“ کے گھسے پٹے جملوں سے بہلاتا رہتا ہے۔ اور جب عوام بوریت کا شکار ہونے لگتے ہیں تو خدا کے کسی برگزیدہ بندے کو درمیان میں لا کر اُس کے جلال سے کالی اور پلید قوتوں کا ستیاناس کر دیتا ہے۔ قارئین خوش ہو کر تالیاں بجاتے ہیں اور مصنف ان کی سادہ لوحی پر مسکرا کر پھر کوئی ”پاپا ڈگی“ قسم کی کہانی گھڑنے بیٹھ جاتا ہے.....

بات تو جب ہے کہ معاشرتی اور اخلاقی برائیوں کی سرجری کی جائے۔ اُن فرسودہ رسم و رواج کے خلاف قلم اٹھایا جائے جو عورتوں کے وجود میں ناسور بن کر ریس رہے ہیں۔ اور مرد حضرات ان پر نشتر زنی کرنے کی بجائے تن آسانی کی خاطر جان چراتے ہیں شاید اس لئے کہ وہ اپنے مقابلے میں مظلوم عورتوں کو سر اٹھاتے نہیں دیکھ سکتے حالانکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ مرد حضرات بھی سچائی کا ساتھ دیں معاشرے کی ان خود ساختہ رسم و رواج کے خلاف قلم سے تیغ برہنہ کا کام لیں جس کی قید و بند میں گھٹ گھٹ کر نہ جانے کتنی معصوم لڑکیاں سسک سسک کر دم توڑ دیتی ہیں، مشرقی تہذیب کا الم بلند رکھنے کی خاطر گیلی لکڑی کی مانند اندر ہی اندر

سلگتی رہتی ہیں اور ہنستے مسکراتے حالات کی صلیب پر چڑھ جاتی ہیں..... منہ میں زبان رکھنے کے باوجود وہ قربانیاں دینے پر مجبور ہوتی ہیں۔ اُن جائز حقوق سے بھی ”تن بہ تقدیر“ دست بردار ہو جاتی ہیں جو مذہب کی رو سے ان کو زبان کھولنے کی اجازت دیتے ہیں..... مردوج قانون بھی جس کی حمایت کرتا ہے۔ ان جھوٹی، کھوکھلی اور خود ساختہ رسموں کا قلع قمع کیا جائے جس نے عورت کو کھلونا بنا کر رکھ دیا ہے..... انسانیت کے نام پر ہمیں عورت کو اس کا جائز حق دینا بھی جہاد سے کم نہیں۔ لیکن ”مرد مصنف“ اس بے حد اہم موضوع پر قلم اٹھانے کی بجائے ”اٹکا“ کو سر پر بٹھائے اترانے میں زیادہ فخر محسوس کرتے ہیں۔ ”اقبالا“ کے جسمانی تشیب و فراز کو سمجھانے میں زمین اور آسمان کے قلابے ملا کر زیادہ لذت محسوس کرتے ہیں..... اور..... اور.....

اور کیا عرض کروں؟..... بھلا ہو محمد علی قریشی کا جن کی ضد نے ”عزت سادات“ کو بھی خطرے میں ڈال دیا ہے۔ اب صرف ایک راستہ باقی رہ گیا ہے کہ سچے دل سے اس حقیقت کا اعتراف کر لوں کہ میں نے ”دُھند“ کی ایک ایک سطر بہت غور سے اور بڑی دلچسپی سے پڑھی ہے اور بقلم خود آپ سے اس سچائی کا اقرار کر لوں کہ ”دُھند“ بے حد خوبصورت ناول ہے۔ اس کے سارے کردار زندگی سے قریب تر ہیں، اتنے سچے اور کھرے کہ میں مسودہ پڑھتے ہوئے بے اختیار کئی بار ان آنسوؤں پر قابو نہ پاسکا جو دل کی گہرائیوں سے اُٹھ کر پلکوں تک آ گئے۔ خاص طور پر ثناء اور احمر کے کرداروں نے بہت زیادہ متاثر کیا۔

میں بڑے خلوص اور بے حد دیانت داری سے آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ”دُھند“ ایک حسین شاہکار ہے جسے آپ مجھ سے زیادہ پسند کریں گے، شاید اس لئے کہ ہیرے کی قدر صرف جوہری ہی کر سکتا ہے۔ ویسے بھی اصل کسوٹی تو آپ ہی ہیں..... اور..... اب مجھے نہیں بلکہ آپ کو عرض کرنا ہے کہ ”دُھند“ آپ کی کسوٹی پر پورا اُترایا نہیں..... مجھے آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔

انوار صدیقی

قوی ہیکل طیارے نے زمین کی پستیوں سے نانا توڑ کر آسمان کی بلند یوں کی جانب اٹھنا شروع کیا تو ثنا کے سر سے جیسے ایک بوجھ اُتر گیا ہو۔ اُس نے سکون کا طویل سانس لیا، پھر خود ہی گہرا کر ساتھ کھڑی بہنوں کو دیکھنے لگی۔ اُسے خوف تھا کہ کہیں اُس کی اضطرابی کیفیت کا سراغ نادبہ اور صائمہ نے نہ پالیا ہو..... اور اگر کہیں فرحان کو ایک ذرا سی بھٹک بھی مل گئی تو وہ اُس کا جینا حرام کر دے گا۔ لیکن اس وقت سب ہی کی نظریں اُس طیارے پر مرکوز تھیں جس میں احمر دو ماہ قیام کے بعد اپنے والدین کے پاس نیروبی واپس جا رہا تھا۔ ثناء نے جلدی سے خود کو سنبھالا، پھر طیارے کی جانب متوجہ ہو گئی جو نیلگوں آسمان کے سینے پر بازو پھیلانے اپنی منزل کی سمت رواں دواں تھا۔ اُسے اپنی کیفیت پر غجب ہو رہا تھا۔ وہ بڑی بنجیدگی سے احمر کے بارے میں سوچنے لگی۔

احمر کوئی غیر بھی نہیں تھا، اُس کا تاپا زاد بھائی تھا۔ پہلے بھی وہ دو بار چھٹیوں میں اُس کے گھر تھوڑے تھوڑے وقفے کے لئے آچکا تھا۔ اُس کے والد نیروبی میں ہیرے جواہرات کی تجارت کرتے تھے۔ دولت کی فراوانی تھی اس لئے احمر کے لئے دنیا جہان کی تمام آسائشیں حاصل تھیں۔ یوں بھی وہ اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا اس لئے بے حد لڑاؤ تھا۔ لیکن روپے پیسے کی بہتات اور ماں باپ کے حد درجہ پیار کے باوجود وہ بے حد متنازع، نیک اور ذہین واقع ہوا تھا۔ انکساری اور دوسروں سے ہمدردی کا جذبہ تو جیسے اُس کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ یہی وجہ تھی جو وہ والدین کی آنکھوں کا تارا ہونے کے علاوہ ہر دلچیز بھی تھا۔

چھوٹے بڑے، اپنے پرانے اور نوکر چاکر سب ہی اُس پر جان چھڑکتے تھے۔ جو بھی ایک بار اُس سے دو گھڑی باتیں کر لیتا اُس کا گرویدہ ہو جاتا۔ نادبہ اور صائمہ تو اُس کے آتے ہی کتابیں الماریوں میں بند کر کے روزانہ نئے نئے ہنگامے گرم کرنے کے پروگرام بنایا کرتیں اور فرحان..... بقول صائمہ کے وہ تو احمر کا خاص چچہ تھا اور ہر وقت بس اُسی کے گن گایا کرتا تھا۔

وقار احمد بھی جیتھے کودل و جان سے چاہتے تھے اور شائلہ بیگم..... اگر اُن کے بس کی بات ہوتی تو شاید وہ ایک گھڑی کو بھی احمر کو نظروں سے دُور نہ ہونے دیتیں..... کہنے کو وہ اُن کے جٹھ کا لڑکا تھا لیکن وہ اُسے سکی ماں کی طرح ٹوٹ کر پیار کرتی تھیں، اُس کی ایک ایک بات کا خیال رکھتیں اور لڑکیوں کو بار بار تاکید کرتیں کہ احمر کے آرام اور سکون کا ہر طرح خیال رکھا جائے۔

وہ جب بھی پاکستان آتا سب کے لئے ڈھیروں تحفے لاتا اور چھوٹے چھوٹے پروگراموں میں دل کھول کر بے دریغ روپے خرچ کرتا..... اس بار بھی وہ حسب معمول سب کے لئے تحفے لایا تھا..... وقار احمد کے لئے اعلیٰ کپڑے کا سوٹ پیس، شائلہ بیگم کے لئے ادنیٰ شال کے علاوہ ہاتھی دانت کے زیورات کا سیٹ، نادبہ کے لئے قیمتی جوڑے اور موتیوں کا ہار..... صائمہ کے لئے اُس کے پسندیدہ مصنوعی پھولوں کے علاوہ رُوبی کا جڑاؤ سیٹ اور فرحان کے لئے شکار سے متعلق اُن گنت کتابوں کے علاوہ ڈھیر ساری ٹافیوں اور چاکلیٹ کے ڈبے..... گھر کے ملازموں کے لئے بھی وہ کوئی نہ کوئی قیمتی

تختہ ضرور لایا کرتا تھا۔ لیکن اس بار شاید شا کا خیال اُس کے ذہن سے نکل گیا تھا۔
سب کے تختے بانٹنے کے بعد اُس نے شا کی جانب شرمندہ نظروں سے دیکھا اور اپنا پچھلا ہونٹ
دانتوں تلے دبایا۔ اُسے خود بھی اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں
آنکھرنے والی شرمندگی کو دیکھ کر شا نے بھی یہی محسوس کیا تھا۔ اُسے محسوس کی لاج نہیں بھی پھر بھی اصرار
کا دل رکھنے کی خاطر ایک حسین سی مسکراہٹ چہرے پر بکھیر کر بولی۔
”کوئی بات نہیں۔۔۔۔۔ اگلی بار آئیے گا تو ایک کے بجائے دو تختے لے آئیے گا۔“
”میں۔۔۔۔۔ میں واقعی شرمندہ ہوں۔“ اصرار نے سجدی سے کہا۔ ”یقین جانے میں نے آپ کے
لئے۔۔۔۔۔“

”کیا خریدنا تھا باجی کے لئے۔۔۔۔۔؟“ صائمہ نے جلدی سے پوچھا۔
”موٹی موٹی کتابوں کا بڈل ہو گا۔“ فرحان نے معصومیت سے کہا۔ ”ہماری آپا کو سوائے
پڑھائی کے اور کوئی شوق بھی تو نہیں۔“
”تعلیم کا حصول تو بڑی اچھی بات ہے۔“ اصرار بولے۔

”وہ تو ہے، لیکن ہماری آپا کتابوں کے سلسلے میں کچھ زیادہ ہی جذباتی واقع ہوئی ہیں۔۔۔۔۔ ایسا
بھی کیا کہ کتابوں کو اوڑھنا بچھونا بنایا جائے۔۔۔۔۔ مجھے دیکھئے ہر سال اپنی جماعت میں کوئی نہ کوئی
پوزیشن ضرور لے آتا ہوں۔“ فرحان نے مسکراتے ہوئے نہایت صاف گوئی سے کہا۔ ”اس بار بھی
چوٹی پوزیشن حاصل کی ہے۔ اس کے باوجود کہ دن میں صرف ایک وقت پڑھتا ہوں۔“
”ایک وقت سے تمہاری کیا مراد ہے۔۔۔۔۔؟“

”یہی کہ میں پڑھائی کو ڈاکٹری نشوں میں درج شدہ ہدایت کے مطابق صبح، دوپہر، شام
استعمال کرنے کا عادی نہیں۔“ فرحان نے شا کی جانب کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”زیادہ پڑھائی
صحت کے لئے بھی۔۔۔۔۔“

”بری بات ہے فرحان میاں!“ اصرار نے اُسے ٹوکا۔ بزرگوں کے لئے مذاق میں بھی ایسی باتیں
نہیں کرتے، اور تمہاری بڑی آپا کی صحت تو خدا نظر بد سے بچائے بہت مناسب اور ٹھیک ٹھاک ہے۔“
”ایک بات پوچھوں اصرار بھائی۔۔۔۔۔؟“

”پوچھو۔۔۔۔۔“
”نہایت شاندار ہونے اور ٹھیک ٹھاک ہونے میں کیا فرق ہے؟“
فرحان نے اتنی شوخی اور معصومیت سے دریافت کیا کہ اصرار بھی اپنی جگہ خفیف سے ہو گئے، شاید پیار
بھری نظروں سے فرحان کو دیکھنے لگی۔

”سچ بتائیے اصرار بھائی! آپ باجی کے لئے کیا لائے ہیں؟“ صائمہ نے بڑے یقین سے کہا۔
”میں نہیں مان سکتی کہ آپ جیسے ذہن آدمی سے اتنی بڑی غلطی ہو جائے۔“

”میں پہلی بار سن رہا ہوں کہ غلطیوں کے بھی مختلف سائز اور نمبر ہوتے ہیں۔“
”تم کچھ دیر کے لئے خاموش نہیں رہ سکتے۔؟“ صائمہ نے پلٹ کر فرحان کو گھورا، پھر اصرار سے
بولی۔ ”بتائیے نا۔۔۔۔۔ آپ نے کیا خریدا تھا باجی کے لئے۔۔۔۔۔ پچھلی بار تو آپ واقعی بہت ساری انسائیکلو
پیڈیا (ENCYCLOPAEDIA) ٹاپ کی موٹی موٹی کتابیں اٹھالائے تھے۔۔۔۔۔“

”ہو سکتا ہے اس بار اُن کتابوں کو قرینے سے سجانے کے لئے کوئی خوبصورت سا بک شیلٹ

(BOOK-SHELF) خریدا ہو۔“ نادہ نے زیر لب مسکراتے ہوئے اظہار خیال کیا۔
”کچھ خریدا تو ضرور تھا لیکن۔۔۔۔۔ اصرار کچھ کہتے کہتے رک گئے، ایک نظر شا پر ڈالی پھر مسکرا کر
دیکھ کر دیکھنے لگے۔“

”آپ ہم سے چھپا رہے ہیں۔“ صائمہ بولی۔ ”ضرور کوئی نایاب اور قیمتی تختہ ہو گا جو آپ نے
جی کے لئے پسند کیا ہے۔“
”اس وقت یاد نہیں آ رہا۔۔۔۔۔ کچھ دیر آرام کر لوں، سفر کی مکان اتر جائے تو ممکن ہے عقل کام
کرنے لگے۔“ اصرار نے ٹالنے کی کوشش کی۔

”سنا ہے ادھار محبت کی پیچی ہوتی ہے۔ لیکن اگر آپ چاہیں تو تھوڑی بہت عقل میں آپ کو۔۔۔۔۔“
”فرحان۔۔۔۔۔“ اس بار نادہ نے اُسے تنبیہ کی۔ ”چھوٹے بڑے کا خیال رکھا کرو۔۔۔۔۔ جو منہ میں
اُٹا ہے بک جاتے ہیں۔“

فرحان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو وہ جھل ہونے لگا۔ لیکن اُسی وقت وقار احمد اور شامکہ بیگم
کمرے میں داخل ہوئے اس لئے فرحان کی شرمساری کا مسئلہ اور شاء والے تختے کی بات دونوں رفع
نہ ہو گئے۔۔۔۔۔!

نادہ، صائمہ اور فرحان کی طرح وہ بھی اصرار کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا پسند کرتی تھی۔ اصرار کی شخصیت
اُس کے لئے بھی وہی حیثیت رکھتی تھی جو دوسروں کے لئے تھی۔ لیکن اُس روز اُسے اندر ہی اندر نہ
جانے کیوں ایک عجیب سی محسوس اور بے چینی کا احساس ہوا، شاید اس لئے کہ اصرار اُس کے لئے تختہ لانا
بھول گئے تھے یا پھر اس لئے کہ اُسے جان بوجھ کر نظر انداز کیا گیا تھا۔ دوسروں کی موجودگی میں اُس
نے اصرار سے کوئی شکوہ یا گلہ نہیں کیا۔۔۔۔۔ یوں بھی اُسے اصرار سے شکایت کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ لیکن
اُس رات جب وہ سونے کے لئے اپنے کمرے میں گئی تو پہلی بار اُسے اپنے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں
ایک انجانی سی ٹھک کا احساس ہوا جیسے اُس کے وجود میں اچانک کوئی خلاء سا پیدا ہو گیا ہو۔ جیسے اُس
کی ذات کا کوئی پہلو مکمل ہونے سے رہ گیا ہو۔۔۔۔۔

وہ اس کک کو کوئی خوبصورت نام دینے سے قاصر تھی۔ بس اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے اُس کی
شخصیت آم کے اُس درخت سے مطابقت رکھتی ہو جس میں پہلی بار بور آتے آتے رہ گئی ہو۔ جیسے
بور نہ آنے سے اس کی ہریالی ماند پڑ گئی ہو۔ وہ بڑی دیر تک اصرار کی ایک چھوٹی سی بھول کو بڑے بڑے
نام دیتی رہی، مختلف زاویوں سے پرکھتی رہی، پھر یکوقت اُسے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔

وہ اتنی سنجیدگی سے اصرار کے بارے میں کیوں سوچ رہی ہے؟ اگر وہ تختہ لانا بھول گئے تو کون
سی ایسی آفت ٹوٹ پڑی جو وہ اپنی جان بھان کر رہی تھی۔ بلاوجہ ایک معمولی بات کا جنگل بنائے
ڈال رہی تھی۔ بغیر تختے کے وہ مرنے نہ جاتی۔ اور پھر یہ اصرار کی اپنی مرضی کی بات تھی۔ وہ جس کے
لئے چاہتے قیمتی تختہ لاتے جس کے لئے چاہتے نہ لاتے۔

شا کو صائمہ پر غصہ آنے لگا۔ تختے کی کرید سب سے زیادہ اُسی کو تھی۔ بار بار یہی کہے جا رہی
تھی کہ اصرار بھائی کوئی نہ کوئی تختہ ضرور لائے ہوں گے۔ اور اصرار بھی جیسے چھیڑنے پر تلے ہوئے
تھے۔ کتنی معصومیت سے کہہ رہے تھے کہ انہیں یاد نہیں کہ کیا تختہ لیا ہے۔ اتنے معصوم اور سیدھے
سادھے بھی نہیں تھے کہ انہیں سفر کی مکان کی وجہ سے کچھ یاد نہ آ رہا ہو۔ پچھلے سال ہی بی، ایس، سی
(آنرز) کا امتحان اعلیٰ نمبروں سے پاس کیا تھا۔ آدھی سے زیادہ دنیا کی سیر کر چکے تھے، بلا کے، چین

تھے، ایک بار جو بات اُن کے کان میں پڑ جاتی برسوں اُسے یاد رکھتے..... پھر..... تحفہ کیسے بھول گئے..... جان بوجھ کر انجان بننے کی کوشش کر رہے تھے۔

”ہونہہ..... جیسے میں اُن کے تحفے کی بھوک ہی تو ہوں۔“ اُس نے اپنے آپ سے کہا۔ ”اگلی بار تحفہ لائے بھی تو میں لینے سے انکار کر دوں گی..... یا لے کر سنسور روم میں کہیں ڈال دوں گی..... پڑا سر تار رہے گا۔“

اُس نے کروٹ بدل کر احمر کے خیال کو ذہن سے نکالنے کی کوشش کی لیکن اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہو سکی۔

”مشکل ہے شا..... تم احمر کو اتنی آسانی سے فراموش نہیں کر سکو گی۔“ اُس کے کانوں میں جیسے احمر کی سرگوشی اُٹھی۔

”کیوں..... کیوں فراموش نہیں کر سکتی؟“ اُس نے تنک کر کہا۔

”اس لئے کہ وہ جو اپنے ہوتے ہیں انہیں یاد رکھا جاتا ہے..... بھلا پانہیں جاتا۔“

”لیکن.....“ وہ تھلا اُٹھی۔

”اپنے معصوم اور نازک ذہن پر بوجھ مت ڈالو..... یہ باتیں ابھی تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔“ احمر نے نہایت سادگی سے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟“ اُس نے احمر کو سنجیدگی سے گھورا لیکن احمر نے کوئی جواب نہیں دیا۔

ایک بیماری سی مسکان اُن کے ہونٹوں کے کداز پر چھلکتی رہی۔

اُن کی آنکھوں میں شرارت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

خاموش خاموش بیٹھے اُسے نشی نظروں سے دیکھتے رہے۔

یوں.....

جیسے وہ اُن کی ملکیت ہو.....!!

”آپ نے میرے سوالوں کا جواب نہیں دیا۔“ ثنائے ہونٹ کاٹتے ہوئے آہستہ سے کہا.....

جاہنے اُسے کیا ہونے لگا تھا، جیسے احمر کی آنکھوں کی پیش سے وہ برف کے نرم گالوں کی طرح پگھلی جا رہی تھی۔ چھوٹی موٹی کے معصوم درخت کی مانند خود اپنے وجود میں سمٹی جا رہی تھی۔

احمر نے اس بار بھی خاموشی اختیار کر لی.....

بدستور اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مسکراتے رہے

یوں.....

جیسے دنیا میں اُس کے سوا کوئی اور دیکھنے کی چیز ہی نہیں تھی.....!!

”اس طرح کیا گھور رہے ہیں.....؟“ ثنائے کپکپاتی آواز میں شکایت کی۔

”بتا دوں.....؟“ احمر نے دبی آواز میں کہا۔ ”برا تو نہیں مانو گی.....؟“

”کیا مطلب.....؟“

”مم..... میں خواب دیکھ رہا ہوں۔“

”کیا میں خواب ہوں.....؟“

”ہاں..... تم ہی میرا خواب ہو، اور خواب کی جیتی جاگتی تعبیر بھی.....“

”جی.....؟“ ثنائے کھلا سی گئی۔ ”یہ..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

”جو بھی کہہ رہا ہوں سچ کہہ رہا ہوں۔“ احمر کی آواز میں جھرنوں کی نغسگی شامل ہو گئی۔

”خدا جانے آپ کیا.....“

”ابھی نہیں ثنا.....“ احمر نے سرگوشی کی۔ ”وقت کا انتظار کرو..... آہستہ آہستہ میری باتیں تمہاری

سمجھ میں آنے لگیں گی۔“

”آپ..... آپ..... یہ سب مجھ سے کیوں کہہ رہے ہیں..... آپ کی باتوں کا مقصد.....“

”کیا ارادہ ہے بڑی آپا..... یہیں کھڑی رہو گی؟“

فرحان کی آواز اُس کے کانوں میں گونجی تو وہ ہڑبڑا کر یوں چونکی جیسے رنگے ہاتھوں کوئی سنگین جرم کرتے پکڑ لی گئی ہو۔ اُس نے پلٹ کر ایک نظر طیارے پر ڈالی جو ہر لمحہ دور ہوتا جا رہا تھا۔ نادیہ اور

صائمہ احمر کے چلے جانے سے طولی تھیں، اس لئے وہ دونوں اُس کی تحویت کو نہ بھانپ سکیں۔

”امی اور ابو کہاں ہیں؟“ اُس نے فرحان کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے مجمع میں ادھر ادھر

دیکھنا شروع کر دیا۔

”گاڑی کی طرف گئے ہیں..... ابو کے کوئی واقف کار مل گئے تھے۔“

”تو پھر چلو نا.....“ اُس نے نادیہ اور صائمہ کو متوجہ کرنے کی خاطر قدرے اونچی آواز میں کہا۔

”یہاں کھڑے کھڑے کیا کر رہے ہو؟“..... پھر اس سے پہلے کہ فرحان اپنی عادت کے مطابق کوئی

دوسرا سوال کرتا ثنا نے قدم آگے بڑھا دیئے..... نادیہ اور صائمہ کو بھی مجبوراً اُس کا ساتھ دینا پڑا.....

دونوں چپ چپ سی تھیں، شاید احمر کے چلے جانے کا بہت اثر لیا تھا..... مگر کیوں.....؟

واپسی کے وقت بھی وہ گاڑی میں تمام راستے گم صمم بیٹھی احمر کے بارے میں سوچتی رہی، کئی بار

اُس نے سوچا کہ احمر کے تصور کو ذہن سے جھٹک کر نکال دے لیکن ہر بار احمر کا تصور ایک نئے زاویے

اور انوکھے انداز سے اُس کے سامنے آ جاتا۔

کبھی مسکراتا ہوا..... بھولا بھولا ساجین چہرہ.....

جس کی مسکراہٹوں میں اُمیدوں اور تمناؤں کے ہزاروں دیپ جگمگاتے نظر آتے.....

جیسے کسی جھکے ہوئے مسافر کو اجاگ ابھی گمشدہ منزل کا سراغ مل گیا ہو.....!!

کبھی اُن کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری نظر آتی.....

کھوئے کھوئے سے دکھائی دینے لگتے۔

جیسے زندگی کی کسی اہم تھی کو سلجھانے میں حد درجہ منہمک ہوں.....!!

اور.....

کبھی یوں لگتا جیسے وہ دور کھڑے اُسے چوری چوری کنکھوں سے دیکھ رہے ہوں، پوچھ رہے

ہوں..... ”ثنا..... تم مجھے بھول تو نہ جاؤ گی..... ایسا مت کرنا ثنا..... ورنہ تمہارا احمر زندگی کے بڑے بڑے

راستوں میں کہیں گم ہو کر رہ جائے گا..... اپنے احمر کے حسین خوابوں کو مسکراتی تعبیر سے نوازنا.....

پھولوں کی مہک اور شوخ اداؤں کے بجائے کوئی زخم نہ دینا جو زندگی کے لئے ایسا ناسور بن جائے جو

اندری اندر اپنی جڑیں پھیلاتا رہے اور پھر..... پھر حسین خوابوں کی مسکراتی تعبیریں بھی سسکتی ہلکتی ہوئی

زندگی کی حسین وادیوں سے اپنا رشتہ نانا توڑ کر موت کے دیران اور سنسان اندھیروں میں کہیں گم ہو

جائیں، دُحوں بن کر فضا کی وسعتوں میں بکھر جائیں..... یوں کہ اُن کا کوئی سراغ نہ ملے..... اور.....

احمر کے تصوراتی ہولے سے یہ کرناک جیلے سن کر وہ کسمسا کر رہ جاتی..... دل ہی دل میں

سوچتی..... احراہی باتیں کیوں کر رہے ہیں..... پہلے تو وہ کبھی اتنے سنجیدہ اور اُداس اُداس سے نظر نہیں آتے تھے..... ہر وقت خود بھی ہنستے ہنساتے رہتے اور دوسروں کو بھی اپنی باتوں سے ہنسنے پر مجبور کر دیتے..... پھر..... یہ خواب..... خواب کی حسین تعبیر..... پھولوں کی مہک..... شوخ اداؤں..... مسکاتی بلکتی زندگی..... اور موت کے ویران اور سنان اندھیروں سے اُن کی کیا مراد تھی..... وہ اُس سے آخر کیا چاہتے تھے..... ایک تو خود ہی اُس کے لئے تحفہ نہ لا کر سب کی نگاہوں میں اُس کی اہمیت کم کر دی اور اُلٹا اُسی کو تصور وار چھی گردان رہے تھے..... زبردستی یاد رکھنے کا وعدہ لے رہے تھے.....

”نہیں رکھوں گی یاد.....“ اُس نے ہونٹ کاٹتے ہوئے احمر کے تصور سے کہا۔ ”واہ..... کوئی زبردستی ہے؟ یہ تو وہی مثل ہوئی کہ جان نہ پہچان..... میں تیرا مہمان.....“

”دل پر ہاتھ رکھ کر کہو نا..... کیا تم احمر کو بھول سکتی ہو.....؟“

اور دل کے حوالے پر وہ خود اپنی نگاہوں میں چوری بن گئی..... جانے کیا ہو گیا تھا اُس کے دل کو۔ جب سے احمر کا طیارہ اُس کی نگاہوں سے اوجھل ہوا تھا رہ کر دھڑکے چلا جا رہا تھا۔ بار بار اُسی کا نام ذہن کے درجوں میں گونجنے لگتا..... اُسی کا تصور آنکھوں کے سامنے آ جاتا..... وہی خوبصورت اور حسین چہرہ..... وہی پیشانی پر جھومتی ہوئی ایک آوارہ سی لٹ..... مست مست آنکھوں کی وہی معصوم اور شوخ مسکراہٹیں جو دلوں کو گدگداتی نظر آتی تھیں۔

احمر بلاشبہ بے حد حسین تھے.....

ہر اعتبار سے خوبصورت کہلانے کے مستحق تھے.....

مردانہ وقار اور وجاہت کا جیتا جاگتا نمونہ تھے.....

اعلیٰ کردار اور اعلیٰ خاندان کے چشم و چراغ تھے جس کی روشنی دلوں کو گرماتی تھی.....

بے حد تعلیم یافتہ اور ذہین بھی تھے..... لیکن یہ کیا زبردستی تھی کہ انہیں یاد رکھا جائے.....

آخر کیوں.....؟

کس لئے.....؟؟

صرف اسی کے لئے یہ اصرار کیوں تھا.....؟؟؟

نادیدہ..... صائمہ..... اور فرحان بھی تھے۔

اور..... اور..... پھر اچانک ثنا کے ذہن میں جیسے نقرئی گھنٹیاں بج اُٹھی ہوں۔ اُس نے ڈرتے ڈرتے خود سے سوال کیا۔ ”ثنا..... کہیں احمر تجھے چاہنے تو نہیں لگے.....؟“ اور اس اچانک خیال کے ذہن میں اُبھرتے ہی جیسے وہ کٹ کر رہ گئی..... اپنے وجود میں سمٹنے لگی..... جلدی سے دراز پکڑ کر نگاہوں پر چلن کر لیا، پھر خود ہی اُلجھنے لگی..... اپنے آپ کو برا بھلا کہنے لگی..... ایسا کیسے ممکن ہے..... اگر ایسا ہوتا تو بھلا احمر اُس کے لئے تحفہ لانا بھول جاتے؟..... بات اگر محبت کی ہوتی تو وہ اُس کے لئے سب سے انوکھا..... سب سے قیمتی تحفہ لاتے..... اور..... اکیلے میں خاموشی سے پیش کرتے..... وہ شرمانے اور ہچکچانے کا مظاہرہ کرتی..... کتر اگر گزر جانے کے لئے قدم آگے بڑھاتی تو وہ جلدی سے لپک کر اُس کے راستے میں آ جاتے..... کچھ گھبرا کر، کچھ ہچکچا کر دبی زبان میں کہتے..... ”یہ مذاق نہیں حقیقت ہے..... مم..... میں..... تم سے.....“

”خدا کے لئے خاموش ہو جائیے..... کوئی سن لے گا تو کیا کہے گا.....؟“ وہ سہم کر اپنی بدنامی کا احساس دلانے کی کوشش کرتی۔

”محبت ایک پاک اور نہایت پاکیزہ رشتے کا نام ہے ثنا! یہ کوئی جرم تو نہیں جس کے اظہار سے.....“

”پلیز..... چلے جائیے..... کوئی آگیا..... کسی نے یہاں اکیلے نہیں دیکھ لیا تو کیا سوچے گا؟“

”وہی..... جو اس وقت ہم دونوں سوچ رہے ہیں۔“

”اُف اللہ..... اب کون سمجھائے آپ کو.....“ وہ گھبرا کر کہتی پھر جلدی جلدی قدم اٹھاتی اپنے کمرے میں جا کر اپنے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کو سمیٹنے کی کوشش کرنے لگتی.....

لیکن..... اُس کے ساتھ تو ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا.....

پھر.....

محبت کا خیال اُس کے دل میں کیسے آگیا.....؟

”کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ انجانے میں خود ہی احمر کو دل دے بیٹھی ہو.....؟“ اور اس خیال کے آتے ہی وہ دھک سے رہ گئی۔ اندر ہی اندر کسی نادیدہ طوفان کی خوفناک تباہیوں کو محسوس کر کے لرز اُٹھی..... یقیناً اُس کے ذہن میں جو حسین اور خوبصورت خیالات اُبھرے تھے وہ اُس کا وہم تھے..... وہ اپنے ہی خیالات کے تانوں بانوں میں اُلجھ کر پسا ہو گئی تھی، شاید اس لئے کہ اب کی بار احمر نے ہر لمحہ ہر لمحہ اُس کے قریب رہنے کی کوشش کی تھی..... اُسے متعدد بار اس بات کا احساس دلانے کی کوشش بھی کی تھی کہ وہ اُس کے لئے تحفہ نہ لانے کے سلسلے میں بے حد شرمندہ ہیں..... لیکن شرمندگی کا اظہار کرتے وقت اُن کے گداز ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ اُبھر کر گہری ہوئی چلی جاتی۔

”کیا شرمندگی اور کسی غلطی کا اظہار یوں شوخ شوخ انداز میں مسکرا کر کیا جاتا ہے.....؟“

نہیں..... یہ سب میرا اپنا وہم تھا..... سراب تھا جسے میں حقیقت سمجھ بیٹھی تھی.....“ ثنا کے معصوم ذہن کو ایک دھچکا سا لگا..... اُس نے سوچا..... احمر کی مسکراہٹ محض ایک فریب تھی..... دھوکا تھی..... اگر کوئی غیر ہوتا تو شاید اتنی آسانی سے وہ اُس کی مسکراہٹوں کے جال میں بھی نہ پھنس جاتی..... پہلے ہی قدم پر کتر اگر اپنی راہ بدل دیتی..... لیکن احمر.....

گاڑی شاندار کوٹھی کے پورچ میں پہنچ کر ایک جھٹکے سے رُکی تو ثنا کے خیالوں کا شیرازہ بکھر گیا..... اُس نے جلدی سے باری باری سب کی جانب دیکھا..... احمر کے چلے جانے سے سب ہی چیپ تھے۔ وہ بھی چپکے سے دروازہ کھول کر نیچے اُترتی اور اپنے دل کی دھڑکنوں کو سمیٹتی..... لمبے لمبے قدم اٹھاتی کوٹھی کا زینہ طے کرنے لگی.....!!

○○○

آج شبانہ بیگم کی مسرتوں کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا..... ایک طویل مدت کے بعد انہیں روحانی خوشیوں کا احساس ہو رہا تھا..... کچھ دیر پیشتر تک وہ حسب معمول نمیشینی انداز میں گھر کے کام کاج میں مصروف تھیں۔ اس لئے نہیں کہ گھر میں کام کاج کرنے والا کوئی اور نہیں تھا بلکہ اس لئے کہ وقت کی طویل مسافت کو طے کرنے کی خاطر وہ اپنے شب و روز کے ایک ایک لمحے ایک ایک پل کو مصروفیت کی آڑ میں چھپا کر خاموشی سے گزار دینا چاہتی تھیں۔

وقت.....

جس نے شبانہ بیگم کے دل کو بڑے یقین چر کے لگائے تھے..... ایسے زخم بخشنے تھے جو مندل ہو جانے کے باوجود اندر ہی اندر ناسور کی طرح اپنی جڑیں پھیلا رہے تھے..... اسی وقت کی گردش نے انہیں ایسے درد عنایت کئے تھے جس کا کوئی درماں نہیں تھا..... کوئی علاج نہیں تھا.....

زندگی کے تمام اٹاٹے اسی وقت کے بے رحم ہاتھوں تاراج ہو کر رہ گئے تھے۔ ایک ایک کر کے سب کچھ چھن گیا۔ اور۔۔۔۔۔ وہ خاموش تماشائی بنی سب کچھ دیکھتی رہیں۔

وقت نے اُن کے لبوں پر مہر لگا دی تھی۔ پھر وہ لب کشائی کیسے کرتیں؟؟

اور یوں زندگی کے سترہ سال بیت گئے۔ مگر شانہ بیگم کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ابھی کل کی بات ہو۔۔۔۔۔ وقت کی گردش جو تھم تھم کر اپنے محور کے گرد گھوم رہی تھی یکنخت تیز ہو گئی۔ ایک چھوٹی سی اطلاع نے جیسے وقت کے دھاروں کا رخ اچانک تبدیل کر دیا ہو۔ بھولی بری باتیں جن پر وقت کی دھول جم چکی تھی ایک بار پھر ذہن میں گردش لینے لگیں، ماضی اور حال کے درمیانی قاصلے پھر گھٹنے لگے۔

سترہ سال پہلے کی بات تھی جب پروفیسر جمال احمد سے اُس کے رشتے کی بات شروع ہوئی تھی، اُس وقت بھی حالات کی ستم ظریفیوں نے اُس کی اپنی رائے، اپنی پسند کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ قسمت نے اُس پر جو مہر پائیاں کی تھیں اور تقدیر نے اُسے زندگی کے جس دوراے پر لا کھڑا کیا تھا وہاں اُسے اپنے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں تھا۔۔۔۔۔

وہ مجبور تھی۔ بے بس تھی۔ اس لئے وقت کے ہاتھوں اُس کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا۔۔۔۔۔ اُس نے جمال احمد کو دیکھا تو درکنار اُن کی تصویر کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھی لیکن قدرت نے اُسے اُن کا شریک حیات بننے پر مجبور کر دیا۔ اُس نے کچھ کہنا چاہا لیکن وقت کے تقاضوں کے آگے سر تسلیم خم کرنے پر مجبور کر دیا۔۔۔۔۔ حالات نے اُسے مہر بلب ہونے کا مشورہ دیا تو وہ اُف بھی نہ کر سکی، اندر ہی اندر گھٹ کر رہ گئی۔

کیسی عجیب تھی یہ شادی۔۔۔۔۔ نہ باراتوں کا شور وغل ہوا، نہ شادیانے بیچے، نہ سہیلیوں نے رخصتی کے گیت گائے، نہ کوئی خوشیوں کے ہنگامے گرم ہوئے۔۔۔۔۔ بس فون پر خاموشی اور انتہائی سادگی سے نکاح کی رسم ادا کی گئی پھر اُسے جہاز پر بٹھا کر رخصت کر دیا گیا۔ وہ اپنا وطن، اپنے عزیز ورشتہ دار، اپنی ہم جولیوں اور اپنا سب کچھ چھوڑ کر اپنے مجازی خدا کے پاس لندن جانے پر مجبور ہو گئی۔

وہ ایک عورت تھی۔۔۔۔۔

ایک مشرقی عورت۔۔۔۔۔ اس لئے اُس نے ماں باپ اور قدرت کے فیصلوں کو بلا کسی چون و چرا کے منظور کر لیا۔

اپنوں سے رخصت ہوتے وقت اُس کا دل چاہا کہ پھوٹ پھوٹ کر روئے، تڑپ تڑپ کر بین کرے اور چیخ چیخ کر دنیا والوں کو بتا دے کہ اُسے اپنی رُوپی ہوئی خوشیوں پر از سر نو مسرتوں کا تاج محل کھڑا کرنے کا کوئی شوق نہیں۔ وقت اور تقدیر نے اُسے جو رخم بننے تھے وہ انہی رُخوں کو سینے سے لگائے زندگی گزار دینے کی خواہش مند تھی لیکن اُس نے اپنی زوج کو پکار کر اپنے سینے کی گہرائیوں میں دفن کر لیا۔

سستی رہی۔۔۔۔۔ بلکتی رہی۔۔۔۔۔ راکھ کے ڈھیر تلے دبی دبی چنگاریوں کی طرح سلتی رہی، نہ اُف کیا نہ احتجاج کیا۔۔۔۔۔ حالات کے فیصلوں کے آگے سرنگوں ہو گئی۔ وقت اُسے گبولوں کی مانند اُڑا کر دُور۔۔۔۔۔ بہت دُور لے گیا، دن مہینے سالوں میں بدلے گئے، اُس نے وقت کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا۔ لیکن ماں کی ایک بات ہمیشہ اُس کے کانوں میں گونجتی رہی۔

”شانہ۔۔۔۔۔ میری بچی! زندگی ان ہی نشیب و فراز کا نام ہے۔۔۔۔۔ اپنے لئے تو سب ہی جی لیتے ہیں لیکن دوسروں کی خوشیوں کے لئے جینا بڑی بات ہے۔ اور پھر کسی کے مستقبل کا تحفظ کرنا تو عین

عبادت ہے۔۔۔۔۔“

اُس نے اپنی ماں کی نصیحت کو خاموشی سے سنا اور دل موس کر رہ گئی۔۔۔۔۔ ماں نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ اپنی پہاڑ جیسی زندگی کیسے گزارے گی۔۔۔۔۔ کب تک ماں کی دلہیز پر بیٹھی جوانی کی ناتمام اُمنگوں کا گلا گھونٹی رہے گی اور دنیا والوں کو اپنی بے گناہی کا یقین دلانی رہے گی۔۔۔۔۔؟

بات اگر ماں کی حد تک محدود رہتی تو وہ اُنہیں رو دھو کر انتہیں ساجتیں کر کے سمجھا لیتی۔ لیکن جب بوڑھے باپ نے بھی پروفیسر جمال احمد کے ساتھ اُس کی دوسری شادی پر اپنی رضا مندی کے فیصلے کی مہر ثبت کر دی تو وہ خاموش ہو گئی۔ وہ ماں باپ کے سامنے سر اٹھانے سے قاصر تھی۔ اُس نے جس تہذیب اور جس ماحول میں آنکھ کھولی اور پرورش پائی تھی وہاں بزرگوں کے آگے زبان کھولنا بے ادبی شمار کیا جاتا تھا۔ البتہ والدین کے فیصلوں سے اُسے اپنی بے بسی اور بے چارگی کا احساس ضرور ہوا۔۔۔۔۔ اُسے وہ بچے دن یاد آگئے جب اُس کی پہلی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔

اُس کے آکلن میں ڈھولک کی تھاپ پر خوشیوں کے گیت گونجتے تھے۔۔۔۔۔ اربانوں اور اُمنگوں کا جوم ٹھانٹھیں مار رہا تھا۔ ہر سمت بہار ہی بہار تھی۔۔۔۔۔ آنے والے لمحوں کے لطیف احساس نے اُس کو چھوٹی موٹی بنا دیا تھا۔۔۔۔۔ کسی سہیلی نے اُس کے کانوں میں ذرا کوئی سرگوشی کی اور وہ شرم کر اپنے وجود میں سمٹ جاتی۔۔۔۔۔ کتنے حسین تھے وہ دن۔۔۔۔۔ کیسی کیف آگئیں تھیں وہ ساعتیں۔۔۔۔۔ کس قدر مسرور کن تھے وہ ایک ایک لمحے۔۔۔۔۔ جب وہ ہر وقت خوابوں کی دنیا میں مدھوش رہتی۔

لیکن۔۔۔۔۔

وہ خواب۔۔۔۔۔ صرف خواب ہی ثابت ہوئے۔!!

بے حد مختصر۔۔۔۔۔

ان خوابوں کی تعبیر بڑی بھیا تک ثابت ہوئی۔۔۔۔۔ ایسی ہولناک کہ وہ کسی معصوم پرندے کی مانند سہم کر رہ گئی۔

اُس نے تو کبھی بھولی کر بھی نہیں سوچا تھا کہ جن لمحوں کے انتظار میں اُس نے اپنے ذہن میں خوبصورت اور حسین محلات تعمیر کر رکھے تھے وہ یوں ایک جھٹکے میں مسمار ہو جائیں گے اور ان سنگ ریزوں کی کرچیاں اُس کے معصوم وجود میں چبھ کر زندگی کے ہر نئے موڑ پر اُسے اذیتیں پہنچائی رہیں گی۔ یہ باتیں تو بھی اُس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آتی تھیں کہ وقت کی آندھی اُس کی مسرتوں کو اپنی جلدی مٹیامیٹ کرے گی۔۔۔۔۔

شادی تو ایک مقدس رشتے کا نام ہے۔۔۔۔۔ دو زندگیوں کا ملاپ۔۔۔۔۔ جو ایک نئے سفر کا حسین آغاز ہوتا ہے۔۔۔۔۔ ایک نئے کنبے کو جنم دیتا ہے۔۔۔۔۔ اسے سودے بازی کا نام تو نہیں دیا جاسکتا۔!! تجارت تو نہیں کہا جاسکتا۔!! جو اتوار جیت کے لئے کھیلا جاتا ہے۔!!

لیکن شانہ بیگم کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ اُس کا نصیب تھا۔!!!!

اُس کی قسمت تھی۔۔۔۔۔ اُس کا مقدر تھا۔۔۔۔۔ لیکن؟

وہ کیسے قصور وار ہو گئی؟

اُس نے خود اپنے ہاتھوں تو اپنی قسمت رقم نہیں کی تھی، اپنے مقدر کا فیصلہ نہیں کیا تھا۔؟ پھر وہ کس طرح مورد الزام ٹھہرائی جاسکتی تھی۔؟ کیا صرف اس لئے کہ وہ عورت تھی جسے ایک لالچی اور خود غرض مرد نے اپنے نفع نقصان کے پیش نظر تجارتی انداز میں معصوم بن کر اپنایا تھا۔

پنی انتھک محنت اور لگن کے بعد بی کام کا امتحان اعزازی نمبروں سے پاس کر لیا تھا۔
دس روز پیشتر منصور کی کامیابی کا جشن نہایت جوش و خروش سے منایا گیا تھا اور آج اچانک
پروفیسر جمال احمد نے فون پر شبانہ بیگم کو ایک نئی اطلاع دی تھی..... لندن سے اپنے وطن واپسی کی
اطلاع..... اور اس اطلاع نے شبانہ بیگم کے ذہن میں سلگتے ہوئے جذبول کو ہوا دی..... ماضی کی
اتوں اور سترہ بال بعد اپنوں سے ملنے کے خیال نے اُس کے دل میں ایک عجیب سی ہلچل پیدا کر
ی.....!!

دروازے پر قدموں کی آہٹ ابھری تو اُس کے خیالات کا شیرازہ ٹوٹ کر بکھر گیا، نظریں گھا کر
یکھا تو منصور کھڑا مسکرا رہا تھا۔ شبانہ بیگم نے بیٹے کو مسکراتے دیکھا تو جلدی سے خود بھی زیر لب
سکراتے ہوئے بولیں۔

”کیا بات ہے..... تم اتنی جلدی کیسے لوٹ آئے؟ تمہیں تو اپنے دوستوں کے ساتھ کہیں پارٹی
میں جانا تھا۔“

”جانا تو تھا..... لیکن میں نے پروگرام کینسل کر دیا۔“
”کوئی خاص بات.....؟“

”ہاں.....“ منصور نے ماں کے قریب آ کر بڑے پیار سے کہا۔ ”ابھی کچھ دیر پہلے ڈیڈی کے
س گیا تھا، بس! وہیں سے پروگرام تبدیل ہو گیا۔“

”میں بھی سنوں..... کیا بات ہوئی باپ بیٹے میں؟“

”کیا ڈیڈی نے آپ سے کچھ نہیں کہا؟“ منصور نے ماں کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے
ریافت کیا۔

”ابھی تو کچھ نہیں کہا.....“ شبانہ بیگم نے منصور کو والہانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بات کیا
ہے آخر.....؟“

”بات یہ ہے کہ ہمیں جھٹ پٹ سامان کی پیکنگ کرنی ہے اور پھر.....“ منصور کچھ کہتے کہتے
ل گیا۔

”کہاں کی تیاری ہے..... کیا لندن سے باہر کی سیر و تفریح کے لئے جارہے ہو؟“
”تفریح تو اب تک ہوئی رہی ماما.....“ منصور سنجیدہ ہو گیا۔ ”اب تو زندگی کا صحیح معنوں میں
غاز ہوگا۔“

”باپ کی طرح تم بھی زندگی کا فلسفہ سمجھنے لگے..... حالانکہ فلسفے اور کامرس میں زمین و آسمان کا
صلہ ہے۔“

”ہم اپنے وطن واپس جا رہے ہیں ماما!“ منصور نے ماں کی گردن میں بانٹیں ڈالتے ہوئے
رہے جذباتی انداز میں کہا۔ ”وہاں سب کچھ اپنا ہوگا۔“

”اور یہاں کیا تھا.....؟“
”ہر چیز مصنوعی اور برائی لگتی ہے..... گھر کے ساز و سامان سے لے کر باہر کی تہذیب تک کوئی
زلے بخٹے، کچھ بھی تو اپنا نہیں لگتا۔“

”عجب کی بات ہے، تم نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اسی ماحول، اسی تہذیب میں گزارا پھر بھی
سے غیر کہہ رہے ہو۔“ ماں نے بیٹے کو ٹٹولتے ہوئے کہا۔ ”میںیں تم نے تعلیم و تربیت حاصل کی.....

جب تک اُس کے والدین کی تجویز کا منہ کھلا رہا مقدس رشتے کا کاروبار چمکتا رہا۔ لیکن جب داماد کی
حرص و طمع کا راز کھلا اور اُس کے والدین نے ہاتھ کھینچنے کی کوشش کی تو مجازی خدا کی پیشانی پر سلونگر
ابھر آئیں..... اُس کے تیر بد لے لگے..... محبت نفرت میں تبدیل ہونے لگی..... پھر.....

ایک دن اُسے بہانہ کر کے اُس کے والدین کے گھر بھیج دیا گیا۔ اُسے یقین تھا کہ وقت کی غلط
دوبارہ بھر جائے گی، وہ اپنی وفا اور بے پناہ محبت سے اپنے شوہر کا دل جیتنے میں کامیاب ہو جائے گی۔
لیکن ایسا نہیں ہوا۔ جسے وہ اپنی زندگی کا سہارا سمجھ رہی تھی، اپنے مستقبل کا ضامن سمجھ رہی تھی وہ ہمیشہ
کے لئے اُس کا ساتھ چھوڑ گیا۔ ایک مختصر خط کے ذریعے اُس نے طلاق نامہ بھیج کر شبانہ بیگم کی ساری
امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اُس کے والدین بھی انگشت بندناں رہ گئے لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا،
واپسی ناممکن تھی۔

اُس روز وہ پچھائیں کھا کھا کر روئی، تڑپ تڑپ کر اُس نے فریادیں کی تھیں لیکن پانی سر سے
گزر چکا تھا۔ پھر بے ہوش طوفان کے تیز و تند دھارے اُس کی خوشیوں کو اپنے ساتھ بہا لے گئے،
تقدیر نے اُسے بے بس کر دیا، مقدر کی خوشیاں اُس سے ٹوٹھ گئیں، وقت نے اُسے سہارا دیا تو وہ اپنی
جگہ سنبھل گئی۔ اُس نے اپنے آنسو اپنے دامن میں جذب کر لئے، زندگی گزارنے کی خاطر اُس نے
وقت اور حالات سے سمجھوتہ کرنے کی ٹھان لی۔ اُسے مرد کی محبت سے نفرت ہو گئی، اُس کا اعتماد جس
طرح پامال ہوا اور ایک مرد کے ہاتھوں روند گیا اُس نے شبانہ بیگم کو یہ فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا کہ
آئندہ وہ کسی مرد کو اپنے مستقبل کا ضامن نہیں بنے دے گی۔ لیکن وقت کی گردش اور حالات کے
دھاروں نے اُسے ایک بار پھر مرد کے سہارے زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا۔

طلاق کے وقت شبانہ بیگم کی عمر اُس کی کئی ماںندھی جو پوری طرح محل کر سکتے بھی نہ پاتی تھی، کچھ
عرصے تک ماں باپ اُس کے غم کو سینے سے لگائے بیٹھے رہے پھر دنیا والوں کی زبان بند کرنے کی
خاطر اور اولاد کا مستقبل سنوارنے کی خاطر اُس کی دوسری شادی پروفیسر جمال احمد سے طے کر دی گئی
جو لندن میں مقیم تھے اور اپنی پہلی بیوی کے انتقال کے بعد اپنے معصوم بیٹے منصور کی نگہداشت اور
پرورش کی خاطر کسی مناسب رشتے کی تلاش میں تھے۔

شبانہ نے اس رشتے کے خلاف احتجاج کرنا چاہا لیکن زندگی کی کچھ مصلحتوں اور والدین کے پیہم
اصرار کے آگے بے بس ہو گئی..... فون پر نکاح کی رسم کی ادائیگی کے بعد جب وہ اپنے گھر اور اپنے
رشتے ناتوں کو توڑ کر ایک نئے سفر پر روانہ ہونے لگی تو اُس نے یہی طے کیا تھا کہ وہ ایک مرد کی بے
وفائی کا انتقام دوسرے سے ضرور لے گی خواہ اُسے قسمت کے ہاتھوں دوبارہ اپنی بربادی کا المیہ کیوں
نہ برداشت کرنے پڑے۔ لیکن وہ وقت کے ہاتھوں پھر شکست کھا گئی۔

جمال احمد نے ایئر پورٹ پر جس طرح اُس کا استقبال کیا اور جس انداز سے اُسے ٹوٹ کر چاہا
اُس نے شبانہ بیگم کو بہت جلد اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کر دیا..... جمال اُس کے حق میں ایک بہترین
دوست ثابت ہوئے۔ شبانہ بیگم نے انہیں ہر کوئی پر پرکھا لیکن کوٹ نہ نکال سکیں۔

منصور کو پا کر شبانہ بیگم کی متا کی تڑپ کو قرار آ گیا۔ منصور کی عمر اُس وقت پانچ سال تھی۔ وہ
بہت معصوم اور پیارا بچہ تھا، باپ کی پرورش نے اُسے مغربی ماحول میں پروان چڑھنے کے باوجود دھتکے
نہیں دیا تھا۔ شبانہ بیگم نے اُسے سچے دل سے اپنا کر متا کی لازوال دولت سے نوازا تو وہ کند بن
گیا۔ تعلیم و تربیت کے حصول میں منصور بے حد ذہین اور سمجھ دار واقع ہوا تھا اور یہی وجہ تھی جو اُس نے

یہاں تمہارے دوست و احباب ہیں، اسی دنیا میں تمہاری پرورش ہوئی، اسی تہذیب میں تم پروان چڑھے اور.....“

”اس کے باوجود یہ سب کچھ پہلایا پایا سا لگتا ہے۔“ منصور نے تیزی سے جواب دیا۔ ”ڈیڈی نے مجھے شروع سے یہی سمجھایا، ہمیشہ یہی تعلیم دی کہ مشرقی تہذیب ہماری زندگی کا سب سے انمول خزانہ ہے۔ یہ درست ہے کہ لندن اور امریکہ میں معیارِ تعلیم بہت بلند ہے، ہم دُور دراز علاقوں سے یہاں تعلیم کے زور سے آراستہ ہونے آتے ہیں لیکن یہاں کی تہذیب ہمارے مزاج سے بہت مختلف ہے، کوئی مطابقت نہیں رکھتی۔“

”تم خوش نصیب ہو منصور! جو تمہارے باپ نے تمہیں اس اجنبی ماحول میں بھی کہیں بھٹکنے نہیں دیا۔“ شانیہ بیگم غریہ لہجے میں بولیں۔ ”تمہاری باتیں اور تمہارے خیالات قابل ستائش ہیں۔“

”میری تربیت میں آپ کا بھی بڑا دخل ہے ماما..... میں بے حد خوش نصیب ہوں جو آپ جیسو ماں کا سایہ مجھے نصیب ہوا، مجھے اس بات کا احساس ہے کہ آپ کی جگہ کوئی اور ماں ہوتی تو شاید مجھے متا کا وہ پیار نہ ملتا جو آپ نے مجھے دیا ہے..... آپ بہت گریٹ ہے ماما، مجھے آپ کی اولاد کہلانے، فخر محسوس ہوتا ہے۔“

شانہ بیگم نے منصور کے جذبے کی سچائی کو محسوس کیا تو اُن کی آنکھوں کے گوشے نمناک ہو گئے۔ کتنا پیار، کتنا خلوص اور کس قدر اپنائیت! منصور کے لب و لہجے میں۔ اور اسی پیار کی شدت محسوس کر کے اُن کی آنکھیں بھر آئیں۔ ماضی کی گم گشتہ باتیں ذہن میں تازہ ہوئیں تو شانیہ بیگم کی بو ترپ اٹھی، وہ منصور کو نکلتی باندھے دیکھتی رہیں اور اندر ہی اندر کسی کیلنگز کی کی مانند سلگنے لگیں، منصور نے ماں کی آنکھوں میں آنسوؤں کو اُٹاتے دیکھا تو بے چین ہو گیا، ابھی ہوئی آواز میں بولا۔

”ماما..... کیا میں نے ایسی کوئی بات کہہ دی جو آپ کے دل کو بھلی نہیں لگی.....؟ پلیز ماما! اگر بڑے نادانگی میں کوئی غلطی سرزد ہوگئی ہو تو مجھے معاف کر دیجئے۔“

”یہ..... یہ خوشی کے آنسو ہیں میرے بیٹے! تم ان آنسوؤں کی گہرائی کو ابھی نہیں سمجھ سکو گے۔“

”میں اس کے علاوہ اور کچھ سمجھنا بھی نہیں چاہتا کہ آپ میری ماما ہیں..... گریٹ ماما۔“ منصور نے ہنچک کر ماں کی کشادہ پیشانی کو چومتے ہوئے نہایت عقیدت کا اظہار کیا پھر گنگنا تا ہوا۔

کمرے میں چلا گیا۔

اُسی رات دن بھر کے کاموں سے فراغت پانے کے بعد جب وہ شوہر کے ساتھ اپنی خواب میں گئیں تو ذہن میں کلبلا تے ہوئے اُن گنت سوانات دل کی گہرائیوں سے نکل کر زبان تک آ گئے۔

”آپ نے بیٹھے بٹھائے اچانک واپسی کا فیصلہ کیسے کر لیا؟“

”کیوں..... کیا آپ کو میرے فیصلے سے خوشی نہیں ہوئی؟“ جمال احمد نے بڑے مہذبانہ انداز میں لیکن قدرے حیرت سے دریافت کیا۔

”بات میری خوشی کی نہیں..... آپ کے فیصلے کی ہے۔“

”ہماری خوشیاں اور ہمارے فیصلے بھی ہماری طرح مشترک ہیں اور ہمیشہ رہیں گے..... کیا خیال ہے آپ کا؟“

”میں زندگی کے فلسفے کو آپ سے زیادہ نہیں سمجھ سکتی۔ لیکن سترہ سال کچھ کم نہیں ہوتے..... مطلب ہے کہ ہم نے یہاں پوری طرح قدم جمائے ہیں..... اب ہمیں غیریت کا احساس نہیں ہو

یہاں منصور کو بہتر سے بہتر ملازمت بھی مل سکتی ہے۔ اُس کا مستقبل زیادہ تابناک اور روشن ہو سکتا ہے۔“

”میں آپ کے خیال کی تردید نہیں کروں گا۔“ جمال احمد نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

”منصور کو یہاں اچھی ملازمت مل سکتی ہے..... یہاں تربیتی کی راہیں بھی کھلی ہوئی ہیں..... سترہ سالوں میں ہم نے یہاں ایک حلقہ بھی بنالیا ہے، ہمیں آج کسی ٹھٹھن کا احساس نہیں ہوتا۔ لیکن کل..... کل کیا ہو گا..... کیا اس ماحول کی پروردہ کوئی لڑکی ہمارے منصور کی شریک حیات بن کر اُس کے مستقبل کو سنوار سکتی ہے؟“

”میں سمجھی نہیں.....“

”ماضی کے درپچوں میں جھانک کر دیکھیے..... سترہ سال پہلے مجھے بھی اپنی تہذیب میں پٹی بڑھی ایک مہذب لڑکی کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔“ جمال احمد نے بڑے خلوص سے بیوی کو گھورتے ہوئے کہا۔

”میں اپنی زندگی کے اس خلا کو یہاں بھی پُر کر سکتا تھا لیکن مجھے اپنی ضرورتوں سے زیادہ اپنی اولاد کے مستقبل کے تحفظ کی فکر دامن گیر تھی جسے آپ نے پورا کر دیا۔“

”ایک بات کہوں..... آپ برا تو نہیں منائیں گے؟“

”جو کچھ کہنا ہے بلا تکلیف کہہ ڈالئے..... میں آپ کی کسی بات کا برا نہیں مانوں گا۔“

”سترہ سال قبل آپ نے میرے حق میں جو فیصلہ کیا تھا وہ مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔“

جمال احمد نے بیوی کی بات کو بہت غور سے سنا لیکن جواب نہیں دیا، خاموشی سے شانیہ بیگم کے چہرے کے تاثرات کو محسوس کرتے رہے۔

”شاید اس لئے کہ اُس وقت میرا زخم تازہ تھا۔“ شانیہ بیگم نے توقف سے کہا۔ ”وقت اور حالات نے میرے دل کو جو چرے کے لگائے تھے اُس نے مجھے مردکی ذات سے متفرک کر دیا تھا..... میرا اعتماد جس طرح ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہوا اُس نے میری سوچوں کے زاویے بدل دیئے تھے۔ میں نے آپ کے سلسلے میں والدین کے فیصلے کو رد نہیں کیا لیکن.....“

”بات ادھوری رہ جائے تو ٹھٹھن کا احساس اور شدت اختیار کر لیتا ہے۔“ جمال احمد نے بیوی کی خاموشی کو بھانپتے ہوئے بڑی اپنائیت سے کہا۔

”میں ہمہ تن گوش ہوں.....“

”میں نے سوچا تھا کہ مردکی ذات پر بھی اعتبار نہیں کروں گی اور..... اس ظلم کا انتقام ضرور لوں گی جو مجھ پر کئے گئے تھے۔“

”آپ ایسا سوچنے میں اپنی جگہ حق بجانب تھیں۔“

”لیکن میں ایسا کر نہیں سکی..... شاید اس لئے کہ آپ کی بے پناہ محبت اور پُر خلوص طرزِ عمل نے میری قوتِ مدافعت کو پسپا کر دیا۔“

”تالی ایک ہاتھ سے نہیں..... دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔“ جمال احمد نے سنجیدگی سے کہا۔

”منصور کے سلسلے میں آپ نے ایک ماں کا جو کردار ادا کیا وہ نہ صرف یہ کہ مثالی ہے بلکہ میں آپ کا شکر گزار بھی ہوں۔“

”آپ کی انہی باتوں نے مجھے خرید لیا..... لیکن اب بھی جب میں اپنے ماضی کے دُھندلکوں میں جھانکتی ہوں تو مجھے شدید ٹھٹھن کا احساس ستانے لگتا ہے..... جب میں زندگی کے بے تحاشوں کے بارے میں سوچتی ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے ایک موڑ پر لچوں کی درمیانی کڑیاں ٹوٹ کر بکھر چکی ہوں.....“

جیسے..... جیسے میری زندگی کے دو سال کہیں گم ہو گئے ہوں..... میں انہیں تلاش کرنے کی کوشش کرتی ہوں تو نہ جانے کیوں خوف سے لرز اٹھتی ہوں..... ان دو سالوں میں، میں نے کیا کھویا..... کیا پایا..... میرے سوا اور کون جان سکتا ہے؟“

”کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں جانتے بوجھتے ہوئے بھی نظر انداز کر دینے میں زیادہ فائدہ ہوتا ہے۔“ جمال احمد نے خلا میں جھانکتے ہوئے جواب دیا۔

”کیا مطلب.....؟“ شبانہ بیگم چونک اٹھیں۔ ”کیا آپ میرے بارے میں.....“

”صرف اتنا جانتا ہوں کہ قسمت مجھ پر مہربان تھی جو مجھے آپ جیسی شریک حیات میسر آ گئی۔“ جمال احمد نے بیوی کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بڑے خلوص سے کہا۔ ”میں نے اس سے زیادہ جاننے کی کوشش کبھی نہیں کی.....“

”کیا آپ نے لندن کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہنے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے؟“ شبانہ بیگم نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں..... میں نہیں چاہتا کہ منصور کو یہاں ملازمت دلائی جائے..... وہ مقصد جو اولاد کی تعلیم؛ تھا خدا کے فضل و کرم سے پورا ہو گیا اس لئے اب میں اپنی دنیا میں واپس لوٹ جانا چاہتا ہوں۔“

”کیا آپ نے محض منصور کی تعلیم کی خاطر اتنے عرصے تک خود کو وطن سے دور رکھا تھا؟“

”آپ کا اندازہ درست ہے.....“ جمال احمد نے خلا میں گھورتے ہوئے مدہم لہجے میں کہا۔

”اگر مجھے اولاد کا مستقبل عزیز نہ ہوتا تو میں اپنوں کو چھوڑ کر اتنی دور بھی نہ آتا..... کچھ ایسے رشتے بھی تھے جن کی تلخ یادوں اور ناگوار پرچھائیں سے بچنے کی خاطر میں نے اتنی دور آنے کا فیصلہ کیا تھا۔“

”ٹھیک کہا آپ نے..... وقت کے تقاضے انسان کو اکثر بے حد مجبور اور بے بس کر دیتے ہیں۔“

شبانہ بیگم کے لہجے میں درد ابھر آیا۔ دل مسوس کر بولیں۔ ”مستقبل کو سنوارنے کا خیال اکثر رشتوں کی

شناخت کو بھی دھندلا دیتا ہے۔“

”آپ کو شاید ان رشتوں کی یاد آگئی جو میری خاطر آپ بہت پیچھے چھوڑ آئی ہیں.....“

”سترہ سال کی طویل مدت..... کچھ کم تو نہیں ہوتی۔“ شبانہ بیگم نے ایک سر آہ بھر کر کہا۔

”مجھے آپ کی قربانیوں کا اندازہ ہے۔“

”قربانی.....“ شبانہ بیگم نے شوہر کو غور سے دیکھا۔ ”آپ کس قربانی کا ذکر کر رہے ہیں؟“

”میرا اشارہ ان فاصلوں کی سمت ہے جنہوں نے ہمیں اپنوں سے دور کر دیا ہے۔ کیا آپ اسے قربانی نہیں کہیں گی؟“

”کچھ فاصلے ایسے بھی ہوتے ہیں جو ایک بار درمیان میں حائل ہو جائیں تو ہمیشہ برقرار رہتے ہیں..... ایسے فاصلوں کو گھٹانے کی کوشش کی جائے تو کرب و اذیت کا احساس اور شدید ہو جاتا ہے۔“

”فلسفہ زندگی کی انہی تلخ حقیقتوں کا دوسرا نام ہے۔ لیکن میرے نزدیک ماپوسی گناہ ہے۔ انسان کو زندگی کے کسی محاذ پر ہمت نہیں ہارنی چاہئے..... حوصلہ برقرار رہے تو وقت ہر زخم کے لئے تریاق بن جاتا ہے۔“

”واپسی کے بعد آپ کا کیا ارادہ ہے، میرا مطلب ہے کیا آپ وہاں بھی ملازمت کریں گے؟“

”ہمارا قیام اپنی کوچھی میں ہو گا۔“ جمال احمد نے بیوی کے سوال پر غور کرتے ہوئے نہایت

سادگی سے جواب دیا۔ ”وہاں ہم دونوں کے عزیز رشتہ دار بھی ہیں، اور میرا ارادہ ہے کہ اب ملازمت

کی بجائے کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کیا جائے تو زیادہ مناسب ہو گا۔ البتہ میں نے منصور کے لئے ملازمت کا بندوبست کر لیا ہے۔“

”کیا مطلب..... کیا منصور کو آگے بڑھانے کا ارادہ نہیں ہے؟“ شبانہ بیگم بولیں۔ ”ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے، بائیس سال سے کچھ اوپر ہو گا۔“

”جب میں نے ملازمت اختیار کی تھی اس وقت میری عمر بھی یہی تھی.....“

”ہو سکتا ہے اس وقت حالات کچھ اور رہے ہوں، لیکن اب تو خدا نے آپ کو بہت کچھ دے رکھا ہے، میرا تو خیال ہے کہ منصور کو ایم کام بھی کرا دیا جائے تو مناسب ہو گا، اعلیٰ تعلیم حاصل کر لینے کے بعد وہ آپ کے کاروبار میں بھی شریک ہو سکتا ہے۔“

”اگر یہ آپ کی خواہش ہے تو میں اس کا احترام ضرور کروں گا.....“ جمال احمد بیوی کی بات

مانتے ہوئے مسکرا کر بولے۔ ”آپ نے منصور کی اعلیٰ تعلیم کے علاوہ کچھ اور بھی سوچا ہے؟“

”کچھ اور سے آپ کی کیا مراد ہے؟“

”میرا اشارہ منصور کے مستقبل اور اس کی گھریلو زندگی کی طرف ہے۔“

”آپ تو ابھی سے پھیل پر سروسول جمانے کی بات کر رہے ہیں۔“ شبانہ بیگم نے پہلو بدل کر

کہا۔ ”منصور کی تعلیم مکمل ہو جائے، وہ اپنے قدموں پر کھڑا ہو جائے، پھر اس کی گھریلو زندگی کا مسئلہ بھی طے ہو جائے گا..... آپ دیکھئے گا کہ میں اپنے منصور کے لئے کیسے اونچے خاندان میں رشتے کی

بات کروں گی۔“

”کیا آپ نے کسی رشتے کے بارے میں سوچ رکھا ہے؟“

”جی نہیں..... ابھی کچھ نہیں سوچا۔ لیکن مجھے خدا کی ذات سے امید ہے کہ منصور جیسے لڑکے کے لئے اچھے رشتوں کی کوئی کمی نہیں ہوگی۔“

”اگر ناگوار خاطر نہ گزرے تو ایک تجویز پیش کرنے کی جسارت کروں؟“

”آپ حکم دیجئے..... اس قدر انکساری کا مظاہرہ کیوں کر رہے ہیں؟“

”مجھے آپ، آپ کا گھر اور آپ کا خاندان بے حد پسند ہے، میری خواہش ہے کہ منصور کا رشتہ خاندان ہی کی کسی لڑکی سے ہو تو بہتر ہو گا.....“

”آپ.....“ شبانہ بیگم نے چونک کر شوہر کو غور سے دیکھا، کچھ کہتے کہتے یلکھت خاموش ہو گئیں۔

”اب آپ انکساری سے کام لے رہی ہیں۔“ جمال نے مسکرا کر کہا۔ ”میرا اشارہ وقار بھائی اور شائلہ کی طرف تھا۔“

”شائلہ میری بہن ہے، وہ میری کسی بات سے انکار نہیں کریں گی۔ لیکن اتنی دور بیٹھے بیٹھے رشتے کا ذکر چھیڑنا مناسب نہ ہو گا۔ اور کیا پتہ اس نے پہلے سے اپنی بیٹیوں کے لئے کچھ سوچ رکھا ہو؟“

”ممکن ہے..... اگر ایسا ہوتا تو وہ آپ کو خط کے ذریعے مطلع ضرور کرتی۔“

”شائلہ نے بھی اس سلسلے میں کھل کر کچھ نہیں لکھا..... بہر حال، جب ہم خود وہاں چل رہے ہیں تو وہ بدد بات ہو جائے گی۔“ شائلہ بیگم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا پھر بولیں۔ ”آپ نے تصویریں تو

دیکھ رکھی ہیں..... آپ کو تینوں لڑکیوں میں کون پسند ہے؟“

”آپ منصور کی ماں ہیں، اس لئے یہ فیصلہ میں آپ پر چھوڑتا ہوں۔“

”ہمیں منصوبہ کی پسند کا بھی خیال رکھنا ہوگا، ہو سکتا ہے وہ ہمارے انتخاب سے متفق نہ ہو۔“
 ”ایسا نہیں ہوگا۔۔۔۔۔۔“ جمال احمد نے پڑ وقار انداز میں کہا۔ ”وہ ہمارا خون ہے اور ہمیں اپنے خون پر پورا پورا بھروسہ ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو ہم اُسے پانچ سالوں کی بچی عمر میں مغربی تہذیب میں تعلیم دلانے بھی نہیں لاتے۔ اور کیا آپ نے کبھی محسوس کیا کہ منصور نے یہاں کی تہذیب کو اپنانے کی کوشش کی ہے؟“

”قطعاً نہیں۔۔۔۔۔۔“ شانہ بیگم جلدی سے بولیں۔ ”بلکہ منصور کو تو واپسی کی اطلاع پر بے حد خوشی ہوئی ہے، کہہ رہا تھا کہ یہاں کی کوئی چیز بھی اپنی نہیں۔ سب برائی لگتی ہے۔۔۔۔۔۔“
 جمال احمد نے اس بار کوئی جواب نہیں دیا، ایک فاتحانہ مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھیرتے ہوئے بیوی کو پیار سے دیکھا، پھر سونے کے ارادے سے دوسری طرف کروٹ بدل لی اور شانہ بیگم شوہر کی کینٹی پر سفید بالوں کے اس گچھے کو دیکھنے لگیں جو جمال احمد کی اعلیٰ تعلیم، وسیع تجربے اور بلند کردار کی غمازی کر رہا تھا۔۔۔۔۔۔

کیسی عجیب بات تھی۔۔۔۔۔۔ کیا انوکھا انقلاب تھا۔۔۔۔۔۔ سترہ سال قبل شانہ بیگم کے دل و دماغ میں اسی مرد سے انتقام لینے کا جذبہ بیدار ہوا تھا جسے آج وہ اپنی زندگی کا محافظ سمجھنے پر مجبور تھیں۔ یہ ایک مرد کا پیار تھا، اُس کی بے پناہ محبت تھی، اُس کے بلند کردار کا نتیجہ تھا جس نے دوسرے مرد کی پست ذہنیت کے ناقابل برداشت نفوش شانہ بیگم کے ذہن سے بڑی حد تک دھندلا دیئے تھے۔ کتنا فرق تھا اُن دونوں کے درمیان۔۔۔۔۔۔

ایک گھپ اندھیرا تھا جس نے زندگی اجیرن کر دی تھی۔۔۔۔۔۔ اور
 دوسرا اُجالا تھا۔۔۔۔۔۔ جس نے زندگی کے دیرانوں میں پھر سے بہار کا رنگ بھر دیا تھا۔۔۔۔۔۔!!

○○○

شاہ، نادیا اور صائمہ چائے کی میز پر بیٹھی شام کا ناشتہ کر رہی تھیں جب فرحان منہ لٹکائے سکول یونیفارم پہنے اندر داخل ہوا۔ بیٹوں، بیٹوں نے اُسے حیرت سے دیکھا، سب سے پہلے صائمہ نے پوچھا۔
 ”کیا بات ہے۔۔۔۔۔۔ آج تمہیں واپسی میں اتنی دیر کسے ہو گئی؟“

”امی جان کہاں ہیں۔۔۔۔۔۔؟“ فرحان نے صائمہ بیگم کی بات کا جواب دینے کی بجائے سنجیدگی سے سوال کیا۔

”اپنے کمرے میں ہوں گی۔“ صائمہ نے جواب دیا پھر بولی۔ ”کیا ابھی واپس آئے ہو۔۔۔۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔۔۔۔“
 ”جاؤ! لباس تبدیل کر کے جلدی سے آ جاؤ۔ ورنہ تمہاری چائے اور تمہارے حصے کی کھیر بھی ختم ہو جائے گی۔“ صائمہ چٹخا رالیتے ہوئے بولی۔ ”ایمان سے آج میں نے بہت ہی لذیذ کھیر بنائی ہے اور وہ بھی شکر قد کی۔“

فرحان جواب دیے بغیر واپس پلٹ گیا تو صائمہ کے علاوہ شاہ اور نادیا کو بھی حیرت ہوئی۔ فرحان کی حاضر جوابی اور ہر وقت ہنستے بولتے رہنے کی عادت سب ہی میں مشہور تھی، خاص طور پر صائمہ اور اُس کے درمیان تو ہر وقت جیسے ٹھنی رہتی تھی۔ لہذا اُس وقت فرحان کا چلا جانا سب ہی کے لئے تعجب خیز تھا۔

”میرا خیال ہے کہ آج اُس کے سکول کی بس پھر راستے میں کہیں پکچر ہو گئی ہوگی۔“ نادیا نے

اظہار خیال کیا۔
 ”بھی تو پھولا پھولا دکھائی دے رہا ہے۔“ صائمہ نے کہا۔
 ”یہ بھی ممکن ہے کہ اُسے کوئی نئی شرارت سوچھی ہو، ورنہ وہ اس طرح خاموش نہ رہتا۔“
 ”میں بتاتی ہوں۔۔۔۔۔۔“ شاہ نے کہا۔ ”فرحان ہمیں کوئی خوشخبری سنانے والا ہے۔“
 ”خوشخبری۔۔۔۔۔۔ اور منہ پھلا کر؟“ صائمہ نے کڑوا منہ بنا کر کہا۔ ”ضرور سکول میں کسی شرارت کی سزا ملی ہوگی۔“

”لیکن خوشخبری کیا ہو سکتی ہے؟“ نادیا نے دریافت کیا۔
 ”ابھی نہیں۔۔۔۔۔۔“ شاہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”فرحان کو آ لینے دو! خود ہی اُس کی زبانی سن لیتا۔“
 ”پلیز باجی۔۔۔۔۔۔ مجھے چپکے سے کان میں بتا دیجئے تاکہ میں بھی جوابی حملے کے لئے خود کو تیار کر لوں۔“ صائمہ نے خوشامد کی۔

”سچ بتائیے آپ! آخر کیا بات ہے؟“ نادیا نے بھی شاہ کی طرف وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔
 ”ہو سکتا ہے میرا قیاس غلط ہو، لیکن اگر میرا اندازہ ٹھیک ہے تو فرحان نے اس بار پھر میدان مار لیا ہے۔“

”سمجھ گئی۔۔۔۔۔۔“ نادیا ہنپک کر بولی۔ ”آج فرحان کا نتیجہ آیا ہوگا۔“
 ”میرا خیال ہے کہ اُس نے اپنی کلاس میں ضرور کوئی اچھی پوزیشن حاصل کی ہوگی، اسی لئے اُترا گیا ہے۔“ صائمہ نے سنجیدگی سے کہا۔

بیٹوں، بیٹوں میں ابھی یہ قیاس آرائی جاری تھی کہ فرحان دوبارہ آ گیا، ابھی تک اُس نے سکول کی یونیفارم نہیں اتاری تھی، چہرے پر بدستور ویسی ہی سنجیدگی طاری تھی۔ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا وہ حسب معمول شاہ کے سیدھے ہاتھ والی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا، نادیا اور صائمہ اُسے ٹٹولتی نظروں سے دیکھنے لگیں۔

”کیا امی سے ملاقات نہیں ہوئی؟“ شاہ نے اُسے پیار سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”جی۔۔۔۔۔۔ ہو گئی۔“ فرحان نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

”کتنا مال ہتھیایا امی سے؟“ صائمہ نے پوچھا۔

”کیسا مال۔۔۔۔۔۔؟“ فرحان نے بدستور خشک انداز میں صائمہ کو گھورا۔

”اب اتنا بننے کی اداکاری بھی مت کرو۔۔۔۔۔۔ ہمیں پتہ ہے کہ تم کس لئے اُترارہے ہو۔“

”جلدی بتاؤ فرحان!“ نادیا نے پوچھا۔ ”اس بار تمہاری کون سی پوزیشن آئی کلاس میں۔۔۔۔۔۔؟“

”اسی کا تو ملال ہے کہ پوزیشن آتے آتے رہ گئی۔“

”کیا مطلب۔۔۔۔۔۔؟“

”جغرافیہ کا پرچہ خراب ہونے سے سارا معاملہ چو پٹ ہو گیا۔“

”نہیں۔۔۔۔۔۔ تم مذاق کر رہے ہو۔۔۔۔۔۔ تم اور جغرافیہ میں ٹیل ہو، میں نہیں مان سکتی۔“ صائمہ نے کہا۔

”یہی تو تمہارا سب سے پسندیدہ مضمون ہے۔“

”اسی بات کا غم تو مجھے بھی ہے کہ اپنے پسندیدہ مضمون میں لڑھک گیا۔“

”فرحان۔۔۔۔۔۔ ذرا میری طرف دیکھو اور سچ بتاؤ! کہ تمہارا نتیجہ کیا رہا؟“ شاہ نے لاڈ سے حکم دیا تو فرحان اپنی سنجیدگی برقرار نہ رکھ سکا۔

”یوں نہیں، پہلے انعام دینے کا وعدہ کیجئے پھر بتاؤں گا کہ اس پار میری فرسٹ پوزیشن آئی ہے۔“
 ”مبارک ہو.....“ ثناء اُسے لپٹاتے ہوئے بولی۔ ”مجھے یقین تھا کہ میرا بھائی ضرور شاندار نمبروں سے کامیاب ہوگا..... میری جانب سے اپنا انعام پکا سمجھو۔“
 ”اس شاندار کامیابی پر تو مجھے بھی انعام دینا پڑے گا۔“ نادیہ نے بھی بھائی کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا۔
 ”لیکن تم تو کہہ رہے تھے کہ جغرافیہ کا پرچہ خراب ہو گیا؟“ صائمہ چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے بولی۔
 ”بس! ایک سوال غلط ہو گیا..... وہ بھی آپ کی وجہ سے۔“
 ”میری وجہ سے کیوں.....؟“ صائمہ چونکی۔
 ”مستحق نے ایشیا کے گرم و مرطوب خطے کے بارے میں سوال کیا تھا اور جواب میں، میں آپ کے کوائف تحریر کر آیا۔“
 ”بھی اپنی صورت بھی دیکھی ہے آئینے میں؟“ صائمہ جل کر بولی۔
 ”روز دیکھتا ہوں۔ لیکن جس روز جغرافیہ کا پرچہ تھا اُس دن غلطی سے شاہد آپ کو دیکھ لیا تھا۔“
 ”فرحان نے برجستہ جواب دیا تو نادیہ اپنی فہمی ضبط نہ کر سکی، ثناء نے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔
 ”کیا تم نے امی کو اپنی کامیابی کی خوشخبری سنائی.....؟“
 ”سنادی.....“

”پھر ابھی تک یہ یونیفارم کیوں چڑھا رکھی ہے؟“ صائمہ نے اُسے چھیننے کی خاطر کہا۔
 ”بطور احتجاج.....“ فرحان نے کھیر کا ڈونگا اپنی طرف کھینچتے ہوئے جواب دیا۔ ”امی جان نے پچاس روپے کی حامی فوراً بھری ہے لیکن میں پورے سو پر ڈٹا ہوا ہوں..... اب آنی عقل شریف میر یونیفارم پہننے کی وجہ؟“
 ”شائلہ بیگم نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھا تو فرحان نے سو روپے کی رٹ لگانی شروع کر دی۔“
 ”اور نادیہ نے بھی بھائی کی پڑ زور سفارش کی تو شائلہ بیگم نے فرحان کا مطالبہ منظور کر لیا۔“
 ”یہ بات غلط ہے امی.....“ صائمہ ٹھنک کر بولی۔ ”جب میں نے ساتویں کلاس میں پہلی پوزیشن حاصل کی تھی اُس وقت آپ نے صرف پچیس روپے اور ایک گڑیادے کر ڈیا تھا۔“
 ”وہ سستے کا زمانہ تھا۔ اس لئے پچیس بھی بہت تھے.....“ فرحان نے کہا۔ ”اب تو سو روپے میر کرکٹ کا ایک اچھا بلا بھی نہیں ملتا..... سو روپے ابو سے بھی لوں گا تب کہیں کام بنے گا۔“
 ”کچھ دیر تک بھائی بہنوں میں اسی قسم کی نوک جھونک جاری رہی، پھر ناشتے سے فارغ ہو کر سب لوگ ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ فرحان لباس تبدیل کرنے کی غرض سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔
 کچھ دیر بعد پڑوس کی ایک خاتون شائلہ بیگم سے ملنے آئیں تو نادیہ اور صائمہ بھی وہاں سے اٹھ گئیں اور شاپاوری خانے میں جا کر ملازم کو چائے وغیرہ کے اہتمام کے سلسلے میں ہدایت دینے لگی۔
 شائلہ بیگم کو فرحان کی کامیابی پر چھٹی خوشی ہوئی کم تھی۔ یوں تو ثناء، نادیہ اور صائمہ بھی تعلیم کے مدارج نہایت شاندار طور پر طے کر رہی تھیں لیکن فرحان کی بات اس لئے زیادہ اہم تھی کہ وہ اکلوتا لڑکا تھا..... رات گئے وقار احمد اپنے کایو بار سے فراغت پا کر ٹھکے ماندے گھر واپس لوٹے تو فرحان کی کامیابی کی خبر سن کر اُن کی تکان چائی رہی، بڑے فخر سے بولے۔
 ”مجھے پہلے ہی سے توقع تھی..... کیوں نہ ہو، آخر ہے کس باپ کا بیٹا؟“

”بس رہنے دیجئے..... آپ کو اپنے کاروباری معاملات سے اتنی فرصت کہاں جو اولادوں کی پڑھائی کی جانب توجہ دیں..... تمام سال پتہ میں مارتی ہوں اور نتیجہ آنے کے بعد آپ سرخرو ہونے بیٹھ جاتے ہیں۔“
 ”فرحان ہے کہاں.....؟“
 ”آپ کا انتظار کرتے کرتے ابھی سویا ہے..... کہہ رہا تھا کہ آپ سے بھی پورے سو روپے انعام لے گا۔“
 ”آپ سو کی بات کرتی ہیں میں اُسے پورے دو سو دوں گا تاکہ وہ آئندہ بھی اسی محنت اور لگن سے پڑھتا رہے۔“
 ”اب ایک دم سے اتنا زیادہ دینے کی بھی ضرورت نہیں ورنہ بچوں کی عادت خراب ہو جاتی ہے۔“ شائلہ بیگم نے کہا۔ ”فرحان کرکٹ کا بلا لانے کو کہہ رہا تھا..... میرا خیال ہے کہ آپ روپے دینے کی بجائے اگر بلا اور گیند لادیں تو اُسے زیادہ خوشی ہوگی۔“
 ”اگر آپ کی مرضی یہی ہے تو ایسا ہی سہی۔“
 ”اچھا..... اب چل کر لباس تبدیل کیجئے، میں آپ کے لئے کھانا گرم کرواتی ہوں۔“
 ”بچیاں کہاں ہیں.....؟“
 ”اپنے اپنے کمروں میں ہوں گی..... اُن کے امتحانات بھی تو سر پر کھڑے ہیں۔“
 ”وقار احمد جب ضروریات سے فارغ ہو کر کھانے کی میز پر آئے تو شائلہ بیگم وہاں پہلے سے موجود تھیں، کھانے کے دوران بھی فرحان کی باتیں ہوتی رہیں، پھر وقار احمد نے کچھ یاد کرتے ہوئے کہا۔
 ”ارے ہاں..... میں آپ کو ایک خوشخبری سنانا تو بھول ہی گیا.....“
 ”کوئی کاروباری معاملہ ہوگا.....“ شائلہ بیگم نے کہا پھر بڑے پیار سے بولیں۔ ”مجھے تو ہر وقت آپ کی صحت کی فکر لاحق رہتی ہے..... آخر اتنی دولت اکٹھا کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے..... خدا کا دیا سب کچھ تو ہے ہمارے پاس..... پھر اتنی رات گئے تک کام میں اُلجھے رہنا مجھے پسند بھی نہیں..... جان ہے تو جہان ہے..... دولت تو آتی جاتی شے ہے۔“
 ”آپ کا حکم ہے تو کل سے جلدی آ جایا کروں گا..... ویسے اس وقت میں آپ کو جو خوشخبری سنانے والا ہوں اُسے سن کر آپ پھڑک اٹھیں گی۔“
 ”کوئی خاص بات.....؟“
 ”جی ہاں، آج جمال بھائی کا فون آیا تھا لندن سے۔ وہ بہت جلد نقل مکانی کا ارادہ رکھتے ہیں۔“
 ”ج.....؟“ شائلہ بیگم نے مسرت بھرنے لہجے میں پوچھا۔ ”کب تک آرے ہیں؟“
 ”دن، تاریخ کا تو ابھی تعین نہیں کیا، لیکن پروفیسر صاحب کی باتوں سے یہی لگ رہا تھا جیسے مینین بھر کے اندر اندر وہ مع ساز و سامان کے واپس آ جائیں گے۔ اور ہاں..... اُن کے بیٹے منصور نے بھی بی کام کا امتحان شاندار نمبروں سے پاس کر لیا ہے۔“
 ”منصور کی کامیابی کی اطلاع آپا جان پہلے ہی دے چکی ہیں۔ البتہ اُن کے آنے کی خوشخبری میرے لئے بہت اہم ہے۔ پورے سترہ سال بعد ہم ایک دوسرے کو دیکھیں گے.....“ شائلہ بیگم نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اس طویل عرصے میں آپا جان کے دل پر کیا گزری ہوگی، اس کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟“

عثمان علی کا تعلق نہایت شریف اور کھاتے پیتے گھرانے سے تھا۔ ریٹائر ہونے سے قبل وہ خود بھی لم ٹیکس کے محکمے میں ایک بڑے عہدے پر فائز تھے۔ اللہ کا دیا سب کچھ تھا اُن کے پاس۔ ملازمت سے باعزت طور پر سبکدوش ہونے کے بعد انہیں کسی بات کی کمی نہیں تھی، ایک تو پنشن معقول مل رہی تھی اس کے علاوہ جائیداد غیر منقولہ کا کرایہ بھی آتا تھا، ایک دو چھوٹے موٹے کاروبار بھی تھے جسے اُن کے ملازم بڑی خوش اسلوبی سے چلا رہے تھے۔ غرضیکہ عثمان علی کو غم روزگار کی کوئی فکر نہیں تھی۔ وہ اپنی ٹریک حیات فرزانہ بیگم کے ساتھ نہایت پرسکون زندگی گزار رہے تھے۔ اگر انہیں کوئی غم تھا تو صرف یہ کہ خداوند کریم نے انہیں اولادِ نرینہ کی نعمت سے محروم رکھا تھا۔

قدرت نے انہیں دو بیٹیاں عطا کی تھیں اور وہ دونوں اپنے اپنے گھروں کی ہو چکی تھیں۔ چھوٹی بیٹی شامکہ بیگم وقار احمد سے بیاہی گئی تھیں اور بڑی بیٹی شہانہ بیگم گزشتہ سترہ سال سے اپنے دوسرے شوہر پروفیسر جمال احمد کے ساتھ باعزت زندگی گزار رہی تھیں۔ عثمان علی اور فرزانہ بیگم نے زندگی کے کسی موڑ پر بھی کسی کا دل دکھانے کی کوشش نہیں کی، ہر شخص سے نہایت خلوص و دیانت سے پیش آتے، سب سے محبت کا برتاؤ کرتے۔ لیکن شاید اُن کی یہی سادہ لوحی اور شرافت تھی کہ شہانہ بیگم کے سلسلے میں اُن سے ایک ایسی چوک ہو گئی جس کا مالِ راستے ناسور کی مانند اُن کی زندگی سے وابستہ ہو گیا۔ اپنے جانتے میں انہوں نے اقبال احمد کا انتخاب کرنے کے سلسلے میں تمام اُونچ نیچ اور مصلحتوں کو پیش نظر رکھ کر شہانہ کا مستقبل سنوارنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ داماد کے دل کے بھید سے ناواقف تھے۔ اس لئے ظاہری رکھ رکھاؤ اور اُس کی بناوٹی معصومیت کے دام میں پھنس کر تقدیر کے ہاتھوں بے بس ہو گئے۔

شادی سے قبل اقبال احمد نے یہی ظاہر کیا تھا کہ وہ ماں باپ کے سائے سے محروم ہے اور خود اپنی محنت سے اپنے مستقبل کو بنانے میں کوشاں ہے، شکل و صورت اور ظاہری ٹھاٹھ باٹ سے وہ کسی اچھے اور معقول خاندان کا فرد نظر آتا تھا۔ ایم اے کی سند بھی اُس کے پاس۔ بظاہر اُس میں ایسی کوئی برائی نہیں تھی جسے شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا۔ عثمان علی سے براہِ راست اُس نے رشتے کی بات کی تھی، ان دنوں وہ اُن کے بڑوس میں رہتا تھا۔ آتے جاتے بڑے ادب سے عثمان علی کو سلام کرتا، محلے کے دوسرے لوگ بھی اقبال احمد کے اخلاق سے متاثر تھے لیکن دلوں کے بھید سے کوئی واقف نہیں تھا اسی لئے نیک دل عثمان علی اُس کے دام میں آ گئے۔ کچھ اُن کی اپنی سادہ لوحی تھی کہ جیسے خود تھے ویسا ہی دوسروں کو سمجھتے تھے اور کچھ فرزانہ بیگم کی پسند کو بھی دخل تھا جس نے اقبال احمد کے دست سوال کو خالی نہیں جانے دیا۔ عثمان علی نے ہاں کرنے سے پیشتر ایک بار بیوی کو سمجھانے کی کوشش کی۔

”میں مانتا ہوں کہ لڑکا پڑھا لکھا اور نیک ہے، اُس کے اطوار اور چلن کے سلسلے میں بھی محلے والوں کو کوئی شکایت نہیں۔ لیکن صرف اتنی سی بات پر تو بیٹی کا رشتہ نہیں کیا جاسکتا۔“

”اور کیا کس تلاش کرنے ہیں آپ کو؟“ فرزانہ بیگم نے معصومیت سے دریافت کیا۔

”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں..... لیکن خدا جو کرتا ہے اُس میں بندے کی بہتری کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور ہوتا ہے۔“

”آپ جانا اور دُلہا بھائی ٹھہریں گے کہاں؟“ شامکہ بیگم نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”اُن کے سوسائٹی والے بنگلے میں تو کرائے دار موجود ہیں۔ کیا وہ اتنی جلدی بنگلہ خالی کر دیں گے؟“

”جمال بھائی نے یہ ذمہ داری مجھے سونپی ہے اس لئے کچھ نہ کچھ بندوبست تو کرنا پڑے گا۔“ وقار احمد نے جواب دیا۔

”میرا خیال ہے کہ اس کام میں کوئی دشواری نہیں ہوگی، سنا ہے کرائے دار بھلے لوگ ہیں لیکن ایک مہینے یا پندرہ دن کی مہلت تو بہر حال دینی ہوگی۔“

”خدا کرے یہ مرحلہ بھی ساتھ خیریت کے طے ہو جائے۔“

”آپ فکر مند نہ ہوں بیگم! خدا نے چاہا تو سارے مرحلے ایک ایک کر کے طے ہو جائیں گے۔“

”آپا جان سے بھی کوئی بات ہوئی آپ کی.....؟“

”نہیں، جمال بھائی نے گھر سے فون نہیں کیا تھا ورنہ میں یہ موقع بھی ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔“

”کیا مطلب.....؟“ شامکہ بیگم نے تعجب سے پوچھا۔

”یہ میرا اور میری بڑی سالی کا ذاتی معاملہ ہے..... آپ پوچھنے والی کون؟“ وقار احمد نے کچھ اس انداز میں یہ جملہ کہا کہ شامکہ بیگم بے اختیار مسکرا دیں..... پھر کھانے میں مصروف ہو گئیں۔ لیکن اُن کے چہرے کے تاثرات اس بات کی ترجمانی کر رہے تھے کہ وہ کسی فکر میں مبتلا ہیں.....

﴿.....○.....○.....○.....﴾

ہیں تو یہ بات بھی ہماری بیٹی کے حق میں جاتی ہے۔ ساس سرورند بھادجوں کے جھگڑے اور آنے کی دانتا کل کل سے بھی محفوظ رہے گی.....“ فرزانہ بیگم نے اپنا آخری فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔ میری پوچھتے ہیں تو مجھے یہ رشتہ پسند ہے..... آگے آپ کی مرضی، آپ باپ ہیں، جو چاہیں سیاہ و سپید کریں۔

غرض کہ قسمت کو یہی منظور تھا کہ شبانہ بیگم کی شادی اقبال احمد سے ہو گئی..... شروع شروع میں قبال احمد نہایت فرمانبرداری اور سعادت مندی کا مظاہرہ کرتے رہے۔ لیکن پھر انہوں نے اپنے طے شدہ منصوبے کے مطابق ہاتھ پیر نکالنے شروع کئے، کچھ عرصے بارے باندھے ملازمت کی پھر یہ کہہ کر تنعفی دے دیا کہ وہ بڑس کا ارادہ رکھتے ہیں۔ عثمان علی نے بیٹی کی خاطر ایک خطیر رقم اُن کے حوالے کی لیکن نتیجہ ڈھاک کے تین پات کے سوا کچھ نہ نکلا۔ چند مہینوں میں ہی تمام روپے اڑانے کے بعد قبال احمد نے مزید رقم کا مطالبہ شروع کر دیا پھر دبی زبان میں اس خواہش کا اظہار کیا کہ انہیں گھر ادا بن کر سرسراں میں رہنا پسند نہیں اس لئے علیحدہ رہائش کا بندوبست کیا جائے۔

عثمان علی اور فرزانہ بیگم نے لاوارث داماد سے جو توقعات وابستہ کر رکھی تھیں وہ ایک ایک کر کے نی کے بلبلوں کی مانند ٹوٹتی گئیں، بیٹی کے سہاگ کی خاطر وہ داماد کی آئے دن کی جائز و ناجائز واہشات اور مطالبات پورے کرتے رہے، پھر ایک دن جب انہیں اس بات کا علم ہوا کہ اقبال احمد نے ایم اے کی جعلی ڈگری بنوا رکھی ہے اور اُن کی تعلیمی قابلیت صرف میٹرک تک محدود ہے تو اُن کا ہن چکرا گیا..... حیرانگی سے نکل چکا تھا اس لئے وہ خاموشی سے تماشہ دیکھنے پر مجبور تھے۔ لیکن بات صرف یہیں ختم نہیں ہوئی، اقبال احمد جنہوں نے خود کو لاوارث ظاہر کیا تھا اُن کے والدین بھی لاہور میں بقید حیات پائے گئے جنہوں نے اولاد کو اُس کی ناپسندیدہ حرکتوں کے سبب عاق کر رکھا تھا۔ یہ عثمان علی کے علم میں آئی تو بیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ فرزانہ بیگم کو بھی سکتہ ہو گیا۔ جسے وہ مول اور نایاب ہیرا سمجھ رہی تھیں وہ کالج کے حقیر نکلے سے بھی زیادہ حقیر اور بدتر ثابت ہو گیا یہ بات انہوں نے خواب میں بھی نہیں سوچی تھی۔

بات کسی اور کی ہوتی تو شاید عثمان علی اپنے غصے کو ایک بل بھی برداشت نہ کر سکتے۔ لیکن معاملہ وکتہ بیٹی کا تھا اس لئے زہر کا گھونٹ پی کر خاموش رہے۔ بات کو اس لئے بھی ہوا دینا ٹھیک نہیں تھا کہ چھوٹی بیٹی شائلہ بیگم کی شادی کی بات بھی تقریباً طے ہو چکی تھی اور اس شادی سے قبل اگر بڑی بیٹی کا گھر جڑ جاتا تو اُس کا اثر دوسری اولاد کی زندگی کو بھی ضرور متاثر کرتا۔

حالات کے پیش نظر عثمان علی نے خون کے گھونٹ پی پی کر خود کو قابو میں رکھا لیکن جب شائلہ کی نادبی ہو گئی اور وہ رخصت ہو گئی تو انہوں نے اقبال احمد سے دو ٹوک فیصلہ کرنے کی خاطر کہا۔

”مجھے کھل کر بتاؤ کہ تم آخر چاہتے کیا ہو.....؟“

”دنیا میں ہر انسان اپنا مستقبل سنوارنا چاہتا ہے..... میری بھی یہی خواہش ہے۔“ اقبال احمد نے نہایت ڈھٹائی سے کہا۔ ”اگر آپ مجھے مزید ایک لاکھ روپے دے دیں تو ہو سکتا ہے کہ.....“

”اب میں تمہیں ایک چھوٹی گڑی بھی نہیں دوں گا۔“ عثمان علی کسی آتش فشاں کی مانند پھٹ پڑے۔ ”اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو! تم نے مجھ سے قدم قدم پر کس قدر فریب سے کام لیا ہے..... اگر بات بیٹی کی نہ ہوتی تو میں..... میں.....“

”اب بھی میرے ساتھ آپ کی بیٹی کا مستقبل وابستہ ہے..... رہا فریب کا معاملہ تو میں نے جو

”میرا مطلب یہ ہے کہ ہمیں نہ تو اُس کے خاندان کا پتہ ہے اور نہ اس بات کا علم ہے کہ اُس کے آگے پیچھے اور کوئی ہے بھی یا نہیں؟“

”میں اسی لئے تو کہہ رہی ہوں کہ تھوڑی بہت چھان بین اور کر لیجئے پھر اللہ کا نام لے کر ہاں کر دیجئے۔“ فرزانہ بیگم نے کہا۔ ”لاوارث لڑکا ہے، پڑھا لکھا بھی ہے، آپ سہارا دیں گے تو تمام زندگی آپ کا احسان مندر رہے گا اور ہماری بیٹی کو بھی خوش رکھے گا۔“

”آپ کا خیال درست ہے۔ لیکن لڑکی کا ہاتھ اس طرح تو کسی اجنبی کے ہاتھ میں نہیں دیا۔“

”یہ بھی بھلی کہی آپ نے..... کیا دنیا میں ساری شادیاں عزیز رشتے داروں اور آپس داری میں ہوتی ہیں؟ لڑکیاں غیروں میں بھی بیاہی جاتی ہیں۔ اور پھر یہ سب تو مقدر کی بات ہوتی ہے۔ آ رُخسانہ کی مثال لے لیجئے، خدا جنت نصیب کرے..... ابا میاں نے کس قدر ٹھوک بجا کر رشتہ کیا تھا خاندان کی بھی جانچ پڑتال کی گئی، شجرہ بھی کھنگالا گیا..... کیا چیز نہیں لڑکے والوں کے پاس، دولت جیسے اُن کے گھر کی لونڈی بھی، بقول شخصے دروازے پر ہاتھی جھومتے تھے۔ لیکن نتیجہ کیا نکلا اس رشتہ کا؟..... تمام زندگی آپا، شوہر کے پیار کو ترستی رہیں اور خدا غارت کرے اُسے..... دولت کے نشے نے تو اُسے اندھا کر دیا تھا، پرانی عورتوں کے ساتھ رنگ رلیاں مانتا رہا اور آپا خون ٹھوک ٹھوک کر اللہ کی پیاری ہو گئیں۔“

”میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں بیگم! لیکن بیٹی کی شادی بہر حال کچھ دیکھ بھال کر کر جاتی ہے۔“

”سب دنیا دکھاوے کی بات ہے۔“ فرزانہ بیگم جو بہن کے حادثے کو یاد کر کے قدرے جذباتی ہو گئی تھیں تملاکر بولیں۔ ”ہماری اپنی مثال سامنے ہے، ابا جان نے ایک شرافت ہی تو دیکھ کر ہاں کر دی تھی..... کیا تھا اُس وقت آپ کے پاس؟ لیکن ہمارے نصیب اچھے تھے جو آپ کی ترقی ہوتی چلی گئی اور آج خدا نے ہمیں دنیا کی تمام نعمتوں سے نواز رکھا ہے..... بیٹی کا مستقبل تو ایک اندھا جوا ہوتا ہے نصیب کھوٹا ہو تو تقدیر کے آگے ایک نہیں چلتی اور اگر مقدر ٹھیک ہے تو انسان مٹی کو ہاتھ لگائے تو وہ سونا بن جاتی ہے۔“

”جیسی آپ کی مرضی..... مگر مجھے نہ جانے کیوں ایک بات رہ رہ کر کھلتی ہے۔“

”کون سی بات.....؟“

”اقبال کا بیان ہے کہ قریبی رشتے داروں میں اُس کا کوئی بھی نہیں اور دُور کے عزیز داروں کو وہ اپنی خوشی میں شریک نہیں کرنا چاہتا۔“

”تو اس میں ایسی عیب کی کون سی بات ہے، ہوگی اُس کی اپنی کوئی مصلحت۔“ فرزانہ بیگم نے طرف داری سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”دو سال ہو گئے اُسے ہمارے بڑس میں اکیلے رہتے ہوئے، کہ آپ نے یا کسی اور نے اُسے کسی غلط حرکت میں ملوث پایا ہے..... میں کہتی ہوں اگر وہ برا ہوتا تو اُس غلط راستوں پر چلنے سے کون روک سکتا تھا.....؟“

”ایک بات اور بھی غور طلب ہے..... صاحبزادے صحافت کے شعبے سے منسلک ہیں اور اسی کا ذریعہ معاش بنائے ہوئے ہیں۔“

”یہی تو میں آپ کو سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں..... شادی کے بعد آپ سفارش کر کے اُسے کوئی معقول ملازمت دلوا دیجئے گا تو ہمیشہ احسان مند رہے گا، رہا یہ سوال کہ اُس کے آگے پیچھے کوڈ

کچھ کیا وہ عین مصلحت تھا۔“ اقبال احمد نے شرمندگی کے اظہار کی بجائے بیہودگی کا مظاہرہ کیا تو عثمان علی غصے سے لرز اٹھے۔

”تم اپنی اوقات مت بھولو..... میرا ایک اشارہ تمہیں جیل کی چکی پیسنے پر بھی مجبور کر سکتا ہے۔“
 ”پھر انتظار کس بات کا ہے؟ کر دیجئے اشارہ..... اس میں آپ کی خاصی شہرت بھی ہو جائے گی۔“
 ”تم..... تم..... بیہودہ اور لفتنگے بھی ہو۔ نکل جاؤ میرے گھر سے اور پھر بھی اس دلیلیز پر قد رکھنے کی جسارت مت کرنا۔“

اقبال احمد نے جب محسوس کر لیا کہ اب اُسے عثمان علی سے مزید کسی رقم ملنے کی مطلق کوئی اُم نہیں تو وہ حقارت سے ہونٹ چباتے ہوئے اُلٹے قدموں واپس لوٹ گیا۔ دوسرے دن اُس نے شاہ بیگم کو باپ کے گھر بھیج دیا اور اس کے بعد طلاق نامہ بھجوا دیا اور اس طرح عثمان علی اور فرزانہ بیگم شاہانہ کی طلاق کا جوغم برداشت کرنا پڑا اُس کی کسک آج بھی اُن کے دلوں میں باقی تھی۔

کہتے ہیں کہ وقت ہر زخم کو مندمل کرنے کے لئے تریاق کا کام دیتا ہے۔ قدرت نے عثمان علی جو زخم دیا وہ بھی بہت جلد بھر گیا۔ طلاق کے ایک سال کے اندر اندر خدا نے غیب سے شاہانہ بیگم کے لئے پروفیسر جمال احمد کا رشتہ بھیج دیا جو بیوی کے انتقال کے بعد لندن میں اپنے پانچ سالہ بیٹے منہ کے ساتھ مقیم تھے، عثمان علی نے جو ایک بار دھوکہ کھا چکے تھے، دوسرے رشتے کو ہر اعتبار سے پرکھا خدا کا نام لے کر بیٹی کو نیا گھر بسانے کے لئے رخصت کر دیا..... انہیں جوان بیٹی کی عمر کے ساتھ اس بات کا خوف بھی لاحق تھا کہ اقبال احمد کی گندی ذہنیت اُس کا مستقبل تباہ کر سکتی ہے۔

شاہانہ کی زندگی جس المیہ سے دوچار ہوئی اُس نے عثمان علی کی کمر توڑ دی تھی۔ اُن کا خیال شاہانہ کی زندگی کا انجام شاملہ اور وقار احمد کی ہنسی کھینچ دینا کو بھی متاثر کرے گا لیکن خلاف توقع وقار نے اس موقع پر سرسبز طرح ساتھ دیا، اُن کی ہمت بندھائی اور شاہانہ کی دوسری شادی کے لئے جو مثبت کردار انجام دیا وہ اپنی مثال آپ تھا۔

عثمان علی اور فرزانہ بیگم کو جہاں شاہانہ کی دوسری شادی کی خوشی تھی وہاں اُس کی جدائی کا غم بھی جیسے اُنہوں نے سترہ سال تک سینے سے لگائے رکھا اور آج جب شاملہ نے اچانک گھر آکر اُنہیں اور جمال احمد کی وطن واپسی کی خوشخبری سنائی تو دونوں کی آنکھوں کے پیمانے چھلک اُٹھے۔

ان آنسوؤں میں خوشیوں اور مسرتوں کا احساس بھی جھلک رہا تھا۔

ممتا کا جذبہ بھی نمایاں تھا..... اور

حالات کی ان پیچیدگیوں کا افسانہ بھی موجود تھا جنہوں نے زندگی کے سترہ قیمتی سالوں ترتیب کو اپنے اندر سرور کھا تھا.....

کچھ ٹکڑیاں ٹوٹ کر بکھر چکی تھیں..... کچھ واقعات حرف غلط کی طرح مٹ چکے تھے..... یادیں دھندلا چکی تھیں..... اور کچھ احساسات ایسے بھی تھے جو تڑپ کر بیدار ہو گئے تھے.....

زخم..... جو وقت کی دھول سے چھپ گئے تھے پھر برے ہونے لگے.....
 کیا عجیب سماں تھا..... جس نے جدائی اور ملاپ کی خوشیوں کو آنسوؤں کی شکل دے دی.....
 آنسو..... جو خوشی کے ترجمان بھی تھے..... اور کسی سوئے ہوئے طوفان کے بیدار ہو.....

غمازی بھی کر رہے تھے۔

کتنا اُنوکھا تنگم تھا.....!!

شاملہ بیگم کو والدین کے دکھوں کا بخوبی اندازہ تھا۔ اُنہوں نے دونوں آنکھوں کے سوتے پھونٹے دیکھے تو جلدی سے دلاسہ دینے کی خاطر پہلو بدل کر بولیں۔

”جو کچھ ہوتا تھا وہ تو ہو چکا۔ اب تو ہمیں خوش ہونا چاہئے کہ آپا جان دوبارہ اپنوں کے درمیان آ رہی ہیں۔“

”تم اس غم کا اندازہ نہیں لگا سکو گی شاملہ بیٹی! جس نے ہمیں اندر ہی اندر کھوکھلا کر دیا ہے۔“
 فرزانہ بیگم بولیں۔ ”اگر بات ہمارے اختیار کی ہوئی تو ہم شاہانہ کو ایک پل کے لئے بھی اپنی نظروں سے دور نہ ہونے دیتے۔ لیکن تمہیں حالات کا اندازہ ہے..... ایک تو اُس کی عمر ایسی نہیں تھی کہ گھر بٹھایا جاسکتا..... دوسرے خدا غارت کرے اقبال احمد کو اُس کی کمینگی سے کچھ بعید نہ تھا کہ کس وقت کس قسم کی ذلالت کا ثبوت دے بیٹھے۔ اسی خیال سے ہم نے اپنے دلوں پر پتھر رکھ لئے اور اپنے جگر کے ٹکڑے کو ہزاروں میل دور بھیج دیا..... اسی میں اس غریب کی بہتری تھی۔“

”میں جانتی ہوں امی جان! لیکن قسمت کو شاید یہی منظور تھا۔“
 ”شاہانہ کی خوشیوں کا سودا کرنے کی خاطر ہمیں کس کس طرح حالات کا مقابلہ کرنا پڑا ہے، تمہیں ان میں سے کچھ باتوں کا سرے سے علم ہی نہیں ہے۔“ عثمان علی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”شاہانہ کی رخصتی کے بعد بھی اقبال احمد برابر اپنے اوچھے ہتھیار استعمال کرتا رہا لیکن میں جانتا تھا کہ کتے کے آگے جب تک بڑی نہیں جھینگی جائے گی وہ بھونکتا رہے گا۔ لہذا میں نے اُس بد بخت اور تانہ باز کے ساتھ وہی طریقہ اختیار کیا تب کہیں جا کر اُس نے خاموشی اختیار کی۔“

”میں بھی نہیں ابا جان.....؟“
 ”بات سمجھنے یا سمجھانے کی نہیں ہے بیٹی..... جس طرح ہم نے سترہ سال سے ہونٹ سی رکھے ہیں اسی طرح آئندہ بھی ہمیں خاموشی سے کام لینا ہوگا۔“ فرزانہ بیگم ایک سرد آہ بھر کر بولیں۔ ”ہمیں پچیس پچاس ہزار کا غم نہیں۔ دولت تو آتی جاتی شے ہے، لیکن ملال اس بات کا ہے کہ ہمیں خود اپنی خوشیوں کی قیمت ادا کرنی پڑی۔“

”مجبوری اور بے بسی کہو بیگم!“ عثمان علی نے تمللا کر کہا۔ ”ہم کو اپنے خاندان کی عزت اور شاہانہ بیگم کی خوشیوں کا خیال تھا ورنہ کچھری اور عدالتوں کے دروازے بند نہیں تھے، میں ناکوں چنے چبوا ڈالتا اُس مردود کو..... وہ اوپاش اور بد معاش اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکتا تھا لیکن اس طرح ہماری ساکھ بھی ڈوب جاتی جس کا بھرم ابھی تک قائم ہے.....“

”جو کچھ ہوا اُس پر خاک ڈالئے..... اب ان بیٹی باتوں کو کریدنے سے کیا حاصل؟“
 ”زخم پر پتے کھرینڈ اکھڑ جائیں تو تکلیف کا احساس تو بہر حال ہوتا ہے۔“

”آپ کا کیا خیال ہے ابا جان.....“ شاملہ بیگم نے بات کی تہہ تک پہنچتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا آپ کی واپسی کے بعد تو اقبال احمد کی طرف سے.....“

”اب وہ مردود کس منہ سے بات کر سکتا ہے؟“ عثمان علی نے تیزی سے جواب دیا۔ ”میں نے اُس کی کمینگی اور حرمزدگی کی پوری قیمت ادا کر کے قانونی دستاویز لکھوا لی ہے۔ اور اگر اب بھی کسی بد معاشی کا ثبوت دیا تو خدا کی قسم سچ چور سے میں گولی مار دوں گا۔“

”لعنت بھیجئے اُس کجخت محسوس کے ذکر پر..... آپ بلاوجہ اپنی جان کیوں ہلکان کر رہے ہیں؟“
 فرزانہ بیگم نے شوہر کو سمجھایا، پھر چھوٹی بیٹی سے بولیں۔ ”کچھ اور بھی پتہ چلا کہ شاہانہ کب تک آ رہی

ہے؟“

”کوئی تفصیلی خط آئے تو معلوم ہو..... فون پر جمال بھائی نے صرف اتنا ہی کہا تھا کہ وہ عنقریب واپسی کا ارادہ رکھتے ہیں، وقار کی باتوں سے اندازہ لگتا ہے کہ آپا جان کے آنے میں تقریباً ایک ڈیڑھ مہینہ لگے گا۔“

”کہاں ٹھہرنے کا ارادہ ہے؟“

”اپنے سوسائٹی والے بنگلے میں۔“ شائلہ بیگم نے کہا۔ ”جمال بھائی نے بنگلہ خالی کرانے کی ذمہ داری بھی وقار کو سونپی ہے۔“

”اور اگر کرائے داروں نے بنگلہ خالی نہ کیا تو.....؟“

”تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑے گی؟“ عثمان علی بولے۔ ”جب تک مکان خالی نہیں ہوتا جہاں اور شبانہ یہاں بھی قیام کر سکتے ہیں، میں خط لکھوں گا جمال کو کہ پریشان ہونے کی چنداں ضرورت نہیں..... جب ہمارا غریب خانہ موجود ہے تو پھر فکر کا ہے کی؟“

”لیکن میرا خیال ہے کہ جمال یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھیں گے۔“

”کیوں..... اس میں غیر مناسب کیا بات ہے؟“

”آپ تو جرح شروع کر دیتے ہیں۔“ فرزانہ بیگم نے کہا۔ ”جمال احمد بڑی خوددار طبیعت مالک ہیں اور ایسی صورت میں کم از کم میرا تو یہی اندازہ ہے کہ وہ سسرال میں قیام کرنے سے گریں گے۔“

”اگر یہ مصلحت ہے تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا..... جب تک جمال میاں کا بنگلہ خالی نہیں ہوتا کوئی دوسرا مکان کرائے پر لیا جاسکتا ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ اس کی نوبت نہیں آئے گی۔“ شائلہ بولیں۔ ”وقار بتا رہے تھے کہ کرا۔ دار بھلے مانس ہیں لیکن انہیں نقل مکانی کے لئے کچھ مہلت تو ضرور دینی ہوگی۔“

”خدا وقار میاں کو ہمیشہ سلامت رکھے..... انہوں نے ہمارے ساتھ آڑے وقتوں میں سلوک کیا ہے اور جس فراخ دلی کا مظاہرہ کیا ہے اس کی توقع تو آج کل اپنے پیٹ کی اولاد سے بھی نہیں کی جاسکتی۔“

”تو کیا آپ مجھے غیر سمجھتی ہیں؟“

”تمہاری بات اور ہے شائلہ..... تم نے جو کچھ کیا وہ ایک سچی بہن ہونے کے ناتے تمہارے اور فرض بھی تھا لیکن اگر وقار نے ساتھ نہ دیا ہوتا تو تم بھلا کیا کر سکتی تھیں..... اور سچ پوچھو تو پہلے بھی وقار ہی کی طرف سے ہوئی تھی۔“

”پھر بھی..... ہم تم دونوں کے شکر گزار ہیں۔“ عثمان علی نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں ابا جان؟“ شائلہ بیگم نے جلدی سے کہا۔ ”کیا پیٹ کی اولاد سے بھو شکر یہ ادا کیا جاتا ہے؟“

”لڑکیاں پرایا دھن ہوتی ہیں بیٹی! عثمان علی پہلو بدل کر بولے۔ ”رخصتی کے بعد والدین حق نہیں رہتا۔“

”کیا تم تنہا آئی ہو؟“ فرزانہ بیگم نے چوکتے ہوئے پوچھا۔ ”فرحان ہی کو ساتھ لے آئیں۔“

”ڈرائیور ہے ساتھ..... میں نے کسی کو ساتھ لانا مناسب نہیں سمجھا۔“

”کیا مطلب.....؟“

”مجھے اندازہ تھا کہ آپا جان کی واپسی کی اچانک خبر آپ دونوں کو جذباتی کر دے گی۔ اور میں نہیں چاہتی کہ بچوں کو اس حادثے کا غم ہو جو ایک منحوس طوفان کی طرح ہمارے سروں سے گزر چکا ہے۔“

”تم نے واقعی ذرا اندیشی سے کام لیا۔“

”اور سناؤ..... تمہارے بچوں کا کیا حال ہے؟“ عثمان علی نے بات کا رخ بدلتے ہوئے دریافت کیا۔ ”آج کل تو سب امتحان کی تیاریوں میں مصروف ہوں گے۔“

”جی ہاں..... ثنا اور نادیہ کے امتحان تو سر پر کھڑے ہیں اس لئے اُن دونوں کو ہوش ہی نہیں رہتا۔ البتہ صائمہ کے امتحان میں کچھ وقت باقی ہے۔“

”فرحان کا کیا رہا..... اُس کا نتیجہ تو آگیا ہوگا؟“

”اے میں پوچھتی ہوں کیا بالکل ہی سٹھیا گئے؟“ فرزانہ بیگم نے مسکرا کر شوہر کو گھورا۔ ”ابھی تین روز پہلے ہی تو شائلہ نے فون پر بیٹے کی شاندار کامیابی کی اطلاع دی تھی۔“

”اور میں نے غالباً اپنے ذہن نو اسے کو کوئی نہایت قیمتی اور مناسب انعام دینے کا فیصلہ بھی کیا تھا۔“

”خدا کا شکر ہے..... آپ کو یاد تو آیا۔“

”اب یاد آگیا ہے تو پھر آج رات ہی فرحان کا تحفہ اُسے مل جانا چاہئے۔“

”تحفے کی کیا ضرورت ہے ابا جان؟ بچوں کے لئے تو آپ کی ہر غلطی دُعا میں ہی سب سے بڑا انعام ہیں۔“ شائلہ بیگم نے کہا پھر اُٹھتے ہوئے بولیں۔ ”میں اب چلتی ہوں..... بچوں کو یہ بتا کر نہیں آئی تھی کہ کہاں جا رہی ہوں ورنہ فرحان اور صائمہ تو ضرور پیچھے لگ جاتے۔“

”جاؤ بیٹی..... خدا تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔“ عثمان علی نے بیٹی کے سر پر نہایت شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”اور ہاں..... فرحان بیٹے کو ضرور بتا دینا کہ ہم آج ہی اُس کا تحفہ لے کر آ رہے ہیں۔“

شائلہ بیگم نے ماں باپ کو سلام کیا پھر واپس چلی گئیں اور اُن کے جانے کے بعد عثمان علی اور فرزانہ بیگم نے شبانہ کے بارے میں باہمی صلاح و مشورے شروع کر دیئے.....!!

○○○

ثنا اور نادیہ اس وقت پڑھائی میں حد درجہ مصروف تھیں جب دروازے پر دستک ہوئی۔ نادیہ نے کتاب سے نظر اٹھا کر گھڑی کی سمت دیکھا، رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے، ایک ہی کروٹ بیٹھے بیٹھے اُس کا انگ انگ دکھنے لگا تھا، وہ کمر سیدھی کر کے ایک طویل انگڑائی لینے میں مصروف تھی کہ دروازے پر دوسری بار دستک کی آواز ابھری۔

”اس وقت کون ہو سکتا ہے؟“ ثنا نے پوچھا۔

”سردیوں کی رات میں اس وقت شیطان ہی آزاد پھر رہا ہوگا۔“ نادیہ نے برا سامنے بنا کر جواب دیا۔ ”فرحان کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے؟“

”دیکھو تو سہی..... ممکن ہے اُسے کوئی ضروری کام ہو.....“

”کوئی نئی شرارت سوچھی ہوگی۔“ نادیہ اُٹھتے ہوئے بولی۔ ”ایمان سے آئی! اس وقت اگر فرحان نے تنگ کرنے کی حماقت کی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا، امی اور ابو کے پیار نے کچھ زیادہ ہی سر

ڈیبا نے اُس کی توجہ اپنی سمت مبذول کر لی..... ایسی بے شمار ڈبیاں اور پیکٹ پہلے بھی سینکڑوں مرتبہ دیکھ چکی تھی جو سونے کے چھوٹے موٹے زیورات رکھنے کے کام آتی ہیں..... لیکن وہ ڈیبا اُس کی الماری میں سلیقے سے رکھے ہوئے پٹروں کے درمیان کہاں سے آگئی؟ چند لمحے وہ نگاہیں باندھے اُسے غور سے دیکھتی رہی..... یوں، جیسے وہ کوئی عجوبہ رہا ہو، جانے کیا بات تھی کہ وہ اُس پر سے توجہ نہ ہٹا سکی۔ خاموش کھڑی سوچتی رہی کہ وہ سرخ مٹی ڈیبا کس کی ہو سکتی ہے..... اُس کے کمرے میں کب اور کیسے آگئی..... پھر اُسے یاد آیا کہ احمر نے اپنے خفے اُسی کے ذریعے الماری میں رکھوائے تھے جسے وہ سب کو اچانک دے کر چونکا نا چاہتے تھے..... لیکن وہ ڈیبا..... ثنا کو اچھی طرح یاد تھا کہ ان تحفوں میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔

احمر کا خیال ذہن میں ابھرتا تو جانے کیوں وہ اندر ہی اندر شرما گئی۔ پھر اُس نے دھڑکتے ہوئے دل سے ہاتھ بڑھا کر ڈیبا کو کھولا تو دھک سے رہ گئی..... اُس کے اندر نہایت اعلیٰ قسم کے تراشیدہ ہیرے کی ایک نازک سی انگوٹھی پوری آب و تاب سے چمک رہی تھی۔ اوپر کے ڈھکنے کے ساتھ ایک پرچہ چھپسا ہوا تھا۔ ثنا نے دل کی دھڑکنوں کو سینٹے ہوئے پرچے کو نکال کر کھولا..... احمر کی ایک مختصر سی تحریر تھی..... مختصر لیکن اتنی بڑا اثر کہ اُس کا پورا وجود گنگنا اٹھا.....

”ثنا کے لئے..... ثنا خواں کی طرف سے..... ایک حقیر سا تحفہ۔“

اور اس مختصر سے پیغام کو پڑھ کر وہ شرم سے پانی پانی ہو گئی..... سردی کی شدت کا احساس جاتا رہا۔ رگ دپے میں ایک عجیب سی لہر دوڑ گئی، اُسے احمر کی باتیں یاد آنے لگیں..... انہوں نے سب کے سامنے کس قدر سنجیدگی اور سادگی سے کہا تھا کہ وہ اُس کے لئے تحفہ لانا بھول گئے تھے..... شاید وہ سب کے سامنے انگوٹھی کا وہ قیمتی تحفہ اُسے نہیں پیش کرنا چاہتے تھے۔

مگر کیوں..... آخر ایسی چوری کی کیا بات تھی؟..... کیا احمر کا خیال تھا کہ وہ اس خفے کو قبول کرنے سے انکار کر دے گی؟..... کیا ایسا ممکن تھا.....؟؟

کتنے دنوں تک وہ دل ہی دل میں احمر کے بارے میں ایک تحفہ نہ لانے کے سلسلے میں کسی کسی عجیب باتیں سوچتی رہی تھی، جانے کتنے شکوے اور گلے اُس کے معصوم ذہن میں ابھرتے رہے تھے..... اُسے احمر سے اس بات کی شکایت نہیں تھی کہ وہ تحفہ لانا کیوں بھول گئے بلکہ اس بات کا ملال تھا کہ..... اُسے فراموش کیوں کیا گیا.....؟؟

کیسی معصوم شکایت تھی..... کیسا پاکیزہ جذبہ تھا..... اور کس قدر انایت تھی اس چھوٹی سی شکایت میں..... اُسے فراموش کیوں کیا گیا.....؟؟

لیکن آج انگوٹھی کا وہ تحفہ پاکر اُس کے سارے شکوے، تمام شکایتیں ایک دم رفع ہو گئیں..... ایک عجیب سا احساس اُس کی معصوم اور پاکیزہ سوچوں کو گدگدانے لگا..... وہ خود اپنے وجود میں کئی چلی جاری تھی.....

اُس کے ذہن میں بار بار احمر کی مختصر تحریر صدائے بازگشت بن کر گونج رہی تھی.....

”ثنا کے لئے..... ثنا خواں کی طرف سے..... ایک حقیر سا تحفہ۔“

کتنی وسعت..... کس قدر گہرائی تھی اس جملے میں کہ وہ ڈوبتی چلی گئی.....

پھر سننے خیال نے ابھر کر اُسے سہا دیا۔ ”اگر کسی کو احمر کے خفے کی بھینک مل گئی تو وہ کیا سوچے گا..... کیا معنی پہناتے گا اس پیغام کو جو خفے کے ساتھ دیا گیا تھا..... کیا کہیں گے گھر والے.....؟؟“

چڑھا رکھا ہے۔“

”ہم سب کا لاڈ لا بھی تو ہے۔“ ثنا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

نادیہ نے دروازہ کھولا تو چلی سی ہو گئی۔

”آپ ای جان.....؟“ اُس نے ماں کو دیکھ کر تعجب کا اظہار کیا۔

”پانی پیئے اُٹھی تھی..... تمہارے کمرے کی نئی روشن دیکھی تو ادھر چلی آئی۔“ ثنا ملکہ بیگم نے بیا سے کہا۔ ”خدا تم دونوں کو تمہاری محنت کا ثمر دے اور اچھے نمبروں سے کامیاب کرے۔“

”آمین.....“ نادیہ بولی۔ ”آپ کی دُعائیں شامل حال رہیں تو ضرور کامیابی نصیب ہوگی۔“

”ای جان..... آج کتنی تیز اور سرد ہوا چل رہی ہے اور آپ نے شامل بھی نہیں اوڑھ رکھی۔“

”ماں کو دیکھا تو اُنھ کو وہ بھی تیزی سے قریب آگئی۔

”اور کتنی دیر پڑھنے کا ارادہ ہے؟“ ثنا ملکہ بیگم نے پیار سے ثنا کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

”بس آدھا گھنٹہ اور.....“

”جائے کی خواہش ہو رہی ہو تو بنا دوں؟“

”کیوں شرمندہ کرتی ہیں امی.....“ ثنا جلدی سے بولی۔ ”اڈل تو ایسی خواہش نہیں ہو رہی۔ او اگر ہوئی تو ہم خود بنا لیں گے۔“

”آپ تو بس یہ دُعا کیجئے ہمارے حق میں کہ خدا ہمیں شیطان کے شر سے محفوظ رکھے۔“ نادیہ نے سنجیدگی سے کہا تو ثنا ملکہ بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

”میں بھی نہیں تمہارا مطلب.....؟“

”میرا اشارہ فرحان کی طرف تھا.....“ نادیہ نے سر کھجاتے ہوئے جواب دیا۔ ”اگر کہیں ہماری پوزیشن بہتر نہ آئی تو وہ ہمارا جینا دو بھر کر دے گا۔“

”ایسی بری فال زبان سے کیوں نکالتی ہو..... خدا نے چاہا تو اس بار تم دونوں بھی شاندار نمبروں سے کامیاب ہوگی۔“

”آپ اندر آ جائیں امی جان..... آج سردی کچھ زیادہ ہی ہے۔“

”نہیں بیٹی..... تم دونوں پڑھو! میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔“

ثنا ملکہ بیگم اُلٹے قدموں واپس لوٹ گئیں تو نادیہ نے دوبارہ اندر سے دروازے کی چٹنی لگالی، پھر ایک طویل جہا ہی لیتے ہوئے بولی۔ ”آپی..... تمہارا کیا ارادہ ہے.....؟“

”کیوں..... تم پر یہ کاہلی کیوں سوار ہو رہی ہے؟“ ثنا نے بہن کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”بہت سخت نیند آ رہی ہے..... سردی بھی زیادہ ہے اس لئے میں تو اب لحاف میں گھس کر آرام سے سوؤں گی۔ خدا حافظ۔“ نادیہ نے سردی دور کرنے کی خاطر دونوں ہاتھ تیزی سے ملتے ہوئے کہا

پھر تیز تیز قدم اٹھاتی اپنے بستر کے قریب گئی اور جلدی سے لحاف میں دھک گئی۔

ثنا نے پیار سے بہن کی حرکت کو دیکھا پھر مسکراتے ہوئے میز پر آگئی جہاں کتابوں کا جم غفیر نظر آ رہا تھا۔ جو سبق باقی رہ گیا تھا وہ اُس کو مکمل کرنے بیٹھ گئی۔ دروازہ کھلنے کے سبب سردی کی لہر اندر آ گئی تھی، ثنا کو کچھ دیر بعد سردی کی شدت کا احساس ہوا تو اپنی اُونی شامل نکالنے کی غرض سے الماری کھول کر شامل تلاش کرنے لگی۔ دو چار کپڑے ہی اُلٹے پلٹے تھے کہ محفل کی سرخ رنگ کی ایک چھوٹی سی

شانے تیزی سے لیٹ کر نادیہ کی طرف دیکھا..... وہ دوسری کروٹ لئے خواب خرگوش میں تھی، جلدی سے اُس نے اٹوٹھی کو احرکی تحریر سمیت الماری کے ایک محفوظ دراز میں بند کر کے اطمینان کا سانس لیا..... چھوٹے چھوٹے قدم اٹھائی اپنے بستر کے قریب گئی اور آہستہ سے لیٹ کر بیڈ سوچ دیا تو روشن کمرہ یکنخت تاریکی میں ڈوب گیا۔
رسمت گھپ اندھیرا پھیل گیا.....
لیکن.....

ان اندھیروں کے باوجود ایک روشن چہرہ اُس کے ذہن پر طلوع ہوتے سورج کی طرح ابھر رہا تھا..... اور..... وہ لحاف میں منہ چھپائے اپنے دل کی دھڑکنوں کو سمیٹنے کی کوشش کر رہی تھی!!

○○○

وقار احمد نے گھر میں داخل ہوتے ہی پہلا سوال نادیہ اور شاکے پر چوں کے بارے میں کیا۔
”خدا کا شکر ہے کہ دونوں کے پرچے اچھے ہوئے ہیں۔“ شائلہ بیگم نے کہا۔ ”البتہ تازہ زیادہ خوش لگ رہی ہے۔“

”کہاں ہیں میری بیٹیاں؟“ وقار احمد نے کوٹ اُتارتے ہوئے پوچھا۔
”گھر میں گھستے ہوئے سب سے پہلے بیٹیوں اور بیٹے کی خیریت دریافت کی جاتی ہے کبھی ہمارا احوال بھی بھولے سے دریافت کر لیا کیجئے۔“

”خیریت تو ہے.....؟“ وقار احمد پریشان سے ہو گئے، بیوی کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔ ”کیسی طبیعت ہے آپ کی؟“

”اب ایسی بھی کوئی بات نہیں جو آپ پریشان ہونے بیٹھ جائیں.....“ شائلہ بیگم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”پہلے آپ اپنے بچوں سے بات کر لیں، پھر میں بھی آپ کو ایک خوشخبری سناؤں گی۔“

”خوشخبری..... اور اس عمر میں؟“ وقار احمد نے بیوی کو چھیڑتے ہوئے کہا۔ ”کہیں میرے کان تو نہیں بک رہے؟“

”بل اس کے شائلہ بیگم کوئی جواب دیتیں سب سے پہلے فرحان کمرے میں داخل ہوا اور اُس کے پیچھے پیچھے تینوں لڑکیاں آئیں۔ یہ اُن سب کا روزمرہ کا معمول تھا، وقار احمد جب تک گھر آتے ہی بچوں کی خیریت نہ دریافت کر لیتے انہیں چین نہ آتا۔ شائلہ بیگم بچوں کے آنے کے بعد چائے کے اہتمام کی غرض سے باہر چلی گئیں تو وقار احمد نے سب سے پہلے شاکے سے پوچھا۔
”ہماری بیٹی کا آج کا پرچہ کیسا ہوا؟“

”آپ کی دعاؤں کی بدولت بے حد شاندار.....“ شاکے مسرت بھرے لہجے میں جواب دیا۔
”اور تمہارا حساب کتاب کیسا رہا؟“ وقار احمد نے نادیہ سے دریافت کیا۔

”ایک سوال کا آدھا حصہ غلط ہو گیا، باقی پورا پرچہ فرسٹ کلاس ہوا۔“
”چلو، کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ وقار احمد بیٹی کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے بولے۔ ”آدھے پونے

سوال کے غلط ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا..... امتحانات میں تو اس قسم کی اوجھڑچ ہوئی رہتی ہے۔“
”وہ تو ٹھیک ہے، لیکن متحین تھوڑے بہت نمبر تو ضرور کاٹ لے گا۔“ فرحان نے ننکھٹیوں سے نادیہ کو دیکھتے ہوئے بڑی معصومیت سے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

”سن رہے ہیں ابو آپ اس کی باتیں؟“ نادیہ سنجیدہ ہو گئی۔ ”جب سے میں نے امی کو پرچے کے متعلق بتایا ہے یہی کہے جا رہا ہے کہ سخن نمبر کاٹ لے گا اور میری فرسٹ ڈویژن ماری جائے گی۔“
”میری بات ہے فرحان..... ایسی باتیں مذاق میں بھی نہیں کہتے۔“ وقار احمد نے فرحان کو دیکھتے دئے کہا تو نادیہ نے بھی بھائی کو اٹوٹھا دکھاتے ہوئے منہ چڑھا کر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ فرحان نے ہن کو ایسی نظروں سے گھورا جیسے یہ باور کرانے کی کوشش کر رہا ہو کہ ابا جان کو جانے دو پھر بتاؤں گا۔
”تم سناؤ صائمہ بیٹی! تمہارے پرچے کیسے ہو رہے ہیں؟“

”ابھی تو صرف ایک پرچہ ہوا ہے.....“ صائمہ بولی۔ ”دوسرا پرچہ کل ہو گا۔“
”تیار تو کر لی ہے.....“

”آپ مطمئن رہیں ابو..... میں فرحان سے زیادہ اچھے نمبروں سے کامیاب ہوں گی۔“
”انشاء اللہ۔“ وقار احمد نے مسکراتے ہوئے دعا دی۔ ”خدا تمہیں تمہارے ارادے میں کامیاب کرے۔“

”اور میرے نقش قدم پر آگے بڑھنے کی توفیق عطا فرمائے۔“ فرحان نے کچھ ایسی سادگی اور سنجی سے کہا کہ وقار احمد کے علاوہ شاکہ اور نادیہ بھی اپنی ہنسی پر قابو نہ پا سکیں، لیکن صائمہ تنگ کر بولی۔
”اپنے من میاں مٹھو بننا ایسے ہی موقعوں کے لئے کہا گیا ہے۔“

”میں نے بھی یہی سنا ہے کہ چچی بات اکثر لڑوی لگتی ہے۔“ فرحان نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔
”اب کے امتحان کے موقع پر مجھ سے پڑھنے کی خوشامد کرنا..... پھر بتاؤں گی کہ چچی بات کیسی روی کیلی ہوتی ہے۔“

”ایک محاورہ میں نے بھی اپنی کتاب میں پڑھا تھا۔“ فرحان نے باپ کی نظریں بچا کر صائمہ کو ان دکھاتے ہوئے بڑی معصومیت سے کہا۔ ”کھسیانی ملی کھانا نوچے.....“
شائلہ بیگم نے کمرے میں داخل ہو کر چائے تیار ہونے کا مژدہ سنایا تو سب لوگ اٹھ کر ڈائننگ روم میں آ گئے۔ صائمہ نے مجبوراً صرف فرحان کو غصہ سے گھورنے پر اکتفا کی۔

چائے کے دوران بھی سب بھائی بہنوں کے درمیان اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔ وقار احمد کا نہ کا اصول تھا کہ جب بھی جلدی گھر واپسی ہوتی، پہلے وہ بچوں کے ساتھ ہنس بول کر دن بھر کی تکان رکتے پھر سب کے ساتھ چائے پینے کے بعد ہی لباس تبدیل کرتے۔ فرحان چونکہ اکلوتا بیٹا تھا اس نے وقار احمد اُس سے بہت زیادہ لاڈ کرتے تھے اور شاید اسی کا نتیجہ تھا کہ فرحان باپ کی موجودگی میں اپنی بذلہ سخی اور ظرافت سے باز نہ آتا اور نہایت ذہانت سے سب پر فقرے چست کرتا رہتا، نمہ سے تو خاص طور سے اُس کی ہر وقت تحفہ رہتی لیکن صرف باتوں کی حد تک ورنہ وہ صائمہ سے بے زیادہ پیار کرتا تھا..... شاید اس لئے کہ امتحان کے موقعوں پر اُسے ہمیشہ صائمہ ہی کی ضرورت مآئی۔

چائے کے بعد سب لوگ اپنے اپنے کام میں مصروف ہو گئے، وقار احمد لباس تبدیل کرنے کی ساسے اپنے کمرے میں آئے تو شائلہ بیگم بھی ساتھ ساتھ تھیں۔
”اب سنا ہے وہ کون سی خوشخبری تھی جو آپ مجھے سنانا چاہ رہی تھیں؟“ وقار احمد نے لباس تبدیل

کرنے کے بعد اطمینان سے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
”آج ابا جان کا تفصیلی خط آیا ہے۔“

لگے۔

”آپ اس طرح مجھے کیا دیکھ رہے ہیں؟“
 ”آپ کے جذبات اور احساسات کو پڑھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“
 ”کیا مطلب.....؟“

”مطلب یہ کہ آپ جلد بازی میں کہیں کسی خوش فہمی کا شکار نہ ہو جائیے گا..... منظور کو آ لینے دیجئے، پھر جیسا ہوگا دیکھ لیا جائے گا۔“

”یہ آپ نے کیسے اندازہ لگا لیا کہ میرے دل میں کیا ہے۔“ شائلہ بیگم نے قدرے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”آپا کوئی غیر تو نہیں کہ یوں ڈھکے چھپے الفاظ میں اپنے عہدہ کا اظہار کرتیں..... اگر اُن کا خیال ہماری طرف ہوتا تو وہ کھل کر صاف صاف لکھ سکتی تھیں..... انہوں نے تو یونہی برسبیل تذکرہ ایک بات لکھ دی ہے..... آپ جانے کہاں کی سوچنے لگے۔“

”یہ بات نہیں ہے بیگم.....“ وقار احمد نے غری پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ”قدرت کو کیا منظور ہے، یہ اس کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ لیکن ہمیں ایک بات کا ہمیشہ خیال رکھنا ہوگا۔ جب تک لڑکیوں کی تعلیم مکمل نہ ہو جائے اُن کے کانوں میں شادی بیاہ کی باتوں کی بھنگ بھی نہیں پڑنی چاہئے۔“
 ”میں نے بھی یہی سوچ رکھا ہے کہ اس معاملے میں جلد بازی سے کام نہیں لوں گی۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ لڑکیوں کو کسی بات کی بھنگ نہ ملے..... جہاں بیری کے درخت ہوتے ہیں وہاں پھر تو آتے ہی ہیں۔“ شائلہ بیگم نے شوہر کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”ویسے کس کی قسمت میں کیا لکھا ہے یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے..... اگر کوئی اچھا رشتہ آجائے تو لڑکی والے منہ کرنا کرنا بھی تو نہیں کر سکتے۔“
 ”کیوں نہیں کر سکتے..... کیا ہم نے کسی کا قرض کھا رکھا ہے؟“
 ”آپ مرد ہیں..... ان باتوں کو نہیں سمجھیں گے۔“
 ”لیکن.....“

”ایسے معاملات میں جذبات سے نہیں دل و دماغ سے کام لیا جاتا ہے..... یوں بھی لڑکی والوں کا معاملہ لڑکے والوں کے مقابلے میں زیادہ نازک ہوتا ہے، زمانے کی اوج بچ اور مصلحتوں کا خیال ہی رکھنا ہوتا ہے.....“

”آپ بجا ارشاد فرما رہی ہیں۔ لیکن قبل از وقت لڑکیوں کو چولہے ہانڈی میں جھونک دینا بڑے نزدیک نظر بند کیے کے منافی ہے۔“

”اپنی مثال بھی ذرا یاد کیجئے.....“ شائلہ بیگم نے کہا۔ ”کتنی جلدی بڑی تھی شادی کی..... مجھے اسے بھی نہ کرنے دیا اور خد کر کے زخمت کرا لیا۔ اُس وقت میری عمر کیا تھی.....؟“

”وہ اور بات تھی.....“
 ”اسی لئے تو کہتے ہیں کہ مرد ہمیشہ اپنے فائدے کی سوچتا ہے..... اپنا معاملہ تھا تو کتنی آسانی سے کہہ دیا کہ وہ اور بات تھی۔ لڑکیوں کا معاملہ آیا تو مونچھوں پر تاؤ دے کر باپ بن گئے..... کیا ماں کو لاد کی زندگی اور اُس کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہوتا؟“

”یہ میں نے کب کہا کہ آپ کو کوئی حق نہیں۔“ وقار احمد نے بیوی کے جذبات کو بھانپتے ہوئے مدی سے کہا۔ ”جب آپ کو بچوں کے باپ پر پورا پورا اختیار ہے تو بچوں پر بھی ہے..... میں نے تو اپنے دل کی بات کہی تھی۔“

”اچھا..... کیا لکھا ہے ہماری بڑی سالی نے..... کب تک واپس آ رہی ہیں؟“
 ”میرا تو خیال ہے کہ آپا اور ذلہا بھائی کو صرف آپ کی طرف سے مکان خالی ہو جانے کی اطلاع کا انتظار ہے ورنہ انہوں نے تمام تیاری مکمل کر رکھی ہے۔“
 ”آپ کے کہنے پر یاد آیا کہ میں نے دو روز قبل ایک بار پھر حشمت اللہ صاحب سے دہلی زبان میں اصرار کیا تھا کہ وہ جتنی جلدی مکان خالی کر دیں اتنی ہی مہربانی ہوگی۔“
 ”پھر..... کیا جواب دیا انہوں نے؟“

”نہایت بھلے اور نیک لوگ ہیں..... حشمت صاحب نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ اس مہینے کے آخر تک ضرر بہ ضرر مکان خالی کر دیں گے، غالباً انہوں نے دوسرے مکان کا بندوبست بھی کر لیا ہے۔“

”یہ تو بڑی اہم خبر تھی..... آپ دو روز بعد سنا رہے ہیں۔“ شائلہ بیگم نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ ”اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ایک ہفتے بعد جمال بھائی کا بنگلہ خالی ہو جائے گا۔“
 ”میں نے ایک ٹھیکیدار سے بنگلے میں رنگ و روغن اور ضروری مرمت کرانے کی بات بھی کر لی ہے۔ خدا نے چاہا تو یہ کام بھی ہفتہ بھر میں پٹ جائے گا۔“

”کیا جمال بھائی نے کہا تھا ان کاموں کے لئے.....؟“
 ”آپ بھی کمال کرتی ہیں بیگم..... بھلا یہ باتیں بھی کہنے کی ہوتی ہیں؟“ وقار احمد نے کہا پھر مسکرا کر بولے۔ ”ایک تو مکان کی صفائی یوں بھی ضروری تھی اور پھر آپ یہ کیوں بھول جاتی ہیں یہ میرا اور میری سالی کا انتہائی نجی اور ذاتی معاملہ ہے۔“

”آپا جان نے بچوں کے علاوہ آپ کو بھی بہت بہت دُعائیں لکھی ہیں۔“
 ”صرف دُعائیں..... پیار کے سلسلے میں کوئی ذکر نہیں کیا؟“
 ”آپ کی یہی شوخیاں اور شرارتیں تو فرحان میں آتی ہیں..... ہر بات کا جواب تو زبان کی نوک پر دھرا رہتا ہے۔“

”خدا کا شکر ہے، آپ نے میری کسی بات کو سراہنے کی کوشش تو کی، ورنہ من آئم کہ من دائم۔“
 ”رہنے دیجئے یہ انکساری.....“ شائلہ بیگم نے مسکراتے ہوئے شوخی سے کہا۔ ”آپ کی ذہانت کی تو میں روزِ اوّل سے قائل ہوں۔“

”تسلیمات عرض کرتا ہوں.....“ وقار احمد نے جھک کر سلام کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”مجھے احساس تھا کہ آپ اس بیچ مقدار پر شروع ہی سے ایمان لے آئی ہیں لیکن آج یہ بات آپ کی زبان سے سن کر زیادہ مسرت ہوئی۔“

”آپا جان نے ایک ذمہ داری اور بھی ہمیں سونپی ہے۔“
 ”وہ کیا.....؟“

”منصور کے لئے کوئی اچھا سا رشتہ.....“
 ”کیا مطلب..... کیا جمال بھائی کا ارادہ منظور کو آگے بڑھانے کا نہیں ہے؟“
 ”یہ تفصیل تو اُن لوگوں کے آنے کے بعد ہی معلوم ہوگی..... بہر حال آپا نے لکھا ہے کہ مناسب رشتہ دھیان میں رکھو۔“

وقار احمد نے اس بات کا فوری کوئی جواب نہیں دیا، بیوی کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھنے

”آپا جان نے یہ بھی لکھا ہے کہ جمال بھائی یہاں آکر کوئی کاروبار کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں البتہ منصور کے سلسلے میں انہوں نے کوئی ملازمت طے کر رکھی ہے۔“

”آپ فکر مند نہ ہوں..... مجھ سے جو کچھ ہو سکے گا اُس سے دریغ نہیں کروں گا۔“

”میں ایک اور بات بھی آپ کے گوش گزار کرنا چاہتی ہوں۔“

”فرمائیے..... بندہ ہمہ تن گوش ہے۔“

”شانے بڑی سنجیدگی سے ڈاکٹری کرنے کا فیصلہ کر رکھا ہے۔“

”یہ تو انتہائی خوشی اور مسرت کی بات ہے۔“

”وہ تو ہے لیکن ڈاکٹری کرنے میں تو پانچ چھ سال صرف ہوتے ہیں۔“

”بالکل درست سنا ہے آپ نے..... لیکن آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟“ وقار احمد نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”اس وقت وہ خدارکھے اٹھارویں سال میں لگی ہے..... ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کرتے کرتے

تیس چوبیس کی ہو جائے گی۔“

”پھر..... اس میں اتنی پریشانی اور تشویش کی کیا بات ہے؟“

”آپ کو اس ذمہ داری کا احساس بھی ہے جو خدا نے ہمیں سونپ رکھی ہے؟“

”میں آپ کا مقصد سمجھ رہا ہوں، لیکن کیا مجھے اپنی شنا کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا کوئی اختیار نہیں؟“

”کیوں نہیں..... لیکن اگر شانے ڈاکٹری کے بعد شادی کا ارادہ کیا تو ہمیں اسی مناسبت سے

نادیہ اور صائمہ کے لئے بھی انتظار کرنا پڑے گا۔“

”تو کر لیں گے انتظار.....“ وقار احمد نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”لڑکیاں پر ایسا دھن ضرور ہیں لیکن

ماں باپ کے لئے بوجھ تو نہیں ہوتیں۔“

”آپ لوگوں کے قول و فعل کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔“ شامکد بیگم نے قدرے جھلا کر جواب دیا۔

”ذرا میں بھی تو سنوں کہ ایسی کون سی بات ہے جس نے آپ کو ہم بیچارے مردوں کو بیک جنبش

زباں بے اعتبار سمجھنے پر مجبور کر دیا ہے؟“

”ابھی کچھ دنوں پہلے ہی کی بات ہے..... اپنے بچتے کے گن کون گارہا تھا؟“

”وہ تو میں اُس کی شرافت، سعادت مندی اور نیک چلتی کی تعریف کر رہا تھا، آپ کیا سمجھ بیٹھیں؟“

”بس رہنے دیجئے.....“ شامکد بیگم نے شوہر کو کوئی کامٹے دکھ کر ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ”میں

آپ لوگوں کی رگ رگ سے واقف ہوں، بیس سال تک آپ کے ساتھ بسر کی ہے..... کوئی بھانڈیں

جھونکا ہے۔“

”ایک بات کہوں..... اگر ناگوار خاطر نہ گزرے۔“

”کہئے..... اب کیا بہانہ تراشنا چاہتے ہیں؟“

”غصے کی حالت میں آپ کے حسن کا نکھار.....“

”میں سمجھ رہی ہوں..... اب آپ مجھے بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ شامکد بیگم نے شوہر کی

آنکھوں میں مچلنے والی شرارت دیکھی تو مسکرا کر بولیں۔ پھر خانساں کو رات کے کھانے کے سلسلے میں

ضروری ہدایات دینے کی غرض سے باہر چلی گئیں۔

○○○

خان بہادر آصف علی کا شجرہ حسب نسب پشتینی نوابوں سے ملتا تھا خود بھی وہ کسی نواب سے کم نہ

تھے۔ زمانے نے جس تیزی سے ترقی کی اور تہذیب و تمدن میں جو انقلاب آیا اس میں اچھے اچھے

خاندانوں نے اپنا چولا اتار کر نیا زیب تن کر لیا۔ خان بہادر آصف علی خان نے بھی وقت کی نزاکت

اور حالات کی سختیں نوعیت کے پیش نظر اپنی شاندار حویلی کو خیر باد کہا اور لاہور میں آکر قیام پذیر ہوئے

وہ بھی دوسروں کی طرح آدم کی اولاد تھے ان میں بھی وقت کے ساتھ ساتھ کچھ تبدیلیاں ضرور آئیں

لیکن خاندانی دبدبہ اور نوابوں کی خوبوا بھی تک ان میں باقی تھی۔

ہندوستان چھوڑتے وقت علاقے کے ہندو ٹھاکروں نے حویلی کی قیمت لگانے میں بڑھ چڑھ کر

حصہ لیا لیکن خان بہادر صاحب نے اپنے آیا و اجداد کی اس نشانی کو فروخت کرنا کسر شان سمجھا چنانچہ

اسے اپنے ایک دیرینہ ملازم کے حوالے کر دیا اور خود بیوی اور بیٹی سمیت لاہور آگئے اور یہاں آکر بھی

جس شان و شوکت سے ایک نئی زندگی کا آغاز کیا اس نے بہت جلد ان کا شمار لاہور کے ان رئیسوں

میں کر دیا جن کے پاس دولت اور جائیداد کی کوئی کمی نہ تھی۔

خان بہادر آصف علی خان اپنے ساتھ نعل مکانی کے وقت جو کثیر رقم نقدی اور زور و جواہر کی

صورت میں لائے تھے وہی ایک طویل عرصے تک ان کے کام آسکتی تھی لیکن انہوں نے سوچا بوجھ سے

کام لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنا کاروبار اتنا پھیلا لیا کہ ملک کے گوشے گوشے میں اُن کا طوطی بولنے

لگا۔ بڑے بڑے شہروں میں ان کی جائیداد میں آئے دن اضافہ ہوتا گیا اور یوں انہوں نے ایک نئی سر

زمین پر بھی اپنے قدم پوری مضبوطی سے جمائے..... لاہور کے سب سے خوبصورت علاقے میں اُن

کی عالی شان وسیع و عریض کوٹھی اور اُس کے دروازے پر سفید پوش چوکیداروں کی موجودگی ہی ان کی

امارت کا منہ بولتا ثبوت تھی۔

ملازموں کی ایک بڑی تعداد خان صاحب بہادر کے ایک شارے کی منتظر رہتی ان کے اہر و پر اہر

کبھی مل پڑ جاتا تو نوکروں میں کھل بلی مچ جاتی بھی وہ کھل کر مسکراتے تو یوں لگتا جیسے کوٹھی کا ذرہ ذرہ

مسکرا رہا ہو۔ غرض یہ کہ خان بہادر صاحب کی پہلو دار شخصیت اور دولت کی ریل پیل نے انہیں امراء

اور کاروباری دونوں طبقوں میں بہت جلد مشہور کر دیا۔

خان بہادر آصف علی خان کی زندگی میں اُن کی بیگم ارجمند بانو کی دور اندیشی کو بھی بڑا دخل تھا۔

شاید اس لئے کہ خان بہادر صاحب نے یہ شادی اپنی پسند سے کی تھی اور اپنا گھر آباد کرنے کے لئے

کچھ بزرگوں کی ناراضگی محض اس لئے مول لی تھی کہ ارجمند بانو کا حلق نہ تو کسی نوابی خاندان سے تھا نہ

نہادہ کی امیر کبیر خاندان کی چشم و چراغ تھیں لیکن وہ بات جس نے ایک نواب زادے کو بزرگوں کی

مرضی کے خلاف قدم اٹھانے پر مجبور کیا..... ارجمند بانو کا وہ لا زوال حسن تھا جس نے عقل و خرد کو اپنے

دام میں بنیر کر لیا۔ پھر یہ عقدہ شادی کے بعد کھلا کہ وہ حسن صورت کے ساتھ ساتھ حسن سیرت میں بھی

باکمال تھیں۔ اُن کی اسی خوبی نے ان لوگوں کے دل بھی موہ لئے جو اس شادی کے خلاف تھے آہستہ

آہستہ ان کے پر تاؤ میں نرمی اور چلک آتی گئی لیکن پیشانی کی وہ شکن جو نوابی رسم و رواج اور خاندانی

وقار کا طرہ امتیاز بھی جاتی تھی جاتے نہ گئی۔

بہر حال ارجمند بانو کی دور اندیشی اور خان بہادر آصف علی خان کی سوچ بوجھ نے مل کر نئے

ملک میں جس نئی زندگی کا آغاز کیا وہ بہت جلد مثالی بن گئی۔ خان بہادر صاحب کو اگر دکھ تھا تو صرف

اتنا کہ قسمت نے انہیں صرف ایک بیٹی عنایت کی تھی بیٹے کی دولت سے نہیں نوازا تھا جو ان کے بعد

خاندان کو آگے بڑھا سکتا لیکن خان بہادر صاحب نے اپنے اس درد کو کبھی کسی پر آشکار نہیں ہونے دیا۔ میرا ان کی اکلوتی بیٹی تھی جس کی پرورش میں ماں کی دوراندیشی اور باپ کی خاندانی شرافت اور سوجھ بوجھ کو دخل حاصل تھا ماں کی طرح میرا بھی بے حد حسین اور خوبصورت تھی اُسے ماں کی طرف سے اگر زندگی کا رکھ رکھاؤ اور قرنیہ ملا تھا تو باپ کی طرف سے تمکنت اور شان و شوکت سے زندگی بسر کرنے کا احساس بھی ورثے میں ملا تھا۔

تعلیم کے میدان میں بھی میرا اپنے کالج میں ہمیشہ دوسروں پر حاوی رہی اور ہم جماعت لڑکے اور لڑکیوں پر سبقت حاصل کرتی رہی جب بھی اس کا نتیجہ نکلتا سرفرازی اور سر بلندی کا احساس بڑھتا جاتا، وہ اپنی ہنجویوں سے ہمیشہ مسکرا کر ملتی، سب سے کھل کر باتیں کرتیں لیکن اس فاصلے کو برقرار رکھتی جو اُس نے روزِ اول سے قائم کر رکھا تھا۔

وہ بڑے باپ کی اکلوتی بیٹی تھی..... امارت کی گود میں پرورش پا کر جوان ہوئی تھی..... خدا نے اس کو زندگی کی تمام دولتوں سے دل کھول کر مالامال کیا تھا..... وہ حسن و قار کا ایک حسین سنگم تھی..... مشرقی اور مغربی تہذیب کا ایسا بے مثل امتزاج کہ جو دیکھتا بس دیکھتا ہی رہ جاتا..... وہ جس باپ کی بیٹی تھی اس نے زندگی میں کوئی بازی ہارنے کا تصور بھی نہیں کیا تھا..... پھر وہ اس روایت کو قدموں تلے کیسے چل دیتی..... باپ کی طرح اس نے بھی زندگی میں ہمیشہ جیتنا سیکھا تھا..... لیکن.....

زندگی کے ایک موڑ پر آ کر اُس کے قدم ڈگمگائے..... اُس نے سنبھلنے کی کوشش کی..... مگر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر خود کو ہار بیٹھی..... اور زندگی کی اس پہلی شکست میں جس لذت کا احساس ملا وہ اس کے لئے سرمایہ حیات تھا۔

میرا نے اپنی ہار تسلیم کر لی..... اس کو ہر مقصود کو حاصل کرنے کی کوشش کر بیٹھی جس نے اس کی زندگی میں ایک بالچل سی پیدا کر دی تھی۔

اس کی تمنائوں کو گدگدا کر بیدار کر دیا..... اس کی آرزوؤں کو مہینے کی ادا سکھا دی..... اسے خود اپنے آپ سے بیگانہ کر دیا..... اتنی جلدی وہ کسی مرد کی نگاہوں کے ظلم میں پھنس کر بے بسی کا شکار ہو جائے گی یہ بات تو میرا نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچی تھی.....

اور حالات نے جب اسے سوچنے پر مجبور کیا تو اس کے اندر سوئی محبت کا سرچشمہ ابل پڑا..... جذبوں میں ایسی طغیانی آئی کہ وہ سنبھل نہ سکی..... ساحل پر پہنچنے کی کوشش کی تو سرکش موجوں نے اس کے قدم اکھاڑ دیے..... اور..... تب اس نے ایک دن ماں سے ڈرتے ڈرتے اپنے دل کا حال کہہ دیا..... ارجمند بانو

نے بیٹی کی آنکھوں میں محبت کی سرخی کی تپش دیکھی تو جان گئیں کہ آج وہ جس خواہش کا اظہار کر رہی ہے وہی ناکامی کی صورت میں سرخی اور بغاوت کا انداز بھی اختیار کر سکتی ہے چنانچہ انہوں نے جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ بیٹی کو کریدنے کی خاطر نہایت شفقت سے پوچھا۔

”کون ہے وہ خوش نصیب جسے ہماری بیٹی نے منتخب کیا ہے؟“

”اس کا نام..... طاہر ہے امی حضور۔“ میرا نے نظریں جھکا کر پاس ادب سے کہا۔ ”میرا ہم جماعت ہے اور.....“

”اور کیا.....؟“

”اس کا تعلیمی ریکارڈ بھی بہت شاندار ہے.....“

اس کے والدین کیا کرتے ہیں.....؟“

”یہ سوال ہمارے درمیان بھی نہیں آیا۔“ وہ معصومیت سے بولی۔

”کیا طاہر کو اس بات کا علم ہے کہ تم کس خاندان کا روشن چراغ ہو.....؟“

”امی حضور..... وہ..... وہ.....“

”کہو بیٹی..... میں تمہاری ماں ہوں اور ماں ہی سب سے بڑی دوست ہوتی ہے۔“ ارجمند بانو نے پیار سے کہا۔ ”تم جو کہنا چاہتی ہو ماں سے کھل کر کہہ ڈالو۔“

”وہ..... وہ..... طاہر مجھے بہت اچھے..... نیک اور شریف لگتے ہیں۔“

”تمہاری تعلیم کا آخری سال ہے..... امتحانات سر پر ہیں دل لگا کر محنت کرو..... میں کسی موقع محل دیکھ کر تمہارے باپ سے تمہاری خواہش کا اظہار کرنے کی کوشش کروں گی.....“

”کیا..... کیا آپ کو یقین ہے کہ ابا جان.....“ وہ اپنا جملہ مکمل نہ کر سکی شرم سے تپ کر گلنار ہو گئی

پھر جانے وہ کیسی جھجک اور کیسی شرم تھی جس نے اسے مہر بلب کر دیا تھا۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

”اگر طاہر کا خاندانی پس منظر مناسب ہو تو ہو سکتا ہے کہ تمہارے باپ رضامند ہو جائیں۔“

”امی حضور.....“ میرا نے ماں کے لب دلچے میں مصلحتوں کے تقاضوں کو محسوس کیا تو دل کڑا کر کے بول اٹھی۔

”طاہر میری پسند ہیں۔“

”نادانی کی بات مت کرو میرا۔“ ارجمند بانو نے بیٹی کو تیز نظروں سے گھورا..... ”جیا اور شرم عورت کا سب سے قیمتی اور اصول گوہر ہوتا ہے۔“

”میں نے خدا خواستہ کوئی بے شرعی یا بے حیائی کا مظاہرہ نہیں کیا۔“ میرا تڑپ اٹھی ”ایسا غلط قدم نہیں اٹھایا جو ہمارے خاندانی وقار کو صیقل پہنچانے کا سبب ہو..... محض ایک خواہش کا اظہار کیا ہے.....“

”ہر تصویر کے دو رخ ہوتے ہیں میری بیٹی..... ارجمند بانو نے بیٹی کی نگاہوں میں پھلنے والے طوفان کی شدتوں کو محسوس کیا تو قدرے سنبھل کر بولیں..... ”ایک پہلو بہت نمایاں روشن اور خوشگوار ہوتا ہے اور دوسرا.....“

”دوسرا بڑا بھیانک اور تاریک ہوتا ہے.....“

”تم نے ٹھیک سمجھا.....“

”مجھے زندگی کا کوئی تجربہ نہ سہی لیکن میں نے کتابوں میں یہی پڑھا ہے کہ اندھیرے ہمیشہ

اجالوں کی دردناک موت کے بعد جنم لیتے ہیں۔“
”سمیرا.....“

”آپ..... آپ ماں ہیں امی حضور مجھے امید ہے کہ آپ اپنی اولاد کی خوشیوں کو رونے کی کوشش نہیں کریں گی..... مجھے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا۔“
”سمیرا..... تم.....“

لیکن اس نے ماں کی پوری بات نہیں سنی تیزی سے گھومی اور لمبے لمبے قدم اٹھاتی اپنے کمرے میں آگئی زندگی میں آج پہلی بار اس نے ماں کے سامنے کسی خواہش کا اظہار بر ملا کیا تھا..... پہلی بار اس نے کسی کے سامنے دست سوال وا کیا تھا پھر جھجھلا کر اگلے قدموں واپس پلٹ آئی..... نہ جانے کیوں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی شے اس کے وجود کے اندر کہیں ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گئی ہو..... جیسے وہ کوئی حسین خواب دیکھ رہی ہو..... خواب..... جو صرف خواب ہوتے ہیں..... ذہن کی سوچوں کی حسین پیداوار..... جن کی تعبیر ہمیشہ الٹی ثابت ہوتی ہے..... اور یہ خواب بڑے نازک اور کمزور ہوتے ہیں..... پانی کے ان ناپائیدار بلبلوں کی طرح جو ہوائے ایک جھونکے سے ٹوٹ جاتے ہیں..... حرف غلط کی طرح ہمیشہ کے لئے مٹ جاتے ہیں.....

سمیرا کے ساتھ بھی یہی ہوا اس کے خواب کا بچ کے سستے کھلونوں کی طرح ٹوٹ کر چکنا چور ہو گئے اور اس کی کرچیاں اس کے وجود کی گہرائیوں میں چھ کر رہ گئیں جس کی کک وہ آج بھی محسوس کرتی تھی۔ اس نے ماں سے جس خواہش کا اظہار کیا تھا وہ ریت کے گھروندوں کے مانند خان بہادر آصف علی خان کے خاندانی جاہ و جلال سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی۔

جب اس کے امتحان کا نتیجہ نکلا تو وہ حسب معمول فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہوئی لیکن جب باپ نے طاہر کے خاندانی پس منظر کی آڑ لے کر اس کی خوشیوں کا گلا گھونٹا تو وہ تڑپ کر رہ گئی۔ مگر اس نے فحاشی نہ کیا اپنے غم کا اظہار نہیں کیا نہ ماں سے اس بات کا شکوہ کیا کہ اس نے اولاد کی آرزوؤں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں اپنی آواز کیوں نہ بلند کی..... نہ باپ سے شکایت کی کہ اس کی محبت کو زور و جواہر کی ترازو میں کیوں ٹولا گیا؟ نہایت خاموشی سے اس نے اپنی قسمت کا حتمی فیصلہ سنا اور زبان سے اُف تک نہ کی..... یہ اور بات ہے کہ وہ کسی خاموش آتش فشاں کی طرح اندر ہی اندر سکتی رہی۔

پھر وقت کی پرواز تیز ہو گئی۔ تعلیم مکمل ہونے کے ایک سال کے اندر ہی اندر اس کی شادی ہوائی فوج کے افسر افتخار سے کر دی گئی۔ افتخار کا خاندانی پس منظر خان بہادر آصف علی خاں کی خواہشات کے عین مطابق تھا۔ انہوں نے سمیرا کی شادی نہایت دھوم دھام سے عالیشان طریقے پر کی، پندرہ دن تک شادی کا جشن پڑا پڑا پھر اُسے پیارے گھر رخصت کر دیا گیا۔ جہیز میں جہاں دنیا کی آسائشوں سے متعلق دنیا جہاں کی چیزیں دی گئیں وہاں ایک شاندار کوٹھی اور ایک بڑا کارخانہ بھی اس کے نام کیا گیا۔

سمیرا نے زندگی کے اس نئے آغاز پر خود کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن حالات نے اُسے سنبھالنے کا موقع نہیں دیا۔ افتخار ہوائی فوج کا افسر تھا اس لئے اُس کی پرواز بھی بہت بلند تھی۔ وہ تمام شوق جنہیں وہ فضول اور بیہودہ سمجھتی تھی افتخار کے لئے وقت کا تقاضہ اور فیشن کے اعتبار سے بہت ضروری تھے۔ اُس نے شوہر کے ساتھ قدم ملا کر زندگی کے انجانے راستوں پر آگے بڑھنے کی بھرپور کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکی، ہر موڑ پر وہ ڈمگ جاتی..... شاید اس لئے کہ وہ راستے اُس کے لئے نئے تھے، اُسے

ان راستوں سے نفرت تھی۔ جس تہذیب کی گود میں اُس نے آنکھیں کھولی تھیں، پرورش پائی تھی، افتخار کی دنیا اُس سے قطعی مختلف تھی۔

افتخار ایک آزاد خیال اور لاپرواہ قسم کا نوجوان تھا، اُس کے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں تھی لیکن فلائنگ کے جنونی شوق نے اُسے ایئر فورس سے منسلک کر دیا، کلبوں اور پارٹیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا اور فرصت کے اوقات میں فضول اور لچر قسم کی کتابوں سے دل بہلانا اُس کا محبوب مشغلہ تھا اور وہ ان سب فضولیات میں اُس کی شرکت ضروری سمجھتا تھا۔

..... بات اگر صرف شوہر کو خوش کرنے کی خاطر زہر کا گھونٹ پینے کی ہوتی تو شاید وہ کسی جیل و جت کے بغیر قبول کر لیتی مگر وہ اپنی ممتا کا گلا گھونٹنے سے قاصر تھی، اُس نے شوہر کو منانے کی خاطر کچھ درمیانی راستے تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن افتخار اپنی ضد پر اڑے رہے اور یوں حالات بہتر ہونے کی بجائے رفتہ رفتہ کشیدہ ہوتے چلے گئے۔

سمیرا عورت تھی..... اپنی حدود سے تجاوز کرنا اُس کے اختیار کی بات نہیں تھی..... وہ افتخار کی محبت کی نشانی کو اپنے وجود میں سمیٹنے آنے والے خوشگوار لمحوں کی امید میں دن گزارتی رہی۔

اُس کے پاس زندگی کے لئے بس ایک ہی بہلاوا تھا..... دوسری طرف افتخار کی پرواز دن بدن بلند ہوتی گئی..... انہوں نے کھلے عام دوسری عورتوں سے ملنا جلنا شروع کر دی۔

یہ ایک مرد کا انتقام تھا جو عورت کی کمزور ذات سے لیا جا رہا تھا..... وہ اندر ہی اندر گھٹتی رہی..... سکتی رہی..... سکتی رہی..... اُس نے کسی کو شریک غم نہیں کیا۔

دن بھر ہونٹوں پر مصنوعی تبسم سجائے دنیا والوں کو اپنی کامیاب زندگی کا یقین دلانی رہی..... رات آتی تو کسی ظلمت گدے میں روشن چراغ کی لو کی طرح کپکپانے لگتی۔ حالات کو بہتر بنانے کی خاطر..... شوہر کو راہ راست پر لانے کے لئے اُس نے تمام جتن کر ڈالے لیکن بد نصیبی اُس کا مقدر بن چکی تھی..... پھر ایک روز اچانک وہ رشتہ بھی ٹوٹ گیا جس نے اُس کی معصوم اور نشہ خواہشات کو سہارا دے رکھا تھا..... اُسے ایئر بیس (AIR BASE) سے ایک دلخراش اطلاع موصول ہوئی.....

”افتخار ایئر کرپش میں جاں بحق ہو گئے.....“

وہ افتخار کی موت کی خبر پا کر گنگ رہ گئی، سکتے کی کیفیت سے دوچار تعزیت کرنے والوں کی باتیں سن رہی، بیوی کے احساس نے جیسے اُس کی زندگی کی تمام خوشیاں..... ہونٹوں کی تمام مسکرائیں..... جھین لی ہوں۔ بس ایک احساس تھا جو زندگی کو برقرار رکھنے کی خاطر اُس کا آخری سہارا تھا..... مرحوم شوہر کے ساتھ گزارے ہوئے خوشگوار لمحوں کی وہ آخری نشانی جو اُس کی کوکھ میں پروان چڑھ رہی تھی۔

خان بہادر آصف علی خاں نے داماد کی موت کے بعد بیٹی کو اپنے گھر لانا چاہا لیکن سمیرا نے انکار کر دیا۔ وہ اُس دہلیز کو چھوڑنے پر خود کو آمادہ نہ کر سکی جہاں وہ ایک روز ڈھن بن کر آئی تھی..... اُس دہلیز سے تو زندگی کی نہ جانے کتنی بچ اور خوشگوار یادیں وابستہ تھیں..... اسی دہلیز کو عبور کرنے کے بعد وہ ممتا کے جذبوں سے روشناس ہوئی تھی..... پھر ان جذبوں کو کیسے روند سکتی تھی؟

وقت کا مہم سمیرا کے زہن کو منہل کرتا رہا، اُس نے راجیل کو جنم دیا، پوری توجہ اور لگن سے اُس کی پرورش کرتی رہی، گھریلو ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ اُس نے کارخانے کے کام کاج میں بھی دلچسپی لی..... شروع کر دی، خود کو مصروف رکھ کر وہ ماضی کی سچ یادوں کے رستے ناسوروں کو تھپک تھپک کر سلا دینا

چاہتی تھی اور اسی کوشش میں اُس نے جوانی کے انیس قیمتی سال گزار دیئے۔ راجیل اُس کی زندگی واحد سہارا تھا، اس سہارے کو قائم رکھنے میں، اُس کی پرورش میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا۔ راجیل اپنے مرحوم باپ کی جیتی جاگتی تصویر تھا۔ میٹرک تک وہ بڑی ذہانت اور لگن سے تعلیم مدارج طے کرتا رہا، ایف اے کا پہلا سال بھی بختیر گزار گیا لیکن فائل ایئر میں جب وہ پہلی بار فٹ ہوا تو سمیرا کو احساس ہوا کہ اُس نے کالج میں جانے کے بعد سے راجیل کو جو ذہیل دے رکھی تھی اُس کے حق میں نامناسب تھی۔ حالات کے پیش نظر اُس نے راجیل کو سرزنش کرنے کی خاطر اپنے توجہ بدلنے کی کوشش کی لیکن اُسے پھر مایوسی ہوئی۔ دوسرے سال بھی وہ فیل ہو گیا۔ سمیرا نے اپنی پور توجہ اولاد کو سنوارنے میں صرف کر دی مگر جب تیسری بار بھی نتیجہ صفر نکلا تو اُس نے راجیل پر سختی سرزنش کرنی چھوڑ دی۔ اُسے پیار و محبت سے سمجھانے کی کوشش کی، روشن مستقبل کے حسین خواب دکھانے کی جدوجہد کی۔ لیکن راجیل ان باتوں کو ایک کان سے سنتا اور دوسرے سے اُڑا دیتا۔

دولت کی ریل پھل اور امارت کے احساس نے اُسے بے حد آزاد خیال اور بے پرواہ بنا دیا۔ جہاں زندگی کی تمام آسائشیں ایک جنش زبان پر میسر آجائیں وہاں مستقبل کو بنانے اور سنوارنے تصور کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ کچھ یہی حال راجیل کا بھی تھا، وہ ایک سے ایک اعلیٰ اور قیمتی لباس پہن شوقین تھا، کالج آنے کے لئے اُس کے پاس اپنی سپورٹس کار تھی، دوستوں کو مرحوب کرنے خاطر اُس کی جیبیں ہمیشہ روپوں سے بھری رہتیں، نت نئے فیشن کرنا اور دوسروں کے سامنے اُلٹی سڈ ڈنگیں مارنا اُس کی عادت بنتی چلی گئی۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہ بے داغ کردار کا ما تھا۔ خوشامد پسند طبیعت اور بڑائی کے احساس نے اُسے ہر محفل میں خود کو سرفراز ظاہر کرنے کی ڈال دی تھی لیکن ابھی تک اُس کے قدم ان راستوں کی جانب نہیں اٹھے تھے جو انسان کو بتایا بربادی سے ہٹکانا کر دیتے ہیں۔

خان بہادر آصف علی نے نواسے کی ذات سے بڑی اُمیدیں، بڑی آرزوئیں وابستہ کر رکھی تھیں لیکن ایف اے میں متواتر تین سال تک میل ہونے کے بعد انہیں بھی راجیل کی فکر دامن گیر ہوئی اس وقت بھی وہ اپنی عالیشان کوٹھی کے برآمدے میں ایک آرام کرسی پر بیٹھے راجیل کے مستقبل بارے میں غلط فہمیاں دیکھتا تھا جب ارجمند بانو نے باہر آکر انہیں مخاطب کیا۔

”میں اندر بیٹھی آپ کا انتظار کر رہی ہوں اور آپ یہاں آرام فرما رہے ہیں۔“

”ہم راجیل کے سلسلے میں بہت فکر مند ہیں۔“ خان بہادر صاحب نے ایک سرد آہ بھر کر ”ہم نے اُس کی ذات سے بڑی اُمیدیں، بڑی آرزوئیں وابستہ کر رکھی ہیں۔ لیکن تعلیم کی ط سے اُس کی غفلت نے ہمیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔“

”افسوس تو مجھے بھی ہے لیکن ہم کبھی کیا سکتے ہیں۔“ ارجمند بانو نے دبی زبان میں جواب دیا۔

”سمیرا اپنی عدت کے دن پورے کرنے کے بعد اگر یہاں آجاتی تو حالات سنور سکتے بچوں پر کسی بزرگ کا سایہ اُن کی تربیت کے لئے اشد ضروری ہوتا ہے لیکن سمیرا نے میری بات مانی۔ ہمارا خیال ہے کہ ہماری بیٹی ہم سے ابھی تک ناراض ہے۔ شاید ظاہر کے سلسلے میں ہمارا فیصلہ پسند نہیں آیا تھا۔ مگر قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ بازی اس انداز میں سمیرا کے حق میں مات ہو جائے گی۔“

”میں نے بھی اُسے سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کر لی لیکن وہ کسی طرح ہمارے ساتھ رہنے

نہیں۔ کوئی نہ کوئی خوبصورت بہانہ تراش کر بات کو ٹال جاتی ہے۔“

”وہ ہمارا خون ہے بیگم۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ ٹوٹ تو سکتی ہے لیکن اپنے اندر پلک پیدا نہیں کرے گی۔“

”راجیل کے بارے میں آپ نے کیا سوچا ہے۔“

”دو صورتیں ہیں میری نگاہ میں۔“ خان بہادر صاحب نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”یا تو راجیل کو بیرون ملک بھیج دیا جائے یا پھر تعلیم کے حصول کی خاطر اُسے کراچی منتقل کر دیا جائے۔ بیرون ملک بھیجنے میں یہ اندیشہ بھی ہے کہ کہیں وہاں کی تہذیب اور آزاد ماحول کا اثر راجیل کو بالکل ہی نہ بگاڑ دے۔“

”اور کراچی میں ہمارا کون بیٹھا ہے جو راجیل کو تعلیم کی جانب راغب کرنے کی ذمہ داری قبول کرے گا؟“

”آپ وقار احمد کو بھول رہی ہیں۔ اُن سے ہماری قرابت داری بھی ہوتی ہے اور کاروباری تعلقات بھی ہیں۔ مجھے یقین ہے وہاں جا کر راجیل میں تبدیلی ضرور رونما ہوگی۔“

”اس یقین دہانی کی کوئی وجہ بھی ہوگی۔“ ارجمند بانو نے دریافت کیا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ وہاں چار ذہن بچے پہلے سے موجود ہیں۔ تین لڑکیاں اور ایک لڑکا۔ راجیل کو نول کی تبدیلی اور پڑھائی کا ماحول ملے تو وہ بدل بھی سکتا ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن کیا سمیرا اپنے بیٹے کو نگاہوں سے دور کرنے پر آمادہ ہو جائے گی؟“

”بات کر دیکھنے میں کیا حرج ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اولاد کا مستقبل اُسے ہمارے مشورے پر عمل کرنے کے لئے مجبور کر دے۔“

”آپ کہتے ہیں تو کسی وقت بات کر کے دیکھوں گی۔“

”خدا کرے ہماری بیٹی اس بار ہمارا کہا مان جائے۔“ خان بہادر آصف علی نے حسرت بھرے لہجے میں کہا پھر آسمان کے ذور پار خلاؤں میں جھانکنے لگے۔ یوں جیسے اپنے خاندان کی رُوٹھی ہوئی رتوں کو تلاش کر رہے ہوں۔!!



آخری پرچہ دے کر وہ امتحان کے کمرے سے باہر نکلے تو خود کو بہت ہلکا محسوس کر رہی تھی۔ سر سے کوئی ڈیڑھ اونچائی ہو۔۔۔۔۔ وہ بے حد سرور تھی، جس پرچے کے بارے میں اُسے سب زیادہ تشویش تھی وہ خلاف توقع سب سے اچھا ہو گیا۔ رات اُس نے جو سوالات دہرائے تھے ان میں چار سوال پرچے میں دیکھتے ہی اُس کا دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔ پھر اُسے اتنی فرصت ہی مل سکی کہ قریب و جوار میں بیٹھی اپنی بھولیوں کے چہرے کے تاثرات دیکھ سکتی۔ جوابات لکھنے میں اتنی ناہوئی کہ خود اپنا ہوش بھی نہ رہا۔

اُسے یقین تھا کہ اب وہ اچھے نمبروں سے کامیاب ہوگی اور میڈیکل کالج میں داخلے میں اُسے مسافرش یا ڈشوار کی کا سامنا بردہش نہیں ہوگا۔ انہی خیالات میں ڈوبی وہ گیٹ کی طرف تیز قدمیں لگاتی تھی کہ شازئیہ کی آواز اُس کے کانوں میں گونجی۔

”ایسا بھی کیا جلدی کہ بھلا کی چلی جا رہی ہو۔۔۔۔۔؟“

”شاکے بڑھتے ہوئے قدم ٹک گئے، اُس نے گھوم کر اپنی عزیز سہیلی کو دیکھا جو عہدین کے ہمراہ

ی جہاں ڈرائیور اس کا مسٹر تھا۔ وہ پر وفار انداز میں اے بی، ڈرائیور کے سبب سے

رہی تھیں، تھکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔

”کیا بات ہے آپ!..... خیریت تو ہے؟“ نادیدہ نے بہن کو دیکھا تو اپنی کتاب بند کرتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔ ”پرچہ کیسا ہوا.....؟“

”بے حد شاندار! ایک دم فرسٹ کلاس۔“ ثناء نے جلدی سے خود پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔

”پھر..... آپ کے چہرے کی رنگت یہ آڑی آڑی کیوں ہے؟“

”تھکنے کا احساس ہوگا..... میں ذرا نہادھولوں پھر غور سے دیکھنا۔“

وہ جلدی سے سینڈل اتارنی غسل خانے میں چلی گئی، کچھ دیر بعد نہادھو کر باہر نکلی تو دل کی دھڑکنیں معمول پر آچکی تھیں لیکن احمر کے خط کا تصور اُسے رہ رہ کر پریشان کر رہا تھا۔ اُس نے نادیدہ کی طرف دیکھا جو بستر پر اونڈھی لیٹی کتاب کے مطالعے میں غرق تھی۔ ثناء کو نادیدہ کے انداز پر پیارا آگیا، قریب جا کر بولی۔ ”کل کے پرچے کی تیاری ہو رہی ہے.....؟“

”ہاں..... بس یہی ایک چپٹر ہضم کرنا باقی رہ گیا ہے..... رات کو دو چار سوال دہرا لوں گی..... پھر جو خدا کو منظور ہو۔“

”ایسی بری بات کیوں کر رہی ہو..... خدا نے چاہا تو اس بار بھی تمہارا نتیجہ شاندار رہے گا۔“

”آپ نماز میں میری کامیابی کی دُعا ضرور کیجئے گا۔“

”یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے؟“ وہ پیار سے نادیدہ کے بالوں کی ایک لٹ کو شانوں پر اچھالتی کمرے سے باہر آگئی۔

احمر کے خط کی اطلاع نے اُسے انجانے خوف اور اضطراب کی کیفیتوں سے دوچار کر دیا تھا، خود کو سنبھالتی وہ ماں کے کمرے میں داخل ہوئی، معصوم ذہن میں عجیب عجیب سوالات اُبھر کر آپس میں گدگد ہو رہے تھے۔ ثناء نہ بیگم نے ثناء کو دیکھا تو مسکرا کر بولیں۔

”احمر کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے.....؟“

”جی.....“ وہ گڑبگڑا گئی۔ ”میں سمجھی نہیں.....“

”میں بھی نہیں سمجھ سکی۔“ ثناء نہ بیگم نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔ ”بظاہر تو وہ مجھے بے حد ذہین

اور سوچ بوجھ کا مالک نظر آتا ہے..... نہ جانے اُسے بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا.....“

”کیا..... کیا ہو گیا احمر بھائی کو؟“ وہ مجسم سوال بن گئی۔

”وہ سامنے سنگھار میز پر اُس کا لافانہ بڑا ہے..... خود ہی پڑھ کر دیکھ لو!“

ثناء کو یوں محسوس ہوا جیسے اُسے عمر قید کی سزا سنائی گئی ہو، ماں سے نظریں ہچا کر وہ آہستہ سے پلٹی، سنگھار میز پر نیلے رنگ کا ایک لافانہ پڑا تھا، احمر اسی رنگ کا لافانہ استعمال کرتے تھے، وہ قدم سنبھالتی آہستہ آہستہ آگے بڑھی، دھڑکتے ہوئے دل سے لافانہ اٹھایا..... اندر ایک نیلے ہی رنگ کا کاغذ تہہ کیا ہوا موجود تھا۔ اُس نے کیکپائی انگلیوں سے اُسے کھولا اور مضمون پڑھنے لگی۔

”مائی ڈیر محبوب.....!“

اُمید ہے تمہیں جس وقت میرا یہ خط ملے گا تم بخیر و عافیت ہو گے۔ واپسی کچھ اس قدر جلدی اور اچانک ہوئی کہ میں تم سے مستقبل کے بارے میں کوئی تفصیلی بات نہ کر سکا..... ایک دو بار سوچا بھی کہ ذکر چھٹروں لیکن تمہاری حساس طبیعت کے پیش نظر ارادہ ترک کر دیا۔ اس بات کا خوف بھی تھا کہ اگر تم نے میری بات کا برا مان لیا..... تو کیا ہو

گا.....؟

تمہارے لئے ایک حقیر سا تحفہ چھوڑ آیا تھا..... اُمید ہے ملا ہوگا۔ اس تحفے کے ساتھ ہی میں نے تمہارے نام ایک ضروری پیغام بھی چھوڑا تھا..... مجھے تمہارے جواب کا شدت سے انتظار ہے، اگر مصروفیت اجازت نہ دے تو ”ہاں“ یا ”نہیں“ میں بھی جواب دے سکتے ہو۔ میں سمجھ لوں گا کہ تم نے مستقبل کے بارے میں کیا سوچا ہے..... کیا میں اُمید رکھوں کہ تم احمر کی خاطر کوئی جواب دینا پسند کرو گے؟ اگر تمہارا جواب نہ آیا تو میں یہی سمجھوں گا کہ تم مجھ سے ناراض ہو.....! بہر حال اپنی پڑھائی کی طرف سے غافل نہ ہونا، میری دُعا ہے کہ تم زندگی کے ہر مرحلے میں کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہوتے رہو!

اب اجازت چاہتا ہوں۔ اپنے امی اور ابو کو میرا بہت بہت سلام کہنا، جس شہر میں تمہارا قیام ہے وہیں میرے چھوٹے چچا بھی رہتے ہیں، انہیں ایک ضروری خط لکھنا ہے اس لئے فی الحال تم سے اس درخواست کے ساتھ رخصت ہو رہا ہوں کہ مجھے اپنے جواب سے ضرور مطلع کرنا۔ فقط تمہارا دُور افتادہ..... احمر۔

خط کا مضمون پڑھنے کے بعد ثناء کا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ وہ دل ہی دل میں احمر کی ذہانت کی ریف کئے بغیر نہ رہ سکی۔ احمر نے کتنی خوبصورتی سے اپنے پیغام کا جواب مانگا تھا، کیسے معصوم انداز کا اہتمام عیاں کیا تھا..... گھر والوں کو اس بات کا یقین دلانے کی خاطر کہ غلطی سے لافانہ بدل گیا ہے اُس نے کتنی عقلمندی سے چھوٹے چچا کا ذکر بھی کر دیا..... لیکن ثناء جانتی تھی کہ وہ خط کس کے لئے لکھا گیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ”محبوب“ کے اندازِ خطاب پر وہ اندر ہی اندر شرمنا کر رہ گئی، چہرہ حیا کی سرنخی سے پُر کرگزار ہو گیا۔

دل کی دھڑکنوں نے ایک نیا انداز اختیار کر لیا..... خوف کی جگہ ایک شرمیلی سی مسکراہٹ اُس کے چہرے پر جمیل گئی.....

کتنے خوبصورت تھے یہ لمحے..... کیسا عجیب سا احساس تھا جس نے اُس کے وجود کو گنگنا اٹھنے پر بور کر دیا..... ایک شوخ سی تحریر نے جیسے اُس کی کاپا پلٹ دی..... زندگی میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ وہ احمر کے خط کے سحر میں ڈوبی کھڑی تھی کہ ثناء نہ بیگم کی آواز نے اُسے یوں چونکا دیا جیسے وہ کوئی سین خواب دیکھتے دیکھتے اچانک جاگ اُٹھی ہو۔ اُس کے خیالات کا شیرازہ منتشر ہو گیا، ہونٹوں پر کاسابم بجائے اُس نے پلٹ کر ماں کی طرف دیکھا۔

”اب کیا خیال ہے تمہارا احمر کے بارے میں؟“ ثناء نہ بیگم نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”عابثاً لافانہ بدل گیا ہے۔“ وہ شوشی سے بولی۔

”مجھے یہ سوچ سوچ کر ہنسی آرہی ہے کہ جب مہاں محبوب کو ہمارا خط ملے گا اور وہ محترمہ چچی ان، دست بستہ آداب..... پڑھے گا تو اُس غریب پر کیا گزرے گی.....“

”ممکن ہے یہ غلطی کسی جلد بازی میں ہو گئی ہو اور احمر بھائی کو بعد میں احساس ہوا ہو۔“

”میرا خیال ہے کہ یہ خط احمر کو واپس روانہ کر دیا جائے تاکہ اُسے اپنی غلطی کا احساس ہو اُسے..... ذرا لطف بھی رہے گا۔“

”جیسی آپ کی مرضی.....“ ثناء نے مسکرا کر جواب دیا پھر کچھ دیر ثناء نہ بیگم کے پاس بیٹھ کر اپنے

کمرے میں آگئی، نادیہ ابھی تک مطالعے میں مصروف تھی شاید اُس نے ابھی تک احمر کا خط نہیں پڑھا تھا ورنہ تذکرہ ضرور کرتی۔

اُس نے نادیہ کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا، چپ چاپ اپنے بستر پر لیٹ کر آنکھیں موند لیں اور احمر کے بارے میں سوچنے لگی، بڑی دیر تک اسی آنکھوں میں جھل رہی کہ وہ احمر کو کیا جواب دے.....؟

ہاں..... یا نہیں..... اور اگر اُس کا جواب کسی غیر کے ہاتھ لگ گیا تو کیا ہوگا..... پھر اُس نے ذہن میں ایک ترکیب آگئی، اُس نے سوچا کہ وہ احمر کا خط واپس کرتے وقت کسی کو نے پر "انتظار فرمائیے" لکھ کر ڈاک کے حوالے کر دے گی!!



رات کھانے کی میز پر ایک بار پھر احمر کے خط کا ذکر نکل آیا، وقار احمد دل کھول کر اُس کی ذہنیت سے رہے۔ نادیہ، صائمہ اور فرحان کو بھی ابھی تک لفافہ پوسٹ کئے جانے کا علم نہیں تھا اس لئے وہ احمر کی بھول پر دلچسپ باتوں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ شائبہ کا ساتھ دینے کی خاطر یونہی ہاں کرتی رہی اس لئے کہ وہ جانتی تھی کہ جس بھول کو گھر والے ایک دلچسپ مذاق سمجھ رہے ہیں ان نہیں ایک زندہ حقیقت تھی۔

حقیقت..... جس کے احساس نے اُسے زندگی کے ایک نئے موڑ سے روشناس کر دیا تھا۔ اور زندگی کے اس موڑ پر پہنچ کر اُس نے محسوس کیا جیسے وہ بہت بلند یوں پر پرواز کر رہی ہو۔ ہواؤں میں بے خوف و خطر اڑی جا رہی ہو..... حسین وادیوں اور دلکش کوساروں کی سیر کر رہی ہو۔

لیکن..... وہ سب کی موجودگی میں اس خط کے تذکرے کو مناسب نہیں سمجھ رہی تھی، اُسے خوف تھا اگر کسی نے اُس کی اصلیت جان لی اور ثناء کے دل کا چور پکڑا گیا تو تب کیا ہوگا..... سب سے خطرہ اُسے فرحان کی ذات سے تھا، کہنے کو وہ صرف پارہ سال کا تھا لیکن اپنی عمر کے بچوں کے لیے میں کہیں زیادہ ذہین، دور اندیش اور معاملہ فہم واقع ہوا تھا۔ بال کی کھال نکالنا تو اُس کی تھی، بلا کا شوخ اور شریر تھا، ہر بات کا جواب تو جیسے اُس کی زبان کی نوک پر دھرا رہتا ہو۔ ت نے اُسے خداداد خوبیوں سے دل کھول کر نوازا تھا، اُس کی انہی عادتوں کی وجہ سے شائیکہ بیگم بڑے لاڈ و پیار سے اُسے "شیطان" کا خطاب دے رکھا تھا۔

ثناء نے کنکھیوں سے فرحان کی جانب دیکھا جو بظاہر کھانے میں مشغول نظر آ رہا تھا لیکن اُس کے منہ کے انداز بتا رہے تھے جیسے وہ کسی اہم کسمی کو سلجھانے میں حد درجہ منہمک ہو۔ دوسرے لوگ احمر کے خط کو موضوع گفتگو بنائے ہوئے تھے۔

"احمر بھائی سے اتنی بڑی غلطی ہو سکتی ہے..... میں نہیں مان سکتی۔" صائمہ نے معصومیت سے کہا۔ "یہ بھی ممکن ہے کہ احمر نے کسی ملازم کو خطوط لفافے میں رکھنے کی تاکید کی ہو اور اُس نے جلد نامیں لفافے بدل دیئے ہوں۔" وقار احمد نے کوفتے کا ڈونگا اپنے سامنے کھسکاتے ہوئے کہا۔ "اگر صاحب کے یہاں تو ملازموں کی بھرمار ہے۔ ہر کام کے لئے ایک علیحدہ ملازم مامور ہے۔"

"اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟" شائیکہ بیگم نے کہا۔ "اللہ نے غار بھائی کو دونوں باتوں کو لازمی طور پر رکھا ہے۔"

"کچھ بھی ہو..... غلطی بہر حال غلطی ہے۔" نادیہ بولی۔ "کل میرا پرچہ ختم ہو جائے تو میں لکھوں کہ بھائی کو ایک خط..... ذرا اُن کو بھی تو احساس ہو کہ غلطیاں انسان ہی سے سرزد ہوتی ہیں..... ہم سب غلطی ہو جاتی ہے تو وہ کس قدر تنگ کرتے ہیں..... اب ہماری باری ہے، کیوں صائمہ؟"

"سوچا تو میں نے بھی یہی تھا لیکن....." صائمہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

”سوری بڑی آپا..... اگر آپ کہتی ہیں تو آئندہ سے سنجیدگی کا مذاق بھی نہیں کروں گا۔“ فرحان نے یہ جملہ اتنی مصعویت اور بھولپن سے کہا کہ شا کے علاوہ خود صائمہ بھی اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکی، پیار سے بھائی کو گھورتی باورچی خانے کی سمت چلی گئی۔

”تجویز تو معقول ہے.....“ ثنائے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ تم پرچے سے فارغ ہو کر اس کو عمل لایا جائے؟“

”بری آیا.....“ فرحان نے صائمہ کے جانے کے بعد بٹائے کہا۔ ”ایک خط آپ کو بھی لکھنا چاہئے احمر بھائی کو..... خوب شکوے شکایت سے بھرپور، جس سے خشکی کا اظہار ہو.....“

”میں بھی نہیں.....“ ثنائے چونک کر فرحان کو دیکھا۔

”کیوں.....“ کہہ کر امانے کی بات نہیں ہے کہ احمر بھائی آپ کا تحفہ لانا تو بھول گئے اور محبوب صاحب کے تحفے کی اتنی قدر لائق ہے۔“

”یہ تمہارے احمر بھائی کا ذاتی معاملہ ہے..... میں کون ہوتی ہوں شکایت کرنے والی۔“ ثنائے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”آپ نہ کریں شکایت..... لیکن اگر آپ کی جگہ میں ہوتا تو ضرور برامانتا۔“

”اس میں برامانتے کی کیا بات ہے..... تحفہ کسی سے زبردستی تو مانگ کر نہیں لیا جاتا..... اور پھر احمر بھائی نے یہ بھی تو کہا تھا کہ وہ میرا تحفہ بھول آئے ہیں۔“ ثنائے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”ہوسکتا ہے کہ وہ اب کی بار آئیں تو ایک کی بجائے دو تحفے لے آئیں میرے لئے۔“

”بات کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی۔“ فرحان نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”احمر بھائی آپ کا تحفہ لانا بھول گئے، یہ اور بات ہے لیکن انہوں نے یہ بھی نہیں بتایا کہ وہ تحفہ کیا تھا؟“

”بات اگر قبل از وقت بتا دی جائے تو اس کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔“

”میں دراصل محبوب صاحب کے بارے میں سوچ رہا ہوں جن کا خط غلطی سے ہمارے پتے پر آ گیا۔“

”کیوں..... اس میں ایسی کیا خاص بات ہے جو تم اپنے ننھے سے ذہن پر بوجھ ڈال رہے ہو؟“ ثنائے پروائی سے بولی۔

”اول تو یہ کہ احمر بھائی نے کبھی کسی محبوب صاحب کا ذکر نہیں کیا اور پھر یہ کہ اگر وہ تحفہ دے گئے تھے تو اس کی باقاعدہ رسید طلب کرنے کی کیا ضرورت پیش آگئی؟“ فرحان نے اپنی عقل کے مطابق بحث کرتے ہوئے کہا۔

”تم یہ بھول رہے ہو کہ اس تحفے کے ساتھ ایک پیغام بھی تھا اور.....“ ثنائے روانی میں کہہ گئی، اپنی غلطی کا احساس ہوا تو جلدی سے بات بناتے ہوئے بولی۔ ”مہیں بڑا ہو کر پولیس میں جانا چاہئے خاصے کامیاب رہو گے۔“

”تھنک یو۔“ فرحان نے خوش ہو کر شکریہ ادا کیا، پھر دوبارہ سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔

”بری آیا! کیا احمر بھائی کے خط سے آپ کو دال میں کچھ کالا نظر نہیں آتا؟“

”تو یہ ہے فرحان..... تم تو بلاوجہ بچے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ گئے۔“ ثنائے بات کا رخ بدلنے کی خاطر کہا۔ ”کوئی اور بات نہیں ہے تمہارے پاس؟“

”ایک بات اور بھی ہے..... سنا ہے شیطان کی خالہ آنے والی ہیں۔“

”کیا مطلب.....؟“

”مطلب یہ کہ جب امی نے مجھے شیطان کا خطاب دے رکھا ہے تو پھر ہماری خالہ جان شیطان کی خالہ ہی کہلا سکتی گی۔“ فرحان نے شوخی سے کہا۔

”مہیں کیسے معلوم کہ خالہ جان آ رہی ہیں؟“ ثنائے تعجب سے پوچھا۔ ”امی جان یا ابو نے تو کچھ نہیں بتایا.....“

”ہر بات بچوں کو نہیں بتائی جاتی۔“ فرحان نے بزرگوں جیسے انداز میں کہا..... پھر ثنائے اس لمبی کے لئے پیار سے ہاتھ بڑھایا تو وہ تیزی سے اٹھ کر دوسرے صوفے پر چلا گیا۔

”سچ بتاؤ..... مہیں خالہ جان کی آمد کی اطلاع کیسے ملی؟“

”کل ہی کی بات تو ہے..... ابو اور امی کے درمیان گفتگو ہو رہی تھی کہ سب لوگ عنقریب واپس والے ہیں۔“

”کیسی عجیب بات ہے.....“ ثنائے سوچتے ہوئے کہا۔ ”ہم لوگ خالہ جان کو کتنی طویل مدت تک پہلی بار دیکھیں گے۔“

”اور مجھے ابھی تک احمر بھائی کے خط کی فکر.....“

”فرحان..... اب میں مہیں سچ سچ مار بیٹھوں گی۔“ ثنائے جھلا کر کہا۔

پھر صائمہ کافی کی ٹرے لئے داخل ہوئی تو فرحان بھی اس کی طرف متوجہ ہو گیا.....!!

○○○

ارجمند بانو، بیٹی کو سمجھا سمجھا کر واپس گئیں تو سیرا کے یادوں کے درپے پچھلے چلے گئے۔ اُسے وہ یاد آ گیا جب سہیلیوں کے جھرمٹ میں سرخ لباس زیب تن کئے، والدین کی مرضی کے آگے سر ہٹے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اپنے گھر سے زخمت ہوئی تھی..... اُس نے والدین کی خوشیوں خاطر اپنی مسرتوں کا گلا گھونٹ لیا تھا..... ماں باپ نے اُس کی زندگی کے لئے، اُس کے مستقبل کو لانے کی خاطر جو فیصلہ کیا، وہ اپنی حسرتوں، تمنائوں اور ناتمام آرزوؤں کو روندتی ہوئی اس فیصلے پر رن ہو گئی۔

اُس نے طاہر کی محبت کو بھول جانے کی کوشش کی..... دل کے اُڑے دیار سے اُس کی یادوں لایک ایک چراغ بنادئے..... صرف دھواں باقی رہ گیا..... اور اسی دھوئیں کی ٹھن میں وہ اپنے گھر زخمت ہو کر ایک نئے گھر آ گئی۔

ماضی کے یہ خانوں کو مقفل کر کے اُس نے آنے والے کل کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ ایک نئے گھر..... ایک نئی دنیا کے خواب دیکھنے لگی..... جہاں اُس کا راج ہوگا..... جہاں وہ ہوگی..... اُس کا مجازی خدا ہوگا.....

مجازی خدا..... جو اُس کی زندگی کا سب سے مضبوط..... سب سے ٹھوس سہارا ہوگا.....

سیرا کی سہیلیاں زخمتی کا گیت گارہی تھیں، باجے گا بے اور شہنائیوں کی تیز آواز نے ایک لمبے ہنگامہ سا پکار کر رکھا تھا، وہ سرخ لباس میں کٹھنی سنائی ماں کی بانہوں سے لگی اپنی نئی دنیا بسانے کی خاطر اپنی دلہیز تنک آ گئی۔ سامنے دلہیا کی بیٹی جی کا راس کی زندگی کے حسین بوجھ کو اٹھانے کے لئے تیار کر لی گئی، عزیز و اقارب اور بڑی بوڑھیوں کی آواز اُس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

ارجمند بانو نے بیٹی کو زخمت کرنے سے پیشتر آخری بار اُسے گلے لگایا تو سیرا کی آنکھوں سے پانچ ہمدادوں کی جھری ٹپک گئی، وہ گھونگھٹ کے اندر سکھتی رہی، ماں اُسے دنیا جہان کی نصیحتیں کر رہی تھیں۔

آج تم اپنے باپل کے گھر سے زخمت ہو رہی ہو..... ایک نیا گھر آباد کرنے کے لئے..... وہی گھر اصل کا گھر ہوگا میری بچی..... تم ایک شریف خاندان کا خون ہو..... ماں باپ کی لاج رکھنا..... خدا حافظ..... خدا تمہیں..... جب جب جو زندگی کی خوشیاں نصیب ہوؤ..... دو دھوں نہاؤ..... پوتوں

مقابلے میں حد درجہ بلند اور ممتاز کر رکھا ہے۔۔۔۔۔ میں محض اپنی محبت اور خوشیوں کی خاطر اس تہذیب کے سرمائے کو کس طرح ٹھکرا دیتی۔۔۔۔۔؟“
”اور اسی تہذیب کی خاطر تم نے خود کو ہمیشہ کے لئے غیروں کے حوالے کر دیا۔۔۔۔۔ اپنے پیار کا گھاگھٹ لیا ہے۔“

”مجھے میری بے بسی، میری مجبوریوں کا احساس مت دلاؤ طاہر۔۔۔۔۔ میں التجا کرتی ہوں، میرے راتے سے ہٹ جاؤ، یوں بھی اب میں تمہاری نہیں رہی، کسی دوسرے کی امانت بن چکی ہوں اور۔۔۔۔۔ ہو سکے تو مجھے بھول جانا۔“

آج ماضی کی وہ تمام باتیں اُسے یاد آ رہی تھیں۔۔۔۔۔ افتخار احمد کے ساتھ ایک نئے رشتے میں منسلک ہو جانے کے بعد اُس نے ماضی کے تمام درپچوں کو بند کر لیا، اُس نے ٹوٹ کر افتخار کو چاہا، اُس کی پریشانی لیکن وہ افتخار احمد کی بلند پروازی کا ساتھ نہ دے سکی، تھک کر ٹھہرا ہوا گئی تو زندگی کی سرنوٹوں نے اُس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ پھر افتخار کی موت نے اُس رشتے کو ہمیشہ کے لئے توڑ دیا جو شادی والے دن وکیل اور گواہوں کی موجودگی میں باندھا گیا تھا۔ وہ آزاد ہو گئی۔۔۔۔۔ لیکن افتخار کی موت کے باوجود ابھی ایک رشتہ باقی رہ گیا تھا۔

میتا کا رشتہ۔۔۔۔۔ وہ مقدس رشتہ جو دنیا کی کوئی ماں نہیں توڑ سکتی۔

اور وہ جو اس رشتے کو دینی خود غرضی کی خاطر توڑ دیتی ہیں وہ ماں کے مقدس نام پر ایک بدناما داغ ہیں۔۔۔۔۔ وہ عورت کہلانے کی سختی نہیں ہوتی۔۔۔۔۔

لیکن سمیرا کے اندر کی عورت ابھی زندہ تھی۔۔۔۔۔ افتخار کی موت کے بعد اُس نے اولاد کی محبت کے عظیم سرمائے کو زندگی کا سہارا بنا لیا، اُسے پال پوس کر بڑا کیا، اپنی جوانی کی تمام خوبصورت اور حسین راتیں راجیل کو پروان چڑھانے میں صرف کر دیں، میٹرک تک حالات سازگار رہے لیکن کالج کی چہار دیواری میں پہنچ کر راجیل اپنی راہ سے ہٹنے لگا۔ اُن راہوں پر تیزی سے قدم بڑھانے لگا جو راستے بھی اُس کے باپ کو پسند تھیں۔۔۔۔۔ تین سال تک جب راجیل متواتر ایف اے میں فیل ہوتا رہا اور اُسے اپنی ناکامیوں کا مطلق کوئی احساس نہ ہوا تو سمیرا سوچنے پر مجبور ہو گئی۔

کیا وہ کالج کے آزاد اور بے باک ماحول کا شکار ہو گیا۔؟ یا۔۔۔۔۔ زمانے کی ہوائ نے اُس کی زندگی کا رخ موڑ دیا ہے۔؟ یا پھر۔۔۔۔۔ وہ باپ کا لہو تھا جو اولاد کے خون میں شامل ہو کر اپنا رنگ دکھا رہا تھا۔۔۔۔۔؟

اور آج جب ارجمند بانو نے بھی نواسے کے مستقبل کی خاطر اُسے کراچی بھیج دینے کا مشورہ دیا تو سمیرا ایک لمحے کو گنگ ہو گئی۔ اُس نے سوچا کیا، وہ اولاد کی دُوری برداشت کر سکے گی۔۔۔۔۔ اولاد جس کی خوشیوں کی خاطر اُس نے ابھی تک شوہر کی دہلیز کو مضبوطی سے تھام کر اپنی ذات کی شناخت کرائی تھی۔۔۔۔۔ جس کی خاطر اُس نے والدین کی شاندار حویلی میں واپس جانے سے انکار کر دیا تھا۔۔۔۔۔ کیا وہ اس جدائی کو برداشت کر سکے گی۔۔۔۔۔؟؟

ارجمند بانو کے جانے کے بعد بڑی دیر تک وہ حالات کے نشیب و فراز کا جائزہ لیتی رہی۔ ماں کی نصیحتوں اور مشوروں پر غور کرتی رہی، وقار احمد اور اُن کے خاندان کے بارے میں وہ باپ کی زبانی پہلے بھی سن چکی تھی، ایک دو بار کاروباری معاملات میں اُس کا بھی وقار احمد کے ساتھ واسطہ پڑ چکا تھا۔۔۔۔۔ وقت کی نزاکت اور حالات کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ راجیل کو اس ماحول سے دُور کر دیا جائے

پھلو۔۔۔۔۔ سدا سہاگن رہو۔۔۔۔۔ آمین، تم آمین۔۔۔۔۔
وہ ماں کے سینے میں سر چھپائے کھستی رہی، پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔۔۔۔۔ اُسے اپنا چھوڑنے کا افسوس بھی تھا اور محبت کی ناکامی کا دکھ بھی۔۔۔۔۔

انہی دکھوں کو سینے میں سمیٹے وہ ماں کی چھاتی سے جدا ہوئی۔۔۔۔۔ سہیلیوں کے گیتوں کی لے تیز گئی۔۔۔۔۔ ڈھولک پر تھاپ کی آواز تیز ہونے لگی، وہ اپنا بھاری غرارہ سنبھالتی ایک قدم اور آگے بڑھی شور و غل اور سہاگ کے غنوں کا سینہ چیرتی ہوئی ایک دُخراش آواز اُس کے کانوں میں گونجی۔
”سمیرا۔۔۔۔۔ خدا حافظ۔۔۔۔۔“

”طاہر۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔“ وہ طاہر کی مانوس آواز کی گونج سن کر جال میں پھنسے ہوئے بے بس پنچھی طرح تڑپ اُٹھی۔

”ہاں سمیرا۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ تمہارا طاہر۔۔۔۔۔ یاد کرو۔۔۔۔۔ تم نے مجھ سے کیا کیا عہد و پیمان کئے۔۔۔۔۔ کیسے کیسے خوبصورت وعدے کئے تھے، ہمیشہ ایک ساتھ رہنے کی قسمیں کھاتی تھیں اور آج۔۔۔۔۔ تم باقیوں کو کیسے فراموش کر کے جا رہی ہو۔“

”میں مجبور ہوں طاہر۔۔۔۔۔“ اُس کے دل کے ویرانوں سے ایک کریناک آواز اُبھری۔
”تم جسے مجبوری کا نام دے رہی ہو میں اسے ظلم کہوں گا۔“ طاہر جذباتی ہو گیا۔ ”تمہارا والدین نے تمہارے ساتھ ظلم کیا ہے۔“

”نہیں طاہر۔۔۔۔۔ نہیں۔“ اُس نے اپنے زوٹھے محبوب کو منانے کی کوشش کی۔ ”میرے والد نے مجھ سے اپنا حق مانگا، میں انکار نہ کر سکی۔ شریف گھرانے کی بیٹیاں خاندان کی عزت ہوتی ہیں ماں باپ کا بھرم ہوتی ہیں۔۔۔۔۔ میں اس اعتماد کو کیسے ٹھکرا دیتی جو میرے والدین نے مجھ پر کیا تھا؟“
”سمیرا۔۔۔۔۔“ طاہر ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔ ”تمہارے بغیر میں زندگی کا تصور بھی کر سکتا۔“

”صبر و ہمت سے کام لو طاہر۔۔۔۔۔ مجھے دیکھو! میں عورت ہو کر سب کچھ چپ چاپ برداشت رہی ہوں۔۔۔۔۔ تم تو مرد ہو۔۔۔۔۔ اور پھر محبت تو ایک مقدس اور پاکیزہ جذبے کا نام ہے جو دل کی گہرائی میں رچا بسا ہوتا ہے۔ جسموں کے ملاپ کو زوچوں کا ملاپ تو نہیں کہا جاسکتا۔۔۔۔۔ محبت تو وہ خوشبو ہے کی مہک ہمیشہ ہواؤں میں بسی رہتی ہے۔۔۔۔۔ سبھی فنا نہیں ہوتی۔ محبت پرستش ہے۔ محبت عباد ہے۔ محبت تو اُس بلندی کا نام ہے جہاں پہنچ کر انسان پستی کی طرف مُڑ کر نہیں دیکھتا۔“

”تمہاری باتوں کا فلسفہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔۔۔۔۔“
”انہیں سمجھنے کی کوشش کرو۔۔۔۔۔ یہی فلسفہ تو زندگی کا دوسرا نام ہے جو آج تک نہ جانے پہلوؤں اور زاویوں سے دہرایا جا چکا ہے۔“

”تم نے وفا کو داغ لگا دیا سمیرا۔۔۔۔۔“ طاہر نے شکوہ کیا۔ ”تم چاہتیں تو اس شادی سے انکار سکتی تھیں۔“

”یہ تم نے کیا کہا طاہر۔۔۔۔۔؟“ سمیرا نے حیرت سے کہا۔ ”میں کیسے انکار کر دیتی۔۔۔۔۔ والدین سامنے نظریں اٹھا کر اُن کے حکم سے سرتابی کرنا تو گناہ ہے۔ میں اس گناہ کا ارتکاب کیسے کر سکتی؟ تہذیب کو اتنی جلدی کیسے فراموش کر دیتی جس میں بچپن سے لے کر جوانی تک میں نے پرورش ہے۔ یہی تہذیب تو ہمارا سرمایہ ہے اور یہی تہذیب تو ہے جس نے مشرق کی عورت کو مغرب

جہاں اُس نے غلط راستوں کو صراطِ مستقیم سمجھ رکھا تھا..... ممکن تھا کہ نیا ماحول اور نئے لوگوں کے درمیان رہ کر اُس کا مستقبل سنور جاتا.....

سمیرا خاتون نے ٹھنڈے دل و دماغ سے اولاد کے مستقبل کے بارے میں سوچا، پھر طے کر لیا کہ وہ اُسے وقار احمد کے پاس کراچی بھیج دیں گی۔ راجیل کی زندگی کو سنوارنے کی خاطر وہ اپنے دل پر پتھر رکھ کر اُس کی وقتی جدائی کو برداشت کرنے کا تہیہ کر کے انھیں، غور و فکر میں ڈوبی راجیل کے کمرے میں قدم رکھا تو ہتھکھک کر دروازے پر ہی زک گئیں۔

راجیل قد آدم آئینے کے سامنے کھڑا اپنے ہتھکھریالے بالوں کو برش سے آخری بچ دے رہا تھا، بلکہ آسانی رنگ کے تھری پیس سوٹ میں اُس کی خوبصورت رعنت کس قدر حسین لگ رہی تھی۔ بائیس سال کی عمر کے باوجود وہ ایک وجہ پر نوجوان نظر آ رہا تھا، بالکل اپنے باپ کی طرح..... وہ چوکھٹ پر کھڑی بیٹے کو پیار بھری نظروں سے دیکھتی رہیں۔

”نچی..... آپ؟“ راجیل نے ماں کو دیکھا تو قدم بڑھاتا قریب آ گیا۔ ”آپ کب آئیں؟“

”بہت دیر سے تمہاری ایک ایک نقل و حرکت کا جائزہ لے رہی ہوں۔“ سمیرا خاتون نے مسکراتے ہوئے معنی خیز انداز اختیار کیا۔ ”کہاں کی تیاری ہو رہی ہے.....؟“

”وہ..... ایک دوست سے ملنے جا رہا ہوں۔“

”کوئی ہم جماعت ہوگا.....؟“

”مجھے افسوس ہے مئی.....“ راجیل نے ماں کے لہجے کے درد کو محسوس کیا تو وہ سنجیدہ ہو گیا۔ ”میں نے طے کیا ہے کہ اس بار دوسرے کالج میں داخلوں گا اور اب کی بار.....“

”بہت ہو چکا راجیل..... بہت ہو چکا۔“ سمیرا خاتون ہونٹ کاٹتے ہوئے بولیں۔ ”تم ہر سال افسوس اور شرمندگی کا اظہار کرتے ہو..... کالج بدل دینے سے کیا ہوگا..... ماحول تو وہی ہوگا..... تمہارے دوست احباب تو وہی ہوں گے۔“

”مجھے ایک چانس اور دیں.....“ راجیل نے بھولپن اور معصومیت سے کہا۔ ”میں وعدہ کرتا ہوں.....“

”ہاں.....“ سمیرا نے خود کو سنبھالتے ہوئے تیزی سے کہا۔ ”آج میں تم سے ایک وعدہ لینے آئی ہوں..... آئندہ تم وہی کرو گے جو میں کہوں گی۔“

”میں نے پہلے بھی آپ کے حکم سے کبھی سرتابی نہیں کی۔“ راجیل نے کہا۔ ”مئی! کیا آپ مجھ سے خفا ہیں؟“

”میری بات کا جواب دو!“ سمیرا خاتون نے اپنا دل کڑا کر کے سوال کیا۔ ”کیا تم میرا حکم مانو گے؟“

”ہاں.....“

”تمہیں اب حصولِ علم کی خاطر کراچی جانا ہوگا۔“ سمیرا خاتون نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”میں نے وہاں تمہارے داخلے اور رہائش کا بندوبست کر لیا ہے۔“

”لیکن مئی! میں.....“ راجیل نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

”یہ میرا آخری حکم ہے۔“ سمیرا خاتون نے بیٹے کو گھورتے ہوئے سرد آواز میں کہا۔ ”اور اگر تمہیں میرے حکم سے انکار ہے تو پھر تم آزاد ہو..... جہاں چاہو جا کر رہو..... جو مرضی آئے کرو.....“

سمجھ لینا کہ تمہاری ماں.....

سمیرا خاتون کی ممتا کو محسوس لگی تو پلکوں کے پیچھے تھے آنسو تمام بندشیں توڑ کر سیلاب کی صورت نکلے۔ راجیل نے ماں کو روتے دیکھا تو آگے بڑھ کر بے اختیار اُسے اپنی مضبوط بانہوں میں لپٹا، سنجیدگی اور بھولپن سے بولا۔

”مئی..... میں آپ کا بیٹا ہوں..... آپ کا راجیل ہوں۔ آپ کے حکم سے انکار نہیں کروں گا۔“

”تو پھر کراچی جانے کی تیاری کرو.....“ ماں نے ڈبڈبائی نظروں سے اولاد کو دیکھا۔

”ایک شرط پر.....“ راجیل نے ماں کی آنکھوں میں معصومیت سے جھانکتے ہوئے کہا۔

”وہ کیا.....؟“

”پہلے آپ مسکرائیں..... پھر میں آپ کا ہر حکم ماننے کو تیار ہوں۔“

سمیرا خاتون نے راجیل کو ہابی بھرتے دیکھا تو اپنے کپکپاتے لبوں پر ممتا کی بھرپور مسکراہٹیں سجا..... راجیل نے گردن جھکا کر ماں کی مقدس پیشانی کو چوما پھر گنگنا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

سمیرا خاتون کمرے کے کھمرے ہوئے ساز و سامان کو از سر نو ترتیب دینے لگیں..... ایک نئے بس.....!!



وقار احمد دن بھر کے تھکے ماندے گھر واپس آئے تو حسبِ معمول شاملہ بیگم نے مسکراتی نظروں کا استقبال کیا، پھر اُن کے ساتھ ہی خوابگاہ میں آ گئیں۔ وقار احمد نے حسبِ عادت لباس کرنے کے بعد بچوں کی خیریت دریافت کی پھر بیوی سے بولے۔

”عبدال سے کہہ کر ایک کپ گرم کافی تیار کر دیجئے تو عین نوازش ہوگی۔“

”کیا بچوں کے ساتھ جانے نہیں بیٹیں گے..... وہ کب سے آپ کی راہ دیکھ رہے ہیں۔“

”چلتے صاحب..... پہلے چائے پئے لیتے ہیں..... کافی کا ایک دور بعد میں آپ کے ساتھ ہو گا۔“

”خیریت تو ہے..... آج آپ خلافِ معمول تھکے تھکے نظر آ رہے ہیں۔“ شاملہ بیگم نے شوہر رے کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ کی بہن کی مہربانی ہے لیکن خدا کا شکر ہے کہ تمام کام خیر و خوبی سے ہو گیا۔“

”کیا مطلب.....؟“

”جمال بھائی کا مکان خالی بھی ہو گیا اور اُس کے اندر ضروری مرمت اور رنگ و روغن کا کام بھی مل ہو گیا۔“

”آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟“ شاملہ بیگم نے شکایت کی۔

”ابھی تو میں نے آپ کو یہ بھی نہیں بتایا کہ جمال بھائی اور ہماری سالی صاحبہ کل کی فلائٹ سے ہے ہیں۔“

”سچ.....؟“ شاملہ بیگم خوشی سے چیخ اٹھیں، بہن اور بہنوئی کی آمد کی اچانک اطلاع سن کر خوشی نا کی آنکھوں کے گوشے بھینکنے لگے، شوہر کو پیار بھری نظروں سے گھورتے ہوئے بولیں۔ ”اپنی مالی کا کام تھا اسی لئے اتنی لگن سے دوڑ دوپ میں مصروف تھے اور میں سمجھ رہی تھی کہ کوئی ری مصروفیت ہوگی۔“

”سترہ سال کا عرصہ بہت طویل ہوتا ہے بیگم!“ وقار احمد ایک لمبی سانس لے کر بولے..... ”اتنی

”میں اب بھی اپنی بات پر قائم ہوں.....“ فرحان نے شرارت بھرے انداز میں جواب دیا۔
 ”صرف اتنا ہے کہ آپ شتر مرغ کو جغرافیائی اعتبار سے دیکھ رہی ہیں اور میں اُسے ریاضی کے
 ل سے حل کر رہا ہوں۔“
 ”جہیں کت جتتی کے سوا اور آتا بھی کیا ہے۔“ صائمہ برا سامنہ بنا کر بولی۔ ”ہمیشہ اپنی ہٹ
 ل پر اڑے رہتے ہو۔“

”فرحان بیٹے.....“ وقار احمد نے بیٹے کو مخاطب کیا۔ ”ذرا میں بھی تو سنوں کہ تم نے شتر مرغ کو
 نی کے اصول سے کیسے حل کیا ہے؟“

”شتر مرغ کے معنی ہوتے ہیں اونٹ جو جانور ہوتا ہے اور چار عدد ناگوں کا مالک ہوتا ہے جبکہ مرغ
 ہ ہے اور اُس کے دو پیر ہوتے ہیں..... اب آپ اگر ریاضی کے اصول پر دونوں جمع کر دیں تو
 نہ کا شتر مرغ میرے شتر مرغ کے سامنے بالکل بیٹا نظر آئے گا۔“

فرحان کی دلیل پر سب ہی بے اختیار ہنسنے لگے البتہ صائمہ اُسے غصے سے گھور رہی تھی۔
 ”سن رہے ہیں آپ.....“ شائلہ بیگم نے شوہر سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اسی لئے تو میں نے
 شیطان کا خطاب دے رکھا ہے۔“

چائے کی میز پر اسی قسم کی دلچسپ باتیں ہوتی رہیں، چائے سے فارغ ہونے کے بعد بچے
 ننگ رُوم چلے گئے اور کیرم بورڈ سے دل بہلانے لگے، نادیہ کا امتحان بھی ختم ہو چکا تھا اس لئے
 سب کے حق میں چین لکھ رہا تھا۔

شائلہ بیگم کچھ دیر تک باورچی کو ضروری ہدایات دیتی رہیں پھر خوابگاہ میں آگئیں جہاں وقار احمد
 فائل کے مطالعے میں مصروف تھے، شائلہ بیگم نے فائل لے کر ایک طرف رکھی پھر شوہر کے سامنے
 م کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔ ”اب سنائیے..... وہ دوسری اطلاع کون سی ہے جو آپ سنانے
 لے تھے؟“

”کافی کا کیا رہا.....؟“

”آپ اپنی بات شروع کریں..... کافی بھی آجائے گی۔“

”آج خان بہادر آصف خان علی صاحب کی جانب سے مجھے ایک طویل محبت نامہ موصول ہوا
 ۔“ وقار احمد نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اس سلسلے میں آپ سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔“
 ”خیریت تو ہے.....؟“ شائلہ بیگم نے جلدی سے پوچھا۔ ”کیا کاروباری اونچ نیچ کا کوئی معاملہ
 بٹ ہے؟“

”جی نہیں..... اس بار قطعی نئی زندگی کا مسئلہ درپیش ہے۔“ وقار احمد نے کہا۔ پھر موصول ہونے
 لے خط کی مختصر تفصیل سناتے ہوئے بولے۔ ”دراصل خان بہادر صاحب اپنے نواسے راجیل کو حصول
 ا کے لئے کراچی بھیجنا چاہتے ہیں..... اور راجیل کی نگہداشت کی تمام تر ذمہ داری میرے اوپر ڈالنا
 چاہتے ہیں۔“

”کیا راجیل کا قیام بھی ہمارے ہی ہاں ہوگا؟“

”اس میں ایسی تو کوئی قباحت نہیں ہے..... انیسویں خالی پڑی ہے، ملازموں سے اس کی صفائی
 کی جاسکتی ہے۔“

”پھر اور کیا مسئلہ ہے؟“ شائلہ بیگم نے کہا۔ ”لیکن جو فیصلہ کریں خوب سوچ سمجھ کر کریں۔ اس

طویل مدت تک اپنوں سے دور ہونا اور صبر کئے رہنا..... ایمان کی بات ہے اگر میں شبانہ بہن کی جگہ
 ہوتا تو شاید مرد ہو کر بھی حوصلہ ہار دیتا۔“

”اپنی اپنی قسمت اور مقدر کی بات ہوتی ہے.....“ شائلہ بیگم بھی ملول ہو گئیں۔ ”شادی بیاہ
 اندھا جوا ہے..... لڑکی کی تقدیر میں کیا لکھا ہے یہ تو رخصتی کے بعد ہی اندازہ ہوتا ہے.....“

”بہر حال..... میں آپ کی تعریف کے بغیر بھی نہیں رہ سکتا اس لئے کہ.....“
 ”اس کے آگے کچھ نہ کہئے گا۔“ شائلہ بیگم نے تیزی سے شوہر کا جملہ کاٹتے ہوئے کہا۔ ”جوابات
 سینوں کی گہرائی میں دفن ہے اُسے دفن ہی رہنے دیجئے..... دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔“

”آپ درست کہہ رہی ہیں۔ ہمیں ان باتوں کو فراموش کر دینا چاہئے، لیکن شبانہ بہن.....
 وقار احمد کچھ کہتے کہتے رُک گئے۔

”آپا کا صبر اور آپ کی قربانی دونوں اپنی مثال آپ ہیں۔“ شائلہ بیگم کی آواز گلوگیر ہونے لگی
 وقار احمد نے جلدی سے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔

”آپ کے لئے میرے پاس ایک اہم اطلاع اور بھی ہے.....“
 ”وہ کیا.....؟“

”ابھی نہیں..... جب کافی کا دور چلے گا تب بتاؤں گا، ویسے اُس مسئلے میں آپ کا مشورہ بے
 ضروری ہے۔“

”کیا نثار بھائی کا کوئی خط آیا ہے.....؟“ شائلہ بیگم نے چونک کر دریافت کیا۔

”جی نہیں..... فی الحال ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

”پھر کیا بات ہو سکتی ہے.....؟“

”پہلے چل کر بچوں کے ساتھ چائے نوش فرمائیے پھر آرام سے گفتگو ہوگی۔“

”آپ نے تو ایک ذکر چھیڑ کر دھک دھکے میں ڈال دیا۔“

وقار احمد نے کوئی جواب نہیں دیا، بیوی کے ساتھ ڈرائنگ رُوم میں آگئے جہاں چاروں نے
 پہلے سے موجود تھے، فرحان اور صائمہ کے درمیان کسی بات پر گرما گرم بحث چل رہی تھی جو والد
 نے آنے سے ختم ہو گئی۔

”کیا بات ہے صائمہ بیٹی.....؟“ وقار احمد نے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ ”کس بات پر بحث
 ہو رہی تھی؟“

”شتر مرغ پر.....“ نادیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”شتر مرغ؟“ وقار احمد نے پوچھا۔ ”ذرا میں بھی تو سنوں کہ بحث کس مسئلے پر ہو رہی تھی۔“

”یہ فرحان کہہ رہا ہے کہ شتر مرغ کے چھ پاؤں ہوتے ہیں اور اس کا شمار جانور اور پرند
 دونوں میں ہوتا ہے جبکہ صائمہ اس بات پر اڑی ہوئی ہے کہ شتر مرغ صرف دو پاؤں کا قد آور پرند
 ہے جو افریقہ میں پایا جاتا ہے۔“ نادیہ نے تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا۔

”ناخاموش بیٹھی چائے بنانے میں مشغول تھی اور بھائی کی گفتگو سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

”میرا خیال ہے کہ صائمہ کا خیال درست ہے۔“ وقار احمد نے بیٹی کی تائید کی۔

”سن لیا تم نے.....؟“ صائمہ نے باپ کی حمایت حاصل ہو جانے کے بعد فرحان سے کہا۔

”وقت اپنی ہٹ دھرمی جتاتے رہتے ہو۔“

”ہم سب کو نہیں..... صرف مجھے جانا ہے.....“
”کیا مطلب.....؟“

”آپ کے قلم والد صاحب کا یہی فرمان ہے۔“ وقار احمد نے سنجیدگی سے کہا۔ ”انہوں نے کل ہمیں مدعو بھی کیا ہے اس لئے اُن کی خواہش ہے کہ سب کی ملاقات وہیں اُن کے گھر پر ہو۔“
”یہ کیوں نہیں کہتے کہ سالی کے استقبال کو تنہا جانے کے خواہشمند ہیں؟“ شائلہ بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا، پھر غرارہ سنبھالتی ہوئی انھیں اور کافی لانے کی غرض سے چلی گئیں۔
وقار احمد چند ٹانے تک بیوی کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے رہے، پھر قائل اٹھا کر دوبارہ اُس کے مطالعے میں مصروف ہو گئے۔

○○○

فرزانہ بیگم نے ”میری بچی“ کہہ کر شائلہ بیگم کو بے اختیار گلے لگایا تو عثمان علی کی آنکھوں کے گوشے بھی نمناک ہو گئے..... برسوں کے پھڑے آپس میں گھلے ملے تو چلوں کے پیچھے تھے آنسوؤں کے سوتے اُبل پڑے۔
ہر آنکھ اشکبار تھی..... ہر نگاہ پُر غم تھی..... دل کی دھڑکنیں احساسات کی ترجمانی کر رہی تھیں..... چلوں سے ڈھلکے آنسو جیتے دنوں کی یادوں کو دہرا رہے تھے.....
کیسا حسین تھا یہ ملاپ..... کتنے عجیب تھے یہ لمحات جب اشکوں کی زبانی مسرتوں کا اظہار ہو رہا تھا..... دقت کے سنگ میل کے نشانات آج دھندلانے لگے تھے..... شاید اس لئے کہ قاصطے سمت گئے تھے..... دُوریاں ختم ہو گئی تھیں..... جدائی نے ملاپ کا رُپ دھار لیا تھا.....
اور.....

بے تاب آرزوؤں اور بے چین تمنائوں کو قرار آ گیا۔
آج..... سترہ سال کے طویل انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئی تھیں۔
عثمان علی کے ویران گھر میں آج بہار کا ساں تھا۔ شائلہ بیگم کے وطن واپس آنے کی خوشی میں انہوں نے بڑی پُر تکلف دعوت کا اہتمام کیا تھا، وقار احمد اور شائلہ بیگم کے تمام گھر والے بھی موجود تھے۔ وسیع و عریض لان جو نہ جانے کتنی مدت سے سنسان اور ویران تھا آج بھر نور بنا ہوا تھا۔ ایک طرف شامیانے کے نیچے صوفوں کو نہایت ترتیب سے رکھا گیا تھا، دوسری طرف کھانے کی میزوں پر اچھی سفید چادر پئی اور قیمتی برتن بڑے سلیقے سے چنے گئے تھے۔ یوں تو عثمان علی کی رہائش گاہ کے اندر بھی خاصی منجانبی تھی، فرزانہ بیگم نے کہا جی تھا کہ کھانے پینے کا اہتمام ڈاننگ روم میں ہوا اور نشست و برخاست کے لئے ڈاننگ روم کو استعمال کیا جائے لیکن عثمان علی نے برسوں کے بعد بیٹی کی آمد کی فوجی میں پورے جشن کا اہتمام کر ڈالا، وہ اس پُر مسرت موقع پر اپنے کچھ دیرینہ ساتھیوں اور دُور سے آئے عزیز داروں کو مدعو کرنا چاہتے تھے لیکن فرزانہ بیگم نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ اس تقریب کو پھر کسی موقع کے لئے اٹھا رکھا جائے اور پہلی دعوت میں صرف گھر کے لوگ شریک ہوں تاکہ بے تکلفی کے ساتھ مل جل کر ملا جائے۔

شائلہ بیگم اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ دو پہر ہی آگئی تھیں تاکہ گھر کے کام کاج میں والدین کا اٹھ بٹا سکیں۔ سب کام منٹ گیا تو شائلہ بیگم کی آمد کا انتظار شروع ہو گیا۔ فرزانہ بیگم کی نظر س بار بار بالک کی جانب اٹھ رہی تھیں۔ بیٹی کے انتظار میں گزرتے وقت کا ایک ایک لمحہ اُن کے لئے ناقابل

بات کو بھی دھیان میں رکھیں کہ آپ کے کاروبار کو جمانے میں خان بہادر صاحب کی کوششوں اور سہرا بڑا دخل ہے، پھر آپ سے اُن کی عزیز داری بھی ہوتی ہے۔ ہم انہیں ناراض تو نہیں کر سکتے۔“
”ہاں خان بہادر صاحب کی نہیں، راحیل کی ہو رہی ہے۔“ وقار احمد نے مزید تفصیل دیتا ہوئے کہا۔ ”دولت کی ریل پیل اور سر پر باپ کا سایہ نہ ہونے کی وجہ سے صاحبزادے کو کھلی چھٹ ہوئی ہے..... خدا نظر بد سے بچائے تین سال سے ایف اے میں لڑھکنیاں کھا رہے ہیں لیکن خان بہادر صاحب کہہ کیا مجال ہے جو کان پر ایک جوں تک رہنکی ہو..... اور فیشن کا یہ عالم ہے کہ سے رات تک میں تین تین سوٹ بدلے ہیں..... اب بتائیے، کیا ہمارے بچوں پر اُس کی صحبت نہیں پڑے گا؟“

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہمارے بچوں کی صحبت میں رہ کر وہ سدھر جائے۔“ شائلہ بیگم نے ”بن باپ کا بچہ ہے، اُس کے سر پر کسی بڑے کا ہاتھ تو ہونا چاہئے۔“
”خان بہادر صاحب کا بھی یہی خیال ہے۔“

”پھر آپ نے کیا سوچا ہے.....؟“
”یہی تو سوچ رہا ہوں کہ کیا جواب دیا جائے؟“
”میرا تو خیال ہے کہ آپ بلا لیں راحیل کو..... اس طرح خان بہادر صاحب کی دل شکنی نہیں ہوگی۔“ شائلہ بیگم نے کہا۔ ”دو تین سال کی تو بات ہے..... کون سا راحیل کو زندگی بھر ہمارا ساتھ رہتا ہے..... میں ایک سی صاف کرائے دیتی ہوں، آپ کل ہی خان بہادر صاحب کو جواب دیں۔“
”پھر سوچ لیجئے اچھی طرح..... کہیں ایسا نہ ہو کہ راحیل کی تکمیل مستقل طور پر ہمارے گلے

جائے۔“
”کیا مطلب.....؟“
”مطلب یہ کہ کیا آگ اور پٹرول کا ساتھ مناسب ہوگا؟“
”میں اب بھی نہیں سمجھی..... کل کر کہئے، آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟“
”آپ بھی کمال کرتی ہیں بیگم! اتنی موٹی سی بات آپ جی عقل میں نہیں آرہی ہے کہ شاد اور خیر سے جوان ہو رہی ہیں۔“ وقار احمد نے بیوی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کی اور خیر خواہی راحیل کو اسی گھر میں دیرہ جمانے پر مجبور کر دے۔“
”اول تو ایسا ممکن نہیں..... کہاں خان بہادر آصف علی اور کہاں ہم..... اور قسمت سے آگ ہو بھی گیا تو اس میں حرج بھی کیا ہے؟“ شائلہ بیگم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”ایسے رشتے تو قوالوں کو ملتے ہیں..... البتہ لڑکے کا شریف، نیک اور تعلیم یافتہ ہونا شرط ہے..... رہا شاد اور نا معاملہ تو مجھے اپنی بچیوں پر مکمل اعتماد ہے۔“
”اعتماد تو آپ کو اپنے اوپر بھی بہت تھا لیکن نتیجہ کیا نکلا..... میری ضد کے آگے آخر آپ کو

ڈالنے پڑے۔“
”ہٹے بھی..... آپ بھی کس زمانے کی باتیں لے بیٹھے۔“ شائلہ بیگم نے قدرے شرماتے کہا، پھر کچھ سوچ کر بولیں۔ ”ارے ہاں..... آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں ہمیں کل ایئر پورٹ کس چلنا ہے؟“

”ہونہ..... ہر وقت کا اترا نا بھی اچھا نہیں لگتا۔“ صائمہ نے جل کر کہا تو فرحان نے مسکرا کر برکت کہا۔ ”اس میں میری ذہانت کو نہیں، آپ کی تنگ نظری کو زیادہ دخل ہے۔“

”خدا کے واسطے.....“ نادیہ نے کہا۔ ”اس وقت تو تم دونوں لڑائی سے باز آ جاؤ۔ خالہ جان اور خالو جان سب گئے تو کیا کہیں گے؟“

فرحان نے نادیہ کی نگاہیں بچا کر صائمہ کو منہ چڑایا پھر بڑی معصومیت سے ثنا کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ دوسری جانب عثمان علی نے بیٹیوں سے کہا۔

”کیا یہیں روش پر کھڑے رہنے کا ارادہ ہے.....؟“

باپ کی آواز سن کر شبانہ بیگم اور شائلہ بیگم علیحدہ ہو گئیں، پھر سب لوگ لان میں آ گئے۔ شبانہ بیگم ثنا، نادیہ اور صائمہ سے بڑے پیار سے ملیں پھر فرحان سے بولیں۔ ”تمہارے بارے میں تو شائلہ کے ہر خط میں تعریف کے پل موجود ہوتے تھے۔“

”خدا نظر بد سے بچائے، چہرے سے بھی ذہانت چپکتی ہے۔“ جمال احمد نے کہا تو فرحان مارے خوشی کے اور پھول گیا۔

”اب اتنی تعریف بھی نہ کیجئے بھائی صاحب.....“ شائلہ بیگم مسکرا کر بولیں۔ ”ابھی آپ اس کی شرارتوں سے واقف نہیں ہیں۔“

”شرارت اگر تہذیب کے دائرے میں ہو تو وہ بذات خود بھی ذہانت کی دلیل ہے۔“ جمال احمد بولے، پھر انہوں نے ثنا کی جانب غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ثنائی! ہم نے تمہاری ذہانت کے بارے میں بھی بہت کچھ سن رکھا ہے۔“

”ضرور سنا ہو گا.....“ فرحان نے جلدی سے کہا۔ ”آخر میری بہن جو ہیں۔“

فرحان کی بات پر سب ہی ہنس دئے البتہ صائمہ نے مسکراتے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی۔ پھر کچھ دیر بعد کھانے کا دور شروع ہوا۔ پھر ہوا میں کھلی بڑھنے لگی تو سب لوگ اندر ڈرائنگ روم میں آ گئے۔

شبانہ بیگم ماں اور بہن کے ساتھ بیٹھ کر باتوں میں مصروف ہو گئیں، عثمان علی دونوں دامادوں کے ساتھ ایک طرف بیٹھ کر جمال احمد سے آئندہ کے بارے میں گفتگو کرنے لگے، منصور کو اپنی ٹیم میں شامل کرنے کی خاطر فرحان نے اپنے قریب بٹھالیا۔ قریب ہی ثنا، نادیہ اور صائمہ بھی موجود تھیں۔ سب لوگ بہت جلد آپس میں کھل مل گئے۔ فرحان کی دلچسپ باتوں نے سب کو بے تکلفی پر آمادہ کر دیا۔

”ایک بات پوچھوں آپ سے.....؟“ منصور نے کچھ دیر بعد فرحان سے کہا۔

”ارشاد.....“ فرحان نے سنجیدگی سے بزرگوں جیسے انداز میں منصور کی طرف دیکھا۔

”میں آپ کو کیا راگ.....؟“

”پہلی ملاقات ہے اس لئے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا..... لیکن میرا اندازہ ہے کہ آپ ہماری ٹیم میں چل سکتے ہیں۔“

”آپ نے کوئی ٹیم بھی بنا رکھی ہے؟“ منصور نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”جی ہاں، ہماری باقاعدہ ٹیم ہے جس کی ممبر شپ نئے لوگوں کو بہت سوچ سمجھ کر دی جاتی ہے۔“

”گو یا ہمیں آپ کی ٹیم میں شامل ہونے کے لئے باقاعدہ درخواست دینی ہوگی۔“ منصور نے دریافت کیا۔

”آپ کی ٹیم کا کپتان کون ہے؟“

”احمر بھائی.....“ فرحان نے جلدی سے کہا۔ ”لیکن وہ چونکہ زیادہ تر نیروبی میں رہتے ہیں اس

پرداشت تھا۔ پھر جب پروفیسر جمال احمد کی گاڑی پھاٹک سے اندر داخل ہوئی تو فرزانہ بیگم مہر سکیں، اپنی نشست سے اٹھ کر تیزی سے روش کی جانب بڑھیں اور بیٹی جیسے ہی گاڑی سے نکلے، بچی“ کہہ کر اسے بے اختیار ممتاز کی آغوش میں سمیٹ لیا۔

عثمان علی نے نہایت شفقت سے جمال احمد کے سر پر ہاتھ پھیرا، منصور کو گلے لگا کر ڈھک دیا۔

شبانہ بیگم ماں سے جدا ہوئیں تو شائلہ بیگم آگے بڑھیں اور آپا جان کہتی ہوئی بہن سے لگیں۔ ثنا، نادیہ، صائمہ اور فرحان دُور کھڑے بزرگوں کو ایک دوسرے سے گلے ملتے دیکھ رہے۔

روش کی دوسری جانب سفید پوش ملازم ہاتھ باندھے موجود تھے۔

شبانہ بیگم کو ایئر پورٹ پر لینے کے لئے صرف وقار احمد گئے تھے اس لئے دونوں بہنوں کا، بھی عثمان علی کے جنگلے پر ہوا۔ ایک دوسرے سے مل کر وہ دل کی دھڑکنوں کی زبانی ایک دوسرے احساسات کا بڑی دیر تک اندازہ لگاتی رہیں۔

”مجھے ایئر پورٹ پر تمہاری آمد کا بڑی شدت سے انتظار تھا۔“ شبانہ بیگم نے سرگوشی کی۔

”میں ضرور آئی آپا! لیکن ابا جان کا خیال تھا کہ سب ایک ساتھ آپ کا استقبال کریں۔“

”م..... میں تمہاری بہت احسان مند ہوں شائلہ.....!“

”آپا جان.....“ شائلہ بیگم کی آواز بھرا گئی۔ ”خدا کے لئے مجھے شرمندہ نہ کریں۔“

”تم اور وقار بھائی بہت عظیم ہو.....“

”یہ سب آپ بزرگوں کی دُعاؤں کا نتیجہ ہے.....“

بہنوں کے درمیان سرگوشیوں میں باتیں ہوتی رہیں، دوسری جانب فرحان نے بڑی معصومیت سے ثنا سے پوچھا۔ ”بڑی آپا! کیا امی جان کی طرح ہمیں بھی خالہ جان سے گلے مل کر دونا پڑے؟“

”دو چار آنسو بہا لیتا.....“ صائمہ نے جلدی سے کہا۔ ”کم از کم اسی بہانے ہم تمہاری آ“

میں آنسو تو دیکھ لیں گے۔“

”میرا تم سب سے آخر میں آئے گا۔“ فرحان نے حسب مراتب کے اعتبار سے جواب مجھ سے پہلے آپ کو ٹسوے بہانا پڑیں گے۔“

”بڑوں کی بات اور ہوتی ہے۔“ نادیہ بولی۔ ”ہم تو خالہ جان سے مل کر خوشی کا اظہار کریں گے۔“

”اور آپ بڑی آپا.....؟“ فرحان نے ثنا کی طرف دیکھا۔ ”آپ کے کیا ارادے ہیں؟“

”ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“ ثنا نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”جب موقع آئے گا تب جانے گا۔“

”منصور بھائی کے سلسلے میں آپ کا کیا خیال ہے.....؟“ فرحان نے منصور کو دیکھتے ہوئے جو اپنے والد اور وقار احمد کے درمیان سر جھکائے خاموش کھڑے تھے۔

”کس سلسلے میں خیال دریافت کر رہے ہو؟“ نادیہ نے پوچھا۔

”یہی کہ ہمارے اور منصور بھائی کے درمیان کیسے نیچے گی؟“ فرحان نے بدستور منصور کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”صورتِ شکل اور رکھ رکھاؤ کے اعتبار سے تو ڈیٹنٹ معلوم ہوتے ہیں لیکن۔“

نہیں جتنے ہمارے احمر بھائی ہیں۔“

”تم نے اس کا اندازہ قبل از وقت کیسے کر لیا؟“ صائمہ نے پوچھا۔

”اپنی اپنی ذہانت اور قیافہ شناسی کی بات ہے۔“ فرحان نے بڑوں جیسے انداز میں جواب

”آپ اپنی تصاویر سے بہت مختلف نظر آتے ہیں۔“ نادیا نے دہلی زبان میں اظہارِ خیال کیا۔
”میں سمجھا نہیں.....؟“

”میں بتاتا ہوں.....“ فرحان تیزی سے بولا۔ ”پچھلے دنوں جب خالہ جان نے آپ کا فوٹو بھیجا تو باجی نے.....“

”فرحان.....“ نادیا نے بھائی کو جلدی سے ٹوکا۔ ”تم چپ نہیں رہو گے.....؟“

”آپ نے خود ہی تو ذکر چھیڑا ہے، پھر مجھے کیوں ٹوک رہی ہیں؟“

”بڑی بات ہے فری.....“ ثناء نے پیار سے فرحان کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”بڑوں کے سامنے ی باتیں نہیں کرتے۔“

”میرا خیال ہے کہ آپ نے میری عمر کا اندازہ غلط لگایا ہے۔“ منصور نے نہایت معصومیت سے ہاتھ پر فرحان کو اُکسانے کی خاطر بولے۔ ”ذہین بچوں کو سچ بولنے سے بھی نہیں روکنا چاہئے۔ ان برا اثر ڈالتا ہے۔“

”لیکن اکثر باتیں بتانے کی نہیں ہوتیں۔“ نادیا نے کہا۔

”مثلاً یہ کہ باجی نے آپ کا فوٹو دیکھ کر بدھو مہاراج کا خطاب دے ڈالا تھا۔“ فرحان نے اپنی منہ پر ہاتھ رکھ کر فرحان کو اُکسانے کی خاطر بولے۔ ”نظریں اٹھا کر اُس نے منصور کے چہرے کے ثبات دیکھنے کی کوشش کی تو اور شرمندہ ہو کر نظریں جھکا لیں۔“

منصور کے چہرے پر کسی شکوے یا شکایت کی بجائے ایک شوخ سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وہ ی اپنائیت بھری نظروں سے نادیا کو دیکھ رہے تھے اور نادیا نے اُن کی نگاہوں کی تاب نہ لاسکی، جلدی سے دروازے پر چل کر پلٹ کر آیا۔ اُسے فرحان کے اوپر غصہ بھی آ رہا تھا اور پیار بھی..... غصہ مائلے کہ اُس نے نادیا کی بات کا کھلے بندوں اظہار کر دیا تھا اور پیار اس لئے کہ اگر فرحان نے وہ بات نہ کہی ہوتی تو شاید منصور اُسے اتنی اپنائیت سے نہ دیکھتے..... جانے کیا بات تھی اُن نظروں میں کہ شرمندہ ہونے کے باوجود اندر ہی اندر گنگنا اُٹھی.....

نگاہوں کا وہ پہلا تصادم بے حد حسین تھا..... وہ اس سحر میں ڈوبنے لگی..... لیکن منصور کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔ ”اب کیا خیال ہے آپ کا میرے بارے میں..... تصویر سے مختلف نظر آ رہا ہوں یا اب بھی.....“

”پلیز.....“ نادیا نے ہنسنے کی شکل خود کو سنبھالتے ہوئے جلدی سے کہا۔ ”آپ فرحان کی بات کا کوئی نہ لیجئے گا۔ وہ بات تو میں نے.....“

”میں آپ کا تازہ خیال دریافت کر رہا ہوں۔“ منصور نے نادیا کا جملہ کاٹتے ہوئے بھولپن اُٹھا۔

”جی تو میں آپ کو بتانا چاہ رہی تھی کہ آپ تصویر سے بالکل مختلف نظر آ رہے ہیں۔“ خدا کا شکر ہے.....“ منصور نے ایک تھنڈی سانس لی..... ”اگر آپ نے اپنی رائے میں

رہنا نہ پیدا کی ہوتی تو مجھے سوچنا پڑتا کہ پاکستان میں زکوں یا واپس لوٹ جاؤں.....“

”اب کیا فیصلہ کیا ہے؟“ ثناء نے نادیا کے چہرے پر پھونٹنے والی شق کو دیکھ کر منصور سے ہلکا سا سوال کیا۔ ”اب تو واپس کا ارادہ نہیں ہے؟“

”نی الحال کچھ یقین سے نہیں کہہ سکتا..... کون جانے، کل پھر لوگوں کی رائے بدل گئی تو میرا کیا

لئے اُن کی غیر موجودگی میں یہ ذمہ داری بھی مجھے ادا کرنی پڑتی ہے۔“

”ویری گڈ..... اور آپ کی ٹیم میں کون کون لوگ شامل ہیں؟“

”ایک یہ بقلم خود اور ایک ان کے احقر بھائی۔“ صائمہ نے قدرے جلدی سے اُگلاز میں جواب دیا۔ ”تیسرے ممبر غالباً آپ ہوں گے۔“

”اور آپ کا تعلق کس ٹیم سے ہے؟“ منصور نے صائمہ سے دریافت کیا۔

”یہ ہماری مخالف ٹیم کی کپتانی صاحبہ ہیں۔“ فرحان نے جلدی سے کہا۔ ”باقی رہیں ہماری یو آپا اور باجی تو ابھی تک اُن کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“

”فرحان.....“ ثناء نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”کچھ ہمیں بھی بولنے کا موقع دو گے؟“

”آپ کہتی ہیں تو میں خاموش ہو جاتا ہوں۔“ فرحان نے نہایت سعادت مندی سے جواب دیا۔ ”کچھ دیر تک اُن کے درمیان اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں، پھر نادیا نے اچانک منصور سے سوال کیا۔“

”سنا ہے آپ نے بی، کام کا امتحان اعزازی نمبروں سے پاس کیا ہے؟“

”جی ہاں..... دیار غیر کا پاس تھا اس لئے شاید انگریز مچھوں کو ترس آ گیا.....“

”اب کیا ارادہ ہے.....؟“ ثناء نے پوچھا۔

”ڈیڈی کا خیال تھا کہ میں اپنے قدموں پر کھڑا ہوں، لیکن ماما کا خیال ہے کہ ایم، کام کے بہ ملازمت کی جائے۔“

”آپ نے کیا سوچا ہے؟“ نادیا نے دلچسپی لیتے ہوئے دریافت کیا۔

”میں ماما کی بات سے انکار نہیں کر سکتا۔“

”یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔“

”آپ کا کیا شغل ہے؟“ منصور نے دہلی زبان میں نادیا سے پوچھا۔ ”میرا مطلب ہے کہ.....“

”میں نے اس سال ایف، ایس، سی پارٹ دن کا امتحان دیا ہے اور آئی نے فائل کا.....“

”اور میں حسب معمول فرسٹ پوزیشن حاصل کرنے کے بعد ساتویں کلاس سے آٹھویں کلا

ا آ گیا ہوں۔“ فرحان نے صائمہ کو دیکھ کر کھنکھارتے ہوئے کہا۔

”اپنے منہ میں مٹھو بننا ایسے ہی موقعوں کے لئے کہا گیا ہے۔“

”منصور بھائی.....“ فرحان نے اچانک کچھ سوچتے ہوئے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ ”کیا آپ ی کسی چیز کے جلنے کی بو محسوس ہو رہی ہے؟“

”کیا مطلب.....؟“

”کچھ نہیں.....“ ثناء مسکرا کر بولی۔ ”یہ صائمہ کو چھیڑنے کی خاطر کہہ رہا ہے۔“

”اوہ.....“ منصور مسکرا کر فرحان کو دیکھنے لگے پھر ثناء سے بولے۔ ”آپ نے مستقبل کے بارے

کا کیا سوچا ہے؟“

”میڈیکل کالج میں داخلہ لینے کا ارادہ ہے.....“

”بڑا نیک خیال ہے۔“

”ایک بات کہوں..... اگر آپ برائہ بنائیں؟“ نادیا بولی۔

”یہ اندازہ آپ نے کیسے لگا لیا کہ میں کسی بات کا برا ماناؤں گا؟“ منصور نے فراخ دلی سے کہا۔
رنا دیا کو بھر پور نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

”تم اس وقت بہت مٹی سی تھیں اس لئے شاید تمہیں یاد بھی نہ ہو۔“ جمال احمد نے بدستور راتے ہوئے کہا۔ ”جب ہم منصور میاں کو لے کر باہر جا رہے تھے تو شاملہ بہن نے تمہیں ہم سے لیا تھا۔ کیا تمہیں یہ بات نہیں بتائی گئی؟“

”آپ شاید مذاق کر رہے ہیں۔“ ثناء نے ایک شوخ تبسم لبوں پر بکھیرتے ہوئے جواب دیا۔

”چلو مذاق ہی سہی لیکن تمہیں اسی بہانے ڈاکٹری پڑھنے کی اجازت تو دلوادی میں نے۔“

”بہت بہت شکریہ خالو جان۔“

شبانہ بیگم اپنی جگہ کم صم بیٹھی سب کچھ سن رہی تھیں۔ فرزانہ بیگم نے جلدی سے گفتگو کا موضوع لے ہوئے جمال احمد سے پوچھا۔ ”منصور میاں کے بارے میں تم نے کیا سوچا ہے؟“

”میرا خیال تو یہ تھا کہ منصور کو اب اپنی ذمہ داریوں کا بوجھ سنبھالنے کی خاطر عملی زندگی میں قدم اچاڑے۔ لیکن شبانہ بیگم کا مشورہ ہے کہ اسے پہلے ایم، کام کرا دیا جائے پھر کوئی قدم اٹھایا جائے۔“

”نہایت مناسب اور معقول مشورہ ہے۔“ عثمان علی نے کہا۔ ”بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ اگر بی، اے بھی کرا لیا جائے تو اور زیادہ مناسب ہوگا۔ اس طرح وہ کاروبار میں تمہارا ہاتھ بھی بٹا سکتا۔“

”بات منصور کے مستقبل اور جمال احمد کے کاروبار کی شروع ہو گئی تو شاید اجازت لے کر واپس نشست پر آگئی جہاں فرحان اور منصور کے درمیان خاصی گاڑھی چھن رہی تھی، یوں محسوس ہو رہا تھا، وہ برسوں سے ایک دوسرے سے واقف ہوئے۔ نادیہ اپنی جگہ بیٹھی بڑی دلچسپی سے اُن دونوں کے بیان ہونے والی گفتگو سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

رات گئے تک محفل اسی طرح جی رہی، پھر جمال احمد نے جانے کی اجازت طلب کی تو سب اُٹھ کھڑے ہوئے، عثمان علی اور فرزانہ بیگم بھی بچوں کے ساتھ بیٹی اور داماد کو چھوڑنے کی خاطر نی پھاٹک تک آئے۔ شبانہ بیگم نے رخصت ہونے سے پیشتر ایک بار پھر سب بچوں کو گلے لگا کر رسائی دے گئیں، پھر والدین کو سلام کرتی ہوئی گاڑی میں بیٹھ گئیں۔ اُن لوگوں کے جانے کے بعد وفاق احمد بھی اپنے بال بچوں سمیت رخصت ہو گئے۔!!



”ہوگا۔“ نادیہ نے فرحان کو مسکراتے ہوئے گھورا۔ ”تمہیں تو میں بعد میں سمجھوں گی۔“

”مشکل ہے۔“ صائمہ نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جلدی سے کہا۔ ”شیطان کو رات راست پر لانا سمجھنا بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔“

فرحان پلٹ کر جواب دیتا چاہتا تھا لیکن اُسی وقت عثمان علی نے ثنا کو آواز دی تو سب اُن کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ”ادھر آؤ بیٹی۔“ تم کو تمہارے خالو جان بلارہے ہیں۔“

شنادو پنے کو سنبھالتی آہستہ سے اُٹھی، چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی پروفیسر جمال احمد کے قریب جا کر بیٹھ گئی۔ شبانہ بیگم کی آنکھوں میں سرسبز جاگ اُٹھیں۔ وہ ثنا کو والہانہ نظروں سے دیکھنے لگیں۔

”میں نے سنا ہے کہ ہماری بیٹی ڈاکٹر بننے کے بارے میں غور کر رہی ہے۔“

”جی ہاں۔۔۔۔۔ ارادہ تو ہے، بشرطیکہ امی اور ابو خوشی سے اجازت دے دیں۔“ ثناء نے والدین کی سمت باری باری دیکھتے ہوئے معصومیت سے جواب دیا۔

”میری جانب سے تو تمہیں پوری اجازت ہے۔“ وقار احمد نے کہا۔ ”البتہ تمہاری ماں کچھ دھل مل یقین ہی نظر آتی ہیں۔“

”کیوں شاملہ بہن۔۔۔۔۔؟“ پروفیسر جمال احمد نے شاملہ بیگم کی جانب وضاحت بھری نظروں سے دیکھا۔

”خیال تو نیک ہے بھائی صاحب! لیکن۔۔۔۔۔“

”لیکن کیا۔۔۔۔۔؟“

”ڈاکٹر بننے میں پانچ چھ سال لگتے ہیں اور۔۔۔۔۔ شاملہ بیگم ثنا کی جانب دیکھ کر کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔

”میں آپ کا مقصد سمجھ رہا ہوں۔ لیکن ہر کام اپنے وقت پر ہی مناسب ہوتا ہے۔“ جمال احمد نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میرا مشورہ تو یہی ہے کہ ثنا کو اگر تعلیم حاصل کرنے کا شوق ہے تو اسے روکنا مناسب نہ ہوگا۔“

”آپ کا کہنا بھی درست ہے بھائی صاحب لیکن۔۔۔۔۔“

”لیکن ویکن کچھ نہیں۔“ جمال احمد جلدی سے بولے۔ ”اگر ثناء بیٹی نے ڈاکٹر بننے کا فیصلہ کر لیا ہے تو پھر وہ ضرور ڈاکٹری پڑھے گی۔ کیوں وقار بھائی! آپ کا کیا فیصلہ ہے؟“

”میں تو پہلے ہی سے ثنا کا ہم خیال ہوں۔“ وقار احمد پہلو بدل کر بولے۔

”شاملہ بیٹی۔۔۔۔۔ جب سب کی یہی رائے ہے تو پھر تمہیں بھی کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔“

عثمان علی نے بڑے داماد کی تائید کی۔

”جیسی آپ سب کی مرضی۔۔۔۔۔ شاملہ بیگم نے بڑی بہن کی طرف دیکھا۔

”اچھا ہوا جو آپ نے فوری طور پر ہتھیار ڈال دیے ورنہ پھر ہمیں ثنا کو بتانا پڑتا کہ یہ کس کی بیٹی ہے۔“ جمال احمد نے مسکراتے ہوئے کہا تو ثنا کے علاوہ شبانہ بیگم اور دوسرے افراد بھی چونک اُٹھے۔

”میں سمجھی نہیں خالو جان!“ ثناء نے نہایت معصومیت سے کہا، پھر اپنی ماں کی طرف وضاحت طلب نظروں سے دیکھنے لگی، اُسے معلوم تھا کہ وہ جملہ محض تفریح میں کہا گیا ہے لیکن نہ جانے کیوں وہ سنجیدہ سی ہو گئی۔

رات کو کھانے کی میز پر جب گھر کے تمام لوگ جمع ہوئے تو شاملہ بیگم اپنے تجربے کی کسوٹی پر اہل کو پڑھتی رہیں، اُن کی نظریں بار بار راحیل کی جانب اٹھتی رہیں، اور انہیں یہ دیکھ کر دلی مسرت دلی کہ راحیل نے کوئی ایسا نازیا حرکت نہیں کی جس کی وجہ سے اُس کے کردار پر شبہ کیا جاتا۔ اس کے برعکس اُس نے نہایت سلیقے اور مہذب انداز کا مظاہرہ کیا۔ البتہ اپنے کپڑوں کو بار بار کچھ اس انداز میں ٹھیک کرنے لگتا جیسے اُن کی نمائش مقصود ہو۔

صورتِ مشکل کے اعتبار سے شاملہ بیگم کو راحیل پہلی ہی نظر میں بہت بھا گیا۔ اُس کے چہرے پر بھولا پن اور معصومیت نظر آئی وہی اُس کی شرافت اور نیک کردار کی دلیل سمجھ گئی۔ وقار احمد پہلے ہی بتا چکے تھے کہ سر پر کسی بزرگ کا سایہ نہ ہونے کی وجہ سے راحیل نے خود کو کالج کے احاطے میں داخل ہونے ہی بے حد آزاد اور خود مختار سمجھ لیا ہے لیکن ابھی تک اُس کے کردار پر اُن جراثیم نے حملہ نہیں کیا جو نہ صرف یہ کہ اُبلے دامن کو داغدار کر دیتے ہیں بلکہ انسان کو غلط راستوں کی طرف لے جاتے۔

بہر حال شاملہ بیگم نے ذاتی طور پر راحیل کے بارے میں جو رائے قائم کی وہ بہت اچھی تھی، اُس نے آنے سے پیشتر انہیں جو خوف لاحق تھا وہ جاتا رہا، انہوں نے اس بات کا اندازہ لگا لیا کہ اگر راحیل کو پیار سے سدھارنے کی کوشش کی جائے اور پڑھائی کی جانب راغب کیا جائے تو اُس کا مستقبل نور سکتا ہے۔ کھانے کے دوران شاملہ بیگم نے ایک دوبار اُسے مخاطب بھی کیا اور انہیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ راحیل نے نہ صرف یہ کہ بڑے ادب سے اُن کی بات کا جواب دیا بلکہ کھانے کے دوران زیادہ نظریں جھکائے بیٹھا رہا، عام لڑکوں کی طرح نہ تو اُس نے لڑکیوں کی جانب دُزدیدہ نگاہوں سے دیکھنے کی کوشش کی نہ ہی بے تکلف ہونے کی کوشش کی۔

”کیا بات ہے راحیل میاں.....“ شاملہ بیگم نے اُس کی خاموشی کو ٹٹولنے کی خاطر بڑے پیار سے چما۔ ”تم اس قدر چپ کیوں بیٹھے ہو؟“

”جی.....“ راحیل نے چونک کر شاملہ بیگم کی طرف دیکھا پھر نظریں جھکا کر بڑے بھولپن سے کہا۔

”کوئی خاص بات نہیں.....“

”کوئی نہ کوئی بات تو ضرور ہے۔“ شاملہ بیگم نے کہا۔ ”تمہارے بہن بھائی موجود ہیں ان سے انہو دا اب تو تمہیں نہیں ہماری ساتھ رہنا ہے پھر یہ اجنبیت کا احساس کب تک باقی رہے گا؟“

”آپ درست کہہ رہی ہیں آئی لیکن.....“ راحیل نے رُک رُک کر جواب دیا۔ ”انسان اتنی جلدی ہونے لگے کہ مانوس نہیں ہو جاتا اور میں..... میں تو پہلی بار میری سے اتنا دُور ہوا ہوں۔“

”دُوری کس بات کی.....؟“ شاملہ بیگم نے راحیل کے احساسات سے متاثر ہوتے ہوئے بڑی اہمیت کا اظہار کیا۔ ”یہاں میں جو موجود ہوں تمہارا خیال رکھنے کے لئے..... اور پھر لاہور اور کراچی، درمیانِ فرق ہی کتنا ہے، تم جب دل چاہے ایک دو دن کے لئے ماں سے ملنے جا سکتے ہو، فون پر نانہ بات کر سکتے ہو۔“

”آپ نے ٹھیک کہا آئی! لیکن وقتی طور پر ماحول کی تبدیلی کا احساس تو ہوتا ہے۔“

”جی وقار میاں..... یہ آئی کا رشتہ بھی آج تک میری سمجھ میں نہیں آ سکا۔“ خان بہادر آصف علی انور سے کی ٹھن دُور کرنے کی خاطر بذلہ سخی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”جہاں کوئی رشتہ سمجھ میں نہ آئے وہاں آئی اور انکل کہہ کر با آسانی کام چلایا جا سکتا ہے..... اگر یزدوں نے جہاں ہماری تہذیب و

خان بہادر آصف علی بخش نفس اپنے نواسے کو کراچی چھوڑنے کی خاطر اُس کے ہمراہ آئے تھے۔ شاملہ بیگم نے راحیل کے آنے سے پیشتر ہی انکیسی کو ملازموں کے ذریعے خوب اچھی طرح صاف کرادیا تھا، کہنے کو تو اُن کی انکیسی دو کمروں پر مشتمل تھی لیکن اُس میں ایک مختصر سا خاندان بڑی آسائے سے زندگی گزار سکتا تھا۔ دو کمروں کے علاوہ ایک چھوٹا سا ستور اور خاصا کشادہ بارہاچی خانہ تھا، کمروں کے ساتھ ہی غسل خانے بھی تھے۔ انکیسی کا برآمدہ بہت زیادہ کشادہ تو نہ تھا لیکن وہاں بھی چار کرسیوں کی نمائش موجود تھی، برآمدے میں بیٹھ کر پورے لان کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔

بنگلے میں انکیسی کی موجودگی وقار احمد کے کاروبار کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ جب بھی اُن کے کوئی کاروباری مہمان دُور دراز کے شہروں سے آتے، انہیں اسی انکیسی میں ٹھہرایا جاتا۔ غرضیکہ شاملہ بیگم نے اُسے ہر طریقے سے ٹھیک ٹھاک کرادیا۔ ایک کمرے میں رہائش کے اعتبار سے تمام ضروریات کی چیزیں نہایت سلیقے سے رکھ دی گئیں اور دوسرے کمرے کو ڈرائنگ روم کے طور پر آراستہ کر دیا گیا خان بہادر آصف علی کے علاوہ راحیل نے بھی انکیسی کو آئیڈیل قرار دیا۔

وقار احمد کو خان بہادر صاحب کی حیثیت کا اندازہ بخوبی تھا اس لئے انہیں اپنے ساتھ بنگلے کے ایک کمرے میں ٹھہرایا، راحیل کے ساتھ جو سامان آیا تھا اُسے شاملہ بیگم نے اپنی موجودگی میں ملازموں سے انکیسی میں رکھوا دیا..... خان بہادر کی آمد نے اُن کے ہاتھ پیر بھی پھلا دیئے تھے۔ اس سے پیشتر اُن کو ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ لیکن یہ بات اُن کو پہلے سے معلوم تھی کہ خان بہادر صاحب نہ صرف کہ وقار احمد کے عزیزوں میں سے ہیں بلکہ وقار احمد نے اپنے کاروبار میں جو ترقی حاصل کی تھی اُن میں بھی خان بہادر آصف کی کوششوں کو بے حد دخل حاصل تھا۔

بچوں کو شاملہ بیگم نے پہلے ہی سے آنے والے مہمان کے بارے میں بتا دیا تھا اور سختی سے تاکید دی تھی کہ اُس کا ہر طرح سے خیال رکھا جائے۔ خاص طور پر فرحان کو سمجھایا گیا تھا کہ وہ راحیل سے اُن وقت تک زیادہ راہ و رسم بڑھانے کی کوشش نہ کرے جب تک راحیل کے طور طریقے واضح نہ ہو جائیں اور اُسے شرافت کی کسوٹی پر پوری طرح پرکھ کر دیکھ نہ لیا جائے۔ وقار احمد بھی یہی چاہتے تھے کہ راحیل اُن کے گھر میں ہر طرح کی آزادی حاصل رہے لیکن خاص طور پر لڑکیاں اُس وقت تک بے تکلفی انداز اختیار نہ کریں جب تک یہ نہ دیکھ لیا جائے کہ صاحبزادے کس کینڈے کے مالک ہیں اور اُن رکھ رکھاؤ کا انداز کس قماش کا ہے۔

شاملہ بیگم چونکہ ماں تھیں اس لئے انہیں شوہر کے مقابلے میں ان باتوں کی کچھ زیادہ ہی فکر لاحق تھی۔ لیکن راحیل کو ایک نظر دیکھنے کے بعد ہی انہوں نے اس بات کا بخوبی اندازہ لگا لیا تھا کہ لڑکا چالا چلن کے اعتبار سے برا نہیں البتہ امارت کے احساس نے اُسے زندگی کے شیب و فراز سے بڑی حد تک بیگانہ کر رکھا ہے جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ باپ کے سائے سے محروم تھا اور یہی ایک احساس تھا جس نے شاملہ بیگم کے دل میں راحیل کے لئے ہمدردی کی خاصی گنجائش پیدا کر دی۔

ت بنے گی۔“

”میرا ارادہ اپنی کراچی والی فیکٹری کو فروخت کرنے کا ہے۔“ خان بہادر صاحب نے نہایت بے دانی سے جواب دیا۔ ”دو چار آفر بھی آچکے ہیں۔ اگر تم مناسب سمجھو تو جمال صاحب سے بات کر۔“

”آپ..... سلک کی فیکٹری کی بات کر رہے ہیں؟“ وقار احمد نے تعجب سے پوچھا۔

”ہاں..... لیکن اس میں اس قدر حیرت کی کیا بات ہے؟“

”میرا خیال ہے کہ اس فیکٹری کا سودا تو کروڑوں میں ہوگا۔“

”تمہارا اندازہ درست ہے۔ لیکن اگر تمہارے ہم زلف کو فیکٹری پسند آجائے تو فی الحال وہ اسے بیچنے کے لئے لیں۔ بعد میں اگر مناسب ہو تو پھر خرید و فروخت کا مسئلہ بھی طے ہو جائے گا۔“ آپس اری کی بات ہے، اس لئے مجھے خوشی ہوگی کہ فیکٹری اپنوں ہی کے ہاتھ میں رہے۔“

”آپ کو کتنے کی آفر مل چکی ہے؟“ اس بار ثناء نے دلی زبان میں پوچھا۔

”کیوں..... کیا تمہارا ارادہ اُسے خریدنے کا ہے؟“ خان بہادر صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”برسوں کی قلاب اپنی طرف گھٹینے ہوئے بولے۔ ”اگر ایسی کوئی بات ہے تو تکلف سے کام نہ لینا۔“

”میرا مطلب کچھ اور تھا۔“ ثناء نے بیگم نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر فیکٹری کی مالیت کا اندازہ ہو جائے تو کوئی اور بندوبست بھی ہو سکتا ہے۔“

”پہلے تم پر وفیسر صاحب سے بات کر لو۔“ بانی باتیں بعد میں طے ہوتی رہیں گے۔“ خان بہادر صاحب نے بے پروائی سے جواب دیا پھر ثناء، نادیدہ، صائمہ اور فرحان سے گفتگو میں مشغول ہو گئے۔

فرحان کی حاضر جوابی اور ذہانت نے خان صاحب کو بھی بہت جلد اپنا گرویدہ بنا لیا، راجیل بھی سے دلچسپ نظروں سے دیکھنے لگے۔

”جی نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

”پھر یہ اس قدر خاموشی کس لئے..... مانا کہ کھانے کے دوران چپ رہنا تہذیب میں شمار ہوتا۔“

”لیکن میں تو بس ایک رات کا مہمان ہوں، کل دوپہر کو واپس چلا جاؤں گا۔“

”اتنی جلدی بھی کیا ہے.....“ وقار احمد نے جلدی سے کہا۔ ”آپ نے پہلی بار تو غریب خانے عزت بخشی ہے اور وہ بھی اتنے کم وقت کے لئے۔“

”اب راجیل یہاں رہے گا تو میرا آنا جانا بھی لگا رہے گا۔“

”مجھے آپ سے کچھ ضروری گفتگو بھی کرنی تھی۔“

”بھلا کس سلسلے میں؟“ خان بہادر صاحب نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔ ”کیا کوئی کاروبار ڈھواری درپیش ہے؟“

”جی نہیں.....“ وقار احمد نے بیوی کی طرف دیکھا پھر مناسب موقع دیکھ کر دلی زبان میں بولے

”میرے ہم زلف پر وفیسر جمال احمد صاحب سترہ سال باہر گزار کر وطن واپس لوٹے ہیں۔ اُن کا ارادہ یہاں کاروبار کا ہے، میں اس سلسلے میں آپ سے مشورہ کرنا چاہتا تھا۔“

”لندن میں کیا کاروبار تھا جمال صاحب کا؟“

”وہاں تو وہ فلسفے کے پروفیسر تھے۔“

”بہت خوب..... گویا فلسفے سے منہ موڑ کر اب تجارت کی سمت پیش قدمی کا ارادہ ہے۔“

”جی ہاں.....“

”اندازاً کتنے اثاثے سے کاروبار شروع کرنے کا خیال ہے؟“

”ابھی اس سلسلے میں کھل کر کوئی بات نہیں ہوئی لیکن میرا خیال ہے کہ پندرہ بیس لاکھ سے تو کیا

تمدن کو مہلک جراثیم عطا کئے ہیں وہاں ہماری مشکل آسان کرنے کی خاطر انکل اور آنٹی قسم کے بہرے

سارے سامان بھی فراہم کر دیئے ہیں..... کیا خیال ہے تمہارا؟“

”بجا ارشاد فرمایا آپ نے۔“ وقار احمد نے تائیدی کی۔

”آپ تو بہت تکلف سے کام لے رہے ہیں۔“ ثناء نے بیگم نے بہت ادب سے خان بہادر صاحب کو مخاطب کیا۔ ”یہ نہ کسی کو فتنے اور شامی کباب تو ابھی تک آپ کی توجہ کے منتظر ہیں۔“

”میں دراصل پرہیزی کھانا کھانے کا عادی ہوں، اس لئے ہاتھ سمجھ کر کام چلا رہا ہوں۔“

”یہ سرخ کا قورمہ کچھ!“ ثناء نے قورمے کا ڈونگا بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اس میں مرچ برا۔“

نام ہی ہے۔“

”تم میرے لئے زیادہ پریشان مت ہو بیٹی.....“ خان بہادر صاحب نے بے تکلفی سے کہا۔ ”میر زیادہ کھانے کا عادی نہیں ہوں۔“

”مانا جان..... دسترخوان پر قومی سونیاں بھی موجود ہیں۔“ راجیل نے پہلی بار کہا۔

”میں دیکھ رہا ہوں برخوردار..... ممکن کہ دادرخم ہو تو میں سب سے پہلے اسی پر ہلہ بولوں گا۔“

ثناء نے بیگم نے جلدی سے سونیوں کی ڈش اٹھا کر خان بہادر صاحب کے سامنے رکھ دی۔

”بھئی وقار میاں.....“ خان بہادر صاحب نے ثناء نے بیگم کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ تمہارا بیٹیاں اور صاحبزادے تو بہت زیادہ ادب اور لحاظ کا مظاہرہ کر رہے ہیں..... کہیں تم نے انہیں میرے

سلسلے میں پہلے سے درغلا تو نہیں دیا؟“

”جی نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

”پھر یہ اس قدر خاموشی کس لئے..... مانا کہ کھانے کے دوران چپ رہنا تہذیب میں شمار ہوتا۔“

”لیکن میں تو بس ایک رات کا مہمان ہوں، کل دوپہر کو واپس چلا جاؤں گا۔“

”اتنی جلدی بھی کیا ہے.....“ وقار احمد نے جلدی سے کہا۔ ”آپ نے پہلی بار تو غریب خانے عزت بخشی ہے اور وہ بھی اتنے کم وقت کے لئے۔“

”اب راجیل یہاں رہے گا تو میرا آنا جانا بھی لگا رہے گا۔“

”مجھے آپ سے کچھ ضروری گفتگو بھی کرنی تھی۔“

”بھلا کس سلسلے میں؟“ خان بہادر صاحب نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔ ”کیا کوئی کاروبار ڈھواری درپیش ہے؟“

”جی نہیں.....“ وقار احمد نے بیوی کی طرف دیکھا پھر مناسب موقع دیکھ کر دلی زبان میں بولے

”میرے ہم زلف پر وفیسر جمال احمد صاحب سترہ سال باہر گزار کر وطن واپس لوٹے ہیں۔ اُن کا ارادہ یہاں کاروبار کا ہے، میں اس سلسلے میں آپ سے مشورہ کرنا چاہتا تھا۔“

”لندن میں کیا کاروبار تھا جمال صاحب کا؟“

”وہاں تو وہ فلسفے کے پروفیسر تھے۔“

”بہت خوب..... گویا فلسفے سے منہ موڑ کر اب تجارت کی سمت پیش قدمی کا ارادہ ہے۔“

”جی ہاں.....“

”اندازاً کتنے اثاثے سے کاروبار شروع کرنے کا خیال ہے؟“

”ابھی اس سلسلے میں کھل کر کوئی بات نہیں ہوئی لیکن میرا خیال ہے کہ پندرہ بیس لاکھ سے تو کیا

رائیگاں نہیں جائے گی۔“

رائیل اس تذکرے پر کچھ غلج ہونے لگے تو خان بہادر صاحب بات گھمانے کی خاطر فرحان مخاطب ہوئے۔ ”رائیل میاں تو خیر اللہ کے فضل و کرم سے ضرور کامیابی کی منزلیں طے کریں گے یہ آپ نے مجھے بڑے ابا کا خطاب کس خوشی میں دے ڈالا؟“

”آپ چونکہ ابا جان سے بڑے ہیں اس لئے بڑے ابا ہوئے۔“ فرحان نے معصومیت سے جواب دیا پھر باپ کی طرف دیکھنے لگا۔

کھانے کے بعد خان بہادر صاحب کی فرمائش پر سبز چائے بنائی گئی۔ وقار احمد نے چائے دوران ایک بار پھر فیکٹری کی بات چھیڑی لیکن خان بہادر صاحب نے بڑی فراخ دلی سے یہ کہہ کر باختم کر دی کہ۔ ”وقار میاں..... تم میرے لئے کوئی غیر نہیں ہو..... جس طرح چاہو اپنے ہم زلف بات کر لینا، مجھے تمہاری ہر بات منظور ہوگی..... یوں بھی میرے پاس خدا کا دیا بہت کچھ ہے۔ اور جہاں اپنائیت ہو وہاں نفع و نقصان کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔“

رات گئے تک اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں، خان بہادر آصف علی کی شخصیت اور ان کی گفتگو دلچسپ تھی کہ شام تک کچھ بھی کہا نہ سنے کو جی نہیں چاہتا تھا لیکن جب رات زیادہ بھگنے لگی تو وہ اکر اپنی خوابگاہ میں آ گئیں۔

دوسرے روز روانگی سے پیشتر خان بہادر صاحب نے تمام بچوں کو بلا کر انہیں بہت بہت پیار کیا، اور تادیہ کے سر پر خاص طور پر بڑی اپنائیت سے ہاتھ رکھ کر دعائیں دیں، پھر جیب سے چار لٹا نکال کر چاروں بچوں کو دینے لگے تو شامکے بیگم نے دلی زبان میں کہا۔

”اس کی کیا ضرورت تھی..... ہمارے لئے تو آپ کی دعائیں اور محبت ہی بہت ہیں۔“

”میں خود بھی اس قسم کے تکلفات کا عادی نہیں ہوں لیکن اب جبکہ فرحان میاں نے ہمیں بڑے کے خطاب سے نواز دیا ہے تو پھر اس رشتے کا بھرم تو بہر حال! قائم رکھنا ہوگا.....“ خان بہادر صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا پھر فرحان کو گلے لگا کر پیار کیا اور سب کو خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو گئے۔ وہ احمد اور رائیل انہیں چھوڑنے کی خاطر ایئر پورٹ چلے گئے۔

خان بہادر صاحب کے جانے کے بعد سب سے پہلے فرحان نے لفافہ کھول کر رقم گنی تو پورے ایک ہزار تھی۔

”مجھ سے ذرا سی چوک ہو گئی۔“ فرحان نے شوق سے کہا۔ ”اگر مجھے پہلے معلوم ہوتا کہ خان بہا صاحب انعام دیں گے تو میں انہیں بڑے ابا کی بجائے بڑے دادا جان کہہ کر مخاطب کرتا.....“

اور فرحان کی اس بات پر سب ہی ہنس دیئے.....!

○○○

رائیل کے آجانے سے گھر میں اچھی خاصی رونق ہو گئی۔

کچھ دنوں تک نئے ماحول اور نئے لوگوں کے درمیان جو اجنبیت کا احساس ہوتا ہے جب وہ ڈھوا تو رائیل نے ہر ایک سے بے تکلفی سے ملنا شروع کر دیا۔ خاص طور پر وہ فرحان سے بالکل برا کے دوستوں کی طرح پیش آتا۔ شامکے بیگم اُسے اپنے تجربے کی کسوٹی پر پرکھ چکی تھیں اس لئے انہوں نے لڑکیوں سے بھی کہہ دیا تھا کہ وہ رائیل کا خیال رکھیں اور اس بات کی تاکید بھی کر دی تھی کہ اُپڑھائی کی طرف سے غافل نہ ہونے دیں۔

وہ بڑے گھرانے کا بیٹا تھا پھر وقار احمد کی سفارش بھی تھی اس لئے کالج کھلتے ہی اُسے داخلہ بھی مل گیا۔ ابھی چونکہ باقاعدہ پڑھائی کا آغاز نہیں ہوا تھا اس لئے رائیل کا زیادہ تر وقت گھر پر ہی گزرتا۔ ماں کے علاوہ صائمہ اور تادیہ سے بھی رائیل بہت جلدی بے تکلف ہو گیا لیکن شامکے بیگم نے دیئے ابھی اس لئے ابھی تک اُس نے رائیل کو ایک خاص قافلے سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔

امارت اور بڑے پن کا مظاہرہ کرنا رائیل کی عادت تھی اس لئے وہ گھر والوں کے سامنے بھی اس کا اہرہ کرتا رہا، خاص طور پر فرحان اُس کی بے سرو پا باتوں سے بے حد لطف اندوز ہوتا۔ اُس وقت بھی م کی چائے سے فارغ ہونے کے بعد سب لوگ لاؤنج میں بیٹھے تھے جب رائیل نے اپنی سپورٹس رکاز کر چھیڑ دیا۔

”فرحان میاں..... ابھی تم چھوٹے ہو، جب بڑے ہو جاؤ گے تو تمہیں معلوم ہوگا کہ سپورٹس کار ن خوبیوں کی مالک ہوتی ہے اور دوسری گاڑیوں کے مقابلے میں اسے کیا فوقیت حاصل ہے۔“

”ایک بات تو مجھے معلوم ہے کہ سپورٹس کاو..... سپورٹس کار ہی کہلائی ہے اور دوسری تمام گاڑیوں طرح اُس میں بھی ایک انجن اور چار پہیے ہوتے ہیں۔“ فرحان نے بڑی سادگی سے کہا۔ ”اس کے وہ اور کوئی خاص بات ہو تو بتائیے۔“

”خوبصورتی اور لمبائی کے اعتبار سے بھی یہ گاڑی دوسری گاڑیوں سے مختلف ہوتی ہے۔“ صائمہ نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

”گڈ..... تم مجھے خاصی ذہن معلوم ہوتی ہو۔“

”ختم تاثیر اور صحبت کا اثر بھی ہوتا ہے۔“ فرحان نے جلدی سے کہا۔

”یہ غالباً تم نے کوئی محاورہ بولا ہے۔“ رائیل نے اپنی قابلیت گھکارنے کو کہا تو تادیہ کو ہنسی آ گئی، نیل کی اصلاح کرنے کی خاطر بولی۔

”ختم تاثیر صحبت کا اثر..... محاورہ نہیں بلکہ مثل ہے۔“

”اور اب آپ یہ پوچھیں گے کہ محاورہ اور مثل کے درمیان کیا فرق ہوتا ہے۔“

”کیا فرق ہوتا ہے.....؟“

”سب سے بڑا اور اہم فرق ہے ججے کا۔ اور ججے کی غلطی کے سبب ضرور کاٹے جاتے ہیں۔“ فرحان نے عجیبی سے کہا۔ پھر بولا۔ ”دوسرا فرق یہ ہے کہ مثل، مثل ہوتی ہے اور محاورہ، محاورہ.....“

”فرحان.....“ شائے نے اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہیں کتنی بار منع کر چکی ہوں کہ تعلیم، معاملات میں مذاق کرنا بری بات ہے۔“

”بھینس کے آگے بین بجانے سے کیا فائدہ.....؟“ صائمہ بولی۔ ”یہ بھی ایک مثل ہے۔“

”بھنشو بی بی..... چوہا لٹو درابھی بھلا.....“ فرحان نے برکتہ کہا۔

”تم باز نہیں آؤ گے فرحان؟“ شائے نے اُسے سرزنش کی پھر رائیل سے بولی۔ ”آپ اپنی سپورٹس کار بارے میں کچھ بتا رہے تھے۔“

”جی ہاں.....“ رائیل جو مثل اور محاورہ کے فرق کے درمیان الجھ کر گڑبڑا گیا تھا جلدی سے سنبل بولا۔ ”ممی نے خاص طور پر میرے لئے یہ گاڑی باہر سے منگوائی تھی..... لندن میں کوئی لارڈ ہیں اسے ہمارے پایا کے بڑے پرانے مراسم تھے، انہوں نے ممی کو خاص ہدایات دے کر میرے لئے پورس کار تیار کرائی ہے۔ یہاں تو پورے ملک میں ایسی گاڑی صرف دو چار لوگوں کے پاس ہوگی۔“

”جی الامکان کیا ہوتا ہے؟“ راحیل نے دبی زبان میں دریافت کیا۔
 ”مکان کے احاطے کو کہتے ہیں۔“ فرحان نے نہایت سنجیدگی سے راحیل کا مذاق اڑانے کی خاطر کہا۔ ”بڑی آیا کا مطلب ہے کہ اگر آپ پڑھنے کو تیار ہوں تو اس کے لئے مکان کا احاطہ نہایت مناسب جگہ ہوگی۔“

”لاہور میں، میں نے انگلش میڈیم میں پڑھا تھا۔“ راحیل نے شام سے دریافت کیا۔ ”کیا آپ مجھے انگلش میں پڑھا سکتی ہیں؟“

”کیوں نہیں پڑھا سکتیں، ہم لوگوں نے بھی انگلش میڈیم میں پڑھا ہے۔“ نادیا نے بہن کو تعریفی غرور سے دیکھا۔ ”اور آئی کو تو انگریزی میں ہمیشہ دستکش لیتی رہی ہے۔“

”ٹائٹل نادیہ کو گھور کر دیکھا پھر خاموش ہوئی، وہ ماں سے پوچھے بغیر راحیل کو پڑھانے کی ذمہ داری نول نہیں کر سکتی تھی لیکن نادیہ بھی کہ مستقل اُسے سولی پر چڑھائے جا رہی تھی۔“

”یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔“ راحیل نے خوشی کا اظہار کیا۔ ”اب تو میں آپ ہی سے پڑھوں گا۔“
 ”بڑی آیا بڑی خوبیوں کی مالک ہیں۔“ فرحان نے خوشی سے کہا۔ ”انہوں نے تو میرا اور غالب کو بھی انگریزی زبان میں پڑھا ہے۔“

”ٹائٹل نادیہ کو گھور کر دیکھا پھر خاموش ہوئی، وہ ماں سے پوچھے بغیر راحیل کو پڑھانے کی ذمہ داری نول نہیں کر سکتی تھی لیکن نادیہ بھی کہ مستقل اُسے سولی پر چڑھائے جا رہی تھی۔“

”ٹائٹل نادیہ کو گھور کر دیکھا پھر خاموش ہوئی، وہ ماں سے پوچھے بغیر راحیل کو پڑھانے کی ذمہ داری نول نہیں کر سکتی تھی لیکن نادیہ بھی کہ مستقل اُسے سولی پر چڑھائے جا رہی تھی۔“

”ٹائٹل نادیہ کو گھور کر دیکھا پھر خاموش ہوئی، وہ ماں سے پوچھے بغیر راحیل کو پڑھانے کی ذمہ داری نول نہیں کر سکتی تھی لیکن نادیہ بھی کہ مستقل اُسے سولی پر چڑھائے جا رہی تھی۔“

”ٹائٹل نادیہ کو گھور کر دیکھا پھر خاموش ہوئی، وہ ماں سے پوچھے بغیر راحیل کو پڑھانے کی ذمہ داری نول نہیں کر سکتی تھی لیکن نادیہ بھی کہ مستقل اُسے سولی پر چڑھائے جا رہی تھی۔“

”ٹائٹل نادیہ کو گھور کر دیکھا پھر خاموش ہوئی، وہ ماں سے پوچھے بغیر راحیل کو پڑھانے کی ذمہ داری نول نہیں کر سکتی تھی لیکن نادیہ بھی کہ مستقل اُسے سولی پر چڑھائے جا رہی تھی۔“

”ٹائٹل نادیہ کو گھور کر دیکھا پھر خاموش ہوئی، وہ ماں سے پوچھے بغیر راحیل کو پڑھانے کی ذمہ داری نول نہیں کر سکتی تھی لیکن نادیہ بھی کہ مستقل اُسے سولی پر چڑھائے جا رہی تھی۔“

”ٹائٹل نادیہ کو گھور کر دیکھا پھر خاموش ہوئی، وہ ماں سے پوچھے بغیر راحیل کو پڑھانے کی ذمہ داری نول نہیں کر سکتی تھی لیکن نادیہ بھی کہ مستقل اُسے سولی پر چڑھائے جا رہی تھی۔“

”ٹائٹل نادیہ کو گھور کر دیکھا پھر خاموش ہوئی، وہ ماں سے پوچھے بغیر راحیل کو پڑھانے کی ذمہ داری نول نہیں کر سکتی تھی لیکن نادیہ بھی کہ مستقل اُسے سولی پر چڑھائے جا رہی تھی۔“

”ٹائٹل نادیہ کو گھور کر دیکھا پھر خاموش ہوئی، وہ ماں سے پوچھے بغیر راحیل کو پڑھانے کی ذمہ داری نول نہیں کر سکتی تھی لیکن نادیہ بھی کہ مستقل اُسے سولی پر چڑھائے جا رہی تھی۔“

”ٹائٹل نادیہ کو گھور کر دیکھا پھر خاموش ہوئی، وہ ماں سے پوچھے بغیر راحیل کو پڑھانے کی ذمہ داری نول نہیں کر سکتی تھی لیکن نادیہ بھی کہ مستقل اُسے سولی پر چڑھائے جا رہی تھی۔“

”ٹائٹل نادیہ کو گھور کر دیکھا پھر خاموش ہوئی، وہ ماں سے پوچھے بغیر راحیل کو پڑھانے کی ذمہ داری نول نہیں کر سکتی تھی لیکن نادیہ بھی کہ مستقل اُسے سولی پر چڑھائے جا رہی تھی۔“

”ٹائٹل نادیہ کو گھور کر دیکھا پھر خاموش ہوئی، وہ ماں سے پوچھے بغیر راحیل کو پڑھانے کی ذمہ داری نول نہیں کر سکتی تھی لیکن نادیہ بھی کہ مستقل اُسے سولی پر چڑھائے جا رہی تھی۔“

”پھر تو یہ بھاگتی بھی بہت تیز ہوگی۔“ صائمہ نے معصومیت سے پوچھا۔
 ”کیوں نہیں.....“ راحیل نے کہا۔ ”کبھی آپ سب لوگ میرے ساتھ تفریح کو چلیں۔“

”میل کی رفتار سے گاڑی چلا تا تو میرے پاس ہاتھ کا کھیل ہے۔“
 ”اور دائیں ہاتھ سے گاڑی چلاتے وقت کیا رفتار ہوتی ہے؟“ فرحان نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”نادیہ ہنس دی۔“
 ”کیا ضروری ہے کہ تم ہر بات کی کھال ادھیڑنے بیٹھ جاؤ؟“

”بہر حال یہ طے ہو گیا کہ ہم سب راحیل بھائی کے ساتھ سیر کو چلیں گے۔“ صائمہ نے بار کرنے کی خاطر کہا۔

”آج ہی اور ابھی کیوں نہ چلیں؟“ راحیل نے جلدی سے کہا۔ ”آپ آئی سے اجازت لے اتی دیر میں، میں لباس تبدیل کر کے آتا ہوں۔“

”آپ کے کالج میں پڑھائی کب سے شروع ہوگی؟“ ٹائٹل نادیہ نے راحیل سے دریافت کیا۔
 ”جی.....“ راحیل نے ایسا کڑوا سا منہ بنایا جیسے اُس سے کوئی بہت مشکل سوال کر لیا گیا ہو۔

”جب تک آپ باقاعدہ پڑھائی شروع نہیں کریں گے اور کوئی ٹائم ٹیبل نہیں بنائیں گے اُمی آپ کے ساتھ گھومنے پھرنے کی اجازت نہیں دیں گی۔“

”میں سمجھا نہیں.....“
 ”آپ شاید بھول رہے ہیں کہ آپ کو یہاں کیوں بھیجا گیا ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن ابھی تو میں نے کسی ٹیوٹر کا بندوبست بھی نہیں کیا۔“ راحیل نے بات بنا۔
 ”کالج میں پڑھائی شروع ہو جائے تو کسی مناسب پروفیسر سے بات کروں گا۔“

”پڑھائی کے لئے ٹیوٹر کی کیا ضرورت ہے؟“ نادیہ بولی۔ ”ہم نے تو آج تک کسی ٹیوٹر سے پڑھا پھر بھی خدا کا شکر ہے کہ اچھے نمبروں سے پاس ہوتے ہیں۔“

”راحیل کی زبان جو کچھ دیر پہلے مشین کی طرح فر فر چل رہی تھی پڑھائی کے ذکر پر کند ہو گئی،
 کی کیفیت کا بغور جائزہ لے رہی تھی، اُسے راحیل کی معصومیت پر ترس بھی آ رہا تھا چنانچہ اُس نے بڑھانے کی خاطر کہا۔“ آپ نے کورس کی کتابیں تو ضرور خرید لی ہوں گی۔“

”جی نہیں.....“ راحیل نے کہا۔ ”میں نے جو پیسے دیئے تھے وہ میں نے شاپنگ پر خرچ کر دیئے۔“

”آج ہی تین نئے سوٹ سٹے دیئے ہیں، بالکل نئے اور ماڈرن سٹائل کے..... کپڑا بھی باہر کا ہے اور
 ”ٹائٹل نادیہ کو گھور کر دیکھا پھر خاموش ہوئی، وہ ماں سے پوچھے بغیر راحیل کو پڑھانے کی ذمہ داری نول نہیں کر سکتی تھی لیکن نادیہ بھی کہ مستقل اُسے سولی پر چڑھائے جا رہی تھی۔“

”ٹائٹل نادیہ کو گھور کر دیکھا پھر خاموش ہوئی، وہ ماں سے پوچھے بغیر راحیل کو پڑھانے کی ذمہ داری نول نہیں کر سکتی تھی لیکن نادیہ بھی کہ مستقل اُسے سولی پر چڑھائے جا رہی تھی۔“

”ٹائٹل نادیہ کو گھور کر دیکھا پھر خاموش ہوئی، وہ ماں سے پوچھے بغیر راحیل کو پڑھانے کی ذمہ داری نول نہیں کر سکتی تھی لیکن نادیہ بھی کہ مستقل اُسے سولی پر چڑھائے جا رہی تھی۔“

”ٹائٹل نادیہ کو گھور کر دیکھا پھر خاموش ہوئی، وہ ماں سے پوچھے بغیر راحیل کو پڑھانے کی ذمہ داری نول نہیں کر سکتی تھی لیکن نادیہ بھی کہ مستقل اُسے سولی پر چڑھائے جا رہی تھی۔“

”ٹائٹل نادیہ کو گھور کر دیکھا پھر خاموش ہوئی، وہ ماں سے پوچھے بغیر راحیل کو پڑھانے کی ذمہ داری نول نہیں کر سکتی تھی لیکن نادیہ بھی کہ مستقل اُسے سولی پر چڑھائے جا رہی تھی۔“

”ٹائٹل نادیہ کو گھور کر دیکھا پھر خاموش ہوئی، وہ ماں سے پوچھے بغیر راحیل کو پڑھانے کی ذمہ داری نول نہیں کر سکتی تھی لیکن نادیہ بھی کہ مستقل اُسے سولی پر چڑھائے جا رہی تھی۔“

نے ہارے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا۔“
 ”آپ شرمندہ کر رہی ہیں۔“ شائلہ بیگم نے کہا پھر بات کا رخ بدل کر بولیں۔ ”کچھ اندازہ ہے کہ جمال بھائی کے پاس نقدی صورت میں کل کتنی رقم ہوگی؟“
 ”میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتی البتہ ایک بار انہوں نے خود ہی کہا تھا کہ چالیس لاکھ کے اندر روکٹی کاروبار دیکھیں گے۔“ شائلہ بیگم نے کہا۔ ”ویسے تمہارا کیا خیال ہے، خان بہادر صاحب سے لڑی کا سودا کہاں تک طے ہو جائے گا؟“
 ”مجھے ان کاروباری معاملات کا بھلا کیا علم؟ لیکن وقار بتا رہے تھے کہ فیکٹری کی مالیت کروڑوں

پھر تو ہم اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔“

”خان بہادر صاحب نے وقار احمد کو تمام اختیار دے رکھے ہیں۔ ویسے وقار ایک بات اور بھی

کہہ رہے تھے۔“

”وہ کیا.....؟“
 ”اگر جمال بھائی تیار ہوں تو فیکٹری سا جھے میں خریدی جاسکتی ہے، جس حساب سے سودا ہوگا اسی

اب سے شرکت کا حساب کتاب بھی طے ہو جائے گا۔“

”تجربہ تو نہایت معقول اور مناسب ہے۔۔۔۔۔ میں منصور کے والد سے بات کر کے دیکھتی ہوں۔“
 ”منصور میاں کا کیا رہا۔۔۔۔۔ داخلہ مل گیا یونیورسٹی میں؟“

”ابھی داخلے شروع نہیں ہوئے، ویسے مجھے یقین ہے کہ اس میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔“ شائلہ

م بولیں۔ ”تمہارے بھائی صاحب نے تو منصور کی ملازمت بھی کہیں پکی کر لی تھی لیکن میرے اصرار

آگے بڑھانے کا فیصلہ کیا ہے۔“
 ”نوکر کی کئی ابھی اتنی جلدی بھی کیا ہے۔۔۔۔۔؟“ شائلہ بیگم بڑے لاڈ سے بولیں۔ ”منصور میاں کی عمر تو

نا پڑھنے لکھنے کی ہے۔۔۔۔۔ جب ملازمت کا وقت آئے گا تو وہ بھی تلاش کر لی جائے گی بلکہ میں تو کہتی

ہوں کہ بھائی صاحب، منصور میاں کو بھی اپنے ساتھ ہی کاروبار میں لگالیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔“
 ”بچیوں کے بارے میں تم نے کیا سوچا ہے؟“ شائلہ بیگم نے کچھ دیر بعد سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”آپ کی اور امی جان کی موجودگی میں بھلا میں کون ہونی ہوں سوچنے والی۔۔۔۔۔ خدا کی جو مرضی ہو

اور آپ لوگوں کا جیسا مشورہ ہوگا وہی ہوگا۔“
 ”کوئی رشتہ ہے تمہاری نظر میں۔۔۔۔۔ خیر سے اب تو شاد اور نادیہ دونوں جوان ہو رہی ہیں۔“

”سب سے پہلے تو ہمیں شاکے لئے سوچنا ہے لیکن اُس روز آپ اپنے کانوں سے سن چکی ہیں کہ

ڈاکڑی کرنے کا ارادہ رکھتی ہے، وقار تو پہلے ہی شاکے ہم خیال تھے، اب جمال بھائی نے بھی حمایت

دی۔“
 ”میری بھی یہی آرزو ہے کہ شاد اکثر بن کر اپنے پیروں پر کھڑی ہونے کے قابل بن جائے۔“

”شائلہ بیگم نے ماضی کی بھولی بھری باتوں کو یاد کرتے ہوئے کہا۔ ”شوہر کی خدمت گزار کی کوئی بری بات

نہیں لیکن عورت کے اپنے ہاتھ میں بھی کوئی ہنر ہونا چاہئے تاکہ آڑے وقت میں اُسے کسی کا دست نگر

ہونا پڑے۔“
 ”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں آپا۔۔۔۔۔ لڑکیوں کا معاملہ تو یوں بھی بڑا نازک ہوتا ہے۔۔۔۔۔ چت پڑی تو

”بڑی آپا سے پڑھنے کی بات تو رہ گئی۔“ فرحان نے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔ ”بس آپ

اجازت رہ گئی ہے، ورنہ یہ بات تو طے ہو چکی تھی کہ پڑھانے کے لئے مکان کا احاطہ ہی ایسی جگہ

جہاں آرام سے پڑھا جاسکتا ہے۔“
 شائلہ بیگم نے فرحان کو وضاحت طلب نظروں سے گھورا، پھر جب نادیہ نے ماں کو بتایا کہ فرحان

کس طرح حتی الامکان کا مطلب بتایا ہے تو شائلہ بیگم بھی بے اختیار ہنس دیں اور فرحان کو ٹوکتے ہو

نصیحت کی۔ ”بری بات ہے فرحان! تمہیں بڑوں کے ساتھ اس قسم کی شرارتیں نہیں کرنی چاہئیں۔“

”غلطی میری بھی تھی لیکن بڑی آپا کو بھی راجیل بھائی کے ساتھ اتنی نفی اور گاڑھی اردو نہیں

چاہئے تھی۔“
 ”گویا آپ نے مجھے غلط مطلب بتائے تھے؟“ راجیل نے غجل ہوتے ہوئے فرحان کو دیکھا۔

”ایمان سے راجیل بھائی۔۔۔۔۔ میرا مقصد یہ ہرگز نہیں تھا۔“ فرحان نے جلدی سے صفائی پیش کی

”بس روانی میں ذرا زبان پھسل گئی۔“
 ”کوئی بات نہیں۔ آپ ہمارے دوست ہیں اس لئے معاف کیا۔“ راجیل نے فراخ دلی کا مظا

کیا۔
 ابھی یہ دلچسپ گفتگو کا سلسلہ جاری تھا کہ شائلہ بیگم منصور کے ساتھ آگئیں۔ بڑی بہن کو اچانک د

کر شائلہ بیگم کی باجھیں کھل گئیں جلدی سے بہن کے استقبال کو انھیں، قریب جا کر پوچھا۔

”بھائی صاحب کہاں ہیں۔۔۔۔۔ وہ ساتھ نہیں آئے کیا؟“
 ”وہ اپنے کچھ پرانے واقف کاروں سے ملنے گئے ہیں، میں منصور کے ساتھ ادھر نکل آئی۔“

”بہت اچھا کیا آپ نے جو چلی آئیں۔۔۔۔۔ میں آج یاد بھی کر رہی تھی۔“
 ”اگر کچھ موقع مجھے بھی دیں تو میں دست بستہ سلام عرض کرنا چاہتا ہوں۔“ منصور نے معصوم

سے شائلہ بیگم کو مخاطب کیا جو بہن کو دیکھ کر اس قدر نہال ہو گئی تھیں کہ بھانجے کا خیال ہی نہ رہا۔ منہ

کے مخاطب کرنے پر اُس کی طرف گھوم کر بے حد پیار سے بولیں۔

”جیتے رہو۔۔۔۔۔ بڑے سے ہو جاؤ اور سدا سلامت رہو!“
 شائلہ بیگم کو دیکھ کر شاد اور دوسرے بچے بھی قریب آ گئے۔ شائلہ بیگم نے سب کو باری باری سینے

لگا کر دُعائیں دیں، پھر شائلہ بیگم کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے اندر چلی گئیں۔ منصور، فرحان ا

دوسرے لوگوں کے ساتھ باہر ہی رُک گئے۔ فرحان نے نہایت سلیقے سے منصور اور راجیل کا آبا

دوسرے سے تعارف کرایا، پھر اُن کے درمیان ایک بار پھر پڑھائی کے موضوع پر گفتگو چل گئی۔

شائلہ بیگم نے اندر جاتے ہوئے راجیل کو بڑے غور سے دیکھا تھا لہذا راجی باتوں کے بعد انہو

نے سب سے پہلے راجیل کے بارے میں دریافت کیا۔ شائلہ بیگم نے پوری تفصیل بیان کر دی تو

باتوں باتوں میں یہ تذکرہ بھی چھیڑ دیا کہ وقار احمد نے خان بہادر صاحب سے پروفیسر جمال

کاروبار کے سلسلے میں بھی گفتگو کر لی ہے اور کام بن جانے کی اُمید نظر آتی ہے۔

”شائلہ بیگم۔۔۔۔۔ میں تمہارے کس کس احسان کا بدلہ چکا سکوں گی؟“
 ”یہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں آپا؟“ شائلہ بیگم انکساری سے بولیں۔ ”بڑی بہن تو ماں کے برا

ہوتی ہے، آپ کی خدمت کرنا اور کام آنا تو میرا فرض ہے۔“
 ”یہ تمہاری شرافت اور محبت ہے جو تم ایسا کہہ رہی ہو، ورنہ میں جانتی ہوں کہ تم نے اور وقار بھا

نال احمد نہایت سنجیدگی سے بیوی کی زبانی تفصیل سنتے رہے، شانہ بیگم نے بات ختم کی تو کچھ دیر مابینے سوچتے رہے پھر کرسی پر پہلو بدل کر بولے۔ ”میں وقار بھائی کا بے حد شکر گزار ہوں جو نے میری خاطر خان بہادر صاحب سے کاروبار کی گفتگو کی لیکن.....“

”لیکن کیا.....؟“

”وقار بھائی کا اپنا ذاتی کاروبار ہے اور اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو انہیں اتنی فرصت بھی نہیں کہ کسی دہائی میں ہاتھ ڈالیں۔“

”میں بھی نہیں.....؟“ شانہ بیگم نے وضاحت طلب لہجے میں دریافت کیا۔

”کہیں ایسا تو نہیں کہ صرف میری خاطر وہ فیکٹری کے معاملے میں دلچسپی لے رہے ہوں؟“

”میں تو نہیں سمجھتی کہ ایسی کوئی بات ہوگی..... شائلہ بیگم نے خود ہی اس بات کا تذکرہ چھیڑا تھا کہ

”اگر کوئی سناجھے میں خریدنا چاہتا ہوں۔“

”کچھ اندازہ ہے آپ کو اس کی مالیت کا؟“

”جی نہیں..... خان بہادر صاحب نے آپس داری کی وجہ سے کھل کر بات نہیں کی۔“

”میرا اپنا خیال ہے کہ اس کی قیمت دو ڈھائی کروڑ سے کم نہ ہوگی۔“

”ڈھائی کروڑ.....؟“ شانہ بیگم نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”پھر تو یہ ہمارے اکیلے کے

ابات نہیں ہو سکتی۔“

”اس قسم کے کاروبار میں عوامی اور ذاتی حصے بھی ہوتے ہیں۔“ جمال احمد نے بیوی کو سمجھاتے

کہا۔ ”یہاں پیرے کچھ دوست احباب ایسے موجود ہیں جو بڑی خوشی کے ساتھ کاروبار میں سرمایہ

پر آمادہ ہو جائیں گے..... فیکٹری مل جانے کی صورت میں ایک سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ

لوہیں اور ملازمت کی ضرورت پیش نہیں آئے گی اور میری مصروفیت کا ایک معقول بندوبست بھی

ہو گا۔“

”پھر دیر کس بات کی ہے؟ اگر آپ کو اس کاروبار میں فائدہ کی صورت نظر آتی ہے تو پھر بسم اللہ کیجئے۔“

”پہلے میں وقار بھائی سے گفتگو کر لوں پھر کوئی فیصلہ کر سکوں گا۔“

”ایک بات پوچھوں اگر آپ برائے نام ہیں.....؟“

”پوچھئے.....؟“

”کیا آپ وقار بھائی کے ساتھ سناجھے میں یہ کاروبار نہیں کر سکتے؟“

”آپ نے یہ اندازہ کیسے کر لیا کہ میں خدا نخواستہ وقار بھائی کو نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہا

ہوں؟“ جمال احمد نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ ”اگر فیکٹری کا معاملہ نہ ملے ہوتا تب بھی میں ان کا

نامند ہوں..... میری خاطر وہ پہلے بھی زحمات اٹھاتے رہے ہیں، رہا کاروبار کا معاملہ تو اگر وقار

بھائی کے ساتھ شریک ہو گئے تو میری بے شمار اہمیتیں زور ہو جائیں گی..... آپ جانتی ہیں کہ بزنس

میں میرا سابقہ تجربہ صفر سے زیادہ نہیں۔“

”لیکن منصور نے تو کامرس پڑھ رکھی ہے۔“

”تجارت پڑھنے اور تجارت کرنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔“ جمال احمد بیوی کی معصومیت پر

نہ ہونے بولے۔ ”ہاں! یہ ضرور ہے کہ منصور ہمارے لئے بہت کارآمد ثابت ہوگا اور وقار بھائی

پو بارہ ہو گئے اور پٹ پڑی تو زندگی بھر کا روگ لگ جاتا ہے جان کو.....“

”ویسے بچوں کے بارے میں تم نے کہیں نہ کہیں تو دیکھا بھلا ہوگا۔“ شانہ بیگم نے کرید کی۔

”باپ کو تو لڑکیوں کی فکر بہت پہلے سے کرنی پڑتی ہے، وقت کے وقت جو کام ہوتا ہے اس کا انجام

زیادہ اچھا نہیں ہوتا۔“

”میں نے سوچا تو تھا اس سلسلے میں لیکن وقار تو اس معاملے میں بولنے ہی نہیں دیتے..... کہتے

جب تک لڑکیوں کی تعلیم مکمل نہ ہو جائے ان کے کانوں میں شادی بیاہ کی بھنگ بھی نہیں پڑنی چاہئے

”وقار بھائی سے تو خیر میں بات کر لوں گی..... تم اپنی سناؤ، تم نے کہاں دیکھ بھال کی ہے؟“

”میری نظر میں تو فی الحال ایک ہی لڑکا ہے۔“ شائلہ بیگم نے اپنے جپٹھ کے بیٹے احمر کا تفصیلی

کرتے ہوئے کہا۔ ”سچ کہتی ہوں آپا..... احمر تو بہرا ہے بہرا..... اگر چراغ لے کر ڈھونڈ جائے تو

اس دور میں ایسا لڑکا دوبارہ نہیں ملے گا، مجھے تو وہ ہر اعتبار سے پسند ہے۔“

”کس کے لئے پسند کیا ہے تم نے احمر کو؟“ شانہ بیگم نے دبی زبان میں دریافت کیا۔

”کیسی باتیں کرنی ہیں آپا..... یہ بھی بھلا کوئی پوچھنے کی بات ہے؟“ شائلہ بیگم نے نہایت سنجیدگی

سے کہا۔ ”شابزی ہے اس لئے ظاہر ہے کہ ہم اسی کے رشتے کے بارے میں سوچ بچار کریں گے۔“

”تمہیں شاپر بھی اتنا ہی اختیار ہے جتنا نادیر اور صائمہ پر..... جس طرح چاہو کرو لیکن میں بھی

کچھ حق استعمال کرنا چاہتی ہوں۔“

”آپ حکم دیتے آپا..... آپ کی مرضی ہماری رائے سے زیادہ مقدم ہوگی۔“

”تمہیں یاد ہوگا کہ میں نے ایک بار تمہیں اس سلسلے میں دبی زبان میں لکھا بھی تھا۔“

”خوب یاد ہے..... لیکن وہ مسئلہ تو منصور مہاں کا تھا اور میں نے ایک دو لڑکیاں بھی نظر میں

ہیں۔ آپ جب چاہیں میرے ساتھ چل کر دیکھ لیں۔“

”بات میری پسند یا آپ کی پسند کی نہیں..... تمہارے بھائی صاحب کی خواہش کی ہے۔“

”کیا جمال بھائی نے کوئی رشتہ دیکھ رکھا ہے؟“

”رشتہ نہیں بلکہ خاندان کو.....“ شانہ بیگم نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”لڑکی تو انہوں

پہلی بار یہاں آنے کے بعد دیکھی ہے۔“

”کون لوگ ہیں.....؟“ شائلہ بیگم نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے دریافت کیا۔

”بہت عظیم لوگ..... اتنے عظیم کہ ان کی پرستش کرنے کو جی چاہتا ہے۔“

”کیا آپ نے بھی لڑکی دیکھی ہے؟“ شائلہ بیگم نے اس بار پہلو بدل کر پوچھا۔

”تم نے بھی دیکھ رکھی ہے۔“ شانہ بیگم نے کھل کر کہا۔ ”دراصل منصور کے والد کی خواہش ہے

منصور کو تمہاری فرزندگی میں دے دیں۔“

”آپا.....“ شائلہ بیگم کی آواز بھرا گئی۔

”میں تم پر زور نہیں دوں گی۔ لیکن اتنی درخواست ضرور کروں گی کہ جب بھی تم نادیر کے لئے

منصور کو بھی نظر میں رکھنا۔“

”کیوں..... کیا نادیر پر آپ کا کوئی حق نہیں ہے؟“ شائلہ بیگم نے شکایت بھرے لہجے میں کہ

”اے اختیار بہن کے گلے لگ کر رونے لگیں۔ شانہ بیگم کی آنکھیں بھی ساون بھادوں کی مانند

لگیں.....!!“

کی رہنمائی میں وہ بڑی آسانی سے کاروباری نشیب و فراز سے واقف ہو جائے گا۔“
”میرا تو مشورہ ہے کہ آپ آج ہی وقار بھائی سے مل کر بات کر لیں۔ ایسے سنہری موقعے بار بار نہیں ملا کرتے۔“

”اگر یہ آپ کا حکم ہے تو آج ہی اس پر عمل کیا جائے گا۔“

”بات حکم کی نہیں..... وقت کی ہے۔“ شبانہ بیگم نے مختصر آرا جیل کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے کہا۔ ”اس وقت خان بہادر صاحب کی گوٹ چونکہ پچھنسی ہوئی ہے اس لئے فیکٹری کا سودا آسانی سے طے ہو سکتا ہے۔“

”یہ آپ کا خیال ہے..... ورنہ خان بہادر آصف علی جیسا کہ نہ مشق کاروباری حیثیت کا مالک محض نواسے کی وجہ سے اتنے اچھے اور چلتے ہوئے بزنس کو اوانے پونے داموں میں فروخت کرنے کی حمانہ کبھی نہیں کر سکتا۔“

”شاملہ بتا رہی تھی کہ وقار بھائی اور خان بہادر صاحب میں دور پرے کی رشتے داری بھی ہونا ہے۔“

”بہر حال..... اگر آپ کا دل ٹھک رہا ہے فیکٹری کے سلسلے میں تو میں وقار بھائی سے مل کر سارے معاملات طے کئے لیتا ہوں۔“ جمال احمد نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”رہا پیسوں کا مسئلہ تو وہ ایک جائیداد فروخت کر کے بھی طے کیا جاسکتا ہے۔“

”جائیداد کیسی؟“ شبانہ بیگم نے تعجب سے پوچھا۔

”میں نے نقدی کی صورت میں پیسے جمع کرنے کے علاوہ کچھ رقم جائیداد خریدنے میں بھی صرف رکھی تھی جو اس موقع پر ہمارے کام آسکتی ہے۔“ جمال احمد نے حساب لگاتے ہوئے جواب دیا۔ ”سکتا ہے کہ کوئی ایسی صورت نکل آئے کہ فیکٹری کے حصوں میں ہمیں کسی تیسرے پارٹنر کی ضرورت نہ آئے۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو.....“ شبانہ بیگم نے گود پھیلا کر دغا مانگتے ہوئے کہا، پھر بولیں۔ ”لیکن یہ سرمایہ بچا کر بھی رکھئے گا۔“

”وہ کس مقصد کے لئے.....؟“

”میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کو کاروبار کی اونچ نیچ سے زیادہ واقفیت نہیں ہے اس لئے اگر خدا کرے.....“

”میں سمجھ گیا آپ کا اشارہ۔“ جمال احمد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”مگر آپ یہ کیوں فراموش رہی ہیں کہ وقار بھائی کا تجربہ ہمارے ساتھ ہوگا اور وہ خود بھی اس کاروبار میں برابر کے شریک ہوں گے..... رہا نفع اور نقصان کا معاملہ تو یہ نیلی چھتری والے کے ہاتھ میں ہے، اُس کی مرضی کے مطابق انسان لاکھ ہاتھ پاؤں مارے نہیں سے گرا ہوا ایک سوکھا پتہ بھی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکتا۔“

”یہ تو خیر ٹھیک ہے۔ لیکن انسان کو زور اندیشی کے تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے۔“
”یہ سب مقدر کے کھیل ہوتے ہیں بیگم..... لیکن مجھے یقین ہے کہ کاروبار میں بھی مجھے کسی گھلا کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔“

”کوئی خاص وجہ.....؟“

”آپ جو ہوں گی ہمارے ساتھ۔“ جمال احمد نے بڑے خلوص سے جواب دیا۔ ”وہ دن ہے

ا کا نہایت مبارک دن تھا جب آپ نے ہماری زندگی میں قدم رکھا..... اُس دن سے مجھے کبھی کوئی س نہیں ہوا۔“

”اب آپ شاید مجھے بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”اگر میری بات پر یقین نہیں آتا تو خود اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر سوچئے..... کیا میں غلط بیانی سے کام رہا ہوں؟“

”میرا خیال ہے کہ اس معاملے میں آپ سے زیادہ میں خوش نصیب ہوں۔“ شبانہ بیگم کے لہجے رشتہ کا اظہار چھلک اٹھا۔ ”اگر آپ نے مجھے سہارا نہ دیا ہوتا تو.....“

”آپ پھر وہی پرانی باتیں لے بیٹھیں۔“ جمال احمد نے بیوی کو جذباتی ہوتا دیکھ کر کہا۔ ”یہ خاصا صاب کتاب ہے، پھر کسی وقت فرصت سے طے کر لیا جائے گا، فی الحال آپ یہ بتائیے کہ شاملہ سے کیا باتیں ہوئیں.....؟“

”ابھی اتنی جلدی کیا ہے؟“ شبانہ بیگم شوہر کا مفہوم بھانپ کر بولیں۔ ”ابھی تو ہمارے منصوبہ کو کام کرنا ہے، اس کے بعد عملی زندگی میں قدم رکھنا ہے، پھر آگے کی بھی سوچ لی جائے گی۔“

”انسان کو اپنی منزل کا سراغ مل جائے تو سفر کی ٹکان کم ہو جاتی ہے۔“

”آگے آپ فلسفے پر.....“

”آپ جسے فلسفہ سمجھتی ہیں دراصل وہی ہماری خوشگوار زندگی کا مرکزی خیال ہے۔“

”منزل پالنے کی خوشی میں کبھی انسان کے قدم ڈگمگاہے جاتے ہیں.....“ شبانہ بیگم نے اپنے ماضی وریچوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”خوشگوار مستقبل کا تصور بھی ناکام حسرتوں کی صورت میں سامنے نے تو تمام زندگی کا روگ بن جاتا ہے.....“

”جہاں نشیب و فراز ہوتے ہیں وہاں قدم ہٹنا کر چلنا بھی اکثر مشکل ہو جاتا ہے لیکن کیا آپ اس سے انکار کریں گی کہ ریگستان میں قدرت نے تھکے ہارے مسافروں کے لئے نخلستان بھی بنا رکھے..... جہاں جذبے سے بچے ہوں، وہاں فتح یابی ہوتی ہے، یہ اور بات ہے کہ فتح حاصل کرنے کی خاطر ان کو کچھ دشواریوں اور قربانیوں کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔“

”یہی دشواریاں رستے ناسور کی طرح زندگی میں ایک کک چھوڑ جاتی ہیں۔“

”ہر وقت زخم کے لئے تریاق کا کام دیتا ہے..... انتظار شرط ہے۔“ جمال احمد نے بیوی کے چہرے تاثرات کو بغور دیکھتے ہوئے کہا پھر جلدی سے بولے۔ ”میں نے آپ سے منصور کے مستقبل کے بارے میں دریافت کیا تھا.....“

”شاملہ مجھ سے زیادہ آپ کا لحاظ کرتی ہے..... میرا خیال ہے کہ اگر آپ براہ راست اُس سے ٹکڑ کر لیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔“

”کیا آپ نے ذکر چھیڑا تھا.....؟“

”گفتگو کے دوران یونہی سرسری سی بات نکلی تھی لیکن شاملہ کا کہنا ہے کہ وقار بھائی اس وقت تک بی بیہ کی بات نہیں سننا چاہتے جب تک لڑکیوں کی تعلیم مکمل نہیں ہو جاتی۔“

”میرا ذاتی نظریہ بھی یہی ہے۔ لیکن اگر بزرگوں کے درمیان مل از وقت کوئی بات طے ہو جائے تو میں حرج بھی نہیں ہے۔“

”آپ مردوں کا مسئلہ ہم بے چاری عورتوں سے بہت مختلف ہوتا ہے۔“

”میں سمجھا نہیں.....؟“

”لڑکوں کا کیا ہے، دن بھر آزاد گھومتے رہتے ہیں اس لئے قدم قدم پر انہیں ایک سے ایک خوبصورت اور حسین منزلیں نظر آتی رہتی ہیں لیکن لڑکیوں کا معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے، اُن کانوں میں ایک بار جس منزل کے نشان کی بھنک پڑ جائے، وہ اُسی کے تصور کے حسین خوابوں تانے بانے جوڑنا شروع کر دیتی ہیں۔“

”آپ کی بات سے مجھے انکار تو نہیں لیکن پانچوں انگلیاں برابر بھی نہیں ہوتیں۔“

”اب آپ جانبداری سے کام لے رہے ہیں.....“

”میں آپ کے خیال کی تردید نہیں کروں گا۔“ جمال احمد نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
”قدرے سنجیدگی سے بولے۔“ اگر آپ شائلہ سے بات کرنے سے گریز کر رہی ہیں تو میں کسی وقت وہ دیکھ کر منصور کے رشتے کی بات اُن کے کان میں ڈال دوں گا..... مجھے قوی اُمید ہے کہ شائلہ یا وہ بھائی میری بات سے انکار نہیں کریں گے لیکن.....“

”لیکن کیا.....؟“

”بات آپ کی پسند کی رہ جاتی ہے۔“ جمال احمد نے کہا۔ ”آپ کو ثنا اور نادیہ میں سے اپنے منہ سے لئے کون پسند ہے؟“

”ثنا تو ڈاکٹری پڑھنے کا معصم ارادہ کر چکی ہے اس لئے اُس کے بارے میں پانچ چھ سال تک بھی نہیں جاسکتا۔“

”اگر آپ کو شاپسند ہے تو ہم اُس کے لئے انتظار کر سکتے ہیں۔“ جمال احمد نے سنجیدگی سے کہا۔

”نادیہ کے سلسلے میں آپ کا کیا خیال ہے؟“ شابلہ بیگم نے پہلو بدلتے ہوئے دریافت کیا۔

”مجھے تو ثنا اور نادیہ دونوں ہی پسند ہیں..... شائلہ جس کے لئے بھی ہاں کر دیں مجھے منظور ہوگا۔“

”آپ تو بالکل اُدھار کھائے بیٹے ہیں۔“

”جہاں اولاد کے مستقبل کا مسئلہ درپیش ہو، وہاں والدین اکثر جذباتی ہو جاتے ہیں..... آپ کا

خیال ہے؟“

”میں آپ سے متفق ہوں لیکن اتنی جلدی بھی کیا ہے..... لڑکیاں کہیں بھاگی تو نہیں جا رہیں۔“

”سوچ بیٹھے..... یہ ذمہ داری آپ کی ہوگی۔“

”کیا مطلب.....؟“

”مطلب یہ کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم انتظار ہی کرتے رہ جائیں اور دونوں لڑکیاں ہمارے ہاتھ

نکل جائیں۔“

”شائلہ میری بہن ہے..... اب ایسا بھی نہیں کہ ہم سے مشورہ کئے بغیر وہ بیٹیوں کی بات کہیں

کر دے۔“

”آپ نے اب تک یہ دریافت نہیں کیا کہ مجھے ثنا اور نادیہ میں سے کون زیادہ پسند ہے؟“

”چلئے، اب پوچھ لیتی ہوں۔“

”ثنا.....“ جمال احمد، ثنا کا نام لے کر ایک لمحے کو خاموش ہو گئے پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

”لیکن وہ میری ذاتی پسند ہے..... منصور کے لئے مجھے نادیہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔“

”منصور کا جوڑ بھی نادیہ کے ساتھ زیادہ اچھا رہے گا۔ لیکن آپ نے ثنا کو ذاتی پسند کس اعتبار

ہا؟“ شابلہ بیگم نے سنجیدگی سے شوہر کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

”ثنا..... دراصل وہ زندگی کے فلسفے کی ایک نہایت ہی حساس اور نازک کڑی ہے اس لئے میں نے اپنی ذاتی پسند قرار دیا..... منصور کے لئے آپ کا خیال مناسب ہے، نادیہ سے اُس کا جوڑ بہت

بہتر ہے گا۔“

”میں محسوس کر رہی ہوں کہ آپ ثنا کے سلسلے میں بہت زیادہ جذباتی ہوتے جا رہے ہیں۔“ شابلہ

بہن نے دینی زبان میں کہا۔ ”اُس روز ابا جان کے گھر پر بھی آپ نے ثنا کی ڈاکٹری پڑھنے کی بھرپور

ابیت کی تھی۔“

”یہ فلسفہ ابھی آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا.....“ جمال احمد نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔ ”کچھ

زے ایسے ہوتے ہیں جن کی تسکین کی خاطر انسان کو دوسرے کی ذات میں اپنی دیرینہ خواہشات کو

اش کرنا پڑتا ہے..... زندگی کی کچھ اچھی ہوئی گتھیاں اچانک کسی رنگ روپ میں سامنے آجائیں تو

سان قدرتی طور پر جذباتی ہو جاتا ہے۔“

”کیا..... کیا ثنا کے روپ میں آپ کو اپنے ماضی کی کچھ گم گشتہ یادیں یا دھندلائی ہوئی کوئی تصویر

لمر آ رہی ہے؟“

”شاید ایسا ہی ہو..... جانے کیوں اُس کا چہرہ مجھے بے حد مانوس اور شناسا لگتا ہے، جیسے میں اُسے

ہوں سے جانتا ہوں.....“

پھر فون کی گھنٹی کی تیز آواز اُبھری تو جمال احمد تیزی سے اٹھ کر کال ریسیور کرنے چلے گئے اور شابلہ

بہن شوہر کے چہرے پر اُبھرنے والے تاثرات اور اُن کی باتوں کی گہرائی کے بارے میں غور کرنے

لیں.....!!

○○○

کھانے کے کمرے سے نکل کر وہ اپنے کمرے کی سمت جا رہی تھی کہ اچانک شازیہ کو دیکھ کر

ششدر رہ گئی۔ ”تم.....؟“ ثنائے اُسے حیرت سے گھورتے ہوئے کہا۔ ”کہیں میری آنکھیں دھوکا تو

میں کھا رہی ہیں؟“

”اور اب تم یہ بھی پوچھو گی کہ آج میں ادھر کا راستہ کیسے بھول گئی۔“

”یقیناً کوئی اہم بات ہوگی ورنہ تم اتنے دنوں بعد اس قدر اچانک وارد نہ ہوتیں۔“

”سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ تمہیں فوراً تیار ہو کر میرے ساتھ شاپنگ کے لئے چلنا ہے۔“

نازیہ نے اپنی دسٹی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہیں تیار ہونے کے لئے دس منٹ سے زیادہ نہیں

سے جاتی۔“

”امی جان سے واقفیت ہے آپ کی؟“ ثنائے شوخی سے کہا۔

”تم آٹنی کی فکر مت کرو..... آٹنیس تو میں دو منٹ میں راضی کر لوں گی، بس تم فافٹ تیار ہو جاؤ۔“

”تفصیل کچھ پیو تو چلے کہ آخر معاملہ کیا ہے؟“

”تفصیل کچھ بعد میں ہوگی..... میں آٹنی کو رام کر کے ابھی آئی۔“ پھر قبل اس کے کہ ثنا کچھ کہتی

نازیہ بے لے قدم اٹھاتی شائلہ بیگم کی خواہگاہ کی طرف چلی گئی۔

نازیہ نے نہ صرف یہ کہ ثنا کی ہم جماعت اور اُس کی قریبی سہیلیوں میں سے تھی بلکہ وقار احمد کے

انونی مشیر و حید الدین کی اکلونی بیٹی تھی اس لئے اکثر وہ ثنا کے گھر بھی آتی جاتی رہتی تھی، ہر وقت

”کچھ ایسی ہی بات ہے۔“ شازیہ نے فرحان کے گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری شازیہ باجی کسی غیر کی امانت ہو چکی ہیں۔“

”سمجھ گیا..... آپ کی شادی یعنی کہ میرج سریمنی ہونے والی ہے۔“

”خدا تمہیں نظر بد سے بچائے..... بہت ذہن بچے ہو۔“

ٹاپ چپ چاپ کھڑی شازیہ کی مسرت بھری باتوں سے اُس کی خوشی کا اندازہ لگا رہی تھی، اچانک اسے کچھ یاد آیا تو شازیہ سے چھوٹی انگلی کا بہانہ کر کے کمرے میں آگئی، دھڑکتے ہوئے دل سے احمر کا دھلا، جلدی جلدی اُس کے کونے پر بچکانہ انداز میں ”انتظار فرمائے“ لکھا، پھر ایک نئے لفافے میں بند کر کے اُس پر بگڑی ہوئی مردانہ تحریر میں احمر کا پتہ لکھا اور پرس میں احتیاط سے رکھتے ہوئے اُلٹے قدموں واپس آگئی، شازیہ فرحان سے کہہ رہی تھی۔

”فرحان میاں..... اپنی شازیہ باجی کے حق میں دُعا کرنا کہ نصیب اچھے ہوں۔“

”آپ بالکل فکر نہ کریں..... میری دُعائیں آپ کے ساتھ ہوں گی۔“ فرحان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”لیکن ایک شرط پر۔“

”وہ کیا.....؟“

”آپ اپنی شادی ہو جانے کے بعد مجھے بھول نہ جائیے گا.....“

”تم بھی کوئی بھلانے کی چیز ہو.....؟“

”اب چلے گی بھی یا یہیں کھڑی باتیں بگھارتی رہے گی۔“ ثناء نے ٹوکا تو شازیہ نے جلدی سے فرحان کو مکملے لگا کر پیار کیا پھر تیز تیز قدم اٹھاتی باہر آگئی جہاں ڈرائیور کار کے قریب کھڑا اُس کی آمد کا منتظر تھا۔

ڈرائیور کی موجودگی میں شازیہ اور ثناء کے درمیان انگریزی میں بات ہوتی رہی۔ ”اب بتا..... کون ہے وہ خوش نصیب جو تجھے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔“ ثناء نے آہستہ سے پوچھا۔

”ہے ایک نکیل سانوجوان.....“ شازیہ معنی خیز انداز میں بولی۔

”نکیل.....؟“ ثناء چونکی۔ ”وہی تو نہیں جس کے ساتھ لاہریری سے کتاب حاصل کرنے پر کالج میں تیرا ایک بار جھگڑا ہو گیا تھا؟“

”بڑی پرانی بات ہے..... اس کے بعد تو ہماری دوستی ہو گئی تھی۔“

”اتنے چپکے چپکے کہ کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوئی؟“ ثناء نے حیرت کا اظہار کیا۔ ”اور نکیل کے طور پر پتے سے بھی کبھی کسی کو شبہ تک نہ ہوا کہ وہ حضرت بھی تھے پر لٹو ہو چکے ہیں..... تم دونوں ہی چھپے رستم نکلے۔“

”رستم کی بات پرانی ہو گئی.....“ شازیہ شونی سے بولی۔ ”اب تو ہمیں سہراب کے بارے میں سوچنا پڑے گا۔“

”شازیہ کی بچی.....“ ثناء نے اُس کے زور سے کہنی مارتے ہوئے کہا۔ ”تو اتنی بے شرم کب سے ہو گئی؟“

”جب سے ڈیڈی نے رشتے کی بات کی کر دی ہے۔“ شازیہ ڈھٹائی سے بولی۔ پھر ڈرائیور سے گاڑی روکنے کو کہا اس لئے کہ اُس کی مطلوبہ دُکان آگئی تھی۔

بہت دیر تک وہ شازیہ کے ساتھ ایک دُکان سے دوسری دُکان کے چکر لگاتی رہی، شازیہ نے اپنے

ہنسا ہنسا اور شوخیوں کرنا اُس کی سرشت میں داخل تھا۔ بڑی یاغ و بہار طبیعت کی مالک تھی شاید لئے وہ فرحان سے بھی خاصی بے تکلف تھی اور یوں کل کر باتیں کرنی جیسے دونوں ہم عمر ہوں۔ ثناء بھی کھڑی سوچ ہی رہی تھی کہ شازیہ کی اچانک آمد اور شاپنگ پر چلنے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔ وہ شام تک بیٹم کے کمرے سے وارد ہو کر پھر اُس کے سامنے آگئی۔

”کیا مطلب..... تم ابھی تک یہیں جی کھڑی ہو؟“ شازیہ نے اُسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”خدا لئے جلدی تیار ہو جاؤ! مجھے ابھی ڈھیر سارے کام اور بھی کرنے ہیں۔“

”امی جان نے اجازت دے دی.....؟“

”جی ہاں.....“ شازیہ نے شرارت بھرے انداز میں کہا۔ ”البتہ آنٹی نے یہ تاکید بھی کی ہے کہ تمہارا خاص خیال رکھوں..... مطلب یہ کہ تم کہیں راستے میں ٹانگا جھانکی نہ کر سکو۔“

”خدا سمجھے گا تجھ سے.....“ ثناء نے لگاتے ہوئے کہا۔ ”جو منہ میں آتا ہے بک دیتی ہے۔“

”شرمانے کے لئے ابھی پوری زندگی پڑی ہے۔ اس لئے برائے مہربانی پہلے جلدی سے تیار ہو جاؤ ثناء کو معلوم تھا کہ شازیہ اُسے لے جائے بنا باز نہیں آئے گی اس لئے اُس نے جلدی جلدی اپنا درست کیا اور ہلکے پیازی رنگ کا ریٹی شلوار سوٹ پہن کر تیار ہو گئی، نادیہ پڑوس میں انٹی سیٹل کے گئی ہوئی تھی ورنہ شازیہ کو دیکھ کر خوشی سے نہال ہو جاتی، اُس کی عادت ہی ایسی تھی کہ ہر شخص سے جلد کل مل جاتی تھی۔

”میں نے تم سے تیار ہونے کو کہا تھا۔“ شازیہ ثناء کو سر سے پاؤں تک غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”اور تمہیں نظر کیا آ رہا ہے.....؟“

”کسی کے قل کا سامان۔“ شازیہ نے اُسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”ایمان سے اس سادگی کے باقیامت ڈھار ہی ہو.....“

”چپ بے شرم.....“ ثناء نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”کیا آنکھوں کا پانی بالکل ہی مر گیا۔“

”اسی کی تیاری ہو رہی ہے.....“ اس بار شازیہ نے عجیب انداز میں شرماتے ہوئے کہا۔

”سچ.....؟“ ثناء خوشی سے چیخ اٹھی۔ ”کون ہے وہ بد نصیب جس کی قسمت تیرے ساتھ پھوٹ ہے؟“

”اے خبردار.....“ شازیہ نے زوٹھتے ہوئے کہا۔ ”اگر تو نے میرے اُن کو کچھ کہا تو اچھا نہ ہو۔“

”یہ اُن کو ہیں کون ذات شریف جن کے نام پر تیری باجپیں کھلی پڑ رہی ہیں؟“ ثناء نے رازداری سے دریافت کیا۔

”بری بات..... بچے ایسی باتیں نہیں پوچھا کرتے۔“ شازیہ نے بزرگوں جیسے لہجے میں سرزنش دونوں سہیلیاں قہقہے لگاتی کمرے سے باہر آئیں تو رازداری میں فرحان سے مذہبھر ہو گئی۔

”شازیہ باجی..... آپ کب آئیں؟“ فرحان نے شازیہ کو دیکھتے ہی خوشی کا نعرہ بلند کیا پھر ”کیا کہیں جانے کی تیاری ہے؟“

”ہاں فرحان میاں! ہم اب جا رہے ہیں۔“ شازیہ نے اداکارانہ صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ ہوئے بڑے حسرت بھرے انداز میں کہا۔ ”تم نے بڑے ہونے میں اتنی دیر لگا دی کہ ہم کسی انگلی تھپنے پر مجبور ہو گئے۔“

”خیریت تو ہے؟“ فرحان نے حیرت سے پوچھا۔ ”آج آپ کچھ زیادہ ہی خوش نظر آ رہی؟“

لئے ڈھیر سارے کپڑے، جوتیاں اور کاسمینکس کی بے شمار چیزیں خرید ڈالیں۔ پھر ایک دکان نکلتے ہوئے شاکی نظر بجلی کے پولی کے ساتھ لگے ہوئے لیٹر بکس پر پڑی تو اُس کے دل کی دھڑکنیں ہو گئیں۔ شازیہ برابر والی جیولری کی دکان کی طرف بڑھی تو شانے جلدی سے لفافہ نکالا اور لپک کر بکس میں ڈال دیا، واپسی کے لئے تیزی سے چلی تو ایک بوڑھے راہ گیر سے ٹکراؤ ہوتے ہوئے روک گیا۔ ”کیا بات ہے بیٹی..... تم کچھ گھبرائی گھبرائی سی لگ رہی ہو۔“ بوڑھے نے اُس سے نہایت شفقت سے پوچھا۔

”جی نہیں..... ایسی تو کوئی خاص بات نہیں۔“ اُس نے ندامت بھرے لہجے میں جواب دیا پھر تو اُٹھائی جیولری کی دکان میں چلی گئی جہاں شازیہ شوکیں پر جھکی جھللاتے اور جھگک کرتے زیورات دیکھنے میں مشغول تھی۔ اچھا ہوا جو اُس نے شا کو خط پوسٹ کرتے نہیں دیکھا تھا ورنہ جان کھا ڈالتی۔ شازیہ اپنے لئے زیورات کا آرڈر دیتی رہی، پھر اُس نے شوکیں سے ایک خوبصورت سی انگوٹھا نکلائی تو شانے آہستہ سے کہا۔ ”یہ کیا دیکھ رہی ہو..... یہ مردانہ انگوٹھی ہے۔“

”ٹکیل کے ہاتھ میں کیسی لگے گی؟“

”دماغ تو نہیں چل گیا تیرا.....؟“ شانے حیرت سے کہا۔ ”تجھے ٹکیل کے لئے انگوٹھی خریدنے کیا ضرورت ہے؟“

”سہاگ رات کو اپنی طرف سے گفت کر دوں گی..... وہ بھی کیا یاد کرے گا کہ کس ریکس زادی واسطہ پڑا ہے۔“ شازیہ نے مسکراتے ہوئے بڑی شان سے کہا۔

”منہ دکھائی کی رسم تو لڑکے والے کرتے ہیں.....“ شانے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”انگوٹھی تو تجھے پہنائیں گے۔“

”اور میں انہیں کیا دوں گی.....؟“ شازیہ نے شوخی سے پوچھا پھر خود ہی دبی زبان میں بولا۔

”ایک پیار بھرا دل..... کیوں ٹھیک ہے نا؟“

”ابھی سے اگر ٹکیل کے سلسلے میں تیری دیوانگی کا یہ حال ہے تو شادی کے بعد کیا ہوگا؟“

”ایمان سے نا..... میں ٹکیل کو پا کر خوشی سے پھوٹی نہیں سارہی۔“

”آہستہ بولو.....“ شانے اُسے ٹوکا۔ ”ہم اس وقت اپنے ڈرائنگ روم میں نہیں، جیولری ڈا میں ہیں۔“

شازیہ نے پلٹ کر شوکیں کے دوسری جانب کھڑے سیلز مین کو دیکھا، انگوٹھی واپس کرتے ہو اُس نے دکاندار سے وقت پر زیورات کی ڈلیوری دینے کی تاکید کی پھر شا کا ہاتھ تھامے باہر آ گئی۔

”نا..... ایک بات پوچھوں؟“ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد اُس نے شا کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”پوچھو.....“

”پہلے وعدہ کرو کہ تم غلط بیانی سے کام نہیں لو گی۔“

”ایسی کیا بات ہے جس کے لئے باقاعدہ وعدہ وعید لیا جا رہا ہے؟“

”بعد میں بتاؤں گی..... پہلے وعدہ کرو کہ تم میری بات کا ٹھیک ٹھیک جواب دو گی۔“

”اچھا ہلما..... چل، وعدہ کرتی ہوں کہ جو تو پوچھے گی اُس کا بالکل ٹھیک ٹھیک جواب دوں گی۔“

”تو نے بھی کسی کو دل کی گہرائیوں سے چاہا ہے..... کسی سے محبت کی ہے؟“

”تیرا تو سچ سچ دماغ چل گیا ہے۔“ شانے اُسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”میرے پاس اس

ات کے لئے وقت کہاں..... ابھی تو مجھے باقاعدہ ڈاکٹری پڑھنی ہے۔“

”ج کہہ رہی ہے.....“ شازیہ نے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے تعذیب کی۔

”مجھے بلاوجہ جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت پڑی ہے.....؟“

”پھر تو کیا سمجھ سکے گی کہ محبت کس چیز کا نام ہے۔“ شازیہ نے مسکرا کر معنی خیز انداز میں جواب دیا۔

”کیا مطلب.....؟“

”مطلب یہ کہ اگر ٹکیل مجھے نہ ملتا تو شاید میں سچ سچ دیوانی ہو جاتی۔“ شازیہ نے سنجیدگی سے کہا۔

”اچا ہو تو اسے میرا پاگل پن کہہ لیکن میں اسے محبت کی انتہا کا نام دوں گی..... جب تک ڈیڈی نے پاگلے سلسلے میں بات چلی نہیں کر دی اُس وقت تک میری حالت کچھ عجیب سی تھی..... میں اکثر سوچا کرتی تھی..... اگر ڈیڈی نے میری پسند کو مسترد کر دیا تو کیا ہوگا..... کیا اس صورت میں، میں زندہ رہ سکتی..... شاید نہیں۔“

”پھر تو اچھا ہی ہوا جو وحید انکل نے ہاں کر دی ورنہ نہ جانے تیرا کیا ہوتا.....“

”ہاں نا! محبت ایسے ہی جذباتی لگاؤ کا نام ہے جو اگر حد سے گزر جائے تو انسان اپنے ہوش و حواس دیتا ہے۔ محبت زندگی بھی ہے اور محبت ہی بندگی..... محبت میں فنا ہو جانا پرستش کی معراج ہے۔“

”اور محبت ہی وہ پاگل پن ہے جو انسان کو پاگل خانے کی سیر بھی کراتا ہے۔“ شانے سنجیدگی سے کہنے لگی۔

”یہ تجھ پر محبت کا بھوت اتنی شدت سے کیسے سوار ہو گیا..... پہلے تو، تو خاصی عقلمندی کی بات کیا کرتی.....“

”بھی وقت آیا تو یہی سوال میں تم سے پوچھوں گی.....“ شازیہ نے ایک سرد آہ بھر کر مسکراتے ہوئے کہا۔

”خیال ہے تمہارا..... میرے اوپر اس قسم کی وحشت کبھی سوار نہیں ہوگی۔“

”محبت کی نہیں جاتی میری بنو..... محبت ہو جاتی ہے، کب ہوتی ہے یہ کوئی نہیں جانتا اور مرض کی اس وقت ہوتی ہے جب وہ لا علاج ہو جاتا ہے۔“

”ماشاء اللہ..... چشم بد دور..... تو نے محبت میں شاید ڈاکٹریٹ کر ڈالی ہے.....“

”ابھی تو ابتدا ہے..... انتہا کیا ہوگی..... کون جانے۔“ شازیہ نے بڑے نرموانی انداز میں کہا پھر کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں..... شاید وہ اپنے محبوب کے تصور میں گم ہو جانے کی شہنشاہ تھی۔

اور..... شا کے معصوم ذہن میں اچانک احمر کا خیال ابھر آیا۔

احمر..... جو اُس کی زندگی میں چوری چوری بڑے دبے قدموں داخل ہوا تھا..... جو اُس سے دور ہونے کے باوجود اُس کے بہت قریب ہوتا جا رہا تھا.....

”کیس محبت اسی قرب کا نام تو نہیں.....؟“ شانے سنجیدگی سے سوچا اور پھر وہ سہم کر رہ گئی، اُس دل کی دھڑکنیں بتدریج تیز ہونے لگیں اور ان دھڑکنوں میں بس ایک ہی نام صدائے بازگشت بن رہا تھا.....

احمر.....! احمر.....!! احمر.....!!!



بزرگوں کا قول ہے کہ محبت وہ پرکشش جذبہ ہے جو جانوروں کو بھی انسانوں سے مانوس کر دیتا

”اور یہ بھی تو سوچو میرے یار! کہ اگر ہم کامیاب ہو گئے ہوتے تو مس غزالہ کا ساتھ کیسے ہوتا؟“
 ”سنا ہے وہ بھی کسی بڑے باپ کی بیٹی ہے..... دیکھتے ہیں اب کلاس میں کون جیتتا ہے، اپنا پرنس
 ایل یاس غزالہ.....“

”کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگو تیلی.....“ حامد نے جو ایک سال پہلے فیل ہو چکا تھا راجیل کو ہوا
 جے ہوئے کہا۔ ”میں نے مس غزالہ کے تمام کوائف معلوم کر لئے ہیں، اُس کا باپ ناجائز آمدنی کی
 جے سے منجھوں پر تاؤ دے رہا ہے، کاغذ کی ناؤ کب تک تیر سکے گی، جس دن پکڑا گیا ساری بڑائی
 عری کی دھری رہ جائے گی..... رہا اپنا پرنس..... تو یہ سالڈ نوابی خاندان سے تعلق رکھتا ہے، تم دیکھنا،
 مس غزالہ تو اپنے پرنس کے مقابلے میں پانی بھرتی نظر آئے گی۔“

اور یہ وہ گمراہ کن باتیں تھیں جن کی ظاہری چمک دیک نے راجیل کو اپنے راستے سے پھر بھٹکا دیا،
 تین سال تک متواتر فیل ہوتا رہا۔ ماں اُسے ہر بار سرزنش کرتی لیکن بیرونی ماحول کے اثرات ماں کی
 بیٹوں کے اثر کو زائل کر دیتے، وہ پڑھائی کی جانب سے بے پروا ہوتا گیا۔ پھر جب ماں نے اُس کو
 لراچی بھیجنے کا فیصلہ کیا تو وہ انکار نہ کر سکا..... ماں کی نگاہوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں نے اُسے مجبور
 کر دیا، دوستوں نے اُسے ورغلانے کی کوشش کی لیکن اس بار ماں کی محتاجیت گئی۔

کراچی آنے کے بعد کچھ دنوں تک راجیل کو اپنے دوستوں کی ڈوری اور نئے ماحول کی گھٹن کا
 حس ستا تا رہا لیکن فرحان کی زندہ دلی نے اُس کے احساس کو مٹا دیا، وقار احمد کی درست شخصیت نے
 س کی ہمت بڑھائی، شامک بیگم کے پیار اور نصیحتوں نے اُسے زندگی کی راہوں پر آگے بڑھنے کا حوصلہ
 یا، ضامنہ اور نادیہ کی معصوم باتوں نے اُس کے ہٹکنے ہوئے ذہن پر نہایت خوشگوار اور مثبت اثرات
 رتب کئے اور جب شانے اُسے پڑھانا شروع کیا تو راجیل کے اندر سویا ہوا انسان کروٹ لے کر بیدار
 ہو گیا۔

اُسے اپنی غلطیوں کا احساس بڑی شدت سے ہوا..... زندگی کے جو تین قیمتی سال ضائع ہو چکے تھے
 وہ انہیں دوبارہ نہیں لاسکتا تھا..... لیکن اُس نے طے کر لیا تھا کہ ماضی میں اُس نے جو کچھ کھویا ہے اُسے
 مستقبل میں اپنی انتھک کوششوں سے ضرور حاصل کرے گا..... حال کے خوابوں کو شرمندہ تعبیر کئے بغیر
 نہیں لے گا۔

اس وقت بھی وہ اپنے کمرے میں بیٹھا ایک کتاب کی ورق گردانی میں مصروف تھا جب منصور
 رحان آ گئے۔ راجیل نے دونوں کو دیکھا تو کتاب میز پر رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ آگے بڑھ کر منصور سے
 تھلایا پھر فرحان سے بولا۔ ”آپ سنا ہے..... خیریت سے تو ہیں؟“

”جی ہاں..... ہم سب خیریت سے ہیں..... آپ کی خیریت خداوند کریم سے نیک مطلوب ہیں اور
 آپ کو یہ بتانے آئے ہیں کہ سورج غروب ہو چکا ہے اس لئے آپ کو انیکسی سے طلوع ہو جانا
 چاہئے..... دیگر احوال یہ ہے کہ آج ہمارے اور نادیہ باجی کے درمیان بید منٹن کا بیچ ہونا طے پایا ہے
 جس میں آپ کی شرکت بھی ضروری ہے.....“

ہوگی، ”میری ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں۔“ راجیل نے دستانہ انداز میں کہا۔ ”فتح یقیناً آپ ہی کی

”ڈرہ نو آڑی ہے آپ کی۔ لیکن میری فتح آپ کی شکست بھی بن سکتی ہے۔“
 ”کیا مطلب.....؟“

ہے۔ نفرت وہ جذبہ ہے جو راکھ کے ڈھیر تلے دبی چنگاریوں کو ہوادے کر شعلوں کا زوہ اختیار
 کر اُکساتا ہے اور خوشگوار ماحول وہ دُورِ نایاب ہے جسے پالینے کے بعد انسان فح و کامرانی کی م
 سے بہت قریب ہو جاتا ہے۔

وقار احمد کے گھر کے مہذب اور صاف ستھرے ماحول نے راجیل کی لائبابی طبیعت پر نہایت ا
 مرتب کیا، جب تک وہ لاہور میں رہا گھریلو ماحول کی یکسانیت کا شکار رہا، صرف وہاں ایک میرا
 تھیں جو کاروباری مصروفیات میں بھی اُبھی رتیں اور فرصت کے اوقات میں راجیل کی تربیت پر
 دیتی تھیں، اتنے بڑے بچکے میں ایک ماں کی محترم ذات کے علاوہ کوئی دوسرا ایسا فرد نہیں تھا، راجیل
 کے ساتھ وقت گزار سکتا، جس کی رفاقت میں وہ اپنی زندگی کے لئے کسی ایک سیدھے راستے کا
 سکتا۔ البتہ وہاں ملازموں کی بھرمار تھی جو حکم کے غلام تھے۔ چنانچہ راجیل کو حکم چلانے اور خود
 عادت پڑ گئی، جب تک وہ میزک میں رہا زندگی کا دائرہ اتنا وسیع نہیں ہوا کہ اپنے ارد گرد کے م
 کھلی فضا میں آزادی سے سانس لے سکتا لیکن کالج کے احاطے میں قدم رکھتے ہی ایک نئے ماحو
 اُس کی آنکھوں میں چکاچوند پیدا کر دی..... وہ بڑے بڑے خاندان کا چشم و چراغ تھا۔
 میں بلند پروازی کی عادت اُسے باپ کی طرف سے ورثے میں ملی تھی اور نوابی ٹھاٹھ باٹ نانا کی
 سے اُس کے حصے میں آیا تھا..... اپنی ماں کی اکوٹی اولاد ہونے کی وجہ سے اُسے زندگی کی تمام آم
 حاصل تھیں اور یہی وہ عناصر تھے جنہوں نے مل جل کر راجیل کو غلط راہروی کا شکار بنا دیا۔

اُس کی طبیعت میں خود نمائی کا جذبہ کسی تناور درخت کی طرح اپنی جڑیں مضبوط کرتا رہا.....
 کلاس میں سب سے زیادہ خوش پوش طالب علم سمجھا جانے لگا..... کالج میں اُس کی سپورٹس
 چرچے عام ہوتے گئے..... اُس کی جیب میں نوٹوں کی بھی کوئی کمی نہیں رہی..... دوسروں پر اپن
 شوکت کا رعب چمانے کی خاطر وہ دل مھول کر خرچ کرنے کا عادی بن گیا۔ اور کالج میں ایسے
 لڑکوں کی کمی نہیں تھی جو راجیل کو اپنے دام میں پھانس کر غلط راستوں پر لے جاتے۔

چنانچہ یہی ہوا۔
 خوشامد پسندی کی لعنت اُس کی سرشت میں سم قاتل کی طرح شامل ہوتی گئی..... وہ اُک
 سے بھٹک گیا جس کا انتخاب اُس کی ماں نے کیا تھا۔

دو مخالف قوتوں کی سرد جنگ نے راجیل کی قوت فیصلہ کو زنگ آلود کر دیا..... جب وہ
 ایف۔ اے کے امتحان میں ناکام ہوا تو اُس کے ذہن کو ایک جھٹکا لگا، ماں نے اُسے ایک ن
 برباد ہو جانے کا احساس دلایا تو اُس نے سنبھلنے کی کوشش کی لیکن جب وہ باہر گیا تو اُس کے دوستان
 انتہائی بے پروائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”لعنت بھیجو یار..... ایک سال ہی تو برباد ہوا ہے، کون سی زندگی برباد ہو گئی۔“
 ابھی تو ساری عمر پڑی ہے..... پڑھ لیس گے بعد میں۔ ایسا بھی کیا کہ انسان کتابوں کا
 جائے۔“

”یہی تو عمر ہوتی ہے زندگی میں ہلاک کرنے کی..... ابھی اگر زندگی کا لطف نہ اٹھایا تو کیا
 میں شباب کی باتیں کرتے اچھے لکھیں گے.....؟“
 ”اپنے پرنس راجیل کو کاغذ کی ایک معمولی ڈگری کی ضرورت بھی کیا ہے..... جس کے
 سینکڑوں ملازم ہوں اُسے کس بات کی پروا؟“

ابور میں اپنے کالج میں بیڈمنٹن چیمپئن رہ چکا ہوں۔“
 ”پھر تو میرا خیال ہے کہ دوسرا کورٹ خالی ہی رہتا ہوگا۔“ فرحان نے اتنی سنجیدگی سے زندہ ولی کا
 بولت پیش کیا کہ سب ہی ہنس دیئے۔

”ہمارے جیت جانے کی صورت میں ڈنر کا بوجھ آپ کے کاندھوں پر پڑتا..... یہ بات بھی مجھے
 غور نہیں تھی۔“ راجیل نے شرمندگی چھپانے کی خاطر بہانہ تراشا۔
 ”یہ کیوں نہیں کہتے کہ آپ کی پارٹنر نے آپ کو مروا دیا..... ورنہ آپ تو اچھی خاصی اچھل کود کر
 رہے تھے۔“

”زیادہ اترانے کی کیا ضرورت ہے؟“ نادیہ نے فرحان کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”میں نے ڈنر کی
 زبردستی کی تھی، وہ تمہیں مل جائے گا۔“
 ”ہپ ہپ ہرے.....“ فرحان نے فتح کا نعرہ بلند کیا تو نادیہ جل کر بولی۔

”منصور بھائی کی وجہ سے جیت گئے ورنہ اس وقت نعرے لگانے کی بجائے بسور رہے ہوتے۔“
 ”گویا آپ یہ کہنا چاہ رہی ہیں کہ آپ کا پارٹنر منصور بھائی کے مقابلے میں کمزور تھا۔“ فرحان نے
 اکیل کو چڑاتے ہوئے کہا۔ ”سن رہے ہیں راجیل بھائی آپ..... ہو گئی نا آپ کی ساری اچھل کود
 کارت..... اسے کہتے ہیں تنکی برباد گناہ لازم.....“

”شرط میرے اور تمہارے درمیان لگی تھی..... تم بلاوجہ دوسروں کو درمیان میں کیوں گھسیٹ رہے
 وہ؟“ نادیہ تنک کر بولی پھر ریکٹ گھمائی ہوئی اندر چلی گئی۔
 ”میں بھی ذرا ڈریس پیچ کر کے ابھی آتا ہوں.....“ راجیل نے شا سے کہا پھر خاموشی سے انیکسی کی
 ریف چلا گیا۔

”بڑی بات ہے فرحان.....“ شا نے راجیل کے جانے کے بعد فرحان کو سمجھانے کی کوشش کی۔
 ”تمہیں اس طرح کسی کی شکست کا مذاق نہیں اڑانا چاہئے..... کل تم بھی ہار سکتے ہو۔“
 ”کیوں منصور بھائی..... کیا ہم ہار سکتے ہیں؟“ فرحان نے شوخی سے مسکراتے ہوئے منصور کی
 ریف دیکھا پھر بڑے بھولپن سے بولا۔ ”ایک تو ہم نے سب کے لئے شاندار ڈنر کا انتظام کر دیا اوپر
 سے ڈانٹ بھی سنی پڑ رہی ہے۔“

”کیا مطلب.....؟“ شا نے فرحان کو گھورتے ہوئے پوچھا۔ ”تم نے کوئی شرارت کی تھی.....؟“
 جواب میں فرحان نے جیب سے قرعہ اندازی والی دوسری پرچی نکال کر شا کے سامنے کر دی.....
 ”ابھی نادیہ باجی اور راجیل بھائی لکھا ہوا تھا..... شانے چوکتے ہوئے کہا۔
 ”گویا یہ تمہاری اور منصور بھائی کی ملی جھگڑ تھی.....“

”مرغا بھانسنے کے لئے دانا تو ڈالنا ہی پڑتا ہے.....“ فرحان نے نہایت معصومیت سے کہا۔ ”اور
 رغا بھی راجیل بھائی جیسا صحت مند.....“
 ”نادیہ کو پتہ چل گیا تو وہ تمہیں بخشے گی نہیں۔“ شا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تم نے صریحاً دھاندلی
 کی ہے۔“

”دھاندلی نہیں آیا..... بلکہ یہ کہنے کہ ہاتھ کی صفائی اور وہ بھی پیٹ پوجا کے لئے۔“ فرحان کے
 برسے پر شوخ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔
 ”اور آپ بھی فرحان کے ساتھ برابر کے شریک تھے؟“ شا نے منصور کی طرف دیکھا۔

”مطلب یہ کہ اس وقت چونکہ ہمارے منصور بھائی بھی موجود ہیں اس لئے میچ سنگل کی بجائے
 کا ہوگا۔“ فرحان نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”نادیہ باجی کا پارٹنر کون بنے گا اس کا فیذا
 اندازی کے ذریعے ہوگا۔“

”کیا پارٹنر بننے والی بات بلاقرعہ اندازی کے طے نہیں ہو سکتی؟“ راجیل نے منصور کی طرف
 ہوئے قدرے شان سے پوچھا۔ ”اُس کے لیے میں بڑائی کے احساس کے ساتھ ساتھ جلن کا ما
 شامل تھا۔“

”آپ نادیہ کے پارٹنر بن جائیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“ منصور نے فراخ دلی۔
 ”کھیل میں ہار جیت تو ہوتی ہی رہتی ہے۔“
 ”جی نہیں..... پارٹنر کا فیصلہ قرعہ اندازی سے ہوگا۔“ فرحان بولا۔ ”یہ بات ریفری نے
 طے کر دی ہے۔“

”ریفری..... وہ کون ہے.....؟“ راجیل نے دریافت کیا۔
 ”ہماری بڑی آپا.....“
 ”جیتنے والی پارٹی کو انعام کیا ملے گا..... میرا مطلب ہے کوئی نہ کوئی شرط تو طے ہوئی ہوگی۔“
 ”جی ہاں.....“ فرحان نے کہا۔ ”جو ٹیم ہار جائے گی اُسے مخالف ٹیم کو مع ریفری اور صائمہ
 کسی اچھے سے ہوٹل میں ڈنر دینا ہوگا۔“

”دوبری گڈ..... نہایت معقول شرط ہے۔“ راجیل نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ پھر سب
 باہر لان میں آگئے جہاں شا، نادیہ اور صائمہ پہلے سے موجود تھیں۔
 ”میرا خیال ہے کہ ابا جان کو بھی بلا لیا جائے۔“ نادیہ نے مشورہ پیش کیا۔
 ”وہ کس لئے.....؟“ فرحان نے پوچھا۔

”اس لئے کہ تم کھیل کے دوران بے ایمانی یا دھاندلی نہ کر سکو۔“ صائمہ بولی۔
 ”سن رہی ہیں بڑی آپا.....“ فرحان نے شا سے کہا۔ ”باجی کو آپ کے ریفری ہونے پر اعتراض
 میں نے کب کہا؟“ نادیہ نے جلدی سے صفائی پیش کی۔

”پھر ابا جان کو بلانے کی ضرورت کیوں محسوس کی جا رہی ہے؟“ فرحان نے بحث شروع کر دیا
 ”ٹھیک ہے۔ جو فیصلہ آپ کی کریں گی وہ مجھے منظور ہوگا۔ لیکن تم رونا نہ شروع کر دینا۔“
 ”کون روتا ہے اور کون ہنتا ہے اس کا فیصلہ تو میچ کے فیصلے کے بعد ہی ہوگا۔“ فرحان نے
 سے کہا پھر منصور کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”کیوں منصور بھائی.....؟“

”ظاہر ہے.....“ منصور نے جلدی سے کہا۔ ”قبل از وقت بھلا کیا کہا جاسکتا ہے.....؟“
 ضروری شرائط طے ہو جانے کے بعد قرعہ اندازی کی گئی تو فیصلہ نادیہ کی مرضی کے خلاف
 اُسے راجیل کا پارٹنر بننا پڑا۔ کھیل شروع ہوا تو مقابلہ کچھ درتیک برابر چلتا رہا۔ کبھی نادیہ کا ایک
 زیادہ ہو جاتا اور کبھی فرحان کا۔ راجیل کی پوری کوشش یہی تھی کہ وہ اور نادیہ جیت جائیں اسی
 پورے کورٹ میں دوڑتا پھر رہا تھا۔ لیکن جب منصور اور فرحان جیت گئے تو راجیل نے جھینپ مٹا

”خاطر کہا۔“ دیکھ لیا آپ نے..... ہمیں آپ کی دوستی کا کتنا خیال ہے.....“
 ”گویا آپ جان بوجھ کر ہارے ہیں.....“ فرحان نے ہانپتے ہوئے پوچھا۔
 ”اور نہیں تو کیا.....“ راجیل نے اپنی بڑائی جتاتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو شاید معلوم نہیں

”میں انکار نہیں کروں گا۔ لیکن آپ کو ماننا چاہئے کہ فرحان کی ترکیب کس قدر فائدہ مند ہوئی۔“ منصور نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”فائدہ مند نہیں منصور بھائی..... ڈنر منہ کیجئے۔“ فرحان نے شوخی سے کہا۔
 ”میں سمجھ گئی.....“ صائمہ جو قریب ہی کھڑی تمام باتیں غور سے سن رہی تھی فرحان سے بولی۔
 ابھی جا کر آپا کو بتاتی ہوں کہ تم نے بے ایمانی سے منہج جیتا ہے.....“
 پھر صائمہ اپنا جملہ ختم کر کے اندر کی طرف بھاگی تو فرحان بھی آوازیں دیتا ہوا اُس کے پیچھے پڑا۔ منصور اور شادونوں قہقہے لگانے لگے۔



صائمہ نے فرحان کی شرارت کا بھانڈہ پھوڑ دیا تو نادیہ جل بھن کر کباب ہو گئی، یوں بھی اُسے جیل کا پارٹرن بننا منظور نہیں تھا، قرعہ اندازی نے مجبور کر دیا ورنہ وہ صاف لفظوں میں انکار کر دیتی۔ موڈ را تو اُس کا جی کھیل سے اُچاٹ ہو گیا۔ پھر ہار یقینی تھی۔ اُسے ہار کا اتنا دکھ نہیں تھا لیکن فرحان کی بے ایمانی کا علم ہوا تو وہ بری طرح تلملا اُٹھی۔

”شرم نہیں آتی تمہیں.....؟“ اُس نے فرحان کو غصے سے گھورتے ہوئے کہا۔ ”بے ایمانی کرنے کا کیا ضرورت تھی.....؟“

”باجی..... میری بات تو سنئے!“ فرحان نے بات بنانے کی کوشش کی۔ ”صائمہ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ بڑی آپا کو دوسری پرچی دکھا رہا تھا اور یہ چٹلی کرنے آپ کے پاس دوڑی چلی آئی۔“
 ”قرعہ اندازی کی پرچیاں کس نے بنائی تھیں؟“
 ”میں نے۔“

”دوسری پرچی کہاں ہے؟“
 ”وہ..... وہ تو میں نے پھاڑ دی۔“ فرحان معصومیت سے بولا۔
 ”سچ بتاؤ..... کیا لکھا تھا دوسری پرچی میں؟“
 ”باجی..... آپ تو بلاوجہ خفا ہو رہی ہیں۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا ہے۔“
 ”اور وہ مرغا پھانسنے والی بات کس نے کی تھی؟“ صائمہ نے فرحان سے پوچھا۔
 ”وہ..... وہ تو محض مذاق تھا۔“ فرحان نے صائمہ کو نگاہوں میں جپ رہنے کی تاکید کی۔
 ”بالکل جھوٹ.....“ صائمہ نے جلدی سے کہا۔ ”تم نے بڑی آپا سے یہ بھی کہا تھا کہ ہاتھ کی صفائی نہ پوجا کے لئے کی ہے۔“

”اچھا..... آپ کو میری بات کا یقین نہیں آتا تو بڑی آپا سے پوچھ لیجئے گا۔“
 ”کچھ بھی کہو لیکن تم نے دھاندلی ضرور کی ہے۔“ صائمہ نے نادیہ کو یقین دلاتے ہوئے کہا۔ ”بڑی نے منصور بھائی سے بھی کہا تھا کہ وہ تمہارے برابر کے شریک تھے۔“
 ”جب وہ میرے پارٹنر تھے تو میرے ساتھ شریک کیوں نہیں ہوتے؟“
 ”تم اگر کہتے تو میں تمہیں ویسے بھی کسی اچھے سے ہوٹل میں ڈنر کھلا سکتی تھی۔“ نادیہ نے فرحان سے ملے ہوئے انداز میں شکایت کی تو بہن کی محبت بھائی کی شرارت پر غالب آ گئی۔ بڑے بھولپن سے

”مجھے یقین ہے کہ آپ میری بہت اچھی اور پیاری سی نادیہ باجی ہیں لیکن.....“

”لیکن کیا.....؟“
 ”دراصل مجھے وہ آم والی بات یاد آ گئی۔ فرحان نے شرارت سے سر کھجاتے ہوئے کہا۔
 ”آم والی کون سی بات؟“

”سوچ لو۔۔۔“ صائمہ نے شانے اچکاتے ہوئے جواب دیا۔ ”اگر میں نے راحیل بھائی کو بھی ماری بات بتادی تو تمہاری ڈشیں اور اُن کا ذائقہ دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔۔۔۔۔ اب بولو۔۔۔۔۔!“

”میری بات ہے صائمہ۔۔۔۔۔“ نادیہ نے منصور کو کھینچوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”راحیل بھائی کو اگر معلوم ہو گیا کہ ہم نے انہیں دھوکا دیا ہے تو انہیں ڈکھ ہوگا۔“

”ہاں۔۔۔۔۔“ شانے نادیہ کی تائید کی۔۔۔۔۔ راحیل کو اصل صورت حال کا پتہ نہیں چلنا چاہئے۔“

”بہر حال، کھیل دلچسپ رہا۔“ منصور بولے۔ ”اور میں تو فرحان کی شرارتوں کا قائل ہو گیا۔“

”ہمارے ساتھ رہیں گے تو آپ کو فائدہ ہی فائدہ ہوں گے۔“ فرحان نے بڑی شان سے کہا۔

”کچھ کھیا خیال ہے۔۔۔۔۔ ہم تیری شروع کر دیں؟“ نادیہ نے شانے سے کہا پھر کچھ سوچ کر بولی۔ ”میں ہی بلیوکلر والا شلوار سوٹ پہنے لیتی ہوں جس کے دوپٹے پر ہلکی کاندانی کا کام ہے۔ راحیل بھائی اس موٹ کی بہت تعریف کر رہے تھے۔“

”وہ سوٹ تو ابھی بدل کر آیا ہے۔ تم نے اُسے پہلے کب پہنا؟“ شانے تعجب سے پوچھا۔

”جس روز آپ شازبہ کے ساتھ شاپنگ کے لئے گئی تھیں، اُس دن میں نے سوٹ کی ٹرائل کی تھی، فاق سے راحیل بھائی نے بھی دیکھ لیا اور انہوں نے تعریفوں کے بل باندھنا شروع کر دیئے۔“

”میں تو جینز اور جیکٹ میں چلوں گا۔“ فرحان نے کہا۔

”منصور خاموش کھڑے نہ جانے کس سوچ میں غرق تھے۔

”تیاری بعد میں ہوتی رہے گی۔۔۔۔۔ پہلے امی جان کی اجازت ضروری ہے۔“ شانے کہا۔

”ہم سب مل کر چلتے ہیں۔“ نادیہ جلدی سے بولی۔ ”میرا خیال ہے امی جان ضرور اجازت دے دیں گی۔“

نادیہ کی تجویز پر سب لوگ وفد کی شکل میں شاملہ بیگم کے پاس گئے، کچھ دیر تک فرحان اپنی چکنی ہڑی باتوں سے ماں کا دل بہلاتا رہا، پھر نادیہ نے دبی زبان میں شروع سے آخر تک کی تفصیل دہرائی

”شاملہ بیگم بھی اپنی بی بی ضبط نہ کر سکیں، فرحان کو متا بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولیں۔

”الکسا شرارتیں اچھی نہیں ہوتیں۔ اگر راحیل کو پتہ چل گیا تو وہ کیا خیال کرے گا؟“

”اس میں سوچنے کی کیا بات ہے؟“ فرحان بولا۔ ”کھیل میں ہار جیت تو لگی رہتی ہے۔“

”بات ہار جیت کی نہیں تمہاری حرکت کی ہے۔“ شاملہ بیگم نے کہا۔ ”راحیل کو اگر ظلم ہو گیا کہ تم نے جان بوجھ کر اُسے ہرانے کی کوشش کی ہے تو اُسے یقیناً ملال ہوگا۔“

”پھر، آپ کا کیا حکم ہے؟“ شانے پوچھا۔ ”ہم ڈنر پر جانے کا پروگرام کینسل کر دیں؟“

”یہ تو اور بری بات ہوگی۔“ نادیہ نے کہا۔ ”راحیل بھائی یہ سوچیں گے کہ ہم انہیں غیر سمجھتے ہیں لے لے اُن کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔“

”ایک طریقہ اور بھی ہے۔“ شاملہ بیگم نے کہا۔ ”تم لوگ بڑے شوق سے جاؤ مگر ڈنر کا خرچ برسہ زمر ہوگا۔“

”راحیل بھائی اس بات کو بھی محسوس کر سکتے ہیں۔“ فرحان نے کہا۔

”ایک تجویز میرے ذہن میں بھی آرہی ہے۔“ نادیہ نے دبی زبان میں کہا۔

”وہ کیا؟“ شاملہ بیگم نے دریافت کیا۔

”آج ہم راحیل بھائی کی خوشی کی خاطر اُن سے ڈنر کھا لیتے ہیں۔ دو ایک دن بعد ہم انہیں ڈنر کھلا

”واہ۔۔۔۔۔ آپ نے اُس دن خود ہی تو کہا تھا کہ جو مزہ آم چوری کر کے کھانے میں آتا ہے وہ کر کھانے میں کہاں؟“

”ہوں۔۔۔۔۔ تو گویا تم نے جان بوجھ کر قرعہ اندازی میں دھاندلی کی تھی؟“ نادیہ نے تیزی گھورتے ہوئے پوچھا۔

فرحان نے بات بگڑتے دیکھی تو سر جھکا کر اپنی شرارت کا اعتراف کر لیا۔

”سمجھیں اس دھاندلی کا مشورہ کس نے دیا تھا؟“ نادیہ نے فرحان کو کریدنے کی کوشش کی۔

”تمہارے منصور بھائی نے کہا تھا؟“

”انہیں بعد میں معلوم ہوا۔“ فرحان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”پہلے میں نے راحیل بھائی شرط والی بات طے کر لی تھی، اس کے بعد منصور بھائی کو بھی پرچیوں کے پارے میں بتا دیا۔“

”پھر۔۔۔۔۔“ نادیہ نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔ ”تمہارے منصور بھائی نے کیا کہا؟“

”وہ تو منع کر رہے تھے مگر میں نے اصرار کر کے انہیں راضی کر لیا۔“

”تم یہ بات مجھے پہلے بھی بتا سکتے تھے۔“ نادیہ نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”بلاوجا خاصے موڈ کا ستیا ناس کر دیا۔“

”کل دوبارہ سہی۔“ فرحان نے بہن کے قریب جا کر بڑی رازداری سے کہا۔ ”اس بار سند پکک والی شرط رکھی جائے گی۔“

”نہیں۔۔۔۔۔“ نادیہ نے فرحان کو پیار سے سمجھایا۔ ”اس طرح کسی کو دھوکہ دینا بری بات ہے۔“

”اس میں دھوکہ دینے کی کیا بات ہے؟“ فرحان بولا۔ ”ہم تو محض تفریح کی خاطر راحیل بھائی مرعابیانے کی شرارت کریں گے۔ آپ نے دیکھا نہیں، اُن کے پاس خرچ کرنے کے لئے کتنے

سارے نوٹ ہر وقت جیبوں میں بھرے رہتے ہیں۔“

”ہوا کریں۔۔۔۔۔ ہمیں اُن کی دولت سے کیا غرض؟“

”سمجھنے کی کوشش کریں نا۔“ فرحان نے شوخی سے کہا۔ ”آخر ایک یونیٹی بھی کسی چڑیا کا نام ہے میں سمجھ گئی۔“ صائمہ نے بھائی کو چھینرنے کی خاطر بے حد سنجیدگی سے کہا۔ ”تم امتحان میں اسی طرح چیٹنگ کر کے پوزیشن لاتے ہو گے۔“

”فصل کے لئے بھی متصل کی ضرورت ہوتی ہے۔“ فرحان نے برجستہ جواب دیا۔ ”آپ چیٹنگ بھی نہ ہو پائے گی۔ اس لئے آپ تو بس گھونٹا لگاتی رہیں۔“

ابھی یہ دلچسپ گفتگو ہو رہی تھی کہ نا اور منصور بھی مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ شانے نا خوشگوار دیکھا تو منصور سے بولی۔ ”یہاں تو موسم بالکل سرد ہے۔ اور ہم سوچ رہے تھے کہ آئندہ طوفان کا شور مچا ہوگا۔“

”بڑی آیا؟“ فرحان نے شانے کے قریب آتے ہوئے احتجاج کیا۔ ”مجھے شاباش دیجئے جو میں طوفان کا رخ موڑ دیا۔ لیکن صائمہ کو اس بات کی سزا ضرور ملنی چاہئے کہ اس نے ہماری چٹلی کیوں کر

”اس میں چٹلی کی کیا بات ہے؟“ صائمہ نے جلدی سے کہا۔ ”تم نے بے ایمانی کی تھی!“

”اس کا پول کھول دیا۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔“ فرحان بولا۔ ”تم اگر شرارت کو بے ایمانی سمجھ رہی ہو تو پھر ڈنر پر ہمارے نہ چلنا۔۔۔۔۔ ہم کھانے سے واپس آکر تمہیں تمام ڈشوں کی تفصیل اور ذائقہ بتا دیں گے۔“

سے سلوانا بھول گئے۔ مئی نے مجھے یہ بات میٹرک کرنے کے بعد بتائی تھی..... اور بھی بہت سارے موٹ چس ہیں میرے پاس..... لیکن مجھے یہاں کی ٹیڈنگ کچھ زیادہ پسند نہیں..... بس گوارا ہے۔“
 ”جی ہاں.....“ آپ کا خیال درست ہے۔“ منصور نے سنجیدگی سے کہا۔ ”کچھ باتیں ضرور ایسی ہیں کہ جن کے سلسلے میں مغربی ممالک ہم سے بہت آگے ہیں..... مثلاً یہ کہ وہ جو کام کرتے ہیں بہت لگن اور شوق سے کرتے ہیں۔“

”میں نے سنا ہے آپ بی کام کر چکے ہیں۔“ راجیل نے ٹائی کی ٹاٹ کو درست کرتے ہوئے کہا۔
 ”آئندہ کے لئے کیا پروگرام ہے؟“
 ”ایم کام کرنے کا خیال ہے۔“

”اور اس کے بعد یقیناً کہیں ملازمت کریں گے۔“ راجیل نے قدرے تکبر سے کہا۔ پھر اپنی بڑائی کرتے ہوئے بولا۔ ”میرے نانا لاہور اور کراچی کے سب سے بڑے بزنس مین اور بل اوز بھٹے جاتے ہیں۔ میری مئی بھی اینڈ پیمنٹ ایک فیکٹری کی مالک ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ مئی کی فیکٹری میں سو سے زیادہ ملازم کام کرتے ہیں اور.....“

”ٹھیک ہے آپ کے بارے میں تفصیل سے بتا چکی ہیں۔“ منصور نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا تو راجیل کے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ اُبھر آئی۔

”آئی سی.....“ اُس نے طنز بہ انداز میں کہا۔ ”آپ کو شاید اس بات کا ملال ہے کہ پارٹنر شپ والی رعا اندازی میرے حق میں کیوں نکلی؟“

”آپ نے کیسے محسوس کیا؟“ منصور نے سنجیدگی سے پوچھا۔ راجیل کی بے ٹکی بات اُسے سخت گوار گزری لیکن اُس نے بڑے ضبط کا مظاہرہ کیا۔

”ممکن ہے میرا اندازہ غلط ہو..... لیکن یہ بات طے ہے کہ آپ اس وقت کسی بوریت کا شکار ہو رہے ہیں۔“

”جی نہیں..... آپ کا اندازہ غلط ہے۔“
 ”ڈنر کے لئے کیا آپ انہی کپڑوں میں چلیں گے؟“ راجیل نے منصور کے لباس پر تنقید کی۔ ”میرا طلب ہے کہ یہ ڈرنس بڑے ہونٹوں کے اعتبار سے کچھ مناسب نہیں لگ رہا..... بیڈ مشن ٹھیلنے کی وجہ سے پتلون کی کریر بھی خراب ہو گئی ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ انسان کی شخصیت کا اصل حسن اس کا اخلاق اور کردار ہے..... لباس تو زیبائش سن کا ذریعہ کہلاتا ہے۔“

”آپ نے بجا ارشاد فرمایا۔ لیکن بڑی بڑی محفلوں اور پارٹیوں میں شریک ہونے کے کچھ میز زاور ٹائیکٹ بھی ہوتے ہیں۔“

منصور کوئی جواب دینا چاہتے تھے لیکن فرحان کے آجانے سے انہوں نے ارادہ ملتوی کر دیا۔
 ”بائی لوگ کہاں ہیں؟“ راجیل نے فرحان سے پوچھا۔

”تیاریاں زور و شور سے ہو رہی ہیں۔“ فرحان نے کہا۔ پھر راجیل کو سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آج تو بس آپ ہی آپ سچ رہے ہیں۔“

”شکر.....“ راجیل نے مسکراتے ہوئے کہا پھر منصور کو دیکھنے لگا۔
 ”سپورٹس مین اسپرٹ اسی کو کہتے ہیں کہ انسان ہارنے کے بعد بھی ہنستا مسکراتا ہے..... کیوں

دیں گے، حساب برابر ہو جائے گا۔“

”اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ مجھے جان بوجھ کر خراب کھیل کر ہارنا ہوگا۔“ فرحان نے احتجاج کیا۔
 ”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس پارٹم اور راجیل پارٹنر بن جاؤ۔“ صائمہ بولی۔

”یہ نہیں ہوگا، ورنہ فرحان پھر پرچوں میں کوئی نہ کوئی شرارت کرے گا۔“ نادیہ نے سنجیدگی کہا۔ ”اب تو راجیل بھائی ہی میرے پارٹنر ہوں گے۔“

منصور نے نظر اٹھا کر نادیہ کے چہرے کی سنجیدگی کو بغور محسوس کیا پھر دوسری جانب دیکھنے لگے۔
 ٹائملہ بیگم کی اجازت مل جانے کے بعد سب لوگ تیار یوں میں مصروف ہو گئے۔ منصور

ڈرائنگ روم میں جا کر ایک رسالے کی ورق گردانی شروع کر دی لیکن اُن کا ذہن کہیں اور بٹک تھا۔ نادیہ کی باتیں اُن کے دماغ میں صدائے بازگشت بن کر گونج رہی تھیں۔ منصور کو ماں کی بات سے اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ نادیہ کو اس کے لئے پسند کر رہی ہیں اور مستقبل میں وہ دونوں

زندگی کی حسین شاہراہوں پر زندگی کے ہم سفر ہوں گے۔“
 منصور کوئی بچہ نہیں تھے..... زندگی کا ایک طویل عرصہ لندن کی آزاد فضاؤں میں گزار کر آ

تھے..... مغرب کی بے باک تہذیب کو انہوں نے بہت قریب سے دیکھا تھا..... لیکن اپنا ذہن بھی آ نہیں ہونے دیا..... باپ کی نصیحتوں اور ٹائملہ بیگم کی پرورش نے انہیں مشرقی تہذیب کا دلدادہ بنا

تھا۔ جوانی کی سرحدوں پر قدم رکھنے کے بعد ہر نوجوان کی طرح منصور نے بھی اپنے مستقبل کے ایک خواب دیکھا تھا۔ خواب..... جو اُن کی پلکوں پر کھیلتا رہا..... خواب..... خواب جو پہاڑی جھرنور

لغسکی سے بھر پور تھا۔ خواب..... جو بے حد بڑھتی کیفیت اور سہانا تھا.....

اور منصور نے جب پہلی بار نادیہ کو دیکھا تو اُسے یوں لگا جیسے وہی اُس کے خوابوں کی جیتی ہ تصویر ہے..... ہو بہو وہی معصوم اور حسین صورت جو ایک مدت سے اُس کے لاشعور میں محفوظ تھی۔

خواب نے تعبیر کی جیتی جاگتی شکل اختیار کی تو منصور کو اپنی منزل کا سراغ مل گیا.....
 کتنا حسین اتفاق تھا..... کیسا عجیب حادثہ تھا جس نے تصورات کے احاطوں سے نکل کر حقیقت

زوپ اختیار کر لیا..... اور یہ حسین اور معصوم زوپ نادیہ بھی جسے وہ دل کی اتھاہ گہرائیوں میں سجائے جانے کب سے پرستش کر رہا تھا.....

مگر..... آج جب نادیہ نے راجیل کے سلسلے میں گفتگو کی تو منصور کے ذہن کو ایک چرکہ سا لگا نادیہ کو راجیل کی کتنی خاطر منظور تھی! راجیل کی پسند کا کس قدر خیال تھا..... بھی تو اُس نے بلیو

کا شلوار سوٹ پہننے کا اظہار کیا..... اور کتنی صاف گوئی سے اس بات کا برملا اظہار کیا تھا کہ وہ آئندہ راجیل ہی کی پارٹنر بنے گی۔ اور.....

”آپ یہاں تنہا بیٹھے کیا کر رہے ہیں؟“ راجیل کی آواز کانوں سے ٹکرائی تو منصور کے خیالو شیرازہ منتشر ہو گیا..... انہوں نے رسالہ ایک طرف رکھ کر راجیل کو دیکھا جو گہرے براؤن کمرے

چس سوٹ میں سچ چچ پرنس ہی لگ رہا تھا۔ سیاہ گھٹنہ والے بال، گندی کھلتی ہوئی رنگت اور آ چمکدار نیلی آنکھوں نے اُس کی شخصیت کو کس قدر جاذب نظر بنا دیا تھا۔

منصور پوری توجہ سے راجیل کے سراپا کا جائزہ لینے لگے.....
 ”اتنے غور سے کیا دیکھ رہے ہیں؟“ راجیل نے صوفے پر بیٹھے ہوئے نہایت شان سے کہا۔
 سوٹ کا کپڑا میرے پاپا اپنے لئے پیرس سے لائے تھے لیکن اُن کے پاس سینکڑوں سوٹ تھے اس۔

منصور بھائی! آپ کا کیا خیال ہے؟“

”پو آرائٹ.....“ راجیل نے تیزی سے کہا۔ ”میرا ذاتی اصول بھی یہی ہے کہ انسان کو ہر وہ لائف انجوائے کرنی چاہئے۔ روتے بسورتے چہروں سے تو احساس کتری کا اظہار ہوتا ہے۔“

منصور نے تیزی سے نظریں اٹھا کر راجیل کو سخت نظروں سے گھورا، ایک لمحے کو اُن کی مشادہ پردہ بر آن گنت سلوٹیں ابھر آئیں، لیکن دوسرے ہی لمحے انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”زندگی کے گام کے بارے میں آپ کا مطالعہ خاصا وسیع اور دقیق معلوم ہوتا ہے۔“

”غلط خیال ہے آپ کا..... مجھے فلسفے سے بھی کوئی لگاؤ نہیں رہا۔“ راجیل نے کڑوا سا منہ بنا کر کہا۔ ”اس کے باوجود آپ کی باتیں خاصی دلچسپ اور خوبصورت لگتی ہیں۔“

”خود ہمارے راجیل بھائی بھی کیا کم خوبصورت ہیں؟“ فرحان نے کہا۔ ”بید منتھن کے معاملے البتہ کچھ کمزور واقع ہوئے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ دو چار بار ہارنے کے بعد جیت کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔“

”جس کے نام قرعہ نکل آئے اُسے میری زبان میں خوش نصیب ہی کہتے ہیں۔“ راجیل نے چہرے لہجے میں کہا۔ ”کیوں منصور صاحب! آپ کا کیا خیال ہے؟“

”میں آپ کی بات کی تردید نہیں کروں گا۔“ منصور نے ہنسنے ہوئے انداز میں کہا پھر اُٹھتے ہو فرحان سے بولے۔ ”تم لوگوں کا ارادہ کس ہوٹل میں ڈنر لینے کا ہے؟“

”یہ تو ہمارے راجیل بھائی پر منحصر ہے۔ دیے میرا اندازہ ہے کہ انٹرکانٹیننٹل سے کم کیا بات گی۔“ فرحان نے راجیل کو بالوں پر چڑھاتے ہوئے کہا۔ ”راجیل بھائی کی جج و جج اور تیاری سے تو اندازہ ہو رہا ہے۔“

”تم لوگ راجیل بھائی کے ساتھ چلو..... میں براہ راست ہوٹل آ جاؤں گا۔“

فرحان کو سمجھا کہ منصور ڈرائنگ روم سے نکلے تو شا، نادیہ اور صائمہ سے راہداری میں ٹڈ بھڑ ہوا۔ نادیہ نے اپنے کہنے کے مطابق وہی نیلے رنگ والا شلوار سوٹ پہن رکھا تھا جس کے دو بٹے پر کاغذ کا کام تیز روشنی میں دُور سے جھلملاتا نظر آ رہا تھا۔ اس لباس میں وہ واقعی بے حد حسین نظر آ رہی۔ منصور نے اپنے احساسات کو نمائشی مسکراہٹ کے اندر دفن کر لیا۔ شاید اس لئے کہ وہ اپنے دل کا عیاں نہیں کرنا چاہتے تھے۔

”آپ کہاں جا رہے ہیں؟“ ثنائے تیزی سے قریب آتے ہوئے پوچھا۔

”ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے۔“ منصور بدستور مسکراتے ہوئے بولے۔ ”میں نے را صاحب سے اجازت لے لی ہے۔ کام پختہ ہی پہلی فرصت میں ہوٹل پہنچ جاؤں گا۔“

”یہ تو کوئی بات نہ ہوئی..... سب ساتھ چلتے تو زیادہ لطف آتا۔“ شا بولی۔ ”کیا کام بہت اہم ہے؟“

”کچھ ایسی ہی بات ہے۔“

”ٹھیک ہے..... ہم لوگ ڈیڈی کی گاڑی پر چلے جائیں گے۔“ صائمہ نے مصیبت سے کہا۔ ”راجیل بھائی کی سپورٹس کار بھی تو ہے۔“ نادیہ نے جلدی سے کہا۔ ”اُس پر چلنے میں زیادہ آئے گا۔“

”میں اب اجازت چاہتا ہوں.....“ منصور نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ پھر ہاتھ اٹھا کر سہ

ل گیا اور لمبے لمبے قدم اٹھاتے باہر چلے گئے۔
ثنائے نادیہ کی طرف غور سے دیکھا جس کے چہرے پر فاقانہ مسکراہٹ قہقہہ کر رہی تھی۔

○○○

فیکٹری کا معاملہ طے ہو جانے کی خوشی میں پروفیسر جمال احمد نے اپنے بنگلے پر نہایت پُر تکلف دست کا ہتھام کیا تھا۔ خان بہادر آصف علی اور ارجمند بانو کو بھی بطور خاص مدعو کیا گیا تھا۔ سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ تھی کہ اس بار راجیل کی وجہ سے سیرا خاتون بھی والدین کے ساتھ کراچی تشریف لے گئیں۔ وقار احمد چونکہ کاروبار میں پروفیسر جمال کے برابر شریک تھے اس لئے وہ بھی شاملہ بیگم اور اُن کے ساتھ موجود تھے۔

بنگلے کے وسیع وعریض سبزہ زار کو تیز روشنیوں اور برقی قہقروں سے بڑی خوبصورتی سے سجایا گیا۔ ہانوں کے بیٹھنے کے لئے صوفوں کو دائرے کی صورت میں نہایت سلیقے سے ترتیب دیا گیا۔ لان کے بگوشے میں کھانے کا بندوبست تھا جہاں اُچلی سفید وردیوں میں لمبوس بیرے، صاحب خانہ کے نادرے کے منتظر تھے۔

اس خیال سے کہ بے تکلفی کا باحوال برقرار رہے جمال احمد نے صرف گھر کے لوگوں کو مدعو کیا تھا، مانوں کے استقبال کے لئے وہ نشستیں گیسٹ پر موجود تھیں۔ جب تمام لوگ آچکے تو وہ بھی اس حلقے کا آئینہ بن گئے جہاں خان بہادر آصف علی کے ساتھ وقار احمد پہلے سے گفتگو میں مصروف تھے۔ منصور راجیل خاموش بیٹھے بزرگوں کی گفتگو سن رہے تھے۔ منصور پوری توجہ سے کاروبار کو سمجھنے کی خاطر ایک بات کو بڑی توجہ سے ذہن نشین کر رہے تھے۔ راجیل کو چونکہ ان معاملات سے کوئی سروکار نہیں تھا اس لئے اُس کے چہرے سے بیزاری اور اکتاہٹ ٹپک رہی تھی۔

مردوں کے سیدھے ہاتھ والی نشستوں پر شاملہ بیگم اور شانہ بیگم بھی سیرا خاتون اور ارجمند بانو سے اُن میں مصروف تھیں، سامنے کچھ فاصلے پر شا، نادیہ، صائمہ اور فرحان کے علاوہ مس نوشابہ بھی جو سیرا خاتون کی سیکرٹری تھیں اور اُن کے ہمراہ لاہور سے کراچی آئی تھیں۔ نوشابہ چونکہ بہت زیادہ ہنس و ہواخ ہوئی تھیں اس لئے بہت جلد شا اور نادیہ سے کھل مل گئیں اور خاص طور پر فرحان سے تو اُن کی اتنی جلدی ہو گئی جیسے ایک دوسرے سے بہت پہلے سے واقف رہے ہوں۔

مردوں کے درمیان خالص کاروباری بات چیت کا مسئلہ زیر بحث تھا۔ خان بہادر صاحب نہایت پندلی کے ساتھ جمال احمد اور وقار احمد کو فیکٹری کے سلسلے میں اپنے وسیع تجربے سے مستفید کرنے کی طرز و محال دھار تقریر کر رہے تھے۔ دوسری جانب ارجمند بانو نے اپنی پیار بھری مخلصانہ باتوں سے بیگم اور شانہ بیگم کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ سیرا خاتون البتہ بہت کم گوئی سے کام لے رہی تھیں۔ وہ مائیکل بانوں سے زیادہ شا اور نادیہ کی جانب متوجہ تھیں۔ بھی بھی نظریں کھما کر راجیل کو بھی دیکھنے لگتیں۔ ”تم دونوں سے مل کر تو مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میں غیروں میں نہیں بلکہ اپنے عزیزوں میں لی ہوں۔“ ارجمند بانوں نے بہت شفقت سے شاملہ بیگم اور شانہ بیگم کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”اُس میں شک بھی کیا ہے؟“ شاملہ بیگم نے جلدی سے کہا۔ ”آپ تو ہمارے لئے ماں کا درجہ رکھتی ماں اور پھر وقار بتا رہے تھے کہ وہ آپ کے رشتہ دار بھی ہیں۔“

”ساتواں نمبر بھی یہی ہے لیکن جوچ پوچھو رشتہ کی نوعیت آج تک میری سمجھ میں نہیں آ سکی۔“

جمند بانو نے نہایت مصیبت سے کہا۔ ”اول تو یہ کہ یہاں ہر ایک کی مصروفیت اتنی زیادہ ہے کہ ملنے

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔“ ارجمند بانو نے نواسے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جس دن وہ باب ہوا میں خواجہ غریب نواز کی نیاز بانٹوں گی۔“

”رائیل اپنے خط میں خاص طور پر فرحان کا ذکر بڑی دلچسپی سے کرتا ہے۔“ سمیرا خاتون بولیں۔ ”میرا ل ہے کہ فرحان کی وجہ سے ہی اُس کا دل یہاں زیادہ لگ گیا ہے۔ کون سی کلاس میں ہے فرحان؟“

”ساتویں پاس کر کے اس بار اٹھویں میں گیا ہے۔“

”اور خدا کے فضل و کرم سے وہ اب تک ہر سال اپنی کلاس میں پوزیشن بھی حاصل کرتا رہا ہے۔“

”یہ تم نے سمیرا خاتون کو بتایا۔“ ثنا، نادیہ اور صائمہ کا بھی یہی حال بلکہ یوں کہئے کہ شائلہ کے گھر کے تعلیم کے معاملے میں ہر وقت بس ٹھنی رہتی ہے۔ ہر سال یہی مقابلے بازی ہوتی ہے کہ کون اپنی اس میں سب سے زیادہ اچھے نمبروں سے پاس ہوتا ہے۔“

”یہ تو والدین کی خوش قسمتی کی دلیل ہے۔“ ارجمند بانو نے کہا۔ ”خدا سب کو ایسے ہونہار اور بات مند بچے نصیب کرے۔“

”رائیل نے لکھا تھا کہ ثنا اُسے بڑی محنت سے پڑھا رہی ہے۔“ سمیرا خاتون نے ثنا کی جانب غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ بہن بھائی کا معاملہ ہے اس لئے میں دخل در معقولات سے گریز کرتی ہوں۔“ شائلہ بیگم نے برائیاں کی نظر سے بھانپتے ہوئے ذرا سنبھل کر کہا۔ ”البتہ میں نے ایک بات بڑے پیار سے رائیل ہاں کے گوش گزار کر دی ہے۔“

”وہ کیا.....؟“

”بہن! اگر اُس نے دل لگا کر محنت اور لگن سے امتحان نہ دیا اور خدا خواستہ نتیجہ ہماری توقعات کے لاف نکلا تو ہماری ناک کٹ جائے گی۔“ شائلہ بیگم مسکرا کر بولیں۔ ”رائیل میاں نے وعدہ تو بڑے زور سے کیا ہے کہ وہ ہماری ناک کی ہر ممکن حفاظت کریں گے۔ اب آگے مالک کو جو منظور ہو۔“

”ثنا نے تو اس بار ایف، ایس، سی کا امتحان دیا ہے؟“ سمیرا خاتون نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

”جی ہاں.....“

”اُس کے مستقبل کے بارے میں کیا سوچا ہے تم نے؟“ ارجمند بانو نے بیٹی کی دلچسپی کو محسوس کرتے ہوئے دلی زبان میں پوچھا۔

”اس کا فیصلہ تو نتیجہ آنے کے بعد ہوگا۔“ شائلہ بیگم نے جان بوجھ کر انجان بنتے ہوئے جواب دیا۔

”اگر نتیجہ حسب خواہش نکلا تو میڈیکل کالج میں داخلہ لینے کا ارادہ ہے۔“

”تم غالباً میرا مطلب نہیں سمجھیں۔“ ارجمند بانو نے قدرے کھل کر کہا۔ ”میرا پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ کیا بات بھی چل رہی ہے بچوں کی؟“

”جو چار رشتے آئے تو ہیں لیکن وقار بھائی اس معاملے میں بڑے حساس واقع ہوئے ہیں۔“ اس ارشاد بیگم نے جلدی سے کہا۔ ”اُن کا خیال ہے کہ جب تک لڑکیاں تعلیم سے مکمل فراغت نہ پالیں، لڑکے کانوں میں رشتے ناتوں کی ہوا بھی نہیں لگنی چاہئے۔“

”یہ بھلا کیسے ممکن ہے بیٹی؟ جہاں پیری کے اتنے خوبصورت درخت ہوں وہاں پتھر تو ضرور آئیں گے۔“ ارجمند بانو نے بزرگانہ لہجے میں کہا۔

”کیا عمر ہوگی ثنا کی؟“ سمیرا خاتون نے دریافت کیا۔

جلنے کا اتفاق نہیں ہوتا، دوسرے فاصلے اور دوریاں اتنی زیادہ ہیں کہ میل ملاقات نہیں ہو سکتی۔ اور سے بڑی خرابی یہ ہے کہ حالات کے تشعب و فراز نے کسی کو غریب سے ایک دم دولت مند بنا دیا اور بے چارے، جو اچھے دن دیکھے ہوئے تھے، ایسے لٹ لٹا کر آئے کہ شرم کے مارے منہ چھپائے ہیں۔ وقت اور ماحول کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ لوگوں کے خون بھی سفید ہو گئے..... اب تو جو جمعیت پیش آئے اور ڈھکے بھڑکے ایک دوسرے کے کام آئے وہی سب سے بڑا رشتہ دار ہے۔“

”پھر تو ہماری اور آپ کی بھی رشتے داری ہوئی۔“ شائلہ بیگم نے پہلو بدول کر کہا۔

”کیوں نہیں.....“ ارجمند بانو نے بڑی اپنائیت سے جواب دیا۔ ”تم دونوں سے ملنے کے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں ایک بیٹی کی نہیں، تین بیٹیوں کی ماں ہوں۔“

”ڈرہ نوازی ہے آپ کی۔“ شائلہ بیگم نے تشکرانہ انداز میں جواب دیا۔

”اور دونو اسے بھی تو ہیں۔“ شائلہ بیگم مسکرا کر بولیں۔

”اس میں بھلا کیا شک ہے؟“ ارجمند بانو نے جلدی سے کہا۔ ”جیسے میرے لئے راحیل، ویا منصور۔ خدا ان دونوں کو سلامت رکھے۔“

”رائیل کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ آپ لوگوں سے بہت زیادہ مانوس ہو گیا ہے۔“ خاتون سپاٹ لہجے میں بولیں۔

”بڑا ہونہار اور سعادت مند بچہ ہے۔“ شائلہ بیگم نے جواب دیا۔ ”خدا نے چاہا تو وہ اس ضرور کامیاب ہوگا۔“

”آمین.....“ ارجمند بانو نے کہا۔ ”خدا تمہاری زبان مبارک کرے۔“

”لاہور میں غلط دوستوں کی صحبت نے اُسے لگاڑ دیا۔ ورنہ راحیل کی ذہانت میں کوئی کلام نہ سمیرا خاتون کے لہجے میں خاندانی وقار جھلک رہا تھا۔

”آپ درست کہہ رہی ہیں بہن.....“ شائلہ بیگم بولیں۔ ”اسی ماحول اور غلط صحبتوں میں تو جاتے ہیں۔ لیکن کیا بھی کیا جاسکتا ہے؟ گھر کی چار دیواری تک تو بچوں کی نگہداشت کی جاسکتی ہے۔ گھر کے باہر جو حالات ہیں وہ اظہر من الشمس ہیں۔ وہی مثال ہے کہ گیسوں کے ساتھ گھن بھی پڑ ہے۔ ایک تو کالج اور یونیورسٹی کے لڑکوں میں یہ دبا مہلک جراثیم کی طرح پھیل گئی ہے کہ احتیاط جی چرائیں گے۔ نہ خود پڑھیں گے نہ دوسروں کو پڑھنے دیں گے۔ سارا سال کھیل کود اور فضول میں وقت برباد کرتے ہیں اور جہاں امتحان سر پر آئے ہنگامے شروع کر دیئے۔ خدا جانے سر پھرے لڑکوں کا مستقبل کیا بنے گا.....؟“

”تمہارا کہنا بھی ٹھیک ہے بیٹی! لیکن میرا خیال ہے کہ اس اُدھم چوڑی میں بیچارے لڑکوں زیادہ اُن سیاست دانوں کا قصور ہے جنہوں نے تعلیم کے صاف ستھرے ماحول میں سیاست کا زہ دیا ہے۔“

”تعلیم سے قبل تو ایسا بھی دیکھا نہ سنا۔ استاد کو باپ کا درجہ حاصل تھا۔ کیا مجال جو کوئی علم استاد کے سامنے نظریں بھی اٹھا سکے۔ اور یہاں..... خدا سب کو اپنی امان میں رکھے۔ بات با چانو اور چھریاں نکل آتی ہیں۔ نہ بڑوں کا ادب باقی رہ گیا نہ چھوٹوں کا لحاظ.....“

”بہر حال، میں آپ کی بے حد شکر گزار ہوں جو آپ نے راحیل کی ذمہ داری قبول کر لی۔“

”اب آپ شرمندہ کر رہی ہیں۔“ شائلہ بیگم نے سمیرا خاتون سے کہا۔ ”راحیل ماشاء اللہ؟“

”ہے، اسے یہاں پڑھانی کا ماحول مل رہا ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں جو وہ کامیاب نہ ہو۔“

”ہو سکتا ہے میں راجیل کی خوشی کے خیال ہی سے درمیان سے ہٹ گیا ہوں.....“ منصور نے فٹ کانٹے ہوئے دم آواز میں جواب دیا۔ اُس کے لہجے میں درد کی ککک موجود تھی۔

نادیہ نے نظریں اٹھا کر منصور کے چہرے کو بغور دیکھا تو گھبراہٹ سے اچانک ہڑا مضحل اور داس اُداس نظر آنے لگا تھا، یوں جیسے بادل کے کسی سیاہ ٹکڑے نے اچانک چاند کو اپنے گھیرے میں لے لیا ہو۔ ایک منٹ پہلے وہ اتنا بھجا بھجائیں دکھائی دے رہا تھا۔ نادیہ نے منصور کے جواب پر غور کیا

اندری اندر کٹ کر رہ گئی۔ کچھ دیر کم کھڑی حالات کی نوعیت پر غور کرتی رہی۔

وہ اپنے آپ کو مجرم سمجھ رہی تھی..... منصور کا مجرم..... اُسے یقین تھا کہ منصور اُس سے خفا ہے..... لیکن پہلے تو خود منصور کی طرف سے ہوئی تھی..... وہی تو فرمان کی سازش میں شریک ہوئے تھے.....

”میرا مطلب ہے کہ شاید ایک طرح سے راجیل کی اُستانی ہوئی۔“
 ”پھر.....؟“
 ”اگر اُستاد کا رشتہ باپ کی طرح ہوتا ہے تو اُستانی.....“
 ”اپنی طرافت اور بذلہ سخی کا ثبوت پھر کسی موقع پر دے لیجئے گا۔“ ارجمند بانو نے سنجیدگی سے ا
 ”میرا خیال ہے کہ اگر آپ بریٹیل تذکرہ وقار احمد کے کان میں یہ بات ڈال دیں تو مناسب ہوگا۔“
 ”اور میرا خیال ہے کہ یہ موقع اِس قسم کی باتوں کے لئے قطعی غیر مناسب ہے۔“
 ”وہ کیوں.....؟“
 ”ابھی فیکسری کے کاغذات پر دستخط کئے پورا ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا۔ آج ہمیں اسی تقریب کے“

انہی کی وجہ سے تو اُسے مجبوراً راحیل کا پارٹنر بننا پڑا۔۔۔۔۔ اس بات سے نادیہ کے احساسات کو بھی کچھ نہیں تھی۔ اُس نے منصور کی خوشنودی کی خاطر جان بوجھ کر خراب کھیل کا مظاہرہ کیا۔۔۔۔۔ شکست ہمسکار ہو گئی۔

پھر۔۔۔۔۔ اگر اُس نے منصور کو محض تنگ کرنے کی خاطر اپنی نگاہوں کے زاویے بدلے تو وہ! کیوں ہو گیا؟ کیا سمجھ رہا تھا وہ اپنے دل میں۔۔۔۔۔؟ کس غلط فہمی کا شکار ہو کر اپنے ہونٹوں مسکراہٹوں کو اُداسیوں کا رنگ بخش دیا تھا؟ اور۔۔۔۔۔ صرف ایک جملے کے وار سے کتنی شدید! پہنچائی تھی اُس کے دل کو!

اُسے راحیل کی خوشی کا کتنا خیال تھا۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ یہ احساس نہیں تھا کہ الفاظ کا گھاؤ تلوار کے زخم زیادہ کاری ہوتا ہے۔۔۔۔۔ وہ اپنے خیالوں میں گم رہی۔ پھر منصور جانے لگا تو وہ خاموش نہ رہ سکی۔ ”منصور۔۔۔۔۔!“ اُس نے پہلی بار دل کی گہرائیوں سے منصور کو آواز دی لیکن منصور نے شاید آواز نہیں سنی تھی جو قدم بڑھاتا آگے نکل گیا۔

یا۔۔۔۔۔ ہو سکتا ہے منصور نے جان بوجھ کر اُسے نظر انداز کرنے کی کوشش کی ہو۔۔۔۔۔؟ ”نہیں منصور۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ تم نادبہ کو غلط سمجھ رہے ہو۔“ نادبہ کے دل سے ایک آواز ابھر کر اُپر وجود پر طاری ہو گئی۔ اُس نے منصور کی غلط فہمی دور کرنے کی خاطر قدم آگے بڑھائے۔ وہ منصور دینا چاہتی تھی کہ جو کچھ وہ سمجھ رہا ہے وہ غلط ہے۔ لیکن راحیل اُس کے راستے میں آ گیا۔

”آپ اس قدر اُلگ تھلگ کیوں ہیں؟“ راحیل نے شکوہ کیا۔

”خیال ہے آپ کا، ورنہ میں تو تنہائی کے ساتھ انصاف کر رہی ہوں۔“ اُس نے کی دھڑکنوں کو چھپانے کی خاطر زبردستی ہونٹوں پر ایک دلاؤ پر تبسم سجایا۔

”آپ کو میری مٹی کیسی لگیں۔۔۔۔۔؟“ راحیل نے اچانک ایک عجیب سا سوال کر دیا۔

”جی۔۔۔۔۔ آپ کی مٹی بے حد گریس فل اور پُر وقار خاتون ہیں۔“ نادبہ نے بدستور مسکراتے کہا۔ اس کے سوا کیا کہتی؟

”آئیے۔۔۔۔۔ میں آپ کو مٹی سے ملواتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کو بہت پسند کریں گی۔“

”جی۔۔۔۔۔؟“ وہ ہکا بکا رہ گئی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ راحیل کی فرمائش کا کیا جواب دے۔

کے ساتھ چلی جائے یا صاف لفظوں میں انکار کر دے؟

”چیکے چیکے کیا کھس پھس ہو رہی ہے؟“ فرحان نے قریب آ کر شرارت بھری آواز میں پوچھا۔

نادبہ گڑبڑائی۔

”آپ سے اپنی شکست کا بدلہ لینے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔“ راحیل نے ہنستے ہوئے کہا۔

”پھر ہو جائے اس بار پینک کی شرط؟“ فرحان نے راحیل کو پھانسنے کی خاطر پُر جوش لہجہ اختیار

”منظور۔۔۔۔۔ لیکن اس بار قرعہ اندازی نہیں ہوگی۔“ راحیل نے تنکھوں سے نادبہ کو دیکھتے

جواب دیا۔ ”پارٹنر وہی رہیں گے جو پہلے تھے۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ آپ بھی کیا یاد کریں گے کہ کس سختی سے واسطہ پڑا ہے۔“ فرحان نے سنجیدگی

جواب دیا۔

”سوچ لیجئے۔۔۔۔۔ اس بار مقابلہ بڑا سخت رہے گا۔“ راحیل نے فرحان کو مرموع کرنے کی کوشش

”آپ بھی سوچ لیجئے۔۔۔۔۔ کہیں ہارنے کے بعد افسوس نہ ہو۔“ فرحان نے معصومیت سے کہا۔

”بالکل نہیں۔۔۔۔۔“ راحیل نے معنی خیز نظروں سے نادبہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے ہارنے کے بعد بھی خوشی ہوگی۔“

”خدا آپ کے خیال میں چٹکی فرمائے اور آپ اسی طرح خوشی خوشی ہارتے رہیں۔“ فرحان نے ن معصومیت سے ہاتھ اٹھا کر دُعا کی کہ نادبہ کو بھی ہنسی آگئی۔

اور۔۔۔۔۔ شاملہ بیگم کے ساتھ کھڑی ہوئی سمیرا خاتون بھی راحیل اور نادبہ کو مسکراتے دیکھ رہی تھیں۔

”آپ کی چھوٹی بیٹی کا کیا نام ہے؟“ سمیرا خاتون نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”نادبہ۔۔۔۔۔“ شاملہ بیگم نے کہا۔ ”اس سے چھوٹی کا نام صائمہ ہے۔“

”ٹٹا اور نادبہ کی عمروں میں کیا فرق ہے؟“

”صرف ایک سال کا۔۔۔۔۔“

”دونوں بچیاں ہی ماشاء اللہ پیاری ہیں۔“ سمیرا خاتون نے نادبہ کو دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

اور۔۔۔۔۔ زور کھڑی ہوئی نادبہ بزرگوں کی گفتگو سے بے خبر فرحان کی باتوں پر دل کھول کر ہنس رہی تھی۔

رات گئے خان بہادر صاحب، ارجمند بانو اور سمیرا خاتون کے ساتھ رخصت ہونے لگے تو راحیل کو ی اپنے ساتھ لے گئے۔ سمیرا خاتون نے جاتے وقت شاملہ بیگم سے کہا۔ ”میں راحیل کو صرف ایک

ت کے لئے لے جا رہی ہوں، آپ کی امانت کل آپ کو واپس مل جائے گی۔“

”کیا کراچی میں آپ کا قیام زیادہ نہیں ہوگا؟“

”جی نہیں۔۔۔۔۔ مجھے کل شام کی فلائٹ سے واپس جانا ہے۔“ سمیرا خاتون نے جواب دیا۔

کاروباری مصروفیات کی وجہ سے لاہور سے زیادہ دنوں کے لئے ڈور نہیں رہ سکتی۔

”اتنی جلدی بھی کیا ہے؟“ شاملہ بیگم نے کہا۔ ”اب جب آگئی ہیں تو دو چار روز تو قیام کریں۔“

”آئندہ آؤں گی تو آپ کی فرمائش پوری کرنے کی کوشش کروں گی۔“ سمیرا خاتون نے کہا پھر

رحان کو قریب بلا کر اُس کے گالوں کو چھتھتھاتے ہوئے بولیں۔ ”آپ سے تو ملاقات کا موقع ہی نہیں ملا

بتا راحیل کے خط سے آپ کی شرارتوں کی تفصیل معلوم ہوئی رہتی ہے۔“

فرحان نے کوئی جواب دینے کی بجائے صرف مسکراتے پر اکتفا کی۔ فرحان کے بعد سمیرا خاتون

نے ٹٹا کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا، پھر مسکراتی ہوئی دو قدم آگے بڑھیں، نادبہ کے قریب جا کر اُسے

پینے سے لگایا، بیٹیاں کو چومتے ہوئے بولیں۔

”خدا تمہیں ہمیشہ خوش رکھے اور زندگی کے تمام امتحانوں میں کامیاب کرے۔“

سمیرا خاتون کے علاوہ ارجمند بانو نے بھی بچوں کو خدا حافظ کہا۔ نوشاہہ بھی صائمہ، نادبہ اور فرحان

سے مل گئی پھر سب لوگ گاڑیوں میں بیٹھ کر رخصت ہو گئے تو وقار احمد اور جمال احمد نے اطمینان کا

ماس لیا۔

مہمانوں کو رخصت کر کے سب لوگ اندر آ گئے۔ وقار احمد کی خواہش پر ملازم کو کافی تیار کرنے کی

رایت کی گئی۔ شاملہ بیگم کچھ گھبرائی گھبرائی سی لگ رہی تھیں۔ شاملہ بیگم نے وجہ دریافت کی تو وہ انہیں

دوسرے کمرے میں لے گئیں پھر بولیں۔ ”آپا! کیا آپ نے سمیرا خاتون کی باتوں پر غور نہیں کیا؟“

”کس سلسلے میں؟“

”اپنی ٹٹا کے سلسلے میں۔“ شاملہ بیگم نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”ارجمند بانو بھی بیٹی کی خاطر

ٹٹا کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہی تھیں۔“

”تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟“ شانہ بیگم نے بہن کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”لڑکی والوں اس قسم کی باتوں سے اکثر و بیشتر واسطہ پڑتا رہتا ہے۔“
 ”وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن آپ نے بھی دیکھا کہ رخصت ہوتے وقت انہوں نے شا کے سر پر ہاتھ پھیرا اور نادیکہ کو باقاعدہ پیار کیا۔“

”ممکن ہے انہیں بعد میں ہماری نادیا زیادہ بھائی ہو۔۔۔۔۔“

”میں نے ایک بات اور بھی خاص طور پر محسوس کی۔۔۔۔۔“ شانہ بیگم نے بدستور سنجیدگی سے ارجمند بانو اور خان بہادر صاحب کے درمیان کچھ اسی مسئلے پر کھسر پھسر ہو رہی تھی۔ اُن کی نظر بھی بار بار شا کی جانب اٹھ رہی تھیں۔“

”یہ تو لڑکے والوں کا حق ہوتا ہے شانہ!“ شانہ بیگم بولیں۔ ”جہاں کوئی اچھی لڑکی نظر آجائے اُس کے بارے میں کرید اور چھان بین شروع کر دیتے ہیں۔“

”یہ تو خیر ہوتا ہے۔ لیکن سمیرا خاتون میری سمجھ میں نہیں آسکتیں۔۔۔۔۔ پہلے وہ شا میں اپنی دلچسپی اظہار کر رہی تھیں، پھر ایک دم لوٹن کبوتر کی طرح قلابازی کھا کر نادیا کو سینے سے لگا کر پیار کر گئیں۔“
 ”تم ابھی سے کیوں کھلی چار رہی ہو۔۔۔۔۔ جب اُن کی طرف سے کوئی بات شروع ہوگی تب درجائے گا۔“

”میں کچھ آپ کی وجہ سے خاموش رہی، اور کچھ اس بات کا لحاظ بھی تھا کہ سمیرا خاتون اور ارجمند بانو پہلی بار ہمارے گھر آئی ہیں۔۔۔۔۔ ورنہ کھل کر کہہ دیتی کہ شا اور نادیا کا خیال دل سے نکال دیں۔“
 ”تم نے اچھا کیا جو ابھی الحال خاموشی سے کام لیا۔“ شانہ بیگم نے خلا میں گھورتے ہوئے ہمارے کچھ کہنے نہ کہنے سے کیا فرق پڑے گا؟ ہوتا وہی ہے جو لڑکیوں کے مقدر میں کاتب تقدیر جانب سے رقم ہوتا ہے۔“

”یہ تو درست ہے کہ خدا کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا لیکن بندے کو تو بہر حال سوجھ بوجھ کام لینا چاہئے۔“

”جوڑے زمین پر نہیں، بہت پہلے سے آسمان پر طے ہو جاتے ہیں۔ ہمیں تو صرف قسمت لکھے کو بھگتنا پڑتا ہے۔“ شانہ بیگم نے ایک سرد آہ بھر کر جواب دیا۔ پھر بہن کو پیار سے دیکھتے بولیں۔ ”ایک بات کہوں؟“

”آپ حکم دیجئے آپا۔۔۔۔۔“ شانہ بیگم نے بہن کے جذبات کو محسوس کرتے ہوئے جلدی سے بھلا ایسی کون سی بات ہے جسے کہنے کے لئے آپ کو اجازت کی ضرورت پیش آگئی؟“

”اگر تم پرانہ مانو تو شا اور نادیا کو دو چار روز کے لئے میرے پاس چھوڑ دو۔۔۔۔۔“ شانہ بیگم حسرت بھری آواز میں اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ ”بچیوں کی وجہ سے ہمارا دل بھی بھل جائے گا۔“
 ”اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے۔۔۔۔۔ آپ تو شرمندہ کرتی ہیں۔“ شانہ بیگم جلدی سے بولیں۔
 ”آپ جب تک چاہیں بڑے شوق سے شا اور نادیا کو اپنے پاس رکھیں۔“

”دقار بھائی خیال تو نہیں کریں گے؟“
 ”دقار اور آپ کی بات کا خیال کریں گے؟ ناممکن۔۔۔۔۔“ شانہ بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔
 بس اس انتظار میں رہتے ہیں کہ آپ کوئی بات کہیں اور وہ اسے پہلی فرصت میں پورا کریں۔“
 ”پھر تو ہمیں نادیا کے سلسلے میں پوری پوری امید رکھنی چاہئے۔“

”میں نے کب انکار کیا ہے؟“

ابھی دونوں بہنوں میں کھل کھل کر باتیں ہو رہی تھیں کہ جمال احمد اور وقار احمد آگئے۔
 ”بہت خوب۔۔۔۔۔“ جمال احمد نے کہا۔ ”ہم وہاں کافی پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں اور آپ دونوں اس گفت و شنید میں مصروف ہیں۔“

”ایسی کون سی بات ہے جو ہم سے چھپ کر کی جا رہی ہے؟“ وقار احمد نے بیوی سے پوچھا۔
 ”ہزاروں باتیں ایسی ہوتی ہیں جو مردوں کے سامنے نہیں کی جاسکتیں۔“ شانہ بیگم بولیں۔ ”آپ لوں کو اس قدر تشویش کیوں ہے۔۔۔۔۔ ہم تو ابھی نہیں پوچھتے کہ مردوں کے درمیان کیا چھڑی پٹی رہتی ہے۔“

”بات تشویش کی نہیں البتہ شیعہ کی ضرور ہے۔“ وقار احمد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”شیعہ کس بات کا؟“

”اس بات کا کہ کہیں آپ میرے خلاف شانہ بہن کے کان تو نہیں بھر رہی ہیں۔۔۔۔۔؟“
 ”اول تو ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ شانہ بیگم نے وقار احمد نے سے تکلفی سے کہا۔ ”اور اگر شانہ نے شکایت کرنے کی کوشش کی بھی تو سننے کا کون۔۔۔۔۔!“

”یہ ہوئی نالا لکھ روپے کی بات۔“ وقار احمد نے بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے نہایت خوشگوار انداز میں کہا۔ ”اب مجھے کوئی فکر نہیں۔“

”البتہ اس بات کی فکر ضرور ہے کہ اگر آپ دونوں نے چلنے میں دیر کی تو کافی ٹھنڈی ہو جائے گی۔“ جمال احمد بولے۔

”کیا آپ کو بھی کافی کی لت پڑ گئی ہے؟“ شانہ بیگم نے پوچھا۔
 ”ابھی تک تو اس بری عادت سے بچا ہوا ہوں۔۔۔۔۔ لیکن اگر وقار بھائی کا ساتھ رہا تو۔۔۔۔۔“

”تم ان کی باتوں میں نہ آنا۔۔۔۔۔“ شانہ بیگم نے شوہر کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے بہن سے کہا۔ ”ان کا کافی پینے کی عادت تو پورے لندن میں مشہور تھی۔۔۔۔۔ دن بھر میں جب تک دس بارہ کپ حلق سے پینے آتیں، چین ہی نہیں آتا۔“

”کیوں جمال بھائی؟“

”اب آپ کی ہمشیرہ کا بیان ہے تو ماننا ہی پڑے گا۔“ جمال احمد نے بڑی مصومیت سے اعتراف دیا۔

کافی کے دوران بھی اسی قسم کی گفتگو ہوتی رہی، پھر وقار احمد خاصی رات گئے شانہ بیگم، فرحان اور ان کے ساتھ رخصت ہو گئے۔ شا اور نادیا کو شانہ بیگم کے گھر چھوڑ دیا گیا۔

○○○

سمیرا خاتون، پروفیسر جمال احمد کے گھر سے واپس ہوئیں تو راستے بھر راہیل کے بارے میں سوچتی رہیں۔ شوہر کی موت کے بعد سے انہوں نے خود کو دنیا کے ہنگاموں سے بڑا الگ تھلگ کر لیا تھا۔
 ان کے درمیان ناقابل عبور خلیج بن کر حائل ہو گئے تھے۔ لیکن اولاد کی محبت نے ماں کی ممتا کو کراچی سے پر مجبور کر دیا۔۔۔۔۔
 اولاد کے درخشاں مستقبل کا خیال نہ ہوتا تو شاید سمیرا خاتون اس دعوت میں کبھی شریک نہ ہوتیں جو

ن کی بند کے بارے میں پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔ لیکن رات کو سونے سے قبل انہوں نے راحیل کو بے کمرے میں بلا لیا۔ کچھ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں، اُس کی پڑھائی کے بارے میں سوال کرتی رہیں، پھر بیٹھی رائے جاننے کی خاطر بولیں۔ ”ٹاکے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“

”بٹی اذکر بیٹ.....“ راحیل نے کہا۔ ”خاص طور پر اُس کے پڑھانے کا انداز اتنا اچھا ہے کہ ماں ایک بار جو کچھ پڑھ لے، اُسے زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔“

”گو یا اس بار تمہاری کامیابی یقینی ہے۔“

”صرف کامیابی نہیں مئی.....“ راحیل پُر جوش لہجے میں بولا۔ ”اگر آپ کی دعائیں شامل حال رہیں میں فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوں گا۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو.....“ سمیرا خاتون نے بیٹے کو محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے دعا دی، رولیں۔ ”نادیہ تمہیں کیسی لگتی ہے؟“

”وہ بھی شائے کچھ کم قابل نہیں ہے۔“ راحیل نے ماں کا عندیہ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔ ”فرحان اور اند بھی پڑھائی کے معاملے میں بہت تیز ہیں۔ یوں سمجھ لیجئے مئی! کہ پڑھائی کے معاملے میں سب درمیان باقاعدہ مقابلہ ہوتا ہے کہ کون زیادہ اچھے اور شاندار نمبروں سے کامیاب ہو گا۔“

”مالک کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تمہیں یہ ماحول رسا آ گیا۔“

”غلطیاں انسان ہی سے ہوتی ہیں مئی.....“ راحیل نے سنجیدگی سے بھرپور انداز میں کہا۔ ”میں بندہ ہوں کہ زندگی کے تین قیمتی سال ضائع ہو گئے مگر اب ایسا نہیں ہو گا۔ مجھے قوی اُمید ہے کہ اب پ کچھ سے پڑھائی کے سلسلے میں کوئی شکایت نہیں ہوگی۔“

”مجھے بھی یقین ہے کہ تم اپنے خاندان کا نام ضرور روشن کرو گے۔“ سمیرا خاتون بڑے فخر سے بولیں، پھر دبی زبان میں کہا۔ ”تم نے اپنی زندگی کے بارے میں کیا سوچا ہے؟“

”سوچنا کیا ہے مئی! میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد کاروبار میں آپ کا ہاتھ بٹاؤں گا اور آپ کو زیادہ تن نہیں کرنے دوں گا۔“

”تم شاید میری بات کا مفہوم نہیں سمجھے۔“ سمیرا خاتون بیٹے کی سادگی پر مسکرا دیں۔

”آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟“

”میں تمہاری ماں ہوں راحیل!“ سمیرا خاتون نے سنجیدگی سے کہا۔ ”زندگی کی دوڑ میں، میں نے اکھڑا کیا پایا، تمہیں ان باتوں کا اندازہ نہیں۔ لیکن میں جانتی ہوں کہ اولاد کی خوشیاں کیا ہوتی ہیں، بچی بڑی سے بڑی آرزو پوری نہ ہو تو انسان کو کوئی ملال، کوئی رنج نہیں ہوتا۔ مگر کبھی یوں بھی ہے کہ ایک چھوٹی سی خواہش کی تکمیل نہ ہو تو ناکامی کا احساس پچاس کی طرح تمام زندگی ذہن کی ٹانگوں میں جھپٹتا رہتا ہے۔ میں..... میں اس لئے تم سے کھل کر بات کر رہی ہوں کہ تمہیں آئندہ دلی میں بھی اپنی محرومیوں کا کوئی گلہ، کوئی شکوہ نہ رہے۔“

”میں سمجھا نہیں مئی!“ راحیل نے حیرت سے ماں کے چہرے کے بدلتے تاثرات کو دیکھا۔

سمیرا خاتون کے چہرے پر ماضی کی تلخیاں کھپکھپا رہی تھیں..... اُن بیٹھے ہوئے چراغوں کا ڈھواں اُڑا رہا تھا جو روشن ہونے سے چپتر ہی بجھ گئے تھے..... روندی ہوئی ناکام حسرتوں کے ڈھندلے منہ سامنے لہرا رہے تھے..... وقت نے ڈھول بن کر ماضی کے نقوش مٹا دیئے تھے..... سمیرا خاتون وقت کے ہاتھوں مجبور ہو کر ماضی کو فراموش کر دیا تھا..... لیکن.....

پروفیسر جمال احمد اور وقار احمد کی جانب سے فیکٹری حاصل کرنے کی خوشی میں دی گئی تھی۔ وہ تو سر یہ سوچ کر آئی تھیں کہ اسی بہانے اُن لوگوں کو بھی قریب سے دیکھ لیا جائے گا جہاں راحیل کو پڑھنے لے بھیجا گیا تھا۔

دعوت میں شرکت کے دوران بھی وہ کچھ دیر تک خود کو لئے دیئے رہیں۔ لیکن ٹاکو دیکھ کر اُن کی کونال آ گیا۔ راحیل کے خطوط کے ذریعے انہیں اس بات کا علم ہو چکا تھا کہ وہ ٹاک سے پڑھ رہا تھا۔ کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی جس پر سنجیدگی سے غور کیا جاتا۔ راحیل کی کامیابی کے بعد ٹاکو کی بہا اُس کی محنت کا صلہ دیا جاسکتا تھا لیکن ٹاکو دیکھ لینے کے بعد سمیرا خاتون کے دل میں ایک خواہش بڑی شدت سے سر اُبھارا۔

”اگر راحیل اور ٹاکو ایک دوسرے سے منسوب کر دیا جائے تو کیا رہے گا؟“..... اسی خواہش پیش نظر سمیرا خاتون نے ٹاکو ہر زاویے اور انداز سے پرکھنا شروع کر دیا۔

ٹاک خوبصورت بھی تھی اور سلیقہ مند بھی..... اُس کی سادگی میں حسن کا ایک انوکھا اور معصوم اند موجود تھا..... اُس کی گفتگو..... اُس کے اُٹھنے بیٹھنے کا سلیقہ اور رکھ رکھاؤ..... سب کچھ بہت ہی پُر وقار قابل تعریف تھا..... رنگ و روپ بھی غضب کا تھا اور تعلیمی اعتبار سے اُس کا مستقبل بھی شاندار سمجھا سکتا تھا..... راحیل نے اپنے خطوط میں ٹاک کے مہذب برتاؤ کی بہت تعریفیں لکھی تھیں.....

اور..... ان ہی باتوں نے سمیرا خاتون کو راحیل اور ٹاک کے متعلق سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اُن کا خیال تھا کہ اگر یہ رشتہ طے ہو جائے تو راحیل کا مستقبل سنور سکتا ہے۔ اُس کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہ سکتا۔ اور اولاد کے بارے میں انہوں نے جو حسین خواب دیکھے تھے وہ بھی شرمندہ تعبیر ہو سکتے تھے۔

ہر ماں کی طرح سمیرا خاتون بھی اولاد کے سر پر ہمکتا ہوا سہرا دیکھنے کی آرزو مند تھیں..... ٹاکو کی اُن کی یہی تمنا دل کے نہاں خانوں میں تڑپ کر بیدار ہو گئی..... ہر چند کہ انہیں راحیل کے لئے بڑ سے بڑے گھرانے کا رشتہ مل سکتا تھا لیکن ماضی کی تلخ یادوں نے سمیرا خاتون کو بہت محتاط اور میا نہ رد انداز اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا..... وہ خود جن حالات کا شکار ہو چکی تھیں، اُن کی پرچھائیں سے راحیل کو دور رکھنا چاہتی تھیں۔ جھوٹی خوشیوں، خاندانی روایات اور امارت کے جس جال میں اُن زندگی کی حسین شاہراہوں پر اُن کی سر تیں پامال ہوئی تھیں..... روندی اور چلی گئی تھیں، وہ راحیل کو دلدل سے بچانا چاہتی تھیں.....

وقت نے جس انداز میں اُن کی جوانی کو اور جوانی کی اُمنگوں کو زہریلا ناگ بن کر ڈس لیا وہ اولاد کو اس زہر آلود فضا اور ماحول سے بہت دور رکھنے کا تہیہ کر چکی تھیں اور اسی لئے سمیرا خاتون اتنی جلدی سے یہ طے کر لیا کہ اگر ٹاک راحیل کی پسند ہے تو وہ اُسے ہر قیمت پر ملنی چاہئے۔ وہ اولاد خوشیوں کی خاطر اپنی زندگی بھی قربان کر سکتی تھیں۔

لیکن..... جب سمیرا خاتون نے راحیل کو نادیہ کے ساتھ بے تکلفی سے بیٹے بولتے دیکھا تو اُلجھ گھٹنیں۔ اس لئے نہیں کہ نادیہ انہیں پسند نہیں تھی۔ بلکہ اس لئے کہ وہ یہ اندازہ نہیں لگا سکیں کہ راجا اور نادیہ میں سے کس کو اپنی زندگی کا شریک سفر بنانا چاہتا ہے؟ اچھا ہی ہوا جو انہوں نے جلد بازی شامکے ٹیکم کے سامنے کھل کر اپنی پسند کا اظہار نہیں کیا ورنہ بات بنتے بنتے بگڑ جاتی.....

کچھ سوچ کر سمیرا خاتون نے راحیل کی جانب دیکھا جو پچھلی سیٹ پر ماں کے برابر بیٹھا خیلوں میں غرق تھا۔ نوشاہہ اگلی سیٹ پر موجود تھی۔ سمیرا خاتون نے سیکرٹری کی موجودگی میں بیٹے

آج جب اولاد کی خوشیوں کا وقت آیا تو زخم پھر سے ہرے ہونے لگے۔ آنسو..... جو نہاں خانوں میں چھپے ہوئے تھے بندشوں کو توڑ کر یہ نکلنے کی خاطر پلکوں پر نکلنے لگے۔
 ”ممی! آپ کو میری قسم.....“ راحیل نے ماں کی آنکھوں کے گوشوں کو بھیکتے دیکھا تو پوچھا۔ ”کیا آپ کو میری کسی بات سے صدمہ پہنچا ہے؟“
 ”یہ..... یہ تو خوشی کے آنسو ہیں میری جان!“ سمیرا خاتون نے اپنے ہونٹوں پر تبسم سجائے۔
 راحیل کو بھلانے کی کوشش کی۔ ”تم ان آنسوؤں کی گہرائی نہیں پاسکو گے۔“
 ”مجھے بتائیے نامی..... پلیز!“ راحیل نے بچوں کی طرح ضد کی۔ آپ کو کس بات کا ڈھک۔
 ”تیری جدائی کا۔“ سمیرا خاتون نے پلکوں پر لرزتے آنسوؤں کو اپنے دامن کی بے پناہ میں جذب کرتے ہوئے کہا۔ ”اب تم جوان ہو رہے ہو..... بڑھ لکھ کر اپنے قدموں پر کھڑے زندگی کے لئے ایک سا مٹی..... ایک ہم سفر کی تلاش ہوگی۔ پھر تمہارا ایک گھر ہوگا جہاں تمہاری ہوں گی..... تمہارے پیارے پیارے بچے ہوں گے اور ایک جاندی ڈہن بھی ہوگی۔“
 ”اور آپ بھی تو میرے ساتھ ہوں گی۔“ راحیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے؟“
 ”تھامی! میں سمجھانہ جانے کیا بات ہوگی۔“
 ”اب تو سمجھ گیا نا کہ کیا بات ہے۔“
 راحیل نے کوئی جواب نہیں دیا، ماں کو پیار بھری نگاہوں سے دیکھ کر ہولے ہولے مسکراتا رہا۔
 ”تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔؟“
 ”کس بات کا.....؟“
 ”یہی کہ تمہیں شاد اور نادیہ میں کون زیادہ پسند ہے؟“
 ”آئی سی.....“ راحیل نے چونکتے ہوئے کہا، پھر خوشی سے بولا۔ ”ابھی تو میں نے اس میں ہی نہیں کیا۔“
 ”ماں سے چھپانے کی کوشش کر رہا ہے؟“
 ”یہ بات نہیں ہے ممی!“
 ”پھر کیا بات ہے؟“
 ”جہاں مقابلہ اتنا سخت ہو وہاں اتنی جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔“
 ”کیا مطلب.....؟“ سمیرا خاتون نے سنجیدگی سے پوچھا۔
 ”مجھے تو شاد اور نادیہ دونوں اچھی لگتی ہیں..... کیا آپ دونوں کو.....“
 ”دماغ تو نہیں چل گیا تمہارا؟“ سمیرا خاتون نے پیار سے چپے کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ”بھلا بھی ہوا ہے؟“
 ”پھر اتنی جلدی کیا ہے؟ مجھے سوچنے کا کچھ موقع تو دیجئے.....“ راحیل نے بے تکلفی سے جواب دیا۔
 ”نہیجہ..... تم مجھے اچھی طرح سوچ سمجھ کر اپنی مرضی سے آگاہ کرنا۔“
 ”اور اگر آپ کو میری مرضی پسند نہ آئی تو؟“
 ”ایسا نہیں ہوگا راحیل..... ایسا بھی نہیں ہوگا۔“ سمیرا خاتون نے جذباتی لہجے میں کہا۔
 اختیار ہاتھ بڑھا کر اسے متا کی کشادہ آنکھوں میں سمیٹ لیا۔

رات وہ دیر سے سوئی تھی لیکن اس کے باوجود صبح اُس کی آنکھ جلد کھل گئی..... نظر گھا کے گھڑی کی جانب دیکھا، ابھی صرف سات بجے تھے۔ پائیں باغ کی سمت کھٹنے والی کھڑکی سے صبح کا اُجالا اندر چھا جاک رہا تھا۔ باہر درختوں پر چڑیوں کی چہچہاہٹ خدا کی حمد و ثناء میں مشغول تھی۔ نادیہ نے کمرٹ بدل کر سونے کی کوشش کی لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ بستر پر یوں ہی کرویٹیں بدلتی رہی۔ پھر اچانک خیال آیا کہ وہ اپنے گھر میں نہیں، شہانہ بیگم کے گھر میں ہے۔
 شاید یہی جگہ اور نئے ماحول کے نفسیاتی اثر نے بے چین کر رکھا تھا..... کچھ سوچ کر وہ بستر سے اٹھ گئی..... ٹاکو دیکھا، جو دوسرے بستر پر ابھی تک محو خواب تھی۔ حالانکہ وہ دونوں رات بہت دیر تک شہانہ بیگم کے ساتھ بیٹھی دنیا جہان کی باتیں کرتی رہی تھیں۔ نادیہ نے اس بات کو خاص طور پر محسوس کیا تھا کہ شہانہ بیگم اُس کے مقابلے میں شاد سے زیادہ محبت اور پیار سے پیش آ رہی تھیں۔
 وہ غسل خانے میں ہاتھ منہ دھونے کی خاطر گئی تو خالہ کی باتیں اُس کے کانوں میں گونجنے لگیں..... ایک موقع پر انہوں نے شاد کے بالوں کو بڑے پیار سے سنوارتے ہوئے کہا تھا۔
 ”تمہارے ہونے سے آج مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے مدتوں کی تنہائی دور ہو گئی..... جیسے ایک طویل عرصے سے مجھے تمہاری تلاش رہی ہو۔“
 ”خالہ جان! میں بھی یہاں موجود ہوں۔“ اُس نے شہانہ بیگم کو اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔
 ”تمہیں یہ کیسے خیال آیا کہ مجھے تمہاری موجودگی کا احساس نہیں.....“ شہانہ بیگم نے نادیہ کی طرف بڑی اپنائیت سے دیکھا۔ ”تم بھی مجھے شاد سے کم عزیز نہیں ہو۔“
 اور نادیہ نے شہانہ بیگم کی خوشی کی خاطر آگے کھسک کر اُن کا دوسرا ہاتھ تھام کر اپنے سر پر رکھ لیا۔ نہ جانے کیوں اُسے ایسا لگا جیسے شہانہ بیگم کے پیار میں اُس کے لئے وہ گرمی اور شدت نہیں جو شاد کے لئے اُس نے محسوس کی تھی۔
 کتنی محبت سے انہوں نے شاد کو اپنے قریب بالکل سینے سے لگا کر بٹھا رکھا تھا..... کیسی محبت سے اُس کے ساتھ پیار بھری میٹھی میٹھی باتیں کرتی رہیں..... رہ رہ کر اُس کے بالوں پر نہایت شفقت سے ہاتھ پھیرنے لگتیں..... کبھی ہاتھ تھام کر چوڑیوں کی تعریفیں شروع کر دیتیں..... کبھی کان میں پڑے آؤڑوں کی خوبصورتی اور بناوٹ کے سلسلے میں گفتگو کرنے لگتیں.....
 ”کیسا والہانہ انداز تھا..... کس قدر مٹھاس بھی اُن کی باتوں میں..... یوں لگتا تھا جیسے وہ شاد کو برسوں سے جانتی ہوں..... ایک بار تو اُس نے بڑی معصومیت سے شکوہ بھی کیا۔“
 ”خالہ جان! اگر ڈرائیور جاگ رہا ہو تو مجھے گھر بھیجا دیں۔“
 ”کیوں..... کیا ماں کی یاد ستا رہی ہے؟“
 ”جی نہیں.....“ اُس نے جان بوجھ کر بڑی معصومیت سے منہ بسورتے ہوئے کہا۔
 ”پھر کیا بات ہے؟“
 ”اس بات سے غلن ہو رہی ہے کہ آپ میرے ہوتے ہوئے آپی سے زیادہ پیار کر رہی ہیں۔“ وہ ٹھنک کر بولی۔ ”میں جھوٹی ہوں اس لئے آپی کے مقابلے میں زیادہ پیار کی مستحق ہوں۔“
 اور اُس کی شکایت کے جواب میں شہانہ بیگم نے بڑے پیار سے لپٹا کر اُس کی پیشانی چوم لی، پیٹنے چبھاتے ہوئے بولیں۔ ”میرے لئے تم دونوں برابر ہو..... جیسے شاد، ویسے تم.....“
 ”اگر یہ بات ہے تو پھر آپ نے میری چوڑیوں کی تعریف کیوں نہیں کی؟“ اُس نے بچوں جیسے

”میں کیوں بتاؤں؟“ شامسکر کر بولی۔ ”خالہ جان نے تم سے سوال کیا ہے، اس لئے تم ہی جواب دینا۔“

نادیہ سر کھانے لگی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ خود ہی اپنے سوال میں الجھ کر رہ گئی ہو۔ شاد اور شبنم بیگم دونوں نادیہ کی معصوم حرکتوں کا جائزہ لیتی رہیں، کچھ دیر تک نادیہ سر کھاتی رہی پھر شبنم بیگم کی طرف کچھ کر بولی۔ ”خالہ جان! پلیز..... آپ خود ہی بتا دیں نا.....“

”ٹھیک ہے.....“ شبنم بیگم نے پیار سے کہا۔ ”لیکن میری بھی ایک شرط ہے۔“

”وہ کیا؟“

”تم دونوں کو یہاں ایک ہفتہ اور رہنا ہوگا..... منظور ہے؟“

”منظور ہے۔ لیکن آپ کو اپنا فیصلہ آج اور ابھی کرنا ہوگا۔“ نادیہ نے شبنم بیگم کا ہاتھ تھام کر ضد کی۔

”یوں سمجھ لو کہ تم دونوں میری دو آنکھیں ہوں۔“ شبنم بیگم نے ہنس کر بات ٹالنے کی کوشش کی۔

”اچھا.....“ نادیہ نے بھولپن سے ایک نئی جگہ لگا دی۔ ”یہ بتائیے کہ سیدھی آنکھ کون ہے؟“

”میں تو تعلیم مکمل کرنے کے بعد وکیل بننا چاہتی ہوں۔ بے حد کامیاب رہو گی۔“

”مال مثول سے کام نہیں چلے گا..... آپ کو یہ فیصلہ تو بہر حال کرنا ہوگا کہ آپ اپنی اور مجھ میں آپ کو کون زیادہ پسند ہے؟“

”جی جی بتاؤں.....؟“ شبنم بیگم کی آنکھوں میں متا کی جھلک ابھر آئی۔

”بالکل جی جی۔“

”شبنم بیگم نے ایک بار پھر شا کی طرف دیکھا جو نہایت اطمینان سے بیٹھی نادیہ کی پیار بھری باتوں سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ سادے لباس میں وہ بھی بہت معصوم اور بہت ہی پُر وقار نظر آ رہی تھی۔

”بتائیے خالہ جان! آپ تو دیر لگا رہی ہیں۔“

”مجھے..... مجھے اپنی بیٹی زیادہ پسند ہے۔“ شبنم بیگم نے نادیہ کو بے اختیار اپنی ہانہوں میں سمیٹ کر دے ہوئے پیچھے ہوئے کہا اور شا کی جانب متا بھری نگاہوں سے دیکھتی رہیں۔

اور یہ فیصلہ سناتے وقت شبنم بیگم کی نگاہوں کے گوشے جھپکنے لگے..... دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں..... اُن کے ہاتھوں کی گرفت نادیہ کو سینے کی گہرائیوں میں سمیٹے ہوئے تھی..... ڈبڈبائی ہوئی طرکیں ٹاکے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

اور..... وقت اُن کی کیفیت پر مسکرا رہا تھا..... کتنے خوبصورت تھے یہ لمحات.....! کس قدر حسین تھا انداز.....! نادیہ ایک ماں کے دل کی دھڑکنوں میں گئی جا رہی تھی.....!! اور پلکوں پر پکپکاتے آنسو شا کی خاطر دل کی گہرائیوں سے اُبل رہے تھے.....!!

نادیہ کچھ دیر تک شبنم بیگم کے دل کی بے چین و بے قرار دھڑکنیں اپنے سینے پر محسوس کرتی رہی، پھر اُس نے پلٹ کر شا کی طرف دیکھا اور فخر سے بولی.....

”سن لیا آنی! آپ نے خالہ جان کا فیصلہ..... میں خالہ جان کو زیادہ عزیز ہوں۔“

”ابھی فیصلہ کہاں ہوا؟“ شبنم نے اپنے گداز ہونٹوں پر ایک شوخ نیم بکھیرتے ہوئے بہن کو جھپڑا۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ خالہ جان نے نام تو کسی کا لیا نہیں پھر تم نے ہرجیت کا اندازہ کیسے لگا لیا؟“

”واہ.....“ نادیہ بولی۔ ”خالہ جان نے مجھے یہی کہہ کر اپنی آغوش میں سمیٹا تھا.....“

انداز میں پوچھا۔

”تمہاری چوڑیوں کا تو کوئی جواب نہیں.....“ شبنم بیگم نے مسکرا کر کہا۔ ”تمہاری نازک کا بہت ہی حسین لگ رہی ہیں۔“

”اور کانوں کے بندے.....؟“

”وہ بھی ماشاء اللہ بہت خوبصورت ہیں۔“

”آپ سے کم یا زیادہ؟“ اُس نے خالہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

”اپنی اپنی جگہ دونوں ہی حسین ہیں۔“

”آپ ٹالنے کی کوشش کر رہی ہیں۔“ نادیہ نے ضد کا انداز اختیار کیا۔ ”یہ بتائیے کہ زیادہ کون سے ہیں؟“

”جو ہماری بیٹی کے کانوں میں موجود ہیں۔“ شبنم بیگم نے نادیہ کو پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”اور لباس کس کا زیادہ خوبصورت اور قیمتی ہے؟“

”تمہارا.....“

”ایک آخری سوال اور.....“ نادیہ نے خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔ ”مگر پہلے وعدہ کیجئے کہ بالکل سچ جواب دیں گی۔“

”وعدہ.....“ شبنم بیگم نے نادیہ کے معصوم چہرے پر زندگی سے بھرپور مسکراہٹوں کو محسوس کر کے وعدہ کر لیا۔

”مجھ میں اور آپ میں..... آپ کو کون زیادہ عزیز ہے؟“

شبنم بیگم نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا، نظریں گھما کر شا کو دیکھا جو چھوٹی بہن کی معصوم سن کر مسکرا رہی تھی۔

”آپ کی طرف نہیں..... میری جانب دیکھ کر فیصلہ کریں۔“ نادیہ نے شوخی سے کہا۔

”یہی سوچ رہی ہوں کہ کیا فیصلہ کروں.....“ شبنم بیگم بولیں۔ ”میرے نزدیک تو تم دونوں برابر ہو۔“

”غلط.....“ نادیہ نے تیزی سے کہا۔ ”عم میں آپ ایک سال بڑی ہیں اور قد کے اعتبار سے آدھا انچ لمبی ہوں..... پھر دونوں برابر کہے ہو سکتی ہیں؟“

”میں عمر اور قد کے اعتبار سے نہیں، بلکہ محبت کے پیمانے سے.....“

”نہیں خالہ جان! ایسے کام نہیں چلے گا۔“ نادیہ نے بچیوں کی طرح چل کر کہا۔ ”آپ کو اُس سے کسی ایک کے حق میں فیصلہ دینا ہوگا۔“

”اچھا..... پہلے میرے ایک سوال کا جواب دو!“

”پوچھیے.....؟“

”شبنم بیگم تم دونوں میں سے کسے زیادہ پیار کرتی ہے؟“

”ہم دونوں کا نمبر بعد میں آتا ہے.....“ نادیہ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”امی جان سب سے زیادہ فرحان کا لاڈ کرتی ہیں۔“

”وہ تو اس لئے کہ فرحان سب سے چھوٹا ہے..... لیکن تم دونوں میں شبنم کو کون زیادہ عزیز۔“

”کیوں آپ.....“ نادیہ نے بہن کی طرف دیکھا۔ ”آپ کو کچھ اندازہ ہے؟“

”اور متا بھری نظریں میرے چہرے پر مرکوز تھیں.....“ ثنائے مسکراتے ہوئے کہا۔
غرضیکہ خاصی رات گئے تک دونوں بیٹھیں شانہ بیکم کے پاس بیٹھی اسی قسم کی دلچسپ باتیں کر رہیں۔ پھر جب نیند کے خمار سے پوٹے بوجھل ہونے لگے تو اُنھ کر دوسرے کمرے میں آئیں جوشاز بیکم کے کمرے سے ملحق تھا۔ سونے سے پہلے ٹا اور نادیہ کے درمیان بھی شانہ بیکم کی پُر خلوص اور ہر وقت خاصیت کے بارے میں کچھ دیر تک باتیں ہوتی رہیں، پھر کون کب نیند کی آغوش میں پہنچ کر ڈوبا مافیا سے بے خبر ہوا یہ کسی کو یاد نہ رہا۔

نادیہ غسل خانے سے باہر نکلی تو شاید ستور خواب خرگوش میں مبتلا تھی۔ صبح کا حسین اور پُر نور اجالا باہر سبزے پر پھیلا نظر آ رہا تھا۔ نادیہ ایک ہلکی سی شال شانوں پر ڈال کر باہر آ گئی۔ شانوں پر شبنم کے قطرے انمول موتی کی طرح ابھی تک پوری آب و تاب سے جھللا رہے تھے۔ وہ موسم کے کھمبے ہوئے حسن سے لطف اندوز ہوتی رہی۔ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی پھانگ والے حصے کی طرف آئی تھٹھک کر رُک گئی۔

منصور سامنے والے لان کے ایک گوشے میں مولسری کے درخت کے نیچے عنابی رنگ کا ٹریک سوٹ پہنے ورزش کرنے میں مصروف تھے..... نادیہ نے ایک قدم آگے بڑھا کر دیکھا، وہاں منصور سوا ڈور ڈور تک کوئی نہ تھا۔ وہ خاموش کھڑی منصور کو دیکھتی رہی۔ منصور ورزش کرنے میں اتنے مگن تھے کہ اپنے سوا کسی اور کی موجودگی کا مطلق احساس ہی نہیں تھا۔ یہ بھی گمان نہیں تھا کہ گلاب کے کجے قریب گوئی پر ستار چپ چاپ کھڑا اُن کی ایک ایک حرکت کو بڑی پیار بھری نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ بڑی دیر تک وہ کسی بت کی طرح ایسا وہ منصور کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی، اُسے خود اپنا بھی ہوش رہا۔ پھر جب منصور ورزش کر کے جانے کے لئے پلٹے اور دونوں کی نگاہوں کا تصادم ہوا تو وہ چونک اُٹھی۔ منصور اُسے ایسی نظروں سے دیکھ رہے تھے، جیسے وہ کوئی گناہ، کوئی جرم کرتے ہوئے رہا ہاتھوں پکڑ لی گئی ہو۔

اُس نے سوچا تیزی سے پلٹے، لمبے لمبے قدم اٹھاتی اپنے کمرے میں لوٹ جائے۔ لیکن نہ جا۔ منصور کی نگاہوں میں کیا سحر تھا کہ وہ اپنی جگہ سے ذرا جنبش بھی نہ کر سکی۔ پھر کے کسی بے جان جسمے طرح دم بخود کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ پھر دوبارہ اُس وقت چونکی جب خود منصور نظریں پچی کر کے جا کے لئے آگے بڑھے..... شاید وہ ابھی تک خفا تھے۔

لیکن ایسی بھی کیا بے رخی کہ بات کرنا بھی گوارا نہ کیا..... کسی بے نیازی سے نظریں جھکائے جا۔ لگے..... یہ بھی نہ سوچا کہ وہ اُن کے گھر کی مہمان تھی..... اور کچھ نہ سہی تو خیریت ہی دریافت لیتے..... دو بول محبت سے بول لیتے تو اُن کی شان کون سی گھٹ جاتی..... ایسی بھی کیا بے مروتی..... ایک بے بنیاد تنگ کو دل میں جگہ دے کر کیسے اجنبی بن گئے تھے، جیسے پہلے بھی دیکھا ہی نہ ہو۔

وہ اپنی جگہ کھڑی بیچ و تاب کھاتی رہی، منصور کے رویے سے اُسے ڈکھ پہنچا تھا۔ اُس کا دل جاہا بھی نگاہیں پھیر کر واپس چلی جائے..... منصور خفا ہیں تو ہوا کریں..... اُسے کیا ضرورت تھی اُنہی منانے کی۔ اور بھلا کوئی بات بھی ہو..... ایک ذرا سے مذاق کو کتنی سنجیدگی سے محسوس کر بیٹھے اور جب منصور مہندی کی باڑھ کے قریب پہنچے تو وہ انہیں بے اختیار آواز دے بیٹھی۔ منصور کے بڑے ہوئے قدم اُس کی آواز سن کر ٹھم گئے۔ انہوں نے آہستہ سے رُک کر کچھ سوچا پھر پلٹ کر اُس کی طرف آنے لگے۔

نادیہ کے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔ منصور کو آواز دینے میں اُس کے ارادے کو کوئی دخل نہیں جائے کون سا جذبہ تھا جس نے اُسے منصور کو مخاطب کرنے پر مجبور کر دیا تھا..... جانے منصور اُس بارے میں کیا خیال کر س..... کیا سوچیں..... وہ ابھی اپنے دل کی دھڑکنوں کو سینٹنے بھی نہ پائی تھی منصور اُس کے قریب پہنچ گئے، نظریں جھکا کر آہستہ سے بولے۔

”آپ نے غالباً مجھے آواز دی تھی.....؟“

”حادثہ کر بیٹھی تھی.....“ وہ منصور کے لہجے پر تمللا اُٹھی۔

”آپ.....“ منصور نے نظریں اٹھا کر نادیہ کو غور سے دیکھا۔ کچھ گھبرائے سے دکھائی دے رہے اس لئے ”آپ“ سے آگے کچھ نہ کہہ سکے۔

”جی میں.....“ وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ ”میرا نام نادیہ وقار احمد ہے۔ خالہ جان کی خواہش آپ کے دولت خانے پر مقیم ہوں۔“

”آپ شاید مجھ سے کسی بات پر ناراض ہیں۔“ منصور نے مدہم آواز میں کہا۔ ”اگر مجھ سے کوئی ناانادہ نگہی میں سرزد ہو گئی ہو تو.....“

”جی نہیں.....“ وہ جلدی سے بولی۔ ”غلطی میری تھی جو میں آپ کو اپنا سمجھ کر ایک مذاق کر بیٹھی اور ایک اُس کی سزا بھگت رہی ہوں۔“

”میں سمجھا نہیں؟“

”اتنے معصوم بھی نظر نہیں آتے آپ۔“ وہ جل کر بولی۔ ”کیا آپ کو اُس روز ہوٹل نہ آنے کا سبب یہ ہے؟“

منصور نے کوئی جواب نہیں دیا، نادیہ کو ایک نظر غور سے دیکھا پھر نظریں جھکا لیں.....

”انسان کو اپنے احساسات کے ساتھ ساتھ دوسروں کے جذبات کا بھی خیال رکھنا چاہئے.....“ وہ نام میں کہتی چلی گئی۔ ”رائیل کے ساتھ قرعہ اندازی والی حرکت میں فرمان کے ساتھ کون شریک ہوا اُس وقت مجھے بھی افسوس ہوا تھا۔ اور کیا آپ میری اس بات کو تسلیم کریں گے کہ میں اُس دن باوجود کہ ہار گئی تھی؟“

”نادیہ..... آپ.....“ منصور نے چونک کر نادیہ کو دیکھا، کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن نادیہ نے اتنا نہیں دیا..... ”جواب میں اگر میں نے بھی محض تفریح کی خاطر کچھ جملے کہہ دیئے تو وہ آپ کو کس کراں گزرے؟“ وہ جذبات کی رو میں بہتے ہوئے بولی۔ ”رائیل کے تو فرشتوں کو بھی بلیو کھروالے اسوٹ کا علم نہیں تھا۔“

”نادیہ.....“ منصور نے ہاتھ ملتے ہوئے تیزی سے کہا۔ ”میں اپنی غلطی کا اعتراف کرتا ہوں لیکن.....“

”آپ کو کوئی اہم کام تھا جو آپ نے ہوٹل آنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔“ نادیہ نے ہونٹ چباتے کہا۔

”میں..... شرمندہ ہوں۔“

”ہو سکتا ہے میں رائیل کی خوشی ہی کے خیال سے درمیان سے ہٹ گیا ہوں۔“ نادیہ نے منصور کے ہوئے الفاظ ذرا سے..... ”کتنی مٹھاس تھی اس جملے میں..... آپ اس کی چاشنی کو شاید محسوس نہ کر سکتے تھے.....“

”نادیہ پلین.....“

”راجیل بڑے باپ اور بڑے خاندان سے تعلق رکھتا ہے، شاید اسی لئے آپ کو اُس کی خوش زیادہ عزیز ہیں۔“ نادیا کے لہجے میں سکوار کی کاٹ تھی۔ ”مجھے آپ کی پسند یا ناپسند سے کوئی غرض نہیں..... آپ کو شاید یہ بھی نہیں معلوم کہ عورت کا دل بہت نازک اور حساس ہوتا ہے۔“

”مجھے افسوس ہے آپ کو میری بات سے ڈکھ پہنچا ہے لیکن.....“ غلطی آپ کی تھی، میری بھی جو میں..... میں.....“ نادیا نے منصور کا جملہ کاٹتے ہوئے جذبات لہجے میں کہا مگر اپنا جملہ بھی مکمل نہ کر سکی..... پلکوں کی اوٹ میں تھے ہوئے آنسو بند توڑ کر بہہ نکلتے پچھلے تو اُس نے دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ لئے..... تیزی سے پٹی اور تقریباً دوڑتی ہوئی اپنے کمرے طرف واپس لوٹ گئی۔

منصور گرم صبح کھڑے نادیا کی باتوں پر غور کرتے رہے..... اُن کے چہرے پر متضاد کیفیتوں پر چھائیں لرز رہی تھیں۔ اُن میں افسوس اور شرمندگی کا ملا جلا احساس بھی شامل تھا..... اور..... سروے کے جذبے بھی پھل رہے تھے.....!!



وقار احمد آج بہت زیادہ خوشگوار موڈ میں تھے..... انہیں بہت دنوں سے کاروباری سلسلے میں حکومت جانب سے جس پرمٹ کا انتظار تھا آج وہ دستیاب ہو گیا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے ہمراہ اس خوشی میں بیوی کے لئے ڈھیر سارے تحفے تحائف اٹھالائے تھے۔ شائلہ بیگم کو صورت حال کا علم ہوا تو سب سے انہوں نے دو رکعت شکرانے کی نماز ادا کی پھر شوہر کے لئے چائے کا اہتمام کرنے میں مصروف ہو گئیں بچوں کے ساتھ چائے پینے کے بعد جب وقار احمد کمر سیدھی کرنے کی غرض سے اپنی خواب گاہ آئے تو حسب معمول شائلہ بیگم بھی اُن کے ساتھ تھیں.....

”ناورا نادیا کب تک واپس آئیں گی؟“ وقار احمد نے خوشی کے موقع پر بیٹیوں کو یاد کرتے ہو

بیوی سے پوچھا۔

”آپ بھی کمال کرتے ہیں..... ابھی کل ہی تو آپا جان کے گھر چھوڑا ہے اور آج واپسی کا دن ستانے لگا۔“ شائلہ بیگم نے موقع دیکھتے ہوئے دبی زبان میں کہا۔ ”کل جب وہ اپنے گھر کی ہوجا گی تب کیا کریں گے؟“

”اس فرض کی ادائیگی کا اہتمام تو ہر والدین کو کرنا پڑتا ہے۔“ وقار احمد نے سنجیدگی سے جواب پھر بستر پر نیم دراز ہو گئے۔

”ہم لوگ تو خوش نصیب ہیں کہ رشتے گھر کے گھر ہی میں طے ہو رہے ہیں۔“ شائلہ بیگم نے آ کر سی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ پھر کچھ توقف سے بولیں۔ ”مجھے تو سب سے زیادہ خوشی اس بات کی ہے فیکٹری کا مسئلہ حل ہو گیا۔ اس طرح جمال بھائی کو بھی خود کو مصروف رکھنے کا بہانہ مل گیا اور سب بڑی بات یہ ہے کہ منصور کو ملازمت کے لئے در بدر کی خاک نہیں چھانی پڑے گی۔“

”جمال بھائی اتنے بوڑھے بھی نہیں ہوئے جتنا آپ سمجھ رہی ہیں۔ فیکٹری کے معاملات میں دن رات جس محنت اور لگن سے دلچسپی لے رہے ہیں اُس کی توقع آج کل کے نوجوانوں سے بھی کی جاسکتی۔“ وقار احمد نے کہا۔ ”رہا منصور کا سوال تو میں نے یہی سوچا ہے کہ تعلیم سے فراغت پا ہی اُسے جزل میٹر کے عہدے پر فائز کر دیا جائے گا۔“

”یہ تو بہت ہی نیک خیال ہے۔“ شائلہ بیگم خوش ہو کر بولیں۔

”اپنی سالی کو خوش کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔“ وقار احمد نے مسکراتے ہوئے

”کچھ نہیں، بلکہ بہت کچھ کہئے۔“ شائلہ بیگم نے وقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دبی زبان میں کہا۔ ”آپا جان جب سے آئی ہیں دوبار مجھ سے نادیا کے سلسلے میں بات کر چکی ہیں۔“

”اور آپ نے کیا جواب دیا؟“ وقار احمد نے چونکتے ہوئے دریافت کیا۔

”میں کیا جواب دیتی، میں نے تو یہ کہہ کر اپنی جان چھڑائی کہ نادیا کے سلسلے میں کوئی آخری فیصلہ ہی کریں گے۔ میرا خیال ہے کہ اب آپا یا جمال بھائی براہ راست آپ سے گفتگو کریں گے۔“

”گویا میرا اندازہ درست نکلا۔“ وقار احمد سنجیدگی سے بولے۔ ”مجھے تو اُسی دن شبہ ہو گیا تھا جب انہیں نے اپنے خط میں منصور کے رشتے والی بات لکھی تھی.....“

”لیکن اُس خط میں نادیا کا تو کوئی ذکر نہ تھا.....“

”مگر میں نے اُسی وقت بھانپ لیا تھا کہ آپ کی ہمیشہ صاحبہ کیا چاہتی ہیں۔“

”پھر اب کیا سوچا ہے آپ نے؟“ شائلہ بیگم نے پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”میں فوری طور پر اس معاملے میں کوئی آخری فیصلہ نہیں کرنا چاہتا۔“

”کیا مطلب؟“

”آپ سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں؟ نادیا کو بی، ایس، سی کرنے میں ابھی تین سال درکار ہیں۔ سوئی تعلیم کا مرحلہ بھی ابھی مکمل نہیں ہوا۔“

”تو میں یہ کب کہہ رہی ہوں کہ آپ جٹ منگنی پٹ بیاہ کر دیں؟“ شائلہ بیگم نے پہلو بدل کر کہا۔ آپا جان نے اگر آپ سے ذکر چھیڑا تو کوئی نہ کوئی جواب تو دینا ہی پڑے گا۔ کسی غیر کی بات ہوئی تو ”وگ فیصلہ بھی کیا جاسکتا تھا۔“

”آپ کا کیا مشورہ ہے؟“ وقار احمد نے بیوی کے چہرے کے تاثرات دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”اگر آپ میرا مشورہ دریافت کر رہے ہیں تو مجھے تو یہ رشتہ ہر لحاظ سے نہایت مناسب اور موزوں آتا ہے۔“ شائلہ بیگم نے کہا۔ ”آپا جان کے سلسلے میں تو پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ نادیا کو نہیں بلکہ بیٹی سمجھ کر ہمیشہ اپنے سینے سے لگائے رہیں گی۔“

”میرا ذاتی خیال بھی یہی ہے کہ شائلہ بہن منصور کے مقابلے میں ہماری نادیا کا زیادہ خیال رکھیں۔“

”لیکن کیا؟ کیا آپ آپا جان کی درخواست کو رد کر دیں گے؟“

”نہیں تو سوچ رہا ہوں کہ کوئی ایسا درمیانی راستہ اختیار کیا جائے کہ بات بھی نہ بگڑنے پائے اور ل کے کانوں میں شادی بیاہ کی جھجک بھی نہ پڑے۔“

”مگر وہی مرغ کی ایک ٹانگ والی بات شروع کر دی آپ نے..... میں پوچھتی ہوں اگر کوئی بی بی مونی رسم کر کے بات بزرگوں کے درمیان طے ہو جائے تو اس میں حرج ہی کیا ہے؟“ شائلہ بیگم نے کہا۔ ”اس طرح آپا جان کو ملال بھی نہ ہوگا اور ہم دوسروں کو بھی جواب دے سکیں گے کہ نادیا کی شادی ہو چکی ہے۔“

”کیا مطلب.....؟“ وقار احمد چونکتے ہوئے دریافت کیا۔ ”کیا کچھ اور رشتے بھی آئے ہیں؟“

”ابھی مکمل کر بات تو نہیں ہوئی لیکن میرا خیال ہے کہ سیرا خاتون کی نظریں بھی نادیا پر جمی ہوئی

ہیں۔“ شائلہ بیگم نے شوہر کو تقریب والی تفصیل بتائی تو وہ کچھ دیر خاموشی سے اپنے خیالوں میں مستغرق رہے پھر بولے۔

”آپ نے ابھی تک ایک پہلو پر غور نہیں کیا۔“

”وہ کیا؟“

”کیا یہ مناسب ہوگا کہ شائستگی رہے اور نادیہ کی بات اُس سے پہلے طے کر دی جائے؟“

”کیوں.....؟“ شائلہ بیگم نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیا شائلہ کے لئے آپ کو احقر پسند نہیں؟ میں نے تو آپا جان کے کانوں میں بھی احقر والی بات ڈال دی..... انہوں نے بھی اس رشتے کو پسند کیا ہے۔“

”بھئی بھئی تو آپ بالکل بچوں جیسی بات شروع کر دیتی ہیں۔“ وقار احمد نے سنجیدگی سے کہا۔ ”احقر ہزاروں کیا لاکھوں میں ایک ہے۔ لیکن جب تک بھائی صاحب کی طرف سے کسی بات کا آغاز نہ ہو، ہم کیسے پہل کر سکتے ہیں؟“

”یہ تو ٹھیک کہا آپ نے۔ لیکن آپا جان کو کیا جواب دیا جائے گا؟“

”یہ مسئلہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں..... اگر شائلہ، بہن یا جمال بھائی نے ذکر چھیڑا تو میں شاد اور احقر حوالہ دے کر انہیں سمجھا لوں گا۔ رہا منصور کا معاملہ تو آپ کے اطمینان کے لئے عرض کر دوں کہ وہ مجھے نادیہ کے لئے ہر لحاظ سے پسند ہے۔“

”خدا کا شکر ہے، آپ نے کم از کم اپنی زبان سے کسی بات کا اقرار تو کیا۔“

”پھر اس خوشی میں کیا انعام دے رہی ہیں؟“ وقار احمد نے بیوی کی نظروں میں نظریں ڈال کر پیار سے کہا۔

”ہنئے بھی..... آپ پر تو وہی مثل صادق آتی ہے کہ بوڑھے منہ مہا سے، لوگ جلتے تماشے..... ہر وقت بس ایسی ہی باتوں میں دل لگا رہتا ہے.....“ شائلہ بیگم شرماتے ہوئے انہیں پھر مسکراتی ہوئی باہر آ گئیں جہاں فرحان فون پر کسی سے بات کرنے میں مشغول تھا۔

”یہ کس سے باتیں ہو رہی تھیں؟“ فون کا سلسلہ ختم ہوا تو شائلہ بیگم نے فرحان سے دریافت کیا۔

”منصور بھائی کا فون تھا.....“ فرحان نے خوشی خوشی جواب دیا۔ ”وہ مجھے لینے آ رہے ہیں۔“

”کوئی خاص بات؟“

”جی ہاں.....“ فرحان نے بڑی شان سے اپنے کارسیدھے کرتے ہوئے کہا۔ ”منصور بھائی آج رات کے کھانے پر مجھے دعوت دے رہے ہیں..... میں نے اس خیال سے انکار نہیں کیا کہ کہیں اُن کی دل شکنی نہ ہو۔“

”تم گئے تو صائمہ بھی ضد کرے گی۔“ شائلہ بیگم نے ایک امکانی بات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”کیا منصور نے صرف کھانے میں شرکت کو کہا ہے یا رات بھی وہیں رہیں گے؟“

”بات صرف کھانے کی ہوئی ہے۔ اس کے بعد منصور بھائی مجھے واپس چھوڑ جائیں گے۔“

”ٹھیک ہے..... تم خاموشی سے چلے جانا۔ لیکن خبردار..... اگر تم نے صائمہ کو چڑانے کی کوشش کیا اُس سے کچھ کہا تو پھر تمہارا جانا بھی منسوخ ہو جائے گا۔“

”منظور!“ فرحان نے شوخی سے کہا۔ ”جاتے وقت کچھ نہیں کہوں گا لیکن واپس آنے کے بعد.....“

”فرحان! تم اپنی شرارتوں سے باز نہیں آؤ گے؟“ شائلہ بیگم نے پیار سے گھورا تو فرحان جلدی سے مسکراتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

○○○

رات کے کھانے پر فرحان بھی منصور کے ساتھ شامل تھا۔

نادیہ میز کی دوسری طرف شائلہ بیگم کے برابر بیٹھی خاموشی سے کھانے میں مصروف تھی۔ صبح والی نادیہ سے منصور نے کئی بار کوشش کی کہ اُس سے تنہائی میں مل کر اپنی صفائی پیش کر سکیں لیکن یہ اُس کا موقع نہیں دیا۔ دوپہر کے کھانے پر اُس نے منصور سے براہ راست کوئی بات نہیں کی۔

چند اُسے اس بات کا احساس تھا کہ منصور اپنی حرکت پر بے حد شرمندہ ہے۔ لیکن وہ اتنی جلدی نہ کر سکتی تھی کہ ناچا ہتی تھی۔ شاید اس لئے وہ منصور کی پریشانی کا تماشہ دیکھنے کی خواہش مند تھی۔

منصور بھی تو بلا وجہ اُس سے رُخسے رہے تھے۔ ایک ذرا سی بات پر کسی نے رُخی اور اجنبیت کا برتاؤ یار کیا گیا تھا۔ اب اُس کی باری تھی، وہ بھی دیکھنا چاہتی تھی کہ منصور کو اُس کی خفگی کا کتنا خیال ہے؟

..... انہیں اس بات کا احساس دلانا چاہتی تھی کہ بات کا زخم تلوار کے گھاؤ سے زیادہ اذیت ناک اور ی ہوتا ہے..... منصور نے بھی تو اُس کے سکون کو برا دیا تھا، اُس کے دل کو شدید دکھ پہنچایا تھا..... وہ انہیں اتنی جلدی کیسے معاف کر دیتی؟“

کھانے کے دوران سب ہی لوگ فرحان کی معصوم اور بھولی بھالی باتوں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ لیکن وہ خاموش بیٹھی آہستہ آہستہ کھانے میں مشغول رہی۔ ایک دو بار شائلہ بیگم نے کسی بات سے مخاطب بھی کیا تو وہ بس ”ہوں، ہاں“ کر کے بات ٹال گئی۔ منصور اُس کی خاموشی کو بڑی شدت محسوس کر رہے تھے۔ وہ فرحان کو اسی لئے ساتھ لائے تھے کہ اُس کے ذریعے کسی طرح بگڑی ہوئی نوبت کی کوشش کریں۔ چنانچہ انہوں نے کچھ دیر بعد اُسی بیڈنٹن والے پیچ کا قصہ چھیڑ دیا جس نے فرحان نے دھاندلی کر کے راجیل کی جیب کا وزن ہلکا کرنے کی شرارت کی تھی۔

”اور اگر راجیل کو پتہ چل جاتا تو.....؟“ شائلہ بیگم نے مسکراتے ہوئے فرحان سے پوچھا۔

”تو کیا.....“ فرحان نے کہا۔ ”ڈر والی شرط پہلے سے طے ہو گئی تھی اور راجیل بھائی پوری اُچھل کے باوجود مار بھی گئے تھے۔“

”کھیل کود میں تو اس قسم کی چھوٹی موٹی شرارتیں جائز سمجھی جاتی ہیں۔“ جمال احمد نے فرحان کی ل سے محفوظ ہوتے ہوئے کہا۔ ”پھر دوستانہ انداز میں بولے۔“ اب آپ کا آئندہ کیا پروگرام ہے، راجیل کو موٹو نے کے لئے کوئی نئی سکیم بنائی ہے؟“

”جی ہاں!“ فرحان نے جلدی سے کہا۔ ”اس بار سمندر کے کنارے پکنک کی شرط طے ہوئی ہے۔“

”اور اگر آپ اتفاق سے ہار گئے.....؟“ شائلہ بیگم نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

”ناممکن.....“ فرحان نے شوخی سے جواب دیا۔ ”راجیل بھائی اکیلے ہوں گے اور ہم تین.....“

”وہ بھلا کس طرح؟“

”ہم اور منصور بھائی تو پارٹنر ہوں گے اور.....“ فرحان نے نادیہ کی طرف دیکھتے ہوئے معصومیت کا ہتھیار بھی ہمارا ساتھ دیں گی۔“

”ہو سکتا ہے یا میں تمہارا ساتھ نہ دوں.....“ منصور نے موقع پا کر سنجیدگی سے کہا۔

”کیا مطلب؟“ فرحان نے تعجب سے منصور کی طرف دیکھا۔ ”آپ اپنے پارٹنر کو جان بوجھ کر اپنے کی کوشش کریں گے؟“

”یہ بات نہیں ہے۔ بلکہ ایک بازو غلطی سرزد ہو گئی ہے اُس کی تلافی تو بہر حال کرنی ہے۔“ منصور

”ہم بات ہے فرحان!“ ثنائے بھائی کوٹو کا۔ ”بڑوں کے لئے ایسے الفاظ استعمال نہیں کرتے۔“
 ”اور پریوں کو ناراض کرنا بھی ٹھیک نہیں۔“ منصور نے جلدی سے کہا۔ ”سنا ہے جو لوگ پریوں کو
 اراض کرتے ہیں، انہیں رات کو سوتے میں خطرناک دیو آسمان پر اٹھا لے جاتے ہیں اور انکی سزا
 ہے کہ بے چارہ جیتے جی مر جاتا ہے۔“

”آپ اتنے بڑے ہو کر ڈرتے ہیں..... میں تو نہیں ڈرتا۔“ فرحان لا بروائی سے بولا۔
 ”تم گھوڑوں بلاوجہ اس بیچارے کو ڈرانے کی کوشش کر رہے ہو؟“ ثنائے بیگم نے منصور سے کہا، پھر
 رحان سے بولیں۔ ”پریاں تو ننھے سنے اور پیارے پیارے بچوں کے پاس آتی ہیں..... انہیں پیاری
 یاری کہانیاں سناتی ہیں اور لوریاں دے کر سلاتی ہیں..... اتنے بڑے آدمیوں کے پاس بھلا پریاں
 کہاں آتی ہیں؟“

”پھر وہ کوئی چیزیل ہی ہوگی جو منصور بھائی کے پاس آئی تھی۔“ فرحان نے برجستہ کہا تو نادیہ کا
 اہل خلق میں ہنسنے پھٹنے پھٹنے رہ گیا۔ فرحان کی بات پر اُس نے بے ساختہ قہقہے روکنے کی کوشش کی تو
 انگوں سے پانی بہنے لگا۔

جمال احمد اور ثنائے بیگم بھی مسکرنے لگیں، ثنائے جلدی سے پانی کا گلاس بھر کر نادیہ کو دیا، پھر اُس کی
 پیٹھ پہلانے لگی۔ منصور کی بے چین نگاہیں بھی نادیہ پر جمی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر بعد ثنائے نے بڑے پیار
 سے نادیہ سے پوچھا۔ ”اب طبیعت کیسی ہے بیٹی؟“

”ٹھیک ہوں خالد جان.....“ نادیہ نے پانی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”فرحان کی بات پر ایک دم
 لی آگئی تھی اس لئے نوالہ پھنس گیا.....“

”دیکھ لیا آپ نے پریوں اور چیزیلوں کے ذکر کا نتیجہ؟“ فرحان نے بزرگانہ لہجے میں منصور سے
 کہا۔ ”اس سے بہتر تھا ہم راحیل بھائی سے پکنک پارٹی لینے کے لئے باقاعدہ ایک منصوبہ پہلے سے تیار
 کر لیتے۔“

”نتیجہ پر مجھے یاد آیا کہ ایف، ایس، سی کا رزلٹ بھی بہت جلد آنے والا ہے۔“ منصور نے فرحان
 کی بات ٹالنے کوئے ٹانگوں کا مطلب کیا۔

”آپ مذاق تو نہیں کر رہے؟“ ثنائے سنجیدگی سے پوچھا۔ رزلٹ آنے کی اطلاع سن کر اُس کے
 دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی تھی.....

”اگر آپ کو میری بات کا یقین نہیں تو شام کا اخبار اٹھا کر تصدیق کر لیں!“ منصور نے بدستور
 سنجیدگی سے جواب دیا۔

”اس میں فکر کی کیا بات ہے..... خدا نے چاہا تو میری بیٹی بہت شاندار نمبروں سے کامیاب ہو
 گی۔“ ثنائے بیگم نے نہایت خلوص سے دعائی۔

”اور ہم ثنائی کی کامیابی کی خوشی میں بہت ہی شاندار پارٹی دیں گے۔“ جمال احمد نے ثنائے
 جیسے کے تاثرات دیکھتے ہوئے بڑی اچانکیت سے کہا۔

”میکل نہ ہم اس پارٹی کے لئے راحیل بھائی سے شرط رکھ لیں؟“ فرحان نے تجویز پیش کی۔
 ”نہ ہرے فرحان..... تم تو بقول شخصے پنجے جھاڑ کر راحیل بھائی کے پیچھے ہی پڑ گئے ہو۔“ ثنائے
 فرحان کو ہر اتو وہ جلدی سے نظریں جھکا کر کھانے میں مصروف ہو گیا۔



نے کھکھوں سے نادیہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”غلطی کیسی.....؟“ فرحان نے سنجیدگی سے منصور کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”اس بار تو راحیل
 بنا کسی قریہ اندازی کے باجی کو پارٹنر بنانے پر تیار ہیں۔“

”لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس بار آپ کی باجی ہمارا ساتھ نہ دیں۔“ منصور نے کہا۔ پھر نوالہ
 کے کہ فرحان، نادیہ سے کوئی سوال کرنا وہ جلدی سے بولے۔ ”ایک سبب اور بھی ہے جو اس بار
 شرط لگانے سے گریز کر رہا ہوں۔“

”وہ کیا.....؟“

”آپ نے دیو اور پریوں کے قصے کہانیاں تو ضرور پڑھے ہوں گے؟“

”پڑھے ہیں۔ لیکن اُن باتوں سے کھیل والی شرط کا کیا تعلق؟“

”تعلق ہے..... اور بہت گہرا تعلق ہے.....“ منصور نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔
 ”میں سمجھ گیا..... اب آپ شاید مجھے پریشان کرنے یا ڈرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”یہ بات نہیں ہے پارٹنر! بلکہ میں خود ڈر گیا ہوں۔“ منصور نے دوستانہ انداز میں جواب
 چہرے پر بدستور سنجیدگی مسلط تھی۔

”آخر بات کیا ہے.....؟“

”پہلے آپ اس بات کا وعدہ کریں کہ میرا مذاق نہیں اڑائیں گے۔“ منصور نے کباب کی پلیٹ
 طرف کھٹکاتے ہوئے کہا۔

”نہیں اڑاؤں گا مذاق..... لیکن آپ جلدی سے بتائیں کہ بات کیا ہے؟“

”بات دراصل یہ ہے کہ کل رات جب میں گہری نیند سو رہا تھا تو اچانک ایک پری میرے
 گئی۔“ منصور نے کباب لیتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ”جانتے ہیں آپ اُس پری نے مجھ سے کیا کہا؟“

”کیا کہا؟“ فرحان نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

”اُس نے مجھ سے کہا۔“ منصور صاحب! اگر آپ نے دوبارہ کسی سازش میں شرکت کی یا
 بوجھ کر کسی کا دل دکھانے کی کوشش کی تو میں آپ کو فرانی کئے بغیر کچا جاؤں گی۔ بہت غصے اور
 میں نظر آ رہی تھی۔“

”اور آپ اُس کی بات سے خوفزدہ ہو گئے؟“

”میں اکیلا تھا..... میں نے اپنی صفائی بھی پیش کرنے کی کوشش کی لیکن وہ پری اتنے شدید غصے
 تھی کہ اُس نے میری بات ہی نہیں سنی اور سرخ سرخ آنکھوں سے گھورتی ہوئی چلی گئی۔“

”کیا اُس کے پڑ بھی تھے.....؟“ فرحان نے معصومیت سے پوچھا۔
 ”پڑ.....؟“ منصور نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”نہیں..... شاید اُس کے پڑ نہیں تھے، البتہ اگر
 مجھے اپنا نام نلیم پری بتایا تھا۔“

”پھر تو آپ بے پڑ کی اڑانے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ فرحان نے شونی سے جواب دیا تو
 بے اختیار ہنس پڑے۔ نادیہ بھی اپنی مسکراہٹ پر قابو نہ رکھ سکی۔
 ”آپ کچھ بھی کہیں..... لیکن یہ بات تو آپ کو تسلیم کرنے پڑے گی کہ انسان کو کسی کا دل
 دکھانا چاہئے۔“

”اس میں دل دکھانے کی کیا بات ہے، جب راحیل بھائی خود مرغا بننے کو تیار ہیں تو.....“

صرف اپنی تعلیم پر پوری توجہ دینی چاہئے۔ لیکن ہر بار شانے اپنا ارادہ ترک کر دیا، اس لئے کہ وہ نادبہ کی طبیعت سے بخوبی واقف تھی۔
وہ بہت جذباتی قسم کی لڑکی واقع ہوئی تھی۔۔۔۔۔ وقت کی مصلحتوں کا خیال رکھنا اُس کے اصول کے خلاف تھا۔۔۔۔۔ جس چیز کو چاہتی ہوٹ کر چاہتی۔۔۔۔۔ اُسے حاصل کرنے کی خاطر جان کی بازی لگا دیتی۔۔۔۔۔

اور۔۔۔۔۔
جس بات سے اُسے نفرت ہوتی وہ اُسے برملا کہہ دینے کی عادی تھی۔۔۔۔۔ جذبات کی رو میں تنکے کی طرح بہہ جانا اُس کی فطرت میں داخل تھا۔۔۔۔۔ اُسے نفع نقصان کی کبھی مطلق کوئی فکر نہیں ہوئی۔۔۔۔۔ وہ دو ٹوک فیصلہ کر ڈالنے کی عادی تھی۔۔۔۔۔ حالات کے نشیب و فراز اور اوج و نیچ کے بارے میں سوچنا اُس کے نزدیک وقت کی پر بادی تھی۔

ٹاکو کی بیٹی نہیں تھی کہ وہ منصور اور نادیہ کی باتوں سے اُن کے دلوں کے بھید کو محسوس نہ کر سکتی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے ہیں۔۔۔۔۔ اُس نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ بڑبڑمتن والے بچے کے بعد دونوں کے درمیان ایک غلط فہمی نے سر اُبھارا تھا۔ اُس روز لکھانے کی میز پر منصور نے فرمان سے جس نایم پیری کا ذکر کیا تھا اُس کی اصلیت سے بھی بخوبی واقف تھی۔

نادیہ اُس کی بہن تھی، اُسے نادیہ کے مستقبل کا تحفظ اپنی زندگی سے بھی زیادہ عزیز تھا، وہ منصور کو بہت پسند کرتی تھی، نادیہ اور منصور کا جوڑ بھی نہایت مناسب تھا لیکن وہ دونوں جس رفتار سے ایک اُچانے راستے پر تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے وہ رفتار ٹاکو کو پسند نہیں تھی، اُسے معلوم تھا کہ محبت ایک پاک جذبے کا نام ہے۔ لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ یہ جذبے اگر ثابت قدم نہ رہیں اور کوئی لغزش سرزد ہو جائے تو انسان منہ کے بل پتھروں سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔

کئی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا۔۔۔۔۔ زندگی ایک روگ بن جاتی ہے۔۔۔۔۔ روگ۔۔۔۔۔ جو ناسور کی طرح اندر ہی اندر اپنی جڑیں پھیلاتے رہتے ہیں۔۔۔۔۔ اور پھر۔۔۔۔۔ انجام بڑا بھیا تک ثابت ہوتا ہے۔ زمانے بھر کی زسوائی اور زلت۔۔۔۔۔ یا اذیت ناک موت۔۔۔۔۔!!

”کیا بات ہے آپ؟“ نادیہ نے بہن کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ پھر خاموش ہو گئیں!“

”آپ بولنے کا موقع دیں تو کوئی بولے۔“ منصور نے چھوٹے شیشے میں نادیہ کو دیکھتے ہوئے شونی سے کہا۔

”کچھ اور بھی سنا آپ نے؟“ نادیہ نے بہن کو بڑی سنجیدگی سے مخاطب کیا۔

”کیا؟“ شانیہ جلدی سے پوچھا۔
”آج کل موسم کی تبدیلی سے سینڈکوں کو بھی زکام شروع ہو گیا ہے۔“ نادیہ نے اتنا خوبصورت فقرہ جھٹک کر کہا کہ شانیہ کی طبیعت نہ کر سکی، منصور بھی زیر لب مسکرانے لگے۔ وہ جواب میں کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن ٹاکو کی موجودگی کی وجہ سے خاموش ہی رہے۔

قدر پریشان کیوں کر دیا تھا؟
قدر پریشان کیوں کر دیا تھا؟

”کیا بات ہے بیٹی؟“ شانیہ بیگم کو چونکہ ابھی تک نتیجہ آنے کی اطلاع نہیں ملی تھی اس لئے گھبرا کر بولیں۔ ”یہ تم رو کیوں رہی ہو؟“

رات ریڈیو پر بھی نتیجہ آنے کا اعلان ہوا تو نہ جانے کیوں اُس کی بے چینی بڑھ گئی۔
اُس کے سارے ہی پرچے خدا کے فضل و کرم سے بہت اچھے ہوئے تھے لیکن نفسیاتی طور پر آنے کی اطلاع سن کر مضطرب ہو گئی، شانیہ بیگم اور جمال احمد نے اُسے روکنے کی بہتیری کوشش کی۔ اُسے کسی کروٹ چپن نہیں آ رہا تھا۔۔۔۔۔ بڑی مشکلوں سے اجازت لے کر منصور کے ساتھ گھر آ گئی۔
نے راستے میں اُسے سمجھانے کی کوشش بھی کی۔

”آپ!۔۔۔۔۔ آپ اس قدر پریشان کیوں ہیں؟ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ آپ کی فرسٹ ڈویژر نہیں گئی۔“

”خدا تمہاری زبان مبارک کرے۔“ شانیہ بہن کا ہاتھ پکڑ کر دھڑکتے دل سے کہا۔

”ایک بات بتاؤں آپ!۔۔۔۔۔؟“

”کیا؟“

”میں نے تو آپ کی کامیابی کا یقین ہونے پر تحفہ بھی خرید رکھا ہے۔“

”سچ؟“

”اور نہیں تو کیا جھوٹ؟“ اُس نے بہن سے لاڈ کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن ابھی بتاؤں گی نہیں

ورنہ مزہ جاتا رہے گا۔“

”تجھے کی کیا ضرورت تھی۔۔۔۔۔؟“ شانیہ مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میرے لئے تو تمہاری محبت ہی بہت ہے۔“

”دیکھنا یہ ہے کہ راجیل صاحب اس موقع پر کیا تحفہ دیتے ہیں؟“ نادیہ نے کہا پھر خود ہی

”اپنی شان بنانے کے لئے کوئی بہت ہی قیمتی چیز اُٹھالائیں گے۔“

”تجھے کی اہمیت اس کی قیمت سے نہیں بلکہ تحفہ دینے والے کے خلوص سے لگائی جاتی ہے۔“

نے کہا تو نادیہ برجستہ ہوئی۔

”سن لیا آپ!۔۔۔۔۔ ایک صاحب تو صرف خلوص پر نثر خانے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں منصور بھائی۔“ شانیہ منصور کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔ ”اصل

خلوص ہی ہے۔۔۔۔۔ قیمت کی بھلا کیا حیثیت؟“

”چلئے۔۔۔۔۔ آپ کہتی ہیں تو مانے لیتی ہوں۔۔۔۔۔“

راستہ بھر اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔ شانیہ محسوس کر رہی تھی کہ منصور اور نادیہ براہ راست

گریز کر رہے ہیں، اُس کی ذات کو درمیان میں لا کر ایک دوسرے سے اشاروں کنایوں میں

رہے تھے۔ وہ بہت دنوں سے محسوس کر رہی تھی کہ نادیہ اور منصور ایک دوسرے سے غریب

رہے ہیں۔۔۔۔۔ اُس نے کئی بار سوچا بھی کہ نادیہ کو سمجھائے، اُسے اس بات کا احساس دلانے کی

کرے کہ وہ جس راستے پر قدم اُٹھا رہی ہے، وہ بہت مخدوش اور بل از وقت ہے۔۔۔۔۔ ابھی تو

”مما سے لڑ کر آئی ہیں۔“ منصور نے سنجیدگی سے کہا۔
 ”کیوں نہ! کیا تم آپا جان کو خفا کر کے آئی ہو؟“ شائلہ بیگم نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیا بات تھی“
 شائلہ نے کوئی جواب نہیں دیا، بس ماں کے سینے میں سر چھپائے بسورنی رہی۔ صائمہ اور فرحان کو
 کے آنے کی خبر ملی تو وہ بھی لاؤنج میں آگئے جہاں باقی سب بیٹھ تھے۔
 ”تم بتاؤ نادیہ.....“ شائلہ بیگم نے نادیہ سے دریافت کیا۔ ”آخر بات کیا ہے؟“
 ”کیا آپ نے شام کی خبریں نہیں سنیں.....؟“ نادیہ بولی۔
 ”خبریں..... کیسی خبریں؟“ شائلہ بیگم ایک دم ہولکھ گئیں۔ منصور کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔
 ”بیٹا! تم بتاؤ، کیا خبر نشر ہوئی ہے ریڈیو سے؟“
 ”ایسی کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے خالہ جان!“ منصور نے جلدی سے مسکراتے ہوئے کہا۔
 ایف، ایس، سی کا رزلٹ آ رہا ہے۔“
 ”تو یہ ہے..... تم لوگوں نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔“ شائلہ بیگم نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے
 پھر شا کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔ ”رزلٹ آ رہا ہے تو اس میں رونے کی کیا
 ہے؟ خدا نے چاہا تو تم شاندار نمبروں سے کامیاب ہو گی۔“
 ”آپ پریشان نہ ہوں بڑی آپا.....“ فرحان نے دریاوی کا ثبوت پیش کرنے کی کوشش کی۔
 مجھ سے دو چار نمبر کم آئے تو بھی میں کسی سے نہیں کہوں گا۔“
 ”اسے کہتے ہیں اپنے منہ میاں مٹھو بتا۔“ صائمہ چڑ کر بولی۔
 ”ابا جان کہاں ہیں.....؟“ نادیہ نے پوچھا۔
 ”وہ ابھی نہیں گئے ہیں..... ہو سکتا ہے شاید کچھ نتیجہ ہی معلوم کرنے گئے ہوں۔“ شائلہ بیگم نے کہ
 ”امی جان.....“ شائلہ نے منہ بسورنے ہوئے بڑے بھولپن سے کہا۔ ”اگر میرے نمبر کم آ
 میڈیکل کالج میں داخلہ کیسے ملے گا؟“
 ”شباباش سے لڑکی..... ابھی نتیجہ آیا نہیں کرتے سب کے ہاتھ پاؤں پھلا دیئے۔“
 ”امی.....“ شائلہ نے ماں کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا، پھر دوبارہ گلے سے لپٹ گئی۔
 ”کیا بالکل ہی دیوانی ہو گئی ہو.....؟“ شائلہ بیگم نے بڑے لاؤ سے کہا۔ ”چلو..... جا کر منہ دھوا
 خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“
 ”ہمت سے کام لیجئے بڑی آپا!“ فرحان بولا۔ ”اگر آپ نے ابھی سے اتنی کمزوری دکھائی
 ڈاکٹری کیسے پڑھیں گی؟ وہاں تو آپ کو مینڈک اور لال بیک کی چیر پھاڑ بھی کرنا پڑے گی..... مر“
 سے بھی دو دو ہاتھ کرنا پڑیں گے۔“
 ”تم کھڑے کیوں ہو بیٹا؟ آرام سے بیٹھو!“ شائلہ بیگم نے منصور سے کہا۔ پھر نادیہ سے بولی۔
 ”جا کر عبدل سے کہو کہ چائے بنالائے۔“
 ”تکلف کی کیا ضرورت ہے خالہ جان؟ میں تو اب اجازت چاہوں گا۔“
 ”اتنی جلدی کیا ہے جانے کی؟ اپنے خالو جان کو آ لینے دو، پھر چلے جانا! دیکھو وہ کیا خبر لاتے ہیں
 ”آپ مطمئن رہیں..... خالو جان یقیناً کوئی خوشخبری لے کر لوٹیں گے۔“
 ابھی یہ بات ہو رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی، فرحان نے لپک کر ریسیور اٹھا لیا۔ سب کی نگاہ
 فرحان کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ شا کے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔ فرحان کے چہرے کی بیجا

ہر اس کو ہول سی ہونے لگی۔
 ”جی..... بہت بہت شکریہ۔“ فرحان نے ماؤتھ پیس میں سنجیدگی سے کہا۔ ”خدا کو یہی منظور تھا تو
 اب بندہ کیا کر سکتا ہے؟“
 ”بس کا فون تھا.....؟“ فرحان نے ریسیور رکھا تو شائلہ بیگم نے جلدی سے پوچھا۔
 ”دبی ہوا جس کا خطرہ تھا۔“ فرحان کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی مسلط تھی، شائلہ کی طرف دیکھ کر بولا۔
 آپ کی وجہ سے میرا بھی نقصان ہو گیا۔“
 ”کیا مطلب.....؟“ شائلہ نے سہمی ہوئی آواز میں دریافت کیا۔
 ”فرحان پلینر.....“ نادیہ جذباتی لہجے میں بولی۔ ”جلدی بتاؤ..... کس کا فون تھا؟“
 ”کوئی اخباری نمائندہ تھا.....“ فرحان نے اختصار سے کام لیا تو نادیہ جھلا گئی۔
 ”کچھ آگے بھی پھوٹو گے..... کیا اطلاع ملی ہے؟“
 ”بڑی آپا.....“ فرحان نے سنجیدگی سے شا کی طرف دیکھا پھر ایک دم چیخ کر بولا۔ ”آپ نے
 ے بورڈ میں دوسری پوزیشن حاصل کی ہے۔“
 ”جج.....؟“ شائلہ بیگم کی آواز بھرا گئی۔ خوشی کے انمول آنسو اس کی دراز پلکوں پر تھر تھرانے لگے۔
 ”امی جان..... یہ سب آپ کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔“ شائلہ نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا
 دوبارہ شائلہ سے لپٹ گئی۔
 ”مجھے پہلے ہی یقین تھا کہ میری بیٹی ضرور کامیاب ہو گی۔“
 ”کامیابی مبارک ہو بڑی آپا!“ صائمہ اور فرحان نے کہا۔
 نادیہ نے بھی سہمی ہوئی کو گلے لگا کر مبارکباد دی۔ منصور نے بھی بڑی اپنائیت سے اپنی خوشی کا اظہار کیا۔
 ”منصور بیٹے.....“ شائلہ بیگم نے کہا۔ ”آپا جان کو بھی یہ خوشخبری سنا دو..... انہیں بھی شا کے نتیجے
 ڈی شدت سے انتظار ہو گا۔“
 منصور نے ماں کو اطلاع دی پھر شائلہ بیگم کو بتایا کہ شائلہ بیگم اور جمال احمد بنفس نفیس مبارک باد
 پنے کے لئے آ رہے ہیں۔ شا کی حالت عجیب تھی، ابھی وہ سب سے مسکرا کر باتیں کرتی اور ابھی اُسے
 شاندار کامیابی کا خیال آتا تو خوشی سے آنکھوں کے پیانے چھلک اٹھتے۔
 ”ابھی تک تمہارے باپ کا فون نہیں آیا۔“ شائلہ بیگم نے کہا۔
 ”ہو سکتا ہے ابا جان مٹھائی لے کر آ رہے ہوں۔“ صائمہ بولی۔
 ”خدا کرے اُس میں چم چم نہ ہو۔“ فرحان نے کڑوا سا منہ بنا کر کہا۔
 ”تم کیوں جلتے ہو چم چم سے.....؟“ صائمہ نے جلتے کٹے لہجے میں جواب دیا۔ ”تمہیں نا پسند ہے
 ”منصور بھائی.....“ فرحان نے منصور کی طرف آنکھ میچ کر اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”جج جج
 پئے، کیا آپ کو چم چم اچھی لگتی ہے؟“
 ”سو ری پارٹنر.....“ منصور نے نادیہ کو کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ”اب میں کسی
 انڈی میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکتا ورنہ نیلم پری پھر ناراض ہو جائے گی۔“
 ”شائلہ بیگم نے گھبراہٹ سے کہا۔ ”فرحان نے کڑوا سا منہ بنا کر کہا۔
 ”جائیں۔“ پھر ہماری اور آپ کی کٹی۔“ فرحان نے مصنوعی ناراضگی کا اظہار کیا۔

”بری بات ہے فرحان.....“ شامکہ بیگم نے فرحان کو پیار سے ڈانٹا۔ ”منصور تمہارے بڑا
ایسی باتیں نہیں کرتے۔“
”منصور بھائی! ہم چم کی برائی کر دیتے تو کئی کی بجائے پکی دوستی ہو جاتی.....“ صائمہ سہار
میں بولی۔
فون کی گھنٹی دوبارہ بجی تو فرحان نے صائمہ کی بات کا جواب دینے کی بجائے تیزی سے اُڑ
کر ریسور اٹھالیا۔ ”ہیلو.....“

”کون، فرحان.....؟“ دوسری جانب سے پوچھا گیا۔

”احمر بھائی! آپ.....؟“ فرحان نے خوشی سے پوچھا۔ ”آپ کہاں سے بول رہے ہیں؟“
”ایئر پورٹ پر آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔“ احمر نے جواب دیا۔ ”اچانک آنا ہو گیا اس
سے اطلاع نہ دے سکا۔“

”آپ انتظار کریں..... میں فوراً آ رہا ہوں۔“

فرحان نے فون رکھ کر احمر کی آمد کی خوشخبری سنائی پھر منصور کو ساتھ لے کر ایئر پورٹ روانہ
شامکہ بیگم کو احمر کے آنے کی خبر سن کر دلی مسرت ہوئی۔ انہوں نے مسکرائی نظروں سے ٹاکی
دیکھا جو نظریں جھکائے کھڑی جانے کن خیالوں میں گم تھی.....!!

○○○

ٹاکی شاندار کامیابی کی خوشی منانے کی خاطر خاندان کے سارے ہی لوگ جمع تھے۔ ٹا
موجود تھی..... ٹانے کیک کا تاتو پورا لاؤنج تالیوں سے گونج اٹھا۔ سب سے پہلے شانہ بیگم۔
بڑھ کر شا کو گلے لگا کر پیار کیا، پھر سونے کا سیٹ تھے میں دیا جس میں نیلم اور پیکھراج بڑے
تھے۔ جمال احمد نے قیمتی گھڑی دی، منصور نے فاؤنٹین پین کا سیٹ دیا، عثمان علی اور فرزانہ بیگم
کی بجائے ایک ایک ہزار روپے دیے، وقار احمد اور شامکہ بیگم نے سوٹ چیں دیا، نادیا نے
تختہ پیش کیا، صائمہ نے ایک خوبصورت ساپن شینڈ دیا، فرحان نے میڈیکل انسٹیکو پیڈیا کا
ٹیکٹ دیتے ہوئے کہا۔ ”بڑی آپا..... یہ وہ کتاب ہے جو آپ کے ہمیشہ کام آئے گی۔“

”بہت بہت شکریہ!“ ٹانے بھائی کو پیار کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ تختہ واقعی میرے بہت کام کا
فرحان کے بعد شازیہ نے ماربل کا ایک بے حد حسین ٹیبل لیمپ دیا، اس کے بعد راحیل۔
قسم کارفیوم اور ایک چھوٹا سا قیمتی ٹیپ ریکارڈر پیش کیا تو فرحان نے کہا۔
”راحیل بھائی..... پروفیوم تو خیر لگانے کے کام آجائے گا لیکن ٹیپ ریکارڈر بڑی آپا کے
کا..... انہیں تو میوزک وغیرہ سے دور کا بھی لگاؤ نہیں۔“

”ماڈرن زمانے میں ٹیپ ریکارڈر پڑھائی کا نہایت سہل اور آسان طریقہ ہے۔“ راحیل
آج لباس کے معاملے میں خاص طور پر ٹپ ٹاپ نظر آ رہے تھے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”پرو
میں جو لیکچر دے اُسے خاموشی سے ٹپ کر لیا جائے اور بعد میں نوٹس تیار کر لئے جائیں۔“

”یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔“
”اچھی آپ بہت چھوٹے ہیں۔ جب بڑے ہوں گے تو آہستہ آہستہ سب باتیں سیکھ جائیں
”آپ کا یہ کٹ واقعی بڑے کام کی چیز ہے۔“ ٹانے راحیل کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔
”آپ نے کیا صرف ایک ٹیپ ریکارڈر خریدا ہے؟“ نادیا نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”جی ہاں..... لیکن اگر آپ کو پسند ہے تو.....“

”آپ غلط سمجھے۔“ نادیا نے جلدی سے کہا۔ ”ایک آپ کو خود اپنے لئے خرید لینا چاہئے تھا تاکہ
آپ بھی اس کی ماڈرن افادیت سے مستفید ہو سکتے۔“

”میں سمجھا نہیں.....“ راحیل نے سنجیدگی سے وضاحت چاہی تو فرحان بولا۔

”باجی کا مشورہ ہے کہ آپ اپنے لئے سفید رنگ کا خریدیں اس سے زیادہ فائدہ ہوگا۔“

”اوہ.....“ راحیل نے گردن ہلاتے ہوئے ایسے انداز میں کہا جیسے بات اُس کی سمجھ میں آگئی ہو،
دوسرے تمام لوگ فرحان کی شرارت پر زرب لب مسکرانے لگے۔

احمر ابھی تک سب سے دور کھڑے تقریب کا حال دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے ہلکے گرے کلر کا
سوٹ پہن رکھا تھا جس پر سلور کلر کی ٹائی خوب سج رہی تھی۔ راحیل کے تحفے پر تبصرہ ختم ہوا تو وہ چھوٹے
چھوٹے قدم اٹھاتے آگے بڑھے۔ ٹانے انہیں قریب آتے دیکھا تو اندر ہی اندر شرماکر رہ گئی۔ دل کی
دھڑکنوں میں تلاطم کی کیفیت پیدا ہوئی تو اُس نے جلدی سے نظریں جھکا لیں۔

سب کی نگاہیں احمر پر جمی ہوئی تھیں شاید اس لئے کہ اُن کے دونوں ہاتھ خالی تھے۔ پروتار انداز
میں چلتے ہوئے وہ ٹاکی کے قریب جا کر رُک گئے، ایک لمحے تک اُس کے ہنڈے پر حیا کی شرمیلی
مسکراہٹ کو دیکھتے رہے پھر کوٹ کے کارلے گلاب کا خوبصورت پھول نکال کر آگے بڑھاتے ہوئے
بولے..... ”خدا کرے آپ کی خوشیاں ہمیشہ اس پھول کی طرح مہکتی رہیں۔“

ٹانے بشکل ہاتھ بڑھا کر پھول کا تختہ قبول کیا پھر..... اُس نے احمر کی خوشی کی خاطر پھول کو باقی
تختوں کے ساتھ رکھنے کی بجائے اپنے بالوں کی زینت بنالیا، وقار احمد اور شامکہ بیگم ایک دوسرے کو معنی
خیر نظروں سے گھورنے لگے۔

”واہ احمر بھائی.....“ فرحان بولا۔ ”آپ نے تو کمال کر دیا۔ ایسا خوبصورت تحفہ دیا جسے بڑی آپا
نے بقول شخصے سر پر بٹھالیا۔“

فرحان کی معصوم تنقید پر سب ہنس دیے۔

”مجھ سے ذرا سی چوک ہو گئی۔“ راحیل نے احمر کو ٹانے کی خاطر کہا۔ ”پہلے تو میں نے بھی سوچا تھا
کہ آنکھوں میں لگانے کے لئے کاجل یا سرمہ خرید لوں، لیکن اتنی شاندار کامیابی کے موقع پر اتنا سستا
تختہ لاتے ہوئے دل نہیں مانا۔“

ٹانے تیز نظروں سے راحیل کی طرف دیکھا۔ اُسے راحیل کے بیہودہ مذاق پر غصہ آ رہا تھا۔ اگر
اُسے لوگوں کی موجودگی کا خیال نہ ہوتا تو وہ راحیل کو ضرور بتاتی کہ گلاب کا پھول تو محبت کی نشانی سمجھا
جاتا ہے.....

محبت..... جو ایک مقدس جذبے کا نام ہے..... محبت..... جودل کے نہاں خانوں میں پرورش پاتی
ہے..... پروان چڑھتی ہے..... اور..... محبت کی مہک رُوح کو ہمیشہ معطر اور تر و تازہ رکھتی ہے.....

”مجھے بھی پہلے سے نہیں معلوم تھا کہ احمر بھائی کیا تختہ دیں گے۔ ورنہ میں آپ کو ایسا مشورہ دیتا کہ
آپ کا تختہ سب سے منفرد اور احمر بھائی کے مقابلے میں زیادہ کھلا ہوا اور بھاری بھر کم ہوتا۔“ فرحان
نے سنجیدگی سے کہا۔ اُسے بھی راحیل کی بات گراں گزری تھی، شاید اس لئے کہ وہ احمر کو سب سے زیادہ
چاہتا تھا۔

”ذرا میں بھی تو سنوں کہ تم کیا مشورہ دیتے راحیل میاں کو.....؟“ فرزانہ بیگم نے نواسے کو پیار

”جتنی جلدی بھی کیا ہے..... کچھ تو انتظار فرمائیے۔“ احمر نے ”انتظار فرمائیے“ کہتے وقت ثنا کی طرف ہنسیوں سے دیکھا پھر جیب سے گہرے نیلے رنگ کی ایک ڈبیا نکال کر ثنا کی طرف بڑھادی..... مسکرا کر بولے۔ ”میں اس سے زیادہ انتظار نہیں کر سکتا۔“

اور ثنا، احمر کی بات کا مفہوم بھانپ کر بری طرح شرما گئی..... چھوٹی موٹی کے معصوم پودے کی مانند خود اپنے وجود میں سمٹ کر رہ گئی.....

”انتظار فرمائیے.....“ احمر نے کس قدر خوبصورتی سے اُس کے پیغام کا جواب دیا تھا..... اور..... کتنی معصومیت سے یہ بھی کہہ دیا کہ میں بہت زیادہ انتظار نہیں کر سکتا..... کتنا خوبصورت انداز تھا..... کیا معصوم لہجہ تھا.....

نادیہ نے ڈبیا کھول کر دیکھی تو اُس کے منہ سے بے اختیار ”واہ“ نکل گئی۔ نیلے رنگ کی مختصر ڈبیا کے اندر وائٹ گولڈ کے بہت شاندار اور دیدہ زیب ٹاپس موجود تھے جس میں نہایت اعلیٰ قسم کے اور خاصے وزنی ہیرے پوری آب و تاب سے جھللا رہے تھے جسے دیکھ کر سب ہی کی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں..... راجیل نے اس موقع پر بھی اپنی بڑائی جتانے کی خاطر احمر سے کہا۔

”ٹاپس یقیناً شاندار ہیں۔ لیکن اس میں ہیرے کون سے لگے ہیں..... بیلجیئم کے یا انڈین کٹ کے؟“

”آپ کو ڈائمنڈ کی شناخت میں بھی خاصا دخل معلوم ہوتا ہے۔“ احمر نے دبی زبان میں مسکراتے ہوئے کہا۔ ”امیشیش ہے، لیکن پلیز! کسی سے کہنے کا نہیں۔“

”مجھے پہلے ہی شبہ تھا.....“ راجیل نے ٹائی درست کرتے ہوئے بڑے فخر سے کہا۔ ”اصلی ہوتے تو ان کی قیمت ہزاروں سے کم نہ ہوتی۔“

وقار احمد نے دوبارہ کھانے کا اعلان کیا تو سب لوگ ڈائمنڈ روم کی طرف قدم اٹھانے لگے۔ راجان احمر کے ساتھ ساتھ تھا۔ منصور راجیل کے قریب تھے۔ انہیں ٹاپس کے بارے میں راجیل کی تنقید بری لگی تھی لیکن اُس وقت انہوں نے کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ لیکن جب احمر اور فرحان آگے نکل گئے تو انہوں نے راجیل سے کہا۔ ”کیا آپ کا احمر صاحب سے باقاعدہ تعارف ہو چکا ہے؟“

”باقاعدہ تو نہیں..... البتہ فرحان نے بتایا تھا کہ احمر اپنے والدین کے ساتھ نیروبی میں رہتے ہیں۔“ راجیل نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”غالباً وقار احمد صاحب کے بڑے بھائی کے صاحبزادے ہیں۔“

”جی ہاں..... یہ آپ نے ٹھیک سنا ہے۔“

”کرتے کیا ہے احمر صاحب..... میرا مطلب ہے کہ کہیں ملازم ہیں یا ابھی زیر تعلیم ہیں؟“

”مجھے بھی کچھ زیادہ علم نہیں۔ البتہ اتنا جانتا ہوں احمر کے والد ثار احمد صاحب نیروبی میں ہیرے واپرات کے سب سے بڑے تاجر سمجھے جاتے ہیں۔“

”آئی سی..... گویا ذاتی کاروبار وغیرہ ہے۔“ راجیل نے منصور کی بات کا مطلب نہ سمجھتے ہوئے کہا۔ کھانے کے دوران زیادہ تر ثنا کی شاندار کامیابی اور فرحان کی شرارتوں کا ذکر ہوتا رہا۔ ثنائے فہم نے ایسی جگہ کا انتخاب کیا جہاں وہ سب سے الگ تھلگ بھی تھی احمر کو بے آسانی دیکھ بھی سکتی تھی۔ شازیہ اور نادیہ اُس کے ساتھ ہی موجود تھیں اس لئے وہ احمر کو دیکھنے میں بہت احتیاط سے کام لے رہی تھی..... اس خیال سے کہ کہیں کوئی اُس کی نگاہیں نہ بھانپ لے اور اس خیال سے بھی کہ کہیں ترکو اُس کی نظر نہ لگ جائے۔ منصور اور راجیل کے درمیان کھڑے وہ بے حد شاندار اور پُر وقار لگ

بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”گو بھی کے پھول کا.....“ فرحان شوخی سے بولا۔ ”گلاب کے پھول کے مقابلے میں زیادہ بھی ہوتا اور دوسرے تحفوں میں سب سے الگ تھلگ بھی نظر آتا۔“

”بعد میں لگا کر کھایا بھی جا سکتا تھا۔“ صائمہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

احمر خاموش کھڑے سب کی باتوں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ راجیل کی باتوں کا تو اُنہوں بالکل خیال نہیں کیا۔ دوسروں کی طرح اُن کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ کھیلتی رہی۔ بہت ہی بڑا انداز میں کھڑے دوسروں کے چہروں کے تاثرات دیکھتے رہے۔

”یہ بات غلط ہے احمر بھائی.....“ نادیہ بولی۔ ”آپ پچھلی بار بھی آپ کا تحفہ لانا بھول گئے۔ اس بار بھی آپ نے گلاب کے پھول پر خریدا۔“

”میرا تو خیال ہے کہ احمر صاحب کا تحفہ سب سے زیادہ قیمتی بھی ہے اور خوش قسمت بھی۔“

”ہرگز نہیں.....“ نادیہ نے منصور کو گھورتے ہوئے بہن کی طرف داری کی۔ ”اس وقت سے کام نہیں چلے گا۔ احمر بھائی کو آپ کی کوئی نہ کوئی قیمتی تحفہ ضرور دینا ہوگا۔“

”بری بات ہے نادیہ.....“ شامکہ بیگم نے بیٹی کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”بھلا تحفہ بھی کہیں مانگا جاتا ہے؟“

”دوسروں کی بات اور ہے لیکن احمر بھائی کو تو میں کسی قیمت پر نہیں بخشوں گی۔“ نادیہ نے اپنائیت سے کہا۔

”احمر بھائی..... اگر آپ کی جیب میں تھوڑی بہت ریز گاری ہو تو تکلف سے کام نہ لیں۔“

نے احمر کی حمایت میں کہا۔ ”دے دیجئے جیب سے نکال کر..... باجی بھی کیا یاد کریں گی کہ کس ریشم پالا پڑا تھا۔“

”تم چپ رہو فرحان.....“ نادیہ نے تیزی سے کہا۔ ”اس وقت تمہاری چچہ گیری نہیں چلے گی احمر بدستور خاموش کھڑے مسکراتے رہے تو نادیہ نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ”اس طرح خامسکرانے سے کام نہیں چلے گا۔ اگر تحفہ لانا بھول گئے تو نقدی سے بھی کام چل سکتا ہے۔ لیکن آپ کو بہر حال ڈھیلی کرنا ہوگی۔“

”اگر آپ جاہیں تو اس آڑے وقت میں، میں آپ کے کام آ سکتا ہوں۔“ راجیل نے اپنی کی شان جتانے کی خاطر بڑی چھپھوری بات کہی۔

”وہ کیا مکمل ہے باجی..... وقت پر تو.....“ فرحان نے راجیل کی بات کا جواب دینا چاہا تو وہ نے اُسے ڈانٹ دیا۔

”فرحان..... تم حد سے بڑھتے جا رہے ہو۔“

”جو منہ میں آتا ہے بکنا شروع کر دیتے ہو۔“ شامکہ بیگم بولیں۔ ”نہ بڑوں کا ادب نہ چھوٹوں کا احمر نے فرحان کو یکدم سنجیدہ ہوتے دیکھا تو بڑے پیار سے اُس کے شانوں کو تھپتھپانے لگے۔

”میرا خیال ہے آپ کھانا کھا لیا جائے۔“ وقار احمد نے کہا۔ ”باقی باتیں کھانے کے دوران کے بعد ہونی رہیں گی۔“

”نہیں.....“ نادیہ احمر کو گھورتے ہوئے بولی۔ ”پہلے آپ کا تحفہ..... اس کے بعد کھانا۔“

رہے تھے۔

”شا آج بہت خوش تھی اور احمر کے آجانے سے تو اُس کی خوشیاں دو بالا ہو گئی تھیں۔ کتنا خیال تھا اُس کا..... جیسی تو عین وقت پر بغیر اطلاع دیئے آ گئے..... وہ نہ آتے تو شا کو اپنی خوشیاں اور صوری لکیر احمر کے ایک ہی جملے نے جیسے اُس کی زندگی کی تمام خوشیاں اور سارے حسین خواب خرید لئے تھے۔“

”شا کے لئے..... شا خواں کی طرف سے.....“ اُسے احمر کا وہ مختصر سا جملہ آج بھی اذہر تھا۔ خلوص، کتنا پیار، کس قدر اپنائیت تھی ایک چھوٹے سے جملے میں..... ایک ذرا سے کاغذ کے پرزے احمر نے جیسے اپنا دل نکال کر رکھ دیا تھا..... کتنی سادگی سے انہوں نے شا کی خدمت میں اپنی خام محبت کا حسین نذرانہ پیش کیا تھا۔

وہ اپنے خیالوں میں کم احمر کی جانب دیکھنے میں مصروف تھی کہ اچانک شازیہ کی آواز سن کر ا طرح چونکی جیسے کوئی حسین خواب دیکھتے دیکھتے اچانک بیدار ہو گئی ہو..... خود کو جلدی سے سنبھالنا نہ تو کھانے کی پلیٹ ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی ہوئی۔

”کہاں کم تھیں میری سرکار.....“ شازیہ نے اُسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ ا لہجے کو گڑ بڑا گئی، پھر خود کو سنبھالتے ہوئے

”نہیں بھی تو نہیں.....“

”ہم سے اُڑنے کی کوشش کر رہی ہو.....؟“ شازیہ نے اُسے پیار سے گھورا۔ ”سچ سچ بتا..... کے خیالوں میں کھولی ہوئی تھی؟“

”تیرا تو دماغ چل گیا ہے۔“ شا مسکرا کر بولی۔ ”سب کو اپنے جیسا سمجھنے لگی ہے۔“

”تجربہ کار ہوں اسی لئے تو پوچھ رہی ہوں کہ وہ کون خوش نصیب ہے جس نے تجھے خود سے بنا دیا؟“

”تیرا سر.....“ شانی نے ہنس کر بات ٹالنے کی کوشش کی۔

”میرے سر میں تو شکیل کا سودا سا چکا ہے جس کا علم تجھے بھی بخوبی ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ چہیتی سیلی شازیہ بنت شیخ وحید الدین بہت جلد ڈولی میں بیٹھ کر وقتی طور پر سوسے بہائی باہل کے ا لوداع کہہ کر اپنے پیارے سونے گھر کو آباد کرنے زحمت ہو جائے گی۔“ شازیہ نے ٹھنڈی سانس پر ہوئے جذباتی لہجہ اختیار کیا تو شانی نے اُس کے چنگلی لیتے ہوئے کہا۔

”تجھے شرم نہیں آتی اس قسم کی باتیں کرتے؟“

”اے بی بی! اب شرم کرنے سے بے گام بھی کیا..... جب اوکھلی میں سر دے دیا تو پھر دھماکوار کیا ڈرنا.....؟“ شازیہ نے بڑی بوڑھیوں کے انداز کی بڑی شاندار لعل اُتارتے ہوئے کہا۔ ”اب مقدر میں لکھا ہے وہ جھگڑنا ہی پڑے گا۔“

”خدا سمجھے گا تجھ سے..... پہلے تو اتنی بے شرم نہیں تھی۔“

”وقت وقت کی بات ہے بوا..... آج میرا نمبر ہے، کل تمہاری باری بھی ضرور آئے گی پوچھوں گی کہ کتنی بیسی کے ساتھ ہوتے ہیں۔“

”تو بہ ہے شازیہ.....“ شانی ہنستے ہوئے کہا۔ ”یہ تو نے میرا مٹوں اور ڈومنیوں کی طرح بات کہاں سے سیکھ لیں؟“

”ٹالنے کی کوشش مت کرو بنو..... سیدھی طرح بتا دو کہ تم نے کس خوش نصیب کو تیر نظر سے گم

”فی الحال ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

”اچھا..... تو پھر کھامیر سے سر کی قسم کہ تو احمر پر دانت جمائے نہیں بیٹھی۔“

اور شازیہ کے منہ سے احمر کا نام سن کر وہ دھک سے رہ گئی۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دے۔ ”دیکھا تو نے.....“ شازیہ نے شا کی خاموشی اور اُس کے چہرے کے بدلتے تاثرات کو محسوس نہ ہوئے کہا۔ ”تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔“

”خدا کے لئے شازیہ..... آہستہ بول! کوئی سن لے گا تو کیا کہے گا؟“ اُس نے مدھم آواز میں کہا، بی نگاہوں سے اطراف کا جائزہ لینے لگی۔

”تیرا انتخاب برا نہیں ہے۔“ شازیہ نے اس بار تنقیدی نگاہوں سے احمر کو دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے ”اچھا خاصا خوبصورت گہرہ جوان ہے۔ اور پھر سب سے اچھی بات تو یہ ہے کہ گھر کا پلا پلایا جانور..... زیادہ جھان بین کی بھی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔“

”تو چپ نہیں ہوگی.....؟“ شانی نے شرماتے ہوئے اُسے تیسھی نظروں سے گھورا۔

”ایک بات تو بتا..... یہ راز و نیاز کا سلسلہ کب سے چل رہا ہے؟“ شازیہ نے دبی زبان میں

کی سے پوچھا۔

”شازیہ کی بچی..... اب اگر تو خاموش نہ ہوئی تو مار بیٹھوں گی۔“ شانی تملاکر کہا۔

”سوچ لے..... محبت کرنے والوں کے درمیان ایک راز دار کی بہت ضرورت ہوتی ہے اور میں یہ ت بلا معاوضہ کرنے کو تیار ہوں۔“

”نہیں چاہئے مجھے تیری خدمت.....“

”اوہ..... تو کیا معاملہ براہ راست ہو گیا ہے؟“ شازیہ نے مسکرا کر کہا۔ ”خدا مبارک کرے۔“

”تو اس طرح نہیں مانے گی.....“ شانی جھلا کر کہا پھر اُس نے شازیہ کو ڈرانے کی خاطر ہاتھ اٹھایا

”اچانک اُس کی نگاہوں کا تصادم احمر سے ہو گیا۔ وہ اُسی کی جانب دیکھ رہے تھے۔

”کتنا پیار تھا اُن کی نگاہوں میں..... کیسی اپنائیت کا احساس جھلک رہا تھا..... کس قدر سحر انگیز تھیں

”موش نگاہیں کہ شا کا ہاتھ اٹھے کا اٹھا رہا گیا..... یوں..... جیسے محبت کے پڑ خلوص اور پاکیزہ جذباتوں کی سوچ کو شیر کر لیا ہو.....“

”نازیہ آ رہی ہے.....“ شازیہ نے ایک دم اُسے ٹوکا تو وہ بوکھلائی گئی۔ گھبرا کر دیکھا تو نازیہ دور کھڑی

”یہم سے گفتگو میں مصروف تھی اور..... شازیہ کے ہونٹوں پر ایک شریر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

○○○

راجیل کے نہ ہونے سے سیرا خاتون نے اپنی مصروفیات میں اضافہ کر لیا۔ صبح سے شام تک وہ کاموں میں لگی رہتیں۔ رات گئے واپس آئیں تو تھک کر گڑھال ہو چکی ہوتی تھیں۔ پھر جب انہیں نیند نہ آ جاتی وہ راجیل کے حسین مستقبل کے بارے میں سوچتی رہتیں۔

”بہ سب سے وہ کراچی سے آئی تھیں انہیں بننے کے سر پر سہرا دیکھنے کی آرزو نے بھی پریشان کر دیا

”برماں کی طرح اُن کی بھی یہی تمننا تھی کہ راجیل پڑھ لکھ کر اپنے پیروں پر کھڑا ہو، اُس کا اپنا گھر ہو، جہاں وہ ہو..... اُس کی چاند سے ڈھن ہو اور زندگی کی تمام خوشیاں اُسے میسر ہوں۔

”سیرا خاتون کے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں تھی لیکن وہ محض کھلتے ہوئے سکوں سے راجیل کا مستقبل

اولاد کا بیمار بھی عجیب چیز ہے۔“
 ”رائیل صاحب کراچی میں جہاں رہتے ہیں کیا وہ آپ کے رشتے دار ہیں؟“
 ”ہاں.....“ سمیرا خاتون نے سیٹ لہجے میں جواب دیا۔ ”کچھ دور پر کے عزیز داری ہوتی ہے۔“
 ”پھر پریشانی کس بات کی..... تعلیم مکمل ہوتے ہی وہ واپس آجائیں گے۔“ نوشابہ نے سلی دینی چاہی۔ ”اور پچھٹیوں میں بھی تو آنا جانا لگا رہے گا۔“
 سمیرا خاتون نے کوئی جواب نہیں دیا، بلکہ باندھے نوشابہ کے چہرے کو دیکھتی رہیں پھر کچھ سوچ کر بولیں۔ ”مہیں میرے گھر میں کسی قسم کی کوئی تکلیف تو نہیں؟“
 ”جی نہیں.....“ وہ جلدی سے بولی۔ ”مجھے تو یہاں ہر قسم کا آرام و سکون نصیب ہے۔“
 ”کوئی فکر..... کوئی پریشانی؟“

”آپ کی محبت نے بھی ان باتوں کے بارے میں سوچنے کی مہلت ہی نہیں دی۔“ اُس نے نظریں جھکا کر بڑی عقیدت سے کہا۔ ”آپ نے مجھے پناہ نہ دی ہوئی..... میرے سر پر محبت سے ہاتھ نہ رکھا ہوتا تو نہ جانے میں کہاں در بدر کی خاک چھانی پھرتی۔“
 ”تم نے بتایا تھا، تمہارا سوتیلا باپ مہیں بہت تنگ کرتا تھا؟“
 ”جی ہاں.....“

”وہ ایسا کیوں کرتا تھا؟“ سمیرا خاتون نے گھبر لہجے میں دریافت کیا۔
 ”وہ..... وہ ماں پر بڑے ظلم کرتا تھا..... اب بھی کرتا ہوگا۔“ نوشابہ ہاتھ ملتے ہوئے بولی۔ ”میں ماں کی طرف داری کرتی تو وہ مجھے بھی مارنے کو دوڑتا..... وہ مجھے اپنے کاندھوں پر ایک وزنی بوجھ سمجھتا تھا..... آئے دن اُلٹے سیدھے طعنے دیا کرتا تھا۔“
 ”پھر بھی..... تمہیں اپنی ماں تو یاد آتی ہوگی۔“
 ”کیوں نہیں؟“ وہ تڑپ کر بولی۔ ”ماں تو ہر حال میں ماں ہوتی ہے۔“
 ”وہ بھی تمہیں یاد کرتی ہوگی.....“

”میں اُس کی اگلی بیٹی ہوں بیگم صاحبہ.....“ نوشابہ نے اپنے درد کو برداشت کرتے ہوئے کہا۔
 ”مجھے یقین ہے کہ وہ میری یاد میں بہت پریشان رہتی ہوگی۔“

”میں بھی ایک ماں ہوں نوشابہ.....“ سمیرا خاتون بڑے غمناک لہجے میں بولیں۔ ”رائیل بھی میرا ایک اگلا بیٹا ہے..... ہمارے درمیان کوئی خلیج نہیں پھر بھی وہ مجھ سے دور چلا گیا ہے لیکن..... شاید اس نے رائیل کا نہیں میرا اپنا ہی قصور تھا..... کبھی بھی ماں کی بڑھی ہوئی مستی اور بہت زیادہ لاڈ و پیار اولاد کو گلا بھی دیتا ہے..... مجھ سے بھی یہی غلطی سرزد ہوگئی جس کی سزا مجھے جھٹکتی پڑ رہی ہے..... میں نے رائیل کو اپنی زندگی سے زیادہ عزیز رکھا..... اُسے ٹوٹ کر چاہا، تمام دنیا کی مسرتیں اُس کے قدموں میں ڈال دیں..... اس لئے کہ میرے معصوم بچے کو باپ کی کمی کا احساس نہ ہو..... میں اُسے محرومی کے احساس سے دور رکھنا چاہتی تھی، اس لئے میں نے اُس پر تنبیہ نہیں کی..... اُس نے جو مانگا میں نے دیا..... اُس کی کسی خواہش، کسی آرزو، کسی تنہا کو بھی ناکامی سے ہمکنار نہیں ہونے دیا..... یہی میری غلطی تھی..... مجھے رائیل کی تعلیم کے سلسلے میں غفلت نہیں برتنی چاہئے تھی مگر..... مجھے اس بات کا احساس اُس وقت ہوا جب بہت دیر ہو چکی تھی.....“

”جو وقت گزر گیا واپس نہیں آ سکتا..... لیکن مجھے یقین ہے کہ رائیل صاحب کراچی میں رہ کر اپنی

نہیں سنوار سکتی تھیں۔ وہ اگر چاہتیں تو بیٹے کو کاروبار میں لگا کر اُس کے مستقبل کا تحفظ کر سکتی تھیں اس طرح رائیل تعلیم کے حصول سے محروم رہ جاتا جب کہ اُن کی دیرینہ خواہش تھی کہ رائیل پیلے لی، اے کر لے اس کے بعد کاروباری مصروفیات کی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کی کوشش کرے۔ اُس کے گھر کا ماحول دیکھ لینے کے بعد انہیں اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ رائیل کی تعلیم کا مرحلہ چائے گا۔ انہوں نے کراچی میں بہت ہی مختصر قیام کے باوجود بیٹے کے اندر نمایاں تبدیلیاں دیکھیں اور یہ تبدیلیاں خوش آئند تھیں۔

آج بھی جب وہ دن بھر کی تھکی ماندی گھر واپس لوٹیں تو حسب معمول چائے کا ایک کپ بعد لاؤنج میں رکھی آرام کرسی پر نیم دراز ہو گئیں۔ اُن کی سیکرٹری نوشابہ نے اُن کا بریف دوسری فائلیں اٹھا کر اُن کے کمرے میں پہنچا دیں۔ نوشابہ کا تقرر سمیرا خاتون نے رائیل جانے کے بعد کیا تھا۔ وہ ایک پڑھی لکھی، ذہین مگر یتیم لڑکی تھی۔ اس لئے سمیرا خاتون نے اُس کے ایک کمرے میں رہنے کی جگہ دے دی۔ اس طرح خود اُن کی اپنی تنہائی بھی قدرے دورا نوشابہ کو بھی زندگی کی سنگلاخ راہوں پر قدم جانے کا ایک موقع میسر آ گیا۔ سمیرا خاتون کی کوئی چھپانے کی جگہ ملنے سے پہلے وہ اپنے سوتیلے باپ کے ساتھ رہتی تھی جو اُس پر آئے دن تنگ کرتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ سمیرا خاتون کے ساتھ بہت محنت اور دیانت داری سے کام کر، دفتر میں بھی اور گھر کی چار دیواری میں بھی وہ ہر طرح سے اُن کا پورا پورا خیال رکھتی۔ سمیرا پریشان دیکھتی تو خود بھی ملول ہو جاتی..... وہ رائیل کی کمی تو پوری نہیں کر سکتی تھی لیکن اُس خاتون کو بڑی حد تک سنبھال رکھا تھا۔

وہ بریف کیس اور فائلیں رکھ کر واپس آئی تو سمیرا خاتون بدستور آنکھیں موندے اپنے خیاں کھوئی ہوئی تھیں۔ ہوا میں خلتی زیادہ بھی اس لئے وہ اندر سے جا کر شال لے آئی، آہستہ سے شال سمیرا خاتون کے شانوں پر ڈالنے کی کوشش کی تو انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ نوشابہ۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی دیکھی تو پریشان ہو گئی۔
 ”کیا بات ہے.....؟“ اُس نے آہستہ سے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ”آپ کچھ پریشان دکا رہی ہیں۔“

”کچھ نہیں..... یونہی رائیل کا خیال آ گیا تھا۔“ سمیرا خاتون نے ایک سر داہ بھرتے ہو۔

بولیں۔ ”تم کھڑی کیوں ہو..... بیٹھ جاؤ!“
 نوشابہ کسی سعادت مند بچے کی طرح حکم کی تعمیل میں دوسری کرسی پر بیٹھ گئی لیکن اُس بدستور سمیرا خاتون کے چہرے پر مرکوز تھیں جس پر اُنھیں ہوئے تاثرات کی پرچھائیاں لرزہ آنکھوں کے غمناک گوشے اس بات کی ترجمانی کر رہے تھے کہ وہ اس وقت کسی آنکھوں سے دو۔
 ”ایک بات پوچھوں.....؟“ نوشابہ نے تھوڑے توقف کے بعد دبی زبان میں اجازت؟
 ”میں جانتی ہوں کہ تم کیا معلوم کرنا چاہتی ہو..... یہی ناکہ میں اس وقت پریشان کیوں جی ہاں.....“

”مجھے رائیل کا خیال آ رہا ہے۔“ سمیرا خاتون منڈیر پر درختوں کے ڈھلتے سایوں کو د بولیں۔ ”وہ پہلے مجھ سے بھی اتنی دور نہیں ہوا تھا۔ روزانہ جب دفتر سے تھکی ماندی واپس آئی مگر مجھ سے لپٹ جاتا اور..... مجھے یوں لگتا جیسے دن بھر کی تھکن ایک پل میں دور

جئے دھوم دھام سے کروں گی کہ تمہاری ماں کی تمام آرزوئیں پوری ہو جائیں گی۔“
 ”بیگم صاحبہ..... آپ.....“ نوشاہہ نے نظریں اٹھا کر سیرا خاتون کی طرف دیکھا۔ وہ اُن کا شکریہ ادا کرتی تھی لیکن جذبات کی طغیانی نے اُسے مہلت نہ دی۔ آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب سارے ڈاکر اچانک اُٹا تو وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر تیزی سے اٹھی اور لمبے لمبے قدم اٹھاتی اپنے کی جانب چلی گئی۔

سیرا خاتون نے اُسے روکنے کی کوشش نہیں کی..... آج پہلی بار انہوں نے نوشاہہ کے دل کی باتوں میں جھانکنے کی کوشش کی تھی اور پہلی بار نوشاہہ انہیں بہت معصوم اور خوبصورت محسوس ہوئی۔ شبنم کے اُن نرم اور موتی جیسے قطروں کی مانند جو فضا سے ڈھلک کر پتوں کی گود میں پناہ لیتے..... بزمے کی آغوش میں سب سے نظر آتے ہیں..... پھولوں کی پتھریوں پر کپکپاتے رہتے..... اور..... دھوپ کی تپش انہیں فنا کر دینے کی گھات لگائے بیٹھی رہتی ہے.....
 نوشاہہ بھی ناکام حسرتوں کی ماری ماں کی پلگوں سے ڈھلکے ہوئے آنسو کا ایک انمول قطرہ تھی جس حالات سے تنگ آ کر سیرا خاتون کے دامن میں پناہ لی تھی..... اُس کی بد نصیب ماں بھی ایک مرد ریب کا شکار ہو کر وقت کے ہاتھوں لٹی اور بے بسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئی۔
 سیرا خاتون نے ایک سرد آہ بھری، پھر نوشاہہ کے بارے میں سنجیدگی سے غور کرنے لگیں.....!!



بروفیسر جمال احمد دراندے میں بیٹھے موسم کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ ملازم نے اُن کی ٹرے لاکر گول میز پر رکھی.....
 ”بیگم صاحبہ کہاں ہیں؟“

”اندرون پر کسی سے بات کر رہی ہیں۔“ ملازم نے کہا، پھر بولا۔ ”چائے بناؤں سرکار؟“
 ”نہیں..... تم جاؤ! بیگم صاحبہ آئیں گی تو وہی بتائیں گی۔“

ملازم چلا گیا تو جمال احمد پھر اُس سٹی کی معصوم جدوجہد کا مطالعہ کرنے لگے جو بڑی دیر سے ریلوں میں سلیپے سے لگے ہوئے پودوں پر منڈلا رہی تھی۔ بار بار وہ کسی پھول کے قریب جاتی، پھر ہچکچاتے ہوئے دوسرے پھول کی جانب اُڑ جاتی..... شاید وہ کسی خاص پھول کی تلاش میں سرگرداں تھی جو مائل بات بات بھٹکتی پھر رہی تھی..... یا کسی ایسے مین کی تلاش میں تھی جہاں خود کو ماحول کے سردو اسے محفوظ رکھ سکتی۔

جمال احمد اُس کی پرواز کو ایک فلسفی کی نگاہ سے دیکھتے رہے۔ ہر چند کہ وہ ایک حقیر کیزا تھا جس کی ت بڑی مختصر تھی لیکن اُس نے اپنی جہد مسلسل میں کوئی کمی نہیں آنے دی۔ ہوا کے دوش پر محو پرواز۔ اب مجروحہ ایک خوبصورت سے نازک پھول پر جا کر بیٹھ گئی، اُس کے حسین پتے چلنے اور بند ہونے لگے، اُسے اپنی منزل مقصود مل گئی ہو، جیسے اُس کی پرواز پر ایسا نہیں گئی..... کتنے سکون سے پھول پر بیٹھی اب بار بار اپنے پتے پھیلا کر اپنی مسرتوں کا اظہار کر رہی تھی۔ قدرت کو شاید اُس کی جدوجہد پر رحم آ گیا.....
 وقت نے اُسے نڈھال ہونے سے پیشتر سنبھال لیا.....

زندگی کا فلسفہ بھی کتنا اُنوکھا اور کتنا عجیب ہوتا ہے..... ہر شے اپنے محور کے گرد چکر لاتی رہتی ہے..... خاص وقت..... محدود مدت تک..... اور پھر..... اپنے مرکز کی سمت واپس لوٹ جاتی ہے.....
 کیا فنا اور بقا کا مسئلہ ہے جو ازل سے قائم ہے اور اب تک یونہی جاری رہے گا..... وقت، ماحول اور

تعلیم ضرور مکمل کر لیں گے۔“ نوشاہہ نے سیرا خاتون کے ڈکھے دل کو ڈھارس پہنچاتے ہوئے ”وقار صاحبہ کے گھر کا ماحول انہیں ضرور راس آ جائے گا۔“

”نوشاہہ.....“ سیرا خاتون نے چونکتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم نے کوئی خاص بات محسوس کی ہے؟“
 ”نادیہ بتا رہی تھی کہ راجیل صاحب بہت دل لگا کر پڑھائی میں دلچسپی لے رہے ہیں۔“
 ”اور..... اور کیا بتایا نادیہ نے.....؟“

”بس! یہی کہہ رہی تھیں کہ راجیل صاحب کامیاب ہو کر واپس لوٹیں گے۔“
 ”ہم.....“ سیرا خاتون نے آہستہ سے کہا، پھر کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔ ”کیا شانہ بھی را“

کے سلسلے میں تم سے کوئی بات کی تھی؟“
 ”جی نہیں.....“

”تمہیں..... تمہیں شاد اور نادیہ میں سے کون زیادہ اچھی لگی؟“ سیرا خاتون نے نوشاہہ کی را معلوم کرنا چاہی۔

”دونوں ہی اپنی اپنی جگہ خوبیوں کی مالک ہیں۔“ نوشاہہ نے اپنے خیال کا اظہار کرتے ہو کہا۔ ”شاکم خن، بزد بار اور سنجیدہ سنجیدہ رہنے کی عادی نظر آتی ہیں جبکہ نادیہ بہت ہی شوخ، چٹپٹلیہ بیباک واقع ہوئی ہے۔“

”اگر تم سے یہ کہا جائے کہ دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرو تو تم کس کے حق میں فیصلہ دو گی؟“
 ”یہ تو آپ نے بڑا مشکل سوال کر لیا.....“ نوشاہہ نے انکاری سے کہا۔ ”اتنی مختصر سی ملاقات بھلا کیا فیصلہ کیا جاسکتا ہے؟“

”تمہارا باپ کیا کرتا ہے؟“ سیرا نے جلدی سے موضوع بدلنے ہوئے سوال کیا۔
 ”کچھ بھی نہیں کرتا..... دن بھر گھر میں پڑا ماں پر ظلم کرتا رہتا ہے۔“

”پھر تمہاری ماں نے اُس سے شادی کیوں کر لی؟“
 ”اُس وقت میرے سوتیلے باپ نے میری معصوم ماں کو بڑے سبز باغ دکھائے تھے، بڑی اُ اونچی باتیں کی تھیں..... بس، قسمت کی بات تھی جو ماں دھوکہ کھا گئی۔“

”جب تمہاری ماں کی شادی ہوئی اُس وقت تمہاری کیا عمر تھی؟“
 ”زیادہ دنوں کی بات نہیں ہے بیگم صاحبہ!“ نوشاہہ نے بڑی حسرت سے کہا۔ ”یہی کوئی تین سال کا عرصہ گزرا ہو گا۔“

”میرا خیال ہے کہ تمہاری ماں کو دوسری شادی نہیں کرنی چاہئے تھی۔“
 ”ایک بار میں نے بھی بھلا کر یہی بات ماں سے کہہ دی تھی لیکن.....“ نوشاہہ کچھ کہتے کہتے نا ہو گئی۔ اُس کی خوبصورت آنکھوں میں ناکام حسرتوں کے گھپ اندھیرے تیرنے لگے۔

”لیکن کیا.....؟“
 ”میری ماں نے اپنی کسی ضرورت کی خاطر نہیں..... میری وجہ سے دوسری شادی کی تھی۔“

نے درد بھرے لہجے میں کہا۔ ”اُس کا خیال تھا کہ باپ کا سایہ سر پر ہونے سے میرے لئے کوئی رشتہ مل جائے گا..... مگر اُس غریب کو کیا معلوم تھا کہ شادی کے بعد اُس کی وہ تمام پونجی اور اثاثہ بھی جائے گا جو اُس نے میری خاطر جوڑ جوڑ کر جمع کی تھی۔“

”تم پریشان مت ہو.....“ سیرا خاتون نے بڑی اپنائیت سے کہا۔ ”تمہاری شادی میں کروں

حالات تو انسان کے اپنے پیدا کردہ ہیں..... خوشیاں اور مسرتیں..... رنج و الم تو زندگی کے سائے کی مانند لگے ہوئے ہیں..... دھوپ اور چھاؤں کا کھیل تو سیاہ و سفید کا فرق سمجھانے جاری ہے..... برقی ققموں کی روشنی گھب اندھیروں کو نکل جاتی ہے..... لگے تاساز گار ہوں بے بس ہو جاتا ہے..... سیاہ بادل کا ایک ٹکڑا تپتے سورج کے چہرے پر نقاب بن جائے تو دریا میں بدل جاتی ہے..... لیکن بدلتے موسم اور وقت کی کروٹیں انسان کے بس سے باہر ہوتی ہیں کو قانون قدرت کہتے ہیں جسے دانشوروں نے فلسفے کا نام دے رکھا ہے.....

کس قدر انوکھا اور سحر انگیز ہے یہ فلسفہ..... ایک چھوٹی سی خواہش پاہ تکمیل تک پہنچ جائے تو چہرہ شگفتہ گلاب کی مانند تروتازہ نظر آنے لگتا ہے..... کھل اٹھتا ہے..... لیکن..... ایک معمولی چہرہ جائے تو کس قدر پریشان ہو جاتا ہے..... چہرے کی دکتی خوشیاں ایک دم ماند پڑ جاتی ہیں اور ”اس قدر غور سے کہاں کھوئے ہوئے ہیں؟“ شبانہ بیگم کی آواز گونجی تو جمال احمد کے شیرازہ منتشر ہو گیا۔ پلٹ کر پیارے بیوی کی طرف دیکھا، کرسی پر پہلو بدل کر پوچھا۔

”کس سے گفت و شنید ہو رہی تھی؟“

”شاملہ کا فون تھا..... میں نے اُسے کل شام کھانے پر بلا لیا ہے۔“

”کوئی خاص بات.....؟“ جمال احمد نے بیوی کے تاثرات کو محسوس کرتے ہوئے سرسری دریافت کیا۔

”شائکی کامیابی کی خوشی میں دعوت تو کرنی تھی..... احمر بھی آیا ہوا ہے۔ میں نے سوچا؟“

ایک پتھ دو کاج ہو جائے تو کیا برا ہے۔“

”آپ نے اچھا کیا جو سب کو بلا لیا۔“ جمال احمد نے پاپ جلاٹر طویل کش لیتے ہوئے کہہ ”آپ نے ابھی تک چائے نہیں پی؟“ شبانہ بیگم نے برتنوں پر نظر ڈالتے ہوئے تعجب سے ”آپ کے بغیر پہلے بھی پی ہے؟“

شبانہ بیگم نے شوہر کی نگاہوں میں پیار کے قمری رنگ لہراتے دیکھے تو خوشی سے تپ کر گئیں، کرسی کا رخ بدل کر چائے بنانے میں مصروف ہو گئیں..... جمال احمد بدستور بیوی کے خوشیوں کا رخص دیکھتے رہے۔

”ایک بات پوچھوں آپ سے؟“ شبانہ بیگم نے چائے بنا کر ایک کپ شوہر کی طرف ہوئے کہا۔

”اور اگر میں آپ کے دریافت کرنے سے پیشتر بتا دوں کہ آپ کیا پوچھنا چاہتی ہیں تو ملے گا؟“

”آپ کو کیا معلوم کہ میرے دل میں کیا ہے۔“

”آزمائش صداقت کی کسوٹی ہوتی ہے۔“ جمال احمد چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے بولے۔

”کو آرسی کیا ہے۔ پوچھ کر دیکھ لیجئے! آپ کو خود ہی اندازہ ہو جائے گا کہ میں آپ کے دل کی سے ہر دم کتنا فریب رہتا ہوں۔“

”یہ آپ نے شاعری کب سے شروع کر دی؟“

”جب سے آپ نے میری زندگی میں قدم رکھا۔“

”اچھا..... چلے بتائیے، میں آپ سے کیا پوچھنے جا رہی تھی؟“

جمال احمد نے پاپ کا ایک طویل کش لیا، بیوی کے چہرے کو بغور تکتے رہے۔

”کیا میرے چہرے پر میرے دل کا حال تحریر ہے جو اس قدر غور سے دیکھ رہے ہیں؟“

”کچھ چہرے بے حد سادہ اور معصوم ہوتے ہیں..... ایسے چہروں پر دل کا عکس ہمیشہ نمایاں نظر آتا

”جمال احمد نے بخیدگی سے جواب دیا۔

”آپ شاید مجھے بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”جی نہیں..... اس حقیقت کا انکشاف کر رہا ہوں جس میں جھوٹ کا ذرہ برابر شامل نہیں۔“

”اب تالیے نہیں..... یہ بتائیے کہ میں آپ سے کیا پوچھنا چاہتی تھی؟“

”میرا اندازہ غلط نہیں تو شاید آپ احمر کے بارے میں کچھ کہنا چاہتی ہیں۔“

”ایمان سے..... آپ کو تو پروفیسر کی بجائے نبوی ہونا چاہئے تھا۔“ شبانہ بیگم نے شوہر کو تعریفی نظروں

دیکھتے ہوئے کہا پھر پہلو بدل کر بولیں۔ ”جی بتائیے، آپ کو میرے دل کا راز کیسے معلوم ہو گیا؟“

”پارٹی والے روز بھی آپ احمر کی شخصیت میں بہت زیادہ دلچسپی لے رہی تھیں۔“

”اور آپ میری ٹوہ میں لگے ہوئے تھے.....“

”جی نہیں.....“ جمال احمد نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”اُن جذبوں کی بلندی اور پاکیزگی کا

ہلکانے کی کوشش کر رہا تھا جو آپ کی نگاہوں میں رہ رہ کر پھیل رہے تھے۔“

”شاملہ نے مجھے بتایا تھا کہ شائے لے احمر کا رشتہ زیر غور ہے۔“ شبانہ بیگم نے کہا۔ ”آپ کی کیا

ہے اس سلسلے میں؟“

”میں شاملہ کی کسی بات کی تردید کیسے کر سکتا ہوں؟“ جمال احمد نے مذاقاً کہا، پھر سنجیدگی اختیار

تے ہوئے بولے۔ ”میں احمر کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا لیکن پہلی نظر میں اُس کی شخصیت نے

میں ذہن پر جو تاثرات چھوڑے وہ نہایت شاندار ہیں..... خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ جامعہ

بھی ہے، اُس کی کشادہ پیشانی اور آنکھوں کی چمک اُس کی ذہانت کی دلیل ہے۔ میرا خیال ہے کہ

احمر کی جوڑی نہایت موزوں رہے گی۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“

”کیا انکار صاحب کی طرف سے رشتے کی کوئی بات شروع ہو چکی ہے؟“

”نہا تو پریشانی ہے کہ ابھی تک ادھر سے کوئی سلسلہ شروع نہیں ہوا..... لیکن شاملہ بتا رہی تھی کہ احمر

ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔“ شبانہ بیگم نے خوشیوں کے جذلوں سے سرشار ہوتے ہوئے

”آپ نے دیکھا نہیں، وہ شائے لے بیروں کا کتنا قیمتی تحفہ لایا ہے۔“

”آپ گلاب کے پھول کو کیوں نظر انداز کر رہی ہیں؟“ جمال احمد بولے۔ ”بھری محفل میں جس

سے احمر نے پھول کا وہ تحفہ پیش کیا اور شائے جس انداز میں ہچکچاتے ہوئے اُسے اپنے بالوں میں

بجایا اس بات کی ترجمانی کر رہا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔“

”کیا آپ بھی اس رشتے کے حق میں ہیں۔“

”جب آپ اُسے پسند فرما رہی ہیں تو بھلا میں کیسے اعتراض کر سکتا ہوں؟“

”کل احمر یہاں آئے تو ذرا آپ بھی اُس سے گفتگو کر کے اندازہ لگائیے گا کہ وہ کس حد تک شائیں

سلے رہا ہے۔“

”اجازت ہو تو ایک سوال میں بھی کر لوں؟“

کاتے ہوئے بڑی حسرت سے بولیں۔ ”میری زندگی میں بھی کبھی بہار کا ایک معطر اور خوشوار جھونکا آیا
خالین بیٹی کی خوشیاں اور اُس کی محبت مجھے راس نہ آئی۔۔۔۔۔ خزاں کا ایک جھونکا آیا اور میری زندگی کی
تمام خوشیوں کو اُڑا کر لے گیا۔ میں اپنی بے بسی پر ماتم کرتی رہ گئی۔“

”کیا ہوا تھا آپ کی بیٹی کو؟“ جمال احمد نے پھر سے ہوئے انداز میں پوچھا۔
”وہ میری خوشیوں کی طرح زوڑھ کر میری زندگی سے ہمیشہ کے لئے دُور ہو گئی۔۔۔۔۔ جیتے جی
مر گئی۔“ شانہ بیگم نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ پھر دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے
لگیں۔۔۔۔۔ سسکتی رہیں۔۔۔۔۔ ہلکتی رہیں۔۔۔۔۔ اپنی خوشیوں کی بربادی کا ماتم کرتی رہیں۔۔۔۔۔

جمال احمد اپنی گریز پر خاموش بیٹھے شانہ بیگم کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے رہے، انہوں نے بیوی
کے آنسو پونچھنے کی کوشش نہیں کی، انہیں دلاس دینے کی خاطر ایک جملہ بھی نہیں کہا۔۔۔۔۔ شاید اس لئے کہ
وہ سمجھ رہے تھے کہ شانہ بیگم کی آنکھوں میں تھمے ہوئے آنسوؤں کا بہہ جانا ہی بہتر ہے وہ مواد نہ جانے
کب سے اندر ہی اندر پک رہا تھا۔ اگر جمع رہتا تو ناسور کی شکل بھی اختیار کر سکتا تھا۔۔۔۔۔ سم قاتل بھی بن
سکتا تھا۔

پھر۔۔۔۔۔ جب آنسوؤں کے سیلاب میں کمی آئی اور شانہ بیگم کی سسکیاں تھم گئیں تو جمال احمد نے
بڑی اپنائیت سے کہا۔ ”وہ خوشیاں جن کا تعلق دی کی گہرائیوں سے ہو سکی تھیں وہ تھیں۔۔۔۔۔ البتہ وقت
اور حالات اس کی ظاہری نوعیت میں کچھ تبدیلیاں ضرور پیدا کر دیتے ہیں۔۔۔۔۔ آپ اگر شاکا کو اپنی بیٹی کی
طرح عزیز رکھتی ہیں تو مجھے بھی وہ منصور سے کم عزیز نہیں۔“

”مجھے افسوس ہے کہ میں نے۔۔۔۔۔“
”بھول جائیے پرانی باتوں کو۔۔۔۔۔ اور صرف اتنا یاد رکھئے کہ ہمارے غم اور ہماری خوشیاں دونوں
شکر ہیں۔“

”آپ کس قدر عظیم انسان ہیں۔“
”تھانہیں۔۔۔۔۔ آپ کی محبت نے شاید بنا دیا ہو تو اس کے بارے میں کیا عرض کر سکتا ہوں؟“
”ایک بات کہوں۔۔۔۔۔؟“
”کہئے۔۔۔۔۔!“

”آپ میرے ماضی کے اس راز کو صرف اپنی ذات تک محدود رکھیں گے۔“ شانہ بیگم کے لہجے میں
الٹاچی۔ ”جی اور سے تذکرہ نہیں کریں گے۔“
”میں سمجھا نہیں۔۔۔۔۔“ جمال احمد نے بڑی معصومیت اور بھولپن سے کہا۔ ”آپ کس راز کی بات کر
رہی ہیں؟“

شانہ بیگم نے شوہر کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا جہاں بے پناہ محبت اور انسانیت کے پُر خلوص
مذہبوں کے سوا اور کوئی جذبہ کارفرما نہیں تھا۔۔۔۔۔ پیار ہی پیار کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔۔۔۔۔ اور شانہ بیگم کو یوں
موسوں ہوا جیسے چٹلائی ڈھوپ کے بعد اچانک اودے ہاڈوں کے تودے آسمان پر دُور دُور تک پھیل
گئے ہوں۔۔۔۔۔!!!



شام کا ملکی اندھیرا رات کی سیاہی میں مدغم ہونے لگا تو شاکی پریشانی بڑھنے لگی۔
آج شازیہ کے والدین نے بیٹی کا رشتہ طے ہونے کی خوشی میں بڑی پُر تکلف پارٹی کا اہتمام کیا

”پوچھئے؟“
”یہ آپ شاکا اور احمر کے معاملے میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہی ہیں؟“ جمال احمد نے
کہا۔ پھر وضاحت کرتے ہوئے بولے۔ ”میرا مطلب ہے کہ جب وقار بھائی اور شاکا کو
ہماری پسند یا نا پسند سے کیا فرق پڑے گا؟“

”کیوں۔۔۔۔۔ کیا میرا شاکا پر کوئی حق نہیں؟“ شانہ بیگم ایک ٹانے کو جذباتی ہو گئیں، پھر فوراً
قابو پاتے ہوئے بولیں۔ ”آخر میں بھی تو اُس کی کچھ لگتی ہوں۔ اور شاکا عمر میں مجھ سے
ہے۔۔۔۔۔ وہ لڑکیوں کے بارے میں مجھ سے مشورہ نہ کرے گی تو اور کس سے کرے گی؟“
”لیکن منصور اور تادیہ کے سلسلے میں۔۔۔۔۔“

”شاکا نے انکار تو نہیں کیا۔“ شانہ بیگم نے جلدی سے کہا۔ ”اُس نے تو یہی جواب دیا
ہم براہ راست وقار بھائی سے گفتگو کر لیں تو زیادہ مناسب رہے گا۔ جہاں تک شاکا کی
تعلق ہے تو وہ اپنے منصور کو بہت پسند کرتی ہے۔“

”وقار بھائی کا اپنا کیا خیال ہے احمر کے بارے میں؟“
”خیال تو نیک ہے لیکن جب تک احمر کے گھر والوں کی طرف سے باقاعدہ کوئی بات نہ
وہ بھلا اپنی زبان کیسے کھول سکتے ہیں؟“ شانہ بیگم نے کہا۔ ”لڑکی والوں کی حیثیت شاکا
معاملے میں یوں بھی نازک ہوتی ہے۔۔۔۔۔“

”آپ کا کہنا درست ہے لیکن۔۔۔۔۔“
”لیکن کیا۔۔۔۔۔؟“ شانہ بیگم نے شوہر کی اچانک خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”آر
کہتے خاموش کیوں ہو گئے؟“

”ہلے وعدہ کیجئے۔۔۔۔۔ آپ میری بات کا برا نہیں مانیں گی۔“
”آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں آپ کی کسی بات کا برا بھی مان سکتی ہوں؟“ شانہ بیگم
انداز اختیار کیا۔ ”کیا شادی کے بعد سے اب تک مجھ سے ایسی کوئی غلطی سرزد ہوئی ہے؟“
”آپ نے میری بات کا غلط نتیجہ اخذ کیا۔ دراصل میں آپ سے کچھ اور کہنا چاہ رہا تھا۔
سنجھل کر بولے۔ ”ہو سکتا ہے کہ میرا اندازہ غلط ہو لیکن میں نے محسوس کیا ہے کہ آپ نار
سے زیادہ شاکا کی ذات میں دلچسپی لیتی ہیں۔“

شانہ بیگم نے چونک کر شوہر کو بغور دیکھا، زری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ اپنے خیالوں
ہو گئیں، جیسے ماضی کے گم گشتہ راستوں کی بھول بھلیوں میں نہیں کھو کر رہ گئی ہوں۔ یا۔۔۔۔۔
بہر بات کی تلخ یادوں نے دل کے بھرتے ہوئے زخموں کو اچانک نہیں پہنچا کر پھر ہرا کر د

”کیا آپ کو میری بات سے ڈھک پہنچا؟“ جمال احمد نے بیوی کے معصوم چہرے پر
سائے منڈلاتے دیکھے تو جلدی سے بولے۔ ”میں نے تو یونہی برسبیل تذکرہ ایک بات دریا
”میں آپ کے خیال کی تردید نہیں کروں گی۔“ شانہ بیگم نے تھکے تھکے لہجے میں جواب
درست ہے کہ میں شاکا کو بہت پیار کرتی ہوں۔۔۔۔۔ وہ مجھے بہت زیادہ عزیز ہے۔ اپنی؟
زیادہ، اس لئے۔۔۔۔۔ اس لئے کہ آج اگر میری بیٹی ہوتی تو وہ بھی شاید شاکا کی عمر کی ہوتی۔
”میں سمجھا نہیں۔۔۔۔۔ کیا آپ کی کوئی۔۔۔۔۔“

”ہاں۔۔۔۔۔“ شانہ بیگم کے ماضی کا سارا ڈھک درد سمٹ کر اُن کی ہچکی آنکھوں میں اُڑ

تھا، شازیہ کے پر زور اصرار پر اُسے بھی آنا پڑا۔ نادیا ساتھ ہوتی تو اُسے اتنی بوکھلاہٹ کبھی نہ ہو لیکن وہ اپنے کانچ کا فنکشن اینڈ کرنے چلی گئی۔ چنانچہ ٹاڈرائیور کے ساتھ آگئی۔ اُس نے ڈرائیور خاص طور پر تاکید کر دی تھی کہ مغرب سے پہلے اُسے لینے آجائے لیکن وہ ابھی تک نہیں آیا۔ کانچ کی بے تکلف سہیلیوں کے درمیان بیٹھی وہ خوش گپیوں میں اس قدر محو تھی کہ وقت گزرنے احساس ہی نہ ہوا۔ لیکن جب برقی تقوں کی جگہ گاہٹ میں چکا چونڈ پیدا ہوئی تو اُسے بے چینی سی ہو گئی، پہلے بھی وہ اتنی دیر تک تنہا گھر سے باہر نہیں رہی تھی..... ممکن ہے ڈرائیور نادیا کو لینے چلا گیا ہو وہاں اُسے دیر ہو گئی ہو..... اُس نے خود اپنے آپ کو تسلی دینے کی خاطر سوچا..... لیکن جب تاریکی کم ہونے لگی تو اُس کی آنکھیں بڑھنے لگی۔ کئی بار وہ اُٹھ اُٹھ کر باہر گئی لیکن ڈرائیور کا کہیں نام و نشان نہ تھا..... وہ ٹیلی فون کے ذریعے صورت حال معلوم کرنے کے ارادے سے اُٹھی تو عزیزین نے ہاتھ کر روک لیا، شوخی سے بولی۔

”کیا بات ہے نا..... آج تم خلاف توقع کچھ پریشان نظر آ رہی ہو..... ہمارے درمیان تمہارا ہی نہیں لگ رہا.....“

”کس کا انتظار ہے جو اُٹھ کر بار بار باہر جا رہی ہو؟“ ایک بے تکلف سہیلی نے پوچھا۔

”ڈرائیور کا.....“ وہ سادگی سے بولی تو الماس نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

”کاش ہم ڈرائیور ہوتے اور کسی مہ رخ کو اتنی بے چینی سے ہمارا بھی انتظار ہوتا۔“

سہیلیوں کے جھرمٹ میں تعجب کی آواز گونجی تو وہ بھی مسکرانے لگی۔

”کوئی نہ کوئی راز تو ضرور ہے اس نے قراری کا!“ شمسہ نے گرہ لگائی۔ ”ورنہ ایسی بھی کیا جلدی“

”مجھے تو ڈرائیور کی قسمت پر رشک آ رہا ہے.....“ الماس نے ٹا کو معنی خیز نگاہوں سے گور

ہوئے پوچھا۔ ”کب تک ترقی ہو رہی ہے اُس بیچارے کی؟“

”بھئی ہم بھی جوان ہوتے تھے لیکن ڈرائیور سے آنکھ منکا..... تو بہ تو بہ.....“ ریحانہ نے کانو

ہاتھ لگاتے ہوئے شوخی سے کہا۔ ”اس سے تو بہتر تھا کہ کسی ہوٹل کے بیرے سے دوستی کر لی ہوتی۔“

ازم بلوں سے تو نجات مل جاتی۔“

”اب زیادہ نہ چیخو..... ورنہ ہم رو دیں گے۔“ شمسہ نے کچھ ایسے لہجے میں بر جستہ کہا کہ

سکھیاں اے اختیار بننے لگیں۔

”خدا سمجھے گا تم لوگوں سے.....“ ثنائے کہا۔ ”مجھے گھر جانے کی فکر لاحق ہے اور تم لوگوں کو

کی سوچ رہی ہے۔“

”کس گھر کی بات کر رہی ہو؟“ الماس نے جلدی سے پوچھا۔ ”بائل کے گھر کی یا بیبا کے گھر کی

”مجھے تو غریب ڈرائیور کا کوارٹر دکھائی دے رہا ہے.....“ شمسہ نے سرد آہ بھر کر جذباتی لہجہ اٹھ

تو وہ چڑ گئی۔

”کچھ تو شرم کرو..... ایسی بے حیائی کی باتیں زیب نہیں دیتیں۔“ اُس نے شمسہ کو گھورتے

قدرے کی سے کہا تو الماس تڑ سے بول اُٹھی۔

”اس کو کہتے ہیں کہ جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے..... ہم تو ڈرائیور والی بات مذاق سمجھ رہے

لیکن ثنائے تو سنجیدہ نظر آ رہی ہیں۔“

”اپنے اپنے مقدر کی بات ہے..... جس کے نام بھی لاٹری نکل آئے۔“ ریحانہ نے مسکرا کر کہ

”تمہاری لاٹری کا کیا بنا.....؟“ اس بار الماس نے ریحانہ پر فقرہ چست کیا۔ ”سنا ہے کئی ڈرا کی

رج بھر آگے بڑھ گئی۔“

”ارے ہاں ریحانہ..... ہمیں تو یہ بات یاد ہی نہیں رہی۔“ عزیزین نے دریافت کیا۔ ”تمہارے

چار ڈباؤ کا کیا بنا، جن سے رشتے کی بات چل رہی تھی؟“

”نی اچال تو سرخ جھنڈی نظر آ رہی ہے..... جب ہری ہو تب جانو۔“ ریحانہ نے ڈھٹائی سے

اب دیا۔

”کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ تیری بجائے کسی اور کو گنجل دے بیٹھا ہو اور تو پلیٹ فارم پر کھڑی انتظار ہی

رہ رہ جائے۔“

”تیرے منہ میں خاک.....“ ریحانہ نے عزیزین کو گھورتے ہوئے بناوٹی غصے سے کہا۔ ”خدا نہ

رے جو ایسا ہو، ورنہ میں تو ریل کی پٹری کے نیچے آ کر اپنی جان اور اُس کی جان ایک کر دوں گی۔“

ابھی سہیلیوں کے درمیان آپس کی چیخڑ چھاڑ اور ہنسی مذاق کا سلسلہ جاری تھا کہ شازیہ نے ٹا کے

پب آ کر بتایا کہ اُس کی گاڑی آگئی ہے۔

”سدا حارو بی..... تمہاری گاڑی تو پلیٹ فارم سے لگ گئی۔“ ریحانہ نے ٹا پر فقرہ چست کیا۔

”بے شرم.....“ ثنائے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر جان چڑانے کی خاطر تیزی سے پٹی اور شازیہ کے

تھ قدم بڑھائی باہر آگئی۔

”اچھا! خدا حافظ..... بہت بہت شکریہ تمہارے آنے کا۔“ شازیہ نے اُسے رخصت کرتے

ئے کہا۔

”خدا حافظ.....“ وہ شازیہ کو الوداع کہتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

گیٹ کے سامنے سڑک کی دوسری جانب اُس کی گاڑی کھڑی تھی۔ لمبے لمبے قدم اٹھاتے اُس نے

دی سے سڑک عبور کی، پھر دروازہ کھول کر پچھلی نشست پر بیٹ گئی۔ دتی کھڑی پر نظر ڈالی تو ساڑھے

ت تارے تھے۔

”کیا بات تھی ڈرائیور..... تمہیں اتنی دیر کیسے ہو گئی؟“ اُس نے ڈرائیور سے سوال کیا، پھر جواب کا

ظار کے بغیر بولی۔ ”میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔“

ڈرائیور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بڑی مہارت سے گاڑی کو دوسری کاروں کے جوم سے نکالتا ہوا

لی سڑک پر آ گیا۔

”نادیا کانچ سے کب واپس آئی؟“ ثنائے تھوڑے توقف کے بعد پوچھا۔

ڈرائیور بدستور خاموش رہا۔ شاید اُس نے ٹا کی بات نہیں سنی تھی یا جان بوجھ کر خاموشی اختیار کئے

ئے تھا۔

”کیا بات ہے؟“ وہ جھلا گئی۔ ”تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“

”میں سوچ رہا ہوں کہ کیا جواب دوں؟“

”آپ.....؟“ ثنائے اصرار کی آواز سن کر تھک سے رہ گئی۔ ایک لمحے کو یوں محسوس ہوا جیسے کوئی

اب دیکھ رہی ہو۔ لیکن جب اُس نے غور سے اگلی نشست پر نگاہ ڈالی تو یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ جسے

ہنگ ڈرائیور سمجھ رہی تھی وہ اصرار تھے..... ٹا کو اپنے لہجے کی پختی کا احساس ہوا تو اندر ہی اندر کٹ کر وہ

ناسوس پختے لگی کہ اصرار نہ جانے اُس کی باتوں کا کیا اثر لیا ہو، لیکن اُس کی تو کوئی غلطی نہیں تھی۔

وہ تو حسب معمول دروازہ کھول کر پچھلی نشست پر بیٹھ گئی تھی۔ یہ بات تو اس کے وہم و گمان میں نہیں آئی تھی کہ احمر اسے لینے آئیں گے۔ اور جب اسے احساس ہوا کہ وہ احمر کے ساتھ تھا گاڑا موجود ہے تو نہ جانے کیوں اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔

حیا کی سرخی نے چہرے پر پھیل کر اسے گلار پنا دیا۔ اس نے جلدی سے اپنی نظریں جھکا لیں جانے کیوں مارے شرم کے پانی پانی ہوئی جا رہی تھی۔

”ہمراہے نہیں۔۔۔۔۔“ احمر نے بڑے مہذب لہجے میں کہا۔ ”میں اپنی مرضی سے نہیں چچی جا رہا حکم پر آپ کو لینے آیا ہوں۔“

”لیکن۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ ڈرائیور۔۔۔۔۔ وہ بوکھلا کر رہ گئی۔ جملے کا ربط قائم نہ رکھ سکی تو جلدی سے غا اختیار کر لی۔

”ڈرائیور کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی۔ پچا جان گھر پر نہیں تھے اس لئے خوش قسمتی سے کولانے کی ذمہ داری مجھے سونپ دی گئی۔“

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ احمر کی بات کا کیا جواب دے، دل کی دھڑکنیں کسی طرح سمجھ نہیں لے رہی تھیں۔

”آپ کو شاید میرا آنا اچھا نہیں لگا۔“ احمر نے تھوڑے توقف کے بعد کہا تو وہ اپنی نشست پر کر رہ گئی۔

”جی نہیں۔۔۔۔۔“ اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے بمشکل جواب دیا۔ ”ایسی تو کوئی بات نہیں۔“

”راجیل اپنی سپورٹس کار پر آنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن چچی جان نے انہیں روک دیا۔“

”شانے احمر کی بات کو بہت شدت سے محسوس کیا لیکن کوئی جواب نہیں دیا۔ شاید احمر اس کے دا نہاں خانوں میں غوطہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ جانتا چاہتے تھے کہ وہ انہیں کس حد تک پہنچے۔“

”میرا خیال ہے کہ ابھی گھر تک پہنچنے میں دس پندرہ منٹ ضرور لگیں گے۔“ احمر نے کہا۔

”جی ہاں۔۔۔۔۔ شاز یہ کا گھر بھی تو خاصا دور ہے۔“ وہ احمر کی بات کا مفہوم بھانپ کر دل میں مسکرا دی۔

”خدا کا شکر ہے کہ اس بار جواب بہت جلدی موصول ہو گیا۔“ احمر نے شونہ سے کہا تو وہ اگنی۔ جلدی سے نظریں گھما کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

”آپ کو میرا اتھہ کیا لگا؟“ احمر نے دہی زبان میں پوچھا۔

”بہت ہی شاندار۔۔۔۔۔“ وہ ہمت کر کے بولی۔ ”انتانیتمی تحفہ لانے کی کیا ضرورت تھی؟“

”میں نے سوچا اسی بہانے سیٹ مکمل ہو جائے گا۔“ احمر کے لہجے میں شرارت تھی۔

”ناپس کی بات اور ہے۔ وہ آپ نے سب کے سامنے دیئے ہیں لیکن۔۔۔۔۔“ وہ کچھ کہتے گئی۔ حجاب کے پردے بار بار درمیان میں حائل ہو رہے تھے۔

”لیکن کیا۔۔۔۔۔“

”اگر آپ برانہ مائیں تو ایک بات کہوں؟“ شانے آہستہ سے کہا۔

”میں ہمد تن گوش ہوں۔“

”آپ۔۔۔۔۔ آپ وہ انگوٹھی واپس لے لیں۔“

”کیوں۔۔۔۔۔؟“ احمر یکنخت افسردہ ہو گئے۔ ”کیا وہ آپ کو پسند نہیں آتی؟“

”بات میری پسند کی نہیں لیکن اگر کسی نے اسے دیکھ لیا تو کیا کہے گا؟“ شانے ایک امکانی خطرے اظہار کیا۔

”ایک تو اسے دیکھ کر بہت کچھ کہہ بھی دیا۔“ احمر نے سنجیدگی سے کہا تو وہ سہم گئی۔ جلدی سے پوچھ بیٹھی۔

”کیا۔۔۔۔۔ کیا کہہ دیا؟“

”انتظار فرمائیے۔۔۔۔۔“ احمر نے پیار بھرے مدھم لہجے میں جواب دیا تو وہ اپنی جگہ پھولوں سے لدی ان کی مانند چپک کر رہ گئی۔

دل کی معصوم دھڑکنوں میں پھر طغیانی آ گئی۔ دراز پلکیں حیا کے بوجھ سے آنکھوں پر چلن بن گئیں۔ دل و دماغ پر ایک پُر کیف سانشہ طاری ہونے لگا۔ وہ اندر ہی اندر پہاڑی جھرنوں کی ند ٹھٹھاٹھی۔ احمر نے کتنی خوب صورتی سے اس کے جواب کی رسید پیش کی تھی۔

وہ اپنے وجود میں کتنی سمٹائی بیٹھی احمر کے جملے کی منٹاس میں کم گئی کہ احمر نے بڑے خوابیدہ لہجے میں اسے آہستہ سے آواز دی۔ ”شانے۔۔۔۔۔“

”جی۔۔۔۔۔“ اس کے گلاب کی پتھڑی جیسے ہونٹ نکپا اٹھے۔

”میں شکر گزار ہوں کہ آپ نے میرے انگوٹھی والے تحفے کو رد نہیں کیا۔“

وہ خاموش بیٹھی اپنے دل کی معصوم دھڑکنوں کو میٹیتی رہی۔ کیا جواب دیتی؟

”میں اپنی منزل کی تلاش میں تمام عمر انتظار کر سکتا ہوں۔“ احمر نے سنجیدگی سے کہا۔ پھر بولے۔

”آپ سے ایک بات کی اجازت اور چاہتا ہوں۔۔۔۔۔“

”کیا۔۔۔۔۔؟“

”اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو۔۔۔۔۔ میں امی جان کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دوں؟“

”کس سلسلے میں؟“ اس نے پہلی بار احمر کو نکھکیوں سے دیکھنے کی کوشش کی۔

”اپنے اور آپ کے مستقبل کے بارے میں۔“

”آپ کو اختیار ہے احمر۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔“

”لیکن کیا۔۔۔۔۔؟“

”میں آپ کی خواہشات کے راستے میں کبھی حارج ہونے کی کوشش نہیں کروں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔“

”شکریہ۔۔۔۔۔“

”ایک آرزو میری بھی ہے۔“ احمر نے ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد سنجیدگی سے کہا۔

”کیا۔۔۔۔۔؟“

”پہلے وعدہ کیجئے کہ آپ مجھے مایوس نہیں کریں گی۔“

”آپ نے اپنی آرزو کا اظہار نہیں کیا اور وعدہ پہلے سے لے رہے ہیں۔“ وہ مدھم آواز میں بولی۔

”مجھے اپنی غلطی کا احساس ہے۔ لیکن آپ اسے میری دیوانگی سمجھ کر معاف کر دیں۔“ احمر جذباتی لگے۔

”بات اگر میرے اختیار کی ہوئی تو میں آپ کو مایوس نہیں کروں گی۔“ اس نے احمر کی بے خودی کو

محسوس کرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

”آپ..... آپ زندگی کے کسی موڑ پر مجھے فراموش تو نہیں کریں گی؟“

شانے مسکراتی نظروں سے احمر کو دیکھا لیکن کوئی جواب نہیں دیا۔

”آپ نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔“ احمر کے لہجے میں فریاد تھی۔

”یہی سوچ رہی ہوں کہ کیا جواب دوں؟“ اُس نے اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”وہ تو میں پہلے کہہ چکی ہوں.....“ وہ مدھر آواز میں بولی۔ ”انتظار فرمائیے.....“

”مجھے اپنی خوش نصیبی پر یقین نہیں آ رہا.....“ احمر نے خوشی سے کہا۔

وہ خاموش بیٹھی احمر کی خوشی کا اندازہ لگاتی رہی..... اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ احمر اسی طرح خود

ناک انداز میں اُس سے گفتگو کرتے رہیں، وہ خاموش بیٹھی اُن کے احساسات کو پیار بھری نظروں

محسوس کرتی رہے..... اور جب احمر تھک مار کر خاموش ہو جائیں تو وہ نظریں جھکا کر انہیں اپنی جگہ

یقین دلانے کی کوشش کرے..... اُن سے کہے..... احمر..... آپ کو کیا معلوم کہ پرسش کسے کہتے ہیں۔

اور یہ کہ عورت زندگی میں صرف ایک بار محبت کرتی ہے۔ کسی کو جسے دل سے چاہتی ہے۔

من مندر میں چھپا کر اُس کی پوجا کرتی ہے..... اگر اپنے محبوب کو پا جیتی ہے تو تمام زندگی اُس

خدمت میں گزار دیتی ہے..... اور اگر مقدر ساتھ نہ دے تو وہ اپنے محبوب کی یادوں کو دل کی اذ

گہرائیوں میں دفن کر لیتی ہے..... ایک مقدس امانت کی طرح..... ایک پاکیزہ جذبے کی طرح۔

جس کا تعلق جسم سے نہیں صرف رُوح سے ہوتا ہے..... رُوح..... جو آلودگیوں سے پاک ہوتی ہے۔

شبہم کے معصوم قطروں کی طرح.....!!

وہ دل ہی دل میں احمر کے تصور سے باتیں کرتی رہی، گاڑی ایک جھٹکے سے رُکی تو حسین خیالات

شیرازہ بھر گیا۔ اُس نے چونک کر دیکھا، گاڑی اُس کے بیٹنگ کے پورٹیکو میں کھڑی تھی۔ جلدی سے

کو سنبھالتی وہ دروازہ کھول کر تیزی سے نیچے اترتی، ایک اچھتی سی نظر احمر پر ڈال کر گھر کے زینے

کرنے لگی۔ اندر داخل ہوئی تو راجیل سے ٹکراتے ٹکراتے پچی جو اُس کے راستے میں آ گیا تھا۔

”سوری.....“ اُس نے راجیل سے معذرت چاہی..... تیز تیز قدم اٹھاتی کتر آ کر آگے نکل گئی۔

اور.....

راجیل کی نظریں اُس وقت تک شان کا تعاقب کرتی رہیں جب تک وہ نگاہوں سے اوچھل نہیں

گئی.....!!



نادیہ پڑھائی میں مصروف تھی، دروازے پر قدموں کی آہٹ سن کر غلط گھائی تو فرحان اپنی ایئر گن

لے مسکراتا ہوا کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ وہ چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے قدرے سخت لہجے

میں بولی۔ ”تم نے پھر اپنی ایئر گن نکال لی.....؟“

”ہی آپ کہاں ہیں.....؟“ فرحان نے نادیہ کی بات نظر انداز کرتے ہوئے سوال کیا۔

”وہ اپنی امی کے پاس ہیں..... لیکن تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“ نادیہ نے تیزی سے کہا۔

کتی بار تمہیں پیار و محبت سے سمجھا چکی ہیں کہ ننھے ننھے معصوم پرندوں کی جان نہ لیا کرو۔ لیکن تم ایک

ان سے سنتے ہو اور دوسرے سے اڑا دیتے ہو۔“

”باجی..... میں تو.....“ فرحان نے کچھ کہنا ابا مگر نادیہ اُسے ڈرانے کی خاطر بگڑتے ہوئے تیور

بولی۔

”ابا جان کو آنے دو..... میں آج تمہاری شکایت ضرور کروں گی۔“

”آپ میری بات تو سن لیجئے.....“ فرحان نے ہانپتے ہوئے احتجاج کیا۔

”نہیں سنوں گی کوئی بات۔“ نادیہ نے اُسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”تم حد سے زیادہ خود مروت ہوتے جا

ہے ہو۔“

”خدا کی قسم نادیہ باجی..... میں چیزوں یا پرندوں کو نشانہ نہیں بنا رہا تھا۔“ فرحان نے قسم کھالی تو

فرحان کی باتوں کا یقین آ گیا۔

”پھر..... تم یقیناً پڑوس والے مکان کے درختوں سے جنگلی بادام توڑنے گئے ہو گے..... مالی نے

ابا تو ہانپتے کانٹے دوڑے چلے آئے۔“ نادیہ نے اس بار قدرے نرم آواز میں بھائی کو سمجھانے کی

شک کی۔ ”تمہیں کب عقل آئے گی..... اب تو اپنی شرارتوں سے باز آ جاؤ..... ابھی ایک ہفتہ بھی

اُن گزرا جب ڈپٹی صاحب نے ابا جان سے تمہاری شکایت کی تھی کہ تم نے پنجرے میں بند اُن کے

ڈنکو کو نشانہ بنا دیا۔“

”وہ میرا دشمن بھی تو تھا۔“ فرحان نے منہ بنا کر جواب دیا۔ ”میں جب بھی بادام کا نشانہ لینے لگتا وہ

چکر آ کر آسمان سر پر اٹھالیتا..... اسی مٹھو کی وجہ سے تو میں ایک روز ڈپٹی صاحب کے مالی کے ہاتھ

تے آئے رہ گیا.....“

”تھک کا واقعہ ہے؟“ نادیہ نے اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے دریافت کیا۔

”مٹھو کے انتقال سے دو روز قبل کا۔“ فرحان نے نہایت سادگی سے کہا۔ ”میں نے بڑی مشکلوں

پائے جیب خرچ سے مالی کو دو روپے دے کر زبان بند رکھنے پر مجبور کیا، ورنہ وہ تو اُسی روز ابا جان

اور تم نے اسی لئے پیارے مٹھو کو گولی کا نشانہ بنا دیا۔“

”نہ مارتا تو اور کیا کرتا..... اُسی کی وجہ سے تو میں مصیبت کا شکار ہوتے ہوتے بچا تھا۔“

”تم نے پوچھا نہیں کہ وہ درخت کے پیچھے چھپے کیا کر رہے تھے؟“ نادیا نے فرحان کی بات میں زور محسوس کرتے ہوئے کہا۔

”پوچھا تھا..... جینپ کر بولے کہ گھبرائی پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔“

”گھبرائی؟“ نادیا نے حیرت سے منہ بنایا۔

”جینپ ہے اسی شوق میں گرفتار ہیں۔“ فرحان بولا۔ ”مجھ سے تو یہی کہہ رہے تھے۔“

”ممکن ہے وہ ٹھیک کہہ رہے ہوں۔“ نادیا بولی۔ ”میری ایک سہیلی کو تتلیاں پکڑنے کا شوق ہے۔“

”وہ تو مجھے بھی ہے.....“

”تمہاری بات اور ہے۔ لیکن میں اپنی جس سہیلی کی بات کر رہی ہوں اُس کا شوق تو دیوانگی اور جنون کی حد تک تھا۔“ نادیا نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔ ”وہ خوبصورت اور معصوم تتلیوں کو پکڑ کر شیشے کی بڑے منہ والی بوتلوں میں بند کر لیتی تھی اور جب وہ دم گھٹ کر مرجائیں تو انہیں بوتل سے نکال کر بڑے بڑے خوبصورت فریووں میں سجایا کرتی۔“

”آپ کی سہیلی کو رحم نہیں آتا تھا پچھاری تتلیوں پر؟“

”اے اے اے شوق کی بات ہے..... اکثر لوگ تو خوبصورت پرندوں اور خوف ناک قسم کے جنگلی پرندوں کو نمیابی عمل کے ذریعے محفوظ کرا کے اپنے کمروں اور ڈرائنگ روم کی خوبصورتی اور سجاوٹ کے لئے استعمال کرتے ہیں۔“

”میں نے بھی اپنے ایک دوست کے سٹڈی روم میں سائڈ ٹیبل پر ایک چتکبرے سانپ کو کنڈلی اڑے بیٹھا دیکھا ہے۔“ فرحان بولا۔ ”پہلی بار تو میں جی جی ڈر گیا، بعد میں پتہ چلا کہ وہ اصلی نہیں بلکہ ٹی ہے۔“

”اچھا..... ہوگا۔“ نادیا نے کہا۔ ”اب تم مجھے بڑھنے دو!“

”سمجھ میں نہیں آتا کہ راجیل بھائی کو گھبرایاں پکڑنے کا شوق کیوں پیدا ہو گیا؟“ فرحان نے بہن سے پوچھا۔ ”گھبریاں تو بازار میں بھی ڈھیر ساری مل جاتی ہیں۔“

”میں کیا غرض ان باتوں سے، راجیل جانیں اور اُن کا شوق۔“ نادیا نے بے پروائی سے کہا۔

”اب کتاب کھولتے ہوئے بولی۔ ”ہو سکتا ہے انہوں نے تمہیں آؤ بیٹانے کی خاطر تقریباً گھبریاں پکڑنے والی بات کہہ دی ہو۔“

”اگر یہ بات ہے تو پھر وہ درخت کی آڑ میں مینڈک کی طرح بیٹھے کیا کر رہے تھے؟“

”میرا سر کیوں کھارے ہو.....“ نادیا نے بیزار سے جواب دیا۔ ”جا کر اپنے راجیل بھائی سے پوچھ لو کہ اصل واقعہ کیا تھا۔“

”باجی..... جلدی اٹھئے، چھت پر چھپکی ریگ رہی ہے۔“

”کہاں.....“ نادیا نے کتاب چھینک کر بستر سے اُٹھتے ہوئے کہا پھر سہی ہوئی نظروں سے چھت کی طرف دیکھنے لگی۔ اور..... فرحان اگر فوراً ہی مسکراتا ہوا کمرے سے باہر نہ بھاگ گیا ہوتا تو اُس کی نظر نہیں مٹتی..... نادیا کچھ دیر تک غصے میں کھڑی دروازے کی طرف دیکھتی رہی، پھر چھوٹے بھائی کی شرارت کو بھول کر دوبارہ پڑھنے میں مصروف ہو گئی.....!!

○ ○ ○

الہ کے آجانے سے گھر کے ہنگاموں میں حسب معمول اضافہ ہو گیا۔ چھوٹے بڑے سب ہی اُس

”بہت بری بات ہے فرحان.....“ نادیا سنجیدگی سے بولی۔ ”معصوم اور پالتو جانوروں پر ہمارے چلانے کا بڑا سخت عذاب ہوتا ہے..... وعدہ کرو کہ آئندہ تم بھی معصوم پرندوں کا نشانہ نہیں لگاؤ گے۔“

”میں نے تو اسی دن کان پکڑ کر توبہ کر لی تھی جب بڑوں والے کانے ڈپٹی صاحب اپنے مٹوکا لے کر ابا جان کے پاس آئے تھے۔“ فرحان نے ایک آنکھ میچھ کر ڈپٹی صاحب کی نقل اتاری تو اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکی۔ پیار سے بولی۔

”اس طرح کسی کی نقل اتارنا بھی اچھی بات نہیں ہوتی۔“

”آپ کی لیسختوں نے تو ناک میں دم کر دیا۔“ فرحان نے نادیا کو مسکراتے دیکھا تو شونی بولا۔ ”میں آپ کو ایک دلچسپ بات بتانے آیا تھا اور آپ لیسختوں کا پتارہ کھول کر بیٹھ گئیں۔“

”کوئی نئی شرارت کی ہوگی.....“

”شرارت نہیں..... حادثہ کیسے حادثہ.....“

”خیریت تو ہے.....؟“

”وہ جو اپنے راجیل بھائی ہیں نا.....“ فرحان نے اپنی ہنسی روکتے ہوئے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

”کیوں..... راجیل صاحب کو کیا ہوا؟“ نادیا نے جلدی سے پوچھا۔

”ہوتے ہوتے رہ گیا.....“ فرحان بولا۔ ”آج مٹوکا بجائے وہ میرا نشانہ بننے بننے رہ گئے۔“

”فرحان..... خبردار! جو تم نے اس قسم کی کوئی سنگین حماقت کرنے کی کوشش کی۔“ نادیا نے کی۔ ”میں تمہیں پہلے بھی کئی بار سمجھا چکی ہوں کہ راجیل ہمارے گھر مہمان ہیں۔ اُن سے بس اتنا تک مذاق کیا کرو جتنا وہ برداشت کر سکیں..... بلاوجہ اگر کوئی بد مزگی ہوگی تو.....“

”بد مزگی تو ہوتے ہوتے رہ گئی۔“ فرحان نے شرارت بھرے انداز میں کہا۔ ”وہ تو خیر گزر دیا مجھے ذم کا خیال آ گیا ورنہ میں تو گولی داغ چکا ہوتا۔“

”کیا مطلب.....؟“

”پتویشن ہی ایسی تھی کہ میری جگہ آپ بھی ہوتیں تو دھوکا کھا جاتیں۔“ فرحان نے مسکراتے ہوئے تفصیل بیان کی۔ ”ایمان سے باجی..... وہ ایک درخت کی آڑ میں اس طرح ڈکے بیٹھے تھے کہ ذرا شست نظر آ رہی تھی..... پہلے تو میں یہی سمجھا کہ ڈپٹی صاحب کے خراٹ ٹامی کی قضا اُسے میچھ کر ہمارے گھر لے آئی ہے، چنانچہ میں نے تاک کر اُس کا نشانہ لیا لیکن ایک دم ٹامی کی ذم کا خیال آیا تو میں لمحے کو رُک گیا..... قسمت اچھی تھی جو اُس وقت راجیل بھائی بھی کپڑے بھاڑتے درخت کی آڑ نمودار ہوئے اور میری اُننگی ایئر گن کی لبلبی پر تھی کی جی رہ گئی..... اگر کہیں میں گولی داغ چکا ہوتا ہوتا.....“

”تمہارا خواب ٹوٹ جاتا اور آنکھ کھلتی تو تم بستر کے نیچے پڑے ہوتے۔“ نادیا نے فرحان کی کوسن گھڑت خیال کرتے ہوئے کہا۔ ”اب تم سیدھی طرح چلتے پھرتے نظر آؤ..... مجھے بڑھنے دو!“

”میں ابھی جا کر امی جان سے.....“

”آپ میری بات کو غلط سمجھ رہی ہیں۔“ فرحان سنجیدگی سے بولا۔ ”ایمان سے باجی..... میں جو کچھ کہا ہے اُس کا ایک ایک حرف درست ہے..... آپ کو میری بات پر یقین نہیں تو خود چل کر راجیل بھائی سے پوچھ لیجئے۔“

دقار احمد نے ہوی کے پیار بھرے غصے کو محسوس کیا تو جلدی سے چھپ اٹھایا اور نہایت سعادت مندی اُٹھ کر بڑیاں کھائی شروع کر دیں۔

کھانے کے دوران حسب معمول صائمہ اور فرحان کے درمیان ٹوک جھونک جاری رہی، راجیل بھی کھانے کے ساتھ ہنسنے مسکرانے میں برابر کا ساتھ دیتے رہے۔ لیکن اُن کی نظریں وہ رہ کر منصور اور دل کے جانب اٹھ رہی تھیں جو آٹے سانے بیٹھے اور ایک دوسرے کو خاموش مگر محبت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ منصور کے برابر احمد بیٹھے تھے۔ اُن کے بعد فرحان تھا اور فرحان کے سیدھے ہاتھ پر ل کی کرسی تھی۔ راجیل کے سامنے شاہی جو زیادہ تر دقار احمد اور شاملہ بیگم کی دلچسپ گفتگو میں حصہ دیتی تھی۔ راجیل کھانے کے دوران میز پر موجود ایک ایک فرد واحد کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیتے لیکن اُن کی توجہ کا مرکز منصور اور نادیہ کی ذات ہی بنی رہی۔

کھانے کے بعد حسب دستور چائے کا دور چلا۔ دقار احمد کے مشورے پر سب لوگ ڈائنگ ٹیبل اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ شاملہ بیگم نے اس مشورے کی تائید بطور خاص اس لئے کی کہ دقار احمد بار بار سویت ڈش کی جانب بڑھنے لگتا اور شاملہ بیگم اُنہیں ٹوکتے ٹوکتے تنگ آ چکی تھیں۔

ڈرائنگ روم میں راجیل نے خاص طور پر منصور کے برابر جگہ حاصل کر لی۔ نادیہ منصور کے ساتھ ہی بیٹھی تھی۔ اُس نے راجیل کے قرب کو بس ایک ٹانے کے لئے محسوس کیا پھر بے تکلفی سے باتوں میں ف ہوئی۔ البتہ شاہی جو سامنے والے صوفے پر صائمہ اور فرحان کے ساتھ بیٹھی تھی بڑی گہری نظروں سے منصور اور راجیل کے چہروں کے تاثرات کا مطالعہ کر رہی تھی۔ اُسے اس بات کا بخوبی علم تھا کہ منصور ایک دوسرے کی ذات میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ وہ یہ بھی محسوس کر رہی تھی کہ راجیل دُلوں کی بے تکلفی سے سخت آزرده خاطر اور دل برداشتہ نظر آ رہے تھے۔ احمد ڈرائنگ روم میں کے بعد دقار احمد اور شاملہ بیگم کے ساتھ بیٹھے نیروی کے بارے میں گفتگو میں مصروف تھے۔ اُن کے اگلیوں باتوں میں فرحان کے لئے دلچسپی کا کوئی پہلو نہیں تھا پھر بھی وہ احمد کی باتیں نہایت دلچسپ سے سن رہا تھا۔ صائمہ نے کام کا ایک رسالہ اٹھا کر اُس کی ورق گردانی شروع کر دی۔

منصور صاحب..... میرا خیال ہے کہ آپ یہ پانے ماڈل کی گاڑی بیچ کر کوئی نئے ماڈل کی اچھی گاڑی لیں۔ نادیہ نے راجیل کو اپنی گفتگو میں دلچسپی لیتا دیکھ کر خاص طور پر کہا شاید اس لئے کہ اُن کو اس بات کا احساس دلانا چاہتی تھی کہ وہ ان کی موجودگی سے خائف نہیں ہے۔

راجیل تو ہے..... لیکن.....

اُن کا کام کر لوں..... اس کے بعد دیکھا جائے گا۔ منصور نے جواب دیا۔

اُن کا کام سے بھلا گاڑی کا کیا تعلق؟ نادیہ نے اس بار براہ راست راجیل کی شخصیت کو حدف ہونے کہا۔ کچھ لوگ ایسے بھی موجود ہیں جو امتحان میں ناکام ہونے کے باوجود نہایت شاندار پائلٹ بنے ٹھانڈے ہاتھ سے گھومتے پھرتے ہیں۔

اُن کا کام مشورہ ہے تو پھر ڈیڑی سے تذکرہ کروں گا اس سلسلے میں۔ منصور نے سادگی سے کہا۔ اُن کی آپ کی اپنی رائے اور ذاتی پسند کو کوئی دخل نہیں؟ راجیل نے منصور سے کہا۔ انسان کی رائے کو اس ہوتی ہے۔ اب مجھ ہی کو دیکھ لیں۔ اُن کی رائے تھا کہ میرے لئے مرشدیز زیادہ بہتر ہے۔ لیکن میں نے انکار کر دیا اور اپنی چوٹس پر اسپورٹس کار خرید لی۔

سے بے پناہ محبت کرتے تھے اور فرحان تو جان چھڑکتا تھا۔ جب تک احمد کا قیام کراچی میں رہتا تو وقت اُن کے ساتھ ساتھ لگا رہتا۔ اسی وجہ سے صائمہ نے اُسے احمد کا چچہ کہہ کر چھینٹنا شروع کر دیا۔ لیکن فرحان کی صحت پر اس قسم کی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ اُس وقت رات کے کھانے بھی وہ احمد کے سیدھے ہاتھ پر موجود تھا۔

شام ڈھلے منصور، نوسابہ بیگم کا کوئی پیغام لے کر خالہ کی طرف آئے تو شاملہ بیگم نے اُنہیں کھانے پر روک لیا۔ غرضیکہ اُس وقت رات کے کھانے پر دلچسپ گفتگو، چھیڑ چھاڑ اور زندگی سے بھرپور قہقہوں کا بازار گرم تھا۔ راجیل بھی سب کے ساتھ شریک تھے۔ بظاہر وہ احمد اور منصور سے بڑی محبت اور خندہ پیشانی سے پیش آ رہے تھے لیکن اندر ہی اندر وہ منصور اور احمد دونوں سے سخت بیرکھتے تھے۔ اُن کی وجہ نادیہ اور شاہی تھیں۔ اور راجیل کے دل میں حسد کی آگ پیدا کرنے کا سبب سمیرا خاتون کی ذرا سی کراچی سے واپسی کے وقت انہوں نے راجیل سے کھلے الفاظ میں شاہی اور نادیہ کے بارے میں گفتگو کی تھی اور اُسے اس بات کا یقین دلا کر گئی تھیں کہ وہ جسے بھی مستقبل میں اپنی زندگی کا ہم سفر، چاہے ایک ماں کی متنا اُسے ہر قیمت پر حاصل کرنے کی کوشش کرے گی۔

راجیل بڑے خاندان کا واحد چشم و چراغ تھا۔ ناز و نعم میں پلا بڑھا تھا، اُسے دنیا کی تمام آسائشیں حاصل تھیں اس لئے ماں کی گفتگو نے اُسے ایک نئی راہ پر ڈال دیا۔ وہ شاہی اور نادیہ کو اپنی جاگیر سمجھنے لگا۔ اُن دونوں میں سے اُسے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا لیکن وہ دیکھ رہا تھا کہ نادیہ کا بھکا و منصور کی جائز ہے اور جب سے احمد نے شاہی کو قیمتی ناپس کا تحفہ دیا تھا وہ شاہی کی طرف سے بھی کھلنے لگا۔ اُسے اس بات بھی سخت ملال تھا کہ شاملہ بیگم نے شاہی کو شاہیہ کے گھر لانے کی خاطر اُس کی پڑ خلوں پیش کش کی تھی۔ خوبصورتی سے ٹال دیا اور احمد کو بھیج دیا..... ہر چند کہ اس میں احمد کا کوئی تصور نہیں تھا لیکن وہ اُس ذات سے بھی پر خاش کھانے لگا۔

دقار احمد آج خلاف توقع بہت زیادہ موڈ میں نظر آ رہے تھے۔ ایک موقع پر جب شاملہ بیگم نے اُن کے سامنے سے مرغ تورے کی ڈش ہٹا کر اُٹھ کر بڑیاں کھا رہی تھی تو وہ مسکرا کر بولے۔ ”ڈال“ نے کھانے پینے کے معاملے میں احتیاط برتنے کو ضرور کہا تھا لیکن یہ آپ نے دال کی ڈش میرے سامنے سے کیوں ہٹائی؟“

”وہ دال کی نہیں، مرغ تورے کی ڈش تھی۔“

”وہی تو میں بھی آپ کو سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ گھر کی مرغی تو دال برابر ہوتی ہے۔ آکھ کر کے دو چار لقمے کھا لینے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

”نہیں ابا جان.....“ شاہی مسکراتے ہوئے بولی۔ ”ابھی آپ زرگی کو فتنے بھی لے چکے ہیں،“

لئے اب مرغ تورے بد پر ہیزی میں شامل ہو جائے گا۔“

”ہائیں!“ دقار احمد نے شاہی کو تعجب سے گھورا۔ ”کیا میں نے تمہیں خاموش رہنے کا اشارہ نہیں کیا تھا؟“

”سلسلے میں.....؟“ شاہی نے معصومیت سے پوچھا تو فرحان بول پڑا۔

”زرگی کو فتنے کے سلسلے میں..... ڈاکٹر صاحب نے ابا جان کو انڈے کا بھی پرہیز تو بتایا ہے۔“

”آب تو بھی بھی بچوں کو بھی مات کر دیتے ہیں۔“ شاملہ بیگم نے فرحان کی بات پر چونکے ہوئے کہا۔ ”جیسی تو میں سوچ رہی تھی کہ آپ کی پلٹ میں چاولوں کی اتنی بھر مار کیسے تھی۔“

”چاولوں کے نیچے تو ابا جان نے زرگی کو فتنہ چھپا رکھا تھا۔“ نادیہ نے ہنسنے ہوئے کہا۔

”میں بھی آپ سے متفق ہوں.....“ منصور نے راجیل کی ٹانگ لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”لیکن میں مجب کی مرضی پیش نظر ہو وہاں تو سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔“
 ”ادوہ.....“ راجیل نے تنکھوں سے نادر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ اور بات ہے۔“
 ”گو یا آپ حالات کے پیش نظر شاعری بھی ہضم کر سکتے ہیں۔“
 نادر اپنی جگہ بیٹھی اندر ہی اندر بیچ و تاب کھا رہی تھی لیکن قل اس کے کہ وہ کچھ کہتی ملازم نے اندر آکر راجیل سے کہا کہ لاہور سے اُس کا فون آیا ہے..... راجیل ”ایلیکٹرونک“ کہتے ہوئے فون پر راجیل سے چلے گئے تو نادر منصور کو گھورتے ہوئے بولی۔
 ”آپ نے اس تھالی کے بیٹن کو منہ لگانے کی کوشش کس خوشی میں فرمائی ہے؟“
 ”وقت کا تقاضہ محسوس کرتے ہوئے۔“
 ”کیا مطلب.....؟“

”اگر آپ برائے نامیں تو ایک حقیقت کا انکشاف کروں؟“
 ”فرمائیے.....“ نادر نے منصور کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔
 ”میرا اندازہ مگر غلط نہیں تو راجیل صاحب آپ کی شخصیت میں دلچسپی لے رہے ہیں۔“ منصور نے زبان میں کہا تو نادر نے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا۔
 ”خدا کی قسم..... اگر راجیل نے بھی حماقت کی کوئی بات کی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔“ وہ غصے سے
 ”میں آپ کو اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔“ منصور نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ایک دو سال کی بات ہے۔
 بل پڑھائی ختم ہو جانے کے بعد واپس لاہور چلے جائیں گے..... اس عرصے میں بلاوجہ اُن کے دل
 راقبت کی آگ بھڑکانے سے کیا فائدہ ہوگا؟“
 ”پھر..... جناب کا کیا مشورہ ہے؟“

”میرا خیال ہے کہ اگر راجیل کسی خوش فہمی میں مبتلا ہیں تو انہیں مبتلا رہنے دیا جائے۔“ منصور نے دلی
 نادمی کہا۔ ”اسی بہانے اگر بیچارے کی تعلیم مکمل ہو جائے تو اس میں بظاہر کوئی حرج بھی نہیں ہے۔“
 ”بے..... چاہے.....؟“ نادر نے منصور کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”گو یا آپ کو اُس ذات
 فیض سے ہم دردی بھی ہے۔“
 ”ہوئی بھی چاہئے۔“ منصور نے مذاق کہا۔ ”وہ غریب آپ کے لئے مرشد بن بھی تو خرید رہا ہے۔“
 ”اب دیکھتے جائیں آپ.....“ نادر ہونٹ چباتے ہوئے بولی۔ ”میں نے بھی اگر اُس بے ذم کے
 کو ناکوں چنے نہ چھوئے تو میرا نام بھی نادیہ نہیں۔“
 لیکن معاملہ صرف مذاق کی حد تک رہے ورنہ میں تو بلا موت مارا جاؤں گا.....“ منصور نے آہستہ
 بخار مے لہجے میں کہا۔
 ”نادر نے منصور کے لہجے کی انانیت کو محسوس کیا تو مسکرا کر رہ گئی..... پھر اُس نے راجیل کو واپس
 نہ دیکھا تو اپنی جگہ سنبھل کر بیٹھ گئی.....!!“

○○○

اردو ہند بانو کی آمد کی اطلاع ملی تو سمیرا خاتون نے صحن میں پہنچ کر بڑے تپاک سے ماں کا خیر مقدم
 ہوسے پیار سے ماں کے گلے میں بائیں ڈال کر نہایت عقیدت سے اُن کی پیشانی کا بوسہ لیا پھر

”آپ کی بات اور ہے راجیل صاحب! لیکن میرا خیال ہے کہ جب تک انسان اپنے بچپن
 پوری طرح جم کر نہ کھڑا ہو جائے اُسے اپنی پسند کو والدین کی خواہشات پر مسلط نہیں کرنا چاہئے۔“
 ”میں آپ کی اس بات سے اتفاق نہیں کرتا۔“ راجیل نے برا سامنے بنا کر کہا۔ ”والدین
 کماتے کس کے لئے ہیں؟ میری مثال لے لیجئے، میری مہم کے پاس کروڑوں روپے موجود ہیں۔
 اُن کا اکوٹا لڑکا ہوں۔ مہم کے شوق کرنے کا زمانہ بھی گزر چکا ہے ایسی صورت میں اگر میں ان روپے
 استعمال میں نہ لاؤں گا تو وہ اور کس کام آئیں گے؟“
 ”آپ کی اسپورٹس کار بھی اب پرانی لگتی ہے۔“ نادیہ نے سنجیدگی سے کہا تو راجیل جلدی
 صوفے پر پہلو بدل کر بولے۔

”آپ نے میرے دل کی بات کہہ دی، میں خود بھی اُسے تبدیل کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔“
 ”میرا خیال ہے کہ اس بار آپ مرشد بن ہی لیں..... بڑی گریس فل کار ہوئی ہے۔ اور سرگرم
 یوں چلتی ہے جیسے پانی پر تیر رہی ہو۔“
 ”ٹھیک ہے.....“ راجیل نے اپنی شان جتاتے ہوئے کہا۔ ”میں کل ہی می کو فون کئے دیتا ہوں
 وہ پہلی فرصت میں نئے ماڈل کی مرشد خرید کر کراچی بھیج دیں۔“
 ”آپ یہ سب میری پسند کی خاطر کریں گے نا؟“ نادیہ نے شوق سے پوچھا۔
 ”جی ہاں..... بالکل!“ راجیل نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تو نادیہ یکلخت سنجیدگی سے بولی
 ”ابھی تو آپ فرما رہے تھے کہ انسان کی اپنی بھی کوئی چواکس ہوتی ہے۔“
 ”جی ہاں..... لیکن کبھی بھی دوسروں کی خاطر قربانی بھی تو دینی پڑتی ہے۔“ راجیل نے
 آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔
 ”جی.....؟“ اُس نے راجیل کو تیز نظروں سے گھورتے ہوئے قدرے ترش لہجے میں
 ”آپ میری خاطر قربانی دیں گے؟“

”آپ میرا مطلب نہیں سمجھیں.....“ راجیل نے شٹاتے ہوئے کہا۔ ”دراصل میں.....“
 ”آپ تو بلاوجہ خفا ہو رہی ہیں۔“ منصور نے نہایت سنجیدگی اور معصومیت سے راجیل کو بکرا
 کی خاطر کہا۔ ”دراصل راجیل صاحب کا مطلب یہ تھا کہ اگر آپ کو مرشد بننے سے توجہ آپ
 خرید لی جائے..... رہا راجیل کا مسئلہ تو وہ اپنی چواکس کے مطابق اسپورٹس کار پر گزرا کرتے رہے؟
 کیوں راجیل صاحب! آپ یہی کہنا چاہ رہے تھے نا؟“
 ”جی.....“ راجیل نے منصور کو ششکلیں نظروں سے دیکھا پھر حسب عادت ٹائی کی گرہ درست
 ہوئے بولے۔ ”جی ہاں..... اگر نادیہ صاحبہ پسند فرمائیں تو یہ بھی ہو سکتا ہے۔“
 ”جج.....“ نادیہ نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے راجیل کو دیکھا۔ ”آپ کہیں مذاق تو نہیں کر رہے؟“
 ”اس میں مذاق کی کیا بات ہے.....“ راجیل نے اپنی امارت کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔
 ”آپ مرشد بن کر بات کر رہی ہیں؟“ منصور نے لقمہ دیا۔ ”راجیل صاحب تو بقول شاعر
 خاطر آسمان کے تارے بھی توڑ سکتے ہیں۔“

”سوری.....“ راجیل نے منصور کی بات کا مفہوم سمجھتے ہوئے تیزی سے کہا۔ ”مجھے شاعر
 مطلق کوئی دلچسپی نہیں۔ بلکہ میں تو شاعرانہ باتیں کرنے والوں کو بھی انتہائی احمق سمجھتا ہوں۔“

ہاتھ تھام کر ڈرائنگ روم میں لے آئیں۔

”کیا ابا جان تشریف نہیں لائے؟“

”ارادہ تو تھا لیکن عین وقت پر کچھ مہمان آ گئے۔ اس لئے.....“

سمیرا خاتون نے کوئی جواب نہیں دیا، ہاتھ مل کر خاموش ہو گئیں۔ جب سے شوہر کا انتقال اور سمیرا خاتون نے باپ کے گھر جا کر بیوگی کی زندگی بسر کرنے کی پیشکش کو ٹھکرا دیا تھا، باپ نے درمیان سرد جنگ کا سلسلہ جاری تھا۔ بس واجبی سا آتا جاتا رہ گیا تھا۔

بھی باپ کی محبت خان بہادر آصف علی کو بیٹی کے گھر تک لے آتی تو وہ گم صم اور چپ رہتے۔ کھانے پینے سے گریز کرتے، بیٹی کو دیکھنے کے بعد دو چار رسمی باتیں کرتے اور کسی کام کا پ کے واپس لوٹ جاتے۔ سمیرا خاتون کے دل میں باپ کو دیکھنے کی خواہش بیدار ہوتی تو وہ آگھر چلی جاتیں اور کچھ دیر بیٹھ کر کچھ کھائے پئے بغیر واپس لوٹ آتیں۔ خان بہادر کے ایک فیصلے نے باپ بیٹی کے رشتے کے درمیان ایک خلیج پیدا کر دی تھی۔ اور..... وقت نے اس خلیج کو بھرنے کی بجائے اور گہرا کر دیا۔

افتخار کی موت نے سمیرا خاتون کے دل میں باپ کی طرف سے جو دراڑ پیدا کر دی تھی وہ کسکی..... وہ چاہتیں تو افتخار کی موت کے بعد طاہر سے شادی کر سکتی تھیں..... اس لئے کہ طاہر نے کیا تھا وہ ابھی تک اُس پر قائم تھا..... اُس نے شادی نہیں کی..... افتخار کی موت پر بھی وہ منناک سے سمیرا خاتون کی بیوگی کے نم میں شریک ہونے آیا..... پھر اپنی ناکام محبت کا حسرت ناک انجا کرواپس چلا گیا.....

وقت کی گردش نے ایک لمحے کے لئے دو محبت کرنے والوں کو یکجا ہونے کا موقع فراہم کیا لیکن..... طاہر نے اس خیال سے ایفاء عہد کا اصرار نہیں کیا کہ وہ سمیرا کے دکھے ہوئے دل ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتے تھے..... اور..... سمیرا اس لئے خاموش رہیں کہ قدرت نے انہیں بیوگی کے ساتھ ساتھ اولاد کی نعمت سے بھی نوازا تھا.....

فرض اور محبت کے درمیان کچھ دنوں تک رسہ کشی جاری رہی..... پھر فرض جیت گیا..... محبت کو فرض کے نہاں خانوں میں دفن کر کے اولاد کی پرورش کے فرض کو اپنایا.....

اس وقت بھی باپ کے نہ آنے سے سمیرا خاتون کے دل کو ایک خفیف سا جھک لگا لیکن وہ حالات نے انہیں دکھ سینے اور غموں کو ہنس ہنس کر برداشت کرنے کا عادی بنا دیا تھا۔ جلدی بنا کر بولیں۔ ”آپ بھی اتنے دنوں بعد آئی ہیں..... اب میں آپ کو دو چار دنوں سے پہلے نہ ڈوں گی۔“

”بہت دنوں سے آنے کا سوچ رہی تھی لیکن ایک تو بیمار و زیت اور مہمان داری سے فرصت نہ دوسرے تمہارے والد کی طبیعت بھی پچھلے دنوں کچھ شراب تھی۔“

”کیا ہوا ابا جان کو.....؟“ سمیرا خاتون نے تڑپ کر پوچھا۔ باپ کی بیماری کی خبر سن کر وہ ہو گئیں۔

”سب سے بڑا روگ تو بڑھاپے کا ہے۔“ ارجمند بانو نے بیٹی کے چہرے کے تاثرات کرتے ہوئے کہا پھر بولیں۔ ”زیادہ کام کاج سے اب اُن کی صحت بھی متاثر ہونے لگی ہے۔“

”کوئی خاص بات تو نہیں تھی؟“

”فلو ہو گیا تھا..... اب خدا کا شکر ہے کہ طبیعت پہلے سے بہتر ہے۔“

”جب اتنے ڈھیر سارے نوکر چاکر اور ملازم موجود ہیں تو ابا جان کو کام کرنے کی کیا ضرورت ہے؟“ عمرانی تو بہر حال کرنی پڑتی ہے۔ اور پھر ملنے ملنے والوں کا تانتا جو بندھا رہتا ہے۔ اس سے بے پروائی کا اثر ہوتا ہے وہ علیحدہ ہے۔ کسی کو ملنے جلنے سے منع بھی تو نہیں کیا جاسکتا۔

”آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“ سمیرا خاتون نے ماں کے قریب بیٹھے ہوئے بڑے لاڈ سے پوچھا۔

”خدا کا شکر ہے..... تم سناؤ، کاروبار کیسا چل رہا ہے؟“

”آپ بزرگوں کی دعا ہے امی حضور!“

”رائیل کا بھی کوئی خط آیا.....؟“ ارجمند بانو نے دریافت کیا۔

”دیکھنے کے معاملے میں تو وہ ہمیشہ سے بہت کامل واقع ہوا ہے۔ البتہ فون برابر آتے رہتے ہیں۔“

”پڑھائی کا سلسلہ کیسا چل رہا ہے؟“

”اُس کا علم تو نتیجہ آنے کے بعد ہی ہوگا۔“ سمیرا خاتون نے کہا۔ ”دیے میرا خیال ہے کہ کراچی س کادل پڑھائی میں لگ گیا ہے۔ اگر خدا کو منظور ہوا تو ضرور کامیاب ہوگا۔“

”انشاء اللہ.....“ ارجمند بانو نے جلدی سے کہا پھر کچھ توقف سے بولیں۔ ”دراصل میں اس وقت کے سلسلے میں آئی تھی۔“

”خیریت تو ہے؟“

”ٹھانور نادیہ کے سلسلے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“ ارجمند بانو نے کہا۔ ”میری نظر میں تو دونوں ہی ہیں۔ نادیہ ذرا شوخ و چٹیل سی ہے اور ٹھانور بار بار اور سنجیدہ۔“

”اُمی تو رائیل پڑھ رہا ہے امی حضور!“ سمیرا خاتون نے بات ٹالنے کی خاطر کہا۔

”تو میں کب کہتی ہوں ہتھیلی پر سرسوں جمانے کے لئے؟“ ارجمند بانو بولیں۔ ”اچھے رشتے بھی اسے نہیں ملتے۔ اگر وقار احمد اور ثناء بیگم کے کان میں بات ڈال دی جائے تو اس میں بظاہر کوئی گئی نہیں ہے۔ خاموش رہنے میں یہ خدشہ ہے کہ اگر کل کلاں کو دو دنوں بچپوں کا رشتہ کہیں اور طے تو پھر ہمارا کوئی زور نہیں چل سکے گا۔ رہا شادی کا مسئلہ تو وہ رائیل کے تعلیم مکمل کر لینے کے بعد ہے گی۔“

”آپ کا فرمانا بجا ہے لیکن.....“

”لیکن کیا.....؟ ایسے نیک کاموں میں دیر نہیں کرنی چاہئے۔“

جلدی کرنے کے نتائج بھی کچھ زیادہ اچھے ثابت نہیں ہوتے۔“ سمیرا خاتون نے ہونٹ چباتے کہا تو ارجمند بانو سنبھل کر بولیں۔

”تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا ہمیں اس کا افسوس ہے۔ لیکن دنیا میں کوئی باپ اپنی اولاد کے دشمن ہوتے..... ہم نے تو اپنی طرف سے تمہارے مستقبل کو سنوارنے کی کوشش کی تھی..... تقدیر کا پانسہ لیا تو اس میں.....“

”میں اسی لئے جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتی۔“

”پھر بھی..... تمہاری اپنی کوئی پسند تو ہوگی۔“

”جہاں تک میری پسند کا تعلق ہے تو مجھے شابہتر لگی۔ لیکن میں نے رائیل کا جھکاؤ نادیہ کی طرف کیا ہے۔“

نثار احمد کو قدرت نے دونوں ہاتھوں سے نواز رکھا تھا..... وہ نیروبی میں ہیرے جواہرات کے سب سے بڑے تاجر سمجھے جاتے، اُن کے پاس دولت اور جائیداد کی بھی کوئی کمی نہیں تھی لیکن زندگی کی ان باتوں کے باوجود اُن کے اندر تکبر یا امارت کا احساس برائے نام بھی نہیں تھا، جس سے بھی ملتے جھکت رہا تھا یا رومیت سے ملتے اور یہ احساس نہ ہونے دیتے کہ وہ کتنی بڑی شخصیت کے مالک ہیں..... کاروباری معاملات میں بھی وہ نہایت دیانت دار واقع ہوئے تھے اور شاید یہی وجہ تھی کہ اگر منی کو لیا تھا لگاتے تو وہ بھی سونا بن جاتی۔ دنیا داری کے ساتھ ساتھ نثار احمد کو دین داری کا بھی ہمیشہ خیال تھا۔ نماز، روزے کے علاوہ خیرات، زکوٰۃ بھی دل کھول کر کرتے۔ مخیر بھی اس قدر واقع ہوئے تھے کہ اگر کوئی سوالی یا ضرورت مند اُن کے در تک آ جاتا تو بھی خالی ہاتھ واپس نہیں لوٹتا تھا۔

نثار احمد کی طرح فوزیہ خاتون بھی اپنی مثال آپ تھیں۔ اپنی ذات سے بے حد ملنسار، خوش مزاج، رفاقتس واقع ہوتی تھیں۔ کسی کا دل دکھانا سب سے بڑا گناہ سمجھتیں، سب کو ایک نظر سے دیکھتیں، نبی میں وہ بھی شوہر سے کسی طرح کم نہیں۔ بے شمار قیمتیوں اور بیواؤں کے ماہانہ وظیفے باندھ رکھے تھے، کسی غریب لڑکی کی شادی ہوتی تو اُس کے بندوبست اور جہیز وغیرہ کے معاملے میں بھی بڑھ چڑھ کر مدد دیتیں لیکن جہاں اُن میں اتنی ساری خوبیاں تھیں وہاں ایک کمزوری بھی تھی، رشتے ناتے کے اہل مل وہ خاندانی حسب و نسب اور بھروسے کو بڑی اہمیت دیتیں۔

نثار احمد اور فوزیہ خاتون دونوں کے چہیتے تھے۔ اس لئے جہاں انہیں باپ کی طرف سے بہت اہمات حاصل تھیں وہاں ماں کی متا اور لاڈ چار بھی میسر تھا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ باپ کے دربار میں پوری طرح دلچسپی لے رہے تھے۔ باہر کی منڈیوں میں مال پہنچانا اور اُس کی قیمت وصول کرنا ہی کے ذمے تھا چنانچہ وہ زیادہ تر نیروبی سے باہر ہی رہتے۔

فوزیہ خاتون کو بیٹے کا اس طرح دنیا جہاں میں مارے مارے پھرنا پسند نہیں تھا..... احمر اُن کا خون انہیں اولاد کے چال چلن اور کردار پر پورا اعتماد اور یقین تھا لیکن یہ بھی منظور نہ تھا کہ احمر اتنے اُن تک اُن کی نگاہوں سے دور رہیں۔ فوزیہ خاتون کے علاوہ نثار احمد کی بھی یہی خواہش تھی کہ احمر نیروبی میں ہی تک کر بیٹھیں اور پورے کاروبار کو سنبھالیں۔ نیروبی منڈیوں میں پھیرا لگانے کے لئے رہی قابل اعتماد اور سختی ملازم موجود تھے لیکن احمر کو ایک جگہ جم کر بیٹھنا پسند نہیں تھا..... شاید اس لئے انہیں سیاحت کا زیادہ شوق تھا..... یا اس لئے کہ وہ اپنے اوپر کوئی پابندی پسند نہیں کرنا چاہتے تھے۔ یا اس کی وجہ شاید یہ ہو سکتی تھی جسے وہ پہلی ہی نظر میں اپنا دل ہار بیٹھے تھے.....!!

اس بار بھی انہیں نیروبی سے گئے چار ماہ سے زیادہ ہو چکے تھے۔ ماں باپ سے دور رہنے کے بعد وہ جہاں بھی ہوتے والدین کو اپنی نقل و حرکت اور کاروباری معاملات سے برابر آگاہ کرتے رہتے۔ ابھی ایک لمحے کو بھی گھر کی طرف سے غافل نہ ہوتے اور ہر طرح سے ماں باپ کا خیال رکھتے، لیکن اُن کی عزم عدولی نہ کرتے۔ یہ اور بات ہے کہ جب کوئی بات مزاج کے خلاف ہوتی تو بڑی بھڑکی سے یا تو کترا کر نکل جاتے یا پھر کوئی ایسا درمیانی راستہ اختیار کرتے کہ نہ اپنے ذہن پر کوئی ریت نہ دوسرے کو احساس ہونے دیتے۔

نثار احمد کو اپنی کاروباری مصروفیات کی وجہ سے بیٹے کی دوری کا اتنا احساس نہیں تھا جتنا فوزیہ اُن کو اُس کی کمی شدت سے محسوس کرتیں۔ ایک دو بار انہوں نے شوہر کو اس بات کا مشورہ بھی دیا کہ اس کے بیچوں میں بیڑی ڈال کر گھر گھر ہستی کے معاملات میں الجھا دیا جائے لیکن ازل تو کوئی مناسب

”تمہارے باپ نے مجھے اس لئے بھیجا ہے کہ میں تمہارا عندیہ معلوم کر سکوں۔ اس کے بعد براست و قار احمد سے بات کر لیں گے۔“ ارجمند بانو نے بیٹی کی مرضی معلوم ہو جانے کے بعد قدر کا اظہار کیا۔ ”نادیہ بھی بہت خوب ہے۔ اُس کے آجانے سے تمہارے گھر میں رونق بھی ہو جائے گی۔“

”ابا جان کو راجیل کی شادی کا خیال کیسے آگیا..... میرا مطلب ہے کہ اتنی جلدی.....“

”ہم تمہارے ماں باپ ہیں سیرا.....“ ارجمند بانو نے کہا۔ ”ہم نے تمہاری نظروں کو اُم بھانپ لیا تھا جب تم پروفیسر جمال احمد کی دعوت میں اُن دونوں بچوں میں دلچسپی لے رہی تھیں۔ سیرا خاتون نے نظر بھر کر ماں کو دیکھا لیکن کوئی جواب نہیں دیا..... شاید ماں کے جملے نے ماضی کے زخموں کو چھیڑ دیا تھا۔“

”پھر کیا مشورہ ہے تمہارا..... نادیہ کے لئے بات شروع کی جائے؟“

”جب تک راجیل کی طرف سے کوئی جواب نہ ملے، میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی۔“

”کیا مطلب.....؟“ ارجمند بانو نے وضاحت طلب لہجے میں پوچھا۔

”میں راجیل کی خواہش پر اپنا کوئی آخری فیصلہ مسلط نہیں کروں گی۔“ سیرا خاتون نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”کراچی سے آتے وقت میں اُسے شاد اور نادیہ کے سلسلے میں مکمل اعتبار دے آئی، اس کے علاوہ بھی راجیل جہاں چاہے شادی کر سکتا ہے۔ میں اولاد کی خوشیوں کے درمیان کم نہیں ہوں گی۔“

”تم نے شاید ابھی تک ہماری غلطیوں کو معاف نہیں کیا.....“ ارجمند بانو نے ڈکھی لہجے میں ”میں نے آپ سے کبھی کوئی شکوہ..... کوئی شکایت نہیں کی۔“ سیرا خاتون نے غلامی ہوئے کہا۔ ”ابا جان نے جب اپنا فیصلہ سنایا تو میں نے اپنا سر تسلیم خم کر دیا تھا۔ انہیں باپ“

ناتے مجھ پر پورا پورا اختیار تھا۔ اب وہی اختیار مجھے حاصل ہے..... میں نے راجیل کو پورا جوان کیا ہے..... میں اُس کی ماں بھی ہوں اور باپ بھی لیکن..... میں اُسے زندگی کا سا بھی جو کے سلسلے میں مکمل آزادی دوں گی۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے اسی حضور.....!“

”تمہارے باپ کو اپنے فیصلے پر شرمندگی ہے.....“

”جو ہوتا تھا ہو چکا..... اب ان باتوں سے کیا حاصل؟“

”میں..... واپس جا کر تمہارے باپ کو کیا جواب دوں گی؟“ ارجمند بانو نے بھیجی ہوئی کہا..... ”انہوں نے تو بڑے ارمانوں سے راجیل کے سر پر سہرا دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔“

”میری بھی یہی خواہش ہے کہ راجیل پڑھ لکھ کر اپنا گھر آباد کر لے۔“ سیرا خاتون نے درد کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ ابا جان سے کہہ دیجئے کہ راجیل کا جواب ملتے ہی میں کر دوں گی، اس کے بعد وہ بڑے شوق سے وقار احمد سے بات ملے کر لیں۔“

”ہمارے لئے یہی بہت ہوگا۔“ ارجمند بانو حسرت بھرے لہجے میں بولیں۔

”نادی حضور..... کیا آپ بھی مجھ سے خائف ہیں؟“

”سیرا..... میری بیٹی.....“ ارجمند بانو کا دل بھرا ہوا تھا، بیٹی کی بات سن کر اپنے جذبات سکین اور بے اختیار اُسے گلے لگا کر سادون بھادوں کی طرح برسنے لگیں۔

سیرا خاتون کی آنکھوں سے بھی اشک رواں تھے.....!!

رشتہ اُن کی نظر میں نہیں تھا اور دوسرے یہ کہ ایک آدھ لڑکیاں جو فوزیہ خاتون کی نظر میں تھیں اور نسب اور ہجرے کے اعتبار سے اس قابل نہیں تھیں کہ بہو کی حیثیت سے اُن کے معیار پر پوری اُتر بہر حال! انہیں ہر وقت یہی فکر لاحق رہتی کہ کسی طرح احمر کا گھر بسا دیں تاکہ وہ اُن کی نظروں نہ رہے۔ یوں بھی احمر اُن کا اکلوتا لڑکا تھا جس کے قریب نہ ہونے سے گھر سونا سونا لگتا تھا۔ اور نہ جانے کیوں انہیں بیٹے کی یاد بڑی شدت سے آ رہی تھی۔

نثار احمد رات گئے واپس آئے تو فوزیہ خاتون نے حسب معمول مسکراتی نظروں سے اُن کا استقبال کیا۔ پھر جب وہ کھانے سے فارغ ہو کر آرام کرنے کی غرض سے لیٹے تو فوزیہ خاتون نے اہم چھیڑتے ہوئے کہا۔ ”اس بار تو احمر نے حد کر دی..... چار مہینے سے واپس نہیں لوٹا۔“

”میرا خیال ہے کہ ابھی اُسے ہفتہ عشرہ اور لگے گا۔“

”آپ کو کیسے معلوم؟“

”آج اُس کا فون آیا تھا.....“ نثار احمد بولے۔ ”دقار کے یہاں مقیم ہے۔“

”سنا ہے دقار بھائی نے کوئی فیکٹری بھی خرید لی ہے۔“

”خان بہادر آصف علی یاد ہیں آپ کو.....؟“

”نام کچھ سنا لگ رہا ہے۔“

”پیشینی نواب اور رئیس واقع ہوئے ہیں..... اصل رشتہ تو مجھے نہیں معلوم لیکن یہ ضرور جانتا ہمارا اُن کی کچھ دُور پرے کی قرابت داری ہوتی ہے۔“ نثار احمد نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

”کیا جلال بھائی کے ساتھ مل کر خان بہادر صاحب سے کسی فیکٹری کا سودا کیا ہے۔ احمر تار ہا تھا خاصا کاروبار چل رہا ہے۔“

”کیا جلال بھائی مستقل طور پر پاکستان منتقل ہو گئے ہیں؟“

”یہی سنا ہے۔“

”خان بہادر صاحب کی کوئی لڑکی بھی ہے.....؟“ فوزیہ خاتون نے اچانک پوچھا تو نثار

کر بولے۔

”جی ہاں..... ہے تو سہی۔“

”یہ آپ مسکرا کیوں رہے ہیں.....؟“

”آپ نے جس انداز میں سوال کیا، اس پر ہنسی آگئی۔“

”کیوں..... کیا میں نے کوئی غلط بات دریافت کر لی.....؟“

”یہ میں نے کب کیا.....؟“ نثار احمد نے بیوی کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

تفتیش اپنی جگہ درست تھی لیکن شاید آپ کو یہ سن کر یقیناً افسوس ہو گا کہ خان بہادر آصف علی کی زادی نہ صرف یہ کہ شادی شدہ ہیں بلکہ احمر کے تقریباً ہم عمر ایک لڑکے کی ماں بھی ہیں۔

”آپ نے احمر کے بارے میں کیا سوچا ہے.....؟“

”کس سلسلے میں؟“ نثار احمد نے انجان جتے ہوئے بڑی مصحوبیت سے پوچھا۔ حالانکہ

مقصود بخوبی سمجھ رہے تھے۔

”شادی کر کے گھر بسانے کے سلسلے میں۔“ فوزیہ خاتون بولیں۔ ”مجھے اب اُس کا آئے

دُور رہنا مناسب نہیں لگتا.....“

”ہماری دلی بات تو خیر اپنی جگہ ہے لیکن یہ گھر سے دُور رہنے میں کیا حرج ہے؟“

”بھئی لڑکے کی عمر پر بھی غور کیا ہے..... خدار کے تیس سال کا ہے اور یہ عمر اتنی بچی بھی نہیں ہوتی

لڑکوں کو اس طرح آزادی سے تمام دنیا گھومنے پھرنے کی کھلی چھٹی دے دی جائے۔“

”میں سمجھا نہیں آپ کا اشارہ..... کیا آپ کو بیٹے پر اعتماد نہیں؟“

”بات اعتماد کی نہیں..... لیکن اس عمر میں بھیکتے دیر بھی نہیں لگتی۔“ فوزیہ خاتون نے کہا۔ ”میرا تو

بال ہے کہ اب احمر کی شادی کہیں طے کر دینی چاہیے۔“

”اُنکی جلدی کیا ہے.....؟ دو چار سال تو اُسے اور گھوم بھر لینے دیجئے، شادی بھی ہو جائے گی۔“

”آپ تو یوں کہہ رہے ہیں جیسے شادی کرنا بھی گڈے لڑکیوں کا کھیل ہے..... یہ بات درست ہے

ابھی احمر کی شادی میں کوئی جلدی نہیں ہونی چاہئے لیکن اُس کے لئے اگر ابھی سے کوئی مقول رشتہ

اُن کر لیا جائے تو کیا حرج ہے؟“

”کوئی لڑکی ہے آپ کی نظر میں؟“ نثار احمد نے قدرے سنجیدگی سے پوچھا۔

”یہاں..... اپنوں سے دُور بیٹھ کر رشتہ کہاں تلاش کیا جاسکتا ہے..... ایک دو لڑکیاں ہیں بھی تو

بِنب کے اعتبار سے مناسب نہیں۔“

”ایک لڑکی میری نظر میں ہے لیکن شاید آپ کو پسند نہ آئے۔“

”وہ کون ہے.....؟“

”اُسے ڈیڑھ ہائی کمشرفر گون صاحب کی لڑکی مونیکا.....“

”نام تو میں چل گیا آپ کا.....“ فوزیہ خاتون جلدی سے بولیں۔ ”میں اور کوئی فرنگن بیاہ کر

ل..... میرے جیتے جی ایسا کبھی ممکن نہیں ہو سکتا۔“

”میں تو یوں ہی مذاق کر رہا تھا اور آپ سچ مچ خفا ہو گئیں۔“

”بات کئی بھی خفا ہونے والی..... ایسی بات تو میں مذاق میں بھی برداشت نہیں کر سکتی۔“

”پھر کچھ دن اور صبر سے کام لیجئے، اس کے بعد بہو تلاش کرنے کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔“

”وہ کس طرح؟“

”مجھے بھی وطن سے دُور ہوئے ایک زمانہ بیت گیا۔“ نثار احمد بولے۔ ”سوچ رہا ہوں چند مہینوں

لے نیردلی سے باہر نکلوں۔ دقار اور شاکلہ بھی ہر خط میں اصرار کرتے ہیں۔“

”ایک بات کہوں.....؟“

”کیا.....؟“

”مجھے دقار بھائی کا گھر بہت اچھا لگتا ہے۔“ فوزیہ خاتون نے کہا۔ ”شاکلہ کا برتاؤ تو مجھ سے سگی

لے سے بھی زیادہ اچھا ہے۔“

”میرا خیال بھی اسی طرف تھا لیکن میں نے کبھی اس کا تذکرہ اس لئے نہیں کیا کہ کہیں آپ یہ نہ

کہا کہ اپنی بیٹیوں کی تعریف کر رہا ہوں۔“

”کوئی بات نہ ہوئی۔ جو چیز بھلی ہو، اُس کی تعریف تو بہر حال کی جائے گی۔“

”میرا فخر نہ ہوئی..... جب پاکستان چلیں گے تو دقار سے یہ مسئلہ بھی طے کر لیا جائے گا۔“

”نثار ایک بات میں ابھی سے آپ کے گوش گزار کئے دیتی ہوں۔“ فوزیہ خاتون بولیں۔ ”مجھے

احمر کے لئے نادیہ زیادہ پسند ہے، بلکہ میں تو کہتی ہوں کہ آپ ابھی سے وقار بھائی کے کان میں ڈال دیں تاکہ وہ ہمیں اور سلسلہ نہ چھینیں۔“

”کیا نانا آپ کو پسند نہیں؟“ نثار احمد نے بیوی سے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”میں نے اُسے برا بھی نہیں کہا، لیکن نادیہ مجھے زیادہ اچھی لگتی ہے۔“

”ہمیں اُن بچیوں کو دیکھئے جہے سات سال ہو گئے۔ یقین سے کیا کہا جاسکتا ہے کہ نثار اور نادیہ کیا تبدیلیاں رونما ہو چکی ہوں گی۔“

”کیوں..... کیا آپ نے وہ تصویر نہیں دیکھی جو شاملہ نے ابھی دو ماہ پیشتر بھیجی تھی۔ مجھے تو میں بھی نادیہ بہتر لگتی ہے۔“

نثار احمد نے کوئی جواب نہیں دیا، کسی سوچ میں مستغرق ہو گئے.....!!

○○○

سبزے پر مولسری کے درخت کے نیچے بیٹھی وہ یوں ہی ایک ریسالے کی ورق گردانی میں مگھی تھی، ہوا میں خشکی زیادہ تھی، اس لئے دھوپ بڑی خوش گوار لگ رہی تھی۔ شاملہ بیگم اپنے کمرے بہتر آن کے لحاف میں ڈبکی لیٹی تھیں۔ گھر میں کوئی بھی تو نہیں تھا جس کے ساتھ وہ وقت گزارا جیل اور نادیہ کالج گئے ہوئے تھے، صائمہ اور فرحان اپنے اپنے سکول جا چکے تھے، احمر شاید اُم اپنے کمرے میں موجود تھے۔

سبزے پر آنے سے پیشتر وہ ماں کے کمرے میں گئی تو اُسے ہنسی آگئی، سردی اتنی شدت کی تھی کہ بہتر جلانے کی نوبت آئی۔ اس خیال سے کہ کہیں ماں سو نہ رہی ہو وہ دبے قدموں داخلہ ارادے سے پٹی لیکن شاملہ بیگم نے آواز دی تو تھک کر رُک گئی۔

”خیریت تو ہے امی جان.....؟“ وہ ماں کے قریب جا کر بیٹھ گئی۔ بڑے شائستہ لہجے میں ”آج خلاف معمول آپ ابھی تک کمرے سے باہر نہیں نکلیں، خدا نخواستہ کہیں دشمنوں کی طبیعت تو نہیں ہے؟“

”رات سے بدن ٹوٹ رہا ہے۔ سر میں بھی بلا کا درد ہے۔“ شاملہ بیگم نے اپنی کیفیت کا کرتے ہوئے کہا۔ ”رات کچھ سردی زیادہ تھی اور کچھ خدا غارت کرے ان چمچروں کو جنہوں نے کمر لگی تھی۔ تمہارے باپ نے چمچروں سے بچنے کے لئے پکھا چلا لیا۔ صبح میری آنکھ بھی اُس دن جب وہ دفتر جا چکے تھے۔ خدا جانے ٹھیک سے ناشتہ بھی کیا یا نہیں.....“

”عبدال سے دریافت کیا آپ نے؟“

”وہ تو یہی کہہ رہا تھا کہ ناشتہ گرا دیا ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ آپ اسپرین کی ایک گولی لے لیں۔“ نثار نے ماں کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”تھکن اور سردی کے اثرات ہیں۔ کچھ دیر آرام کرنے سے طبیعت بحال ہو جائے گی۔ اُس نے جلدی سے اُنھ کو کھانا کھلائی۔“

”باہر کی کیا حالت ہے؟“ شاملہ بیگم نے گولی کھانے کے بعد پوچھا، پھر شاکشاوار قبضہ ہوئی۔ ”تم نے کوئی گرم لباس نہیں پہنا..... اور کچھ نہیں تو کوئی اونی شال عا ہوئی..... سردی لگتے دیر نہیں لگتی۔“

”آج تو موسم بے حد خوشگوار ہے امی جان.....“ نثار نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”آپ ذرا باا

”ہاں.....“ شاملہ بیگم نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں کیا خبر، صبح جب اُن سردی سے تھر تھرا کر رہی تھی۔ وقت کا احساس ہی نہیں تھا۔ بمشکل اُنھ کو پکھا بند کیا.....“

لڑنے کے بعد سے جسم کو کچھ آرام ملا ہے۔“

”اب کچھ دیر سولیں..... آرام کرنے سے طبیعت پر خوشگوار اثر پڑے گا۔“

نثار احمد نے دوپہر کے کھانے کے بارے میں تاکید کر دینا..... شاملہ نے لحاف میں ڈبکے کو ضروری ہدایات دیں پھر بولیں۔ ”خاص طور سے اپنے باپ کے لئے بخنی کی تاکید ضرور کر دو روز سے وہ بھی احتیاط نہیں کر رہے۔“

نثار نے گھبرا کر پوچھا۔ ”ابا جان کو کیا ہوا.....؟“

”میں درد کی شکایت ہے اور رات سے کھانسی بھی شروع ہو گئی.....“ شاملہ بیگم نے لحاف کو جسم لپیٹتے ہوئے کہا۔ ”ایک نوہ اپنے آگے کسی کی بات نہیں مانتے..... دو روز سے برابر کہہ رہی تھی ڈاکٹر کو دکھا دیجئے، لیکن ہر بار ہاں، ہوں میں ٹال جاتے ہیں۔ کوئی بچہ ہو تو انسان زبردستی لے بھی جائے..... کام کی مصروفیات کی وجہ سے آرام بھی نہیں کرتے۔“

”اب فکر نہ کریں، میں عبدال کو ہر بات کی تاکید کر دوں گی، اور آج شام ابا جان کو بھی ڈاکٹر کے لے جاؤں گی۔“

”ہمارے کہنے سے شاید تیار ہو جائیں..... مجھے تو ہنسی میں ہال جاتے ہیں۔“

”ملک ہے..... آپ آرام کریں.....“ وہ جانے کے لئے اُنھی تو شاملہ بیگم نے اُسے دوبارہ ٹوکا۔ ”وہ گرم لباس ضرور پہن لو..... ٹھنڈ لگتے دیر بھی نہیں لگتی۔“

”ال سے وعدہ کر کے باہر آگئی۔ اپنے کمرے میں جا کر اُس نے موسم کے اعتبار سے سرمی رنگ کا مانی اونی شال نکالی، پھر سیدی باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ عبدال کو دوپہر کے کھانے کے سلسلے میں ضروری ہدایات دینے کے بعد وہ سبزے پر آگئی جہاں کھلی ہوئی دھوپ اور خشکی کے دم بے حد رومانٹک ہو رہا تھا۔ کچھ دیر تک وہ کیار یوں میں تازہ کھلے پھولوں کو دیکھتی رہی پھر اُس نے کول کر اُس کی ورق گردانی شروع کر دی۔ وقت گزاری کے لئے اُس کے سوا اور کرنی بھی تو

ماں کے پاس اس خیال سے زیادہ دیر نہیں بیٹھی کہ اُن کے آرام میں خلل پڑے گا۔

نثار احمد کو گول میز پر دونوں بیروں کے رسالے کے ورق الٹی پلٹی رہی۔ پھر کار کی آواز سن کر نظر کھما کر دیکھا تو احمر گاڑی سے اتر رہے تھے۔ باپ کی گاڑی کو دیکھ کر اُس کی طبیعت ایک لڑکھانہ ہو گئی، شاید اُن کی طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب ہو گئی جیسی تو احمر اُنہیں چھوڑنے گئے تھے۔ ”ڈرائیور؟“ کہاں مر گیا کجھت..... نثار نے سوچا کیا وہ نہیں جاسکتا تھا جو احمر کو تکلیف اٹھانی اُسے ڈرائیور پر غصہ آگیا لیکن غصے کی یہ کیفیت زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکی۔ اُسے یاد آگیا کہ

دوسری گاڑی پر نادیہ کو کالج چھوڑنے جاتا ہے۔

پسے نادیہ کے کالج کھلتے تھے، وقار احمد کے معمول میں حسب سابق تبدیلی آگئی تھی۔ ڈرائیور کاٹا اور سکول چھوڑنے جانے لگا اور وہ اپنی گاڑی خود ہی ڈرائیو کرنے لگے۔

نثار نے طرف آتا دیکھ کر وہ جلدی سے سنبھل کر بیٹھ گئی۔ اُسے رہ کر اپنے باپ کا خیال پریشان

اور کو تو شاعروں نے بے ساختگی کا نام دیا ہے.....“ امر شوخی سے بولے۔ ”آپ کو جو کہتا تھا
اُمیں اور یہ احساس بھی نہیں ہوا کہ کیا کہا۔“
اُس نے ایک حقیقت کا اظہار کیا تھا۔ ”ثانے اپنے جملے کو یاد کیا تو شرما کر بولی۔ ”آپ کو
یہاں آئے کچھ زیادہ دن تو نہیں ہوئے۔“

”جی ہاں.....“ امر نے اُسے سر تا پا بہت غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ کو یہ خیال کیا
خدا نخواستہ چچا جان کی طبیعت علیل ہوگی؟“
”امی جان بتا رہی تھیں کہ دو روز سے ابا جان کے سینے میں درد ہے اور پھر.....“ وہ بولے
اچانک خاموش ہو گئی۔ کسی اندرونی احساس نے اُس کی دراز پلکوں کے گوشے نمناک کر دیئے۔
”ارے..... آپ تو باقاعدہ رونے کا سارٹ لینے والی ہیں۔“ امر نے ثنا کی کیفیت کو محسوس
ہوئے کہا۔ ”میری بات کا یقین کیجئے! چچا جان کی طبیعت بفضل تعالیٰ بالکل ٹھیک ہے۔“

”پھر آپ انہیں چھوڑنے کیوں گئے تھے.....؟“ ثنا نے آہستہ سے پوچھا، پھر دوپٹے کے
سے ہینک پکلیں خشک کرنے لگی۔
”اوہ.....“ امر نے معاملے کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے کہا پھر کچھ توقف سے بولے۔ ”مجھے
سے کچھ ضروری باتیں کرنا تھیں، اور گاڑی کی بھی ضرورت تھی اس لئے میں انہیں چھوڑنے چلا
ڈرائیور کو صبح ہی ہدایت کر دی تھی کہ وہ بچوں کو چھوڑنے کے بعد فیکٹری چلا جائے۔“

”آپ کو ابا جان سے کیا ضروری بات کرنا تھی؟“ ثنا نے چونکتے ہوئے دریافت کیا،
چہرے پر بکھری ہوئی کمبیر سنجیدگی دیکھ کر نہ جانے کیوں اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔
”مجھے آج بازار سے کچھ ضروری خرید و فروخت کرنی تھی، اس لئے میں نے چچا جان سے
کے لئے گاڑی اُدھار مانگ لی ہے۔“

”آپ چاہتے تو ڈرائیور کے ساتھ بھی جاسکتے تھے۔“ ثنا بولی۔ ”دوپہر کو نادیہ اور بچوں کو
پک بھی کر لیتے۔“

”یہ خیال آیا تھا مجھے لیکن.....“
”لیکن کیا.....؟“
”میں نے آپ کو بتایا..... مجھے چچا جان سے کچھ ضروری باتیں بھی کرنی تھیں۔“
”کوئی کاروباری معاملہ ہوگا۔“

”جی نہیں.....“ امر نے مختصر جواب دیا تو اُس کی بے چینی اور بڑھ گئی۔
”اور کیا بات ہو سکتی ہے؟“
”میں دو چار روز بعد واپس جا رہا ہوں۔“ امر نے بدستور سنجیدگی سے کہا۔ ”اس بار گھر
چار مہینے سے زیادہ ہو گئے۔“

”اتنی جلدی.....؟“ وہ روائی میں کہہ گئی۔ ”ابھی تو آپ کو آئے زیادہ دن بھی نہیں ہوئے۔“
”مجھے آپ کے اس جملے سے بڑی تقویت محسوس ہوئی۔“
”جی.....؟“ اُس نے چونک کر امر کی جانب دیکھا۔
امر کی نگاہوں میں اُمید کے سینکڑوں چراغ روشن نظر آ رہے تھے۔
”خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے آپ نے کسی بات کا اقرار تو کیا۔“

”میں نے کیا کہا.....؟“ اُس نے بڑی معصومیت سے سوال کیا۔
”اگر وہ مجھے اپنی فرزندگی میں قبول کر لیں تو میں اپنے آپ کو دُنیا کا سب سے زیادہ خوش
انسان تصور کروں گا.....“ امر نے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”میں نے کوئی غلط
مانی.....؟“

”آپ.....“ ثنا اُس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی، کچھ اور نہ بن پڑا تو دوپٹے کے کونے کو ہاتھ
سلائی لگی۔

”اگر اعتراض نہ ہو تو میں بھی کچھ دیر کے لئے یہاں بیٹھ جاؤں؟“
”بڑے شوق سے تشریف رکھئے.....“ اُس نے کہا، پھر جلدی سے پوچھ بیٹھی۔ ”ابا جان کی ہل
ٹھیک ہے نا؟“

”جی ہاں.....“ امر نے اُسے سر تا پا بہت غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ کو یہ خیال کیا
خدا نخواستہ چچا جان کی طبیعت علیل ہوگی؟“

”امی جان بتا رہی تھیں کہ دو روز سے ابا جان کے سینے میں درد ہے اور پھر.....“ وہ بولے
اچانک خاموش ہو گئی۔ کسی اندرونی احساس نے اُس کی دراز پلکوں کے گوشے نمناک کر دیئے۔
”ارے..... آپ تو باقاعدہ رونے کا سارٹ لینے والی ہیں۔“ امر نے ثنا کی کیفیت کو محسوس
ہوئے کہا۔ ”میری بات کا یقین کیجئے! چچا جان کی طبیعت بفضل تعالیٰ بالکل ٹھیک ہے۔“

”پھر آپ انہیں چھوڑنے کیوں گئے تھے.....؟“ ثنا نے آہستہ سے پوچھا، پھر دوپٹے کے
سے ہینک پکلیں خشک کرنے لگی۔
”اوہ.....“ امر نے معاملے کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے کہا پھر کچھ توقف سے بولے۔ ”مجھے
سے کچھ ضروری باتیں کرنا تھیں، اور گاڑی کی بھی ضرورت تھی اس لئے میں انہیں چھوڑنے چلا
ڈرائیور کو صبح ہی ہدایت کر دی تھی کہ وہ بچوں کو چھوڑنے کے بعد فیکٹری چلا جائے۔“

”آپ کو ابا جان سے کیا ضروری بات کرنا تھی؟“ ثنا نے چونکتے ہوئے دریافت کیا،
چہرے پر بکھری ہوئی کمبیر سنجیدگی دیکھ کر نہ جانے کیوں اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔
”مجھے آج بازار سے کچھ ضروری خرید و فروخت کرنی تھی، اس لئے میں نے چچا جان سے
کے لئے گاڑی اُدھار مانگ لی ہے۔“

”آپ چاہتے تو ڈرائیور کے ساتھ بھی جاسکتے تھے۔“ ثنا بولی۔ ”دوپہر کو نادیہ اور بچوں کو
پک بھی کر لیتے۔“

”یہ خیال آیا تھا مجھے لیکن.....“
”لیکن کیا.....؟“
”میں نے آپ کو بتایا..... مجھے چچا جان سے کچھ ضروری باتیں بھی کرنی تھیں۔“
”کوئی کاروباری معاملہ ہوگا۔“

”جی نہیں.....“ امر نے مختصر جواب دیا تو اُس کی بے چینی اور بڑھ گئی۔
”اور کیا بات ہو سکتی ہے؟“
”میں دو چار روز بعد واپس جا رہا ہوں۔“ امر نے بدستور سنجیدگی سے کہا۔ ”اس بار گھر
چار مہینے سے زیادہ ہو گئے۔“

”اتنی جلدی.....؟“ وہ روائی میں کہہ گئی۔ ”ابھی تو آپ کو آئے زیادہ دن بھی نہیں ہوئے۔“
”مجھے آپ کے اس جملے سے بڑی تقویت محسوس ہوئی۔“
”جی.....؟“ اُس نے چونک کر امر کی جانب دیکھا۔
امر کی نگاہوں میں اُمید کے سینکڑوں چراغ روشن نظر آ رہے تھے۔
”خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے آپ نے کسی بات کا اقرار تو کیا۔“

”میں نے کیا کہا.....؟“ اُس نے بڑی معصومیت سے سوال کیا۔

ایہ بات چہرے پر لئے وہ جانے کے ارادے سے تیزی سے اٹھی تو احمر نے پہلی بار بڑی بے تکلفی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے، تنہا کی رفتار تیز ہونے لگی۔

”کیا میری درخواست کا یہی جواب ہے؟“
 احمر کی گرفت اتنی مضبوط نہیں تھی کہ اگر چاہتی تو اپنا ہاتھ نہ چھڑا سکتی۔ لیکن وہ عجیب محضے میں گرفتار تھا، اسے احمر کی دلجوئی بھی منظور تھی اور اس خیال سے بھی پانی پانی ہوئی جارہی تھی کہ اگر ماں نے سچ کہا تو اس کی مرضی دریافت کی تو وہ کیا جواب دے گی..... کیسے نظر ملا سکے گی گھر والوں سے..... احمر نے بے چارے کی شکل مشکل امتحان سے دوچار کر دیا تھا۔

”کیا..... میری طرف دیکھیں!“ احمر کے لہجے میں التجا تھی، وہ انکار نہ کر سکی، آہستہ سے گھوم کر دیکھا احمر کی آنکھوں میں شوخی اور محبت رقصاں تھیں۔ وہ احمر کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھنے لگی۔

”کیا آپ احمر کو اتنا ہی جذباتی تصور کرتی ہیں؟“

”تو کیا.....؟“ وہ سوالیہ انداز میں کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

”میں تو صرف آپ کو چھیڑ رہا تھا.....“

”اور میرے اوپر قیامت گزر گئی.....“ ثناء نے اطمینان کا سانس لے کر کہا پھر آہستہ سے احمر سے چھڑا کر اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”میں نے اتنی دیر میں نہ جانے کیا کیا فیصلے کر لئے تھے۔“
 ”مثلاً.....؟“ احمر نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

”یہی کہ اگر امی جان مجھ سے دریافت کرتیں تو میں صاف مکر جاتی۔“ ثناء نے بے پروائی سے اب دیا۔

”اور میرا کیا ہوتا.....؟“

”آپ کو اپنے کئے کی سزا بھگتنی پڑتی..... اور کیا ہوتا؟“ وہ شوخی سے بولی۔

”میں جواہرات کی تجارت کرتا ہوں..... ہیرے کی قدر و قیمت بخوبی جانتا ہوں، پھر آپ نے یہ بے سوچ لیا کہ میں اپنی زندگی کے سب سے نایاب اور انمول ہیرے کو جذبات میں آکر کھو بیٹھنے کی افکروں کا؟“

”کیا دھرا ہے ہیرے میں.....؟“ وہ ڈالی پر لپکتے مہکتے پھولوں کی طرف دیکھ کر آہستہ سے بولی۔
 ”لوگوں تو ہوتا ہے.....“

”اس مٹی کے بارے میں کیا خیال ہے جو خوب صورت اور حسین پھولوں کو جنم دیتی ہے۔“

”پھول تو صرف ڈالی پر حسین لگتا ہے..... اس کا مٹی سے کیا تعلق؟“

”بہت گہرا تعلق ہے..... آپ جس ڈالی کی بات کر رہی ہیں اس کی جڑیں مٹی کی گہرائی میں ہی دفن ہیں۔“

”آپ نے یہ بیٹھے بٹھائے جانے کا ارادہ کیسے کر لیا؟“ ثناء نے شاعرانہ گفتگو سے کترانے کی خاطر ال کیا۔

”آپ کہیں تو نہ جاؤں.....“

”میں بھلا کون ہوتی ہوں آپ کو روکنے والی.....“ وہ ایک شان بے نیازی سے بولی۔

”اپنے دل کی دھڑکنوں سے بوجھ کر جواب دیجئے..... شاید ہمارے درمیان کوئی گہرا تعلق موجود ہے..... احمر نے بے باک انداز میں کہا تو وہ شرما کر رہ گئی۔ چہرہ تپ کر گلزار ہوا تو حسن کی رعنائیاں اور

احمر اس کی پریشانی کا اندازہ لگا کر دل ہی دل میں محفوظ ہو رہے تھے۔ اس کی کشمکش کا اندازہ ہونے دہی زبان سے بولے۔ ”اعتراف محبت کو ارتکاب جرم کا نام نہیں دیا جاسکتا..... پھر بھی اگر میری جسارت سے کوئی ڈھک، کوئی صدمہ پہنچا ہے تو میں اس کے لئے معافی کا خواستگار ہوں۔“

”احمر..... آپ سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟“ اس نے سہمے ہوئے حسین انداز میں کہا جان میرے بارے میں کیا خیال کریں گے..... میں کیا منہ لے کر ان کے سامنے جاؤں گی..... کو حالات کا علم ہوگا تو وہ میرے بارے میں کیا رائے قائم کریں گی؟“

”محبت کرنے والے ان چھوٹے چھوٹے طوفانوں سے نہیں ڈرا کرتے.....“

”آپ مرد ہیں..... اس لئے ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے لیکن میں.....“

”میں نے سچا جان سے دست بستہ اپنی دیرینہ خواہش کا اظہار کیا ہے..... آپ کو مکمل آزاد تھا!“ احمر جذباتی ہو گئے۔ ”اگر آپ کو میری ذات سے منسوب ہونا منظور نہیں تو آپ..... انکار سکتی ہیں۔“

”احمر.....“ اس نے بڑی بے بسی اور بے چینی کی کیفیتوں سے دوچار ہو کر احمر کی طرف دھونٹ کاٹنے لگی۔

”ثناء.....“ احمر نے کچھ توقف کے بعد اسے آہستہ سے مخاطب کیا۔

”جی.....؟“

”کیا آپ مجھ سے خفا ہیں؟“

”چچی جان کی بات اور ہوتی احمر! لیکن آپ کو اب جان سے.....“ وہ اس سے آگے نہ کہہ سکی، تقاضوں نے اس کی قوت گویائی سلب کر لی۔

”ایک بات کہوں؟“

”کہئے!“

”چچا جان نے میری جسارت کا برا نہیں مانا.....“

وہ خاموش بیٹھی احمر کی باتیں سنتی رہی۔ عجیب شش و پنج میں مبتلا ہو کر رہ گئی تھی۔ اسے احمر کی توقع نہیں تھی کہ وہ اچانک اس قدر جذباتی ہو کر دل کی بات زبان تک لے آئیں گے کیسے سمجھائی کہ شادی بیاہ ایک مقدس اور پاکیزہ رشتے کا نام ہوتا ہے جسے بزرگ بیٹھ کر نہیں، اگر ایسا نہ ہو تو پھر مشرق و مغرب کی تہذیب میں فرق ہی کیا رہ جاتا ہے اور پھر احمر کو اتنی؟ کیا تھی۔ دو بدو بات کرنے کی بجائے وہ نیروبی جا کر والدین کے ذریعے بات کو آگے بڑھا لیکن.....

”میرا اندازہ اگر غلط نہیں تو چچا جان بھی مجھے پسند کرتے ہیں.....“

وہ بدستور خاموش بیٹھی رہی.....

”جانتی ہیں انہوں نے میری بات کا کیا جواب دیا.....؟“

”میں کیا بتا سکتی ہوں.....؟“ وہ ساٹ لہجے میں بولی۔ اسے احمر کی حماقت پر غصہ آنے لگا۔ ”وہ آج ہی چچی جان کے ذریعے آپ سے آپ کی مرضی دریافت کریں گے اور پھر.....“

میری درخواست کا جواب مل جائے گا۔“

ثناء کو آنے والے لمحوں کا احساس ہوا تو اس کی پریشانی دو چند ہو گئی۔ گہرا ہٹ اور ابھن

نکھر گئیں۔

”آج میں نے زندگی میں ایک نیا تجربہ کیا ہے۔“ احمر نے ثنا کے چہرے پر پھونسنے والی شبنم قرمزی رنگوں کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

”وہ کیا.....؟“

”یہی کہ حسن شرمندہ باہر ہم ہو تو اور نکھر جاتا ہے۔“

اُس نے چونک کر احمر کی جانب دیکھا پھر چھوٹی موٹی کے معصوم پودے کی مانند خود اپنے وجود سمٹ کر رہ گئی۔ احمر کے جملے کی گونج اُس کے دل کی گہرائیوں میں صدائے بازگشت بن کر بہت دیر اُبھرتی رہی.....!



دارہ، کرنل عابد کی اکلوتی بیٹی تھی۔ بچپن میں ماں کے انتقال کے بعد سے اُس کی پرورش کی ذمہ داری کرنل عابد پر آ پڑی۔ وہ بہت آزاد خیال اور مغربی تہذیب کے دلدادہ واقع ہوئے تھے اس دارہ کو پروان چڑھانے کے سلسلے میں بھی اُنہوں نے بھی ان اقدار کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دی جو تہذیب اور روایات کی جان بھی جاتی ہیں چنانچہ نادرہ کی تربیت جس ماحول میں ہوئی وہ انتہائی اور مغربی تہذیب کا گہوارہ تھا۔

اپ کی طرف سے پہننے اوڑھنے، گھومنے پھرنے اور کسی دوسرے معاملے میں کبھی کسی قسم کی روک تھام ہوئی اس لئے نادرہ کو ہر قسم کی آزادی حاصل تھی۔ کونوٹ کی تعلیم نے اُسے حد درجہ پیماک رہنا دیا تھا۔ لڑکوں کے ساتھ گھومنا پھرتا اور سیر سپاٹے کرنا اُس کے نزدیک کوئی معیوب بات نہیں قدرت نے اُسے حسن کی دولت سے بھی دل کھول کر مالا مال کر رکھا تھا۔

وہ بڑے باپ کی بیٹی بھی اس لئے اُس کا حلقہ احباب بھی خاصا وسیع تھا۔ وہ باپ کے دوستوں کے ہی ہمیشہ میل مل کر باتیں کرتی، جہاں چاہتی آتی جاتی، باپ کی طرف سے اُس کے اوپر کسی قسم کی ٹوک نہیں تھی لیکن اس کے باوجود وہ باپ کے مزاج سے بخوبی واقف تھی۔ وہ آزاد خیال ہونے کے ساتھ انتہائی سخت گیر طبیعت کے مالک بھی تھے۔ فوجی زندگی کی سخت جدوجہد اور محاذ جنگ پر اُس کے ساتھ جنگ لڑتے لڑتے زندگی کے نشیب و فراز سے بھی بخوبی واقف تھے۔ وہ جانتے تھے مہارت کون سی چال دشمن کی بازی مات کرنے کے لئے مؤثر ثابت ہو سکتی ہے اور کون سی غلطی ماباط پلٹ کر رکھ دیتی ہے۔

لیدر بھی جبھی کہ نادرہ نے ہر معاملے میں آزاد خیال ہونے کے باوجود خود کو ہمیشہ لئے دیئے رکھا۔ خاص حد سے تجاوز کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ باپ کی کشادہ پیشانی پر ایک مل ایک لمحے میں حالات اور ماحول کی نوعیت کو بدل ڈالنے کے لئے کافی ہوتا ہے اس لئے نے بھی باپ کی طرف سے ملی ہوئی مکمل آزادی سے کوئی غلط فائدہ اُٹھانے کی کوشش نہیں کی..... اس کی روش اختیار نہیں کی جو باپ کی ناراضگی کا سبب بنتی۔ وہ کسی آزاد چھچی کی طرح اپنی شوخ اور افسانوں اور زندگی سے بھرپور فہم ہوں سے فضاؤں اور محفلوں میں رنگ بکھیرتی رہتی لیکن کبھی یہ محسوس نہ کہ کوئی اُس کی باتوں سے غلط نتیجہ اخذ کر رہا ہے یا آگے بڑھنے کی جرات کر رہا ہے تو وہ ایسی اور سب سے بڑی کا مظاہرہ کرنے کی صلاحیت بھی رکھتی تھی کہ دوسرے فریق کی ہمت جواب دے

دارہ کی سہیلیوں کی فہرست بھی خاصی طویل تھی لیکن نادیہ اُس کی سب سے زیادہ قریبی اور بے دوست تھی۔ دونوں کی طبیعتوں میں بھی بڑی حد تک یکسانیت پائی جاتی تھی البتہ لباس کے میں نادرہ زیادہ آزاد خیال واقع ہوئی تھی۔ بہر حال نادرہ اور نادیہ کے درمیان بہت گامی چھٹی کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ دونوں پڑوس میں رہتی تھیں اور دوسری وجہ یہ تھی کہ کرنل عابد اور وقار

احمد کے درمیان بھی ہمیشہ سے خوشگوار تعلقات استوار تھے۔ پڑوسی ہونے کے ناتے بھی دوسرے کے دکھ درد اور خوشیوں میں برابر کے شریک رہتے۔

شام کے وقت نادیہ اور نادرہ ایک ساتھ ہی ہوں، کبھی نادیہ اُس کی طرف چلی جاتی اور کبھی جاتی۔ دونوں ہم جماعت تھیں اس لئے تعلیم کے معاملے میں بھی ایک دوسرے سے استفادہ کرتی رہتی۔ شائلہ بیگم چونکہ لڑکیوں کی تہذیب اور اُن کی تربیت کے معاملے میں ہمیشہ سے بہت محتاط ہوئی تھیں اس لئے شروع شروع میں انہیں نادیہ اور نادرہ کی دوستی پسند نہیں آئی لیکن جب انہیں نادرہ کو بہت قریب سے دیکھا اور اُس کے حالات کا علم ہوا تو وہ بھی اُس سے پیار کرنے لگیں۔ انہیں نادرہ کی کسی بات سے اگر اختلاف تھا تو وہ اُس مغربی طرز کے لباس سے، جسے وہ بہت ذوق سے پہننے کی عادی تھی۔

آج بھی نادیہ سے ملنے کے لئے آئی تو اُس نے گرے گلر کی چٹلون اور اُسی کی مناسبت سے ڈھالی سیک ڈیزائن کی شرٹ پہن رکھی تھی، کپٹے بالوں کو اُس نے پونی ٹیل کے انداز میں سنوارا تھا۔ اچھی خاصی چلتی پھرتی گڑیا سی لگ رہی تھی۔ حسب معمول اُس نے سب سے پہلے شائلہ بیگم پاس جا کر انہیں سلام کیا پھر مسکرانے لگی۔ اُسے معلوم تھا کہ شائلہ بیگم اُس کے لباس پر کوئی نہ کوئی ضرور کریں گی۔

”خدا نظر بد سے بچائے۔ میری بنی بڑی پیاری لگ رہی ہے لیکن.....“
”یہ مغربی طرز کا فصول سا لباس میری بنی کو زیب نہیں دیتا۔“ نادرہ نے جلدی سے جملہ کرتے ہوئے کہا۔ ”کیوں آئی..... آپ پہلی کہنے والی تھیں نا؟“
”یہ بات نہیں ہے۔ لیکن مجھے تم شلوار قمیض میں زیادہ خوبصورت لگتی ہو۔“ شائلہ بیگم نے پیار اُس کے شانوں پر ہاتھ بھیرتے ہوئے جواب دیا۔

”اچھا آئی! وعدہ..... آئندہ سے آپ کے سامنے ہمیشہ شلوار قمیض ہی میں آؤں گی۔“
”یہ وعدہ تم نے پچھلی بار بھی کیا تھا۔“
”سوری آئی..... جلدی میں بھی اس لئے یاد نہیں رہا۔“ وہ شوخی سے بولی۔ پھر جلدی سے اِدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”نادیہ کہاں ہے؟ نظر نہیں آ رہی۔“
”میرا خیال ہے اپنے کمرے میں ہوگی۔“
”میں دیکھنے لیتی ہوں.....“

وہ نادیہ کے کمرے میں چلی گئی جہاں فرحان، نادیہ، صائمہ اور احمد کمر کھیلنے میں مصروف تھے۔ قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھی اُن کے درمیان ہونے والی دلچسپ گفتگو سے لطف اندوز ہو رہی فرحان حسب معمول کھیل کے دوران بھی شرارت سے باز نہیں آ رہا تھا۔ احمد اُس کے پارٹنر تھے اُن اُن کا بلہ صائمہ اور نادیہ پر بھاری تھا۔ چنانچہ نادیہ نے نادرہ کو کمرے میں داخل ہوئے دیکھا تو اسے ہاتھ مار کر کھیل بگاڑتے ہوئے بولی۔ ”جاؤ میں نہیں ہیتی.....“

”یہ تو کھلی دھاندلی ہے۔“ فرحان نے احتجاج کیا۔ ”جب آپ شرط ہارنے لگیں تو کھیل بگاڑا اور تم جو بے ایمانی کر رہے تھے۔“ نادیہ نے جواب دیا۔ ”پچھلی بار تم نے کون کون ہاتھ قریب کر لیا ورنہ تمہارے فرشتے بھی اُسے پاٹ نہیں سکتے تھے۔“
”بڑی آپا..... آپ ایمانداری سے بتائیں!“ فرحان نے شاکی طرف دیکھتے ہوئے انصاف

پایم نے کون کو چھو بھی تھا؟“
”میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔“ صائمہ بولی۔ ”تم کھیل میں ہمیشہ اسی قسم کی حرکتیں کرتے ہو۔“

”آپ بتائیے احمد بھائی!“ نادیہ نے احمد کی طرف دیکھا۔ ”آپ کو قسم ہے جو غلط بیانی سے کام فرحان نے کون پاٹ کرنے میں بے ایمانی کی تھی یا نہیں؟“
”میرا خیال ہے کہ اس کا فیصلہ جج صاحبہ کریں تو زیادہ مناسب ہوگا۔“ احمد نے مسکرا کر شاکی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”فرحان میاں چونکہ میرے پارٹنر ہیں اس لئے ہو سکتا ہے کہ میں جانبداری سے کام

لے۔“ شرط کس بات کی تھی؟“ نادرہ نے اندر داخل ہوتے ہوئے سوال کیا تو نادرہ احمد کے علاوہ فرحان اُس کی جانب متوجہ ہو گئے۔

”نادرہ باجی.....“ فرحان نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”آپ کی سیمپلی شرط ہارنے لگیں تو کھیل بگاڑا۔ اس روز لڈو میں بھی یہی ہوا تھا۔“
”اُس روز بھی تم نے دھاندلی کی تھی.....“ صائمہ نے نادیہ کا ساتھ دیتے ہوئے کہا۔ ”چار آیا تھا اُن نے انگلی مار کر پانسہ ملٹ دیا۔“

”وہ تو اتفاق سے انگلی لگ گئی تھی..... میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا تھا۔“ فرحان نے ہمت سے جواب دیا۔

”یہ تمہاری پرانی عادت ہے..... جب بے ایمانی کرتے ہوئے پکڑے جاتے ہو تو یہی کہتے ہو کہ لے لے ہاتھ لگ گیا۔“

”فرحان.....“ نادرہ نے جو فرحان کی شرارتوں سے بخوبی واقف تھی، اُسے شوخ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”شرط کس بات کی لگی تھی؟“

”دوسرے مٹھائی اور گرما گرم سموسوں کی۔“

”جب کھیل کا فیصلہ ہی نہیں ہوا تو پھر شرط کیسی.....؟“ نادیہ نے کپڑے جھاڑ کر اٹھتے ہوئے کہا۔

”میرا خیال ہے ٹاس کر لیا جائے.....“ نادرہ نے تجویز پیش کی۔ ”وہ پارٹی جو ٹاس جیت جائے نا کو فتح قرار دیا جائے گا۔“

”اور ہم نے جو اپنی مشکل سے چوبیس پوائنٹ بنائے تھے اُس کا کیا ہوگا؟“ فرحان نے احتجاج کیا۔

”آٹھ پوائنٹ ہمارے بھی تو تھے۔“ صائمہ بولی۔

”ٹاس میں چھپیں کیا اعتراض ہے؟“ نادرہ نے دریافت کیا۔

”کیوں احمد بھائی..... آپ کا کیا شورہ ہے؟“ فرحان نے جلدی سے احمد کی طرف دیکھا۔

”میرا خیال ہے کہ جس کے آنے کی وجہ سے کھیل بگاڑا گیا ہے، شرط اُسی کو پوری کرنی چاہئے۔“
”اسے پیار سے نادرہ کی طرف دیکھا۔“
”گویا آپ مجھے یہاں آنے کی سزا دے رہے ہیں۔“ نادرہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

پوچھا۔ ”شرارت کی ابتداء کس کی جانب سے ہوئی تھی؟“
 ”میرا فیصلہ ہے کہ شرط کی مٹھائی اور سمو سے ضرور آنے چاہئیں لیکن.....“ شا کچھ کہتے کہتے خام ہو گئی۔

”لیکن کیا.....؟“ فرحان نے جلدی سے پوچھا۔
 ”غلطی چونکہ دونوں فریق کی بھی اس لئے دونوں کو برابر کا خیا زہ بھگتنا چاہئے۔“ شانے نے خوبصورتی نے احمر کی بات کا جواب دیتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔
 ”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ فرحان نے بحث کرتے ہوئے کہا۔ ”یا تو کھیل پورا کیا جائے یا جو پارہ تھے اُس کی بنیاد پر شرط پر خرچ ہونے والی رقم کا فیصلہ کیا جائے۔“
 ”شکل دیکھی ہے آپ نے میں.....؟“ نادیہ بولی۔ ”بڑے آئے پوائنٹ کی بنیاد پر رقم کا ہزارہ کر والے۔“

”اچھا بابا..... یہ بحث اب ختم کرو!“ نادرہ بولی۔ ”میرا مشورہ ہے کہ باہر چل کر کھلی نفاذ بیڈ منٹن کھیلا جائے۔ رہا مٹھائی اور سمو سے کا معاملہ تو وہ احمر بھائی کے کہنے پر میرے ذمے۔“
 ”کیوں..... تمہیں کیا ضرورت ہے شرط پوری کرنے کی؟“ نادیہ نے نادرہ کو آنکھ مارتے ہو کہا۔ ”مٹھائی قاعدے سے احمر بھائی کو منگوانی چاہئے اس لئے کہ وہ ہم سب سے بڑے بھی ہیں فرحان کے پارٹنر بھی تھے۔“

”یہ تو وہی مثال ہوئی کہ زبردست کا ٹھیکہ گسر پر۔“ فرحان بولا۔
 ”تمہارے سر پر تو نہیں ہے..... پھر تم کیوں شور مچا رہے ہو؟“ صائمہ نے کہا۔
 ”میں احمر بھائی کا پارٹنر جو ہوں.....“ فرحان نے جواب دیا۔ ”اگر فیصلہ ہی کرنا ہے تو نئے سر سے کھیل شروع کر لیا جائے۔“

”چھوڑو پارٹنر!“ احمر نے فرحان کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”کبھی کبھی بچوں کی بات بھی مان لینی چاہئے۔“
 ”آپ کچھ بھی کہیں لیکن شرط بہر حال آپ کو پوری کرنی ہوگی۔“ نادیہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

احمر مسکرا دیئے۔
 پھر سب لوگ باہر لان میں آ گئے جہاں بیت کی آرام کرسیاں بڑے سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔
 نے ڈرائیور کو پیسے دے کر مٹھائی اور سمو سے لانے کو روانہ کر دیا۔ نادرہ اور نادیہ کے درمیان بیڈ منٹن کھیل شروع ہو گیا جس میں ریفری کے فرائض فرحان انجام دے رہا تھا۔ احمر اور شا قریب قریب کھیل دیکھنے میں مصروف تھے۔

کچھ دیر بعد منصور بھی ماں کے ساتھ آ گئے۔ شانہ بیگم بچوں سے مل کر اندر چلی گئیں اور منصور کے قریب بیٹھ گئے۔ نادرہ اور نادیہ کے درمیان ایک ایک پوائنٹ پر شدید جدوجہد جاری تھی۔ بھی نا ایک پوائنٹ سے جیتنے لگی اور بھی نادرہ پوائنٹ برابر کر کے اُس سے آگے نکل جاتی۔ ابھی کھیل کا سلسلہ جاری تھا کہ راجیل بھی انکی سے نکل کر لان کی طرف آ گئے۔ یہ اتفاق تھا کہ نادرہ نے صرف نادیہ کی زبانی راجیل کے بارے میں سن رکھا تھا، بھی دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا چنانچہ اُس کھیل کے دوران ہی نادیہ سے پوچھا۔

”کیا یہ وہی راجیل صاحب ہیں جنہوں نے انکی میں ڈیرہ جمار کھا ہے؟“
 ”ٹھیک پہچانتا م نے.....“ نادیہ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

راجیل نے قریب آ کر کرسیوں پر بیٹھے ہوئے افراد کا جائزہ لیا پھر شا کے برابر جا کر بیٹھ گئے۔
 ”کون جیت رہا ہے؟“

”ابھی تک تو نادرہ کا پلہ بھاری ہے۔“ شانے نے راجیل کو بتایا۔
 ”کوئی نئی خاتون معلوم ہوئی ہیں۔“

”آپ نے شاید پہلی بار دیکھا ہے۔ ورنہ ہمارے پڑوس میں ایک زمانے سے رہتی ہے..... نادیہ بڑی عزیز سہیلی ہے۔“

”بڑی ماڈرن معلوم ہوتی ہیں۔“
 ”جی نہیں.....“ شانے نے جلدی سے کہا۔ ”بڑی شائستہ اور بے حد مہذب لڑکی ہے..... البتہ لباس

جاملے میں کچھ آزاد خیال ضرور ہے۔“
 ”ان کے والد کیا کرتے ہیں؟“

”نٹری کے ریشاڑڈ کرٹل ہیں..... کرٹل عابد۔“ شانے اکتائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔
 ”کرٹل عابد.....“ راجیل نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”کیا یہ شروع سے یہیں آباد ہیں یا.....؟“

”میرا خیال ہے کہ آپ باقی تفصیل خود نادرہ سے دریافت کر لیں..... مجھے کرٹل اٹکل کے بارے اتنی تفصیل نہیں معلوم۔ صرف اتنا جانتی ہوں کہ گزشتہ بارہ تیرہ سال سے ہمارے پڑوس ہی میں

آئی ہیں۔“
 ”فصل میں صرف ایک پوائنٹ باقی رہ گیا تھا جس کے لئے نادرہ اور نادیہ شدید جدوجہد کر رہی

تھا، پھر نادرہ جیت گئی۔ دونوں سہیلیاں پسینے میں شرابور ہو رہی تھیں، سستانے کی خاطر کورٹ کی راجیل نے کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔ راجیل کی نظر یں بار بار اُن دونوں کی جانب اٹھ رہی تھیں۔

”آئیے احمر بھائی..... اب ہمارا اور آپ کا ایک گیم ہو جائے۔“ فرحان نے کہا۔
 ”سوری پارٹنر..... اس وقت موڈ نہیں ہو رہا۔“

”کیا خیال ہے؟“ اس بار فرحان نے سرگوشی کی۔ ”مرغ لڑا دیئے جائیں؟“
 ”کیا مطلب.....؟“ احمر نے پوچھا۔

”اب ہمارے راجیل بھائی اور منصور بھائی میں مقابلہ ہوگا۔“ فرحان نے بلند آواز میں اعلان کیا۔
 ”بارگیا اسے پکنک اور پارٹی کے اخراجات برداشت کرنا ہوں گے۔“

”نہیں ہر وقت بس اسی قسم کی حرکتیں سوچتی رہتی ہیں۔“ شا بولی۔ ”کھیل بغیر شرط کے بھی ہو سکتا ہے۔“
 ”ہو تو سکتا ہے لیکن پکنک کے پروگرام کا کیا رہے گا؟“

”اس کے لئے شرط ہی کیا ضرورت ہے؟“ نادیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”راجیل صاحب بغیر کے بھی چھوٹے موٹے پروگراموں کے معمولی اخراجات برداشت کر سکتے ہیں۔“

”کیوں نہیں..... کیوں نہیں؟“ راجیل نے حسب عادت تمیض کا کالر درست کرتے ہوئے جلدی کہا۔ ”بلکہ یوں سمجھئے کہ پکنک کا پروگرام میری طرف سے طے ہو گیا۔ دن تاریخ آپ حضرات طے

میں۔“
 ”راجیل بھائی زندہ باد.....“ فرحان نے ہڑے کا نعرہ بلند کرتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا پھر بولا۔

”نک کا پروگرام تو طے ہو گیا، اس لئے اب منصور بھائی اور راجیل بھائی کے درمیان صرف نمائشی ہوگا۔“

”بس تم کی بات کر رہی ہو.....؟“ نادیرہ نے شوشی سے پوچھا۔
 ”ہیلو! جلدی سے کوئی ترکیب سوچو ورنہ بنانا پھیل خراب ہو جائے گا۔“ نادیرہ نے تیزی سے کہا۔
 ”ہاں نے ایک لمحے کے لئے کچھ سوچا پھر اونچی آواز میں بولی۔“ راجیل صاحب! یہ آپ کیا کر رہے ہیں..... جان بوجھ کر منصور کو جتنے کی کوشش کر رہے ہیں؟“
 ”بس بھی نہیں محسوس کر رہی ہوں۔“ نادیرہ نے جلدی سے کہا۔“ راجیل صاحب منصور کو کھلا رہے ہیں۔ جانیں گے کیسے جیت لیں گے۔“

”منصور کے لئے نادیرہ کا اشارہ ہی کافی تھا۔ وہ جان بوجھ کر خراب کھیلنے لگے اور گیم ہار گئے لیکن اس سے میں انہوں نے راجیل کو اتنا تھکا دیا تھا کہ اس کی حالت قابل دیدھی۔ سانس لینا بھی دشوار ہو گیا۔ راجیل کی اس حالت پر اصرار اور شائستگی مسکرانے لگے لیکن نادیرہ اور نادیرہ بے حد سنجیدہ نظر آ رہی تھیں۔ دیکھو یہ بات سب ہی سمجھ رہے تھے کہ منصور نے دیدہ و دانستہ گیم ہارا ہے۔“
 ”آپ تو بے حد شاندار کھیلنے والے ہیں راجیل صاحب!“ نادیرہ نے قریب آتے ہوئے کہا۔

”نادیرہ! اپنی کرسی گھسیٹ کر قریب آ گئی۔“
 ”جی..... جی..... ہاں!“ راجیل نے ہانپتے ہوئے جواب دیا۔ ”تھوڑا آؤٹ آف پریکٹس ہارنا ایک زمانے میں مجھے پتہ چلا تھا۔“

”آپ کے کھیل کے تصور دیکھ کر میں تو دنگ رہ گئی۔“ نادیرہ سنجیدگی سے بولی۔
 ”یہ میری بڑی عزیز سہیلی نادیرہ ہے۔“ نادیرہ نے تعارف کرایا۔
 راجیل نے اپنے حسن اخلاق کا مظاہرہ کرنے کی خاطر جھکتے ہوئے کہا۔ ”خوش..... خوش ہوئی۔“

”ہاں!“
 ”آپ غالباً خوش کہنا چاہ رہے تھے۔“ نادیرہ نے تھج کی۔ ”جلدی میں خوش خوشی نکل گیا منہ سے۔“
 ”آپ نہیں جانتیں نادیرہ باجی!“ فرحان شوشی سے بولا۔ ”جب بہت زیادہ خوش ہو تو اسے خوش خوش کہا جاتا ہے۔“

”فرحان.....“ شائے زیر لب مسکراتے ہوئے ٹوکا۔ ”تم باز نہیں آؤ گے؟“
 ”آپ شاید بہت زیادہ تھک گئے ہیں۔“ نادیرہ نے راجیل کی طرف داری کی۔ ”روانی میں پھسل گئی۔“

راجیل نے اس بار جواب دینے کی بجائے اثبات میں سر کو جنبش دی۔
 ”پہلے آپ کہاں تھے؟“ نادیرہ بولی۔ ”میرا مطلب یہ ہے کہ میں نے آپ کو دیکھا نہیں۔“
 ”یہ لاہور سے تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آئے ہیں۔“ منصور نے کہا۔ ”قیام یہیں وقار انگل یہاں ہے۔“

”دیر لگے..... پھر تو اچھی گزرے گی۔“ نادیرہ نے مسرت کا اظہار کیا پھر نادیرہ سے رُوحے ہوئے اتریں بولی۔ ”شاید تم اسی لئے مجھے بار بار اپنے یہاں آنے سے روکتی تھیں کہ کہیں میری اور راجیل جب ملاقات نہ ہو سکے۔“

نادیرہ نے کوئی جواب دینے کی بجائے اپنی جگہ بیٹھنے کی اتنی خوبصورت اداکاری کا مظاہرہ کیا جیسے وہ جادوگر کہہ رہی تھی، وہ واقعی درست تھا۔ راجیل کی حالت قابل دیدھی۔ کبھی وہ نادیرہ کی سمت دیکھتے اور کبھی نادیرہ کی طرف۔

منصور اور راجیل کھیلنے کے لئے اُٹھے تو نادیرہ نے نادیرہ کو کہنی مارتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ”تم مجھے اپنے ہمراہ کا نام منصور بتانا تھا۔ پھر یہ مسٹر راجیل کی طرف داری کس لئے؟“
 ”یہ موصوف دن بننے کی کوشش فرما رہے ہیں اس لئے میں نے ان کی ڈرگت بنانے کا مصمم کر لیا ہے۔“ نادیرہ بولی۔ ”تم نے دیکھا نہیں، کتنی جلدی پٹک کے لئے ہائی بھری۔“
 ”خاصا فرما کر اندر دم کا عاشق معلوم ہوتا ہے۔“ نادیرہ نے سرگوشی کی، پھر شکوہ کرتے ہوئے بولی۔ ”تم نے اس کا مکمل تعارف پہلے کیوں نہیں کرایا؟“

”اب بھی کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی..... گیم ہو لینے دو، تمہارا باقاعدہ تعارف کرائے دیتی ہوں۔“
 ”ایک بات پہلے بتاؤں..... موصوف بہت ڈھیٹ اور چمکوسم کے واقع ہوئے ہیں۔“
 ”موصوف ہی سے لگتا ہے۔“ نادیرہ نے راجیل کو دیکھا پھر آہستہ سے بولی۔ ”جب تک گیم ختم ذرا مختصر اُچھے، ان کے بارے میں تھوڑی بہت تفصیل بتا دو! تاکہ میں پہلے سے تیار رہوں۔“
 ”کیا مطلب.....؟“ نادیرہ چونکی۔ ”تمہیں اس قدر دلچسپی کیسے ہو گئی؟“

”کیوں..... کیا تمہارے رشتے سے میرا کوئی حق نہیں بنتا راجیل پر؟“ نادیرہ نے زیر لب مڑے ہوئے کہا۔ ”چیز ہے دلچسپ.....“

”کیا ارادے ہیں تمہارے.....؟“
 ”بہت دنوں بعد ایک تفریح ہاتھ آئی ہے اور تم نے ابھی سے سوال جواب شروع کر دیئے۔“
 ”تم جانو!“ نادیرہ بولی۔ ”اگر اُسے ہری ہری گھاس نظر آ گئی تو گھر تک تمہارا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔“
 ”سو دہات (تو کیا ہوا).....؟“ نادیرہ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”باتو جانو زیادہ خطرناک ہوتا۔ اور اگر باقاعدہ پٹا ڈال کر رکھا جائے تو سوائے ڈم ہلانے کے اور کچھ نہیں کر سکتا۔ کیا ڈیشیاں والا کیس یاد نہیں، کس طرح سریش بن کر اور ہاتھ دھو کر پیچھے لگا تھا۔ مگر بیچارے کا اہم ہوا.....؟ پلٹ کر ایسا سرپٹ رفو چکر ہوا کہ پھر بھی نظر بھی نہیں آیا۔“

”اُسے بے چارہ کہہ رہی ہے.....“ نادیرہ نے حقارت سے کہا۔ ”اگر انکل کی جگہ میں ہوتی تو گولی مار دیتی ڈیشیاں کو۔“

”چھوڑو اس پرانے قصے کو..... میں نے تو برسبیل تذکرہ ایک بات کہہ دی تھی۔“ نادیرہ نے را دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اب تو مجھے راجیل صاحب کی جغرافیائی کیفیت اور حدود اور بعد سے دلچسپی پیدا ہے۔ بظاہر تو کسی اچھی نسل کا پلا پلا یا نظر آتا ہے۔“

”ابا جان کی کچھ دُور پڑے کی قربت داری بھی نکلتی ہے۔“ نادیرہ نے راجیل کے سلسلے کا تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ”یہی وجہ ہے جو میں منصور کی زبانی یہ سن کر خاموش ہو گئی کہ موصوف اندر دلچسپی لے رہے ہیں۔ کوئی دوسرا ہوتا تو ایک منٹ میں دماغ ٹھیک کر دیتی۔“

”اب تم اُسے میرے حوالے کر دو..... باقی میں جانوں اور میرا کام۔“
 ”کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کر بیٹھنا، ورنہ انکل کہیں محاورے کی بجائے حقیقتاً مجھے گولی نہ مار بیٹھنا۔“

نادیرہ نے کوئی جواب نہیں دیا، راجیل کی طرف دیکھتی رہی جو منصور کو شکست دینے کی خاطر کی بازی لگائے ہوئے تھے لیکن بظاہر اُن کے جیتنے کے کوئی امکان نہیں تھے اس لئے کہ منصور پوائنٹ ہو چکے تھے اور راجیل کے صرف دو پوائنٹ بنے تھے اور وہ بھی منصور کی غلط سروں کی وجہ سے۔
 ”نادیرہ!“ اچانک نادیرہ نے سرگوشی کی۔ ”کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ منصور جان بوجھ کر یہ گیم ہار جا۔“

”میرا خیال ہے کہ یہ نادارہ اور نادیدہ کی ملی بھگت ہے۔“ ثنائے سرگوشی کی۔ اُس کا مخاطب احمر ہے۔
”اور منصور صاحب کیسے بگلا بھگت بنے خاموش بیٹھے ہیں۔“ احمر نے منصور کو دیکھا تو وہ کراہنے لگے۔

”جائیے راجیل بھائی..... ہم آپ سے نہیں بولتے۔“ فرحان نے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔
”نے جان بوجھ کر ہماری ساری سکیم چوہٹ کر دی۔“
”کیا..... مطلب.....؟“ راجیل نے اپنی سانسوں پر قدرے قابو پاتے ہوئے دریافت کیا۔
”آپ نے اگر شرط بدلی ہوتی تو منصور بھائی کو کچک کا انتظام کرنا پڑتا۔“
”تم نہیں سمجھو گے فرحان میاں!“ نادارہ نے راجیل کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”دریادلی اور فیاضی تو کو کہتے ہیں کہ انسان جیت بھی جائے اور دوسرے کو شرمندہ بھی نہ ہونے دے۔ اس وقت راجیل صاحب نے حاتم طائی والی سخاوت کا مظاہرہ کیا ہے..... ہم تو مان گئے۔“
”دزدہ نوازی ہے آپ کی۔“ راجیل نے اِکساری سے کام لینے کی خاطر ہانپتے ہوئے مسکرائے۔
”کوشش کی تو اور بھی مضحکہ خیز نظر آنے لگے۔“
”میں آپ کے پڑوس ہی میں رہتی ہوں..... کبھی ہمارے غریب خانے پر بھی تشریف لایا۔“
”نادارہ نے دعوت تھی۔“
”ضرور حاضر ہوں گا۔“

”لیکن احتیاط شرط ہے۔“ فرحان نے راجیل سے کہا۔ ”ہمارے کمرل انگل بات بات پر گولہ دیتے ہیں۔“

”واہی.....؟“ راجیل نے سنجیدگی سے پوچھا۔
”جی نہیں..... یہ تو انگل کا تکیہ کلام ہے۔“ نادیدہ نے وضاحت کی تو راجیل نے فرحان کی بات یوں دیکھا جیسے تکیہ کلام کے معنی پوچھ رہے ہوں۔ اُن کی اُردو کس قدر کمزور تھی، اس کا اندازہ پڑھاتے ہوئے بھی ہو چکا تھا۔

”تکیہ کلام.....“ فرحان نے آہستہ سے راجیل کو مخاطب کیا پھر سنجیدگی سے بولا۔ ”جب کوئی تکیے پر لیٹ کر کلام کرے تو اُسے تکیہ کلام کہتے ہیں۔“
”اور مشکلم غالباً دونوں کا تکیہ کلام ہے۔“ منصور نے سادگی سے پوچھا۔
”آپ نے ڈکشنری میں اس کے معنی دیکھ لئے ہوں گے۔“ فرحان نے اس قدر برجستہ لہجے کا ثبوت پیش کیا کہ سوائے نادارہ کے کوئی بھی اپنی اے اختیار نہیں پر قابو نہ پاسکا۔
راجیل اس طرح ہونفوں کی طرح سب کی شکلیں دیکھ رہے تھے جیسے اُن کی ہنسی کی وجہ جانے کوشش کر رہے ہوں۔

”اور آپ کے کیا مشاغل ہیں؟“ نادارہ نے جلدی سے راجیل کی توجہ بنانے کو کہا۔
”فی الحال تو صرف سٹڈی پر زور دے رہا ہوں۔“ راجیل نے جواب دیا۔ پھر کچھ یاد کرتے ہوئے۔ ”آپ کے ڈیڈی کا نام کمرل عابد ہے؟“
”جی ہاں..... لیکن آپ کو کیسے معلوم ہوا؟“
”ابھی بتا رہی تھیں۔“
”آپ واقف ہیں ڈیڈی سے.....؟“

”ہاں کچھ سنا سنا سا لگ رہا ہے۔“ راجیل نے پوچھا۔ ”کراچی سے پہلے آپ لوگ لاہور میں تو رہتے تھے؟“

”بالکل تھے۔“
”پھر آپ کے والد میرے ڈیڈی سے ضرور واقف ہوں گے۔“ راجیل نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ”میں دراصل سکواڈرن لیڈر افتخار کا بیٹا ہوں۔“
”اور آپ کے ڈیڈی شاید کسی ایئر کرئیش میں.....“

”جی ہاں..... وہی وہی۔“ راجیل نے جلدی سے کہا۔ ”آپ کو کیسے معلوم ہوا؟“
”ایک دو بار ڈیڈی کی زبانی آپ کے ڈیڈی کے کارنامے سن چکی ہوں۔“
”پھر تو آپ دونوں واقف کار نکلے۔“ منصور بولے۔

”ابھی نکلے کہاں.....“ فرحان نے کہا۔ ”ابھی تو محض دریافت ہوئے ہیں۔“
”ابھی جب چاپ بیٹھی راجیل کو بار بار کچھ ایسی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی جیسے اُسے راجیل کا نادارہ کے ساتھ مل کر بات کرنا پسند نہ ہو۔ اور شاہان چکی تھی کہ نادارہ اور نادیدہ نے مل کر راجیل کو پریشان کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔“

”پھر تو آپ ضرور ہمارے ہاں تشریف لائیے۔“ نادارہ نے فرحان کا جملہ نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”ڈیڈی آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔“
”اب تو میرا آنا فرض ہو گیا.....“

”لیکن اکیلے آئیے گا.....“ نادارہ نے نادیدہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس کو ساتھ لانے کی کوئی ضرورت نہیں۔“
”وہ کیوں بھلا.....؟“

”اس لئے کہ اس نے ابھی تک ہمارا ایک دوسرے سے تعارف کیوں نہیں کرایا..... ذرا سوچئے تو نام ایک دوسرے کے اتنے قریب رہنے کے باوجود آپس میں واقف نہیں تھے..... کیا اس کی ذمہ داری نادیدہ پر عائد نہیں ہوتی؟“

”مجھے کیا خبر تھی کہ تم دونوں پرانے واقف کار ہو گے۔“ نادیدہ نے اُکھڑے ہوئے انداز میں کہا۔
”ہم نہیں..... ہمارے ڈیڈی۔“ نادارہ نے مسکراتے ہوئے بڑا رومانٹک انداز اختیار کیا۔ ”میری راجیل صاحب کی تو ابھی پہلی ملاقات ہے۔“

”فرحان..... تم عبدال چچا سے کہو! کہ وہ جوس بنالائیں۔“ ثنائے فرحان کو وہاں سے ہٹانے کے لئے کہا پھر صائمہ سے بولی۔ ”تم ذرا بھاگ کر جلدی سے یہ دیکھ کر آؤ کہ امی جان کیا کر رہی ہیں؟“
فرحان اور صائمہ چلے گئے تو ثنائے نادارہ سے کہا۔ ”تمہاری اطلاع کے لئے ایک بات یہ بھی بتا دو کہ راجیل صاحب کا لاس سال پاس ہونا اشد ضروری ہے ورنہ میری کرکری ہو جائے گی۔“

”وہ کیوں.....؟“
”اس لئے کہ راجیل صاحب کو پڑھانے کی ذمہ داری میرے اُپر ہے۔“
”تو کیا ہوا؟“ نادیدہ بولی۔ ”جہاں تین سال وہاں ایک سال اور سبھی.....“

”یہی بات ہے نادیدہ.....“ ثنائے جلدی سے کہا۔ ”کسی کے لئے ایسا نہیں کہا کرتے۔“
”مگر یہی تو زندگی کا دوسرا نام ہے۔“ نادارہ نے راجیل کو کسمساتے دیکھ کر سفید جھوٹ بولا۔ ”میں

خود بھی ایک ہی کلاس میں دوبار لڑھک چکی ہوں۔“
”کیا آپ کو بینڈیشن وغیرہ کے علاوہ کسی اور ٹیم سے بھی دلچسپی ہے؟“ راجیل نے گفتگو بدلتے ہوئے نادارہ کو مخاطب کیا۔
”مثلاً.....؟“

”مثلاً یہ کہ کیرم بورڈ، برج، کٹ تھروٹ اور پلیئر ڈ وغیرہ وغیرہ۔“
”مجھے کٹ تھروٹ زیادہ پسند ہے۔“ نادارہ نے ذومعنی انداز میں کہا پھر جلدی سے بولی۔
”غیرہ وغیرہ بھی کھیل لیتی ہوں۔“
”آپ شاید مجھے بنانے کی کوشش کر رہی ہیں۔“ راجیل نے مسکرا کر جواب دیا۔
”خدا کا شکر ہے کہ آپ سمجھ تو سہی۔“ نادارہ نے اپنائیت کا اظہار کیا تو راجیل گڑبڑا کر
”ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ نادارہ سے بے تکلف ہوں یا نادارہ کی اپنائیت کا خیال رکھیں۔“
”آپ فکر نہ کریں..... میں سب کچھ سمجھ رہا ہوں۔“ راجیل نے نادارہ کو دلاسہ دینے کی کوشش
”ان کے چہرے پر تیزی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ نادارہ بڑی مشکلوں سے اپنی ہنسی ضبط کر
کوشش کر رہی تھی۔

”کیا مطلب.....؟“ نادارہ نے یکنکتہ سنجیدگی اختیار کر لی، راجیل کو گھورتے ہوئے بولی۔
”آپ میری باتوں کو مذاق سمجھ رہے ہیں؟“
”جی..... جی نہیں تو.....“ راجیل اور زیادہ شیشا گئے۔

”آپ نے میرے جذبات کی توہین کرنے کی کوشش کی ہے۔“ نادارہ تیزی سے اٹھی پھر
پھانک کی جانب قدم بڑھانے لگی۔

”نادارہ.....“ نادارہ نے اسے سپاٹ آواز میں مخاطب کیا۔ ”جس تو پتی جاؤ!“
”پلیئر..... سنئے تو سہی! میں تو.....“

نادارہ نے پلٹ کر راجیل کو گھورا تو وہ اس طرح خاموش ہو گئے جیسے کسی تیز رفتار کار کو فٹ پرکا
گئے ہوں۔ نادارہ نے بھی صورت حال کو سنجیدہ بنانے کی خاطر رکنے کی کوشش نہیں کی۔ قدم اٹھا
آگے بڑھ کر اپنی کار میں بیٹھی اور اسے شارٹ کر کے تیزی سے پھانک سے نکالتی چلی گئی۔
راجیل کی حالت قابل دید تھی..... نہ بائے رفتن نہ جائے ماندن کی مکمل تصویر نظر آ رہی تھی
اپنے منہ پر ہاتھ رکھے ہنسی روکنے کی کوشش کر رہی تھی..... اور نادارہ، راجیل کو بدستور ایسی نظر دلا
دیکھ رہی تھی جیسے کچا ہی چبا ڈالنے پر غور کر رہی ہو.....!
پھر عبدل جس کی ٹرائی لئے آیا تو ماحول کا رنگ کچھ تبدیل ہو گیا۔

○○○

رات کو وقار احمد اپنی خواب گاہ میں گئے تو شامکہ بیگم بھی ان کے ہمراہ تھی۔ میاں بیوی کے درمیان
دیر تک گھریلو مسئلوں پر بات ہوئی رہی، پھر وقار احمد نے پوچھا۔ ”احمر کی واپسی کا ارادہ کب تک ہے؟“
”خیریت..... یہ آپ کو اچانک احمر کی واپسی کا خیال کیسے آ گیا؟“
”آج بھائی جان کا فون آیا تھا۔“ وقار احمد نے بتایا۔ فوزیہ بھائی کو بیٹے کی یاد بہت ستا رہی
بھائی صاحب کہہ رہے تھے کہ احمر جلدی نیرونی واپس چلا جائے تو مناسب ہوگا۔“
”یہ تو ظاہر ہے کہ فوزیہ بہن احمر کے اتنے دنوں گھر سے دور رہنے سے پریشان ہوں گی

”اچھے تو سہی! ہم بھلا احمر سے کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ تم رخت سفر باندھو اور واپس لوٹ جاؤ۔“
”آپ فکر نہ کریں..... میں ایک دو دن میں خود ہی اسے سمجھا دوں گا۔“

”کوئی اور بات بھی ہوئی تھار بھائی سے؟“
”اور بات سے آپ کی کیا مراد ہے.....؟“

”آپ تو ایسے انجان بن رہے ہیں جیسے کچھ جانتے ہی نہ ہوں۔“
”اوہ..... آپ شاید احمر کے رشتے کے متعلق دریافت کر رہی ہیں۔“

”خدا کا شکر ہے کہ آپ سمجھ تو سہی۔“ شامکہ بیگم نے کہا۔ ”آج آپا جان اور منصور بھی آئے تھے۔ آپا
اجر ایسا بھا گیا ہے کہ ہر وقت اسی کی تعریف کرتی رہتی ہیں.....“

”آخر ہے کس چچا کا بھتیجا.....“ وقار احمد مسکرا کر بولے۔
”آج بھی وہ یہی اصرار کر رہی ہیں کہ احمر اور شاکر شاکر جلدی ملے کر دیا جائے تو مناسب رہے گا۔“

”میرا اپنا خیال بھی یہی ہے۔ لیکن آپ اور شامکہ بہن یہ کیوں بھول جاتی ہیں کہ ہم لڑکی والے
ہیں۔ کھول کر لڑکی کے رشتے کی بات بھی تو نہیں کر سکتے۔“

”اتنا میں بھی جانتی ہوں کہ لڑکی والوں کی حیثیت لڑکے والوں کے مقابلے میں بڑی نازک اور
ورہتی ہے۔ مگر آپ باتوں باتوں میں شاکر بھائی سے یہ تو پوچھ سکتے ہیں کہ انہوں نے احمر کے
نہل کے بارے میں کیا سوچا ہے؟“

”نہیں..... یہ طریقہ مناسب نہیں رہے گا۔“ وقار احمد نے بھائی سے ہونے والی گفتگو کی تفصیل
نے ہوئے کہا۔ ”بھائی صاحب نے ایک دو مہینے کے لئے پاکستان آنے کا خیال ظاہر کیا ہے..... اس
پر آپ بہ آسانی فوزیہ بھانجی سے احمر کے بارے میں ان کا ارادہ دریافت کر سکتی ہیں۔“

”کب تک ارادہ ہے شاکر بھائی کا آنے کا.....؟“ شامکہ بیگم نے جلدی سے پوچھا۔
”ابھی کوئی تاریخ تو طے نہیں کی۔ ویسے بھائی صاحب کی باتوں سے میں نے یہی اندازہ لگایا ہے

”ایک گریوں کے آخر میں ارادہ رکھتے ہیں۔“
”یہ تو آپ نے بڑی خوش خبری کی اطلاع سنائی۔“ شامکہ بیگم بولیں۔ ”فوزیہ بہن اور میرے
ن جو بے تکلفی کا رشتہ قائم ہے آپ بھی اس سے بخوبی واقف ہیں۔ میں یہ معاملہ بڑی آسانی سے
روں گا۔“

”ظاہر ہے۔ جو بات عورتوں کے درمیان کھل کر ہو سکتی ہے وہ فضا مردوں کے مابین قائم نہیں ہو سکتی۔“
”آپ تو ایسا کہہ رہے ہیں جیسے مرد حضرات بے حد شرمیلے ہوتے ہیں..... بے چاروں کو بات
اتوار سے آئی ہی نہیں۔“

”آپ میری بات کا مطلب نہیں سمجھ سکیں۔“ وقار احمد نے وضاحت کرتے ہوئے جواب دیا۔
”لڑکے اور لڑکیوں کا رشتہ شروع شروع میں عورتوں ہی کے درمیان طے پاتا ہے۔ بعد میں جو
”نکاح ہوئی ہیں وہ مردوں کے درمیان طے ہو جاتی ہیں۔“

”نکاح ہے.....“ شامکہ بیگم فیصلہ کن لہجے میں بولیں۔ ”اب میں خود ہی فوزیہ بہن سے مل کر سب
”آج ایک رشتے کی بات اور بھی چھڑ گئی ہے۔“ وقار احمد نے کچھ توقف کے بعد کہا۔
”کیا جمال بھائی نے کوئی بات کی ہے؟“ شامکہ بیگم نے پہلو بدل کر تیزی سے پوچھا۔

”اپنے مطلب کی بات تھی نا..... کتنی جلدی سمجھ میں آگئی۔“ وقار احمد شوفی سے بولے۔
 ”اب بتا بھی چکے..... آپ تو ترسا ترسا کر بات سنانے کے عادی ہیں۔“
 ”اپنے اپنے موقع کی بات ہے..... جب آپ کی باری آتی ہے تو آپ بھی نہیں چوکتیں۔“
 ”آپ کو کیا مجھے تنگ کرنے میں زیادہ لطف آتا ہے؟“
 ”اب اس عمر میں اس کے سوا اور کبھی کیا سکتا ہوں؟“
 ”یہ باتیں تو میں روزِ اوّل سے سنتی چلی آ رہی ہوں۔“ شائلہ بیگم نے مسکرا کر کہا پھر بولیں۔
 ”بھائی سے کیا باتیں ہوئیں؟“
 ”وہی..... جس کا آپ کو انتظار تھا۔“ وقار احمد نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ”منہ شادی کی بات کر رہے تھے، اُن کا خیال ہے کہ زلزلہ آنے کے فوراً بعد ہی اس فرض سے سبکدوش جائیں۔“
 ”پھر آپ نے کیا جواب دیا؟“
 ”میں بھلا کیا جواب دیتا؟ یوں بھی دفتر میں بیٹھ کر اس قسم کے گھریلو مسئلے طے نہیں کئے جاسکتے۔ کیا مطلب؟“ شائلہ بیگم نے چونکتے ہوئے پوچھا۔ ”جمال بھائی بات کرنے آئے اور آپ انہیں ٹال دیا۔“
 ”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ وقار احمد نے کہا۔ ”میں نے آپ کی بہن اور بہنوئی کو رات کے کھانے تک بلایا ہے۔ اس وقت منصور میاں والی بات بھی ہو جائے گی۔“
 ”نادیہ سے پہلے اگر شائکی بات طے ہو جاتی تو کتنا اچھا ہوتا۔“
 ”خدا پر بھروسہ رکھئے..... وہ چاہے گا تو سب کام اسی طرح نپٹ جائیں گے جس طرح آپ ہیں۔“
 ”ایک بات کہوں.....؟“
 ”فرمائیے۔“
 ”ابھی منصور والی بات کی بھٹک نادیہ یا کسی اور کے کانوں میں نہیں پڑنی چاہئے۔“
 ”وہ کیوں.....؟“
 ”ہمارے اگر دس دوست ہیں تو کچھ دشمن بھی ضرور ہوں گے۔ اور پھر نادیہ ابھی اپنی تعلیم رہی ہے، شادی بیاہ کا ذکر چھڑ جائے تو لڑکیوں کا دھیان بٹ جاتا ہے۔“
 ”یہ آپ جگہ بیتی کہہ رہی ہیں یا آپ بیتی.....؟“
 ”مذاق پھر کسی وقت کر لیجئے گا۔ فی الحال میں جو گر کی بات بتا رہی ہوں اُسے گرہ میں باندھ لیں۔“
 ”آپ کا کہنا اپنی جگہ بالکل درست ہے لیکن میرے خیال میں اب یہ طریقہ نہ صرف یہ کہ اور دقیقاً نوی ہو گیا ہے بلکہ اس کے دُور رس نتائج بھی اچھے ثابت نہیں ہوتے۔“
 ”میں سمجھی نہیں.....“
 ”میرا خیال ہے کہ منصور کے رشتے کے سلسلے میں جمال بھائی سے ہاں کہنے سے پیشتر نادیہ بھی معلوم کر لی جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔“ وقار احمد نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔
 ”کیا ماں باپ ہونے کی حیثیت سے ہمیں کوئی اختیار حاصل نہیں، جو ہم بیٹی سے اُس معلوم کریں؟“

”والدین کی حیثیت یا اختیار کی نہیں..... لڑکے اور لڑکی کے مستقبل کی ہوتی ہے۔“ وقار احمد بڑی کوشش سے بولی۔
 ”زمانہ اب بہت بدل گیا ہے شائلہ بیگم..... اور شریعت کی رو سے بھی یہ کہ لڑکے اور لڑکیوں کو اُن کی پسند کا اختیار دیا جائے..... بغیر مرضی معلوم کئے جو شادیاں کر رہے ہیں، آج کل اس کا انجام وہ نہیں ہوتا جو ہمارے اور آپ کے زمانے میں ہوا کرتا تھا۔“
 ”اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اگر نادیہ نے خدا نخواستہ اپنا دو ٹوک فیصلہ سنا دیا کہ منصور اُسے پسند نہیں اس رشتے سے انکار کر دیں گے؟“
 ”ہونا تو یہی چاہئے..... لیکن آپ کو یہ خیال کیسے ہوا کہ نادیہ، منصور کو پسند نہیں کرتی؟“
 ”ظاہر تو ایسا نہیں لگتا۔ مگر دلوں کے بھید سوائے خدا کے اور کون جان سکتا ہے.....؟“
 ”میرا مشورہ ہے کہ آپ نادیرہ کے ذریعے بیٹی کے دل کا بھید معلوم کرنے کی کوشش کریں۔ دونوں اسی نے تکلفی ہے اس لئے نادیرہ اس کام کو بہتر طور پر انجام دے سکتی ہے۔“
 ”آپ کہتے ہیں تو اب یہی کرنا ہے.....“
 ”غیریت تو ہے.....؟“ وقار احمد نے بیوی کے چہرے کے بدلتے تاثرات کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔
 ”آپ اچانک کس اُلجھن میں مبتلا ہو گئیں؟“
 ”آپ کی باتوں نے فکر میں ڈال دیا۔“ شائلہ بیگم نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”اوّل تو مجھے قوی ہے کہ نادیہ منصور کے حق میں فیصلہ دے گی..... میں اُس کی ماں ہوں، دن بھر لڑکیوں پر نظر رکھتی۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ منصور اور نادیہ ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے ہیں لیکن.....“
 ”لیکن.....؟“
 ”ذرا بھی لگتا ہے.....“
 ”ذرا کی کیا بات ہے.....؟“
 ”اگر میرا اندازہ غلط ثابت ہوا تو آیا جان اور جمال بھائی کو کیا جواب دیا جائے گا..... یہ بھی منہ مار نہیں کہا جاسکتا کہ لڑکی نے لڑکے کو پسند کر دیا ہے۔ غیروں کی بات ہوتی تو ایک بار جواب اس سلسلہ ختم بھی کیا جاسکتا تھا۔ لیکن یہاں تو خونی رشتوں کا تعلق ہے اور پھر آیا جان کی پوزیشن بھی سامنے ہے، وہ جمال بھائی کو کیا منہ دکھائیں گی..... آدمی مارنے والے کا ہاتھ پکڑ سکتا ہے لیکن دالوں کی زبان تو بند نہیں کی جاسکتی۔ آپا کے سرال والے یہی کہیں گے کہ لڑکا سوتیلا تھا اس لئے نہیں لی۔“
 ”آپ تو بلاوجہ پریشان ہو رہی ہیں۔“ وقار احمد بولے۔ ”جمال بھائی بہت سلجھے ہوئے اور دُور شخصیت کے مالک ہیں۔ انہیں سمجھا یا بھی جاسکتا ہے۔“
 ”خدا نہ کرے جو اس کی نوبت آئے۔“
 ”آپ جو چاہتی ہیں وہی ہوگا۔ لیکن اگر ابھی سے آپ نے اس طرح ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیں تو پھر کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔“ وقار احمد نے بیوی کو دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ ”منصور مجھے بھی پسند ہے مگر تو کہتا ہوں کہ نادیہ کے لئے فی الوقت میری نظر میں منصور سے بہتر کوئی رشتہ بھی نہیں ہے۔“
 ”مسلّ کل ہی نادیرہ کو بلا کر نادیہ کا عندیہ معلوم کرانے کی کوشش کرنی ہوں۔“ شائلہ بیگم نے کہا۔
 ”پھر جی لانج رکھ لے..... میں اس خوشی میں میلا دشریف کراؤں گی۔“
 ”میرا یہ نہیں..... سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“ وقار احمد نے جمائی لیتے ہوئے کہا پھر دوسری

کھا رہا تھا ابھی نہیں کھایا۔ اگر عبدل چچا نہ بتاتے کہ آپ کھانے کے لئے منع کر گئے ہیں تو امی جان چڑھ جاتی۔
 ”جیسا آپ کو ایک ضروری اطلاع دینے کی خاطر حاضر ہوا ہوں۔“
 ”خیریت تو ہے؟“ ”شانے احمر کے لہجے کی اداسی کو محسوس کرتے ہوئے جلدی سے پوچھا۔
 ”کچھ اچھے اچھے سے نظر آرہے ہیں۔“
 ”مجھے خوشی ہوئی کہ آپ کو میری انجمن کا احساس تو ہوا۔“
 ”بات کیا ہے؟“

”میں اس وقت اپنی سیٹ بک کرا کے آرہا ہوں۔“ احمر نے شا کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کل کی فلائٹ سے واپس نیردلی جا رہا ہوں۔“
 ”اور اتنی سی بات نے آپ کو اُلجھا دیا۔“ شانے احمر کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے جواب دیا۔
 ”مگر کافر تو اسی طرح جاری رہتا ہے۔“
 ”تسلط طویل ہونے لگیں اور ٹھکن کا احساس نہ ہو، بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟“
 ”اور منزل پر پہنچ کر جو سکون و آرام ملتا ہے، اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟“ وہ احمر کی رائے ہونٹوں پر ایک دلنواز مسکراہٹ سجائے ہوئے بولی۔ یہ اور بات ہے کہ احمر کی واپسی کی خبر سن کر خود بھی اداس ہو گئی تھی۔
 ”اسی تجربے کے بارے میں غور کر رہا ہوں۔“
 ”آپ کو یہ بھی تو سوچنا چاہئے کہ چچا جان اور چچی جان کو آپ کی واپسی کا کس قدر شدت سے روکا۔“
 ”جی۔“
 ”احمر نے کچھ سوچتے ہوئے اُسے مدھم لہجے میں آواز دی۔

”جی۔“
 ”جی آپ کو بھی میری آمد کا انتظار رہتا ہے؟“
 ”جب آپ نہیں ہوتے تو نادیدہ اور صائمہ بھی اکثر آپ ہی کا ذکر کیا کرتی ہیں اور فرمان.....“
 ”میں نے اوروں کے بارے میں نہیں، آپ کے بارے میں دریافت کیا تھا۔“
 ”کامیابی جان کو بھی آپ کی واپسی کی خبر ہے؟“ شانے بڑی خوبصورتی سے گفتگو کا رخ بدلنے لگا۔
 ”آپ شاید مجھے ٹالنے کی کوشش کر رہی ہیں۔“ احمر جذباتی ہو گئے۔
 ”اُس نے کوئی جواب نہیں دیا، نظریں جھکا کر دل کی دھڑکنوں کا شمار کرنے لگی، سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔“
 ”جواب دے، کس طرح احمر کو اپنی محبت کا یقین دلائے۔“
 ”میں آپ کی خاموشی کا کیا مطلب سمجھوں.....؟“
 ”انسان کو اپنے مستقبل سے بھی ناامید نہیں ہونا چاہئے۔“ اُس نے سنبھل کر جواب دیا۔

”اور اواز سے ہٹ کر اندر آگئے، پھر شا کی میز کے قریب رہی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئے۔ نہ جانے خیالوں میں کس تھے۔ وہ چپ چاپ انہیں دیکھتی رہی، ایک بار پھر دل نے اُسے مجبور کیا کہ وہ احمر کو دافقوں کا یقین دلا دے مگر شرم و حیا نے اُس کی زبان پر تالے ڈال رکھے تھے۔ اُسے احمر کی عجیب لگ رہی تھی..... وہ سوچ رہی تھی..... احمر پہلے تو اتنے جذباتی نہیں ہوئے تھے.....

کروٹ لے کر لیٹ گئے۔ دن بھر کے تھکے ماندے تھے اس لئے جلدی ہی خراٹے لینے لگے۔
 ”شانہ بیگم نے اُنھ کو لائٹ آف کی پھر ٹائٹ بلب آن کر کے خود بھی سونے کے ارادے سے لیٹ گئیں مگر..... جب تک پوری طرح نیند کی آغوش میں پہنچ کر بے خبر نہیں ہو گئیں، اُن کے ذہن میں ایک ہی سوال گونجنے رہا..... اگر نادیدہ نے رضامندی کا اظہار نہ کیا تو کیا ہوگا.....؟“

○○○

احمر دے قدموں کمرے کے سامنے آئے تو شا کو دیکھ کر رُک گئے۔ اپنے بستر پر نیم دراز در کتاب کے مطالعے میں مچھی..... احمر کو یوں لگا جیسے وہ کوئی حسین خواب دیکھ رہے ہوں۔
 وقار احمد کی زبانی باپ کا پیغام سن کر وہ فوراً ہی نیردلی واپس جانے کے لئے تیار ہو گئے تھے، کچھ دیر بیشتر ہی سیٹ بک کرا کے واپس لوٹے تھے۔ شانہ بیگم اپنے کمرے میں آرام کی غرض سے چکی تھیں اس لئے شانے سے ملنے کی خاطر اُس کی طرف آگئے۔ وہ شا کو اچانک اپنی واپسی کی خبر سنا کر کے چہرے کے تاثرات دیکھنے کے خواہاں تھے۔ لیکن انہوں نے اُسے فوری طور پر مخاطب کرنا مہار نہیں سمجھا۔ چوٹ پر خاموش کھڑے اپنے حسین خوابوں کی اُس زندہ تعبیر کو دیکھتے رہے جو اُن نگاہوں کے سامنے..... اُن کی موجودگی سے بے خبر پڑھائی میں لگ گئی۔

گھر کے سادہ کپڑوں میں لمبوس ہونے کے باوجود وہ کس قدر خوب صورت نظر آ رہی تھی..... ہوئے کیسو تنیکے پر بکھرے ہوئے تھے..... کتنی معصوم اور پاکیزہ نظر آ رہی تھی..... شبی پر جھومتی ہوئی خوابیدہ گلی کی مانند جو پوری طرح بیدار نہ ہوئی ہو..... اپنے قرب و جوار سے بے پرواہ صرف محبت مصروف ہو..... شا کے خوبصورت چہرے پر بھی بالکل ویسا ہی معصوم تقدس نظر آرہا تھا.....
 احمر بڑی دیر تک دروازے کے بیچ دوڑ کھڑے اُسے پیار بھری والہانہ نظروں سے دیکھتے رہے آہستہ سے کھنکھار کر مدہم آواز میں اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”یہ اتنی محویت سے کس کتاب کا مطالعہ کیا جا رہا ہے؟“
 اور احمر کی آواز سن کر وہ ایک دم بوکھلا سی گئی، کتاب پھینک کر تیزی سے اُٹھی، سر سے ڈھلا دوپٹہ ٹھیک کرتے ہوئے بولی۔ ”آپ..... آپ کب آئے؟ مجھے خبر تک نہ ہوئی۔“
 ”اپنی بے خبری بھی اچھی نہیں.....“ احمر نے اُس کے چہرے پر بکھری حیا کی سرخی کو دیکھتے ہو کہا۔ ”میں تو نہ جانے کب سے آپ کی چوٹ پر محو انتظار کھڑا ہوں۔“
 ”لیکن میں نے تو ایک ہلکی سی قدموں کی چاپ بھی نہیں سنی۔“ وہ بڑی شوخی سے بولی۔ ”دے لی ہوئی۔“

”اس بات کا خدشہ لاحق تھا کہ کہیں آپ نے پلٹ کر توجہ نہ دی تو کیا ہوگا.....“
 ”ایک بار آزما کر دیکھ لینے میں کیا حرج تھا؟“ شانے سادگی سے کہا۔ پھر اپنے جیلے کا مفہوم خود ہی شرم سے گلٹار ہو گئی۔

حیا کی تمازت نے اُس کی معصومیت کو لگدلا دیا تو چہرہ ہمتا اٹھا..... دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں جانے کس جھونک میں وہ اپنی زبان پر قابو نہ رکھ سکی..... دل کی بات لبوں تک آگئی..... شرم کا ادھام سن گیر ہوا تو مسکرا کر جلدی سے نگاہیں جھکا لیں.....
 ”مجھے اسی وقت کا انتظار ہے شا.....“ احمر نے سرگوشی کی۔
 ”آپ.....“ اُس نے جلدی سے بات کا رخ بدلنے کی خاطر پوچھا۔ ”آپ چلے کہاں گئے۔“

”بس کافون تھا۔۔۔؟“
 ”راہیل کے کالج کے پرنسپل کا۔۔۔۔۔“ سمیرا خاتون نے اطمینان کا طویل سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔
 ”راہیل کے بارے میں اُن کی رپورٹ خاصی اطمینان بخش ہے، خدا نے چاہا تو اِس بار وہ ضرور باب ہو جائے گا۔“

”خدا آپ کی زبان مبارک کرے۔۔۔۔۔“
 ”میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ وقار احمد کے گھر کا ماحول اُسے راس آگیا ہے۔۔۔۔۔“
 ”اب تو امتحان بھی قریب ہوں گے۔“
 ”ہاں۔۔۔۔۔ بس دو مہینے باقی رہ گئے ہیں۔۔۔۔۔“

”اس کے بعد تو راہیل صاحب لاہور آجائیں گے؟“ نوشابہ نے دریافت کیا۔
 ”ابھی میں نے اس سلسلے میں کچھ ڈسائیڈ نہیں کیا۔“ سمیرا خاتون سوچتے ہوئے بولیں۔ ”ہوسکتا ہے کہ راہیل چلی جاؤں اور کچھ دنوں کے لئے راہیل کو ساتھ لے کر کہیں بیرون ملک ہواؤں۔“
 ”اس طرح آپ کی صحت پر بھی خوشگوار اثر پڑے گا لیکن۔۔۔۔۔ آپ کی غیر موجودگی میں کاروبار کے ذہن کا اندیشہ بھی ہے۔“

”ممكن ہے۔۔۔۔۔ مگر ہمیں شاید اندازہ نہیں کہ راہیل میری زندگی کا سب سے قیمتی اور انمول سرمایہ ہے۔“ سمیرا خاتون نے کہا۔ ”میں اُس کی پڑھائی کی طرف سے بہت ناامید اور مایوس ہو گئی تھی۔۔۔۔۔ حالات سازگار ہوئے ہیں تو میں چار پیسوں کی خاطر کاروبار کو راہیل کے مستقبل کے راستے میں لٹ نہیں ہونے دوں گی۔۔۔۔۔ صرف چند مہینوں کی تو بات ہے اور پھر میری غیر موجودگی میں تم جو یہاں جڑو ہوگی۔۔۔۔۔ عملے کے دوسرے ذمہ دار افراد بھی ہوں گے۔“

”آپ نے کیا سوچا ہے۔۔۔۔۔ کیا راہیل صاحب کو کراچی ہی سے بی، اے کرانے کا ارادہ ہے؟“
 ”ہاں۔۔۔۔۔ وہاں جا کر راہیل کے اندر جو تغیر پیدا ہوا ہے وہ بے حد خوش آئند ہے۔۔۔۔۔“
 ”میرا خیال ہے کہ اس میں ثنا کی محنت کو بھی خاصا دخل ہے۔۔۔۔۔“ نوشابہ بولی۔ ”بہت ذہین اور بڑھاپت کی مالک ہیں۔“

”کیا یہ ممکن نہیں کہ راہیل کی پڑھائی میں دلچسپی کا سبب نادیہ ہو۔۔۔۔۔؟“ سمیرا نے دیوار پر لٹکے فریم پر نظر ڈالتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

”ہمیں ابھی زندگی کا تجربہ نہیں ہے۔۔۔۔۔ وقت کے سنگناخ راستوں پر اکثر ایسے موڑ آتے ہیں کہ انسان بھٹک جاتا ہے۔۔۔۔۔ کوئی تحریک، کوئی جذبہ ایسا ہوتا ہے جو انسان کے قدم ڈگمگا دیتا ہے۔۔۔۔۔ غلط راستے پر بھٹک کر اپنی منزل کا نشان بھول جاتا ہے۔۔۔۔۔ پھر کوئی حادثہ یا انقلاب اُس کی منزل کی طرف لے کر آتا ہے۔ اور جب راستے ہموار ہو جاتے ہیں تب انسان کو احساس ہوتا ہے کہ اُس نے اپنی منزلت محض اپنی انا۔۔۔۔۔ اپنی ضد۔۔۔۔۔ یا جھوٹی آن بان کی خاطر ضائع کر دی ہے۔“
 ”سمیرا خاتون نے بدستور فریم میں لگی ہوئی اپنے شوہر کی تصویر کو گھورتے ہوئے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔
 ”انسان اگر وقت اور حالات کی کردوٹوں سے قبل از وقت آگاہ ہو جائے تو پھر زندگی کے نشیب و فراز کا ہماری غلط ہو جائے۔۔۔۔۔ میری اور راہیل کی مثال لے لو۔۔۔۔۔ ہمارے ساتھ بھی وقت اور حالات نے لٹاؤ بھولی کھیلی ہے۔۔۔۔۔ مگر میں نے ہمت اور حوصلہ نہیں ہارا، بیٹے کی محبت اور اُس کے مستقبل کو

نیرونی سے اُن کا آنا جانا تو لگا رہتا تھا۔۔۔۔۔ پھر۔۔۔۔۔ اِس بار انہیں کیا ہو گیا۔۔۔۔۔ کیا وہ واپس جانے خوش نہیں تھے۔۔۔۔۔ یا۔۔۔۔۔ اُس سے دُور ہونے کے خیال سے اُداس ہو گئے تھے۔

وہ خاموش کھڑی اتر کوکتی رہی۔۔۔۔۔ احرا اپنے خیالوں میں محو تھے۔ پھر اچانک انہوں نے مہربان ہوئی ثنا کی ڈائری اٹھا لی اور جیب سے قلم نکال کر اُس پر کچھ لکھنے لگے۔۔۔۔۔ شاید وہ بات جو زبانی نہیں پارہے تھے اُسے تحریر کے ذریعے بیان کرنا چاہ رہے تھے۔ ثنا کو احرا کی اُداسی پر ترس آنے لگا۔۔۔۔۔ کل وہ کس قدر خوش نظر آ رہے تھے اور آج۔۔۔۔۔ جدائی کے وقتی احساس نے انہیں کیسا غم بنا دیا تھا۔
 احرا نے اُس کی ڈائری پر کچھ لکھا، پھر ڈائری کو کھلا چھوڑ کر آہستہ سے اٹھے، ثنا کی طرف دُور ہوئے بولے۔ ”میں اس جسارت کی معذرت چاہتا ہوں۔۔۔۔۔“ اُن کے لہجے میں درد کی ہلکی سی کدک موجود تھی۔

”آپ کی واپسی کب تک ہوگی؟“ ثنا نے آہستہ سے کہا۔

”کوشش کروں گا کہ جلدی ممکن ہو۔۔۔۔۔“

”ایک بات کہوں اگر ناگوار خاطر نہ گزرے۔۔۔۔۔؟“

”کہئے۔۔۔۔۔ ابھی میں پوری طرح ہوش و حواس میں ہوں۔“ احرا اُداس لہجے میں بولے۔

”مسکراتے رہنا زندگی کی علامت ہے اور صحت کے لئے بھی بے حد مفید ہے۔“ ثنا نے زور

مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ احرا کو بولوں اُداس نہیں جانے دینا چاہتی تھی۔

”مجھے صحت سے زیادہ زندگی عزیز ہے، جسے میں آپ کے پاس چھوڑے جا رہا ہوں۔“ احرا کے ارادے سے پلٹے۔

”احرا۔۔۔۔۔“ اُس نے احرا کو روکنے کی خاطر آواز دی لیکن شاید احرا نے اُس کی آواز نہیں سنی، سے قدم اٹھاتے، نظریں جھکائے کمرے سے باہر چلے گئے، وہ کچھ دیر تک سنگ مرمر سے تراشید حسین بت کی طرح اپنی جگہ خاموش کھڑی کھلے دروازے کی سمت دیکھتی رہی، پھر ڈائری کا خیال میز کی جانب پلٹ آئی۔ ڈائری اٹھا کر دیکھی۔۔۔۔۔ احرا نے بڑا خوبصورت شعر لکھا تھا

جو ہو سکے تو میری روح میں سا جاؤ

دل و نگاہ کے رشتے تو ٹوٹ جاتے ہیں

وہ شعر پڑھ کر بریل کے تاروں کی مانند من ہی من میں گنگنا اٹھی۔ احرا نے جیسے اس شعر کے ذرا اُس کے احساسات کو چھوڑ کر بیدار کرنے کی کوشش کی تھی۔ اپنے جذبات کی ترجمانی کی تھی۔ خوبصورت اندازِ تکلم تھا، وہ اس شعر کی گہرائیوں میں ڈوبنے لگی، اُسے اپنے آپ پر غصہ بھی آیا۔ احرا نے ایسی سادگی سے اُس سے گفتگو کا آغاز کیا تھا لیکن جانے اُسے کیا ہو گیا تھا کہ دو بیٹھے بول بول سکی۔

اور اب۔۔۔۔۔ احرا کے چلے جانے کے بعد اُسے ملال ہو رہا تھا۔۔۔۔۔ وہ ڈائری پر لکھے ہوئے شعر بار پڑھتی رہی، پھر اُس نے ڈائری کو اپنے سینے کی لطیف دھڑکنوں میں چھپا کر آنکھیں موند لیں۔
 کے تصور میں ڈوب کر حسین وادیوں کی سیر کرنے لگی۔!!

○○○

سمیرا خاتون نے فون پر گفتگو ختم کر کے ریسیور کرڈیل پر واپس رکھا تو اُن کا چہرہ خوشی سے تھا۔ نوشابہ قریب ہی بیٹھی اُن کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لینے میں مصروف تھی۔

”بیت جلدی خیال آگیا تمہیں۔“

”اب بھی نہ آتا اگر نازی نے مجبور نہ کیا ہوتا۔“ وہ حقارت سے بولا۔ ”لیکن سمیرا خاتون کا تجربہ بتا تا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔“

”یہ نازی کون ہے؟“

”نوشاہ کی بد نصیب ماں جو دن رات اُس کے لئے آنسو بہاتی رہتی ہے۔“

”اُس کی بد نصیبی کا آغاز کب سے ہوا؟“ سمیرا خاتون نے زہر خند سے پوچھا۔ ”نوشاہ کی پیدائش

بعد سے یا۔۔۔۔۔“

”ہمارا اپنا ذاتی معاملہ ہے۔“ وہ سمیرا خاتون کو گھورتا ہوا بولا۔

”تہیں۔۔۔۔۔“ سمیرا خاتون کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”جب لڑکی بالغ ہو جائے تو خود مختار ہو جاتی ہے۔ کیا

یہ نوشاہ کی عمر کا اندازہ ہے؟“

”نازی نے اسی لئے تو اُس کی شادی طے کر دی ہے ورنہ ہمارے پاس اتنا کہاں کہ۔۔۔۔۔“ وہ جملہ

لہ کر سکا، کھانسی کا دورہ دوبارہ پڑا تو اُس کا سانس دھونکی کی مانند چلنے لگا۔

سمیرا خاتون نے چیز اسی سے پانی منگوا کر اُسے پلایا تو اُس کی حالت قدرے سنبھل گئی۔

”لڑکا کیا کرتا ہے۔۔۔۔۔؟“ سمیرا خاتون نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”کلیئرنگ فارورڈنگ کا کام کرتا ہے۔ آمدنی بھی معقول ہے اور صورت شکل بھی واجبی ہے۔“ اُس

بحری سانوں کو سیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ ”ایک چھوٹا سا ذاتی مکان بھی ہے۔۔۔۔۔“

”تعلیم کہاں تک ہے۔۔۔۔۔؟“

”شادی کی تمام باتیں نازی نے طے کی ہیں۔ ویسے میرا خیال ہے کہ لڑکے نے بی کام کر رکھا ہے۔“

”اُسے کسی وقت میرے پاس لے آؤ!“ سمیرا خاتون بولیں۔ ”میں اُسے ایک نظر دیکھنا چاہتی ہوں۔“

”کیوں۔۔۔۔۔؟“ اُس نے بڑے بھونڈے انداز میں سوال کیا۔

”نوشاہ میرے ساتھ میرے بنگلے میں رہتی ہے۔۔۔۔۔ وہ صرف میری سیکرٹری ہی نہیں میرے گھر کے

نزدیکی حیثیت بھی رکھتی ہے اس لئے اُس کے مستقبل کا خیال رکھنا بھی میری ذمہ داری ہے۔۔۔۔۔“

راخاتون نے سنجیدگی سے کہا۔ ”نازی کا انتخاب اگر میرے معیار پر پورا اُترتا تو میں لڑکے کو معقول

مت بھی دلاؤں گی اور نوشاہ کی شادی بھی بہت ذہوم دھام سے کروں گی۔۔۔۔۔ یہ میرا وعدہ ہے۔“

”نازی لڑکے والوں کو زبان دے چکی ہے۔“ وہ کرسی پر بل کھاتے ہوئے بولا۔ ”آپ اُسے

ساتھ کر دیں! یہی آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔“

”میرا خیال ہے کہ تم ایک اچھی خاصی آفر کو ٹھکرانے کی کوشش کر رہے ہو۔۔۔۔۔“ سمیرا خاتون نے

اُسے بولنے لگے۔ ”میں اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔“

”یہ مال بیٹی کا معاملہ ہے۔۔۔۔۔ نوشاہ کی زندگی سنور گئی تو مجھے کتنی رکعت کا ثواب ملے گا؟“ اُس نے

بعادت ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ”نازی نے مجبور نہ کیا ہوتا تو مجھے یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”ہو سکتا ہے کہ نوشاہ کی زندگی میں تمہاری کسی ضرورت کو بھی دخل ہو۔۔۔۔۔“ سمیرا خاتون نے اُسے

ت سے گھورتے ہوئے کہا۔ ”تم باپ ہو کر کہہ رہے ہو کہ بیٹی کی زندگی سنور جانے سے تمہیں کتنی

ت کا ثواب ملے گا۔۔۔۔۔“

”میں سنا نہیں۔۔۔۔۔ سویتلا باپ ہوں۔“

کا انداز اس بات کی ترجمانی کر رہا تھا جیسے وہ حالات سے مجبور ہو کر اور بہت ساری اُمیدیں را وہاں تک آیا ہو۔

سمیرا خاتون نے سر کی خفیف سی جنبش سے اجازت دی تو وہ آہستہ سے شکریہ کہہ کر بیٹھ گیا۔ کمرے میں ناگوار خاموشی طاری رہی، پھر آنے والے نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

”میں۔۔۔۔۔ نوشاہ کا باپ ہوں۔“

”سویتلا باپ۔۔۔۔۔“ سمیرا خاتون نے صبح کی تودہ کرسی پر پہلو بدل کر بولا۔

”جی ہاں۔۔۔۔۔ میں نے نوشاہ کی ماں سے ابھی کوئی تین چار سال پیشتر شادی کی ہے۔“

”نوشاہ کو میرے یہاں آئے تقریباً چار پانچ مہینے ہوئے ہیں۔“

”جی ہاں۔۔۔۔۔“ اُس نے جلدی سے کہا۔ ”آپ کے یہاں ملازمت اختیار کرنے سے پہلے

دواؤں کی ایک کمپنی میں کام کرتی تھی۔“

”تم صورت شکل سے مجھے بیمار نظر آتے ہو۔۔۔۔۔“ سمیرا خاتون نے ساٹ لہجے میں پوچھا۔

”جی۔۔۔۔۔ جی ہاں! بیماری تو زندگی کا روگ بن کر جان کے ساتھ چمٹ گئی ہے۔“

”تمہارا نام کیا ہے۔۔۔۔۔؟“

”نام۔۔۔۔۔“ وہ ایک لمحے کو زکا پھر آہستہ سے بولا۔ ”خاکسار کو اقبال احمد کہتے ہیں۔“

”کرتے کیا ہو۔۔۔۔۔؟“

”پہلے ملازمت کرتا تھا لیکن اب بیماری کی وجہ سے بے روزگار ہوں۔“

”پھر۔۔۔۔۔ گھر کے اخراجات کس طرح پورے ہوتے ہیں؟“ سمیرا خاتون نے اُس کے چہرے

اتار چڑھاؤ کا اندازہ لگاتے ہوئے سوال کیا۔

”پیٹ کا ایندھن تلاش کرنے کی خاطر کچھ نہ کچھ تو کرتا پڑتا ہے لیکن۔۔۔۔۔“ وہ بولتے بولتے خا

ہو گیا۔ نظریں جھکا کر ہونٹ کاٹنے لگا۔

”لیکن کیا۔۔۔۔۔؟“

”ایک وقت کی روٹی بھی بمشکل نصیب ہوتی ہے۔“ اُس نے دبی زبان میں جواب دیا۔

”کہاں تک پڑھ رکھا ہے۔۔۔۔۔؟“

”جی۔۔۔۔۔“ اُس نے چونک کر سمیرا خاتون کی طرف دیکھا پھر اس انداز میں کھانسنے لگا جیسے

موذی مرض میں مبتلا ہو، کھانسی کا دورہ ختم ہوا تو وہ ہانپتے ہوئے بولا۔ ”گریجویٹ ہوں لیکن صحت

پھر وہ خاموش ہو کر ہونٹ چبانے میں مشغول ہو گیا۔

”نوشاہ کی ماں سے تمہاری پہلی شادی ہے یا اس سے پیشتر بھی شادی کر چکے ہو؟“

”یہ میرا بھی معاملہ ہے۔“ اُس نے پہلی بار کسی قدر زور دے کر انداز میں جواب دیا۔

”کچھ رقم کی ضرورت ہے؟“

”جی۔۔۔۔۔“ اُس نے لپٹائی ہوئی نظروں سے سمیرا خاتون کی طرف دیکھا، ایک ٹانے کے لے

کی بوڑھی آنکھوں کی چمک میں اضافہ ہو گیا لیکن پھر وہ سنبھل گیا، تھوڑے وقفے سے بولا۔ ”میں

کسی رقم کی لاچ میں نہیں آتا ہوں۔“

”نوشاہ کی محبت صحیح لائی ہوگی۔“ سمیرا خاتون نے طنز یہ انداز اختیار کیا۔ ”اُسے دیکھنے آئے

جی۔۔۔۔۔ جی نہیں۔“ وہ سپاٹ آواز میں بولا۔ ”میں نوشاہ کو ساتھ لے جانے کی غرض سے آیا ہوں۔“

”باپ پر حال میں باپ ہوتا ہے..... کیا تمہیں نوشاہہ کے مستقبل سے کوئی دلچسپی نہیں؟“
”نہ ہوتی تو اُسے ساتھ لے جانے کی خاطر یہاں تک کیوں دوڑا چلا آتا؟“ اُس نے غم جو اب دبا کھڑا کھانے لگا۔

”ہوسکتا ہے کہ وہ تمہارے ساتھ جانے سے انکار کر دے۔“
”میں جانتا ہوں..... اُس نے کبھی مجھے باپ سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔“ وہ کھانسی پر قابو پاتے ہوئے
”اگر جھوٹ بول رہے ہو.....“ سمیرا خاتون نے تیزی سے کہا۔ ”کوئی جوان لڑکی بلاوجہ اپنے
کی دلہیز سے باہر قدم نہیں نکالتی..... جب بھی کوئی ایسی کہانی جنم لیتی ہے اس کے پس منظر میں کس
کسی مرد کا ہاتھ ضرور ہوتا ہے.....“

”نوشاہہ نے آپ کو کیا کہانی سنائی ہے؟“
”میں نے اُس سے پوچھنا مناسب نہیں سمجھا..... اس لئے کہ اگر وہ غلط راستے کی مسافر ہو
میرے ساتھ رہنے کی بجائے کوئی اور ٹھکانا بھی تلاش کر سکتی تھی۔“
”پھر..... اُس نے گھر چھوڑنے کی حماقت کیوں کی؟“

”یہ اُس کا نجی معاملہ ہے.....“ سمیرا خاتون نے سپاٹ آواز میں جواب دیا تو اقبال ام
چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا، کچھ دیر خاموش بیٹھا کسی خیال میں گم رہا پھر تھکے لہجے میں بولا۔
”آپ کا کیا فیصلہ ہے..... کیا نوشاہہ میرے ساتھ.....“

”یہ میرا نہیں خود نوشاہہ کا فیصلہ ہے۔“
”نازلی اس معاملے میں چلی نہیں بیٹھی گی.....“ اُس کے تیور بدلنے لگے۔ ”بات عزت کی آبا
تو انسان سب کچھ کر گزرتا ہے۔“
”میں تمہارا مقصد نہیں سمجھ سکی۔“

”آپ عزت دار خاتون ہیں.....“ اقبال احمد کا لہجہ معنی خیز تھا۔ ”یہ ماں بیٹی کا معاملہ ہے، بات
کچھری عدالت تک چلی گئی تو مفت میں آپ کی بھی رسوائی ہوگی.....“

”اوہ..... آئی سی!“ سمیرا خاتون نے نفرت سے کہا۔ ”تم مجھے خوفزدہ کرنے کی کوشش کر رہے
“آپ غلط سمجھ رہی ہیں.....“ اقبال احمد نے پہلی بدلتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں تو آپ کو
امکانی خطرے سے آگاہ کر رہا تھا ورنہ میری طرف سے دونوں ماں بیٹیاں جیٹھی میں پڑیں..... میں
تو نازلی کو بھی سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ بیٹی کا خیال دل سے نکال دے..... لڑکی ایک بار گھر سے
نکال دے تو پھر آسانی سے پلٹ کر واپس نہیں آتی.....“ وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے بولا۔ ”مفت میں
بھی غوار کرادیا۔“

”تم اب جا سکتے ہو.....“ سمیرا خاتون نے خشک اور فیصلہ کن لہجے میں کہا تو اقبال احمد انہیں
ہوا اٹھ کھڑا ہوا..... اُس کے تیور خراب نظر آ رہے تھے لیکن وہ ضبط سے کام لیتے ہوئے جانے
ارادے سے پلٹا..... انداز بالکل ایسا ہی تھا جیسے کوئی ہارا ہوا جواری اپنی زندگی کی آخری پوچی بھی
لگا بیٹھا ہو۔ سمیرا خاتون اُسے غور سے دیکھتی رہیں، وہ دروازے تک پہنچا تو انہوں نے اُسے آواز
کر واپس بلالیا۔
”جی.....؟“ اُس نے میز کے قریب آکر پڑا امید نگاہوں سے سمیرا خاتون کی طرف دیکھا۔

”میں ایک شرط پر نوشاہہ کو تمہارے ساتھ واپس بھیج سکتی ہوں۔“
”جی.....“ اُس کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ ”وہ کیا.....؟“
”نوشاہہ کا حساب علیحدہ ہے، میں اُسے درمیان میں نہیں لانا چاہتی لیکن.....“ سمیرا خاتون نے
جہ ہونے لگا۔ ”میں نے اُسے گھر پر رکھ کر جو کچھ خرچ کیا ہے اُس کا خسارہ کون بھگتے گا؟“
”اندازاً کتنی رقم بنتی ہے؟“ اقبال احمد نے تیزی سے پوچھا۔
”چار مہینے کے چار ہزار سے تو کیا کم اٹھے ہوں گے۔“ سمیرا خاتون نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔
”چار ہزار.....“ وہ کسی سوچ میں پڑ گیا پھر جلدی سے بولا۔ ”اگر آپ میری زبان پر بھروسہ کریں تو
ایک شادی کے فوراً بعد یہ رقم میں آپ کو ادا کر دوں گا.....“
”بعد میں تم کمر گئے تو.....؟“

”آپ چاہیں تو اپنے اطمینان کے لئے مجھ سے تحریر لکھوا لیں.....“
”ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ ایک وقت کی روٹی بھی مشکل سے نصیب ہوتی ہے۔ پھر چار ہزار کی رقم
ذہبت کہاں سے کرو گے؟“

”جی..... وہ..... نازلی کی خوشی کی خاطر کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔“
”ایک بات پوچھوں اقبال احمد.....؟“
”جی..... پوچھیے!“

”اگر تمہاری اپنی کوئی بیٹی ہوتی تو کیا تم اُس کا سودا بھی اسی انداز میں کر ڈالتے؟“
”جی..... میں سمجھا نہیں۔“

”میک آؤٹ.....“ سمیرا خاتون غصے سے بے قابو ہو کر بولیں۔ ”ایک بات اور کان کھول کر سن لو!
اُنے دوبارہ کبھی میرے اُس آنے کی کوشش کی یا نوشاہہ کی ذات کو کوئی نقصان پہنچانے کی حماقت
تمہاری زندگی جیل میں چلی پیٹے گزر جائے گی۔“
”آپ.....“

”ٹھٹ آپ.....“ سمیرا خاتون نے غصے میں لرزتے ہوئے پوری شدت سے چیخ کر کہا پھر چڑای
غور بلا کر حکم دیا۔ ”اس بد بخت کو دھکے دے کر پھاٹک سے باہر چھوڑ آؤ اور چوکیدار سے کہو کہ اگر یہ
میں اندر آنے کی کوشش کرے تو اسے بے دریغ گولی مار دے..... باقی میں سنبھال لوں گی۔“

اقبال احمد نے صورت حال کو اچانک خطرناک ہوتے محسوس کیا تو عزت اسی میں بھی کہ اُلے
دل واپس لوٹ جائے۔ چنانچہ وہ جلدی سے پلٹا اور لمبے لمبے قدم اٹھاتا دفتر سے باہر نکل گیا۔
جی اُس کے پیچھے پیچھے تھا۔

اقبال احمد کے جانے کے بعد سمیرا خاتون کسی زخمی شیرنی کی طرح دبیز قالین پر ٹہلنے لگیں۔ غصے کی
ش سے اُن کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا، بار بار وہ منٹھیاں جھینچنے لگیں۔ پھر ٹہلنے ٹہلنے اچانک انہوں نے
کراس فریم کی جانب دیکھا جس میں مرحوم شوہر کی مسکراتی ہوئی تصویر آویزاں تھی..... سمیرا خاتون
تم نے ایک زہریلا جسم ابھر آیا، وہ مکملی باندھے تصویر کو دیکھتی رہیں..... جیسے کہنا چاہ رہی ہوں.....
میں نے دیکھا افتخار..... اقبال احمد تمہاری تصویر کا دوسرا رخ تھا..... ایک تم تھے..... جس نے اپنی
دل کی خاطر ایک عورت کی زندگی کو جہنم بنا دیا..... اُس کے ہونٹوں سے مسکراتی جھین کر صلیب پر
لٹا دیا..... تم بھی مرد تھے..... تم نے ایک شوہر کے روپ میں اپنی بیوی کی خواہشات کو اپنے

ہو گی جو آپ اچانک اس قدر سنجیدہ ہو گئے۔۔۔۔۔ رہا کھانے کا سوال تو آج آپ نے جس تکلف
بات کیا ہے وہ میں بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔۔۔۔۔

”میں آپ کی بات کی تردید نہیں کروں گا۔“ جمال احمد نے بڑے بڑ وقار انداز میں زیر لب
راتے ہوئے جواب دیا۔ ”دراصل آج معاملے کی نوعیت ہی کچھ ایسی تھی کہ مجھے دیدہ و دانستہ تکلف
کا ہر لینا پڑا۔۔۔۔۔ یہ خیال درپیش تھا کہ کہیں آپ میری بسیار خوری دیکھ کر منصور کے سلسلے میں بھی کوئی
بائے کام نہ کر لیں اور میرے کئے کی سزا بلا وجہ بیٹے کو چھٹکتی پڑے۔“

”آپ بھی کمال کرتے ہیں جمال بھائی۔۔۔۔۔ میں اور آپ کو کھانا چپتا دیکھ کر خوش نہ ہوں گی؟“
”ہم نے بہنوئی کو چھیڑتے ہوئے کہا۔“ اب بھی وقت ہے۔۔۔۔۔ آپ کہیں تو شاہی ٹکڑوں کی ڈش
کر لے آؤں۔۔۔۔۔“

”آپ نے بطور خاص شاہی ٹکڑوں ہی کا نام کیوں لیا؟“
”اس لئے کہ شاملہ جاتی ہے کہ آپ مضائقہ کھانے کے کس قدر شوقین ہیں اور خاص طور پر شاہی
نے آپ کی کمزوری ہیں۔“ شاملہ بیگم بولیں۔

”آج بھی آپ کی نظریں بار بار اسی ڈش کی جانب اٹھ رہی تھیں۔“ شاملہ بیگم نے کہا۔
”ہو سکتا ہے کہ اس کی وجہ کچھ اور رہی ہو۔۔۔۔۔“ جمال احمد نے شوقی سے جواب دیا۔

”اور کیا وجہ ہو سکتی ہے؟“ شاملہ بیگم نے پوچھا۔

”کیوں وقار بھائی۔۔۔۔۔ سچ بولنے کی اجازت ہے؟“

”یہ آپ دونوں کا معاملہ ہے۔۔۔۔۔ آپس ہی میں طے کر لیں تو مناسب ہو گا۔“ وقار احمد نے
اتنے ہوئے کہا۔ ”مجھے چونکہ اسی گھر میں رہنا ہے اس لئے میرا خاموش رہنا زیادہ بہتر ہو گا۔“
”یہ کی اچھی رہی۔۔۔۔۔“ جمال احمد نے کہا پھر اپنے لئے سگار سلگانے لگے۔

”آپ نے ابھی تک وجہ نہیں بتائی۔“ شاملہ بیگم نے اصرار کیا تو جمال احمد دبی زبان میں بولے۔
”یہ آپ کو یاد ہے کہ شاہی ٹکڑوں کی ڈش آپ کے سامنے رکھی تھی۔۔۔۔۔ میری نظروں کا بار بار اٹھنا
ناہر تھا۔“

”اس میں ہی آپا جان، جمال بھائی کی باتیں؟“ شاملہ بیگم نے مسکراتے ہوئے بہن سے شکایت کی۔
”تم تو ایک مدت سے ان باتوں کی عادی ہو چکی ہوں۔۔۔۔۔ اب کچھ تم بھی سنو۔۔۔۔۔“

”اب تو میں کسی قیمت پر وہ ڈش نہیں لاؤں گی۔“ شاملہ بیگم نے بہنوئی کو گھورتے ہوئے کہا۔
”آپ کی موجودگی میں مجھے کسی سویت ڈش کی چنداں ضرورت بھی نہیں۔“

”خیر خیال ہے کہ آج جمال بھائی کچھ زیادہ ہی موڈ میں نظر آ رہے ہیں۔“ وقار احمد نے شاملہ بیگم
رہنمائی کرتے ہوئے پوچھا۔ ”کچھ یاد ہے صبح ناشتے میں کیا دیا تھا؟“

”براز کی باتیں ہیں۔۔۔۔۔ سب کے سامنے نہیں بتائی جاتیں۔“ شاملہ بیگم نے برجستہ جواب دیا تو
”مگر ادا ہے۔“

”مگر ایک اُن کے درمیان اسی قسم کی دلچسپ گفتگو کا سلسلہ جاری رہا پھر جمال احمد نے بیوی کی
تلاش ہو کر سنجیدگی سے کہا۔“ خیر خیال ہے کہ اب مطلب کی بات بھی ہو جائے ورنہ کہیں شاملہ
بیگم کو بھی مذاق میں نہ ٹال جائیں۔“

”شاملہ بیگم۔۔۔۔۔ کیا فیصلہ کیا تم نے ہمارے منصور کے بارے میں؟“

قدموں تلے روند ڈالا اور۔۔۔۔۔

اقبال احمد بھی تمہاری ہی طرح ایک مرد ہے۔۔۔۔۔ جو چاندی کے چند چمکتے سکوں کے عوض اپنی
بیٹی کو سر بازار نیلام کر دینا چاہتا ہے۔۔۔۔۔ یوہی مسکراتے رہو افتخار! کہ تمہاری نسل ابھی ختم نہیں ہو
پورے ترک و احتشام کے ساتھ زندہ ہے۔۔۔۔۔!!

○○○

کھانے کے بعد سب بیچ لاؤنج میں جا کر بیٹھ گئے تو وقار احمد، جمال احمد اور شاملہ بیگم کے
ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ شاملہ بیگم بھی اُن کے ہمراہ تھیں لیکن کچھ خاموش خاموش سی نظر آ رہی
اُن کی خاموشی کی وجہ ناہیکہ جواب تھا جو انہیں نادارہ کی زبانی مل چکا تھا۔

نادیہ نے منصور کے سلسلے میں بڑی صاف گوئی سے اپنی پسند کا اظہار کر دیا تھا۔ لیکن ساتھ ہی
دیا تھا کہ جب تک وہ رجسٹریشن نہ کر لے اس سلسلے میں کوئی حتمی کارروائی نہ کی جائے، اپنی اس
کا اظہار کرتے ہوئے اُس نے نہایت معقول جواز پیش کیا تھا۔ اول تو یہ کہ جب تک شاہی بار
طے نہ ہو جائے اُس کی بات پکی کر دینا نامناسب تھا۔ اور دوسرے یہ کہ وہ چاہتی تھی کہ دوسرا
عرصے میں منصور اور وہ ایک دوسرے کو خوب اچھی طرح پرکھ لیں تاکہ زندگی کا ایک اہم فیصلہ
طرح غور و خوض کرنے کے بعد کیا جائے۔

نادیہ کی بات اپنی جگہ درست تھی لیکن شاملہ بیگم کو بڑی بہن کی خاطر بھی منظور تھی اس لئے
کے دوران مستقل یہی سوچ رہیں کہ ایسا کون سا طریقہ اختیار کیا جائے کہ نادیہ کی بات بھی
اور بہنوں کے دلوں میں کوئی گرہ بھی نہ پڑنے پائے۔

”کیا بات ہے شاملہ۔۔۔۔۔؟“ شاملہ بیگم نے بہن کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔
”خلاف معمول کچھ خاموشی دکھائی دے رہی ہو۔“

”شاملہ کی جگہ آپ ہوتیں تو اس وقت آپ کی بھی یہی کیفیت ہوتی۔“ جمال احمد نے ص
بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”لو کی کے مستقبل کا فیصلہ کرنا دنیا کی ہر ماں کے لئے زندگی کا سب سے پیچیدہ
ترین مسئلہ ہوتا ہے۔“

”کیوں شاملہ۔۔۔۔۔؟“ شاملہ بیگم نے بہن کو پیار سے دیکھا تو وہ جلدی سے بات بناتے ہوئے
”آپ کی موجودگی میں بھلا میں کون ہوں فیصلہ کرنے والی؟“

”خدا تمہیں سلامت رکھے جو تم ایسا جھٹکتی ہو۔“
”اس میں مجھنے کی کیا بات ہے؟“ شاملہ بیگم نے شوہر کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

”نیک امی جان اور آپ کا سایہ سروں پر قائم ہے اُس وقت تک مجھے کوئی فکر کرنے کی کیا ضرورت
”یہ آپ کی لیاقت ہے شاملہ بہن جو آپ ایسا جھٹکتی ہیں۔ لیکن ایک بات آج میں بھی صاف
بتا دینا چاہتا ہوں۔“ جمال احمد نے اس قدر سنجیدگی سے کہا کہ سب ہی کی نظریں اُن کے
جانب اٹھ گئیں۔

”وہ کیا۔۔۔۔۔؟“ شاملہ بیگم نے سنبھل کر دریافت کیا۔
”یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ ہم نے آپ کے گھر کا نمک کھایا ہے مگر آج ہم جواب
آسانی سے نہیں نکلیں گے۔“

”آپ نے تو ذرا ہی دیا تھا۔“ شاملہ بیگم اطمینان کا سانس لیتے ہوئے بولیں۔ ”میں سمجھی

”میں سمجھ رہا ہوں۔۔۔۔۔“ جمال احمد نے نہایت بردباری سے کہا۔ ”ہمیں شاہی کے جذبات کا احترام کرنا بھی ضروری ہے۔۔۔۔۔“

”میں تو بڑے ارمانوں سے آج نادیہ کو انگوٹھی پہنانے کے ارادے سے آئی تھی۔“ شاہانہ بیگم نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

”آپ کی خوشی اگر اسی میں ہے تو ہمیں کوئی انکار نہیں۔“ وقار احمد نے بڑی سالی کا دل رکھنے کی ہلکہ۔

”میں اس جلد بازی کے حق میں نہیں ہوں۔“ جمال احمد سگار کا کش لگاتے ہوئے سنجیدگی سے کہنے لگا۔ ”بات بدوں کے درمیان طے ہوگئی۔۔۔۔۔ ہمارے لئے یہی بہت ہے۔۔۔۔۔ رہی منگنی کی انگوٹھی تو وہ ناکہ بین کے پاس بطور امانت رکھی جاسکتی ہے۔ جب شاہی کی بات پکی ہو جائے تب دونوں بہنوں کی ایک ساتھ بھی ہو سکتی ہے۔۔۔۔۔ آپ کا کیا خیال ہے۔۔۔۔۔؟“ آخری جملہ جمال احمد نے بیوی کو مخاطب کر کے کہا تو وہ یوں چونکیں جیسے کوئی خواب دیکھ رہی ہوں، پھر جلدی سے بولیں۔

”جیسی آپ کی مرضی۔۔۔۔۔“

”کیوں۔۔۔۔۔ کیا آپ کو شاہی کی شادی سے کوئی دلچسپی نہیں؟“

”کیوں نہیں۔۔۔۔۔“ شاہانہ بیگم نے جلدی سے کہا۔ ”میں تو دن رات خدا سے یہی دعا کرتی ہوں کہ لاکشترہ احمد کے ساتھ طے ہو جائے۔۔۔۔۔ خدا انظر بد سے بچائے، بہت ہی لائق اور نہایت فرمانبردار لگا ہے۔۔۔۔۔“

”نثار بھائی اب کی گرمیوں میں آنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔۔۔۔۔“ شاہانہ بیگم نے کہا۔ ”مجھے یقین ہے لاکشترہ احمد کا معاملہ اُن کی موجودگی ہی میں طے ہو جائے گا۔“

”اور اُس وقت تک منصور کی انگوٹھی تمہارے پاس امانت رہے گی۔“ شاہانہ بیگم نے اپنے پرس سے راز رنگ کی ایک ڈیا نکال کر شاہانہ بیگم کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

شاہانہ بیگم نے ایک نظر شوہر کی طرف ڈالی پھر بہن کی خوشی کی خاطر انگوٹھی کو سنبھال کر رکھ لیا۔!!



رائیل نے کرنل عابد کی عالیشان کوشی کے سامنے پہنچ کر حسبِ عادت ٹائی اور کالر کو درست کیا پھر رستے ڈرتے کال بیل پر انگلی رکھی۔ کچھ دیر بعد پھانک کھلا اور اُس کے ساتھ ہی کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دی تو رائیل اُچھل کر دو قدم پیچھے ہو گئے۔ وہ تو اچھا ہوا جو اُس خوشوار کتے کی زنجیر چوکیدار کے ہاتھوں میں تھی اگر کھلا ہوتا تو شاید رائیل کی خوش لباسی کو یسر نظر انداز کر کے اُن سے بغل گیر ہونے کی خاطر حسرت لگا چکا ہوتا۔

”قادی۔۔۔۔۔“ چوکیدار نے آنے والے کی حیثیت کا اندازہ لگاتے ہوئے گھڑکی دی تو وہ یوں دُم اسنے لگا جیسے رائیل سے برسوں سے واقف ہو اور دُم ہلا کر اس بات کا یقین دلانے کی کوشش کر رہا ہو۔ لہٰذا برسوں سے بے تکلفی ہو وہاں اس قسم کی اُچھل کود تو ہوتی ہی رہتی ہے۔

رائیل نے کتے کو رام ہوتے دیکھا تو دل کی دھڑکنوں کو سنبھالتے ہوئے آگے بڑھے لیکن اس ت کے لئے خود کو پوری طرح آمادہ کئے ہوئے تھے کہ اگر قادی دوبارہ اچانک کسی بد اخلاقی کا مظاہرہ کرنے کی جسارت کرے تو اُس کے شر سے محفوظ رہ سکیں۔

”فرمائیے جناب۔۔۔۔۔ آپ کو کس سے ملنا ہے؟“ چوکیدار نے بڑے مہذب انداز میں رائیل سے

”میں آپ کے حکم سے انکار کس طرح کر سکتی ہوں؟“ شاہانہ بیگم نے گول مول جواب دیا۔

گواہ ہے منصور مجھے اپنے بچوں سے کم عزیز نہیں۔“

”گویا ہم آپ کی طرف سے نادیہ کے سلسلے میں ہاں سمجھیں؟“ جمال احمد نے پوچھا۔

”میں نے ناگب کہا۔۔۔۔۔ نادیہ جیسے میری بیٹی دیے ہی آپ کی۔“

”ہماری خوشی ہے کہ منصور کا رزلٹ آتے ہی اس فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔“

• ”آپ تو بھیلی پر برسوں جمانے کی بات کر رہے ہیں۔“ شاہانہ بیگم نے کہا۔ ”کچھ ہم تیاری کا موقع دیں۔ اور پھر ابھی تو نادیہ کی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری ہے۔“

”تعلیم کا سلسلہ رسم کی ادائیگی کے بعد بھی جاری رکھا جاسکتا ہے۔“ جمال احمد نے کہا۔

”کی ضمانت میں دیتا ہوں۔“

”اس کی ضمانت تو آپ کے بھائی صاحب نے بھی دی تھی۔“ شاہانہ بیگم نے شوہر کی جانب ہوتے ہوئے کہا۔ ”لیکن نتیجہ کیا نکلا۔۔۔۔۔؟“

”کیا مطلب۔۔۔۔۔؟“ جمال احمد نے چونکے بغیر کہا۔ ”کیا اب تک جو نتیجہ نکلا ہے آپ مطمئن نہیں ہیں؟“

”آپ جان۔۔۔۔۔“ شاہانہ بیگم شرماتے ہوئے بولیں۔ ”آپ نے بہت ڈھیل دے رکھی۔ بھائی کو۔۔۔۔۔ سنا آپ نے، بات کہاں سے کہاں لے گئے۔“

”میں نے کوئی ایسی بات بھی نہیں کہی جو آپ خفا ہو رہی ہیں۔۔۔۔۔“ جمال احمد نے سادگی راست اپنی صفائی پیش کی۔

”ان دونوں کا مذاق چلتا رہے گا وقار بھائی۔۔۔۔۔ آپ بتائیے، آپ نے کیا طے کیا ہے؟“ منصور کے سلسلے میں؟“

”نادیہ آپ ہی کی بیٹی ہے، جب چاہیں اُسے ساتھ لے جائیں لیکن میرا خیال ہے کہ اس ایک خاص مدت کے لئے ملتوی کر دیا جائے تو زیادہ مناسب ہو گا۔“ وقار احمد نے سنجیدگی جمال احمد انہیں وضاحت طلب نظروں سے دیکھنے لگے۔

”میں آپ کا اشارہ نہیں سمجھی۔۔۔۔۔“ شاہانہ بیگم نے پوچھا۔ ”کیا کوئی خاص بات ہے؟“

”بات دراصل یہ ہے کہ میں نے منصور میاں کے سلسلے میں نادیہ کی مرضی دریافت کر لی تھی۔“

”پھر۔۔۔۔۔ نادیہ نے کیا جواب دیا؟“

”خدا کا شکر ہے کہ اُس نے رشتے سے انکار نہیں کیا۔“ وقار احمد نے تفصیل بیان کرتے ہوئے ”نادیہ نے صرف اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ اگر رسموں کی ادائیگی اُس کے گرجویشن کے زیادہ مناسب رہے گا۔“

”نہایت معقول خیال ہے نادیہ بیٹی کا۔“ جمال احمد نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”ہمیں بھی کوئی اعتراض نہیں لیکن اگر بزرگوں کے درمیان بات پکی ہو جائے اور کوئی چھوٹی رقم تو بظاہر کوئی حرج بھی نہیں۔“

”آپ کا کہنا سچا ہے لیکن۔۔۔۔۔“

”دراصل ابھی تک بھائی صاحب کی جانب سے ٹاکے سلسلے میں کوئی بات شروع نہیں۔“

ایسی صورت میں، میں نادیہ کے معاملے میں کسی رسم کی ادائیگی۔۔۔۔۔“

”جی ہاں.....“ راجیل نے قدرے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”تعلیم مکمل کرنے کی کراچی آیا ہوں۔“

”تمہارا باپ بہت بیمار اور دلیر آدمی تھا..... فورس لینڈنگ کرنے کے معاملے میں تو اپنا ثانی نہیں تھا۔ لیکن ٹھوڑا جذباتی تھا، ہنسنے ہنسنے ایک دم ریش (RASH) ہو جاتا اس کی پرانی عادت تھی۔ غصے کی کھیلنا تھا، لیکن بھی اتفاق سے ہار جاتا تو اس طرح سیریس ہو جاتا جیسے محاذ جنگ سے واپس ہو۔ مرد آدمی تھا..... لیکن تم نے یہ حلیہ کیا بنا رکھا ہے؟“ کرنل عابد نے اس کے مرحوم باپ کی بات کرتے کرتے اچانک اسے گھور کر حلیے کے بارے میں سوال کیا تو راجیل بی طرح شیشا گیا، لمبے کواں خیال آیا کہ وہ جلدی میں سوٹ کا کوٹ تو پہننا نہیں بھول گیا..... لیکن وہ اپنی جگہ موجود اس نے ٹائی کی ٹاٹ کو ٹٹولا بظاہر وہ بھی ٹھیک محسوس ہوئی۔

”تم نے ابھی کہا تھا کہ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے کراچی آئے ہو.....“

”جی ہاں.....“

”پھر یہ سوٹ کیوں پہن رکھا ہے..... میں گولی مار دوں گا۔“ کرنل عابد نے پہلی بار اپنا تکیہ کلام ہال کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ”جب تک تعلیم مکمل نہ ہو جائے طالب علم کو صرف اپنی پڑھائی دل لگانا چاہئے..... اور پھر ٹائی پن کا رواج تو بہت پرانا ہو چکا ہے..... تمہارا کیا خیال ہے؟“

”آپ درست فرما رہے ہیں.....“

”کیا مطلب.....؟“ کرنل عابد نے پاپ کا ڈھواں اڑاتے ہوئے کہا۔ ”گویا تم جان بوجھ کر ہاتھوں کا ارتکاب کر رہے ہو جو تمہارے خیال میں بھی فی الحال نامناسب ہیں۔“

”سوری انکل..... آئندہ سے خیال رکھوں گا۔“ راجیل نے جلدی سے جان چھڑانے کی خاطر کہا۔

”گڈ..... خوشی ہوئی تم سے مل کر..... تمہارا باپ بھی میرا بہت احترام کرتا تھا۔“ کرنل عابد نے لوگوں کی نظروں سے دیکھا پھر بولے۔ ”کون سی جماعت میں پڑھتے ہو؟“

”جی..... ایف اے میں۔ اس سال فاسٹ کا انعام دوں گا۔“

”ٹان سنس.....“ کرنل عابد کا بارہ پھر چڑھ گیا، راجیل کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”ابھی تک صرف اے میں ہو..... میں تو سمجھا تھا شاید ایم اے وغیرہ کی تیاریاں کر رہے ہو گے.....“

”دوسال تک بیمار رہا اس لئے تعلیم کا سلسلہ بریک ہو گیا تھا۔“ راجیل نے جان بچانے کی خاطر لٹ بولا۔

”بھاری!..... اور جوانی میں؟..... میں گولی مار دوں گا۔“ کرنل عابد غراتے ہوئے بولے۔ ”میری - غور سے دیکھو، کیا ساٹھ سال کا لگتا ہو.....؟ جانتے ہو میری صحت کا راز کیا ہے..... روزانہ صبح چھ سات میل واکنگ کرتا ہوں..... کل سے تم بھی چلا کر میرے ساتھ۔“

”اوہ..... ایف، اے کا فاسٹ ختم ہو جائے تو ضرور چلا کروں گا۔“ راجیل نے صوفے پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

”تمہاری می کیا کرتی ہیں..... میرا مطلب ہے کہ سیر ملز ابھی تک قائم ہے یا.....“

”اب تو می نے اپنا کاروبار خاصا پھیلایا ہے۔“

”گڈ..... انسان کو کبھی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھنا چاہئے ورنہ صحت کو زنگ لگ جاتا ہے..... اور ٹیکس تو حکمران سے دلچسپی پیدا کر لے۔“ کرنل عابد سے کہا پھر راجیل کو سوالیہ نظروں سے گھورتے

دریافت کیا۔

”میں..... یہیں پڑوس میں وقار احمد صاحب کے بنگلے میں مقیم ہوں..... لاہور سے آیا ہوں۔ راجیل نے بوکھلاہٹ میں اپنا پورا تعارف کرا ڈالا۔ ”میرے ڈیڑی کا نام اسکوڈرن لیڈر افتخار تھا۔ خدا جنت نصیب کرے ایئر کریٹس میں شہید ہو کر اللہ کو پیارے ہو گئے۔“

چوکیدار کے علاوہ اعلیٰ نسل کا اسمیشن کتابھی راجیل کو بغور دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے ذرا آگے بڑھ کر اپنی قوت شامہ کے ذریعے راجیل کے بیان کی تصدیق کرنے کی کوشش کی تو چوکیدار نے ایک پھر اسے جھڑک دیا۔ ”ٹائی..... خبردار!“

کتا دوبارہ دم ہلانے لگا تو چوکیدار نے معذرت طلب لہجے میں کہا۔

”معاف کیجئے گا سر..... کرنل صاحب نے ابھی اسے حال ہی میں باہر سے منگوایا ہے اس نوواردوں کو دیکھ کر بے قابو ہونے لگتا ہے، کچھ دنوں میں یہاں کے ماحول سے مانوس ہو جائے گا تو.....“

”مجھے راجیل کہتے ہیں۔“ راجیل نے قدرے اڑ کر چوکیدار کی بات کاٹی۔ ”کیا تمہارے صاف گھر پر تشریف رکھتے ہیں؟“

”سوری سر!“ چوکیدار ایک دم اٹنشن پوزیشن میں آ گیا۔ ”آپ تشریف لائیں..... کرنل صاف لان ہی میں بیٹھے ہیں۔“

راجیل نے ڈرتے ڈرتے بھانک کے اندر قدم رکھا تو سبزے کا حسن دیکھ کر ٹائی کا خوف دل جاتا رہا۔ حد بندی کے ساتھ ساتھ جھپٹتے پھولوں کی کیر یوں کو بڑی خوبصورتی سے رنگ برنگے پودوں سے آراستہ کیا گیا تھا، روش کے دونوں طرف گلاب کے مختلف اقسام کے پودے اپنی بہار رہے تھے، سبزے کے دونوں کونوں پر صنوبر کے پیڑ لان کے حسن کو دوبالا کر رہے تھے۔ راجیل بائیں جانب والے سبزے کی خوبصورتی کو دل ہی دل میں سراہ رہے تھے کہ دائیں جانب والے سے ایک بھاری بھر کمردانہ آواز سن کر یوں اٹھلے جیسے چوکیدار کے ہاتھ سے کتے کی زنجیر چھوٹ جا۔ کے خیال نے خوفزدہ کر دیا، جلدی سے گھوم کر دیکھا تو لان کے درمیان بید کے صوفے پر ڈیرہ گاؤں میں ایک قد آور شخصیت ہونٹوں کے درمیان پائپ دبائے راجیل کو پرکھنے والی سنجیدہ نظروں۔ گھور رہی تھی۔ صوفے کے درمیان بید ہی کی گول میز موجود تھی جس پر چائے کی ایک خالی پیالی ڈرائی فروٹ کی پلیٹیں رکھی ہوئی تھیں، راجیل ایک لمبے کے لئے جھجک پھر..... ”جل تو جلال تو، صاف کمال تو، آئی بلا کوٹال تو“ کا ورد کرتے ہوئے صوفے کے قریب جا کر ٹک گئے۔

”خاکسار کو راجیل افتخار کہتے ہیں۔“

”میں شاید تمہیں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔“ کرنل عابد نے اسے سر سے پاؤں تک گھورا تو راجیل ایک ہی سانس میں اپنا پورا فخر و نسب سنا ڈالا۔

”اوہ..... تو گویا تم اسکوڈرن لیڈر افتخار کے بیٹے ہو.....“

”جی ہاں.....“

”تو پھر کھڑے کیوں ہو..... بیٹھ جاؤ!“ کرنل عابد نے اپنائیت کا اظہار بھی ایسے دنگ لہجے میں کیا کہ راجیل جلدی سے ایک خالی صوفے پر اس انداز میں بیٹھ گئے جیسے حکم عدولی کی صورت میں اپنے کورٹ مارشل کا خطرہ لاحق ہو۔

”نادرہ نے تذکرہ کیا تھا..... تم غالباً وقار احمد صاحب کے یہاں مقیم ہو.....“

ہوئے پوچھا۔ ”کیا تم نے بھی شکار کھیلا ہے؟“

”جی نہیں..... ابھی تک کوئی ایسا اتفاق نہیں ہوا.....“

”کوئی بات نہیں..... کبھی میرے ساتھ چلنا، میں تمہیں دکھاؤں گا کہ کتنے جنگلات میں شکار ہوا اور آدم خورد درندوں کے درمیان کس طرح آنکھ پجھتی ہوتی ہے..... لیکن دراصل شکاری وہی کہلاتا ہے بڑے جانوروں کا شکار کرے..... مرغائیاں اور تیز شیر مارنا میرے نزدیک سچ اوقات سے زیادہ چیز نہیں رکھتا..... لطف تو آدم خورد شیر اور چیتوں کو مارنے میں آتا ہے..... کیا تم جانتے ہو کہ چیتا خود بصورت اور معصوم نظر آتا ہے اتنا ہی خوشخوار، عیار اور پھر تپلا بھی ہوتا ہے..... اس طرح دبے قدموں کراہنے دشمن پر چھپتا ہے کہ اسے سنبھلنے کا موقع نہیں ملتا، اور.....“

”راجیل صاحب..... آپ.....؟“ پشت سے نادرہ کی آواز سنائی دی تو راجیل کو ایسا محسوس ہوا جیسے تھے ریگستان میں کوئی خلستان مل گیا ہو..... وہ جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا..... پلٹ کر دیکھا تو نادرہ ان کی طرف آ رہی تھی۔ حسب معمول وہ اس وقت بھی سفید پتلون اور سیک شائل شرٹ میں لباس کر کے کھلے ہوئے دراز کیسو اس کے شانوں پر بٹھرے بہت حسین لگ رہے تھے..... ”آپ کب آئے؟“

نادرہ نے راجیل کے قریب آ کر بے تکلفی سے پوچھا۔

”میں گولی مار ڈوں گا.....“ کرنل عابد بنی گو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے۔ ”ابھی میں نے شکار کا قصہ شروع کیا تھا اور تم نے آکر سارا مزہ کر کر اکر دیا۔“

”اوہ نو ڈیڈ.....“ نادرہ نے بڑے لاڈ سے باپ سے شکوہ کیا۔ ”اگر آپ اسی طرح میرے واقف کاروں کو شکار کے قصے سناتے رہے تو پھر لوگ یہاں آنا جانا بند کر دیں گے..... اُس روز گت بھی کہا رہی تھی۔“

”گت کون..... اوہ..... وہ بھورے بالوں والی لڑکی جسے میں پیار سے وائلڈ کیٹ کہتا ہوں۔ کرنل عابد مسکرا کر بولے۔ ”کہاں ہے وہ..... ادھر بہت دنوں سے نظر نہیں آئی۔“

”اپنے ڈیڈ کے ساتھ باہر گئی ہوئی ہے، دس پندرہ روز میں واپس آ جائے گی۔“ نادرہ نے باپ سے کہا پھر راجیل کو لے کر اندر آ گئی۔

راجیل نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھا تو اُسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی شیش محل میں آ گیا ہو۔ دیواروں پر چاروں طرف بڑے بڑے اسموک کمر کے شیشے نظر آ رہے تھے، چھت سے لٹکے ہوئے فانوس اور کٹ گلاس کے لائٹ شیڈ بھی اپنی مثال آپ تھے، زمین پر دبیز قالین موجود تھا جس کے اطراف قیمتی صوفے بڑی فحاشت سے ترتیب دیئے گئے تھے۔ درمیانی میز کے دونوں طرف خوشبو چیتوں کی کھال لٹھو پڑی سمیت موجود تھی۔ دیگر سامان بھی اتنا قیمتی اور نایاب تھا کہ راجیل ایک لمبے ڈرائنگ روم کی حباوت میں کھو کر رہ گئے۔

”آج آپ ادھر کا راستہ کیسے بھول گئے؟“

نادرہ کی آواز کانوں میں گونجی تو راجیل نے چلدی سے اپنی توجہ اُس کی جانب مبذول کر لی، سارا

اپنی طرف داری کر رہے تھے اور میری بات کو کوئی اہمیت نہیں دے رہے تھے۔“

”شاید ابھی تک تھا ہیں۔“

”نادرہ نے میری بات کو مذاق سمجھ کر اڑا دیا اور میں خفا بھی نہ ہوں؟“ نادرہ نے بڑے دل آویز لہجے سے کہا۔ ”وہ تو آپ تھے جو میں زہر کا گھونٹ پی گئی..... آپ کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو میں اُس کی شکل دیکھنا بھی گوارہ نہ کرتی.....“

”وہ نوازی ہے آپ کی، لیکن میں کیا کرتا؟“ راجیل نے بڑی انکساری سے کام لیا۔ ”اگر میں بات نہ مانتا تو وہ ناراض ہو جاتی.....“

”اب آپ کو نادیہ کی خاطر زیادہ منظور ہے.....“ نادرہ نے تیوری پر بل ڈال کر اُسے تکیہ نظروں مانور راجیل گڑ بڑا گئے۔

”اب حالات کی نزاکت کو سمجھنے کی کوشش کریں..... دراصل بات یہ ہے کہ میں اُن کے یہاں مقیم ہوں.....“

”تو ایسی کوئی خاص مجبوری نہیں۔“ نادرہ پہلو بدل کر تیزی سے بولی۔ ”اگر آپ وہاں نہیں رہنا چاہتے تو شوق سے ہمارے یہاں آ جائیے!“

”بت بہت نوازش آپ کی لیکن.....“

”ماں کیوں نہیں کہتے کہ آپ نادیہ کو نہیں چھوڑ سکتے۔ اُس میں سرخاب کے پڑ جو لگے ہوئے ہیں۔“

”ب..... ب..... بخدا..... ایسی کوئی بات نہیں۔“ راجیل نے نادرہ کے لہجے میں پیار کی کک لیا تو اُسے منانے کی خاطر بولے۔ ”آپ اپنے دل سے یہ وہم نکال دیں.....“

”مال کتنی ہوں یہ وہم..... لیکن ایک شرط پر۔“ نادرہ نے بدستور زور دے انداز میں کہا۔

”کیا.....؟“

”آپ وعدہ کریں کہ ہفتہ میں کم از کم ایک بار ضرور آئیں گے۔“

”نادرہ.....“ راجیل نے نہایت فرمانبرداری سے وعدہ کر لیا۔

”ہارے درمیان جو گفتگو ہوگی آپ اُس کا تذکرہ بھی نادیہ سے نہیں کریں گے۔“

”اگلے نہیں کروں گا.....“

”میری موجودگی میں آپ نادیہ کی طرف داری بھی نہیں کریں گے۔“

”اب بتی ہیں تو نہیں کروں گا۔“ راجیل نے کسی شکل بنا کر اتنی بے بسی سے اپنا جملہ ادا کیا کہ

ایک لمحہ کی ضبط کرنی مشکل ہو رہی تھی..... کچھ دیر تک وہ راجیل کو بدستور شکایتی انداز میں گھورتی ہوئی کر بولی۔

”میری موجودگی میں آپ کسی بھی گیم میں نادیہ کے پارٹنر نہیں بنیں گے۔“

”نادرہ.....“

”ایک وعدہ اور بھی کریں.....“ نادرہ نے راجیل کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”آپ خوب

پرہیز کریں گے..... نادیہ کی نہیں، میری خاطر۔“

”میں..... میں..... کتنا خوش نصیب ہوں جو آپ اتنے پیار سے میرا مستقبل سنوارنے کی بات کر

رہے.....“ راجیل نے شرماتے کی کوشش کی تو اور بھی مضحکہ خیز نظر آنے لگے..... نادرہ نے بمشکل اپنی

کے ہوئے کہا۔

”آپ نہیں جانتے راحیل..... آپ کس قدر خوبیوں کے مالک ہیں لیکن مجھے آپ کی ایک ادائیگی نہیں لگی۔“

”وہ کون تھا؟“

”اُس روز آپ جب ان کو بوجھ کر منصور سے ہارنے کی کوشش کیوں کر رہے تھے؟“

”بس..... یوں ہی.....“ راحیل نے زبردستی مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”منصور کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟“

”کس سلسلے میں؟“

”میرا اندازہ ہے کہ منصور صاحب، نادیر کے قریب ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”جی نہیں.....“ راحیل نے جلدی سے کہا۔ ”انہیں اپنے بارے میں کچھ زیادہ ہی غلط فہمی ہے۔“

”ورنہ نادیر تو انہیں گھاس بھی نہیں ڈالتی.....“

”پھر گھاس کہاں جاتی ہے؟“ نادیر نے سنجیدگی سے راحیل کو گھورتے ہوئے سوال کیا۔

”آپ بھی تو.....؟“

”جی نہیں.....“ راحیل نے نادیر کی نگاہوں کے بدلتے زاویوں کو محسوس کیا تو جلدی سے!

دلانے کی خاطر بولے۔ ”مجھے بھلا کیا ضرورت ہے اُن میں دلچسپی لینے کی..... وہ تو بس یونہی اُنہیں بول لیتا ہوں۔“

”راحیل..... آپ کتنے اچھے اور سادہ لوح ہیں۔“ نادیر نے ایک خوبصورت سا قسم گداز ہونٹوں

سجا کر پیار سے کہا تو راحیل اپنی جگہ پہلو بدل کر رہ گئے..... نظریں جھکا کر بولے۔

”آپ نے بنا دیا ہے.....“

”ٹائی کی جگہ آپ بوکیوں استعمال نہیں کرتے؟“ نادیر نے بڑی اپنائیت سے کہا۔ ”میرا خیال

کہ بو باندھ کر آپ زیادہ سمارٹ لگیں گے۔“

”کہیں باہر باندھ کر آپ کا حکم پورا کر دوں گا۔“

”کیوں..... یہاں کیا خطرہ ہے؟“

”آپ کے ڈیڑی گولی مار دیں گے..... وہ تو سوٹ اور ٹائی کی بھی مخالفت کر رہے تھے۔“

راحیل نے کرنل عابد سے ہونے والی گفتگو کی تفصیل بیان کی تو نادیر اپنی فہمی ضبط نہ کر سکی.....

اختیار زندگی سے بھرپور تہمت بکھیرنے لگی..... راحیل کچھ دیر خاموش بیٹھے نادیر کے تہمتوں کی وجہ

کی کوششوں میں مصروف رہے، پھر کچھ سمجھ میں نہ آیا تو خود بھی مسکراتا شروع کر دیا۔

○○○

فون کی گھنٹی بجی تو نادیر نے اس طرح لپک کر ریسیور اٹھایا جیسے بڑی دیر سے اُسی کال کی منتظر ہو

”ہیلو.....“

”نادیر وس انڈ.....“ دوسری جانب سے حسب توقع نادیر کی چپکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

”جلدی سنا..... کیا رہا؟“ نادیر نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے ماڈتھ پیس میں کہا۔ رابدار ہی

کے سوا اور کوئی نہیں تھا، صائمہ اور فرحان باہر لان میں کھیلنے میں مصروف تھے، شامک بیگم باہر برآمد

میں عصر کی نماز پڑھ رہی تھیں اور ثنا اپنے کمرے میں تھی۔

”ایمان سے لطف آگیا۔“ نادیر بولی۔ ”بڑا ہی دلچسپ لطفہ ہاتھ آیا ہے۔“

”ہوں نہیں..... شروع سے پوری تفصیل سنا!“

”جھیل نہ پوچھنا دیہ! ورنہ درمیان میں کچھ باتیں رازداری کی بھی آجائیں گی۔“ دوسری جانب

نادیر نے خنڈی سانس بھری تو نادیر بھلا گئی۔

”دانا تو نہیں چل گیا تھا؟“ راحیل اتنے یوسف ثانی بھی نہیں کہ تو پہلی ہی نظر میں گھائل ہو جائے۔“

”گھائل نہ سہی..... زخمی تو ہو سکتی ہوں۔“

”جے میری قسم، باتوں باتوں میں ٹالنے کی کوشش نہ کر۔“ نادیر نے بے صبری کا اظہار کیا۔ ”کتنی

بے خبری کال کی منتظر تھی۔“

”جے کہہ رہی ہوں..... اگر تو ہوتی تو راحیل کی حرکتوں کو دیکھ کر لوٹ پوٹ ہو جاتی۔“

”پھر وہی..... میں فون بند کر رہی ہوں۔“ نادیر نے دھمکی دی تو نادیر نے پوری تفصیل چٹارے

رہ شروع سے آخر تک سنا ڈالی، نادیر مسکرا مسکرا کر تمام باتوں سے لطف اندوز ہوتی رہی، جب نادیر

لے ہوئی تو اُس نے کہا۔

”تم نے بہت اچھا کیا جو اُس شتر بے مہار کو تعلیم پر توجہ دینے کے لئے پابند کر دیا۔“

”بڑھ لکھ کر کام کا آدمی بن گیا تو ممکن ہے اپنے ہی کسی کام آجائے۔“

”کیا مطلب..... کہیں تو مذاق مذاق میں جے جے سنجیدہ تو نہیں ہو گئی؟“

”اچھی تو اے کوئی آثار پیدا نہیں ہوئے لیکن آئندہ کے بارے میں کچھ یقین سے نہیں کہا جاسکتا۔“

”بے تکلفی سے کہا۔“ ویسے آڑے وقتوں میں کام بھی آسکتا ہے..... مجھے تو اُس کی انکساری اور

راہزنہ صلاحیتوں پر حیرت ہو رہی ہے..... بہت ہی ٹرینڈم کا ماڈرن مجنوں نظر آ رہا تھا۔“

”تم کہیں سلی کا بارٹ ادا کرنا نہ شروع کر دینا، ورنہ انکل جے جے گولی مار دیں گے۔“

”ای بات پر تو تجھے سب سے زیادہ حیرت ہو رہی ہے کہ راحیل نے ڈیڑی کو بھی پہلی ہی ملاقات میں

ہاتھ کر لیا ہے۔“ نادیر نے کہا۔ ”اُس کے جانے کے بعد کہہ رہے تھے کہ لڑکا بے حد ہونہار اور

امہذب واقع ہوا ہے۔“

”لیکن نہیں مانتی.....“ نادیر بولی۔ ”انکل کے انٹرویو سے تو خود میں بھی پناہ مانگ گئی تھی، راحیل کیا

”تم کچھ بھی کہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ ڈیڑی اُس کی تعریف کر رہے تھے..... ویسے ممکن ہے کہ اس کی

ہو کہ وہ راحیل کے گھر والوں سے پرانی واقفیت رکھتے ہیں۔“

”یہ تو خیر میں مانتی ہوں کہ یہ شخص بہت حرفوں کا بنا ہوا ہے۔ لیکن پہلی ہی ملاقات میں اُس نے

میں اتنے مرحلے کو طے کر لیا یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔“

”اچھی تو تمہیں پہلے مرحلے کی فکر پڑی ہے اور مجھے دوسرا مرحلہ بھی آسان ہوتا دکھائی دے رہا

”نادیر نے دوسری بار خنڈی سانس بھر کر کہا۔ ”ایمان سے.....“

”جے اُس کی باتیں رہ رہ کر گند کا

”اے.....“

”اے تو شاید مجھے بنانے کی کوشش کر رہی ہے..... اس لئے بائی بائی..... باقی باتیں ملنے کے بعد

”نادیر..... میری بات تو سن!“

”اے نادیر نے کوئی جواب نہیں دیا، ریسیور رکھ کر مسکراتی ہوئی ملی تو ٹھٹھک کر رہ گئی، منصور جانے

کب سے وہاں کھڑے اُس کی باتیں سن رہے تھے، اُس نے جلدی سے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔
”آپ کب آئے.....؟“

”ابھی ابھی حاضر ہوا ہوں۔ آپ فون پر مصروف تھیں اس لئے.....“

”امی جان سے ملاقات ہوئی.....؟“ وہ منصور کی آنکھوں میں پیار کے ساغر چھلکتے دیکھ کر جھل سے بولی۔ ”ابھی تو برآمدے میں نماز پڑھ رہی تھیں۔“

”اُن کی دعائیں لینے کے بعد یہی یہاں تک پہنچا ہوں۔“ منصور نے بڑی خوبصورتی سے بات کہی۔ ”صائمہ اور فرحان لان میں کھیل رہے ہیں۔“ نادیا نے منصور کی بات کا مفہوم سمجھ کر زہرا مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آئیے اوہیں چلتے ہیں۔“

”ایسی جلدی بھی کیا ہے.....؟“

”نہیں تو نہ سہی.....؟ وہ بے پروائی سے شانے اُچکاتے ہوئے بولی۔

”مجھے آپ کی یہی صاف گوئی پسند ہے۔“ منصور نے شوقی سے جواب دیا۔

”کیا منگو اؤں آپ کے لئے..... جائے یا شربت.....؟“ نادیا نے قدرے شرماتے ہوئے کہی۔ ”اپنی تعریف سن کر مجھے اخلاقاً آپ کی تو آغوش کرنی پڑے گی۔“

”میں اس بے تکلفی کا شکریہ ادا کرتا بھی اپنا فرض سمجھتا ہوں۔“

”مجھے علم ہے کہ آپ نے بارہر کر تہذیب میں اعلیٰ قابلیت کا امتحان پاس کر رکھا ہے۔“

”اور کیا جانتی ہیں آپ میرے بارے میں.....؟“ منصور نے اُسے غور سے دیکھا تو نہ جانے کہ وہ ان آنکھوں کا مقابلہ نہ کر سکی۔ جلدی سے دراز پکلیں آنکھوں پر گرالیں، کچھ دیر تک دل کی بے تڑدھڑکنوں پر غور کرتی رہی پھر سنبھل کر بولی۔

”ابھی تعلیمی مدارج طے کر رہی ہوں اس لئے کچھ زیادہ نہیں جانتی..... ہو سکتا ہے تعلیم مکمل کر کے بعد کچھ سوجھ بوجھ آجائے۔“

”یقین جانئے..... میں آپ کے فیصلے سے بہت خوش ہوں۔“ منصور نے آہستہ سے کہا۔

”کس فیصلے کی بات کر رہے ہیں؟“ وہ دل پر قابو نہ پاسکی تو سوال کر بیٹھی۔

”وہی..... جو آپ نے نادرہ کی زبانی خالدہ جان تک پہنچایا تھا.....“ منصور نے خوابیدہ انداز سرگوشی کی تو نادیا کا پورا وجود گنگنا اٹھا، اُس نے جلدی سے دوبارہ نگاہیں جھکا لیں، دل ہی دل منصور کے بارے میں سوچنے لگی۔

اُسے تو ڈر تھا کہ منصور جب اُس کا فیصلہ سنیں گے تو ضرور شکوہ کریں گے..... عام لوگوں کی طے اُسے اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کریں گے، مجھے دار باتوں سے ایک لڑکی کی جچی سوچ کو مستحق کی رنگینوں کی لالچ دے کر شیشے میں اتارنے کی کوشش کریں گے..... اپنی خوشیوں اور مسرتوں حاصل کرنے کی خاطر وہ اُسے فیصلہ بدلنے کی ترغیب دیں گے۔

لیکن کچھ بھی تو نہیں ہوا..... اُس کے خیالات کے برعکس منصور نے کس قدر ٹھوس لہجے میں اُسے فیصلے کو سراہا تھا..... کسی اپنائیت سے اُس کی سوچ پر صداقت کی مہر ثبت کی تھی..... ایک ہی جملے نہ جانے کتنی منزلیں چھلانگ گئے تھے..... اتنی جلدی..... کتنے ہم خیال بن گئے تھے..... اور..... ”شاکہاں ہیں..... نظر نہیں آرہیں.....“ منصور کی مدہم آواز اُس کے کانوں میں گونجی تو خیالات شیرازہ بکھر گیا۔ اُسے ایک بار پھر منصور کی اعلیٰ ظرفی کی داد دینی پڑی..... اُسے شرماتا دیکھ کر

ہوتی سے موضوع بدل دیا تھا۔

”آپ شاید اپنے کمرے میں ہیں..... کیوں.....؟“

”ممانے ایک دوپٹہ ٹانگنے کے لئے بھیجا ہے.....“ منصور نے سادگی سے جواب دیا۔

”خالدہ جان کو ابھی تک رنگے، پنے اور ٹیکے ہوئے دوپٹے اوڑھنے کا شوق ہے.....“

”اب کچھ ڈیڈی کی خوشی کی خاطر کرتی ہیں۔“ منصور بولے۔ ”اگر ممّا کا بس چلے تو وہ شاید بند لباس ہی استعمال کریں۔“

”تو بڑی اچھی بات ہے.....“ نادیا نے خوش ہو کر کہا۔

”غند کپڑے پہنتا.....؟“

”جی نہیں.....“ نادیا نے جلدی سے جواب دیا۔ ”ایک دوسرے کا خیال رکھا..... ذہنوں میں مطابقت

ممانے پیدا ہو جائے تو زندگی کتنی خوشگوار ہو جاتی ہے..... کیسے پیار اور سکون سے گزر جاتی ہے۔

”دوسری صورت میں آئے دن آپ میں کھٹ پٹ ہوتی رہتی ہے..... بات بات پر کمرار شروع ہو جاتا ہے۔“

”اور پھر زندگی کس قدر تلخ ہو جاتی ہوگی.....“ وہ بڑی سادگی سے بولی۔

”اسی لئے تو بزرگوں کا قول ہے کہ جب ایک فریق غصے میں ہو تو دوسرے کو خاموشی اختیار کر لینی چاہیے۔“

”انسان اگر پہلے ہی سے ایک دوسرے کی خوشیوں اور آرزوؤں کا احترام کر لے تو غصے کی نوبت یوں آئے.....“ نادیا نے بہت معصومیت سے کہا۔

”اسی لئے تو میں آپ کے فیصلے کو سراہنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ منصور کا لہجہ پھر شوق ہو گیا، نادیا آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولے۔ ”ورنہ دو سال کا طویل انتظار.....“

”آپ چپ نہیں رہیں گے.....؟“ اُس نے بڑی اپنائیت سے منصور کو گھورتے ہوئے سرزنش کی نوا اپنی معصوم ادا پر پیار آگیا تو جلدی سے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا، شرماتی، لجائی، نظریں کے تیزی سے منصور کے قریب سے کتر کر گزر گئی۔

اور منصور کو اچانک اُس آزاد نظم کا خیال آگیا جو انہوں نے برسوں پہلے سنی تھی، نظم کے خوبصورت ڈالنے کا انوں میں گونجنے لگے۔

رات..... کچھ ایسے ہی عالم میں کئی۔

میں کوئے چینی تو کہہ سکتے ہیں.....!!

مجان سے تعبیر دے سکتے نہیں.....!!

آنکھ لگنے پر سکون قلب تھا.....!

آنکھ لگنے پر مجسم اضطراب.....!!

مجھے ساری رات دو متضاد خواب.....

آنکھ کی پلکوں پہ ہی کھیلنا کئے.....

نادیا کی کئی ایسے ہی حسین خواب کی طرح اُن کے سامنے سے کتر کر گزر گئی تھی..... پھر باہر سے شاملہ آواز سنائی دی تو منصور، شاکہ کے کمرے کی طرف جانے کی بجائے برآمدے کی جانب لوٹ گئے۔

میڈیکل کالج میں داخلہ لینے کے بعد شاکی مصروفیات اتنی پڑھ گئیں کہ سر اٹھانے کی بھی فراموشی نہ رہی، صبح سویرے ہی گھر سے چلی جاتی..... دوپہر کو کھانسی مامدی آتی، کچھ دیر کمر سیدھی کرنے کے بعد مولیٰ مولیٰ کتابوں سے سر کھپانے کے لئے بیٹھ جاتی۔ راجیل کے امتحان شروع ہونے میں چند دن باقی گئے تھے اس لئے اسے نوکس تیار کرنے کے بعد اسے بھی پڑھانے کی خاطر تھوڑا بہت وقت نکالنا پڑا۔ نادیہ کے امتحان بھی قریب تھے اس لئے دونوں بہنیں کمرے میں بند ہر وقت پڑھائی میں مصروف رہتیں۔ البتہ صائمہ کے میٹرک کے امتحان ختم ہو چکے تھے اس لئے راوی اس کے حق میں جین لکھنا فرحان کو اپنے نتیجے کا انتظار تھا..... اس کے امتحان صائمہ سے بھی پہلے ہو چکے تھے۔

آج بھی شاکی کالج سے واپس لوٹی تو بڑی کھلی کھلی نظر آ رہی تھی، چہرے پر عجیب اضطرابی سی کڑی طاری تھی، یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کچھ سہی سہی ہو۔ شامکہ بیگم نے دیکھا تو اُن کا ماتھا ٹھک اٹھا۔ نے چونکہ ابھی ابھی گھر میں قدم رکھا تھا اس لئے انہوں نے فوری طور پر اُس سے پریشانی بوکھلاہٹ کی وجہ دریافت کرنے کی جلدی نہیں کی البتہ دل ہی دل میں اُس کا سبب جاننے کی کوشش میں مصروف رہیں۔

شامکہ بیگم نے چونکہ اپنے زمانے میں لڑکیوں کے کالج میں پڑھا تھا اس لئے مخلوط تعلیم کے خلاف تھیں اور پھر میڈیکل کالج کے بارے میں تو انہوں نے بہت کچھ سن رکھا تھا، اخباروں ذریعے بھی انہیں ہنگامہ آرائی کی خبریں آئے دن ملتی رہتیں۔ اسی لئے انہوں نے شا کے سلسلے ڈاکٹری پڑھنے کی دبی دبی زبان میں مخالفت کی تھی لیکن جب وقار احمد اور پھر جمال احمد نے بھی ڈاکٹر شاکی کی توجہ خاموش ہو گئیں۔

شاکی کھانے کی میز پر بیٹھی آہستہ آہستہ لقمے لے رہی تھی، انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ زبردستی کھا رہی تھی۔ شامکہ بیگم قریب ہی بیٹھی اُس کے چہرے کا بغور جائزہ لے رہی تھیں، اُن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح گفتگو کا آغاز کریں؟ لیکن جب اُس نے چار پانچ لقمے حلق سے اتارنے کے بعد سے اُبکا لئی اور تیزی سے اُٹھ کر غسل خانے کی طرف دوڑی تو شامکہ بیگم کے پیروں تلے کی زمین گئی..... ذہن میں برے برے خیال آنے لگے، جلدی ہے اُٹھ کر وہ بھی شا کے پیچھے پیچھے چلیں۔ کی اُبکائیاں لینے کی آوازیں انہیں دُور سے سنائی دے رہی تھیں۔

”خدا خیر کرے“ شامکہ بیگم نے اپنے آپ سے کہا پھر غسل خانے کے دروازے پر جا کر ڈک جیٹا۔ شا نے ماں کو دیکھا تو اُس کے ہونٹوں پر ایک خوفزدہ نیم تڑپ کر رہ گیا، جلدی سے منہ پر پانی چھینے مار کر باہر آگئی لیکن چہرے پر پھیلی ہوئی زردی بتا رہی تھی کہ وہ اندر ہی اندر کتنی بات سے ہوا ہو رہی ہے۔

”کیا بات ہے بیٹی.....؟“ شامکہ بیگم نے دبی آواز میں پوچھا۔ ”آج تمہاری طبیعت کچھ نامسا آ رہی ہے۔“

”نکان کا سبب ہے امی جان..... کچھ دیر میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔“ شا نے مسکرانے کی کوشش کی۔

”میرا جی نہیں مانتا..... تم اپنے کمرے میں چل کر آرام کرو! میں ڈاکٹر کو فون کرتی ہوں۔“

”دوپہر کو کون ڈاکٹر ملے گا امی جان..... آپ بلا وجہ پریشان نہ ہوں۔“

”کیا کالج میں کوئی بات ہو گئی ہے.....؟“

”نہیں تو۔“

”اسی لوگ نے کوئی الٹی سیدھی بات کی ہے.....؟“ شامکہ بیگم نے اُس کے ساتھ کمرے میں بیٹے ہوئے معلوم کیا تو شا جلتے جلتے رُک گئی۔

”آپ نے یہ اندازہ کیسے لگایا.....؟“

”تمہاری حالت دیکھ کر.....“ شامکہ بیگم نے اُس کے تاثرات کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے ڈرا آہنے میں اپنا حلیہ دیکھو..... سرخی تو نام کو نظر نہیں آ رہی۔“

”میں نے کہا نا امی جان..... نکان کی وجہ سے.....“

”میں نہیں مانتی.....“ شامکہ بیگم نے اُس کی بات کا نٹے ہوئے تیزی سے کہا۔ ”کوئی نہ کوئی بات ہے جو تم مجھ سے چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔“

”اُمی جان.....“ شامکہ بیگم نے اُس کی بات کا نٹے ہوئے تیزی سے کہا۔ ”کوئی نہ کوئی بات ہے جو تم مجھ سے چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔“

”اُمی جان.....“ شامکہ بیگم نے اُس کی بات کا نٹے ہوئے تیزی سے کہا۔ ”کوئی نہ کوئی بات ہے جو تم مجھ سے چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔“

”اُمی جان.....“ شامکہ بیگم نے اُس کی بات کا نٹے ہوئے تیزی سے کہا۔ ”کوئی نہ کوئی بات ہے جو تم مجھ سے چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔“

”اُمی جان.....“ شامکہ بیگم نے اُس کی بات کا نٹے ہوئے تیزی سے کہا۔ ”کوئی نہ کوئی بات ہے جو تم مجھ سے چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔“

”اُمی جان.....“ شامکہ بیگم نے اُس کی بات کا نٹے ہوئے تیزی سے کہا۔ ”کوئی نہ کوئی بات ہے جو تم مجھ سے چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔“

”اُمی جان.....“ شامکہ بیگم نے اُس کی بات کا نٹے ہوئے تیزی سے کہا۔ ”کوئی نہ کوئی بات ہے جو تم مجھ سے چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔“

”اس سلسلے میں.....؟“ وقار احمد نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔ پھر جب بیوی سے تفصیل سنی تو لڑکھوئے۔ ”میڈیکل کے طلباء طالبات کو تو اس قسم کے تجربوں سے آئے دن گزارنا پڑتا ہے..... ہاں ہی سے پریشان ہو رہی ہیں۔“

”میں سمجھا رہی تھی کہ تجربہ کرتے وقت لڑکے اور لڑکیاں سب ساتھ ہوتے ہیں۔“

”میں سمجھا نہیں..... آپ کہنا کیا چاہ رہی ہیں؟“

”آخر جا اور شرم بھی کوئی چیز ہوتی ہے..... کیا تجربے علیحدہ علیحدہ نہیں کرائے جاسکتے؟“

”اس اعتبار سے تو پھر طالبات کے لئے لیڈیز پروفیسر بھی ہونی چاہئیں۔“ وقار احمد نے بیوی کی اُم کی محسوس کرتے ہوئے کہا۔

”ہونی تو چاہئیں.....“

”کسی دوسرے کے سامنے ایسی بات زبان پر نہ لائیے گا، ورنہ وہ ہنسے گا آپ کی باتوں پر.....“

”کیوں..... اس میں آخر ہنسنے کی کون سی بات ہے.....؟“

”مجھے کی کوشش کیجئے بیگم..... زمانہ بہت ترقی کر گیا ہے۔“ وقار احمد نے بیوی کو سمجھاتے ہوئے

”میڈیکل پروفیشن میں عورت اور مرد کی تمیز نہیں ہوتی..... یوں بھی جہاں موت اور زندگی کا پیچیدہ

لہر چل رہی ہو، وہاں ذہن آلودگیوں سے پاک ہوتا ہے۔“

”آپ نے ٹھیک کہا..... لیکن پانچوں انگلیاں برابر بھی نہیں ہوتیں۔“

”بجائے شاد..... مگر آپ کو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ تالی صرف ایک ہاتھ سے نہیں جیتی.....“

”آپ جیسا مناسب سمجھیں..... لیکن مجھے نہ جانے کیوں یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا.....“

”ہمت سے کام لیں بیگم..... شاید حوصلہ بڑھانے کی کوشش کریں۔“ وقار احمد بولے۔ ”اگر آپ نے

طاہراتی نہ کی اور اُس کی ہمت ابھی سے ٹوٹ گئی تو وہ مستقبل میں ایک کامیاب ڈاکٹر کیسے بنے گی؟“

”مٹانے تو پوری طرح انسانیت کی خدمت کرنے کا عزم کر رکھا ہے.....“

”یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے.....“

”ہے تو سہمی لیکن ہمارے اوپر جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے مجھے اُس سے ڈر لگتا ہے۔“ شائلہ بیگم

ہوئے ہوئے جواب دیا۔ ”دشمنوں کے منہ میں خاک..... اگر کل کلاں کو خدا نخواستہ کوئی الٹی سیدھی

نہ ہوگی تو ہم.....“

”اللہ پر بھروسہ رکھئے..... وہ بڑا کارساز ہے، دلوں کے بھید جانتا ہے، ہمیں اُس کی ذات سے

میرٹھیں ہونا چاہئے۔“

”کچھ پتہ چلا کہ غار بھائی کیب تک واپس آ رہے ہیں؟“

”آج ہی فون پر گفتگو ہوئی تھی..... کچھ کاروباری مصروفیات درپیش ہیں جس کی وجہ سے اُن کے

لے گا پروگرام وقتی طور پر ملت گیا ہے لیکن یہ بھی کہہ رہے تھے کہ جلدی ہی آنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔“

”کیا طرح بنا اور احمر کی بات سنی ہو جائے تو میرے سر سے ایک بڑا بوجھ اتر جائے۔“

”میرا خیال ہے کہ آج آپ کو کٹا کے پاس ہونا چاہئے۔“ وقار احمد نے بیوی کی اُمھن کو محسوس

سے ہوئے بات کا رخ بدلنے کی کوشش کی۔

”وہ کس لئے.....؟“

”ہوسکتا ہے وہ سوتے میں ڈر جائے..... شروع شروع میں تو ایسا ہوتا ہے اس کے بعد تو چیر پھاڑ

شائلہ بیگم کو بیٹی کی پریشانی کی اصل وجہ معلوم ہوئی تو اطمینان کا سانس لینے ہوئے

”ڈاکٹری پڑھنے میں تو یہی سب کچھ ہوتا ہے..... اسی لئے میں نے مخالفت کی تھی۔ ویسے آپ

نہیں اُمی..... نہیں۔“ شائلہ نے خود کو سنبھالتے ہوئے جلدی سے کہا۔ ”قصائی بھی جب پہلی

جانور کے گلے پر چھری پھیرتا ہے تو اُس کے دل کے کسی گوشے میں بھی خوف کی ایک لہر ضرور

گی..... اس کے بعد وہ ان باتوں کا عادی ہو جاتا ہے، میں بھی رفتہ رفتہ لاشوں کی چیر پھاڑ کرنا

عادی ہو جاؤں گی..... آج پہلا اتفاق تھا اس لئے وقتی طور پر سہم گئی۔“

”لیکن میں پوچھتی ہوں کہ لیڈی ڈاکٹر بننے کی ایسی ضرورت بھی کیا ہے؟“

”ضرورت ہے اُمی جان.....“ شائلہ بیگم نے بولی۔ ”آج ہم نے جس لاش پر تجربہ کیا ہے

کسی لاوارث یا غریب کا مردہ جسم ہوگا جسے مرنے کے بعد ابھی تک دفن ہونا بھی نصیب نہیں ہوا

سکتا ہے کہ اگر بروقت اُس کے مرض کی تشخیص ہوگئی ہوتی تو وہ بچ جاتا..... ممکن ہے اُس کے ہاں

علاج کے لئے اتنا پیسہ نہ رہا ہو جو وہ موت کے ہاتھوں زندگی کا سودا کر سکتا..... دنیا میں نہ جانے

ایسے بد نصیب انسان ہوں گے جو موت اور زیت کے سنگم پر پڑے اڑیاں رگڑ رہے ہوں۔

زندگی بچانے کی خاطر اُن کی جیب اتنی وزنی نہیں ہوگی کہ وہ دوا دارو کر سکیں..... میں ڈاکٹر ضرور

گی..... دولت کے انبار جمع کرنے کی خاطر نہیں..... انسانیت کی خدمت کے لئے، ایسے مجبور

مریضوں کی زندگی بچانے کی خاطر جو اپنی غربت کی وجہ سے سسک سسک کر دم توڑ دیتے ہیں۔

ایچھے ڈاکٹر کی خدمات حاصل نہیں کر سکتے..... ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ڈاکٹر تو مسیحا ہوتا ہے.....

کسی کی زندگی بچانے سے منہ کیوں پھیر لیتا ہے..... اتنا شقی القلب کیوں بن جاتا ہے.....؟“

شائلہ بولی رہی، ذہن کا بوجھ ہلکا ہوا تو چہرے سے خوف کے اثرات بھی زائل ہونے لگے۔

کی صداقت نے اُس کے دل سے وہ دہشت نکال دی جو آج کالج میں ایک سر دلاش پر تجربہ

وقت اُس کے دل و دماغ پر طاری ہوئی تھی..... کس قدر ہولناک تھا وہ منظر جب اُس نے منہ

اکڑی ہوئی بے گور و کفن لاش کو اتنے قریب سے دیکھا تھا.....

پھر..... جب پروفیسر نے اُس کے مردہ جسم کے ایک حصے پر نشتر لگایا تو وہ ساری جان

اٹھی..... کسی ایسے مقصوم پودے کی مانند جو اپنا چاک طوفان کی زد میں آ گیا ہو..... اُس نے ایک

کے لئے آنکھیں بند کر لیں لیکن جب پروفیسر نے طالب علموں کو جسم کے اس حصے اور رگ پھار

بارے میں بتانا شروع کیا تو شائلہ نے ڈرتے ڈرتے آنکھ کھول دی..... اُس کا جی اندر سے متلا رہا

وہ خود کو اپنے قدموں پر سنبھالے کھڑی رہی، پروفیسر کے ایک ایک جملے کو ذہن نشین کرتی رہی۔

لیکن..... جب کلاس ختم ہوئی تو اُس کا جی اُٹنے لگا، آخری پیریڈ خالی تھا اس لئے وہ کانٹا

پکڑ کر واپس آ گئی، ماں کی خاطر دل پر جبر کر کے میز پر بیٹھی تو لاش کا تصور اُس کی نگاہوں کے

ابھر آیا اور وہ خود پر قابو نہ رکھ سکی..... مگر ماں کے سامنے اپنے ذہن کا بوجھ اتار دینے کے بعد

خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔

شائلہ بیگم نے بیٹی کی جذباتی باتیں سنیں تو خاموش ہو گئیں، قریب بیٹھی اُسے تسلیاں دیتی،

لیکن جب رات کو شوہر کے سانچہ اپنی خواب گاہ میں گئیں تو دہی زبان میں کہا۔

”میرا مشورہ ہے کہ آپ شائلہ کے سلسلے میں ایک بار پھر غور کر لیں!“

روزمرہ کا معمول بن جاتی ہے۔“
 ”آپ نے ٹھیک کہا.....“ شائلہ بیگم جلدی سے اٹھتے ہوئے بولیں۔ ”میں جا کر دیکھتی ہوں
 اگر وہ جاگ رہی ہوئی تو میں اُسے اپنے پاس لے آتی ہوں..... آپ ایک روز برابر والے کمرے
 لیٹ رہے گا۔“
 ”جو حکم آپ کا.....“
 شائلہ بیگم خواب گاہ کا دروازہ کھول کر باہر چلی گئیں لیکن پھر یہ دیکھ کر واپس آ گئیں کہ شاہد
 دونوں بے خبری کی نیند سو رہے تھے۔

○○○

راجیل آخری پرچہ دے کر واپس لوٹے تو نادیا، صائمہ اور فرحان کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھی لڑائی
 میں مصروف تھی، اُس کا امتحان دو روز پہلے ختم ہو گیا تھا۔
 فرحان نے راجیل کے چہرے پر خوشی کے تاثرات دیکھے تو فوراً سمجھ لیا کہ آخری پرچہ بھی فی
 سے نپٹ گیا ہے، اُس نے جلدی سے نادیا سے سرگوشی کرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔
 ”باجی..... شکار آ رہا ہے۔“
 نادیا نے ہلٹ کر دیکھا تو راجیل قریب آچکے تھے، اُسے راجیل کے چہرے پر زندگی کے
 دیکھ کر خوشی ہوئی، نادراہ کے اصرار پر اُس نے راجیل کو اُن کی حماقتوں کی تھوڑی بہت سزا
 پروگرام ضرور بنایا تھا لیکن وہ دل سے یہی چاہتی تھی کہ راجیل امتحان میں کامیاب ہو جائیں، اُس
 چاہا کہ راجیل سے اُس کے آخری پرچے کے بارے میں دریافت کر لے، لیکن پھر اپنا ارادہ نہ
 دیا، یوں بے پرواہی نظر آنے لگی جیسے اُسے راجیل سے مطلق کوئی سروکار نہ ہو۔
 ”کیوں راجیل بھائی.....“ صائمہ نے پوچھا۔ ”آج کا پرچہ کیسا ہوا.....؟“
 ”فرسٹ کلاس۔“ راجیل نے اپنی بڑائی کرتے ہوئے کہا۔ ”تین گھنٹے کی بجائے دو گھنٹے
 سارے سوال حل کر ڈالے.....“

”اور اس کے بعد آپ نے ایک گھنٹہ کیسے گزارا؟“ فرحان نے سوال کیا۔
 ”قریب بیٹھے ہوئے دوسرے لڑکوں کی مدد کرتا رہا.....“ راجیل نے ڈیک ماری۔ ”ایک
 صرف تین سوال گر پایا تھا، دو سوال میں نے اُسے بتائے۔“
 ”اور انویگیلیٹر (INVIGILATOR) نے آپ سے کچھ نہیں کہا؟“ صائمہ بولی۔ ”ہا
 میٹرک کے امتحان میں تو بڑی سختی ہوتی ہے، ادھر ادھر دیکھنے پر بھی کڑی پابندی ہوتی ہے۔“
 ”وہ تو ہمارے امتحان میں بھی ہوتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود لڑکے کا رتوس چلاتے رہتے ہیں
 ”کا رتوس کیا.....؟“ صائمہ نے معصومیت سے پوچھا۔
 ”نقل کرنے کے لئے جو پرچیاں پہلے سے تیار کی جاتی ہیں انہیں کا رتوس کہتے ہیں۔“ راجیل
 مسکرا کر کہا پھر کنکھیوں سے نادیا کی جانب دیکھنے لگے جو بدستور بے پرواہی بیٹھی تھی۔
 ”کیا آپ بھی کا رتوس چلانے کے عادی ہیں.....؟“ صائمہ حیرت سے بولی۔ ”یہ تو صاف
 ہوئی.....“

”وہ تو ہے لیکن انسان کامیاب ہونے کے لئے کیا کچھ نہیں کرتا؟“
 ”ایسی کامیابی کس کام کی جو دھوکے سے حاصل کی جائے؟“ فرحان نے کہا، پھر جلدی سے
 ”میری تم کو.....“ راجیل کچھ نہ سمجھ کر بولے۔
 ”اُس کے بعد شابلہ باجی کو.....“ صائمہ نے جلدی سے کہا۔ ”اُس لئے کہ انہوں نے آپ کو بڑھایا ہے۔“
 ”میرا خیال ہے کہ نادراہ کو بھی کچھ کم مسرت حاصل نہیں ہوگی۔“ نادیا نے جان بوجھ کر جملے کٹے
 ”میں کہا تو راجیل اپنی جگہ شٹا کر رہ گئے۔“
 ”کیا آپ کو کوئی خوشی نہیں ہوگی؟“ راجیل نے نادیا کے تاثرات کو محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔
 ”ناہی.....“ جواب دینے کی بجائے ایسی شکایت آمیز نظروں سے راجیل کی طرف دیکھا کہ وہ اپنی
 ”نہی.....“ کا شکار ہو کر زیر لب مسکرانے لگے۔ پھر اس سے پیشتر کہ وہ کچھ کہتے نادیا جلدی سے اٹھ
 ”سے نفی سے منہ موڑ کر اپنے کمرے کی طرف قدم بڑھانے لگی۔
 ”سنئے تو سہی.....“

اندرونی گھٹ گھٹ کر رہا ہو جائیگی۔
اولاد کی خوشیوں کی خاطر وہ اپنی جان بھی داؤ پر لگا سکتی تھیں لیکن یہ بات انہیں کسی طرح گوارا نہیں
کران کی ہونے والی بہو حسب نسب اور خاندانی اعتبار سے ان کی ہم پلہ نہ ہو۔
آج وہ بھی اپنی عالیشان کوٹھی کے یامیں باغ میں بیٹھی احمر کے بارے میں سوچ رہی تھیں کہ قدموں
بٹ نے چونکا دیا، آہستہ سے نظریں گھما کر دیکھا تو احمر قریب آ رہے تھے، خلاف معمول آج وہ بہت
نظر آ رہے تھے، فوزیہ خاتون نے بیٹے کی خوشی کو بھی بڑے معنی خیز انداز میں پرکھنے کی کوشش کی۔
”غیرت تو ہے۔۔۔۔۔ آج تم بہت دنوں بعد بڑے خوش نظر آ رہے ہو۔۔۔۔۔“

”ایسی کوئی خاص بات نہیں۔۔۔۔۔ احمر نے ماں کے لب و لہجہ کو بھانپتے ہوئے سنبھل کر جواب دیا پھر
کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولے۔ ”ابا جان کو آج ایک ایرانی تاجر کی جانب سے ہیرے جواہرات کی
پاکت بڑا آرڈر ملا ہے۔۔۔۔۔ اگر معاملے کی بات طے ہوگئی تو کروڑوں کا منافع ہوگا۔“
”مجھ کو۔۔۔۔۔ تم شاید اسی لئے خوش ہو کہ آرڈر کی سلائی کی خاطر تمہیں ایک بار پھر نیروبی سے باہر
کا موقع مل جائے گا۔“ فوزیہ خاتون نے بیٹے کو ٹٹولنے کی خاطر اپنے الفاظ پر زور دیتے ہوئے
”اس بار تمہاری واپسی کتنے دنوں بعد ہوگی؟“
”غل از وقت یقین سے کیا کہا جاسکتا ہے۔۔۔۔۔ کاروباری معاملات نپٹانے اور پیسوں کے لین دین
مجدد تو لگ ہی جاتا ہے۔“

”تمہارے علاوہ اور بھی بہت سارے ایسے کارندے موجود ہیں جن پر آنکھ بند کر کے اعتماد کیا جا
سکتا ہے۔۔۔۔۔ ابوالمصور ہی کو لے لو، نیروبی میں ہمارے کاروبار کی ابتداء اور اُس کی ملازمت کی معیاد
پایک ہی ہے، تم سے پہلے وہی نیروبی سے باہر کا کام سنبھالتا تھا۔“
”تم آپ کے خیال سے متفق ہوں۔“ احمر نے کہا۔ ”ابوالمصور ہر اعتبار سے قابل بھروسہ ہے،
جواہرات میں اصل و نقل کی شناخت میں بھی وہ مہارت رکھتا ہے۔“
”ہماری مسئلہ تو اصل و نقل کی شناخت ہی کا ہوتا ہے۔“ فوزیہ خاتون نے موقع سے فائدہ اٹھاتے
کہا۔ ”پورے مال میں اگر ایک دانہ بھی نقلی شامل ہو تو انسان کی بنی بنائی ساکھ مٹی میں مل جاتی ہے۔“
”خدا کا شکر ہے کہ ابھی تک ہمارے ساتھ کوئی ایسا ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔۔۔۔۔“

”میں اپنی عزت اور وقار کو برقرار رکھنے کی خاطر آئندہ بھی مقابلہ روی سے کام لینا ہوگا۔“
”چال نیت میں کھوٹ نہ ہو وہاں قدرت بھی بندے کی مدد کرتی ہے۔“
”میں انسان بہر حال غلطیوں کا پتلا ہے۔۔۔۔۔ اُسے شوکر لگتے دیر بھی نہیں لگتی۔“
”میں سمجھا نہیں۔۔۔۔۔ احمر نے وضاحت طلب نظروں سے ماں کو دیکھا، آج انہیں ماں کی گفتگو کچھ
ناگوار رہی تھی۔

”میں تمہارے باپ سے کہوں گی کہ اس بار تمہاری بجائے ابوالمصور کو مال کے ساتھ بھیج دیا جائے۔“
”کیوں۔۔۔۔۔ میرے جانے پر آپ کو کوئی اعتراض ہے؟“
”میں نے کب کہا۔۔۔۔۔“ فوزیہ خاتون بیٹے کو پیار بھری نظروں سے گھورتے ہوئے بولیں۔
”میرے جانے میں کیا حرج ہے؟“ احمر نے اصرار کیا۔
”اگر تمہیں اس بات کا احساس نہیں کہ جب تم گھر سے باہر ہوتے ہو تو میں کتنی شدت سے
مارا دھکتی ہوں۔۔۔۔۔ تمہارے بغیر یہ سب کچھ بڑا سونا سونا لگتا ہے۔۔۔۔۔“

راجیل کی آواز سن کر وہ جاتے جاتے رک گئی، پلٹ کر جھلائے ہوئے لہجے میں بولی۔
”کیا مجھے آواز دینے کی زحمت گوارا کی آپ نے۔۔۔۔۔؟“
”جی ہاں۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ دراصل۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ راجیل، صائمہ اور فرحان کی موجودگی میں
بھلانے کے اور کچھ بھی نہ کہہ سکے۔
نادیہ انہیں گھورتی ہوئی واپس چلی گئی تو فرحان نے راجیل سے کہا۔ ”میرا خیال ہے باجی آپ
خفا ہوگئی ہیں۔۔۔۔۔ آپ کو مٹھائی ساتھ لے کر آنا چاہئے تھا۔۔۔۔۔“
”مٹھائی کیوں۔۔۔۔۔؟“

”اپنی کامیابی کی توقع کی خوشی میں۔۔۔۔۔ ویسے بھی باجی رس ملائی بہت شوق سے کھاتی ہیں۔“
”تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔۔۔۔۔ راجیل نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”رس ملائی تو میں ابھی لے آتا ہوں
تم نے راجیل بھائی سے جھوٹ کیوں بولا؟“ راجیل کے باہر جانے کے بعد صائمہ نے بھائی
کہا۔ ”رس ملائی تو تمہیں زیادہ پسند ہے۔۔۔۔۔ باجی تو اُس کے نام سے چڑتی ہیں۔“
”تم فکر مت کرو۔۔۔۔۔ باجی کے حصے کی بھی میں کھا لوں گا۔۔۔۔۔“
”میں ابھی جا کر باجی سے تمہاری شکایت کرتی ہوں۔“ صائمہ جانے کے لئے اٹھی تو فرحان
اُسے روکتے ہوئے کہا۔

”نی الحال جو مل جائے کھانے پینے کو، اُسی پر قناعت کر لو۔۔۔۔۔ مجھے تو راجیل بھائی کی کامیابی
باتیں بھی پیر بل کی سمجھڑی جیسی معلوم ہو رہی ہیں۔“
”شرم کرو فرحان! تمہیں راجیل بھائی کے سلسلے میں ایسی بات زبان سے بھی نہیں نکالنی چاہئے
صائمہ بولی۔ ”کیا تمہیں اُن کے کامیاب ہونے پر خوشی نہیں ہوگی۔۔۔۔۔؟“
”اسی خوشی میں تو میں نے رس ملائی ایڈوائس منگوا لی ہے۔“ فرحان نے اتنی سادگی سے جواب
کہ صائمہ بھی اُس کی شرارت پر مسکرانے لگی۔ پھر شرم کے آجانے سے بات وہیں ختم ہوگئی۔



فوزیہ خاتون بڑی جہاندیدہ اور دور اندیش خاتون تھیں۔ اتنی سادہ لوح اور معصوم بھی نہیں تھیں
بیٹے کے اندر رونما ہونے والی تبدیلی کو محسوس نہ کر پاتیں، وہ اس بات کو بخوبی محسوس کر رہی تھیں کہ
جب سے کراچی سے لوٹے ہیں ہر وقت اپنے خیالوں میں گم اور کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں۔
دو بار انہوں نے باتوں باتوں میں یوں ہی اولاد کے دل کا بھید جاننے کی کوشش کی لیکن کامیاب
نہیں۔۔۔۔۔ احمر ہمیشہ انہیں کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے ٹال جاتے۔ بھی کام کی مصروفیات کا عذر پیش کر دیتے
اور بھی طبیعت کی ناسازی کی آڑ لے کر بڑی خوبصورتی سے کترا کر نکل جاتے۔۔۔۔۔ اور انہی باتوں
فوزیہ خاتون کو بڑی سنجیدگی سے بیٹے کے مستقبل کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا۔

احمر اُن کی اکلوتی اولاد تھے، انہیں اپنے خون پر مکمل اعتماد تھا۔ وہ ایک ایسا انمول اور نایاب
تھے جس کی تراش خراش میں فوزیہ خاتون نے کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا، اُس کی تربیت اور
بہال میں کسی کوتاہی یا غفلت سے کام نہیں لیا۔ لیکن احمر عمر کے جس دور سے گزر رہے تھے اُس نڈ
نادانی کر بیٹھنے کی توقع بھی بعید از قیاس نہیں تھی۔ وہ جانتی تھیں کہ زمانے کی ہوا بدلنے دیر نہیں لگے
لئے وہ ہر وقت اس خیال سے ڈرتی رہیں کہ کہیں بیٹے نے جوانی کے جوش میں آ کر اپنی زندگی
سفر کے انتخاب میں کوئی غلط فیصلہ کر لیا تو اُن کی زندگی کی تمام اُمکیں، تمام آرزوئیں، تمام حسرت

احمر نے کبھی ماں کے دل کو تکلیف پہنچانے کی کوشش نہیں کی تھی اس لئے ماں کا جواب سن کر نہ ہو گئے لیکن دل ہی دل میں سوچ رہے تھے کہ اگر اُن کا ایران جانا ممکن نہ ہوا تو شاید سے ملاقات پر وگرام بھی ملتوی ہو جائے گا۔ انہوں نے یہی سوچ رکھا تھا کہ جب ایرانی تاجر سے کاروبار معاملات طے پا جائیں گے تو وہ کچھ دنوں کے لئے پاکستان ہوتے ہوئے واپس لوٹ آئیں گے ماں کی ممتا کے آگے مجبور ہو کر رہ گئے۔

”کیا بات ہے..... تم اچانک کس سوچ میں پڑ گئے؟“ فوزیہ خاتون نے بیٹے کے چہرے بدلنے تاثرات کو بغور محسوس کرتے ہوئے دبی زبان میں پوچھا۔

”یہی سوچ رہا تھا کہ اگر آپ کو منظور نہیں تو پھر میں اپنے باہر جانے کا ارادہ ملتوی کئے دیتا ہوں۔“

احمر نے جلدی سے بات بنانے کی کوشش کی۔

”بہت دنوں سے تمہارے سلسلے میں ایک بات اور بھی بڑی سنجیدگی سے سوچ رہی ہوں۔“

”وہ کیا.....؟“

”میرا خیال ہے کہ اب تمہاری شادی بھی ہو جانی چاہئے۔“

”اتنی جلدی کیا ہے امی جان..... ابھی تو.....“

”نہیں.....“ فوزیہ خاتون نے بیٹے کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”میں جب بھی تم سے شادی مسئلہ پر کوئی گفتگو کرتی ہوں تو تم ہر بار کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے ٹال جاتے ہو۔ لیکن اس بار میں نے کوئی بات نہیں سنوں گی۔“

”میں نے آپ کے حکم سے کبھی سر تابی نہیں کی مگر.....“

”اب اگر مگر کوئی گنجائش نہیں..... تم اپنی من مانی کر چکے، اب وہی ہوگا جو میں چاہوں گی۔“

احمر نے کچھ کہنا چاہا لیکن ماں کا احترام مانع تھا، اس لئے ہونٹ کاٹ کر رہ گئے۔ فوزیہ خاتون گہری نظروں سے بیٹے کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا اندازہ لگا رہی تھیں چنانچہ احمر کی خاموشی کرتے ہوئے بولیں۔ ”ایک بات پوچھوں.....؟“

”پوچھیے.....“

”ایران سے کراچی کا فاصلہ کچھ زیادہ تو نہیں.....“

”جی.....؟“ احمر نے اس طرح چونک کر ماں کی جانب دیکھا جیسے رنگے ہاتھوں پکڑے گئے۔

”تجھے میری قسم..... سچ بتا! کیا تمہارا ارادہ پاکستان جانے کا نہیں تھا.....؟“

”تھا تو سہی.....“ احمر نے ماں کی قسم کے آگے مجبور ہو کر آہستہ سے نظریں جھکاتے ہوئے جواب دیا۔

”کیا دقار بھائی اور شائلہ تمہیں بہت پیار کرتے ہیں.....؟“

”یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟“ احمر نے مدھم آواز میں کہا۔ ”اگر وہ مجھ سے محبت نہ کرتے بھلا وہاں جانے کا ارادہ کیوں کرتا.....؟“

”بہنیں کون پسند ہے.....؟“ فوزیہ خاتون نے بیٹے کے چہرے پر خوشی کا اُجالا چھیننے کا خیر لہجے میں سوال کیا۔

”چچی جان مجھ سے زیادہ پیار کرتی ہیں۔“ احمر نے بڑی خوبصورتی سے جواب دیا۔

”اور کون اچھا لگتا ہے.....؟“

”وہاں تو سب ہی قابلِ تعریف ہیں..... خاص طور پر فرحان کی شرارتیں تو مجھے بے

”کوئی اور بھی یاد آتا ہے.....؟“

”کوئی جواب نہیں دیا، ماں کی طرف دیکھ کر مسکرا دیئے۔“

”دقار احمد کا کھرا نہ مجھے بھی پسند ہے.....“

”بہنیں خاتون بیٹھے ماں کی بات سنتے رہے، البتہ انہیں اس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ ماں کو بدل کا بھید کس طرح معلوم ہو گیا..... انہوں نے تو ثنا کی محبت کو اپنے دل کے نہاں خانوں میں مٹا دیا تھا۔“

”میں آج ہی موقع دیکھ کر تمہارے والد سے بات کرتی ہوں۔“

”کس سلسلے میں.....؟“ احمر نے انجان بن کر نہایت معصومیت سے دریافت کیا۔

”تمہاری شادی کے سلسلے میں۔“ فوزیہ خاتون بولیں۔ ”تمہیں کوئی اعتراض ہو تو ابھی کھل کر بتا بد میں مجھ سے کوئی گلہ نہ کرنا۔“

”اگر آپ ایک بات کا فیصلہ کر چکی ہیں تو پھر مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟“ احمر نے اٹھتے ہوئے دیا۔

”کہاں چلے.....؟“

”ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے.....“ احمر مسکراتے ہوئے بولے، پھر لمبے لمبے قدم اٹھاتے اندر

..... فوزیہ خاتون کے چہرے پر ممتا کی خوشی پوری آب و تاب سے دکھ رہی تھی!!!

○○○

ن کی بائیں آنکھ رات ہی سے پھڑکے جا رہی تھی۔ صبح سو کر اٹھی تو سر میں ہلکا ہلکا درد سا تھا، ٹائم نظر پڑی تو ہز بڑا کر اٹھ بیٹھی، آنکھ بچے تھے، اور نوبے اُسے روزمرہ کے معمولات کے مطابق کرکیرا خاتون کے ساتھ دفتر جانا تھا..... غسل خانے میں جا کر اُس نے منہ پر پانی کے چھپکے، جلدی جلدی فارغ ہو کر لباس تبدیل کرنے کی غرض سے باہر آئی تو اُلٹی آنکھ پھڑکنے لگی۔

”شب نے بزرگوں سے یہی سن رکھا تھا کہ بائیں آنکھ کا پھڑکنا نیک شگون نہیں ہوتا۔ وہ پرانی

دل پر اعتقاد نہیں رکھتی تھی لیکن آج جانے کیا بات تھی کہ اُسے کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا تھا، یوں لگتا کہ ہونے والی ہے۔ رات سوتے میں بھی وہ ذہنی طور پر ابھی رہی، عجیب عجیب سے خواب

دیکھ رہی۔

رینگ ٹیبل کے سامنے کھڑی بالوں کو سنوارتے ہوئے اُسے اچانک یاد آیا کہ آج ہفتہ وار تعطیل کا

بڑا جھلکا کرش کو ایک طرف اُچھال دیا، چھٹی والے دن تو وہ یوں بھی دیر سے سو کر اٹھنے کی عادی

کراچ اُسے کیوں یاد نہیں رہا؟..... وہ جھکے جھکے انداز میں بستر کی جانب واپس لوٹ گئی، لباس تبدیل کئے بغیر نرم و گرم لمبل میں گھس گئی، بید سوچ آف کر کے اُس نے کمرے میں اندھیرا کر

الٹا دُور کرنے کی خاطر ایک طویل انگڑائی لے کر اُس نے کروٹ بدلی، کچھ دیر سوئیں تو شاید سر کا

دُور دُور دُور ہو جاتا لیکن آنکھ پھڑکنے کی وجہ سے اُسے ابھن ہو رہی تھی۔

دُور دُور دُور ہو رہی تھی، بہت دیر تک آنکھیں بند کئے لیٹی رہی لیکن اُسے کسی کروٹ چین نہیں آ

تھی۔ دُور دُور دُور سے پردستک کی آواز سنائی دی تو اُس نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں..... وقت

تو اُن کی نو بجے میں کچھ منٹ باقی تھے، اُسے سیرا خاتون کے روزمرہ کا معمول بخوبی معلوم تھا، چھٹی

وہی دستاویز اور گواہوں کا بیان قلمبند کرنے کے بعد طرم اقبال احمد کو پانچ سال قید کی سزا سنائی تھی۔
نوٹابہ نے اس خبر کو دوسری بار پڑھا تو اُس کا جی چاہا کہ دل کھول کر جھگڑے لگائے، اسے بدکردار
نیلاب کی سزا کی خوشخبری کا باقاعدہ جشن منائے لیکن ماں کی نگاہوں سے چھلکتے ہوئے آنسو دیکھ کر
ناکھٹوں کی کر خاموش ہو گئی۔

”نوٹابہ.....“ ماں نے بیٹی کے چہرے کے بدلنے تاثرات کو دیکھ کر بڑی حسرت بھری آواز میں
کہا: ”کیا تمہارا خیال ہے کہ تمہاری ماں بھی اس گناہ نے جرم میں.....“

”نہیں ماں..... نہیں۔“ وہ تڑپ اٹھی۔ ”میں جانتی ہوں کہ یہ سب کچھ اُسی کا کیا ہوا ہے۔“ اُس
خجارت سے کہا۔ ”ایک بار وہ بیگم صاحبہ کے پاس بھی معصومیت کا لبادہ اوڑھ کر تجھے واپس لینے آیا

یہی کہو اس کر رہا تھا کہ تم نے کہیں میری بات پکی کر دی ہے..... مگر بیگم صاحبہ نے اُسے لالچ
کر یہ بات بھانپ لی تھی کہ وہ کہیں میرا سودا کر چکا ہے، چنانچہ اُسے دھکے دے کر نکلوا دیا گیا۔“

”وہ تو ہو گیا..... لیکن..... اب کیا ہوگا؟“ نازلی بیگم نے نوٹابہ کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتے
در در بھرے لہجے میں سوال کیا۔

”ہوگا کیا..... ایک بدکردار انسان کو اُس کے برے اعمال کی سزا بھگتنی پڑے گی۔“ وہ نفرت سے
پھر ماں کی بے بسی کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”تم کیوں فکر کرتی ہو..... میں جو ملازمت کر رہی

..... تم کچھ دنوں کے لئے میرے پاس چلی آؤ..... ماحول کی تبدیلی تمہاری صحت کے لئے خوشگوار
غیثت ہوگی۔“

”ماحول کی تبدیلی قسمت کی بد نصیبی اور تقدیر کے لکھ کو نہیں بدل سکتی.....“ نازلی بیگم سر د آہ بھر کر
کہا۔ ”میں چلی آئی تو پاس پڑوس والوں میں جو تھوڑی بہت عزت ہے وہ بھی جاتی رہے گی..... وہ

تباہی کے کہ شاید میں بھی.....“ نازلی بیگم کی متناہل آواز ایک بار پھر سداون کے بادلوں کی طرح
نہیں، نوٹابہ ماں کو تسلی دیتی رہی لیکن ماں کے آنسو جھنکے کا نام نہیں لے رہے تھے، جب دل بھر کر

مل تو آہستہ سے بولیں۔ ”بشیر صاحب کہہ رہے تھے کہ اگر چھوٹی عدالت کے خلاف بڑی عدالت
ایک کی جائے تو.....“

”تو کیا ہوگا؟“ نوٹابہ نے تیزی سے پوچھا۔
”ہو سکتا ہے کہ اُس کی سزا میں تخفیف ہو جائے..... کوئی اچھا اور بڑا وکیل مقدمے کی پیروی کے

لحاظ کر دیا جائے تو اُسے باعزت طور پر بری بھی کرایا جاسکتا ہے۔“
”م..... تم اُسے باعزت طور پر بری کرانا چاہتی ہو؟“ نوٹابہ نے حیرت سے ماں کو گھورا، اُسے

انت ساحت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔
”جس طرح سن ڈھانپنے کے لئے کپڑا ضروری ہوتا ہے اُسی طرح عزت کا بھرم رکھنے کی خاطر

ناک بہت کچھ کرنا پڑتا ہے..... اور پھر..... وہ..... وہ تو میرا.....“
”ہاں.....“ نوٹابہ تڑپ کر چیخ اٹھی۔ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن دروازے پر قدموں کی چاپ سنی تو

بہ ہوئی، پلٹ کر دیکھا تو جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔
”نیرا خاتون.....“ اُس نے ایک نونگ گاؤں میں ملبوس دروازے کے پتوں بچ موجود تھیں۔ نوٹابہ نے ماں سے

خاتون کا تعارف کر لیا تو وہ بھی آنسو پوچھتی کھڑی ہو گئیں..... کچھ دیر تک رسی باتیں ہوتی رہیں پھر
خاتون نے براہ راست نازلی بیگم سے کہا۔

والے دن وہ دس بجے سے پہلے اپنے کمرے سے باہر نکلنے کی عادی نہیں تھیں۔ ”پھر دروازے پر کون
سکتا ہے؟“ اُس نے سوچا۔ لیکن دوسری بار دستک سنائی دی تو وہ سوچنے کی بجائے کھل کو ایک لمبے
ڈال کر تیزی سے اٹھی۔

دروازہ کھولا تو سب سے پہلے اُس کی نظر غفرون پر پڑی، پھر ملازمہ کے پیچھے اپنی ماں کو خلاف
کھڑا دیکھا تو اُس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا..... اُسے سیرا خاتون کے یہاں ملازمت کرتے ہوئے

مہینے سے اوپر ہو گئے تھے، اس عرصے میں وہی دو تین بار باپ کی نگاہوں سے چھپ چھپ کر ماں
لٹنے آئی تھی..... ماں اُس سے ملنے بھی نہیں آئی تھی..... آج ضرور کوئی اہم بات تھی جو وہ اتنے سویرے

سویرے اُس کے پاس چلی آئی۔
نوٹابہ کے دل کی دھڑکنیں آپ ہی آپ تیز ہونے لگیں، غفرون کو جائے لانے کی ہدایت

کے بعد وہ ماں کا ہاتھ تھام کر اندر لے آئی۔ ماں کی سوچی ہوئی نمناک آنکھیں دیکھ کر اُسے یہی
گزر کر کہ اُس کے باپ نے غالباً ایک کمزور اور بے سہارا عورت پر حسب معمول پھر اپنی قوت آزمائی

ہوگی، اُسے مارا پیٹا ہوگا اور..... ہو سکتا ہے اُسے گھر سے نکال دیا ہو..... ذہن میں ماں کی برباد
خیال ابھرا تو وہ بے چین ہو گئی، خود کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن سنبھال نہ سکی، ماں کی ممتا اور اُس کی

چارگی کا خیال آیا تو بے اختیار اُس کے سینے سے پلٹ کر رونے لگی..... اُس کے آنے کا سبب
دریافت نہ کر سکی۔

”چپ ہو جاؤ نوٹابہ.....“ ماں کی بھرائی ہوئی آواز اُس کے کانوں میں گونجی۔ ”اب در
دھونے سے کیا فائدہ.....؟“

”اماں.....“ وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی، ماں کے لہجے کے درد کو محسوس کر کے وہ تڑپ اٹھی۔
”تو نے اچھا کیا بیٹی جو پلٹ کر میری خبر تک نہ لی..... لیکن خدا گواہ ہے کہ مجھے کسی بات کا علم

تھا۔“ ماں نے اُسے اپنے کلیجے سے لگاتے ہوئے رقت آمیز لہجے میں یقین دلایا۔ ”اگر بشیر صاحب
آج مجھے اطلاع نہ دی ہوتی تو میں یہی سمجھتی کہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ کہیں سیر پانے کے لئے

گئے ہوں گے۔“
نوٹابہ نے ماں کی بات سنی تو جلدی سے رونا بند کر کے اُسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھنے لگا

بشیر صاحب کا نام سن کر وہ صرف یہی جان سکی کہ ماں کو اپنے بھلے مانس پڑوسی کے ذریعے کوئی ایسا
منحوس خبر ملی ہوگی جسے سن کر وہ بیٹی کے پاس چلی آئی۔

”میں تیری ماں ہوں نوٹابہ..... میں نے تو تیرے سر پر ایک باپ کا سایہ برقرار رکھنے کی خاطر
دوسری شادی کی تھی..... لیکن..... دنیا کی کوئی ماں ایسی تو نہیں ہوتی کہ خود اپنی اولاد کو.....“ وہ اس

آگے کچھ نہ کہہ سکی، پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تو نوٹابہ کی بے چینی بڑھ گئی، اُس نے ماں سے اُس
پریشانی کا سبب دریافت کرنا چاہا تو نازلی بیگم نے ہاتھ میں دبا ہوا اخبار اُس کی جانب بڑھا دیا، نوٹابہ

نے دھڑکتے ہوئے دل سے اخبار کھولا تو پہلے ہی صفحے پر سوتیلے باپ کی تصویر دیکھ کر اور بے چین
گئی۔ پھر جب اُس نے پوری خبر پڑھی تو اُس کی آنکھوں میں آنسو کی بجائے خون اُتر آیا۔

اُس کے سوتیلے باپ نے ایک نوجوان سے دس ہزار کے عوض اپنی بیٹی کا رشتہ دینے کا وعدہ کیا
آدھی رات وہ پیشگی لے چکا تھا، بعد میں اپنا وعدہ پورا نہ کر سکا تو نوجوان نے رقم کی واپسی کا مطالبہ

اقبال احمد نے رقم دینے سے انکار کیا تو معاملہ عدالت تک چلا گیا اور عدالت نے رقم کی لین دین

”میرا خیال ہے موجودہ کس میں اپیل کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔“
”خود کو مطمئن کرنے کی خاطر انسان اپنی سی کوشش تو ضرور کرتا ہے۔“ نازی بیگم بولیں۔ ”میں آپ کے پاس بڑی امیدیں لے کر آئی ہوں۔“

”بڑی حیرت کی بات ہے۔۔۔۔۔“ سمیرا خاتون نے سپاٹ آواز میں کہا۔ ”آپ اُس مرد کو بچانے کی کوشش کر رہی ہیں جو شہر کے روپ میں آپ کو ہمیشہ ڈکھ اور اذیتیں پہنچاتا رہا۔۔۔۔۔ اور سوتیلے باپ کی حیثیت میں اُس نے نوشاہہ کے ساتھ جو گھناؤنی سازش کرنے کی کوشش کی کیا اس کے باوجود اُس کو گرمی کے برتاؤ کا حق سمجھا جاسکتا ہے؟ میرے خیال میں تو ایسے شخص کو عمر قید کی سزا ہونی چاہئے تھی۔“
”عمر قید کی با مشقت سزا تو میں بھگت رہی ہوں۔۔۔۔۔“ نازی بیگم نے دبی زبان میں جواب دیا۔
”اُن کے لہجے میں مظلومیت اور کسک کا احساس بھی شامل تھا۔“

”مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ لیکن۔۔۔۔۔“
”میں اپنے سہاگ کو بچانے کی خاطر بڑی عدالت میں اپیل ضرور کروں گی۔“ نازی بیگم نے فہرہ کن لہجے میں کہا۔ ”تھوڑا بہت اثاثہ جو باقی رہ گیا ہے اُسے بھی داؤ پر لگا دوں گی۔“
”کس کی خاطر۔۔۔۔۔؟“

”اس داغ کو مٹانے کی خاطر جو وقت نے میرے دامن پر لگا دیا ہے۔۔۔۔۔“ نازی بیگم نے جذباتی انداز میں جواب دیا۔ ”اس جوان بیٹی کی خاطر جس کے مستقبل کو سنوارنے کے لئے زندگی کے ایک ماہ پر میرے قدم لڑکھڑا گئے تھے۔۔۔۔۔ اُس مرد کو بچانے کی خاطر جس نے زہریلے سانپ کی شکل میں بار بار میری ناکام حسرتوں کو ڈسا۔۔۔۔۔ جو ماں اور بیٹی کے مقدس رشتے کے درمیان ایک دیوار بن کر حائل گیا تھا۔ لیکن وہی میرا سہاگ بھی ہے۔ وہ اُبڑ گیا تو پھر باقی کیا بچے گا۔“

نازی بیگم اپنا جملہ مکمل کرنے کے بعد آہستہ سے اٹھیں، ایک نظر بیٹی پر ڈالی پھر تھکے تھکے انداز میں قدم اٹھانی باہر چلی گئیں۔ نوشاہہ کو سمیرا خاتون کی بے لوث محبت کا لیاظ بھی ملحوظ خاطر تھا اور ماں کے اُکھ درد کا احساس بھی جس نے اُس کے چہرے کی تمام مسکراہٹیں چھین لی تھیں، وقت سے پہلے ہی اُس قدر بوڑھا کمزور اور لاغر کر دیا تھا۔۔۔۔۔ چند ثنائے تک وہ گنگ سی حالات کے دوراے پر کھڑی وقت گردش کا اندازہ لگاتی رہی، پھر نظریں جھکا کر جلدی سے ماں کے پیچھے تیز قدم اٹھانے لگی۔

اور۔۔۔۔۔ سمیرا خاتون بڑی سنجیدگی سے نازی بیگم کے بارے میں سوچ رہی تھیں۔
عورت کا یہ روپ انہیں عجیب و غریب لگ رہا تھا۔۔۔۔۔ ایک مرد نے اُسے قدم قدم پر حسین فریہ دیئے۔ ہر ظلم روا رکھا۔۔۔۔۔ اپنی ہوس کی خاطر وہ اُس کی خوشیوں کو اپنے قدموں تلے روندنا تاراج کرتا رہا۔ لیکن وہی عورت اُسے اپنا سہاگ سمجھ کر بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اپنی زندگی آخری سہارا سمجھ رہی تھی!!



”نانی نے بیوی کو غور سے دیکھا، ایک لمحے تک خاموش کھڑے کسی خیال میں کھوئے رہے پھر بے لٹ کر ڈرائنگ روم کی طرف قدم اٹھانے لگے۔ فرزانہ بیگم نے شوہر کے چہرے پر غور و فکر لائیں دیکھیں تو مضطرب ہو گئیں۔ ڈرائنگ روم تک جاتے جاتے اُن کے ذہن میں ٹینکڑوں کا ہر اُبھارتے رہے، پھر جب عثمان علی ڈرائنگ روم میں پہنچ کر تھکے انداز میں ایک صوفے پر بیٹھ وہ اُن کے قریب بیٹھتے ہوئے بولیں۔“

”خدا آپ کو ہمیشہ سلامت رکھے۔ لیکن بات کیا ہے جس نے آپ کو اس درجہ مضطرب کر رکھا ہے؟“
”میں نے کہا نا کہ کچھ کاروباری۔۔۔۔۔“
”خدا خیر کرے۔۔۔۔۔ آخر ایسی کون سی بات ہے؟“ فرزانہ بیگم نے بے چین ہو کر کہا۔ ”مجھے تو ہول ہے۔۔۔۔۔ خدا کا واسطہ، جو بات ہے کہہ ڈالئے۔“

”اب تو کہنی ہی پڑے گی۔“ عثمان علی سنجیدگی سے بولے۔ ”ہمیں اس سلسلے میں بہت محتاط رویہ اپن لینا ہوگا۔“

”آپ اطمینان رکھئے۔۔۔۔۔ بغیر آپ کے مشورے کے میں کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گی۔“
”شاید آپ نے تین روز پہلے کا انگریزی اخبار نہیں دیکھا۔۔۔۔۔ ورنہ میری پریشانی کا سبب ضرور جانیں۔“

”میں انگریزی اخبار کب دیکھتی ہوں۔۔۔۔۔؟“ فرزانہ بیگم نے اُلجھتے ہوئے کہا۔ ”اب معہ ختم کر ہمیر سے پیٹ میں تو مرد شروع ہو گئی۔“

”اقبال احمد کو پانچ سال کی سزا ہو گئی ہے۔“
”خدا غارت کرے اُسے۔۔۔۔۔“ فرزانہ بیگم اقبال احمد کا نام سن کر جلے کئے لہجے میں بولیں۔ ”یہ تو سارے لئے خوشی کی خبر ہے۔۔۔۔۔ اُس نے ہمارے ساتھ جو کچھ کیا تھا اُسی کا صبر بڑا ہے۔۔۔۔۔ پانچ سال بائے بیس سال کی ہوئی ہوتی تو ہمیں زیادہ خوشی ہوتی۔“

”آپ نے یہ نہیں دریافت کیا کہ اُس مرد کو کس جرم کی پاداش میں سزا سنائی گئی ہے۔۔۔۔۔“
”میری جوتی کو کیا غرض پڑی ہے جو کچھ پوچھوں۔۔۔۔۔ اور آپ بلاوجہ کیوں پریشان ہو رہے ہیں؟“
”میں نے پہلے ہی عرض کیا تھا کہ ہمیں صبر و تحمل سے کام لینا ہوگا۔“ عثمان علی نے بدستور سنجیدگی کا پھر تفصیل بیان کرتے ہوئے بولے۔ ”اقبال احمد کے اوپر اپنی سوتیلی بیٹی کا سودا کرنے کا جرم نہ ہو گیا ہے۔“

”مالک کا بڑا احسان ہے کہ ہم نے بروقت اُس بد بخت سے اپنی بیٹی کی جان چھڑالی ورنہ خدا نے وہ ہمارے ساتھ بھی کیا دعا اور فریب کر گزرتا۔۔۔۔۔“

”میں نے بھی اگر صرف خبر پڑھی ہوتی تو شاید میں بھی دور کت شکرانے کی ادا کرتا۔“
”میں بھی نہیں۔۔۔۔۔“

”پریشانی کا ایک سبب تو یہ ہے کہ اخبار میں خبر کے ساتھ اُس مردود کی تصویر بھی چھپی ہے۔ دوسری اہم بات جو اپنے ذرائع سے معلوم کرائی ہے وہ یہ ہے کہ اقبال احمد کو کیفر کردار تک پہنچانے پر غائبانہ طور پر خان بہادر آصف علی کی صاحبزادی سمیرا خاتون کا ہاتھ شامل ہے۔“

”سمیرا خاتون.....“ فرزانہ بیگم نے چونک کر پوچھا۔ ”کون..... راجیل کی والدہ.....؟“

”جی ہاں.....“

”لیکن سمیرا خاتون کا اقبال احمد سے کیا تعلق؟“

”آپ شاید نوشاہہ کو بھول رہی ہیں.....“

”نوشاہہ کون.....؟“

”سمیرا خاتون کی سیکرٹری۔“ عثمان علی اپنی نشست پر پہلو بدل کر بولے۔ ”در اصل نوشاہہ ہی اقبال احمد کی سوتیلی بیٹی ہے جس نے باپ کے ظالمانہ رویے سے تنگ آ کر گھر سے علیحدگی اختیار کر لی اور سمیرا خاتون کے ساتھ مقیم ہے۔“

”یہ تو بہت برا ہوا.....“ فرزانہ بیگم نے معاملے کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر سمیرا خاتون اور خان بہادر صاحب کو حالات کا علم ہوا تو وہ لوگ کیا خیال کریں گے.....؟“

”مجھے تو سب سے زیادہ فکر اپنی بیٹی کی ہے۔“ عثمان علی نے سرد آہ بھر کر جواب دیا۔ ”وہ یہ بچہ پڑھے گی تو اُس کے دل پر کیا بیتے گی؟“

”اُسے کیا ضرورت ہے سوچنے کی..... اب کون سی رشتہ داری قائم ہے؟“

”بات کو سمجھنے کی کوشش کیجئے بیگم..... راجیل کی وجہ سے وقار میاں اور خان بہادر صاحب کے تعلقات اور زیادہ گہرے ہو گئے ہیں، بات اگر پچھلی تو ہم کسی کو کیا جواب دیں گے اور شائبہ کے دل پر کیا گزرے گی؟“

”ہاں..... یہ تو ہے، لیکن اب کیا بھی کیا جاسکتا ہے.....؟“

”شائبہ یا وقار نے تو آپ سے اس سلسلے میں ابھی تک کوئی ذکر نہیں کیا.....؟“

”نہیں..... ہو سکتا ہے کہ یہ شخص خبر ان کی نظروں سے نہ گزری ہو۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو..... لیکن میں اس بات پر سنجیدگی سے غور کر رہا ہوں کہ یہ بات کم از کم شائبہ کے گوش گزار کر دی جائے۔“

”کوئی خاص مصلحت.....؟“ فرزانہ بیگم نے وضاحت طلب انداز میں دریافت کیا۔

”میں چاہتا ہوں کہ شائبہ پہلے سے کسی اچانک پیش آنے والے واقعات اور حالات سے متاثرہ کرنے کے لئے تیار رہے۔ دوسری صورت میں خدا نخواستہ نیکھت کوئی بات سامنے آگئی تو وہ جواب دے سکے گی؟“

”اگر آپ کا مشورہ یہی ہے تو میں شائبہ کو کسی وقت یہاں بلا کر سب کچھ بتاؤں گی..... لیکن انہی صورت میں یہ بات وقار میاں کے علم میں بھی آجائے گی..... ہم شائبہ کو یہ تو منع نہیں کر سکتے کہ وہ شائبہ سے بھی پردہ داری سے کام لے۔ اگر ایسا ہوا تو وقار میاں ہمارے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے؟“

”ان ہی سب باتوں نے مجھے بھی پریشان کر رکھا ہے۔ نہ بات چھپائے بن پڑتی ہے نہ کہہ سکتا ہوں۔“

”بات چھپ بھی کیسے سکتی ہے؟ جب اخبار میں اُس مکار فریبی کی تصویر بھی آگئی تو سب ہی ہمت ہورہی ہے۔“

”عثمان علی نے بیوی کی طرف غور سے دیکھا، کچھ کہنے کا ارادہ کیا لیکن پھر جانے کیا سوچ کر خاموش رہا۔ اور فرزانہ بیگم بدستور اقبال احمد کے حق میں موت کی دعائیں مانگتی رہیں.....!!“

”عثمان علی نے بیوی کی طرف غور سے دیکھا، کچھ کہنے کا ارادہ کیا لیکن پھر جانے کیا سوچ کر خاموش رہا۔ اور فرزانہ بیگم بدستور اقبال احمد کے حق میں موت کی دعائیں مانگتی رہیں.....!!“

ہونے والی گفتگو کو با آسانی سنا جاسکتا تھا بلکہ کی ہول (KEY HOLE) کے ذریعے دیکھا بھی جاسکتا تھا۔
نہایت سے ایک ایسی چیز (آرام کرسی) آہستہ سے اٹھا کر دروازے کے قریب رکھی، پھر چابی کے
برائے ذریعے دوسری طرف کا جائزہ لیا تو راجیل کو دیکھ کر مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔ آج راجیل نے
مندرگ کا اُجلا اور بے داغ سوٹ پہن رکھا تھا اور ٹائی کی جگہ اُس نے نادرہ کی فرمائش پر بولنگا رکھی
تھی۔ اس لباس میں وہ حقیقتاً بے حد سمارٹ اور خوبصورت نظر آ رہا تھا۔

نادرہ کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا، کچھ دیر بعد نادرہ بھی کیل کانٹے سے لپس ہو کر وہاں پہنچی گئی، راجیل
کو دیکھتے ہی اُس نے بڑی بے ساختگی سے چبکتے ہوئے کہا۔ ”اوہ..... بیوٹی فل اینڈ چارمنگ..... آپ
اس ڈرنکس میں بے انتہا سمارٹ نظر آ رہے ہیں۔ اور خاص طور پر بوکی موجودگی نے تو آپ کی شخصیت
میں چار چاند لگا دیئے ہیں.....“

”تھنک یو.....“ راجیل نے خوش ہو کر کہا پھر نادرہ کو سر تا پا دیکھتے ہوئے بڑی اپنائیت سے بولے۔
”آپ کی فرمائش تھی اس لئے مجبوراً یہ سب کچھ کرنا پڑا اور نہ یوٹوب آؤٹ آف ڈیٹ ہو چکی ہے.....
بڑے لوگ بھی اسے ناپسند کرنے لگے ہیں.....“
”یہ کس نے کہہ دیا آپ سے.....؟“ نادرہ نے حیرت کا اظہار کیا۔ ”اب تو پھر وہی فیش واپس آ
رہے ہیں جو پہلے تھے..... ایمان سے بتائیے، آپ نے یہاں آنے سے پہلے خود کو بھی آئینے میں ضرور
دیکھا ہوگا..... کیسے لگ رہے تھے؟“

”جی..... میں بھلا اپنے منہ سے کیا کہہ سکتا ہوں؟“ راجیل نے انکساری سے کہا۔
”آپ کھڑے کیوں ہیں..... بیٹھئے نا!“ نادرہ نے اشارہ کیا تو راجیل بیٹھ گئے لیکن ایسا محسوس ہو
ا تھا جیسے وہ کسی بات سے پریشان ہوں۔

”اور سنائیے..... آپ کے پرچے کیسے ہوئے؟“ نادرہ نے راجیل کے برابر والے صوفے پر بیٹھتے
ہوئے بے تکلفی سے پوچھا۔

”بہت شاندار ہوئے ہیں، مجھے تو فرسٹ ڈویژن کی امید ہے لیکن.....“
”لیکن کیا؟“

”کیا ہم کہیں اور چل کر گفتگو نہیں کر سکتے..... میرا مطلب ہے کہیں باہر چلتے ہیں۔“
”کیوں..... یہاں بیٹھ کر گفتگو کرنے میں کیا حرج ہے؟“

”مم..... میں نے سوٹ جو پہن رکھا ہے۔“
”پھر کیا ہوا.....؟“

”آپ شاید بھول رہی ہیں۔“ راجیل نے یاد دلایا۔ ”انگل نے کہا تھا کہ اگر میں دوبارہ سوٹ میں
نظر آیا تو وہ گولی مار دیں گے۔“

”مذاق کیا ہوگا ڈیڈ نے۔“ نادرہ جلدی سے بولی۔
”پھر بھی..... رسک لینے سے کیا فائدہ؟“

”آپ پریشان نہ ہوں، ڈیڈ دو گھنٹے سے پہلے واپس نہیں آئیں گے..... اور پھر میں جو ہوں آپ
کے ساتھ۔“ آخری جملہ نادرہ نے کچھ اس قدر اپنائیت اور معنی خیز انداز میں زیر لب مسکراتے ہوئے کہا
کہ نادرہ بھی اُس کی اداکاری پر ششدر رہ گئی۔
”تھنک یو.....“ راجیل نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔

○○○

دونوں بے تکلف سہیلیاں کمرے میں بیٹھی خوش گپیوں میں مصروف تھیں جب ملازم نے انہیں کام
نادرہ کو راجیل کی آمد کی اطلاع دی۔ نادرہ مسہری پر نیم دراز تھی، نادرہ ریسیور رکھ کر مسکراتی ہوئی پلنگ
اُس نے شوخی سے دریافت کیا۔ ”کوئی نئی اطلاع.....؟“
”بہت ہی اہم..... خاص طور پر تمہارے لئے۔“

”وہ کیا.....؟“
”پہلے یہ بتاؤ کہ تم آنٹی سے کیا کہہ کر گھر سے چلی تھیں.....؟“
”تمہارے یہاں کا بتا کر آئی ہوں۔ لیکن.....“
”کسی اور کو بھی علم ہے تمہارے یہاں آنے کا.....؟“

”آبی، صائمہ اور فرحان تو صبح سے جمال انگل کے گھر گئے ہوئے ہیں، میں اکیلی تھی اس۔
تمہارے پاس آگئی۔“ نادرہ نے کہا پھر نادرہ کے چہرے کے تاثرات پر غور کرتے ہوئے بولی۔
”بات ہے آخر، جو تم اس قدر چھان بین کر رہی ہو.....؟“
”ملازم نے خبر دی ہے کہ راجیل تشریف لائے ہیں۔“
”راجیل.....؟“ نادرہ ایک لمحے کو شپٹا گئی۔

”گھبراؤ نہیں..... ہمارے ماڈرن بچوں کو ڈرائنگ روم میں آرام سے بٹھا دیا گیا ہے۔“
”وہ تو ٹھیک ہے لیکن اگر عابد انگل نے راجیل کو میری یہاں موجودگی کے بارے میں بتا دیا تو
کھیل بگڑ جائے گا۔“ نادرہ بولی۔ ”بڑا کائیاں فحش ہے، فوراً سمجھ جائے گا کہ ہم نے مل کر اُسے
بنانے کا پروگرام بنایا ہے۔“

”اس بات کی تو تم فکر ہی نہ کرو۔“ نادرہ نے نہایت لاپرواہی سے جواب دیا۔ ”اول تو یہ کہ ڈیڈ
اس وقت گھر پر نہیں ہیں، اپنے کسی پرانے واقف کار سے ملنے گئے ہیں اور مغرب سے پہلے انہیں
واپس نہیں ہوگی۔ دوسرے یہ کہ میں نے چونک کر اس بات کے لئے پہلے ہی تاکید کر دی ہے کہ اگر
کوئی ایسی صورت حال درپیش ہو کہ تم یہاں موجود ہو تو راجیل کو باہر ہی سے یہ کہہ کر ٹال دیا جائے
میں گھر پر موجود نہیں ہوں۔“

”اور اگر وہ عابد انگل سے ملنا چاہے تو.....؟“
”تو بھی اُسے ٹال دیا جائے۔“ نادرہ نے جواب دیا۔ ”میں نے ملازموں کو سب بات پہلے ہی
رکھی ہے۔“

”کیا مطلب..... کیا تم نے ملازموں کو بھی سب کچھ.....؟“
”ڈونٹ وری ڈیر.....“ نادرہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”وہ میرے ملازم ہیں اس لئے ذرا
کھولنے کی جرات نہیں کر سکتے۔“

”اب کیا پروگرام ہے جناب کا؟“
”پروگرام.....“ نادرہ نے ایک شوخ مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھیرتے ہوئے جواب دیا۔ ”میرا خیال
ہے کہ تم ڈرائنگ روم کے برابر والے کمرے میں چل کر بیٹھو اور میں ذرا ماڈرن بچوں سے ملنے کی خاطر
تھوڑی تیار کر لوں۔“
نادرہ جلدی سے مسکراتی ہوئی اٹھی اور اُس کمرے میں آگئی جہاں سے نہ صرف ڈرائنگ روم

”نہیں مانتی.....“ نادرہ نے بدستور چھلاتے ہوئے کہا۔ ”آپ نہیں آنا چاہتے تو نہ آئیں، لیکن اگر کسی کا دل توڑنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”راہیل نے بڑے مضحکہ خیز لہجے میں معذرت طلب کرنے کی کوشش کی۔“ صرف ایک لمحوں کے لیے.....“

”نادرہ نے دوبارہ ایسی غلطی نہیں ہوگی..... میں وعدہ کرتا ہوں۔“

”راہیل.....“ نادرہ نے اس بار بڑے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ”کیا آپ کو اندازہ ہے کہ عورت کا اتنا نازک اور حساس ہوتا ہے.....؟“

”جی ہاں.....“

”آپ کو کیا خبر کہ میں پہلی ہی ملاقات میں.....“ نادرہ نے جذباتی لہجہ اختیار کیا مگر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ ”نادرہ کو اپنی ہنسی ضبط کرنی مشکل ہو رہی تھی۔“

”مجھے اندازہ نہیں تھا۔“ راہیل نے قسمی صورت بنا کر تنبیہ کی سے جواب دیا۔ ”پلیز آپ رنجیدہ نہ ہوں۔ میں آئندہ سے آپ کے جذبات کا احترام کروں گا۔“

”ایک بات کہوں راہیل؟“

”جی..... حکم دیجئے!“ راہیل نے بڑی فرمانبرداری کا ثبوت دیا۔

”میں حکم نہیں..... صرف درخواست کر سکتی ہوں۔“ نادرہ نے ہونٹ کاٹتے ہوئے مدہم آواز میں کہا۔

”آپ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں.....“ راہیل نے صوفے پر کرسیاں کی کوشش کی تو نادرہ کو اپنی ہنسی لے کر غصہ منہ پر ہاتھ رکھنا پڑا۔ نادرہ غصہ کی اداکاری کر رہی تھی۔

”راہیل کے جواب پر ایک سر آدھ بھر کر بولی۔“ ابھی وقت ہے راہیل..... آپ چاہیں تو اس راستے سے واپس لوٹ جائیں جو نادرہ کی طرف جاتا ہے۔ میں اپنے دل کو بہلانے کی کوشش کروں گی۔“

”آپ..... آپ تو بہت زیادہ سنجیدہ ہو گئیں.....“

”جنت میں اگر سنجیدگی نہ ہو تو پھر ٹریڈی اور کامیڈی میں کیا فرق باقی رہ جاتا ہے؟“

”میں سمجھا نہیں.....“

”نادرہ سے پوچھ لیجئے گا..... وہ آپ کو سمجھا دے گی۔“ نادرہ نے ہاتھ ملتے ہوئے جواب دیا۔

”پلیز..... مجھے صرف ایک بار معاف کر دیجئے۔“ راہیل سنجیدگی سے بولے۔ ”دوبارہ غلطی ہو تو پھر معاف نہ کیجئے گا۔“

”اپنے دل کو ٹھونڈ کر دیکھ لیجئے راہیل..... میں آپ کو مجبور نہیں کروں گی۔“

”خواب میں راہیل نے واقعی اپنے سینے پر اس طرح ہاتھ رکھا جیسے دل کو ٹھونڈنے کی کوشش کر رہے ہو۔“

”پوچھنا اس قدر مضحکہ خیز تھی کہ نادرہ اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکی، دوسری طرف نادرہ کا بھی یہی حال تھا۔“

”خدا کا شکر ہے آپ ہنسی تو سہی۔“ راہیل نے اطمینان کا سانس لیا۔

”آپ کی معصومیت اور سادگی پر ہنسی آگئی۔“ نادرہ نے جلدی سے بات بناتے ہوئے کہا۔ ”آپ بولے ہیں راہیل.....“

”ڈونوازی ہے آپ کی جو ایسا سمجھتی ہیں۔“ راہیل نے بڑے عاجزانہ انداز میں جواب دیا۔

”میں تو خیر جو سمجھتی ہوں وہ سمجھ رہی ہوں لیکن آپ بھی تو کچھ سمجھنے کی کوشش کریں.....“

”اب سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ راہیل نے مسکرا کر نادرہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا آپ کو یقین ہے کہ اس بار آپ ڈویژن لینے میں کامیاب ہو جائیں گے؟“

”امید تو ہے.....“

”آپ نے ٹاؤ اور نادیہ وغیرہ کو بھی بتا دیا ہوگا.....“

”جی ہاں.....“

”شناخت خیر آپ کی کامیابی سے ضرور خوش ہوگی اس لئے کہ اس نے آپ پر بڑی محنت کی ہے؟“

”نادیہ کا کیا حال ہے.....؟“ نادرہ نے سوال کیا تو راہیل نے اسے جلدی سے خوش کرنے کی خاطر کہا۔

”نادیہ..... وہ تو کچھ ناراض ناراض سی نظر آ رہی ہیں۔“

”جل گئی ہوگی آپ کی کامیابی کے امکانات روشن دیکھ کر۔“

”جی ہاں..... میں رس ملائی بھی لایا تھا، وہ بھی کھانے سے انکار کر دیا۔ کہنے لگیں.....“ راہیل کہتے کہتے خاموش ہو گئے۔

”کیا کہا نادیہ نے.....؟“ نادرہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”جانے بھی دیجئے۔“ راہیل نے بات بنانے کی کوشش کی۔ ”ممکن ہے وہ غصہ میں کہہ گئی ہوں۔“

”آپ کو میری قسم راہیل صاحب..... پلیز بتائیے..... کیا کہا تھا نادیہ نے؟“

”میرا خیال ہے کہ انہیں میرا آپ کے یہاں آنا جانا پسند نہیں..... رس ملائی دیکھتے ہی چراغ گئیں، کہنے لگیں یہاں کیوں لے آئے..... لے جائیے! اسے بھی نادرہ کے گھر.....“

”آپ نے کیا جواب دیا؟“

”میں کیا جواب دیتا..... خاموش ہو گیا۔“

”اور رس ملائی کا کیا بنا.....؟“

”وہ فرحان نے لے لی.....“

”اور آج آپ یہاں خالی ہاتھ آئے ہیں.....؟“ نادرہ نے قدرے خشکی کا اظہار کیا۔

”جی ہاں..... لیکن آپ کو تو میں نے ڈرنے کا سوچ رکھا ہے۔“ راہیل بولے۔ ”اور نتیجہ“

”کے بعد ایک شاندار پارٹی کا ارادہ ہے۔“

”اب آپ شاید مجھے بہلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”جی نہیں..... ایمان سے ایسی کوئی بات نہیں۔“ راہیل نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

”پھر نادیہ کے لئے مٹھائی لانے کی کیا ضرورت تھی؟“ نادرہ نے سنجیدگی سے سوال کیا تو راہیل کر رہ گئے۔

”کچھ نہ بن پڑا تو بلا وجہ مسکرانے لگے۔ نادرہ جل کر بولی۔“ مجھے غصہ آ رہا ہے اور مسکرانے کی کوشش فرما رہے ہیں۔“

”آپ غلط سمجھ رہی ہیں مس نادرہ..... دراصل.....“

”میں جانتی ہوں سب کچھ۔“ نادرہ نے تمل کر کہا۔ ”آپ نادیہ میں زیادہ دلچسپی لے رہے“

”حالانکہ آپ نے مجھ سے کچھ وعدے کئے تھے۔“

”میں اب بھی اپنے وعدے پر قائم ہوں۔“ راہیل نے جلدی سے کہا۔

”جھوٹ..... آپ نے وعدہ کیا تھا کہ ہفتے میں ایک بار یہاں ضرور آئیں گے۔ اور آج بارہ بعد صورت دکھائی ہے۔“

”استحان کی تیاریوں میں مصروف تھا اس لئے.....“

”خاک.....“ نادرہ بولی۔ ”آپ کو کچھ خبر بھی ہے..... نادیہ ایک طرف منصور کو بے وقوف ہے اور دوسری طرف آپ کو..... لیکن آپ اتنے نیک دل واقع ہوئے ہیں کہ حالات کی نوعیت سمجھ رہے ہیں۔“

”منصور والی بات آپ کو کیسے معلوم ہوئی؟“ راحیل نے اچانک سوال کیا تو نادرہ ایک لمحہ گئی پھر جلدی سے راحیل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

”اسی لئے تو کہتی ہوں کہ آپ بہت معصوم ہیں۔ ایک ہی چھت کے نیچے رہتے ہوئے حالات کا اندازہ نہیں۔“

راحیل نے کوئی جواب نہیں دیا، کچھ سوچنے لگے تو نادرہ نے پوچھا۔ ”اب آپ کیا سوچتے ہیں؟“

”آپ کو نہیں معلوم.....؟“ راحیل نے اپنا کالر درست کرتے ہوئے بڑی شان سے جواب دیا۔ ”میں نے مجھے اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کی پوری پوری اجازت دے رکھی ہے۔ میرا مطلب کہ میں جس سے بھی چاہوں شادی کر سکتا ہوں۔“

”پھر..... آپ کا جھکاؤ کس طرف ہے؟“ نادرہ پر ایک انکشاف ہوا تو وہ روانی میں پوچھ پڑا۔

”میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔“ راحیل نے نہایت سادگی سے کہا۔ ”شامیری اے اس لئے میں اُن کا بے حد احترام کرتا ہوں..... رہا نادیہ کا سوال تو پہلے میں اُسے ضرور پسند کرتا آپ سے ملنے کے بعد میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔“

”اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ کل میرے بجائے کسی اور کو پسند نہیں کریں گے؟“ نادرہ زبان میں کہا۔

”آپ جس طرح چاہیں، میں آپ کو یقین دلا سکتا ہوں۔“ راحیل سنجیدگی سے بولے۔

”آپ کہتے ہیں تو یقین کئے لیتی ہوں.....“ نادرہ نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔

نادیہ دروازے کے قریب سے ہٹ کر دوبارہ نادرہ کے کمرے میں آگئی۔ یہ معلوم ہو جانے کہ راحیل اُسے پسند کرتے تھے اُسے شدید غصہ آ رہا تھا، اُس کا دل چاہا کہ اسی وقت ڈرائنگ روم کر راحیل کے دماغ میں کبلانے والے تمام کیڑے بھجائے لیکن اُس نے بڑے ضبط سے کام لیا۔

وقت گزرا مئی کی خاطر وہ نادرہ کے کمرے میں شہتہ رہی..... راحیل کا جملہ رہ رہ کر اُس میں گونج رہا تھا۔ نادیہ اندر ہی اندر مل کھاتی رہی پھر اُس نے طے کر لیا کہ وہ بھی راحیل کو چکھائے گی کہ وہ بھی تمام عمر یاد رکھیں گے..... وہ اپنے منصوبوں پر غور کرنے میں مصروف ہو گئی۔

”یہ نہیں کیا ہو گیا.....؟“

”مجھے شدید غصہ آ رہا ہے راحیل پر.....“ نادیہ نے تلملا کر کہا۔ ”کس قدر ڈھٹائی سے کہہ رہے ہیں کہ بعد اُس نے میرے سلسلے میں اپنا ارادہ تبدیل کر دیا ہے، جیسے میں اُس کی جاکیر ہو۔“

”اوہ..... فارگٹ اٹ۔“ نادرہ مٹکراتے ہوئے بولی۔ ”کیا تم نے اس پہلو پر غور نہیں کیا؟“

”تم اُس کی طرف سے کیوں وکالت کر رہی ہو.....؟“

”اس لئے کہ اُس غریب نے میری فرمائش پر یو باندھ لی.....“ نادرہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”ویسے ایک بات ایمان کی ہے..... آج راحیل سفید سوٹ میں بہت سارٹ لگ رہا تھا.....“

”لگ رہا ہو گا..... مجھے کیا؟“

”چھوڑو..... تو، تو سچ سنجیدہ ہوتی جا رہی ہے۔“

”خود اپنے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“ نادیہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”میں نے ابھی کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا لیکن.....“ نادرہ نے مٹکرا کر اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”لیکن کیا.....؟“

”مجھے راحیل سے ہمدردی ہوتی جا رہی ہے..... بیوقوف ضرور ہے لیکن دل کا برا نہیں ہے۔“ نادرہ نے کہا۔ ”کیا تم نے اُس سچویشن پر غور نہیں کیا جو راحیل کے جاتے وقت پیش آئی تھی.....؟“

”نہیں.....“ نادیہ بولی۔ ”میں تو اُسی وقت چلی آئی تھی جب تمہارے ماڈرن مجنوں نے میرے دل میں بکواس کی تھی۔“

”بڑی بھلی ہے تمہاری جو تم رخصتی کا منظر نہ دیکھ سکیں۔“

”کیوں..... کیا جاتے جاتے کسی اور حماقت کا ثبوت دے گئے ہیں؟“

”حماقت نہیں..... پرستش کہو!“ نادرہ نے ہنستا ہوا لیتے ہوئے کہا۔ ”کاش تم نے وہ منظر دیکھا ہوتا جب رخصت ہوتے وقت وہ نہایت بھونڈے انداز اور بھرائی ہوئی آواز میں اپنی سچی محبت کا یقین دلائے کی کوشش کرنے لگا۔ بس! پھوٹ پھوٹ کر رونے کی کسر باقی رہ گئی تھی۔“

”پھر کیا ارادے ہیں تمہارے؟“

”بھئی فرصت سے بیٹھ کر غور کروں گی..... ابھی تو ابتدا ہوئی ہے۔“

”اور میں نے انتہا کرنے کی سوچ لی ہے۔“ نادیہ نے کہا۔ ”اگر دماغ ٹھکانے نہ لگا دیا تو میرا نام بھی نادیہ نہیں۔“

”اُپس سے کیا فائدہ ہو گا..... اچھی خاصی تفریق ہاتھ سے جاتی رہے گی۔“

”چالی ہے تو چائے لیکن میں.....“

”مجھے میری قسم!“ نادرہ نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے جلدی سے کہا۔ ”اتنا جذباتی ہونا بھی ٹھیک نہیں۔ اس طرح بات بڑھ گئی تو اس میں ہماری بھی بدنامی ہوگی..... انکل اور آئی کیو سوسپس گے؟“

”لیکن راحیل کو اس حماقت کی کوئی نہ کوئی سزا تو ملنی چاہئے.....“ نادیہ نے کسی قدر نرم پڑتے ہوئے کہا۔

”وہ تم میرے اوپر چھوڑ دو! میں جانوں اور میرا ماڈرن مجنوں۔“ نادرہ نے کہا۔ ”تم بلاوجہ کیوں بکواس کر رہی ہو؟“

”بلاوجہ کیوں.....؟“ نادیہ بولی۔ ”اُسے جرات کیسے ہوئی مجھے چاہئے کی؟“

”اور منصور جو تمہیں پسند کر رہے ہیں..... اُن کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ نادرہ نے کہا۔ ”کیا منصور کو کوئی سزا نہیں دو گی؟“

”منصور کی اور بات ہے.....“ نادیہ نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔

”بھئی..... تم نے غالباً منصور کو عمر قید کی سزا دینے کا مقصد ارادہ کر لیا ہے۔“

نادیہ نے کوئی جواب نہیں دیا، البتہ منصور کے تذکرے نے اُس کا سارا غصہ کا فور کر دیا، وہ من ہی

”خدا کا شکر ہے کہ آپ نے میری ایک اور مشکل آسان کر دی.....“

”کیا.....؟“

”وہ بات..... میں بہت دنوں سے کہنے کی جسارت کر رہا تھا آپ نے ایک پل میں کہہ ڈالی۔“
منصور کا جواب سن کر اُس کے چہرے کی سرخی اور گہری ہو گئی، کچھ دیر یوں نظریں جھکائے کھڑی
جانے کی چاشنی سے لطف اندوز ہوئی رہی، پھر جلدی سے بات کا رخ بدلنے کی خاطر بولی۔

”کیا اسی جان گھر پر نہیں ہیں.....؟“

”جی نہیں..... اپنی والدہ کے یہاں گئی ہیں۔“ منصور نے جواب دیا۔ ”ملازم نے یہی بتایا ہے۔“
”آپ نے راجیل کو بلا لیا ہوتا..... کم از کم تنہائی کا احساس تو دُور ہو جاتا۔“
”نست کی خوش نصیبی کہہ لیجئے کہ موصوف بھی کہیں باہر تشریف لے گئے ہیں۔“ منصور نے شریر

”میں کہا۔“
”آج صبح آپ نے ناشتے میں کیا لیا تھا.....؟“ اُس نے منصور کو گھورتے ہوئے جواب دیا۔
”اتھا بول رہے ہیں۔“

”یہ میری خوش قسمتی ہے کہ جو آپ نے قابل تعریف سمجھا ورنہ.....“
”آئی اور فرحان وغیرہ نہیں آئے آپ کے ساتھ؟“ اُس نے منصور کو جملہ مکمل نہیں کرنے دیا۔
”انہیں ممانے روک لیا ہے۔“

”اور آپ صرف یہی بتانے کی خاطر تشریف لائے ہیں۔“ نادیہ نے منصور کو خوشی سے گھورا۔
”کہنا تو کچھ اور بھی چاہتا ہوں لیکن.....“
”لیکن کیا.....؟“

”ڈر لگتا ہے.....“ منصور نے سادگی سے کہا۔ ”اگر محتجن نے نمبر کاٹ لئے تو نتیجہ خراب ہونے کا
”بھی لاحق ہے۔“

”کیا مطلب.....؟“ نادیہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔ ”کیا آپ کے اگزام ختم نہیں ہوئے؟“
”جی نہیں..... ابھی تو شروع ہوئے ہیں اور خدا کسی آفت ناگہانی سے محفوظ رکھے..... اگر بقید
ات رہا تو امتحان کا سلسلہ دو سال اور برقرار رہے گا۔“

اُس نے منصور کی بات کا مفہوم سمجھا تو زور پل مسکرانے لگی۔ ”آپ کا کیا خیال ہے، نتیجہ کیسا رہے گا؟“
”یہ تو محتجن کی مرضی اور موڈ پر منحصر ہے۔“ منصور نے بڑی سعادت مندی سے جواب دیا۔ ”میں تو اپنی
نست سے کامیابی کی پوری امید لگائے بیٹھا ہوں۔ قسمت میں کیا لکھا ہے یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔“

”انسان کو خود پر اعتماد ہو تو اُسے راستے کی دشواریوں سے ہراساں نہیں ہونا چاہئے۔“
”محتجن اپنی ذات سے زیادہ خدا پر بھروسہ ہے اس لئے راستوں کے نشیب و فراز سے کیا ڈرنا؟“
”جی جی تو قدرت بھی اپنے بندوں کا بڑا کٹھن امتحان لیتی ہے۔“

”تقریر اور قسمت ساتھ دے تو سارے مرحلے از خود طے ہو جاتے ہیں اور پھر جب منزل سامنے
”پر نظر آسان ہو جاتی ہے۔“

”ہو سکتا ہے آپ جسے منزل سمجھ رہے ہوں وہ سراب ہو.....“
”جیسے یہ سراب بھی عزیز ہے.....“ منصور نے اُسے پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بر جت
”دیا تو وہ کٹ کر رہ گئی، جلدی سے موضوع بدل کر بولی۔

”من میں مسکرانے لگی۔ کچھ دیر بعد جانے لگی تو نادرہ نے پھر اُسے تاکید کی کہ وہ راجیل کے سلسلے میں
خاموشی کو برقرار رکھے اور کسی جذباتی حماقت سے گریز کرے۔ نادیہ نے وعدہ کیا پھر واپس گھر آ گئی۔
گاڑی سے گنگنائی اتر کر اندر جانے لگی تو منصور کو لان میں تنہا بیٹھا دیکھ کر رُک گئی۔ ایک
نگاہوں کے تصادم نے اُس کے دل کی دھڑکنیں تیز کر دیں پھر وہ خود کو سنبھالتی چھوٹے چھوٹے
اٹھائی منصور کے قریب آ گئی۔

”آپ کب آئے؟“ اُس نے قریب پہنچ کر بڑی اپنائیت سے پوچھا۔ منصور کو اس وقت غلاف
توقع دیکھ کر اُسے بڑی مسرت ہوئی، شاید اُس لئے کہ ابھی کچھ دیر پیشتر ہی نادرہ نے اُس کا تذکرہ
کرنا دیکھنا اُکرنے کی کوشش کی تھی اور وہ سچ سچ منصور کا نام سن کر سب کچھ بھول گئی تھی۔ جا
کیا خاص بات تھی اس نام میں جس نے اُس کے خون کی حدت کو ایک دم کم کر دیا تھا..... وہ باا
نارمل ہو گئی تھی۔

یوں..... جیسے اس نام میں کوئی مقناطیسی کشش تھی..... کوئی جادو..... کوئی سحر تھا جس نے اُس
روح کے تاروں کو چھیڑ دیا تھا..... وہ سب کچھ بھول کر دل ہی دل میں گنگنائی اٹھی..... واپسی میں اُس
نگاہیں سڑک پر چری رہیں..... لیکن..... ذہن میں منصور کا تصور بار بار اُبھرتا رہا..... اور..... اب نہ
اُس کے سامنے موجود تھے۔

کیسا عجیب اور حسین اتفاق تھا۔ کاش اس وقت اُس نے خدا سے کچھ اور مانگا ہوتا.....
”آؤ بھٹے گھٹنے سے اس سبزہ زار پر بیٹھا آپ کی راہ دیکھ رہا ہوں۔“ منصور نے اُسے پیار بھری نظر
سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آج پہلی بار تجربہ ہوا کہ کسی کا انتظار کرنا بھی جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔“
”مجھے کیا معلوم تھا ورنہ میں اور دیر سے آئی.....“ وہ خوشی سے بولی۔ ”آپ کے تجربے میں کچھ
اضافہ ہو جاتا۔“

”کبھی کبھی یہ تجربے بڑے خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔“

”مطلب.....؟“

”سائنس کی رفتار کا کیا بھروسہ..... کون جانے کب رُک جائے؟“ منصور نے اُس کے چہرہ
چھوننے والی شفق کو محسوس کرتے ہوئے شاعرانہ انداز اختیار کیا۔

”ایک بات بتاؤں آپ کو.....؟“

”کیا.....؟“

”دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ اور اگر حاصل جمع سے اتنی ہی رقم تفریق کر دی جائے تو جواب
”برآمد ہوتا ہے۔“

”میں سمجھا نہیں.....“

”آپ ایم کام کر رہے ہیں اس لئے شاعری سے پرہیز کریں۔“ اُس نے مسکراتے ہوئے جواب
”اگر اجازت ہو تو نظر اتار دوں.....؟“ منصور نے مدہم آواز میں کہا۔ ”بڑی خوبصورت بات
آپ نے۔“

”یہ دوسری غلطی سرزد ہوئی آپ سے.....“ نادیہ روانی میں بولی۔ ”بات خود خوبصورت نہیں
بلکہ..... اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اُس نے جلدی سے جملہ نامکمل چھوڑ دیا، شرما کر نظریں جھا
منصور اور بے باک ہو گئے۔

”آپ نے کچھ لیا..... میرا مطلب ہے چائے یا کولڈ ڈرنک وغیرہ؟“

”کون پوچھتا.....؟“

”گھر پر ملازم موجود ہے، آپ نے خود منگو لیا ہوتا۔“

”آپ کا انتظار مقصود تھا اس لئے میں نے بے صبری کا مظاہرہ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔“

”چلیے اب فرمائیے..... کیا پینا پسند کریں گے آپ؟“

”اب کسی اور چیز کی ضرورت نہیں محسوس ہو رہی.....“

”آپ باز نہیں آئیں گے؟“ نادیہ نے پیار سے گھورا تو منصور مسکرا دیئے۔

نادیہ نے ملازم کو آواز دے کر چائے لانے کو کہا پھر منصور سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”خالہ جان کسی پر خدا کے فضل و کرم سے بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں.....“

”اور خالو جان.....؟“

”وہ بھی روبصحت ہیں..... البتہ ملازمہ کو گزشتہ رات سے ہلکا ہلکا ساجار ہو رہا ہے۔“ منصور نے حد سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”ڈاکٹر کا خیال ہے کہ سینے پر ٹھنڈ کا اثر ہو گیا ہے..... بخار کے ساتھ کھانسی کا سلسلہ بھی جاری ہے.....“

”میں نے ملازمہ کے بارے میں کب سوال کیا تھا؟“

”میں نے سوچا کہ آپ کے پوچھنے سے پیشتر ہی.....“

”جی نہیں.....“ اُس نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”جتنا پوچھا جائے صرف اتنا ہی جواب چاہئے۔ زیادہ قابلیت بگھارنے سے نمبر کٹ جانے کا ڈر بھی رہتا ہے۔“

”بہتر ہے..... آئندہ اور زیادہ محتاط رہنے کی کوشش کروں گا۔“ منصور نے کسی فرمانبردار طرز کی طرح جواب دیا۔

”کاروبار کیسا چل رہا ہے؟“ نادیہ نے اُسے چھترنے کی خاطر سنجیدگی سے پوچھا۔

”ابھی تک تو حالات بہتر ہیں۔“

”فیکٹری کا کام سمجھ میں آگیا یا ابھی تک پرانے میجر کے ساتھ گزارا کرنا پڑ رہا ہے؟“

”دل لگانے کی کوشش کر رہا ہوں..... جیسے ہی معاملات پر گرفت مضبوط ہوئی ہر مشکل آما جائے گی۔“

”زلزلہ کب تک آ رہا ہے.....؟“

”امتحان کا عنقریب اور زندگی کا دو سال بعد.....“

”بری بات.....“ نادیہ نے اُسے بزرگوں جیسے انداز میں ٹوکا۔ ”اچھے بچے تعلیم حاصل کر۔ دورانِ کسی اور چیز میں دلچسپی نہیں لیتے.....“

”لیکن اگر کوئی مرض لاحق ہو جائے تو.....؟“ منصور نے سادگی سے پوچھا۔ ”کیا اس کا علاج نہیں ہوتا چاہئے؟“

”ضرور ہونا چاہئے لیکن ڈاکٹر نے پرہیز بتایا ہو تو اُس پر بھی سختی سے عمل کرنا چاہئے۔“

”زیادہ پرہیز سے بھی مریض اکتا جاتا ہے.....“ اُن کا احساس بڑھنے لگتا ہے۔

”ایسی صورت میں صبح کی چہل قدمی دل و دماغ دونوں کے لئے مفید ثابت ہو سکتی ہے۔“

ملازم چائے لے آیا تو گفتگو کا دلچسپ سلسلہ کچھ دیر کے لئے رُک گیا۔ نادیہ کرسی آگئی۔

رکے لئے چائے تیار کرنے لگی اور منصور خاموش بیٹھے اُسے والہانہ نظروں سے دیکھتے رہے۔

”شکر تھی لیں گے آپ.....؟“ نادیہ نے نظریں اٹھا کر منصور کی طرف دیکھا۔

”اس وقت تو ضرورت نہیں محسوس ہو رہی..... ویسے ڈیڑھ چھپچھپا لیتا ہوں۔“ منصور نے شوفی سے دبا۔

”آپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شکر ملا کر چائے کا کپ منصور کی جانب بڑھایا تو انہوں نے پوچھا۔

”میں ہمارے راجیل صاحب کی جغرافیائی کیفیت کیسی ہے؟“

”نقصان کے دورے پڑ رہے ہیں۔“ نادیہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اگر یہی کیفیت برقرار رہی تو آبادی کا ٹکٹ کتنے بھی دیر نہیں لگے گی.....“

”برا خیال ہے کہ ایسے مرض میں حلیوں نے بید مشک کا استعمال مفید بتایا ہے۔“

”بید مشک.....“ نادیہ تنک کر بولی۔ ”میرا بس چلو تو دھتورا پیس کر کھلاؤں۔“

”خیریت.....؟“ منصور نے سنبھل کر پوچھا۔ ”کیا حالات قابو سے باہر ہوتے جا رہے ہیں؟“

”نادرہ کو دوا دیتے جس نے مجھے منع کر دیا ورنہ میں ایک پل میں دماغ درست کر دیتی۔“

”بات کیا ہوئی تھی.....؟“ منصور سنجیدہ ہو گئے۔

”نہیں سوار ہو گئی تھی دماغ پر.....“ نادیہ نے جھلا کر جواب دیا۔

منصور نے اصرار کیا تو نادیہ نے غصے میں آ کر الف سے لے کر آخر تک تمام داستان نشا ڈالی۔

”کے لئے اپنی کبھی ضبط کرنا مشکل ہو رہی تھی، دوسری طرف نادیہ کا یہ حال تھا کہ غصے سے لال پیلی ہو جاتی..... شرم مانع بھی اس لئے اُس نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو تلمل کر بولی۔

”برائون کھول رہا ہے اور آپ مسکرانے کی کوشش فرما رہے ہیں.....“

”آپ کے خوف سے محض مسکرانے پر اکتفا کر رہا ہوں ورنہ میرا دل تو یہی چاہ رہا ہے کہ خوب جی بٹھے لگاؤں۔“

”کس بات پر.....؟“

”راجیل کی احمقانہ صلاحیتوں پر۔“ منصور نے کہا پھر نادیہ کو سمجھاتے ہوئے بولے۔ ”آپ بلاوجہ ان کیوں جلا رہی ہیں؟ میرا خیال ہے کہ راجیل کے مرض کا علاج نادرہ بہتر طور پر کر دے گی۔“

”مجھے تو وہ رہ کر غصہ آ رہا ہے۔“ نادیہ نے کہا۔ ”بزرگوں کا خیال نہ ہوتا تو اسی وقت اُس کا تمام اہم کام ہی نکلوا کر باہر پھینکوا دیتی۔“

”کیا غصے کی کیفیت میں آپ کو اکثر یہی خیال آتا ہے.....؟“ منصور نے کچھ ایسے سہے ہوئے لہجے کی صورت بنا کر دریافت کیا کہ نادیہ بھی اُن کی بات کا مفہوم سمجھ کر مسکرانے لگی۔

”خدا کا شکر ہے کہ آپ کا موڈ دوبارہ ٹھیک ہو گیا ورنہ میں تو چائے پے بغیر نو دو گیارہ ہونے کے اسی غور کر رہا تھا۔“

”یہ نظر نہیں اٹھا کر پیار بھرے غصے سے منصور کو دیکھا، کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن شام لے بیگم کی گاڑی داخل ہوئی تو اُس نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔ منصور بھی اپنی جگہ سنبھل کر بیٹھ گئے.....!!

نادرہ کو جہاں اپنے باپ کو ملنے والی سزا کی خبر پڑ کر خوشی ہوئی وہاں اُسے ماں کی کیفیت دیکھ کر

..... وقت کی ایک ہی کر دھ نے جیسے حالات کی بساط کا رخ ایک دم پلٹ کر رکھ دیا.....

نے تجوری خالی ہونے کا طعنہ دیا تو نوشاہہ تمللا اٹھی، پہلی بار ایک سوال اُس کی زبان تک آ گیا۔
 ”تم بھی تو بیکار رہتے ہو..... کہیں کوئی ملازمت کیوں نہیں کر لیتے؟“
 ”تو..... مجھ سے زبان چلائے گی؟“ ایک مرد کا بھرپور پھٹرا اُس کے گال پر پڑا تو وہ چکرا سی گئی،
 انہوں نے آگے اندھیرے تاج اٹھے، پورا وجود گھوم کر رہ گیا، اُس کی سمجھ میں نہیں آ سکا کہ اُسے کس
 آدمی کی سزا ملی ہے۔ ”خرد دار..... دوبارہ زبان کھولی تو بویاں کر کے رکھ دوں گا۔“
 وہ سہم کر خاموش ہو گئی..... یہ بھی نہ پوچھ سکی کہ دانشور نے تو عورت اور مرد کو گاڑی کے دو پیسے
 زار دیا ہے..... پھر صرف ایک پیسہ کب تک چلتا رہے گا.....؟

اُس روز کے بعد سے باپ کا ہاتھ اُس پر بھی کھلی گیا، وہ جب بھی ماں کے بچاؤ کی خاطر درمیان
 مائی چلی کے دو پاؤں کے درمیان پس کر رہ جاتی، باپ اُسے مار پیٹ کر دوستوں کے ساتھ گل
 ہڑے اڑانے کی خاطر چلا جاتا تو ماں اُس پر برس پڑتی۔
 ”بد نصیب..... تو کیوں درمیان میں آ جاتی ہے؟“
 ”مجھ سے تمہارا دکھ نہیں دیکھا جاتا ماں!“
 ”نہیں دیکھا جاتا تو چلی جا کہیں.....“ ماں سینے پر دو ہتھ مار کر کہتی۔ ”میں نے تیری ہی خاطر تو اپنی
 نیت پھوڑ لی..... اب اگر تیری تقدیر بھی کھولی ہوگی تو دنیا والوں کو کیا منہ دکھاؤں گی؟“
 ”نہیں ماں..... نہیں!“ وہ ماں سے لپٹ کر کہتی۔ ”میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی، تمہارے سوا
 اور کون ہے میرا؟“

”پھر کانوں میں کڑوا تیل ڈالے خاموشی سے بیٹھی رہا کر.....“
 وہ ماں کے درد کو محسوس کرتی تو تڑپ کر رہ جاتی۔ گھر کے بڑے حالات کو سنوارنے کی خاطر اُس
 نے ملازمت کر لی، وہ جو کچھ کما کر لائی خاموشی سے ماں کے ہاتھ پر رکھ دیتی اور پھر اُس کا باپ کسی
 فوٹا آشام درندے کی مانند چھٹنا مار کر ساری کی ساری رقم لے جاتا..... کئی ماہ تک یہ سلسلہ جاری رہا، وہ
 حالات کے پیش نظر خاموش تماشائی بنی سب کچھ دیکھتی رہی لیکن اُس روز اُس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا
 اُس روز اُسے یہ معلوم ہوا کہ اُس کے باپ نے اُسی کے دفتر میں کام کرنے والے ایک ادھیڑ عمر شخص
 سے اُس کی شادی کی بات طے کی ہے اور اس بہانے ٹھوڑی رقم بھی اٹھ لی۔

نوشاہہ نے ماں کو حالات سے باخبر کیا تو ماں کی متا میں اُبال آ گیا، اُس نے شوہر سے باز پرس کی
 ”وہ بڑی ڈھٹائی سے بولا۔“ شادی کی بات کرنا کوئی جرم تو نہیں ہے۔“
 ”لیکن تم نے عمروں کا فرق تو دیکھا ہوتا۔“ نازی بیگم نے کہا۔ ”نوشاہہ بتا رہی تھی کہ وہ اُس سے عمر
 گنیں بائیس سال بڑا ہے..... دو بیچے پہلی بیوی سے موجود ہیں۔“
 ”تو کیا ہوا.....؟“ اقبال احمد نفرت سے جواب دیا۔ ”عمر کے اسی فرق کی وجہ سے تو وہ رقم بھی
 متول دے رہا ہے۔ چار چھ مہینے آرام سے گزر جائیں گے۔“
 ”مگر..... تم اپنی بیٹی کا سودا کرنا چاہتے ہو..... تمہیں شرم نہیں آتی؟“ نازی بیگم نے احتجاج کیا۔
 ”میں تو ہوں اس کی رقم واپس کر دو..... یہ شادی میرے جتنے جیتی نہیں ہوگی.....“
 ”تو فکر مت کر..... نوشاہہ کا نکاح ہونے سے پہلے میں تیرا یہ ارمان بھی پورا کر دوں گا۔“
 ”مجھے شوق سے مار ڈالو..... لیکن میری معصوم بیٹی پر تو اتنا بڑا مظلم نہ کرو!“ وہ مجسم التجا بن گئی
 ”اور وہ رقم جو میں لے کر خرچ کر چکا ہوں اُس کا کیا بنے گا.....؟“

ماں کا غم بانٹنے کے خیال ہی سے وہ واپس آئی تو گھر کی حالت دیکھ کر اور صدمہ ہوا..... کیا
 اجڑا اور دیران سا نظر آ رہا تھا۔ جب اُس نے باپ کے ظلم سے تنگ آ کر گھر کو خیر باد کہا تھا اُس وقت
 وہاں ڈیہر سارا ساز و سامان موجود تھا لیکن اب سوائے اُداسی اور محرومیوں کے اور کوئی قیمتی شے نظر
 آ رہی تھی۔

اُس نے ماں سے گھر کی حالت کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا، وہ جانتی تھی کہ اُس کے باپ
 نے تمام قیمتی اشیاء کو ایک ایک کر کے ٹھکانے لگا دیا ہوگا..... خود بھی وہ گھن بن کر اُس کی ماں کی زندگی
 سے لپٹ کر رہ گیا تھا۔ دیکھ کی طرح ماں کی زندگی کو اندر ہی اندر کھوکھلا کرتا چلا جا رہا تھا لیکن ماں
 اُس سے بھی کوئی شکوہ شکایت نہیں کی۔ وہ جو بھی کہتا اُسے نظریں جھکا کر مان گیتی..... اُس کے ظلم
 خلاف اُس نے بھی کوئی احتجاج نہیں کیا، ہر دم ہنس ہنس کر سہتی رہی.....

شاید اس لیے کہ وہ مرد تھا..... مجازی خدا تھا..... پھر..... ایک مجبور عورت اپنے خدا کے خلاف کیا
 کیسے بلند کر سکتی تھی.....!! وہ سب کچھ برداشت کرتی رہی..... دل ہی دل میں ٹوہنتی رہی لیکن زبان
 سے بھی اُف نہیں کی..... کرتی بھی کیسے..... وہ اُس کی زندگی کا واحد سہارا تھا۔ بیسباھی بن کر اُس
 وجود سے نصی ہو گیا تھا..... اُس کی مرضی کے بغیر تو وہ ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتی تھی..... شوہر کے خلاف
 زبان کھولتی تو گھر کی بدنامی ہوتی..... گھر کی بدنامی ہوتی تو اولاد کا مستقبل تاریک ہو جاتا..... اور
 اسی تاریکی کو دُور کرنے کی خاطر اب وہ روشن اُجالوں کی تلاش میں بھٹک رہی تھی..... اُسے اپنا ہا
 بھی عزیز تھا اور بیٹی کا مستقبل بھی.....

”نوشاہہ کو ماں کی بے بسی اور گھر کی حالت دیکھ کر پہلی بار اندازہ ہوا کہ اُس نے ماں کو تنہا حال
 کے رحم و کرم پر چھوڑ کر شاید اچھا نہیں کیا..... لیکن وہ کبھی کیا سکتی تھی، اُس سے ماں کے اور بچہ
 والے مظالم نہیں دیکھے جاتے تھے۔ وہ دم سادھے چپ چاپ بیٹھی سبھی سبھی نظروں سے سب کچھ
 رہتی۔ پھر جب ماں کی متنا کا خیال آتا تو اُنھ کے درمیان میں آ جاتی..... ماں کو بچانے کی خاطر خود
 باپ کے مظالم کا نشانہ بن جاتی، ہاتھ جوڑ کر سوتیلے باپ کے آگے کھڑی ہو جاتی..... رورو کر کہتی۔
 ”تم مجھ پر جو جاہو ظلم کرو! لیکن ماں کو اس بے دردی سے نہ مارا کرو..... آخر اس کا قصور کیا ہے
 ”قصور اس کا نہیں میرا ہے.....“ وہ نازی بیگم کو حقارت بھری نظروں سے گھور کر کہتا۔ ”مجھے
 معلوم تھا کہ اس کی تجوری میری خواہشات کے سامنے اتنی جلدی خالی ہو جائے گی.....“

وہ حیرت سے باپ کا منہ تنگے لگتی..... کتنا خود غرض اور کم ظرف انسان تھا وہ..... اُس نے ا
 عورت سے نہیں اُس کی تجوری کی چابیوں سے رشتہ جوڑا تھا..... اُسے صرف اپنے عیش و عشرت
 غرض تھی، ایک مجبور بیوی کے احساسات کی کوئی پرواہ نہیں تھی، اپنی خواہشات کی تکمیل ہی کی خاطر
 اُس نے ایک عورت کی زندگی اجیرن کر دی تھی..... اُسے خوشیوں اور مسرتوں کے خواب دکھا کر
 طرح اُس کے ارمانوں اور اُمنگوں پر شب خون مارا کہ وہ دم بخود رہ گئی۔ جب تک مال و دولت
 چمک قائم رہی اُس کا پیار بھی زندہ رہا لیکن جب تجوری کے دروازے چو پٹ ہو گئے تو ایک مرد کا
 جی ختم ہو گیا..... اُس نے آنکھیں پھیر لیں تو نازی بیگم کو احساس ہوا کہ وہ جسے زندگی کا سہارا سمجھ
 تھی اُسی نے آستین کا سانپ بن کر اُن کی خوشیوں کو ڈس لیا ہے لیکن وہ اُسے پھر بھی دودھ پلانے
 مجبور تھیں..... اس لیے کہ وہ ان کے خاندان کی شناخت بن گیا تھا..... اُس کے دم سے نوشاہہ کا
 وابستہ تھا۔ اسی اولاد کی خاطر تو انہوں نے اپنی اجڑی مانگ میں دوبارہ اشتاں سجائی تھی۔ پھر ا

”وہ مجھ سوال بن گئی، سپاٹ لہجے میں بولی۔“ تم نے کیا فیصلہ کیا.....؟“

”میں نے کوئی جواب نہیں دیا..... اپنا سامنے لے کر لوٹ آئی۔“

”میں نے تمہارا فیصلہ دریافت کیا تھا ماں.....“

”میں..... میں تمہیں جان بوجھ کر اندھے کنوئیں میں دھکا نہیں دے سکتی..... وہ لڑکا تیرے قابل ہے.....“ نازی بیگم نے بیٹی کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا پھر دونوں ہاتھ چہرے پر جا اختیار روئے لگیں۔

”ابراہیم رو سو رکھو ماں..... وہ بہتر کرے گا۔“ نوشابہ نے ماں کو روتے دیکھا تو اُس کی آنکھوں نے بھی نمناک ہونے لگے۔ پھر اُس نے ماں کو آگے بڑھ کر لپٹا لیا اور جھوٹی تسلیاں دینے لگی۔

○○○

ان کی تھقی دوسری بار بیٹی تو شائے اپنے کمرے سے نکل کر برآمدے میں آ گئی، تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی، جلدی سے ریسور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔

”ہیلو.....“

”اگن بول رہا ہے.....؟“ دوسری جانب سے کسی نے بھاری اور خشک لہجے میں پوچھا۔

”ہی..... آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟“ شائے نام بتانے کی بجائے سنجیدگی سے دریافت کیا، نبر کے خیال سے اُس نے نام پتا نامناسب نہیں سمجھا۔

”آپ سچ وقار احمد کے گھر سے بول رہی ہیں؟“

”ہی ہاں.....“ اُس نے جلدی سے جواب دیا۔ ”لیکن ابا جان اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔“

”مجھے ایک ضروری اطلاع دینی ہے..... مگر آپ کون صاحب بول رہی ہیں؟“ اس بار مہذب لہجے میں پوچھا گیا۔

”میں شائیل رہی ہوں..... وقار صاحب کی بیٹی۔“

”اگر کوئی بات ہے آپ.....؟“ دوسری جانب سے اجانک ایک غیر متوقع سوال سن کر وہ ایک لمحے کو ہلکے سے تھکی گئی کہ وقار احمد کے کسی واقف کار کا فون ہوگا لیکن احمر کا حوالہ درمیان میں آیا تو وہ اُن کے گھر میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دے؟

”ہیلو..... کیا آپ میری بات سن رہی ہیں؟“

”ہی.....“ شائے مختصر اُکھا۔

”میں ندوہی سے احمر کا ایک دوست بول رہا ہوں..... آپ مجھے لے ایک اہم پیغام ہے۔“

”میں سن رہی ہوں.....“ شائے خود کو سنبھالتے ہوئے جواب دیا۔

”میں شام احمر کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا.....“

”کی.....؟“ اُس نے احمر کو پیش آنے والے حادثے کی اطلاع سنی تو ذہن محوم کر رہ گیا۔

”خدا کا شکر ہے کہ حالت خطرے سے باہر ہے لیکن.....“

”کی.....؟“ اُس نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

”میں نے مجھ سے کہا ہے کہ آپ کو اطلاع کر دی جائے۔“ دوسری جانب سے سپاٹ آواز میں کہا

”حادثے کے بعد وہ کئی بار آپ کو یاد کر چکے ہیں۔“

”اگر وہ کال کیا خیال ہے.....؟“ وہ جلدی سے پوچھ بیٹھی۔ ”خدا نخواستہ کوئی زیادہ سیریس بات تو

”وہ میں کوئی چیز فروخت کر کے ادا کر دوں گی۔“ نازی بیگم نے بھرائی ہوئی آواز میں وعدہ کیا تو حقارت سے فرش پر تھوک کر بولا۔

”تیرے پاس ایک..... بیٹی کے سوا اور باقی کیا بچا ہے جو تو.....“

”میں کہتی ہوں اپنی نخوس زبان بند کر لے ورنہ.....“ نازی بیگم تڑپ کر چیخ اُٹھیں۔

”تیری یہ مجال..... مجھ سے زبان لڑائی ہے.....؟“ اقبال احمد کی مردانگی کو جلال آیا تو اُس نے بیوی کو زور دے گا لوں کی طرح ڈھن کر رکھ دیا، اُس روز نوشابہ نے درمیان میں آنے کی جسارت نہیں کی لیکن دوسرے روز اُس نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور اُسی روز اُسے خوش قسمتی سے سیرا خانہ کے یہاں نہ صرف ملازمت مل گئی بلکہ سر چھپانے کی جگہ بھی حاصل ہو گئی۔

لیکن..... قسمت نے ایک بار پھر اُسے گھر آنے پر مجبور کر دیا..... ایک مجبور اور بے سہارا ماں..... خاطر..... جو آج بھی اپنا سہاگ بچانے کی خاطر کسی اچھے وکیل کے پاس مشورہ کرنے لگی تھی..... اُجڑے صحن کے دوران برآمدے میں ٹوٹی کرسی پر بیٹھی وہ گزرے ہوئے حالات کے بارے میں سو رہی تھی کہ نازی بیگم کھکی ماندی گھر واپس آ گئیں۔ اُس نے ماں کے چہرے پر حسرت و یاس کے مارا منڈلاتے دیکھے تو جلدی سے قریب جا کر بولی۔

”کیا ہوا ماں..... وکیل نے کچھ اُمید دلائی؟“

”ہاں.....“ نازی بیگم نے اُداس لہجے میں جواب دیا۔ پھر برق اتار کر تخت پر بیٹھتے ہوئے بولیں

”لیکن فیس کی رقم کہاں سے آئے گی؟“

”نئی رقم مانگ رہا ہے.....؟“

”کم از کم دو ہزار بیٹگی ادا کرنے ہوں گے اور دس ہزار اپیل منظور ہونے کے بعد۔“

”اتنی رقم کہاں سے آئے گی؟“ نوشابہ نے کہا۔ ”بیٹگی کا انتظام تو خیر ممکن ہے لیکن بعد میں

ہزار.....“

”تیری خاطر میں اس گھر کو بھی رہن رکھ سکتی ہوں لیکن.....“

”لیکن کیا.....؟“ اُس نے ماں کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے جلدی سے پوچھا۔

”ہمیں اُسی کے آگے جھکنا پڑے گا جس کی وجہ سے تمہارے باپ کو سزا ہوئی ہے۔“

”کیا مطلب.....؟“

”تمہارے باپ نے جس لڑکے سے رقم لی تھی اگر وہ اپنا بیان بدل دے تو اپیل میں جان پڑے

ہے..... سوائے اس کے دوسری کوئی صورت نہیں۔“

”کیا وہ اپنے بیان سے منحرف ہونے پر آمادہ ہو جائے گا؟“

”ہو تو سکتا ہے مگر اُس نے بڑی ٹیڑھی شرط رکھی ہے۔“

”تم اُس سے بھی مل چکی ہو.....؟“ نوشابہ نے حیرت سے ماں کو دیکھا۔

”نہ ملتی تو اور کیا کرتی.....؟“ نازی بیگم نے بے بسی سے جواب دیا۔ ”دو بجے کو تنکے کا سہارا

بہت ہوتا ہے۔“

”کیا شرط رکھی ہے اُس نے.....؟“

”وہ..... اس بات پر ہند ہے کہ اگر تمہاری شادی اُس کے ساتھ کر دی جائے تو وہ اپنا بیان

دے گا۔“

نہیں؟“

”ہو بھی سکتی ہے.....“

”آپ ہولڈ کیجئے، میں امی جان کو بلاتی ہوں.....“

”اگر آپ نیردبی آجائیں تو زیادہ مناسب ہوگا..... احمر نے اسی خواہش کا اظہار کیا ہے۔“

”میں.....؟“ وہ حواس باختہ ہوئی جاری تھی، دل کی دھڑکنوں کو سمیٹتے ہوئے بولی۔ ”میں“

سکتی ہوں؟“

”پھر..... میں احمر کو کیا جواب دوں.....؟“

”اُن سے کہئے گا کہ خدا کی ذات پر بھروسہ رکھیں۔“ اُس کی آواز بھراسی گئی، آنکھوں کے

منہ نکالنے لگے۔

”گو کیا آپ احمر کی خاطر بھی نہیں آسکتیں.....؟“

وہ کوئی جواب نہ دے سکی، ریسپور ہاتھ میں لئے گنگ سی کھڑی رہی، یوں جیسے سکتے ہوگا

جیسے وہ کوئی منحوس خواب دیکھ رہی ہو..... دل کی دھڑکنیں کسی طرح قابو میں نہیں آ رہی تھیں۔

”ثنا صاحبہ.....“

”جی.....؟“ وہ بمشکل ہمت کر کے بولی۔

”میں نے آپ سے کوئی سوال کیا تھا.....“

”جی.....“ وہ اس بار بھی ”جی“ کے سوا کچھ اور نہ کہہ سکی، احمر کے حادثے کی اطلاع نے جیسے

روح کو کھینچ کر دیا تھا، پل بھر میں وہ خود کو کس قدر کمزور محسوس کرنے لگی تھی..... یوں جیسے ا

جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی باقی نہ رہ گیا ہو..... جیسے وہ حادثہ احمر کو نہیں..... خود اُس کی ذات

آیا ہو..... اور..... سانس کس قدر تنگ کر آ رہی تھی.....

”ثنا..... پلیز! میری بات کا جواب دیں، آپ خاموش کیوں ہیں؟“

وہ بدستور خاموش رہی، آنکھیں بھیگ کر گلابی ہوئی جاری تھیں۔

”ثنا.....“ اس بار دوسری طرف سے بڑی صاف آواز سنائی دی۔ ”میں احمر بول رہا ہوں۔“

”احمر.....؟“ اُس کے ہونٹوں میں ارتعاش سا پیدا ہوا جیسے گھپ اندھیرے میں ڈور نہیں

ٹھٹھاتی کرتی نظر آ گئی ہو۔

”ہاں ثنا..... میں احمر بول رہا ہوں۔“

”احمر..... آپ..... ٹھیک تو ہیں؟“ اُس نے خود کو سنبھالتے ہوئے جلدی سے پوچھا، احمر

سن لینے کے بعد جیسے اُس کے جسم میں زندگی کی ایک لہر دوڑ گئی..... یوں جیسے گھٹا ٹوپ باد

چھٹ گئے ہوں اور کسی آنے والے طوفان کا خطرہ ٹل گیا ہو۔

”مجھے کچھ نہیں ہوا ثنا.....“ احمر نے جواب دیا۔ ”میں تو آپ کو آزمانے کی خاطر محض مڑا

تھا.....“

”مذاق.....؟“ وہ ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔

موت کے دہانے تک پہنچ کر اُسے زندگی کی نوید ملی تو اُس کی حالت عجیب سی ہو گئی..... منہ

والی سردی کے بعد اچانک گرمی کی تپش ملی تو وہ ساری جان سے کپکپا کر رہ گئی۔ پھر..... اُس

کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

کچھ سر نہیں ایسی بھی تو ہوتی ہیں جن کے استقبال کے لئے خوشی کے آنسو درکار ہوتے ہیں..... ہر

اگر مرہم سے مندمل ہونے لگے تو پھر نشتر کی کیا ضرورت باقی رہ جائے.....؟

”ثنا.....“ احمر نے بے چینی سے کہا۔ ”کیا آپ کو میرے مذاق سے ڈکھ پہنچا؟“

”آپ کا کیا خیال ہے احمر.....“ اُس نے دیوار کا سہارا لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”کیا حادثے کی

باعث سن کر مجھے خوشی کا اظہار کرنا چاہئے تھا؟“

”مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے آپ کو پریشانی ہوئی۔“

”آپ ٹھیک تو ہیں نا.....؟“

”آپ کی دعا سے بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں.....“

”پھر..... حادثے والے مذاق کی کیا ضرورت پیش آ گئی تھی.....؟“ اُس نے آنچل سے بھیگی پلکوں

کے کرتے ہوئے سوال کیا۔

”اپنی ٹاکو آزمانے کی کوشش کر رہا تھا.....“

”یہ بڑی ٹھن آزماتش تھی.....“ وہ ایک طویل سانس لے کر بولی۔

”میں واقعی معذرت خواہ ہوں۔“ احمر کے لہجے سے شرمندگی کا احساس چھلک رہا تھا۔

”پلے..... اسی بہانے آپ کو سلی تو ہو گئی۔“

”میں نے آپ کو ایک خوشخبری سنانے کی خاطر فون کیا تھا.....“

”کیا.....؟“

”امی جان میری گرفتاری کے وارنٹ جاری کرنے کے سلسلے میں بڑی بنجیدگی سے غور کر رہی ہیں۔“

”مبارک ہو.....“ اُس نے مدہم آواز میں دھڑکتے ہوئے دل سے کہا۔

”آپ کو بھی.....“ احمر کی آواز گنگنائی ہوئی ابھری..... ”جانتی ہیں امی جان نے مجھ سے کیا کہا

.....؟“

”میں اتنی دُور بیٹھ کر کیا اندازہ لگا سکتی ہوں.....“

”امی جان نے میرے لئے وقار انکل کی بڑی بیٹی کا انتخاب کیا ہے.....“

”ٹانے کوئی جواب نہیں دیا، خاموش کھڑی دل کی دھڑکنوں کا شمار کرتی رہی۔

”لوں کی گردش نے اُسے کیسی گنگا جمنی کیفیتوں سے دوچار کر دیا تھا..... اُسے احمر نے حادثے کی

ایادی تو وہ تڑپ اٹھی تھی..... اور..... اب اُسے آنے والے کل کی خوشی کا مژدہ سنایا گیا تو رُوح

ٹپٹپ اٹھی.....“

”آپ نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا.....؟“ احمر نے دریافت کیا۔ ”کیا آپ کو اس خبر

کوئی خوشی نہیں ہوئی؟“

”آپ نے کیا اندازہ لگایا.....؟“ اُس نے آہستہ سے پوچھا۔

”میرا خیال ہے کہ اس وقت آپ بے انتہا مسرور ہوں گی.....“

”احمر.....“ وہ بنجیدگی سے بولی۔ ”آپ کو یاد ہے کہ میں نے آپ سے کیا کہا تھا؟“

”کیا.....؟“

”میںڈیکل کرنا میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے.....“

”اور میں نے آپ کی خواہش کا احترام کرنے کا وعدہ کیا تھا.....“

دھڑکی سے اپنے کمرے میں جانے کے لئے پلٹی تو صائمہ سے ٹکراتے ٹکراتے رہ گئی۔

”کیا بات ہے باجی..... کس کا فون تھا؟“ صائمہ نے اُسے غور سے دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔

”تمہارے احمر بھائی کا.....“

”کیا کہہ رہے تھے.....؟“ صائمہ نے خوش ہو کر پوچھا۔

”ب کی خیریت دریافت کر رہے تھے.....“

”کچھ آنے کے بارے میں نہیں بتایا.....؟“

”نہیں..... درمیان میں کچھ گڑبگڑ بھی..... لائن کٹ گئی۔“

وہ صائمہ کو خوبصورتی سے ٹال کر اپنے کمرے میں آئی تو احمر کا تصور اُس کے ذہن کے پردوں پر برآ۔ اُن کے چہرے پر زندگی سے بھرپور مسرتیں رقص کر رہی تھیں، کیسی شریر نظروں سے اُسے لہرے جا رہے تھے۔ شانے اُن نگاہوں کی شوخی سے لجا کر آنکھیں بند کر لیں تو احمر کی آواز اُس کے ذہنی گہرائیوں میں گونج اُٹھی۔

”میں غلط نہیں کہا تھا..... شاہرحر کے دل میں رہتی ہے..... ہمیشہ یوں ہی رہے گی..... پھول کی

لہکی طرح..... اور یہ خوشبو زندگی کی آخری سانوس تک میرے وجود میں رچی بسی رہے گی..... ہاں

اٹھنم سے سچ کہہ رہا ہوں..... کبھی وقت آئے تو آزما کر دیکھ لینا.....“

اور احمر کے تصور میں گم ہو کر وہ مستقبل کی حسین وادیوں کی سیر کرنے لگی!!

○○○

کھانے کی میز پر آج خلاف توقع کچھ زیادہ ہی خاموشی طاری تھی۔

دقار احمد دن بھر کے تھکے ماندے آئے تھے اس لئے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ نادیہ کو چونکہ راجیل

نے بڑھ چکی تھی اس لئے جان بوجھ کر خاموش تھی، راجیل کی خاموشی کی وجہ شامکے بیگم تھیں جو اپنے کسی

بالوں میں جھپٹیں..... شاہراہی ابھی پڑھتے سے اٹھ کر آئی تھی اس لئے چہرے سے تکان ظاہر ہو رہی تھی۔

انکماں کے قریب بیٹھی تھی اور فرحان، نادیہ کے سیدھے ہاتھ پر موم جو تھا۔

کھانے کے دوران راجیل دو تین مرتبہ نادیہ کو تنکھوں سے دیکھ چکے تھے جو اُن کے سامنے والی

ست پر بیٹھی کھانے میں مصروف تھی، اُس وقت وہ ٹی شرٹ اور پتلون میں ملبوس تھے۔

خاموشی میز پر ایک اُستاد دینے والی خاموشی طاری رہی پھر گفتگو کا آغاز دقار احمد نے کیا۔

”کیوں فرحان میاں..... آپ کا نتیجہ کب آ رہا ہے.....؟“

”نتیجہ تو معلوم ہے..... بس ایک دو روز میں اعلان بھی ہو جائے گا۔“ فرحان نے صائمہ کو جلالانے

کاغذ پر کہا۔

”تمہیں کیسے معلوم ہو گیا نتیجہ.....؟“ شامکے بیگم نے نظریں اٹھا کر فرحان کو وضاحت طلب نظروں

سے دیکھا، اُن کے لہجے سے بھی یہ بات صاف عیاں تھی کہ وہ کسی سوچ میں گم ہیں۔

”جب میرے سارے ریسے فرسٹ کلاس ہوئے ہیں تو پھر نتیجہ بھی فرسٹ کلاس ہی ثابت ہوگا۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو، لیکن قبل از وقت ڈیک مارلی اچھی بات نہیں ہوتی.....“ صائمہ نے نوالہ

باتے ہوئے کہا۔

”اُس میں ڈیک مارنے کی کیا بات ہے.....؟“ فرحان نے جو خاموشی کی وجہ سے بری طرح

لکھا ہوا تھا راجیل کو بھی گفتگو میں ملوث کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم بھول گئیں کہ اُس روز راجیل بھائی

”ایک وعدہ اور بھی کر لیجئے!“ وہ شوخی سے بولی۔ ”دوبارہ آپ کبھی اتنی سنجیدگی سے کوئی ایسا وعدہ

نہیں کریں گے۔“

”وعدہ رہا..... لیکن ایک شرط پر۔“

”وہ کیا.....؟“

”آپ کو میرے سوال کا جواب دینا ہوگا.....“

”پوچھئے.....“

”اگر میرے حادثے والی اطلاع سچ ہوتی تو آپ کے دل پر کیا گزرتی.....؟“

”کچھ جذبے ایسے ہوتے ہیں جن کا اظہار لفظوں کی زبانی نہیں کیا جاسکتا.....“ شانے سنجیدگی

کہا۔ ”موت اور زندگی کے درمیان بس ایک پل کا فاصلہ ہوتا ہے..... سانس ٹوٹ جائے تو.....“

”پلیز شاہراہی..... دوسری جانب سے احمر نے جلدی سے کہا۔ ”میں نے آپ سے موت کے فلسفے

بارے میں نہیں، مستقبل کی خوشیوں کے بارے میں دریافت کیا تھا۔“

”میں کوئی نجوی تو نہیں جو ابھی سے مستقبل کے بارے میں کوئی فیصلہ کر سکوں۔“

”کسی اور کی خوشی کی خاطر دو بیٹھے بول تو بول سکتی ہیں.....“

”یہی سوچ رہی ہوں کہ کیا جواب دوں.....“ شانے مسکراتے ہوئے کہا پھر احمر کو چھیڑنے کی عادت

بولی۔ ”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ آپ مجھے خوش کرنے کی خاطر مذاق کر رہے ہوں۔“

”یہ مذاق نہیں شاہراہی..... میری زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔“

”پھر تو آپ کو مبارکباد دینی ضروری ہو گئی۔“ اُس نے شوخی سے کہا۔ ”آپ نے کسی وقار انگ

ذکر کیا تھا..... کہاں رہتے ہیں وہ؟“

”اسی شہر میں جہاں آپ رہتی ہیں.....“ احمر نے جواب دیا۔ ”آپ کہیں تو اُن کی بڑی بیٹی کا

بھی بتاؤں؟“

”مجھے کیا ضرورت ہے کسی کا نام دریافت کرنے کی۔“

”پوچھ لینے میں کوئی حرج بھی نہیں.....“

”آپ کا اصرار ہے تو پوچھ لیتی ہوں.....“ اُس نے دل کی لطیف دھڑکنوں پر قابو پاتے ہو

کہا۔ ”کیا نام ہے اُس خوش نصیب کا.....؟“

”شاہراہی.....“

”نام کچھ عجیب سا نہیں لگا.....؟“

”وہ خود بھی بہت عجیب و غریب ہے.....“

”اچھا.....“ شانے حیرت سے کہا۔ ”کہاں رہتی ہے.....؟“

”احمر کے دل میں.....“

اور احمر کا جواب سن کر وہ شرملا گئی، حیا کی سرفی خون کی گردش کے ساتھ جسم میں دوڑی تو چہرہ

گھٹنا ہو گیا، احمر اُس کے سامنے نہیں تھے پھر بھی شانے مارے شرم کے دراز پلکیں اُنکھوں پر چھلک

لیں، اپنے وجود میں سمٹ کر رہ گئی پھر درمیان میں کسی اور کی آواز سنائی دی تو اُس نے گھبرا کر رہ

رکھ دیا..... اس خیال ہی سے کٹ کر رہ گئی کہ شاید احمر اور اُس کی باتیں کوئی اور بھی سن رہا تھا۔

جانے اُس نے احمر اور اُس کی گفتگو کے بارے میں کیا رائے قائم کی ہو..... کیا سوچا ہو.....؟

کیا کہہ رہے تھے.....؟

”کیا.....؟“ صائمہ نے پوچھا۔

”یہی کہ تین سال بعد اس بار انہیں بھی فرسٹ ڈویژن کی امید ہے۔“

”ارے ہاں راجیل میاں..... تمہارا نتیجہ بھی تو آنے والا ہوگا.....“

”جی ہاں.....“ راجیل نے وقار احمد کو سنجیدگی سے جواب دیا۔

”راجیل بھائی سے پہلے تو میرا رزلٹ آئے گا۔“ صائمہ بولی۔

”یہی بات راجیل بھائی کے حق میں نہیں جاتی۔“ فرحان نے جلدی سے جواب دیا۔ ”سنا۔“

بلی کے راستہ کاٹ جانے سے شگون خراب ہو جاتا ہے۔“

”بری بات ہے فرحان.....“ ثناء نے بھائی کو ٹوکا۔ ”تمہیں ایسی بات مذاق میں بھی نہیں کہنی چاہیے۔“

”تمہارا کیا خیال ہے ثناء بیٹی.....؟“ وقار احمد نے ٹاکو دیکھ کر مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔ ”را“

میاں کامیاب ہو جائیں گے؟“

”مجھے تو پوری امید ہے۔“ ثناء نے کہا۔ ”راجیل یقیناً اچھے نمبروں سے کامیاب ہوں گے۔“

”میری بھی یہی دعا ہے کہ خدا میرا خاتون کے خوابوں کو شرمندہ تعبیر کرے۔“ ثناء بیگم نے

سوچتے ہوئے کہا پھر راجیل کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولیں۔ ”ایف۔“

کرنے کے بعد تمہارا کیا ارادہ ہے.....؟“

”بڑھائی جاری رکھوں گا۔“ راجیل نے بڑی انکساری سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”کم از کم بلی۔“

تو ضرور کروں گا۔“

”خدا کرے تم دن و گنی اور رات چوگنی ترقی کرو! لیکن میرا مطلب یہ تھا کہ نتیجہ آ جانے کے

تمہارا کیا ارادہ ہے..... کیا بی۔ اے بھی کراچی سے کرو گے یا لاہور جا کر داخلہ لینے کا خیال ہے۔“

”یہ تو میری فیصلہ پر منحصر ہے۔“

”تمہاری اپنی جی تو کوئی رائے، کوئی مرضی ہوگی۔“ ثناء بیگم نے کریدنے والا انداز اختیار کیا تو

احمد نے بیوی کو غور سے دیکھا لیکن بچوں کے سامنے کچھ کہنے کی بجائے جلدی سے اپنی توجہ دوسری

مبذول کر لی۔

”میری مرضی تو یہی ہے کہ بی۔ اے بھی کراچی سے کروں۔“ راجیل نے ثناء کی جانب

ہوئے کہا۔ ”یہاں کا ماحول بڑھائی کے لئے زیادہ مناسب ہے۔“

”وہ تو خیر ہے، لیکن تمہیں یہ بھی سوچنا چاہئے کہ تمہاری ماں کو تمہاری ڈوری کا احساس بھی

شدت سے ستاتا ہوگا۔ اور پھر ثناء اپنی بڑھائی میں ہر وقت اتنی مصروف رہتی ہے کہ اُسے کھانے

ہوش بھی نہیں رہتا۔“ ثناء بیگم نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے سپاٹ آواز میں کہا۔ ”جب دیکھ

مونی مونی کتابوں سے سرکھپائی رہتی ہے یا پھر مٹر دوں کی سال خوردہ کھوپڑی کے حصوں کا مطالعہ

رہتی ہے.....“

”جی ہاں.....“ راجیل نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔ ”میڈیکل میں تو یہ سب کچھ کرنا لازم ہوتا۔“

”کبھی کبھی تو جانوروں کا پوسٹ مارٹم بھی کرنا پڑتا ہے.....“ فرحان بولا۔ ”کیوں راجیل بھائی

”وہ تو جانوروں کے ڈاکٹر کرتے ہیں۔“ صائمہ نے جلدی سے کہا۔

”لیکن ہوتے تو وہ بھی انسان ہیں۔“ فرحان نے جلدی سے کہا۔ ”اب اپنی بڑی آپا بی“

ناٹون ہو کر مرد کو بڑھا رہی ہیں یا نہیں؟“

”فرحان.....“ ثناء بیگم نے بیٹے کو گھورا۔ ”ہر بات میں ٹانگ پھسانا اچھی بات نہیں ہوتی۔ اور

وہ کی بات میں دخل دینا بے ادبی میں شمار ہوتا ہے۔“

”میں نے کوئی غلط بات تو نہیں کہی.....“ فرحان نے نہایت ادب سے جواب دیا۔

”لیکن ہر بات میں بولنا ضروری بھی نہیں ہوتا.....“

وقار احمد نے ایک بار پھر بیوی کو غور سے دیکھا، وہ کچھ اُلجھی اُلجھی سی نظر آ رہی تھیں ورنہ عام طور پر

فرحان کا بولنا ہمیشہ اچھا لگتا تھا، یقیناً کوئی ایسی بات تھی جس نے ثناء بیگم کو اُلجھا رکھا تھا لیکن

مرنے سب کی موجودگی میں پرسش احوال سے گریز کیا، راجیل کی طرف دیکھ کر بولے۔

”مگر یہاں رہ کر بی۔ اے کرنا چاہتے ہو تو بڑے شوق سے کرو..... بھلا ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا

ہے؟“ ثناء بیٹی کی مصروفیات کا سوال تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ایک سے ایک اور بہتر سے بہتر

بدولت ہو سکتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ تمہاری می کو تمہاری کی ضرور محسوس ہوتی ہوگی۔“

”راجیل خاں ہے کہ چھٹیوں میں لاہور ہواؤں.....“

”کائنم نے اپنی می سے بات کر لی ہے.....؟“

”جی نہیں.....“ راجیل بولے۔

”عجب اتفاق ہے.....“ وقار احمد نے کہا۔ ”تم لاہور جانے کے بارے میں سوچ رہے ہو اور

میں یہاں آنے کا ارادہ کر رہی ہیں۔“

”آپ کو کیسے معلوم ہوا.....؟“ ثناء بیگم نے چونکتے ہوئے دریافت کیا۔

”آج ہی فون پر گفتگو ہوئی تھی.....“ وقار احمد بولے۔ ”اُن کا خیال ہے کہ راجیل میاں کی کامیابی

ناہیک کراچی میں منایا جائے، اس کے بعد غالباً کچھ دنوں کے لئے وہ راجیل کے ساتھ سیر و

نکے ارادے سے کہیں باہر جانے کا بھی پروگرام بنا رہی ہیں۔“

”ثناء بیگم نے کوئی جواب نہیں دیا، کسی سوچ میں پڑ گئیں۔“

راجیل بھائی کی کامیابی کا جشن تو بہت دھوم دھام سے منایا جائے گا۔“ فرحان نے سنجیدگی سے

”راجیل خاں ہے کہ کسی فائیموٹار ہوٹل میں اہتمام ہوگا۔“

”آپ فکرنہ کریں.....“ راجیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آپ کی رس ملائی پکی ہے.....“

”یہ رس ملائی کا کیا قصہ ہے.....؟“ ثناء بیگم نے کہا۔

راجیل بھائی نے اپنی کامیابی کی پیشگی خوشی میں کھلائی تھی۔“ فرحان نے جلدی سے کہا۔

راجیل بھائی نے کھلائی تھی یا تم نے فرمائش کی تھی.....؟“ وقار احمد نے بیٹے کو دیکھتے ہوئے مسکرا

چھا۔

”میں نے صرف اپنی پسند کا اظہار کیا تھا۔“

”میں دیکھ رہی ہوں کہ تم آج کل راجیل کو زیادہ ہی پریشان کرنے لگے ہو.....“ ثناء بیگم نے کہا۔

”کی نہیں آئی.....“ راجیل نے جلدی سے فرحان کی طرف ذرا تڑپ کر تے ہوئے کہا۔ ”فرحان کی وجہ

یہاں میرا دل لگ گیا ہے۔“

”مگر آپ پھر بھی ذرا بچ کر رہیں!“ ثناء بولی۔ ”فرحان کی شرارتوں سے سب ہی پناہ مانگتے ہیں۔“

”یہ آپ.....“ فرحان نے پیار سے ثناء کی جانب دیکھتے ہوئے بڑے لاڈ سے کہا۔ ”آپ بھی

”جیتا ہے باجی..... اپنے راجیل بھائی چوڑی دار پا جامہ اور شیروانی میں کیسے لگیں گے؟“
 ”میں کیا بتا سکتی ہوں.....؟“ نادیہ نے بیزار سے کہا۔
 ”فرحان میاں..... آپ کیوں مجھے ایسے خاصے انسان سے کارٹون بنانا چاہتے ہیں؟“ راجیل نے
 رات ہوئے کہا۔ ”ایسا لگے گا جیسے سارگی پر غلاف چڑھا دیا گیا ہو.....“
 ”وہ تو ہے..... لیکن سارگی بغیر غلاف کے اچھی بھی تو نہیں لگتی۔“ فرحان نے اتنی معصومیت سے کہا
 راجیل کے علاوہ نادیہ بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔
 ”جہیں دوسروں کا مذاق اڑانے کے سوا کچھ اور بھی آتا ہے؟“ صائمہ نے بھائی سے پوچھا۔
 ”میں تو راجیل بھائی کے خیال کی تائید کر رہی ہوں.....“ راجیل نے شوخی سے کہا۔ ”ناراجیل بھائی
 نے؟“
 ”میں سن بھی رہا ہوں اور سمجھ بھی رہا ہوں.....“ راجیل نے فرحان کو پیار سے گھورتے ہوئے
 دیا۔ ”آپ کی بیبی باتیں تو مجھے پسند ہیں.....“
 کھانے کے دوران اسی قسم کی دلچسپ باتیں ہوتی رہیں لیکن نا اچھی تک نادیہ کے اسی ”پاس پڑوس
 ابھی مہربان ہونے لگے ہیں“ والے جملے پر بہت تنبیہ کی سے غور کر رہی تھی!!



ٹائم ٹیگم اُس وقت بھی کسی سوچ میں غرق تھیں جب شوہر نے کمرے میں قدم رکھا۔ پھر بیشر اس
 کو وقار احمد بیوی سے اُن کی پریشانی اور اُجھن کی وجہ دریافت کرتے، ٹائم ٹیگم نے شوہر کو قریب
 دیکھ کر تنبیہ کی سے دریافت کیا۔
 ”کیا آج آپ کی سیرا خاتون سے گفتگو ہوئی تھی.....؟“
 ”جی ہاں..... لیکن.....“

”آپ نے مجھ سے اس کا تذکرہ نہیں کیا.....“
 ”اتفاق ہی کہاں ملا؟“ وقار احمد بولے۔ ”جتنی دیر میں لباس تبدیل کیا آپ نے کھانا چنوا دیا۔“
 ”کیا باتیں ہوئیں آپ کی.....؟“
 ”وہ راجیل کی کامیابی کے بعد یہیں آنے کا ارادہ رکھتی ہیں، اس کے بعد کامیابی کے جشن کے بعد.....“
 ”یہ باتیں میں کھانے کے دوران بھی سن چکی ہوں۔“ ٹائم ٹیگم نے ایک بار پھر شوہر کی بات
 نہ ہوئے کہا۔ ”کوئی اور خاص بات تو نہیں ہوئی.....؟“
 ”خاص بات سے آپ کی کیا مراد ہے؟“ وقار احمد نے بیوی کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔
 ”میرا خیال ہے کہ اگر ایف اے کے بعد راجیل لاہور واپس چلا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔“
 ”خیریت تو ہے..... یہ آج آپ راجیل اور فرحان کے اوپر اس قدر توجہ کس سلسلے میں دے رہی
 ہیں؟“ وقار احمد بولے۔ ”کھانے کے دوران بھی.....“
 ”آپ کو حالات کا اندازہ نہیں ہے۔“ ٹائم ٹیگم بولیں۔ ”مصلحت اسی میں ہے کہ کسی طرح یا تو
 لاہور جا کر کر کے پر آمادہ کیا جائے یا پھر اُس کی رہائش کا بندوبست کہیں اور ہو جائے۔“
 ”میں آپ کا مقصد نہیں سمجھا..... کیا خدا نخواستہ راجیل سے ایسی کوئی ناشائستہ حرکت سرزد ہو گئی ہے
 پاس کے خلاف ہو گئی ہیں؟“
 ”ایسی کوئی بات نہیں.....“

اپنے منے سے بھائی کی شکایت کر رہی ہیں؟“
 ”بات شکایت کی نہیں تمہاری شرارتوں کی ہے.....“
 ”جو بچے شرارت نہ کریں وہ ذہین نہیں ہوتے۔“ راجیل بولے۔ ”فرحان میاں کی شرارت
 مجھے پسند ہیں۔“
 ”راجیل بھائی! ایک بات پوچھوں؟“ فرحان نے تنبیہ کی سے کہا۔ ”آپ جشن والے دن کیا
 نہیں گئے؟“
 ”میں سمجھا نہیں.....“
 ”میرا خیال ہے بوزیادہ مناسب رہے گی۔“ نادیہ نے پہلی بار دبی زبان میں کہا۔ ”بو باندہ
 آدمی زیادہ سمارٹ نظر آتا ہے۔“
 ”لیکن میرا مشورہ کچھ اور ہے.....“ فرحان نے بدستور تنبیہ کی سے کہا۔
 ”آپ کا کیا مشورہ ہے.....؟“ راجیل نے پوچھا۔
 ”آپ چوڑی دار پا جامہ اور شیروانی میں خوب بچیں گے..... بالکل شہزادوں کی طرح۔“
 ”فرحان..... تم باز نہیں آؤ گے؟“ ٹائم ٹیگم نے فرحان کو سرزنش کی تو وقار احمد بولے۔
 ”یہ آج آپ فرحان بیٹے پر بار بار کیوں خفا ہو رہی ہیں؟ میرا خیال ہے فرحان نے راجیل
 نہایت مناسب مشورہ دیا ہے۔“
 ”اس بات کی تائید میں بھی کروں گی امی جان!“ ٹائم نے بھی بھائی کی طرف داری کی۔
 ”میں مانتی ہوں..... لیکن آخر ضرورت کیا ہے ہر معاملے میں مشورہ دینے کی؟“ ٹائم ٹیگم
 اُٹھتے ہوئے کہا پھر اُٹھ کر جانے لگیں تو وقار احمد نے تنبیہ کی سے پوچھا۔
 ”کہاں جا رہی ہیں.....؟“
 ”میرا سر بھاری ہو رہا ہے..... کچھ دیر آرام کروں گی۔“
 وقار احمد بھی بیوی کے جانے کے بعد میز سے اُٹھ گئے تو ٹائم نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ
 طبیعت ایک دوروز سے ٹھیک نہیں ہے..... جانے کس سوچ میں ڈوبی رہتی ہیں؟“
 ”ہوسکتا ہے امی جان کو صائمہ کے نتیجے کی فکر ہو۔“ فرحان نے شوخی سے کہا تو صائمہ چپ نہ
 ”قاضی جی! اُبلے کیوں شہر کے اندیشے سے..... دیکھ لیتا، تم سے زیادہ اچھے نمبروں سے
 ہوں گی۔“
 ”تم واقعی بہت شریر ہوتے جا رہے ہو۔“ نادیہ نے فرحان سے کہا۔ ”اس وقت صائمہ کو
 کی کیا ضرورت تھی؟“
 ”پھر کسے چھیڑوں.....؟“ فرحان بڑی معصومیت سے بولا۔ ”راجیل بھائی کے اوپر آج
 بہت مہربان ہیں۔“
 ”ایک امی ہی پر کیا موقوف ہے.....“ نادیہ نے پانی کا گلاس اُٹھاتے ہوئے کہا۔ ”راجیل
 کی شخصیت ہی کچھ اتنی پُرکشش اور جاذبِ نظر ہے کہ پاس پڑوس والے بھی مہربان ہونے لگے
 ثناء، نادیہ کا جملہ نہ کر چوکی، اُس نے تیزی سے راجیل کی سمت دیکھا، وہ بھی کچھ جزیرہ نظر
 تھے۔ فرحان کو چونکہ والدین کے چلے جانے سے آزادی مل گئی تھی اس لئے اُس نے ایک بار
 سے کہا۔

”آپ شاید کی بات کر رہے ہیں اور میں پورے وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ بھی ثنا اور نادیہ پر نظر سے لے بیٹھی ہیں۔“ شائلہ بیگم نے شوہر کی بات کاٹتے ہوئے بڑے یقین سے کہا۔ ”سب سے زیادہ فکر تو بات کی ہے کہ اگر سمیرا خاتون نے بھی رشتے کی بات چھیڑ دی تو ہم کیا جواب دیں گے؟“

”جواب کیا دیتا ہے؟“ وقار احمد بولے۔ ”نادیہ کا معاملہ تو طے ہو چکا ہے۔ رہا ثنا کا سوال تو اُنے چاہا تو وہ بھی احمد کے ساتھ منسوب ہو جائے گی۔“

”آپ مرد ہیں اس لئے ایسا سوچ رہے ہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ نادیہ اور منصور یا ثنا اور احمد کی بات کا سمیرا خاتون کو بھلا کیا علم۔۔۔۔۔ انہیں جب بات کا علم ہوگا تو وہ یہی سوچیں گی کہ ہم نے اسی کجخت مارے اقبال احمد کی وجہ سے انکار کیا ہے۔“

”آپ بھی بجا فرما رہی ہیں۔“ وقار احمد بولے۔ ”بات واقعی الجھ کر رہ گئی ہے۔ لیکن کیا ایسا ہو سکتا کہ ہم نادیہ اور منصور میاں کی منگنی کا باقاعدہ اعلان کر دیں؟“

”آپ بھی کمال کرتے ہیں۔“ شائلہ بیگم نے کہا۔ ”جمال بھائی کا تو شروع سے یہی اصرار تھا کہ نانی رسم ادا کر دیں لیکن ہم نے احمد اور ثنا کی وجہ سے انہیں سمجھا لیا۔۔۔۔۔ اب جو ہماری طرف سے ارہ ہوگا تو وہ کیا سوچیں گے؟ نادیہ کو کیا جواب دیا جائے گا؟ اور رہا خطرہ۔ تو وہ اس منگنی کے بعد اپر پرنسز لانا رہے گا۔۔۔۔۔ سمیرا خاتون، ثنا کا رشتہ بھی تو مانگ سکتی ہیں۔“

”پھر۔۔۔۔۔ آپ کا کیا فیصلہ ہے؟“

”میں نے تو جب سے امی جان کی تمام باتیں سنی ہیں میرا ذہن جیسے کند ہو کر رہ گیا ہے۔۔۔۔۔ البتہ جان کا خیال ہے کہ اگر راجیل کو کسی طرح سے درمیان سے ہٹا دیا جائے تو بات بن سکتی ہے۔“

”میں اس خیال سے اتفاق نہیں کرتا۔۔۔۔۔ سمیرا خاتون کا ارادہ اگر ثنا یا نادیہ کے سلسلے میں ہے تو وہ مل کے یہاں سے چلے جانے کے بعد بھی رشتے کی بات چھیڑ سکتی ہیں۔“

”یہ بھی آپ درست کہہ رہے ہیں مگر ایک بات طے ہے کہ راجیل کے ہمارے یہاں رہنے سے لہ احمد والی بات کسی وقت بھی مکمل کر سامنے آ سکتی ہے۔“

وقار احمد کچھ دیر تک خاموش رہے، پھر بولے۔ ”ایک بات کہوں اگر ماننے کا وعدہ کریں۔۔۔۔۔“

”پہلے میں نے آپ کی کس بات سے انکار کیا ہے جو اس معاملے میں جیل و جت کروں گی؟“

”میرا مشورہ ہے کہ آپ فی الحال اس سلسلے میں پریشان نہ ہوں۔۔۔۔۔ راجیل کے بارے میں آپ زیادہ فکرمند ہونے سے بات بھی خراب ہو سکتی ہے۔“

”کیا آپ کے ذہن میں اس مسئلے کا کوئی حل آ گیا ہے؟“

”میں تو نہیں۔۔۔۔۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ وقار احمد نے ناگواری سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”سمیرا خاتون کو آ لینے دیجئے، اس کے بعد ہی کوئی راستہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔“

”اور اگر انہوں نے آتے ہی راجیل کی کامیابی کی خوشی میں رشتے کی بات چھیڑ دی تو۔۔۔۔۔؟“

”اصل ازل وقت پریشان ہونے سے کیا فائدہ۔۔۔۔۔ اور پھر ہمیں تو رشتے والی بات سے زیادہ اقبال نانیہ سے سروکار ہونا چاہیے۔“ وقار احمد نے جواب دیا۔ ”آپ مطمئن رہیں۔۔۔۔۔ میں کوئی شل لگا کر یہ تمام معاملات خوش اسلوبی سے حل ہو جائیں۔“

”پھر کیا بات ہے۔۔۔۔۔؟“ وقار احمد نے اس بار قدرے پیار سے کہا۔ ”میں دو ایک روز سے لڑ کر رہا ہوں کہ آپ کچھ کم صبر ہی رہنے لگی ہیں۔“

”بات ایسی ہی ہے کہ آپ سناں گے تو آپ بھی پریشان ہو جائیں گے۔“ شائلہ بیگم نے کہا آگے بڑھ کر خواب گاہ کا دروازہ بند کیا اور وہ تمام باتیں شروع سے آخر تک سنا ڈالیں جو اقبال احمد بارے میں انہیں ماں سے معلوم ہوئی تھیں۔

وقار احمد بڑی توجہ سے تمام باتیں سنتے رہے، اقبال احمد کی سزا والی خبر سن کر وہ بھی سوچ میں پڑا۔

”اب بتائیے، کیا ایسی صورت حال میں راجیل کا یہاں قیام مناسب رہے گا۔۔۔۔۔؟“ شائلہ بیگم پوچھا۔

”یہی میں سوچ رہا ہوں کہ ان تمام باتوں میں راجیل پیارے کا کیا قصور۔۔۔۔۔؟“

”نہ سہی۔۔۔۔۔ لیکن دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔“ شائلہ بیگم نے کہا۔ ”راجیل کی دہر سمیرا خاتون کا بھی یہاں آنا جانا رہے گا اور اگر کبھی بات پھوٹی تو۔۔۔۔۔“

”میں سمجھ رہا ہوں۔۔۔۔۔“ وقار احمد نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”مگر سمیرا خاتون کو کس طرح دے سکتا ہے؟ اور پھر آپ تو جانتی ہیں کہ خان بہادر صاحب سے ہمارے تعاقبات کی نوعیت کس قسم کی۔“

”انہی باتوں نے تو مجھے بھی الجھا رکھا ہے۔“ شائلہ بیگم بولیں۔ ”نہ کچھ کہتے بن پڑ رہا ہے چپ رہنا مناسب ہے۔ ابھی آپ جان کو کچھ نہیں معلوم۔۔۔۔۔ وہ نہیں گے تو اُن کے دل پر کیا بیجے گی۔“

”مگر اقبال احمد کی گرفتاری سے شائد بہن کی ذات کو اب کیا نسبت ہو سکتی ہے؟“

”کیوں۔۔۔۔۔“ شائلہ بیگم نے کہا۔ ”جمال بھائی کے کان تک بات پہنچی تو وہ ہمارے بارے میں خیال کریں گے؟ ساری بنی بنائی عزت خاک میں مل جائے گی۔“

”آپ کا وہم ہے ورنہ جمال احمد نہایت وسیع القلب اور معاملہ فہم واقع ہوئے ہیں۔ اور پھر کا پیغام بھی خود اُن ہی کی طرف سے آیا تھا۔“ وقار احمد نے کہا۔ ”جمال بھائی کی طرف سے خط کوئی بات نہیں البتہ سمیرا خاتون کو اصل صورت حال کا علم ہوا تو اُن کی نگاہوں میں ہمارا وہ مقنا رہے گا جو اس وقت قائم ہے۔“

”امی جان کا بھی یہی خیال ہے۔۔۔۔۔“ شائلہ بیگم نے جلدی سے کہا۔ ”اسی لئے انہوں نے دیا ہے کہ راجیل سے ہمارا محتاط رہنا ضروری ہے۔“

”وہ تو ہے۔۔۔۔۔ لیکن آپ خود ہی غور فرمائیں! کیا آپ ہم بلا کسی وجہ کے منہ کھول کر راجیل کہہ سکتے ہیں کہ تم اپنا کوئی اور ٹھکانہ تلاش کر لو۔۔۔۔۔؟ خان بہادر صاحب نے ہمارے اوپر فیکڑا سلسلے میں جو عنایت کی ہے کیا اُسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے؟“

”پھر آپ ہی بتائیں۔۔۔۔۔ ایسا کون سا راستہ اختیار کیا جائے کہ ہمارا بھرم بھی قائم رہے اور با۔۔۔۔۔ خراب ہونے پائے۔“ شائلہ بیگم نے الجھتے ہوئے کہا۔

”جمال بھائی باقاعدہ طور پر نادیہ کو بہو بنانے کا ارادہ ظاہر کر چکے ہیں۔۔۔۔۔ وہ لاکھ آزاد خا کشادہ ذہن کے مالک ہوں لیکن جس گھر سے اولاد کا مستقبل ہو، وہاں کے بارے میں کوئی اہم خبر ملے تو انسان بہر حال سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔ پھر بچوں کو ان باتوں کا علم ہوگا تو اُن سے پر بھی کوئی نہ کوئی اثر تو ضرور پڑے گا۔“

”آپ نے سمیرا خاتون کے سلسلہ میں بھی تو کچھ خیال ظاہر کیا تھا، میرا مطلب ہے کہ شاید وہ بھی

”خدا کرے ایسا ہی ہو.....“ شائلہ بیگم نے دُعا مانگتے ہوئے کہا۔

”اُس کی ذات سے مایوسی گناہ ہے..... وہ جو بھی کرے گا بہتر ہی کرے گا۔“ وقار احمد بولے۔
گفتگو کا رخ بدلنے کی خاطر کہا۔ ”اُس وقت ایک کپ کافی کی بڑی شدت سے خواہش ہو رہی ہے۔
آج کچھ ٹکان بھی زیادہ ہے، کام اس قدر تھا کہ دن بھر سر اٹھانے کی مہلت ہی نہ ملی۔“

”آپ آرام کیجئے..... میں ابھی کافی تیار کر لاتی ہوں.....“ شائلہ بیگم نے جواب دیا پھر خواب کا دروازہ کھول کر باہر چلی گئیں۔ اور وقار احمد بڑی سنجیدگی سے اُلجھے ہوئے حالات کے نشیب واز کے بارے میں غور کرنے لگے.....!!



وقت کی طنائیں ٹوٹ کر بکھریں تو زندگی کی نمائش کا بھرم بھی کھل گیا..... مستقبل کے حسین اور
نہ خواب گھپ اندھیرے میں ڈوب کر رہ گئے۔ تیز و تند ہوا کے ایک ہی جھمکے نے خیالوں کے
پرغیر کئے جانے والے تمام فلک بوس محلات کو مسمار کر کے زمیں بوس کر دیا.....

بازی اقبال احمد کے حق میں تھی..... اُس نے بہت سوچ سمجھ کر چالیں چلی تھیں، پھونک پھونک کے
اٹھایا تھا..... فریب کا حال بچھانے سے پہلے اُس نے اپنی فتح کے تمام امکانات پہلوؤں پر غور کر لیا،
اپنی کامیابی کا یقین تھا لیکن..... سمیرا خاتون کی شخصیت اُس کے ناپاک منصوبوں کے آگے دیوار
نہ، مایوسی کے احساس نے چرکا لگایا تو وہ بوکھلا گیا، پوری طرح اپنے قدم نہ جھاسکا..... جلد بازی
دیوار پھلانگنے کی کوشش کی تو منہ کے بل زمین پر آگرا، خود اپنے ہی دام میں پھنس کر شکار ہو گیا۔

نو شاہ..... جسے وہ سونے کی انمول چڑیا سمجھ کر اپنے دام فریب میں بھانسنے کی کوشش کر رہا تھا اُس
آنکھوں میں آتے آتے پھر سے اُڑ کر اُس کی دست رس سے دُور نکل گئی اور وہ پھٹی پھٹی نظروں
اپنی بازی بات ہوتے دیکھتا رہا، ایک چال کی غلطی نے ساری بباط کا نقشہ پلٹ کر رکھ دیا۔

اُسے اپنی غلطی اور حماقت کا احساس بڑی شدت سے ہو رہا تھا۔ اُس نے سمیرا خاتون سے براہ
ت ملاقات کر کے زبردست غلطی کا ثبوت دیا تھا، اگر نو شاہ کے حصول کی خاطر اُس نے نازلی بیگم کو
انہی چڑی باتوں سے رام کرنے کی کوشش کی ہوتی تو زیادہ مناسب ہوتا، وہ بڑی آسانی سے اپنی
بات کا واسطہ دے کر واپس لاسکتی تھی..... لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

اور..... یہ زندگی کی پہلی شکست تھی جس نے ایک مرد کو بیچ و تاب کھانے پر مجبور کر دیا.....
نزد..... جو زندگی کے ہر موڑ پر فتح و نصرت سے ہمکنار ہوتا رہا..... سیل رواں کی طرح بے بسائے
لمروں کی معصوم خوشیاں اُجاڑتا رہا..... فریب اور دھوکہ دہی سے کمزور اور ناتواں عورتوں کی
نات کوتاراج کرتا رہا..... اپنے قدموں تلے روندتا رہا..... اپنی ہوس کی بھیشت چڑھاتا رہا.....

ہی مرد..... ایک عورت کے ہاتھوں شکست کھا کر اپنی ناکامی پر تمٹلانے پر مجبور ہو گیا.....!!
نیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے، نیم تاریک کوٹھڑی کے نیچے فرش پر بیٹھا وہ کسی گہری سوچ میں غرق
رہا۔ داری میں سنتری کے وزنی جوتوں کی ٹھوس آواز سنائی دی اور اقبال احمد کے خیالوں کا شیرازہ
رہ گیا۔ اُس نے آہستہ سے نگاہوں کا زاویہ بدل کر سنتری کی جانب دیکھا جو ایک ہاتھ میں سنگین
رائفل اٹھائے دوسرے ہاتھ سے بڑی بڑی اور گھنیری مونچھوں کو تازہ دیتا ہوا قریب آ رہا تھا۔

نگاہ کے قریب پہنچ کر وہ رُک گیا، اپنی بڑی بڑی سرخ اور خونخوار نگاہوں سے اُس نے کوٹھڑی کے
بٹے ہوئے تینوں قیدیوں کو یوں گھورتا شروع کیا جیسے اپنی آمد سے اُن کے دلوں کی کیفیتوں کا
الگائے کی کوشش کر رہا ہو، پھر اُس کی عقابانی نظریں تیسرے قیدی پر جم کر رہ گئیں جو ایک کونے
پارے سے ٹپک لگائے بیٹھا تھا۔

ننگری کچھ دیر تک اُسے نگاہوں نگاہوں میں تولتا رہا، پھر اُس کی پاٹ دار آواز کی گھن گرج

قیدی نے اپنی مٹھیاں پوری شدت سے بھینچ لیں، اُس کے تیر خطرناک ہوتے جا رہے تھے۔ سنتری جلدوں کا زہر جیسے پڑی سمعت سے اُس کے وجود میں اترتا جا رہا تھا، اُس کی نگاہوں سے نفرت کی لہریاں مچھوٹ رہی تھیں، پلکیں جھکائے بغیر وہ سلاخوں کے دوسری طرف کھڑے سنتری کو خونخوار راہ سے گھورتا رہا۔ اس کے سوا اور کون بھی کیا سکتا تھا؟

”اب بھی ایک آخری موقع ہے تیرے پاس.....“ سنتری نے اس بار رازدارانہ انداز میں سرگوشی کی۔ ”مجھے آدھا سا جھا کر دے..... ایک بڑا ویل ہے میری نظروں میں..... منہ مانگی فیس ضرور ملے گی۔“ سنتری نے جھنجھکی سے یوں نیچے اُتار لائے گا جیسے تجھ سے بڑا شریف زادہ پوری دنیا میں جڑ نہ ہو..... بول! کیا ارادہ ہے تیرا، منظور ہے یہ سودا؟“ قیدی نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر شروع کر دیا، اُس کے صبر کا پیمانہ بڑی تیزی سے لبریز ہو رہا تھا۔

”معدے جاؤں تیری اس اداکاری سے..... اوتے تو، تو ایسا لال پیلا ہو رہا ہے جیسے وہ سچ بچ لائی بنی ہو۔“ سنتری نے چپتے ہوئے لکچہ میں کہا۔ ”مجھے سب خبر ہے کہ تو نے بیوہ سے شادی کا ایک کیوں رچایا تھا؟ پرشیدے نے درمیان میں آ کر تیرا سارا کھیل چوہن کر دیا..... کیوں..... ہے بات، مجھے سب.....“

”کواس بند کر! نہیں تو تیرا خون پی جاؤں گا۔“ قیدی تیزی سے اٹھ کر جنگل کی طرف لگا تو سنتری ہارمت سے دو قدم پیچھے ہٹ گیا، اسے شاید قیدی کی جانب سے اس جارحانہ عمل کی توقع نہیں تھی۔ لے خاموش کھڑا وہ رفیق نامی قاتل کو حیرت بھری نظروں سے گھورتا رہا، پھر ہونٹ چپا کر خست رہا۔ ”نہو..... میرا خون پئے گا..... کوئی بات نہیں..... آج تجھے معاف کر رہا ہوں لیکن کل.....“

”میری باتوں کا کہ خون کا ذائقہ کیسا ہوتا ہے..... اگر میں نے تیری اکڑفوں منٹوں میں نہ نکال دی تو اب بھی رب نواز نہیں.....“ سنتری مومچوں پر تاؤ دیتا راہداری میں واپس پلٹ گیا تو کچھ دیر کے لئے ماحول پر ایک سوگوار سی لہر مسلط رہی، دوسرا قیدی جو سنتری کے خوف سے اپنی جگہ ڈبکا بیٹھا تھا اُس کے جاتے ہی اٹھ کر نکل دیے لگا، اقبال احمد کے ذہن میں ابھی تک سنتری اور رفیق کے درمیان ہونے والی گفتگو کا ایک جملہ صدائے بازگشت بن کر گونج رہا تھا۔

سنتری کے جانے کے بعد رفیق خاصی دیر تک اُسی سلاخوں پر زور آزمائی کرتا رہا، پھر تھک ہار کر اسے لیک لگا کر بیٹھ گیا، دوسرا قیدی بدستور اُس کی دلجوئی کر رہا تھا۔ ”ہمت سے کام لو میرے سات! اس طرح اگر تم ایک ایک بات پر آپے سے باہر ہوتے رہے تو جیل کے تمام سپاہی تمہارے ماتحت بن جائیں گے۔“

”نہ جانے دو.....“ رفیق نے حقارت سے کہا۔ ”مجھے اُن کی دوستی سے بھی کوئی فائدہ نہ پہنچے گا۔“

”نہ کی..... لیکن بلاوجہ اُن کی دشمنی مول لینا بھی دانشمندی کے خلاف ہے۔“

”نہ کی..... بد ذات میرے اوپر کچھ اُچھالتے رہیں اور میں خاموش رہوں..... یہ ناممکن ہے۔“

”نہ کی.....“

راہداری میں گونجی۔ ”رفیق تیرا ہی نام ہے.....؟“

”ہاں.....!“

”رفیق ولد اسلم شاہ.....؟“ سنتری نے حقارت بھرے لہجے میں دوسرا سوال کیا۔

”ہاں.....“ قیدی نے بدستور بے پروائی اور بیزارگی کا مظاہرہ کیا۔

”شیدے پھل فروش پر تو نے ہی چاقو سے حملہ کیا تھا.....؟“

”ہاں.....!“

”تیرے لئے ایک خوشخبری لایا ہوں..... سننے گا.....؟“ سنتری نے قیدی کو نفرت سے گھورتے ہوئے کہا پھر اُسے خاموش دیکھ کر جھلا گیا، ایک قدم آگے بڑھ کر سرسراتے لہجے میں بولا۔ ”شیدے نے ہسپتال میں دم توڑ دیا ہے..... پرچی کٹالی اُس نے دنیا سے۔“

”سچ.....؟“ قیدی کے چہرے پر اچانک خوشی کی لہر دوڑ گئی، جیسے وہ شیدے کی موت کی اطلاع کا منتظر تھا۔ آہستہ سے اٹھ کر جنگل کے قریب آ گیا، سنتری کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”تم..... سے مذاق تو نہیں کر رہے؟“

”کیوں..... تو کیا میری گھر والی کا رشتہ دار لگتا ہے جو میں تیرے ساتھ مخل کر دوں گا؟“ سنتری نے زعب دار انداز اختیار کیا، پھر حقارت سے بولا۔ ”پرے ہٹ کر بات کر! نہیں تو ہڈیوں کا سرواڑوں گا۔“

تیسرا قیدی جنگل سے دُور ہو گیا لیکن وہ خوف زدہ نہیں تھا، اُس کے چہرے پر اطمینان کی کرنی پھوٹ رہی تھیں۔ ”ایک اطلاع اور ہے تیرے لئے.....“ سنتری نے تھوڑے وقفے سے کہا۔ ”تیرا عورت نے تیرے لئے عدالت میں ضمانت کی جو درخواست پیش کی تھی وہ بھی مسترد ہو گئی اور میں نے کچھ..... جیلر صاحب نے تیرے کارنامے سے خوش ہو کر تیرے لئے ایک علیحدہ کال کوٹھڑی الاٹ کر دی ہے..... بس! ایک رات کی اور بات ہے، جیسے بن پڑے یہاں جنگی ترشی سے گزار لے، کل.....“

راجہ اندر کی طرح اپنی کوٹھڑی میں پاؤں پار کر چین کی بنی بجانا۔ ”تیرے قیدی نے کوئی جواب نہیں دیا، خاموش بیٹھا سنتری کی باتیں سنتا رہا۔ ”نام کا دوست..... اور چھن قاتلوں والے..... آ.....“

”تھو!“ سنتری نے قیدی کی تھپک کرنے کی خاطر حقارت سے فرش پر تھوک دیا، کچھ دیر اُسے کھا جا۔ والی نظروں سے گھورتا رہا، پھر معنی خیز انداز میں بولا۔ ”پر تو نے اچھا نہیں کیا..... شیدے سے بنا کر.....“

تو تیرے وارے نیارے ہو جاتے..... گرمی کھا کر تو نے اپنے نصیب کھونے کر لئے..... ٹھنڈے دل..... کام لیتا تو تیری کا یا پلٹ جاتی..... اپنی ہنڈی شیدے کے بینک میں جمع کر دیتا تو تمام زندگی تجھے ملتا رہتا اور اصل اپنی جگہ محفوظ رہتا..... اور پھر وہ کون سی تیری اپنی ملکیت تھی جو تو اُسے اکیلا بڑ..... کرنے کی کوشش کر رہا تھا.....؟“

سنتری کی باتیں سن کر قیدی کے چہرے کا اطمینان چھٹنے لگا، اُس کی آنکھوں میں الاؤ کی سرخیاں ابھرنے لگیں، یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے غصے کو اندر ہی اندر پینے کی کوشش کر رہا ہو..... جیسے ستر کے جملوں نے اُس کے رستے زخموں کو کریدنے کی کوشش کی تھی۔

”کڑوی سیلی گولیاں حلق سے نیچے مشکل ہی سے اترتی ہیں۔“ سنتری نے اُس کی کیفیت کا انداز لگاتے ہوئے زہر خند سے کہا۔ ”سرکاری وکیل نے بھری عدالت میں تیری شرافت کا بھانڈا چھوڑ دیا..... تو نے ایک تیر سے دو شکار کرنے کی کوشش کی، پھر دوسرے شکار کو حلال کرنا تیرے مقدر میں نہیں تھا.....“

لبالبوں کو آخری سچ دیتی گنگناتی ہوئی گھومی تو دروازے پر نادرہ کو کھڑا دیکھ کر ایک لمحے کو رک

”تمہاری سوتیلی بیٹی کا کیا نام تھا؟“
 ”ریشماں۔“ رفیق نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔ ”بیٹی صرف بیٹی ہوتی ہے، خواہ سگی ہو یا سوتیلی۔“
 ”لیکن خون کے رشتوں اور بناوٹی رشتوں میں فرق ضرور ہوتا ہے۔“

کی گئی، مغربی طرز کے لباس کی بجائے سر تا پا سفید شلوار سوٹ میں ملبوس وہ نہایت معصوم اور بڑا دکھانے والی رہی تھی، لباس کی مناسبت سے اُس نے کانٹوں میں موتیوں کے آویزے پہن رکھے تھے، گلے میں موتیوں کا ہار تھا، اُلٹی کلائی میں موتیوں کا ہلکا کڑا موجود تھا اور سیدھے ہاتھ میں سلور کلر کی نازک سی گھڑی نظر آ رہی تھی۔ کھلے بالوں کی بھری ہوئی لٹ نے تو جیسے اُس کی شخصیت میں چار چاند لگا رہے تھے۔ نادیرہ دل ہی دل میں اُس کی جامہ زیبی کی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکی لیکن قبل اس کے کہ وہ اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتی، نادیرہ نے اُسے بڑے غور سے گھورتے ہوئے کہا۔ ”یہ زلفوں کے بچ کس لئے سنوارے جا رہے تھے۔ اس قدر بن بھن کر کس کے قتل کا ارادہ ہے؟“

”جناب کا کیا خیال ہے؟“ نادیرہ نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔

”اس میں خیال کی کیا بات ہے، سب ہی جانتے ہیں کہ آج راجیل کی کامیابی کا جشن منایا جا رہا ہے اور اس جشن میں صرف راجیل ہی نہیں کچھ اور لوگ بھی موجود ہوں گے۔“ نادیرہ شوق سے بولا۔ ”مجھے اوروں سے کیا غرض۔۔۔۔۔؟“ نادیرہ نے کڑوا سا منہ بنا کر جواب دیا پھر ہونٹوں پر ہلکا سا بکیر کر بولی۔ ”میں تو صرف اور صرف راجیل کی خوشیوں میں شریک ہونے آئی ہوں۔“

”جب ہی قیامت نظر آ رہی ہو۔۔۔۔۔“ نادیرہ نے ایک بار پھر اُس کی بچ دج کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تو بچ بچ شبہ ہو رہا ہے کہ کہیں راجیل تجھے دیکھ کر دیوانہ نہ ہو جائیں۔ ایمان سے، آ سفید لباس میں تو آفت لگ رہی ہے۔“

”راجیل کہاں ہیں۔۔۔۔۔؟“ نادیرہ نے اُس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بڑی اچانکیت سے ”کہیں نظر نہیں آ رہے۔“

”ہو سکتا ہے ابھی تک اخبار میں اپنے رول نمبر کو آنکھ پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے ہوں۔“ نادیرہ نے لہجہ اختیار کیا۔ ”صبح سے کئی بار یہی حماقت کر چکے ہیں آپ کے راجیل صاحب۔۔۔۔۔ انگریزی اور کے تمام اخباروں کا ڈھیر لگا رکھا ہے اپنے کمرے میں۔۔۔۔۔ فرمان نے پوچھا بھی تھا کہ راجیل بھائی آپ کا رول نمبر ملک کے تمام اخباروں میں شائع ہوا ہے۔۔۔۔۔ جانتی ہو کیا جواب دیا انہوں نے بجائے اس کے کہ اپنی حماقت پر شرمندہ ہوتے، بڑی ڈھٹائی سے بولے۔۔۔۔۔ رول نمبر تو دیکھ لیا اب اپنی تصویر تلاش کر رہا ہوں۔“

”اس میں حماقت کی کیا بات ہے۔۔۔۔۔؟“ نادیرہ نے اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے سنجیدگی سے ”آج رول نمبر شائع ہوا ہے تو کل تصویر بھی چھپ جائے گی۔“

”اور تصویر کے نیچے جلی حروف میں لکھا ہوگا۔ دیکھو مجھے جدیدہ عبرت نگاہ ہو۔۔۔۔۔ ایک طالب علم جس نے تین سال کی تک دو دو اور مسلسل جدوجہد کے بعد بالآخر روڈ پار ایف، اے کو عبور اور اب بی اے کی ڈگری کو سر کرنے کے لئے مغرب۔۔۔۔۔“

”اے۔۔۔۔۔ خبردار!“ نادیرہ نے جلدی سے ٹوکا۔ ”تجھے کیا حق پہنچتا ہے راجیل کی کامیابی کا اڑانے کا؟“

”کیوں۔۔۔۔۔ کیا میں تیری سہیلی نہیں ہوں۔۔۔۔۔؟“ نادیرہ نے معصومیت سے جواب دیا تو دونوں تکلف سہیلیاں بے اختیار ہنس پڑیں۔

”صائمہ بتا رہی تھی کہ راجیل کی مٹی بھی لاہور سے بطور خاص تشریف لائی ہیں۔“

”ہاں۔۔۔۔۔“ نادیرہ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”بہت گریٹ خاتون ہیں۔۔۔۔۔ راجیل اُن کی خد

”مگر تیرے، اس لئے وہ جتنا بھی خوش ہوں کم ہے۔۔۔۔۔“

”راجیل واحد کیوں ہوئے۔۔۔۔۔ میں بھی تو ہوں اُن کے ساتھ۔“ نادیرہ نے برجستہ کہا تو کمرے کی انہوں سے کھٹک اٹھی، دونوں کے درمیان دیر تک اسی قسم کی گفتگو ہوتی رہی پھر نادیرہ نے ”تم نے راجیل کے لئے کیا تحفہ خریدا ہے۔۔۔۔۔؟“

”میں نے تم کو بتا دیا۔۔۔۔۔ تم کیا دے رہی ہو؟“

”ارادہ تو نہیں تھا لیکن آپ کی کہنے سے شیفرس کا سیٹ اور سینٹ لے لیا ہے۔“

”کیا مطلب۔۔۔۔۔ کیا تجھے راجیل کے پاس ہونے کی خوشی نہیں ہوئی۔۔۔۔۔؟“

”بات خوشی کی نہیں بلکہ راجیل کی حماقتوں کی ہے۔۔۔۔۔ خدا جانے وہ حضرت کس کے تجھے سے کیا بکاٹال نہیں؟ اور پھر دنیا جہاں میں اُس کی تشہیر بھی کرتے پھریں۔“ نادیرہ نے کہا۔ ”ایسے دل لہجہ والوں سے تو خدا ہی محفوظ رکھے۔“

”میں اب کیا خطرہ، تم تو منصور کے ساتھ بگ ہو چکی ہو۔“ نادیرہ نے سرد آہ بھر کر کہا۔ ”میرے سے پوچھو میں کس طرح راجیل کے سلسلے میں دن رات بے چین رہتی ہوں۔ ہر دم بس یہی خطرہ رہتا ہے کہ کہیں یہ ذات شریف پٹاڑوا کر ہاتھ سے نہ نکل جائیں۔“

”ایک بات پوچھوں نادیرہ۔۔۔۔۔؟“ نادیرہ نے ٹٹولنے والے انداز میں کہا۔

”پوچھو۔“

”تو کہ تو اُڑنے کی کوشش نہیں کرے گی۔“

”نہ۔۔۔۔۔“ نادیرہ نے نہایت سادگی سے وعدہ کر لیا۔

”کہیں تو واقعی راجیل کے سلسلے میں سنجیدہ تو نہیں ہوتی جا رہی ہے۔۔۔۔۔؟“

”تہاں راجیل مشورہ ہے؟“

”میرا مشورہ چھوڑ۔۔۔۔۔ میں نے تیرے دل کی بات پوچھی ہے۔“

”ابھی میں نے کوئی آخری فیصلہ نہیں کیا۔۔۔۔۔ ویسے ڈیڈ، راجیل کو ضرور پسند کرنے لگے ہیں۔“

”تجھے میری قسم جو جھوٹ بولے۔۔۔۔۔ سچ بتا! تیری اپنی پسند کیا ہے؟“

”میری پسند سے کیا ہوگا؟“ نادیرہ شوقی سے بولی۔ ”بات تو تب ہے کہ وہ بھی مجھے پسند کر لے۔“

”نادیرہ کی بچی۔۔۔۔۔ تو شرافت سے نہیں بتائے گی؟“

”آئیڈیا۔۔۔۔۔“ نادیرہ نے اچانک چوکتے ہوئے کہا۔ ”کیوں نا راجیل کی کامیابی کے اس خوبصورت

آسے فائدہ اٹھایا جائے؟“

”کیا مطلب۔۔۔۔۔؟“

”ایک مضبوط اور قیمتی پٹا خرید کر اُس پر جلی حروف میں ریزروڈ (RESERVED) لکھوایا جائے، خوبصورتی سے پیک کر کے بطور تحفہ پیش کر دیا جائے۔۔۔۔۔ اگر راجیل نے اُس تجھے کو قبول کر کے

ملا لال لیا تو سمجھو بات ادھر سے بھی بچی دور نہ۔۔۔۔۔“

”تو کیا۔۔۔۔۔؟“

”مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں کے مصداق کہیں اور قسمت آزمائی پڑے گی۔“

”کچھ بھی۔۔۔۔۔“ نادیرہ نے اُسے زور سے انداز میں گھورا۔

”کیا۔۔۔۔۔؟“

میں راجیل کا مستقبل سنوارنے کی خاطر وقف کر دی تھی۔ لیکن آج..... ایک طویل مدت کے بعد نہیں راجیل کی کامیابی کی خوشی نصیب ہوئی تو جذبات کے سمندر میں طغیانی آگئی۔

ایک بیگم کے بعد شائہ بیگم اور دوسرے مہمانوں نے بھی سیرا خاتون اور راجیل کو دل کھول کر ڈھیروں دلی۔ پھر وقار احمد نے ملازموں کو اشارہ کیا تو وہ بڑی نفاست کے ساتھ مہمانوں کی خاطر تواضع میں ہو گئے، شاد اور نادیہ نے ایک کی تقسیم میں راجیل اور نادرہ کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا۔

بچوں پر ایک جانب خان بہادر صاحب وقار احمد، جمال احمد اور دوسرے کاروباری مہمانوں کے دل چسپیوں میں مصروف تھے، دوسری سمت سیرا خاتون کے ہمراہ شائہ بیگم، شائلہ بیگم اور یاس بڑوس دوسری خواتین موجود تھیں۔ شاد، نادیہ اور نادرہ وغیرہ نے بزرگوں سے الگ تھلک ایک علیحدہ ٹیبل یا چائے جہاں بات بات پر زندگی سے بھرپور گفتگو کر رہے تھے، صرف ایک راجیل تھے جنہیں ان کی چینی تھی۔ وہ پورے لان پر گھوم پھر رہے تھے اور مہمانوں سے مبارکباد کے ساتھ ساتھ تحفے بول کر مہمانوں میں مصروف تھے۔ فرحان اور صائمہ زیادہ تر راجیل کے ساتھ نظر آ رہے تھے۔

نیل ایک خوبصورت اتفاق تھا کہ نادرہ کی طرح آج راجیل نے بھی سفید رنگ کا بے داغ سوٹ پہنا تھا لیکن اس حسین مطابقت پر ایک طرف تو نادیہ نے نادرہ کا ناطقہ بند کر رکھا تھا اور دوسری طرف سیرا خاتون کی دور بین نظریں بھی متعدد بار پڑچسپ انداز میں نادرہ کی جانب اٹھ چکی تھیں۔ ایک موقع پر انہوں نے راجیل کو بے تکلفی سے نادرہ کو کیک پیش کرتے دیکھا تو ضبط نہ کر سکیں، ان میں شائلہ بیگم سے پوچھا۔ ”یہ لڑکی کون ہے..... میں شاید اسے پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔“

نادرہ نے بڑوس ہی میں رہتی ہے..... ہر وقت کا آنا جانا ہے، نادیہ سے تو سبکی بہنوں کی طرح ٹوٹ کر رہی ہے۔“ شائلہ بیگم نے سرسری طور پر تعارف کر دیا۔

نیل حد مہذب اور بڑی سلیقہ شعار بچی ہے۔“ شائہ بیگم بولیں۔ ”ماں کی محبت اور سائے سے بے لگن میں نے بھی اسے روتے بسورتے نہیں دیکھا۔“

کیا نام ہے اس بچی کا.....؟“ سیرا خاتون نے دلچسپی لیتے ہوئے دریافت کیا۔

نادرہ.....

پاپ کیا کرتے ہیں؟“

میری فوج میں کرنل کے عہدے پر تھے، مگر اب تو ریٹائرڈ لائف گزار رہے ہیں۔“ شائلہ بیگم نے مانتے ہوئے کہا۔ ”دولت کی ریل چل ہونے کے باوجود بڑے با اصول اور مہذب شخصیت لگ ہیں۔“ نادرہ کو تو اس طرح بالہ ہے کہ ماں کی کمی کا احساس تک نہیں ہونے دیا۔

کیا نام ہے کرنل صاحب کا.....؟“

کرنل عابد.....

کرنل عابد.....؟“ سیرا خاتون چونک اٹھیں۔ کرنل عابد کا نام وہ کئی بار اپنے مرحوم شوہر کی سے بھی سن چکی تھیں۔“

کیا آپ جانتی ہیں کرنل عابد کو.....؟“

شاید.....“ سیرا خاتون نے بڑی خوبصورتی سے بات بناتے ہوئے کہا۔ ”یہ نام کچھ سنا سنا سا ہے۔“ کہاں اور کب سنا ہے..... کچھ یاد نہیں آ رہا۔“

راجیل کے والد بھی تو فوج میں تھے..... ممکن ہے انہوں نے کبھی تذکرہ کیا ہو۔“

”بھئی کہ تو اپنے دل کا بھید نہیں کھولنا چاہتی..... ویسے میں بڑے اعتماد سے کہہ سکتی ہوں کہ تیرے میں کہیں نہ کہیں کسی گوشے میں راجیل کا چور ضرور چھپا بیٹھا ہے۔“ نادیہ بولی۔ ”میری ماں تو ابھی بزرگوں کے تھانے میں رہت درج کر دے تاکہ چور بھی پکڑا جائے تو تجھے شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔“

”مشورہ تو معقول ہے..... سوچوں گی کسی وقت اطمینان سے۔“ نادرہ نے شانے اچکا کر پردائی سے جواب دیا پھر بولی۔ ”کیا تم میرے ساتھ کچھ دیر کے لئے بازار چل سکو گی؟“

”بازار..... اور اس وقت؟“

”ہاں..... مجھے راجیل کے لئے کوئی گفٹ خریدنا ہے۔“ نادرہ مسکرائی۔ ”تمہاری پسند سے۔“

”میری پسند سے کیوں.....؟“

”وقت مت ضائع کرو، پلیز.....“ نادرہ نے اُس کا ہاتھ تھام کر دروازے کی طرف کھینچ کر کہا۔ ”باتیں راستے میں ہوتی رہیں گی۔“

وہ نادرہ کے ساتھ باہر آئی تو برآمدے میں ماں سے ٹڈبھٹھ ہو گئی۔ نادرہ نے نہایت ادب شائلہ بیگم کو سلام کیا تو انہوں نے بھی نادرہ کی مشرقی جج دھج کو پسندیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے ”خدا نظر بد سے بچائے، شلوار سوٹ میں تم ہمیشہ بڑی پیاری لگتی ہو.....“

”شکریہ آئی.....“ نادرہ نے مسکرا کر شکریہ ادا کیا۔

”امی! میں ذرا نادرہ کے ساتھ سپر مارکیٹ تک جا رہی ہوں۔“ نادیہ نے ماں سے اجازت چاہی۔

”کوئی خاص کام.....؟“

”راجیل کے لئے تحفہ خریدنا ہے۔“ نادرہ بولی۔

”ٹھیک ہے، لیکن جلدی آ جانا! مہمانوں کی آمد کا سلسلہ بھی بس شروع ہونے والا ہے۔“

خاتون نے دیوار گیر کلاک پر نظر ڈالتے ہوئے جواب دیا پھر دونوں کو پیار اور شفقت بھری نظروں دیکھتی ہوئی باورچی خانے کی سمت چلی گئیں جہاں ملازم پارٹی کے اہتمام میں مصروف تھے۔

○○○

راجیل نے ایک کانٹا تو پورا لان تالیوں کی آواز سے گونج اٹھا..... ہر چند کے کامیابی کا یہ جشن واقف کاروں کی حد تک محدود تھا لیکن اس کے باوجود شائلہ بیگم نے اپنے حسن انتظام میں اس با خاص خیال رکھا تھا کہ مردود اور عورتوں کی نشستیں علیحدہ علیحدہ ہوں۔ لاہور سے سیرا خاتون کے اُن کے والد خان بہادر آصف علی بطور خاص تشریف لائے تھے، ارجمند بانو چونکہ علیل تھیں، ان ڈاکٹروں نے انہیں سفر کی اجازت نہیں دی۔

”میں راجیل کی کامیابی پر آپ کو وی مبارکباد پیش کرتی ہوں۔“ تالیوں کی گونج میں سب پہلے شائلہ بیگم نے سیرا خاتون کو مبارکباد دی۔

”شکریہ.....“ سیرا خاتون نے اپنی پلکوں سے اُٹتے آنسوؤں کو ٹشو میں جذب کرتے ہوئے ”راجیل کی کامیابی میں آپ کی محبت اور عنایت کو بھی بڑا دخل ہے۔ میں آپ کے اس خلوص اور کبھی فراموش نہ کر سکوں گی..... اگر آپ نے راجیل کا مستقبل سنوارنے میں میری مدد نہ کی“

شاید.....“ سیرا خاتون کی آواز فرط جذبات سے بھر اُٹی۔ پھر وہ اُن آنسوؤں کو نہ روک سکیں جنہیں موت کے بعد بھی پلکوں تک آنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ بیوگی کے غم کو بھول کر انہوں۔

”ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔“ سیرا خاتون نے بے پروائی کا اظہار کیا پھر قریب سے گزرتی ٹاکو آواز دے پاس بلا لیا، بڑے لاڈ سے صوفے پر اپنے برابر بٹھاتے ہوئے پوچھا۔ ”تمہاری اپنی پڑھائی کا کیا ہے۔۔۔۔۔ کوئی دُشواری تو پیش نہیں آ رہی؟“

”جی نہیں۔۔۔۔۔“

”اب تو تم دوسرے سال میں ہو گی؟“

”جی ہاں۔۔۔۔۔“

”مجھے یقین ہے کہ تم ایک دن بہت بڑی اور نامور ڈاکٹر بنو گی۔“

”خدا آپ کی زبان مبارک کرے۔“ شائہ بیگم نے ٹاکو والہانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے دُعا کی۔ ”تم نے ابھی کچھ دیر پہلے مجھے راجیل کے فرسٹ ڈویژن پاس ہونے پر دل کھول کر مبارکبادیں کہیں۔“ سیرا خاتون مسکراتے ہوئے بولیں۔ ”اب میری باری ہے۔۔۔۔۔“

”جی۔۔۔۔۔ میں بھی نہیں؟“ شائہ نے بڑی مصوہیت سے وضاحت چاہی۔

”راجیل کی شاندار کامیابی میں تمہاری محنت اور لگن کا سب سے زیادہ دخل ہے، اس لیے مہارکباد کی مستحق بھی تم ہو۔“ سیرا خاتون نے بڑے خلوص سے کہا پھر پرس سے گلابی رنگ کا مٹ لٹافہ نکال کر ٹاکو کی جانب بڑھاتے ہوئے بولیں۔ ”یہ میری طرف سے تمہارے لیے ایک نذرانہ ہے۔۔۔۔۔ اسے قبول کرو!“

شائہ نے ماں کی طرف دیکھا، شائہ بیگم کے علاوہ شائہ بیگم بھی لٹافہ دیکھ کر اپنی جگہ کسما کر تھیں۔ ”کیا بات ہے شائہ؟“ سیرا خاتون نے ٹاکو کو جھپکتے دیکھ کر بڑی اہانت سے کہا۔ ”تمہارے اُد پر کوئی اختیار نہیں؟“

”یہ بات نہیں ہے، لیکن۔۔۔۔۔“

”تم نے انکار کیا تو مجھے دکھ ہو گا۔“ سیرا خاتون کے لہجے میں اس بار مٹا کی مٹھاس بھی شامل تھیں۔ ”اس کی کیا ضرورت ہے؟“ شائہ بیگم نے پہلو بدلتے ہوئے جلدی سے کہا۔ ”ٹاکو کے لیے تو کی دُعا میں ہی بہت ہیں۔“

”یہ میرا اور ٹاکو کا معاملہ ہے، اس لیے آپ درمیان میں نہ بولیں۔“ سیرا خاتون نے ہنسنے جواب دیا پھر ٹاکو کو پیار سے گھورتے ہوئے پوچھا۔ ”کیوں بیٹی ٹاکو۔۔۔۔۔ کیا تم کو اپنی آئی کی یہ چم خوشی منظور نہیں؟“

شائہ عجیب اُچھٹن میں گرفتار تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ لٹافہ قبول کرے یا ایک بار دل کڑا انکار کر دے۔ لیکن پھر شائہ بیگم نے اشارہ کیا تو اُس کی پریشانی یکفخت دور ہو گئی۔ نہایت اہمیت کے ساتھ لٹافہ قبول کیا، پھر سیرا خاتون سے اجازت لے کر بھولیوں کی خاطر مدارات میں لگا۔ ”خدا نظر بد سے بچائے۔۔۔۔۔ شائہ تو مجھے اپنے طور طریقوں سے اس دنیا کی نہیں۔۔۔۔۔ کوئی مخلوق نظر آتی ہے۔“ سیرا خاتون نے ٹاکو کے جانے کے بعد اُس کی تعریف کی تو شائہ بیگم کا منہ جلدی سے بات کا زرخ بد لے کر خاطر بولیں۔

”اس بار آپ نو شاہ کو ساتھ نہیں لائیں؟“

”لاہور میں میری غیر حاضری کی وجہ سے اُس کی موجودگی ضروری تھی۔“

”یہاں کب تک قیام کا ارادہ ہے؟“ شائہ بیگم نے پوچھا۔

”ہم سہ ماہی اس بار کراچی میں میرے قیام کی مدت طویل ہو جائے۔“

”کوئی کاروباری مصروفیات۔۔۔۔۔؟“

”کاروباری ہی سمجھ بیٹے!“ سیرا خاتون نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”دراصل میں کراچی میں بھی بارے کی ایک شاخ کھولنے کے بارے میں غور کر رہی ہوں، تجارت کے فروغ کے لیے اب نئے آفس کا قیام ناگزیر ہو گیا ہے۔“

”پھر تو آپ کی مصروفیات بھی پہلے کے مقابلے میں دو گنی ہو جائیں گی۔“

”میں چاہتی ہوں کہ اب اپنی کچھ ذمہ داریاں راجیل کو بھی سونپ دوں۔۔۔۔۔ پڑھائی کے ساتھ اب کاروبار میں راجیل کی دلچسپی ضروری ہے۔“

”یہ تو بڑا نیک ارادہ ہے۔“ شائہ بیگم نے تائید کی۔ ”راجیل کے کندھوں پر ذمہ داری کا بوجھ ہاؤن میں بردباری اور آگے بڑھنے کا احساس بھی پیدا ہو گا۔۔۔۔۔ منصور کی مثال آپ کے سامنے ہے۔“

”میں نے بھی یہی سوچ کر ایک نئی براچ کے قیام کا فیصلہ کیا ہے۔“ سیرا خاتون نے کہا۔ ”آفس کی مناسب جگہ دستیاب ہو جائے تو میں دو چار روز کے اندر ہی کام شروع کر دوں۔“

راجیل کے مستقبل کے لیے آپ کا یہ قدم یقیناً ایک اہم کردار ادا کرنے کا۔“ شائہ بیگم نے پھر ان میں پوچھا۔ ”دیے آپ نے راجیل کی پڑھائی کے بارے میں کیا سوچا ہے۔۔۔۔۔؟“

”یہ تو آپ کی ذمہ داری بن چکی ہے۔“ سیرا خاتون مسکرائیں۔ ”تعلیم کے سلسلے میں میری جانب سے کوئی روک ٹوک نہیں ہو گی۔۔۔۔۔ البتہ اگر وہ ایم اے کر لے تو مجھے بے حد خوشی ہو گی۔۔۔۔۔“

”ایم اے کرنا کچھ ایسا دُشوار بھی نہیں۔۔۔۔۔ مگر راجیل کے لیے کسی مناسب اور قابل ٹیوٹر کی تلاش آئے گی۔“

”اس کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔ لیکن راجیل کے سلسلے میں آپ کو بھی میرا ساتھ دینا ہو گا۔۔۔۔۔“

”پر اس کی شادی کے لیے۔“

”شادی؟“ شائہ بیگم چونکیں۔ ”کیا آپ بیٹے کی شادی کے بارے میں بھی غور کر رہی ہیں؟“

”جی ہاں۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے کہ اگر بی، اے کر لینے کے بعد اس فرض کو بھی پورا کر دیا جائے تو ہو گا۔“

”لو لڑکی ہے آپ کی نظر میں؟“ شائہ بیگم نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”ایک دو لڑکیاں ہیں تو سبھی مگر میں نے ابھی کسی کا انتخاب نہیں کیا۔“

”مگر لڑکیوں کے سلسلے میں سیرا خاتون کو کچھ اور کرنا چاہی تھیں لیکن وقار احمد نے آواز دی تو وہ ان کی طرف چلی گئیں، سیرا خاتون نے ایک بار پھر نادارہ کی جانب نظر اٹھائی اور یہ دیکھ کر اُن کے پشیمندگی طاری ہو گئی کہ اس وقت راجیل بہت کل مل کر نادارہ سے باتوں میں مصروف تھے۔

”اُن اپنی جگہ خاموش بیٹھی بیچ و تاب کھاتی رہیں، پھر کچھ سوچ کر اُنھیں اور بیٹے کے قریب چلی۔

”راجیل نے ماں کو قریب آتے دیکھا تو نادارہ سے بولے۔ ”مئی اسی طرف آ رہی ہیں۔“

”آ رہی ہیں تو آنے دیں۔۔۔۔۔ اچھا ہے، اسی بہانے ہمارا تعارف بھی ہو جائے گا۔“

”مگر کچھ اور کہنا چاہتے تھے لیکن ماں کے قریب آ جانے سے کہہ نہ سکے، جلدی سے نادارہ کا راستہ ہوتے ہوئے بولے۔ ”مئی۔۔۔۔۔ ان سے ملنے، یہ ہمارے کرٹل عابد انکل کی اکلونی بیٹی ہیں۔۔۔۔۔“

لے کو انہیں بھی سکتے ہو گیا، پھر ان گنت سوال ابھر کر ذہن میں گزرتے ہوئے گئے۔
 تارن ہزار کی وہ رقم شاکی محنت کا معاوضہ تھی؟ محنت..... جس نے راجیل کو تین سال بعد
 اپنی خوشیوں سے ہمکنار کیا..... یا..... سمیرا خاتون نے خوشی کے اس موقع پر اس چپک کے
 راجیل کے لئے شاکی پسند کرنے کا اظہار کیا تھا.....؟

راجیل اسی تھا تو بھی یہ بات سمیرا خاتون کو زیب نہیں دیتی تھی..... شائلہ بیگم نے ہونٹ چباتے
 ہوئے..... رشتوں ناتوں کا سودا خلوص محبت اور دل کی گہرائیوں سے کیا جاتا ہے..... کسی دوسرے
 جاننے کی خاطر انسان کو مختلف مراحل طے کرنا پڑتے ہیں۔ بتدریج منزل بہ منزل پھونک پھونک
 دم اٹھانے کی ضرورت پیش آتی ہے..... حرف مدعا زبان تک لانے سے جو مختصر وقت اور موقع کی
 ان کا خیال رکھنا پڑتا ہے..... اپنی طلب سے زیادہ دوسروں کے احساس کو محسوس کرنے کی ضرورت
 ہے..... قاصدوں کو گھٹانے اور کم کرنے کی خاطر تو ایک مدت درکار ہوتی ہے..... یوں تو نہیں ہوتا
 ایک لمحہ..... ایک بل میں کسی کو ہمیشہ کے لئے اپنا بنا لیا جائے۔

راجیل..... انسان اور جانوروں کے درمیان فرق بھی تو ہوتا ہے..... شائلہ بیگم..... منڈی میں
 ت ہونے والا جانور نہیں، جس کے لئے سمیرا خاتون نے بولی لگانے کی جسارت کی تھی.....!

شائلہ بیگم کے ذہن میں محفوظ خدشوں نے سر اٹھا رہا تھا تو ان کے چہرے کے نقوش تھکے پڑنے لگے۔
 لہ لہانے سے برآمد ہونے والے اس چپک کو حقارت بھری نظروں سے دیکھنے لگیں جس نے بل
 ل ہونٹ کی مسکراہٹوں کو معدوم کر دیا تھا..... ان خوشیوں کو روند ڈالا تھا جو چند لمحے پیشتر دلوں کی
 پس میں ہمک رہی تھیں، کاغذ کے ایک حقیر ٹکڑے پر بٹھرے ہوئے حروف کے جال نے جیسے
 لہ لہاتوں کو اپنے اندر مقید کر لیا تھا..... دم گھٹ کر مر جانے کے لئے مجبور کر دیا تھا۔

پس بے بسی تھی..... کسی مٹھن تھی..... کیسا احساس تھا..... جس نے سانسوں کی رفتار میں زہر گھول
 لہ لہا قاتل..... جو نہایت سرعت سے وجود کی آتھہ گہرائیوں تک اترتا چلا جا رہا تھا.....!!
 شائلہ بیگم کی آواز کانوں سے ٹکرانی تو شائلہ بیگم یوں چونک اٹھیں جیسے انہیں وہاں
 ہاکی اور کی موجودگی کا احساس ہی نہ ہو..... جمود کا ظلم ٹوٹا تو وہ آوازیں بھی سنائی دینے لگیں جو
 نے آ رہی تھیں، چپک کو اٹھیں میں دبائے وہ بہن کو دیکھنے لگیں۔

انے کیا رائے قائم کی.....؟ شائلہ بیگم نے کپکپاتی آواز میں دریافت کیا۔
 بھری سمجھ میں نہیں آ رہا آیا جان! کہ اس دریا دلی کا کیا مطلب سمجھوں.....؟
 لہ لہ نہ کوئی نتیجہ تو ضرور قائم کیا ہو گا.....

تھا..... ہو سکتا ہے سمیرا خاتون نے شاکی مٹھنوں کا صلہ دینے کی کوشش کی ہو۔
 ہاکی اور بھی تو سوچا جا سکتا ہے۔ شائلہ بیگم بولیں۔ ممکن ہے بیٹے کی خوشیوں کے جشن کے
 ہاکی خاتون نے اس پیشکش کے ذریعے شاکی اور راجیل کے رشتے کی بات کا آغاز کرنے کی کوشش
 لہ لہا امارت کی دھماک بٹھانے کی خاطر دولت کا سہارا لیا ہو۔

تھا..... کیسے ہو سکتا ہے؟ شائلہ بیگم نے بہن کے جذبات کو محسوس کرتے ہوئے جلدی سے کہا۔
 لہ لہا تو ایک طرح سے احمر کے ساتھ طے کیا جا چکا ہے۔

لہ لہا کاظم ہمارے سوا اور کسی کو نہیں..... شائلہ بیگم نے پہلو بدل کر جواب دیا۔ میں اسی لئے
 لہ لہا نہادیہ اور منصور، شاکی اور احمر کے رشتے کی بات کہی کہ اس کا باقاعدہ اعلان کر دیا جائے۔

مس نادرہ۔
 خوشی ہوئی آپ سے مل کر..... نادرہ نے ادب سے سلام کرتے ہوئے سمیرا خاتون کو مخاطب کیا
 شائلہ بیگم ابھی تمہاری بہت تعریف کر رہی تھیں۔

یہ ہیں بھی تعریف کے قابل۔ راجیل روانی میں بول گئے۔ اپنی غلطی کا احساس ہوا تو جلدی
 بات بنانے کی خاطر کہا۔ میرا مطلب ہے کہ نادرہ بیڈ منتن بہت اچھا کھیلتی ہیں اور رانیڈنگ میں تو
 کا کوئی جواب نہیں..... بڑے سے بڑے اڈیل گھوڑے کو مٹھنوں میں قابو کر لیتی ہیں۔
 تعلیم کے بارے میں تم نے کچھ نہیں بتایا؟ سمیرا خاتون نے ٹھوس لہجے میں سوال کیا۔

نادرہ اور میں ہم جماعت ہیں۔ نادرہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، پھر بے تکلفی سے
 آئی..... آپ بھی ہمارے قریب خانے پر بھی تشریف لائیں، ڈیڈ آپ سے مل کر ضرور خوش
 گے۔ راجیل سے ملاقات کے بعد تو وہ اکثر افتخار انگلی کی بہادری اور دلیری کے واقعات سناتے
 ہیں۔ خاص طور پر فورس لینڈنگ کے بارے میں۔

فورس لینڈنگ میں کریش ہو جانے کا خطرہ بھی تو لاحق ہوتا ہے۔ سمیرا خاتون نے ہونٹ
 ہوئے جواب دیا۔

انہی خطرات سے کھلتا تو ایڈو وچر کہلاتا ہے۔
 اور میں ایڈو وچر کو حماقت سمجھتی ہوں۔ سمیرا خاتون نے بدستور خشک لہجے میں کہا۔ بہر حال
 کسی دن تمہارے ڈیڈی سے ملنے کی کوشش ضرور کروں گی۔
 کسی دن کیوں گی..... کل ہی کیوں نہیں؟ راجیل نے اصرار کیا۔

میں دو چار دن بہت مصروف ہوں..... اس کے بعد دیکھا جائے گا۔
 پھر فرحان کے آجانے سے بات آگے نہ بڑھ سکے، وہ نادرہ کو بلانے کی غرض سے آیا تھا اور
 نادرہ سمیرا خاتون سے سرسری اجازت لیتی فرحان کے ساتھ اس طرف چلی گئی جہاں نادیہ اور
 کسی بات پر بے اختیار قہقہے لگا رہی تھیں۔

سمیرا خاتون نے راجیل سے گھر بیٹھنے کی باتیں چھیڑ دیں، راجیل ماں کی بات کا جواب دینے
 لیکن ان کی نظریں بار بار اسی سمت اٹھ رہی تھیں جہاں نادرہ جا کر نادیہ کے قریب بیٹھی تھی۔
 اور..... سمیرا خاتون نے راجیل کی بے ہوشی نظروں کا بڑی سنجیدگی سے نوٹس لیا تھا.....!!

○○○

شائلہ بیگم کے ذہن میں بس ایک ہی سوال رہ رہ کر گونج رہا تھا..... سمیرا خاتون نے شاکی کو دس
 خطیر رقم کا وہ چپک کس مقصد سے پیش کیا تھا.....؟

مہمانوں کے جانے کے بعد انہوں نے شائلہ بیگم سے سب سے پہلے اسی لفافے کے بار۔
 دریافت کیا..... ان کا خیال تھا کہ سمیرا خاتون نے راجیل کی پڑھائی کی دیکھ بھال کرنے کی
 موقع کی رعایت سے شاکی خوش کرنے کی خاطر ہزار پانچ سو کی رقم چوڑی پہننے یا مٹھائی کھانے کے
 دے دی ہوگی۔ لیکن لفافے سے دس ہزار کا چپک برآمد ہوا تو شائلہ بیگم کے ذہن میں متعدد
 جاگ اٹھے۔ شائلہ بیگم کا ماتھا بھی ٹھنکا۔

سمیرا خاتون نے جس لاڈ پیار اور جاذب سے شاکی کو قریب بلا کر نہایت اناجیت اور محبت کا اظہار
 ہوئے لفافہ پیش کیا تھا اسی وقت شائلہ بیگم کے دل کی دھڑکنیں بھی تیز ہو گئی تھیں، دس ہزار کا چپک

”نادر یہ اور منصور کی بات تو خیر ہماری اپنی ہے۔ لیکن احرار اور شا کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔“
 ”کیا مطلب.....؟“
 ”جب تک ثار بھائی اور فوزیہ خاتون سے رشتے کی بات طے نہ ہو جائے ہم بھلا اس کی طرح کر سکتے ہیں؟“
 ”تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن.....“ شبانہ بیگم نے کچھ کہتے کہتے بہن کی سمت دیکھا پھر خاموشی اختیار کر لی۔
 ”آپاجان.....“ شبانہ بیگم نے تیزی سے کہا۔ ”ایک بات پوچھوں.....؟“
 ”پوچھو.....“ شبانہ بیگم کے لہجے میں درد کی کک موجود تھی۔
 ”کیا آپ کو اپنی شبانہ پر اعتماد نہیں رہا.....؟“ شبانہ بیگم کے لہجے میں شکوہ تھا۔
 ”یہ بات نہیں ہے شبانہ..... مگر.....“
 ”آپ کو میری قسم آیا جان جو ذرا بھی پریشان ہوں۔“ شبانہ بیگم جلدی سے پولیس۔“
 اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ لگانے کے اندر سے دس ہزار کا چیک برآمد ہوگا۔ اگر شربہ بی، میں کھلے لفظوں میں شا کو اسے قبول کرنے سے روک دیتی۔“
 ”اور اب..... کیا سوچا ہے تم نے؟“ شبانہ بیگم نے بہن کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔
 ”میرا خیال ہے کہ دو چار روز دیکھ لیا جائے..... اگر میرا خاتون کی نیت یہی ہے کہ وہ شاہ کے رشتے کی بات چھیڑیں تو لاہور واپسی سے قبل اپنے دل کا بھید ضرور کھولیں گی۔“
 ”پھر.....؟“

”پھر کیا..... شادی بیاہ کوئی زبردستی کا سودا تو نہیں ہوتے۔“ شبانہ بیگم نے کہا۔ ”اگر یہ اول کے مصداق ہم اس سلسلے کے شروع ہوتے ہی سیرا خاتون سے کہہ سکتے ہیں کہ شا کی بات طے ہو چکی ہے اس لئے وہ اس خیال کو دل سے نکال دیں۔“
 ”اور اگر لاہور واپسی کے بعد یہ ذکر نکلا تو تم اس چیک کا کیا کرو گی؟“ شبانہ بیگم نے دبا پھر خود ہی پولیس۔ ”میرا خیال ہے کہ کسی طرح خوبصورتی سے اگر یہ رقم واپس کر دی جائے تو شاہ کے رشتے کی بات نکلنے کے بعد چیک کی واپسی ہمیں زیب نہیں دے گی۔“
 ”جیسا آپ کا حکم.....“
 ”لیکن زیادہ جلدی بھی مناسب نہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ تم پہلے وقار بھائی سے پوچھ لو۔“
 ”آپ کا کیا خیال ہے..... کیا وقار آپ کی خوشی کا خیال نہیں رکھیں گے؟“
 ”یہ میں نے کب کہا..... لیکن میں اپنی ایک دیرینہ آرزو کی خاطر تمہیں یا وقار کو پریشان نہ چاہتی۔“
 ”اس میں پریشانی کا کون سا پہلو نکل آیا.....؟“ شبانہ بیگم نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔
 ”لیا نظری اور مروت بھی اکثر بیروں کی بیڑیاں بن جاتے ہیں۔“
 ”میں سمجھی نہیں.....“

”خان بہادر آصف علی نے وقار بھائی اور جمال کے ساتھ فیکٹری کے لین دین میں جو ہے، اُسے نظر انداز کر دینا احسان فراموشی ہوگا۔“ شبانہ بیگم ہاتھ ملتے ہوئے پولیس۔
 بہادر صاحب کس قدر ٹوٹ کر پیار کرتے ہیں، ہمیں یہ پہلو بھی نہیں بھولنا چاہئے..... ذرا سو خان بہادر صاحب نے وقار بھائی کے سامنے ہاتھ باندھ کر دامن پھیلا دیا اور بیٹی کی خوشحال

”میرا خیال ہے کہ اگر ایسا کوئی وقت آیا بھی تو وقار کو خان بہادر صاحب کی خوشیوں سے زیادہ ری شا کا مستقبل عزیز ہوگا۔“ شبانہ بیگم نے بے حد اعتماد سے کہا۔ ”آپ دل چھوٹا نہ کریں، خدا نے اتنی دہی ہو جاوے آپ چاہتی ہیں..... رہا چیک کا مسئلہ تو وہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں، یا تو میں دوسری بات ہی میں کاغذ کے اس پرزے کو بھید شکر یہ واپس لوٹاؤں گی یا پھر باتوں باتوں میں سیرا خاتون پرورد واضح کر دوں گی کہ شا کی بات کہیں اور چل رہی ہے۔“
 ”اور جو سیرا نے شا کی طرف سے مایوس ہو کر نادیہ کا رشتہ مانگا تو.....؟“
 ”صاف بتاؤں گی کہ نادیہ اور منصور کی بات کئی ہو چکی ہے۔“
 ”یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سیرا تمہاری باتوں سے یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ انہیں رشتوں کے سلسلے میں اجارہ ہے۔“

”سمجھتی ہیں تو سمجھا کریں..... وہ اپنے گھر خوش اور ہم اپنے گھر خوش۔“
 ”انسانوں کی منڈی میں باہمی رابطوں کا سلسلہ قائم رکھنا پڑتا ہے، ورنہ زندگی کا سارا کاروبار ٹھپ جاتا ہے۔“ شبانہ بیگم نے پہلو بدل کر جواب دیا پھر کچھ سوچ کر بولیں۔ ”ہمیں کوئی ایسی تدبیر سوچنی ہے کہ شاہ کے ساتھ بھی مر جائے اور لاگھی بھی نہ ٹوٹے۔“
 ”آپ مجھے حکم دیں.....“ شبانہ بیگم نے بہن سے اپنی بے پناہ اپنائیت کا ثبوت دیتے ہوئے بانی لہجہ اختیار کیا۔ ”آپ کی خوشیوں کی خاطر میں کسی قربانی سے بھی دریغ نہیں کروں گی۔“
 ”وقار بھائی نے کچھ یقین سے بتایا ہے کہ ثار بھائی اور فوزیہ کب تک آنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟“
 ”بیگم نے تھوڑے تو قف سے پوچھا۔
 ”کچھ کاروباری مصروفیات ہیں جو ثار بھائی کا آنا بار باٹل رہا ہے، ورنہ وہ اب تک آچکے ہوتے۔“
 ”قسمت میں کیا لکھا ہے، یہ اوپر والا ہی بہتر جانتا ہے۔“ شبانہ بیگم نے سر آدھ بھری۔
 ”آپ کو میری قسم آپ جو ذرا بھی آزرہ خاطر ہوں۔“ شبانہ بیگم نے بہن کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”خدا کی رمتوں سے مایوس نہیں ہونا چاہئے..... وہ جو کرے گا بہتر ہی کرے گا۔“
 ”تم میرے درد سے واقف ہو شبانہ، اگر قسمت نے یاد دہی نہ کی تو میں ریت پر بنے ہوئے راندوں کی طرح ٹوٹ کر بکھر جاؤں گی..... یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں خود اپنے ہاتھوں سے.....“
 ”شبانہ بیگم اپنا جملہ مکمل نہ کر سکیں، جمال احمد اور وقار احمد ہنستے بولتے کمرے میں داخل ہوئے تو دل کے درمیان ہونے والی گفتگو ادھوری رہ گئی..... شبانہ بیگم نے اپنی نمناک آنکھوں کو آجیل سے لٹکایا اور لرزتے ہونٹوں پر ایک پھیکا سا تبسم چکا کر خود کو وقت کے سانچے میں ڈھال لیا۔ اور شبانہ بیگم نے چیک کو تہہ کر کے جلدی سے پرس کے اندر بند کر دیا.....!!

○○○

سیرا خاتون، کرنل عابد سے رخصت لے کر بنگلے سے باہر آئیں تو نادرہ دروازے تک انہیں لڑنے آگئی۔ اُبلے رنگ کی بے داغ سفید پتلون اور سیک ڈیزائن کی ٹی شرٹ میں وہ بے حد سارٹ خوبصورت نظر آ رہی تھی، بلکہ میک آپ نے اُس کی کھلتی رنگت کو اور نکھار دیا تھا۔
 داخل نے جلدی سے آگے بڑھ کر ماں کے لئے گاڑی کا دروازہ کھولا، سیرا خاتون نے پلٹ کر لائی نظروں سے نادرہ کو دیکھا تو وہ بڑے دل آویز انداز میں مسکرا رہی تھی، سیرا خاتون کو اپنی طرف

”خان بہادر آصف علی نے وقار بھائی اور جمال کے ساتھ فیکٹری کے لین دین میں جو ہے، اُسے نظر انداز کر دینا احسان فراموشی ہوگا۔“ شبانہ بیگم ہاتھ ملتے ہوئے پولیس۔
 بہادر صاحب کس قدر ٹوٹ کر پیار کرتے ہیں، ہمیں یہ پہلو بھی نہیں بھولنا چاہئے..... ذرا سو خان بہادر صاحب نے وقار بھائی کے سامنے ہاتھ باندھ کر دامن پھیلا دیا اور بیٹی کی خوشحال

متوجہ پا کر جلدی سے بولی۔ ”آج آپ نے بہت تکلف سے کام لیا آئی..... نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ اور جانے میں بھی اتنی جلدی کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔“

”مصرفیات بہت زیادہ ہیں..... ورنہ کچھ دیر اور رک جاتی۔“

”کہیں ایسا تو نہیں کہ ڈیڈ کی باتوں نے آپ کو بھی پور کر دیا ہو۔“ نادرہ نے کہا۔ ”اکثر لوگ طرح طرح سے بہت جلد اکتا جاتے ہیں، شاید اس لئے کہ فوجی زندگی اور پھر می کی نے انہیں زیادہ محتاط بنادیا ہے..... یا تو خاموش رہتے ہیں اور جب بولنے پر آتے ہیں تو دوسرے کو بولنے کا کام نہیں دیتے۔ فوج کے زمانے کے قصے کہانیاں سن سن کر خود بھی.....“

”تمہیں ایسا نہیں سوچنا چاہئے۔“ سمیرا خاتون سنجیدگی سے بولیں۔ ”وہ تمہارے باپ ہیں۔ اور تمہارے سوا کون ہے جو ان کی دیکھ بھال اور خوشیوں کا خیال رکھے گا..... تم ان کی زندگی کی آخری ہوا، اگر تم بھی اکتا گئیں تو پھر انہیں کون سنبھالا دے گا؟“

”ڈیڈی کا کہنا ہے کہ انسان کو سوائے خدا کے کسی اور پر بھروسہ نہیں کرنا چاہئے۔“ نادرہ نے سزا جواب دیا۔

”ماں باپ کی خدمت بھی عبادت ہوتی ہے۔“ سمیرا خاتون نے سپاٹ لہجے میں تلقین کی۔

”میں ڈیڈ کا بہت زیادہ خیال رکھتی ہوں..... لیکن وہ اپنا کام خود کرنے کے عادی ہیں۔ اور پھر نے سنا نہیں..... اگر ڈیڈ کو کوئی بات ذرا سی بری لگ جائے تو فوراً گولی مار دیتے ہیں۔“

”مجھے تمہارے ڈیڈ سے مل کر بے حد مسرت ہوئی، بہت تجربہ کار، ملسار اور جہاں دیدہ شخصیت مالک ہیں۔“

”اور کیا آپ کو مجھ سے مل کر خوشی نہیں ہوئی؟“ نادرہ نے انتہائی مصومیت سے سوال کیا۔

”تم سے پھر کسی وقت تفصیل سے ملوں گی۔“ سمیرا خاتون نے ٹھوس آواز میں جواب دیا۔

”پراس.....؟“ نادرہ نے شیک پنڈ کرنے کے لئے ہاتھ بڑھایا پھر کچھ سوچ کر جلدی سے اچھے کرتے ہوئے بولی۔ ”اب کی بار آئیں تو مصرفیات ختم کر کے آئیں..... آج تو آپ جیسے ہوا۔“

”ٹھوڑے پر سوار نہیں، سوائے ڈرائنگ روم کے اور کچھ بھی نہیں دیکھا۔“

”اور کیا یاد دیکھنے کی چیزیں ہیں یہاں.....؟“

”میرا بیڈ روم جسے میں نے نہایت نفاست سے سجایا ہے۔“

”مجھے زیادہ سجاوٹ پسند نہیں۔“ سمیرا خاتون نے آہستہ سے کہا۔ ”شاید اس لئے کہ میں ما پسند ہوں۔“

”لیکن راجیل تو سادہ نہیں رہتے..... میرا مطلب ہے کہ وہ تو کھانے پینے اور لباس کے معا میں بہت باڈرن واقع ہوئے ہیں۔“ نادرہ نے بڑی مصومیت سے جواب دیا پھر زیب لب مسکرا بولی۔ ”یہ اور بات ہے کہ راجیل بہت سیدھے اور نیک طبیعت کے مالک ہیں۔“

”گو یا تم نے راجیل کو بہت قریب سے محسوس کرنے کی کوشش کی ہے۔“ سمیرا خاتون نے نادرہ سر تا پا سنجیدگی سے گھورتے ہوئے پوچھا تو وہ شہنائی، ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ کیا جواب دے کہ راجیل نے اس کی مشکل آسان کر دی۔

”مئی! یہاں کھڑے ہو کر گفتگو کرنے سے تو بہتر ہے کہ ہم اندر چل کر اطمینان سے بیٹھیں۔“ راجیل نے ماں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”اسی بہانے آپ نادرہ کے ہاتھوں سے کوئلہ کافی بھی چکھ لیں۔“

”پڑ آئی!“ نادرہ نے بھی اصرار کیا۔ ”میں یقین دلاتی ہوں کہ میرے ہاتھ کی کوئلہ کافی پی کر آپ.....“ سمیرا خاتون نے جلدی سے نادرہ کا جملہ کاٹتے ہوئے کہا پھر بڑے بڑ وقار انداز لہجہ کی نشست پر بیٹھ گئیں۔

راجیل دروازہ بند کر کے اگلی سیٹ پر آئے تو نادرہ نے ایک بار پھر سمیرا خاتون سے کہا۔ ”اپنا وعدہ پورا کیا آئی..... آپ نے دوبارہ جلدی آنے کا پراس کیا ہے۔“

”خبر آئی نہیں..... میں اب کی بار اطمینان سے آؤں گی اور تمہارے ڈیڈ کے ساتھ تفصیل سے بھی ہوں گی۔“

راجیل نے گاڑی چلائی تو نادرہ مسکراتی ہوئی ایک قدم پیچھے ہٹ گئی پھر سمیرا خاتون کی نظریں بدستور اکیڑوں کا بخور جائزہ لیتی رہیں۔

راستے میں ان کے اور راجیل کے درمیان نادرہ کے سلسلے میں کوئی خاص بات نہیں ہوئی لیکن وہ ن کر رہی تھیں کہ راجیل نادرہ کی ذات میں بہت زیادہ دلچسپی لے رہے ہیں، اس کا کچھ اندازہ اس روز بھی ہو گیا تھا جب راجیل نے اپنی کامیابی کے جشن کے موقع پر نادرہ سے ان کا تعارف افادہ کیا۔

”ہاں بیٹھے کے بعد بھی سمیرا خاتون راجیل اور نادرہ کے بارے میں سوچتی رہیں۔ راجیل ان کی کا ادھار تھا جس کی خاطر انہوں نے حالات سے کبھی سمجھوتہ کرنے کی کوشش نہیں کی، اپنی متا اطرف انہوں نے اپنی سہاگ کی خوشیوں کو بھی پس پشت ڈال دیا تھا۔ اس وقت راجیل کا تصور ان کو تھا جب افتخار نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ اولاد کی آمد دونوں کے درمیان فاصلے دور ہے۔“

”شوہر کی اس انوکھی منطق کو سن کر ششدر رہ گئیں..... اس وقت ماں کی متا کا جذبہ پوری طرح لگی نہیں ہوا تھا لیکن انہوں نے شوہر کی بات ماننے سے انکار کر دیا، شوہر کو خوش رکھنے کی خاطر بائیں دنیا کے تمام جن جن کرنے منظور کر لئے مگر متا کا گلا گھونٹنے کے لئے خود کو آمادہ نہ کر سکی۔“

”پھر نے اپنی ضد منوانے کی خاطر وہ تمام حربے استعمال کر ڈالے جو ایک مرد کی عورت کو مجبور بنانے کی خاطر کر سکتا ہے لیکن وہ اپنی جگہ محسوس چٹان کی مانند اٹل رہیں۔ افتخار نے ان کے ساتھ سرد اور یہ اختیار کیا۔ وہ آنے والے خوش گوار محسوس کی امید کو سینے سے لگائے مسکراتی رہیں..... افتخار بال عورتوں کے ساتھ گھومنا پھرنا شروع کر دیا۔ وہ آزمائش کی ان ٹھٹھن گھڑیوں میں بھی ثابت پایا، انہوں نے شوہر سے کوئی شکوہ، کوئی شکایت نہیں کی۔ ایک خاموش تماشائی کی طرح سب کچھ دیکھا۔“

”یہاں.....! افتخار نے راتوں کو گھر سے دور رہنے کی عادت ڈال لی.....“

”یہاں.....! افتخار نے راتوں کو گھر سے دور رہنے کی عادت ڈال لی.....“

”یہاں.....! افتخار نے راتوں کو گھر سے دور رہنے کی عادت ڈال لی.....“

”یہاں.....! افتخار نے راتوں کو گھر سے دور رہنے کی عادت ڈال لی.....“

”یہاں.....! افتخار نے راتوں کو گھر سے دور رہنے کی عادت ڈال لی.....“

”یہاں.....! افتخار نے راتوں کو گھر سے دور رہنے کی عادت ڈال لی.....“

”یہاں.....! افتخار نے راتوں کو گھر سے دور رہنے کی عادت ڈال لی.....“

”یہاں.....! افتخار نے راتوں کو گھر سے دور رہنے کی عادت ڈال لی.....“

”یہاں.....! افتخار نے راتوں کو گھر سے دور رہنے کی عادت ڈال لی.....“

معصوم خوشیوں کو جینے کا سہارا جان کر مستقبل کی طرف قدم بڑھاتی رہیں۔ یوں زندگی کا ایک طویل عرصہ گزر گیا، ماضی کی یادیں بندرتج و حنن لاتی گئیں لیکن آج زندگی کے ایک نئے موڑ پر نادرہ کی شخصیت نے سامنے آکر سیرا خاتون کو ان کا ماضی پھر یاد دلایا۔

افتخار بھی مغربی تہذیب کا دلدادہ تھا، زندگی کے ہنگاموں سے لطف اندوز ہونا اور سن مانی کرنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ بڑے گھر کا چشم و چراغ تھا، اس لئے اس کے پاس دولت کی کوئی کمی نہ تھی اور اسی بے راہ روی نے سیرا خاتون اور اس کے درمیان ایک خلیج پیدا کر دی جو رفتہ رفتہ زندگی کے لئے ایک ناسور بن گئی۔

افتخار کی طرح نادرہ کی تربیت بھی جس ماحول میں ہو رہی تھی، وہاں کسی بندش، کسی روک ٹوک کا کوئی دخل نہیں تھا۔ سیرا خاتون نے پہلی نظر میں شخص اس بات کا اندازہ لگایا تھا کہ وہ بہت آزاد خیال اور خود مختار واقع ہوئی ہے، کرنل عابد سے ملنے کے بعد ان کے شبہات کی تصدیق ہو گئی، انہوں نے اپنی کی تربیت میں کسی نجل سے کام نہیں لیا تھا لیکن اس کے باوجود اسے کھلی جھڑپ دے رکھی تھی، شرعی تہذیب کی قدروں سے روشناس کرانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اسی لئے وہ مردوں کی طرح چلتی پھرتی کر آزادی سے کھوئے پھرنے میں کوئی عار نہیں سمجھتی تھی ہر شخص سے نہایت آزادی سے ملتی اور مل کر بات کرتی تھی۔

راجیل ہر چند کہ بے داغ کردار کا مالک تھا لیکن جس ماحول میں اس کی پرورش ہوئی، وہاں بھی دولت کی ریل چل تھی، زندگی کی تمام آسائشیں موجود تھیں، اس لئے وہ بھی کسی روک ٹوک کے بغیر زندگی کی شاہراہوں پر قدم بڑھاتا رہا، سیرا خاتون نے کئی بار سنجیدگی سے اس کے بارے میں سوچا لیکن ہر بار اولاد کی محبت اور ماں کی ممتا ان کے فیصلوں کو کند کر رہی۔

سر پر باپ کا سایہ نہ ہونے کی وجہ سے بھی راجیل کی تربیت اس انداز میں نہ ہو سکی جس طور سیرا خاتون نے سوچا تھا، گھر کی چہار دیواری کے اندر وہ بیٹے کی ایک ایک حرکت پر کڑی نگرانی رکھ سکتی تھی لیکن گھر کے باہر ان کا بس نہیں چلتا تھا اور یہی وجہ تھی جس نے راجیل کو متضاد طرز عمل اپنانے پر مجبور کر دیا۔ جب تک ماں کے سامنے رہتا خود کو بہت لئے دیتا رہتا، بھی ماں کے کسی حکم سے سر تابی کی جسارت نہ کرتا، ان کے رُخے اور مرتبے کا خیال رکھتا۔ البتہ لاڈلا اولاد کو بتا دینا ہونے کی وجہ سے اسے ماں نے جو رعایت دے رکھی تھی اس کا مظاہرہ ضرور کرتا تھا لیکن جب وہ ماں کی نظروں سے دور دستوں کو محفل میں ہوتا تو اپنی بوائی اور امارت کی شان ضرور بگھارتا تھا۔ کچھ باپ کے خون کا اثر تھا۔ کچھ دولت کی افراط اور فراوانی۔ کچھ ماحول کا رنگ تھا اور کچھ غلط قسم کے لڑکوں کی صحبت کا اثر جس نے راجیل کو اپنے مستقبل سے بے نیاز اور بے پرواہ کر دیا تھا۔

یہی وہ اسباب تھے جن سے مجبور ہو کر سیرا خاتون نے راجیل کو خود سے دور کرنے کا فیصلہ کر لیا راجیل کو اپنے والدین کے مشورے پر کراچی بھیج دیا۔ ماحول کی یہ تبدیلی راجیل کے حق میں رانجا نہیں گئی، اس نے خلاف توقع شاندار کامیابی حاصل کی تو سیرا خاتون کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ راجیل کی اس کامیابی میں وقار احمد کے گھر بیلو ماحول اور ثنا کی کوششوں کو بھی بڑا دخل تھا چنانچہ خاتون نے یہی سوچا تھا کہ بیٹے کے مستقبل کو سنوارنے کی خاطر وہ ثنا یا نادیہ میں سے کسی ایک کو بھروسہ لیں گی۔ ان کی نظر انتخاب پہلے ثنا کی طرف اٹھی۔ پھر ایک موقع پر نادیہ اور راجیل کو کھل کر باتیں کرتا دیکھ کر انہوں نے نادیہ کو پسند کر لیا لیکن اس بار وہ راجیل کو نادرہ کے آس پاس منڈلا۔

نئی سوجے پر مجبور ہو گئیں۔ ان کی زندگی میں جو طوفان برپا کئے تھے، ان کی شدتیں آج بھی سیرا خاتون کی زندگی میں محفوظ تھیں۔ راجیل کی خاطر وہ کرنل عابد سے ملنے کے لئے بھی آمادہ ہو گئیں۔ انہوں نے نادرہ کو مغربی لباس میں دیکھا تو اسے زیادہ دیر اپنے قریب برداشت نہ کر سکیں۔ ان کی اور کرنل عابد کی موجودگی میں نادرہ کا بے باکی سے گفتگو میں حصہ لینا اور بات بات پر کھل کھیرنا بھی ایک آنکھ نہ بھایا۔ شاید اس لئے کہ ان کی اپنی ازدواجی زندگی کا انجام بھی ایک آزاد ماں سے وابستہ ہونے کے بعد بڑا دردناک اور الم انگیز ثابت ہوا تھا۔ بہار آنے سے خوشتر گئے محسوس بادل ان کی خوشیوں کو تاراج کرنے کی خاطر ان کے آشیانے پر منڈلانے لگے اور انہیں ایک ایسا ہی ریل اٹھائیں کسی حقیر تنکے کی مانند اپنی شدتوں میں بہا کر بہت دور لے گیا۔

ان کی سرزمین ان کے حق میں بہت عارضی اور نامائیدار ثابت ہوئیں۔ وقت کی کروٹ نے ہاگ کو اجاڑ دیا۔ محرومیاں مقدر بن گئیں۔ اگر راجیل نہ ہوتا تو شاید بیوگی کا غم انہیں بھی نہ دے سکتی تھیں۔

ان کی شخصیت ان کی ویران زندگی میں ایک محسوس حقیقت تھی۔ نادرہ کے رکھ رکھاؤ اور اس کی ہر بات کا عکس نمایاں نظر آتا تھا۔ پھر وہ اسے بہو کی صورت میں کس طرح قبول کر سکتی تھی۔

ان کی کتنی کی تیز آواز کمرے میں گونجی تو سیرا خاتون کے خیالات کا شیرازہ منتشر ہو گیا، ایک لمحے انہوں نے نفرت سے فون کی جانب دیکھا پھر ہاتھ بڑھا کر ریسور اٹھا لیا۔

ان کے لہجے میں حالات کی تلخی بھی شامل تھی۔ ان کے لئے لاہور سے کال ہے۔ دوسری جانب سے ہوٹل کے آپریٹر کی آواز سنائی دی۔ ان کو یوں ہے۔ انہوں نے خشک آواز میں دریافت کیا۔

ان سے کہہ دو کہ میں اس وقت آرام کر رہی ہوں، رات کو فون کریں۔

راجیل نے جواب کا انتظار کئے بغیر ریسور واپس رکھ دیا، پھر دوبارہ راجیل اور نادرہ کے کمرے کو گئے۔

○○○

راجیل نے جب سے شوہر کی زبانی شاد احمد اور فوزیہ خاتون کی آمد کی خبر سنی تھی ان کی خوشیوں کا اندازہ تھا۔ مہمانوں کے استقبال کے اہتمام میں اس بار وہ کچھ زیادہ ہی مسرور نظر آ رہی تھیں۔ ان کے لئے دو بڑے اندر اندر پورے گھر کا نقشہ پلٹ گیا۔ شامکے بیگم صبح سے شام تک گھر کی صفائی کرتی تھیں۔ ہر کام کا جائزہ لیتیں، ملازموں کو بات بات پر نوکتیں اور ہر کام سلیقے سے کرنے کی تاکید کرتیں۔ مہمانوں کے لئے انہوں نے خاص طور پر پائیں باغ کی سمت والے باغ میں فوٹو ترتیب دیا، پرانے پردے اتار کر اس کی جگہ نئے پردے ڈالے گئے، دیوار پر نیا رنگ لگایا۔ پھر پائیں کرائی گئی، لکڑی کی نئی الماری خرید کر اس میں ضروریات کی تمام چیزیں رکھی گئیں۔ ہاتھ نرم میں صابن اور تولیے کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔

”یاری شاملہ..... خوش رہو!

انہی سب لوگ بغیر وعایت ہو گئے..... یہ خط تمہیں بھائی صاحب کے دفتر کے پتے پر روانہ ہوں تاکہ براہ راست تمہارے ہاتھوں میں پہنچے۔

خانے جاہا تو ہم ہفتے کے روز تمہارے درمیان ہوں گے، اس بار میرا ارادہ تمہارے گھر کی بجائے دوسری جگہ قیام کرنے کا تھا اس لئے کہ اب ہمارے بچے جوان ہو گئے ہیں اور جب بچے جوان ہوں تو ماں باپ کو ان کی فکر کسی کروٹ چین نہیں لینے دیتی..... اُمید ہے تم میرا مقصد سمجھ گئی ہو یہ مختصری پیش بندی اس لئے ضروری سمجھ رہی ہوں کہ تم پہلے سے اپنا ارادہ پختہ کر لو.....

اب بار ہماری ملاقات کا مقصد بچوں کی خوشیوں کی تکمیل ہو گا..... احمر جتنا عرصہ پاکستان میں رہے ہیں ان کا قیام تمہارے پاس ہی ہوتا ہے..... تم مجھ سے زیادہ بچوں کی خوشیوں کا خیال رکھتی مجھے جی اب احمر کے سر پر سہرا دیکھنے کی تمنا ہے..... کیا خیال ہے تمہارا کیوں نہ ہم دونوں مل کر بچوں کے پاؤں میں ایسی خوبصورت زنجیریں ڈال دیں جو ہمارے رشتوں کو اور مستحکم کریں اور ان کی خوشیاں بھی پوری ہو جائیں.....؟! ”

انی فیصلی باتیں ملاقات کے بعد ہوں گی، میری طرف سے تمام بچوں کو بہت بہت پیار اور وقار کو بہت بہت دعائیں۔ (تمہاری..... فوزیہ!) ”

شائلہ بیگم نے خط کا مضمون مکمل کیا تو چہرہ یوں دمک اٹھا جیسے عید کا چاند نظر آ گیا ہو..... شاکی لے کر شوہر کو گھورتے ہوئے بولیں۔ ”آپ نے تو ذرا ہی دیا تھا..... ایسی سنجیدگی طاری کر رہی تھا کی پناہ۔“

”آپ کو بھی اب سنجیدگی اختیار کر لینی چاہئے.....“ وقار احمد نے کہا۔ ”بٹی کا معاملہ ہے..... مجھے تو سے یہ خیال رہ رہ کر ابھار رہا ہے کہ جب ثناء اور نادیہ اپنے اپنے گھر کی ہو جائیں گی تو ہمارا کیا حال

”بٹی والوں کو ایک نہ ایک دن یہ رسم پوری کرنی پڑتی ہے..... قدرت کا قانون یہی ہے۔“

”وہ تو ہے لیکن.....“

”مکن ویکن کچھ نہیں.....“ شائلہ بیگم نے شوہر کے احساسات کو محسوس کرتے ہوئے تیزی سے کہا۔

پہلے کر ناشے کی میز پر بیٹھیں..... میں جلدی سے دو رکعت شکرانے کی پڑھ کر آتی ہوں۔“

وقار احمد ناشے سے فارغ ہو کر حسب معمول باہر لان پر چلے گئے، شائلہ بیگم ان کے ساتھ جاتے دیکھ کر سوچ کر ناشا کے کمرے کی سمت گھوم گئیں..... ثناء نے ماں کو آتے دیکھا تو کتاب میز پر رکھ کر ان نظروں سے ان کا استقبال کیا، اُس وقت وہ کمرے میں تنہا تھی، صائمہ اور فرحان لان میں تھے یہ شام ہی سے نادرہ کی طرف گئی ہوئی تھی۔

”تمہارے امتحان میں کتنا عرصہ باقی ہے؟“

”قریباً پانچ ماہ.....“ ثناء نے ماں کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لیکن آپ بے فکر نہ ہو، بڑی اماں کی دیکھ بھال کا خاص خیال رکھوں گی، انہیں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی۔“

”خدا تمہیں سلام رکھے.....“ شائلہ بیگم نے بڑے لاڈ سے ناشا کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”میں تمہیں یہی

کہتی تھی کہ تمہاری بڑی اماں وغیرہ ہفتے کو پہنچ رہی ہیں۔“

نادرہ میں کون کون شامل ہے؟“ ثناء کے لہجے میں شوخی تھی۔

وقار احمد بھی اپنی جگہ بھائی اور بھادج کی آمد سے بہت خوش تھے، ایک تو خون کا رشتہ تھا ہمیشہ سب سے زیادہ مسرت اس بات کی تھی کہ ناشا جس کی تعلیم و تربیت میں انہوں نے کوئی دقیقہ فرما کر نہیں کیا تھا۔ بے شایان شان خاندان ہی کے ایک گھر کی زینت بننے جا رہی تھی۔ چنانچہ وہ بھی ہمیشہ میں حتی الوسع بیوی کا ہاتھ بٹاتے میں مصروف تھے۔

آج بھی وقار احمد جب دفتر سے گھر واپس لوٹے تو وہ تمام سامان ان کے ساتھ تھا جس کی ضرورت شائلہ بیگم نے صبح اُن کے حوالے کی تھی اور خاص طور پر فون پر تاکید کی تھی کہ تمام چیزیں نہایت اعلیٰ معیار کی خریدی جائیں۔

شائلہ بیگم نے حسب معمول تھکے ماندے شوہر کا استقبال ایک دنواڑ تبسم سے کیا، ملازم کو ناشا ہدایت دیتی ہوئی شوہر کے ساتھ کمرے میں چلی گئیں، وقار احمد خلاف توقع کچھ سنجیدہ سنجیدہ نظر آ رہے تھے چنانچہ شائلہ بیگم نے فوراً ہی کوئی کرید نہیں کی۔ جب وقار احمد ہاتھ منہ دھو کر اور لباس تبدیل کر کے بعد آرام کرسی پر بیٹھے تو شائلہ بیگم نے اُن کے قریب جا کر بڑی اپنائیت سے پوچھا۔ ”خیر ہے..... آج آپ کچھ خاموش خاموش سے نظر آ رہے ہیں۔ کیا دفتر میں کام زیادہ تھا؟“

”آپ جانتی ہیں کہ میں کام کے معاملے میں کبھی پیچھے نہیں ہٹتا۔“

”کوئی کاروباری مسئلہ درپیش ہے؟“

”جی نہیں.....“ وقار احمد نے بیوی کو غور سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”کاروبار میں اُدھن کا نفع نقصان روزمرہ کی بات ہے۔ لہذا میں نے اس کی فکر بھی کبھی نہیں کی..... اللہ نے جو کچھ دے ہے وہی بہت ہے۔ مجھے اس سے زیادہ کی صلح بھی نہیں ہے۔“

”پھر..... اس سنجیدگی کا سبب کیا ہے؟“

”آج بھائی صاحب کا فون آیا تھا.....“

”کوئی خاص بات.....؟“ شائلہ بیگم نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

”اپنی آمد کی تاریخ سے مطلع کیا ہے.....“

”کب آ رہے ہیں؟“ شائلہ بیگم کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔

”ہفتے کے روز..... احمر بھی ساتھ آ رہا ہے۔“

”یہ تو بہت اہم خبر ہے۔“ شائلہ بیگم نے کہا۔ ”آپ کو کیا پریشانی لاحق ہے..... اب تو انتظامات مکمل ہو چکے ہیں..... دو چار چھوٹی موٹی چیزیں رہ گئی ہیں وہ کل تک آ جائیں گی۔“

”مجھے انتظامات کی کوئی فکر نہیں..... جہاں آپ جیسا سلیقہ مند منتظم موجود ہو، وہاں کسی کی یا غلط

امکان ہی کہاں باقی رہتا ہے؟“

”پھر..... بات کیا ہے؟“

”آج کی ڈاک میں بھائی صاحب کا ایک خط بھی موصول ہوا ہے..... آپ کے نام۔“

”میرے نام، اور دفتر کے پتے سے.....؟“ شائلہ بیگم نے حیرت کا اظہار کیا۔ ”کیا لکھا ہے؟“

”بہن نے.....؟“

”بریف کیس میں نیلے رنگ کا لفافہ اوپر ہی رکھا ہے..... آپ بھی نکال کر پڑھ لیں۔“

شائلہ بیگم نے شوہر کے چہرے پر طاری سنجیدگی دیکھی تو دل دھک سے رہ گیا، جلدی سے ہاتھ کیس کھول کر لفافہ نکالا اور دھڑکتے ہوئے دل سے مضمون پڑھنا شروع کر دیا۔

”تمہارے بڑے ابا..... اور احمد بھی اُن کے ساتھ آرہا ہے۔“

ثنا نے احمد کا نام سنا تو اندر ہی اندر گنگنا اٹھی..... جلدی سے بات بنانے کی خاطر ماں کے چہرے پر ہنسکتی مسرتوں کو دیکھ کر بولی۔ ”ایک بات کہوں اگر آپ برا نہ مانیں۔“

”ایسی کیا بات ہے جسے سن کر میں برا ساؤں گی؟“

”میں نے تو سنا ہے کہ دیورانی اور جھٹانی کا رشتہ بڑا نازک ہوتا ہے..... اس رشتے کے درمیان نوک جھونک کا ہونا قدرتی امر سمجھا جاتا ہے لیکن آپ کی خوشی اور بڑی اماں سے آپ کی محبت دیکھ کر مجھے اپنا خیال بدلنا پڑ رہا ہے۔“

”ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے جو تم ان باتوں کی گہرائی سمجھ سکو گی..... ویسے پانچوں انگلیاں برابر ہی نہیں ہوتیں۔“ ثنا ٹکے بیگم نے ثنا کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”تالی دووں ہاتھوں سے بچتی ہے..... لیکن جہاں دلوں میں گنجائش ہو اور ذہن کدورتوں سے پاک ہو، وہاں لڑائی جھگڑے یا نوک جھونک کا تصور بھی نہیں ہوتا۔“

”لیکن رشتوں کے درمیان کشش کا پایا جاتا تو بڑی پرانی بات ہے۔“

”نہیں بیٹی..... ایسا نہیں ہے۔“ ثنا ٹکے بیگم بولیں۔ ”رشتے ناتے تو انسان کی شناخت ہوتے ہیں..... جہاں بزرگوں کی اچھی سمجھیں شامل ہوں وہاں بھی کوئی چپقلش نہیں ہوتی..... میری مثال لے لو..... میری ماں نے شروع ہی سے ذہن میں سسرال والوں کا ایسا خوبصورت اور حسین تصور پیش کیا تھا کہ مجھے شادی کے بعد بھی تمہارے باپ کے گھر میں کسی اجنبیت یا غیریت کا احساس نہیں ہوا۔ سب اپنے اپنے سے لگے..... یوں بھی سسرال کے لوگ دنیا سے الگ تھلک تو نہیں ہوتے۔ وہ بھی ہمارے تمہارے جیسے انسان ہوتے ہیں۔ اور محبت تو وہ جذبہ ہے جو دلوں کو تنہا کر لیتا ہے۔“

”پھر یہ ساس بہو کے جھگڑے اتنے کیوں مشہور ہیں؟“

”یہ جھگڑے وہاں ہوتے ہیں جہاں تعلیم کا فقدان ہوتا ہے..... پڑھے لکھے اور جاہلوں کا فرق ایسے ہی موقعوں پر نمایاں نظر آتا ہے۔“ ثنا ٹکے بیگم نے بڑی شفقت سے جواب دیا۔ ”خدا بخشے تمہاری دادلی اماں کو..... بہت نیک اور منساہر خاتون تھیں، بڑھی لکھی ہونے کے ساتھ ساتھ نماز روزے کی بھی بے حد پابند تھیں..... خدا گواہ ہے کہ انہوں نے کبھی نہیں اپنی اولاد سے کم نہیں سمجھا بلکہ اپنی اولاد سے بڑھ کر سلوک کیا..... اور مائیں کیا بیٹیوں کے ساتھ ڈانٹ ڈپٹ نہیں کرتیں..... اچھی بری باتیں اگر بڑے نہیں بتائیں گے تو اور کون بتائے گا..... ساس تو اُس ہستی کا نام ہے جو پال پوس کر اپنی متاع حیات کو دوسری عورت کے حوالے خوشی خوشی کر دیتی ہے..... اس اعتبار سے تو ہم ساس کا جتنا احترام کریں کم ہے۔ یہ تو والدین کا فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں کو ساس سسرکا ادب کرنا سکھائیں..... اگر خود ماں ہی اپنی بچیوں کو ساس مندوں کا خوف..... سسرکا دیدہ اور دیور کی شرارتوں کو غلط رنگ دے کر ذہن میں بٹھا دے گی تو نتیجہ صاف ظاہر ہے..... جہاں تربیت نامناسب ہوگی وہاں مسرتوں کی توقع ہی فضول ہے۔“

”آپ بہت عظیم ہیں..... اُس بلند اور روشن منارے کی مانند جو پھٹکے ہوئے مسافروں کی رہبری کرتا ہے۔“ ثنا نے اُن کی تعریف کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ”خاص طور پر آپ کے اور بڑی اماں کے درمیان تو مثالی محبت قائم ہے۔“

”اس کی بھی وجہ ہے..... میں نے ثنا بھائی کو ہمیشہ اپنا بزرگ اور ہمدرد سمجھا، فوزیہ بہن کو بڑی بہن کا درجہ دیا..... احمد کو فرحان سے کم نہیں سمجھا..... یہی وجہ ہے جو ہمارے پاس دوڑا چلا آتا ہے، وہ کہاں نیروبی، کہاں کراچی۔ محبت تو وہ جذبہ ہے جو فاصلوں کو بھی مٹا دیتا ہے۔“

”اماں ستنے دنوں کے لئے آ رہی ہیں.....؟“ ثنا نے پوچھا۔

”داخل ہے کہ اس بار وہ واپسی کے معاملے میں جلد بازی نہیں کریں گی۔“

”کیسے معلوم..... پچھلی بار تو دس پندرہ دن بعد ہی واپس لوٹ گئی تھیں۔“

”اور بات تھی۔“

”کیا خاص بات ہے.....؟“

”بڑی اماں کو آ لینے دو..... تمہیں بھی حالات کا علم ہو جائے گا۔“ ثنا ٹکے بیگم نے معنی خیز انداز کر جواب دیا تو ثنا نے جلدی سے نظریں جھکا لیں، حیا کی سرخی اُس کے چہرے کو گلزار بنا گئی، بات کا مفہوم سمجھ رہی تھی..... احمد نے بھی تو اُسے فون پر یہی خوشخبری سنائی تھی کہ فوزیہ خاتون واپس آ رہی ہیں۔

”اخبار تک تصور ہیجئے یادلوں کی طرح اُس کے ذہن کے پردوں پر ابھرا تو وہ خود اپنے ہی ہم گم ہو کر رہ گئی..... مستقبل کی حسین دادیوں کے سبزہ زاروں میں بہت دُور نکل گئی.....“

”احمد تھا اور گنگنا تھی..... اُس کے ریلے نئے اُس کے کانوں میں رس گھول رہے تھے۔“

”سوچے لگیں.....؟“ ثنا ٹکے بیگم کی مدغم آواز اُس کے کانوں میں گونجی تو خواہوں کا ظلم ٹوٹ کر بلدی سے اُس نے خود کو دسنبھالا، دل کی معصوم دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے آہستہ سے بولی۔

”یہ کون سے بہت دیر ہو گئی.....“

”ماہیہ کے بارے میں نہیں..... احمد کے سلسلے میں گفتگو کر رہی تھی۔“ ثنا ٹکے بیگم نے مسکراتے۔ ”بہت ہی نیک اور سعادت مند بچہ ہے..... یوں ٹوٹ کر ملتا ہے جیسے اسی گھر..... اسی ماحول اُچھو ہو..... تمہارا کیا خیال ہے.....؟“

”اجاں..... آپ جانتی ہیں کہ میری سب سے بڑی خواہش کیا ہے۔“ ثنا نے سنجیدگی سے کہا۔

”.....؟“

”ماب سے پہلے اپنی تعلیم مکمل کرنا چاہتی ہوں..... ایک کامیاب ڈاکٹر بننا چاہتی ہوں۔“

”اُمہ نہیں تمہارے نیک ارادے سے کب روک رہی ہوں..... خدا نے چاہا تو تم بہت بڑی ما.....“

”پکی دُعا میں میری زندگی کا سرمایہ ہیں۔“

”میں تم سے بات کرنے میں ایک اہم کام تو بھول ہی گئی۔“

”.....؟“

”اجاں کو بھی فون کر کے بتانا ہے کہ ثنا بھائی اور فوزیہ بہن ہفتے کو پہنچ رہے ہیں اور.....“ ثنا ٹکے بیگم نے مسکرا کر خاموش ہو گئیں تو ثنا کا تجسس بڑھ گیا۔

”کیا.....؟“ اُس نے ماں کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

”یہ کہ آج تمہاری بڑی اماں کا خط بھی آیا ہے۔“

”اے خط.....؟“ وہ کسی معصوم بچی کی طرح لہک کر بولی۔ ”آپ نے مجھے کیوں نہیں دکھایا؟“

”اسے باپ نے منع کر دیا ہے۔“

”کر دیا ہے..... لیکن کیوں؟“ اُس نے حیرت سے دریافت کیا۔

”.....؟“ ثنا ٹکے بیگم نے خاص انداز میں مسکرا کر جواب دیا تو ایک بار پھر اُس کے

ذہن میں احمر کا تصور ابھر آیا۔ وہ خود ہی اپنے سوال پر شرمندہ ہو گئی۔ دل کی دھڑکنوں میں قائم کیفیت بیدار ہوئی تو وہ کٹ کر رہ گئی۔ جلدی سے دراز چلوں کو غلافی آنکھوں پر چٹکن کر لیا۔ اہر بارے میں سوچنے لگی۔

احمر۔ جو اس سے دور رہ کر بھی بہت قریب تھا۔

اُبھی اُبھی سانسوں کی لطیف سرسراہٹوں کی مانند۔!!

○○○

شانہ بیگم نے فون رکھا تو جذبات پر قابو نہ پا سکیں۔ فوز بہ خاتون کی آمد کی اطلاع نے اُن کی جا رہی دگرگوں کر دی تھی۔ اُنہوں نے دل کی گہرائیوں سے اُٹھتے ہوئے طوفان پر قابو پانے کی کوشش لیکن آنسوؤں کے ان شبیہ قطروں کو نہ روک سکیں جو چلوں کی اوٹ سے اندر کر آنکھوں کو نمناک کر رہے تھے۔ یہ خوشی کے آنسو تھے۔ خوشی جس کی تلاش میں شانہ بیگم نے ایک طویل مدت انتظار کیا تھا۔ ایک ایک لمحہ۔ ایک ایک پل گن گن کر گزارا تھا۔ غموں کو سینے کی اتھاہ گہرائیوں میں چھپا وقت کے ساتھ ساتھ مسکرانے کی عادت ڈال لی تھی۔ وہ ہنسی۔ وہ مسکراہٹیں بڑی کھوٹی تھیں۔ آج۔ آج وقت کی کروٹ نے ایک بار پھر انہیں سچی خوشی کے احساس سے دوچار کر دیا تھا۔ خوشی کا یہ احساس ہی تھا جو چلوں کے درمیان آنسو بن کر تھر تھرا رہا تھا۔

شانہ بیگم جس گنگا جمنی کیفیت سے دوچار تھیں اُس نے وقتی طور پر انہیں خود سے بھی بے نیاز کر دیا تھا۔ یہ بھی بھول گئیں کہ جمال احمد قریب ہی آرام کرسی پر بیٹھے اُن کی ایک ایک حرکات و سکنات کا مطالعہ کر رہے تھے۔ پھر اچانک انہیں شوہر کی موجودگی کا احساس ہوا تو یوں چونک اُٹھیں جیسے حسین خواب درمیان سے ٹوٹ گیا ہو۔ جلدی سے آنکھوں کے نمناک گوشوں کو خشک کرتی اندازہ کے لئے قدم بڑھا دیئے مگر جمال احمد کی نرم مگر خوش آواز کانوں سے ٹکرائی تو وہ یکنخت رک گئیں۔

”سنئے۔“ شوہر کی آواز اُن کے وجود میں صدائے بازگشت بن کر گونج رہی تھی۔

”جی۔“

”میرے قریب آئیں۔“

شانہ بیگم خود کو سنبھالتی شوہر کے قریب جا کر بیٹھ گئیں۔

”کس کا فون تھا؟“ جمال احمد نے بڑی اپنائیت سے دریافت کیا۔

”شاملہ کا۔“ وہ بولیں۔ ”شار بھائی اور فوز بہ خاتون ہفتے کو کراچی پہنچ رہے ہیں۔“

”یہ تو خوشی کی خبر ہے۔ آپ ملول کیوں ہو گئیں؟“

”مجھے اپنے منصور کی خوشیوں کا خیال آ گیا۔“ شانہ بیگم نے پہلو بدل کر جذباتی انداز میں کہا۔ اور احمر کی بات سنی ہو جائے تو میں بھی اپنے دل کے ارمانوں کی تکمیل کی خاطر شاملہ کو مجبور کروں گی۔

”آپ شاید بھول رہی ہیں کہ منصور اور نادیر کے سلسلے میں کیا شرط طے پائی ہے۔“

”خوب یاد ہے۔ لیکن ہم ممکن کی رسم تو کر سکتے ہیں۔“ شانہ بیگم بولیں۔ ”دیپ سے جلائے جاتے ہیں۔“

”کیا آپ کو شاد اور احمر کی بات سنی ہو جانے کی خوشی نہیں ہوگی۔“

”شاملہ کوئی غیر تو نہیں۔ اُس کی خوشی میری خوشی ہے۔ آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں بہن خوشی پر مسرت کا اظہار نہیں کروں گی۔“ شانہ بیگم نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”اولاد تو ہر حال

ہوتی ہے، اپنی ہو یا غیر کی۔ اور۔۔۔۔۔ یوں بھی شاید مجھے منصور سے کم عزیز نہیں۔ خدا سلامت ہے۔ بڑی ذہین، بے حد نیک اور بہت لطیف طبیعت کی مالک ہے، جس گھر میں بیاہ کر جائے۔۔۔۔۔ اُجالا کر دے گی۔“

”نثار صاحب کہاں قیام کریں گے؟“ جمال احمد نے دریافت کیا۔

”میری کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ جب وقار بھائی کی اتنی بڑی کوٹھی موجود ہے تو وہ کہیں اور کیوں جائے؟“

”اگر بھی ساتھ آ رہا ہے۔“

”اُن شاملہ نے تو یہی بتایا ہے۔“

”ایک صورت میں نثار صاحب کا وقار بھائی کے گھر قیام کرنا کچھ مناسب نہیں لگتا۔“

”کیوں؟“

”بات سمجھنے کی کوشش کیجئے۔۔۔۔۔ رشتے ناتوں کی بات بڑی نازک ہوتی ہے۔ ان آہنیوں کی بڑبڑک ذرا نہیں لگنے سے ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں۔“ جمال احمد سنجیدگی سے بولے۔

”اُسے آپ کی خوشیاں اور شاملہ کی سرسرتیں ہمیشہ قائم رہیں لیکن ہمیں تصویر کے دوسرے رخ کو بھی اُنہیں کرنا چاہئے۔“

”ہم آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔“ شانہ بیگم نے شوہر کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”اگر آپ کو سوچئے۔۔۔۔۔ خدا نخواستہ اگر احمر ارشاد کی بات طے نہ ہو سکی تو کیا ہوگا۔“

”شانہ بیگم نے شوہر کی بات سنی تو جیسے اُن پر سکتہ طاری ہو گیا، ایک لمحہ کو گنگا جمنی ہو کر رہ گئیں، ذہن دل دوسوے بیدار ہونے لگے، دل کی دھڑکنوں میں طوفان کی شدتیں سر اُبھارنے لگیں، اُن کے نیچے اندھیرا سا پھیلنے لگا۔

”فارا آزرہہ خاطر نہ ہوں۔“ جمال احمد نے بیوی کے چہرے کی بدلتی رنگت کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے محض ایک امکانی بات کہی تھی۔۔۔۔۔ دراصل میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ اگر نثار رشتے کی بات طے کرنے کی غرض سے آ رہے ہیں تو انہیں وقار صاحب کے گھر نہیں ٹھہرنا۔“

”میرا غریب خانہ حاضر ہے، وہ لوگ یہاں بھی قیام کر سکتے ہیں۔“

”پہلے تو ایک بات کہہ کر دیا اور اب کس اطمینان سے میری بات کے فرائض انجام دینے کی بات کر رہے ہیں۔“

”اُن کی خوشیاں، ہمارے غم الگ الگ تو نہیں۔“ جمال احمد کے لہجے میں سمندر کی وسعتیں پنہاں تھیں۔ ”کیا آپ مجھے کوئی ایسا لمحہ یاد دلا سکتی ہیں جب میں نے آپ کی شخصیت کو اپنی ذات سے الگ کیا ہو؟“

”ناسات کا تعلق دل و دماغ سے ہوتا ہے اور دلوں کا عہد خدا ہی بہتر جانتا ہے۔“ شانہ بیگم نے

”لہذا نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”بائیں سے بھجوں کہ آپ میری کسی کوتاہی کا گلہ کر رہی ہیں؟“ جمال احمد یکنخت سنجیدہ ہو گئے۔

”نثار کی کر رہی تھی اور آپ نے دل پراثر لے لیا۔“

”اواس لئے کہ ہمارے دل کی دھڑکنیں بھی مشترک ہیں۔“ جمال احمد نے بیوی کی آنکھوں

میں آنکھیں ڈال کر قدرے جذباتی انداز میں کہا۔ ”مجھے بھی اتنی ہی عزیز ہے جتنی آپ کو۔ بات میرے اختیار کی ہوتی تو میں منصور کے لئے نادیہ کی بجائے ثناء کا انتخاب کرتا۔“

”لیکن آپ نے بھی اس خواہش کا اظہار نہیں کیا.....؟“ ثناء بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

”کیا جواب دوں آپ کی بات کا؟“ جمال احمد آہستہ سے بولے۔ ”مجھے اس خوبصورت شعر یاد آ گیا۔“

یہ بھی ہماری سوچ کا تصور ہے
سنائے کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔“

”آپ فلسفی ہیں اس لئے زندگی کی تمام گتھیوں کو فٹنے کی روشنی میں حل کر لیتے ہیں۔ لیکن ”زندگی بذات خود بھی ایک فلسفہ ہے..... آپ زندگی کو کائنات کا ننچڑ بھی کہہ سکتی ہیں اور کائنات کے اندر موجود ہر دوسروں کی نگاہوں سے ہمیشہ مخفی تو نہیں رہ سکتی۔“

”آپ..... کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟“

”صرف اتنا احساس دلانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ میں آپ کے وجود کا ایک اٹوٹ اٹا آپ کی ذات سے کبھی دور نہیں ہو سکتا۔“

ثناء بیگم نے شوہر کو ٹٹولتی نظروں سے دیکھا، کچھ کہنا چاہتی تھیں لیکن بات دل کی دل ہی منصور کے آجانے سے ماحول کا رنگ بدل گیا۔

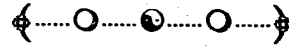
”مما..... بڑی زور کی بھوک لگ رہی ہے، پلیز! جلدی سے کچھ کھانے کو لا دیں۔“

ثناء بیگم جلدی سے اٹھیں، باورچی خانے کی طرف جانے لگیں تو منصور نے بڑے پیا بڑھ کر اپنی ہانہوں میں سمیٹ لیا، لاڈ سے بولا۔ ”مما..... پو آگر ریٹ..... ویری گریٹ.....“

ثناء بیگم نے بھی متا کے جذبوں سے مغلوب ہو کر منصور کو پوری شدت سے اپنی ہانہوں لیا، دیوانہ وار اُس کی پیشانی اور گالوں کو چومنے لگیں، پھر اُن کی آنکھیں بے اختیار بند

سادن کے بھرے بادلوں کی طرح جو ٹوٹ کر برسنے کو بے تاب تھے۔

اور..... جمال احمد بیوی کی چھلکتی آنکھوں کا منظر بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔



سہیلیوں کے ساتھ وہ ہنستی بولتی کالج سے باہر آئی تو خلاف توقع منصور کی کار کو سامنے دیکھ کر ٹھٹھک کر ایک لمحے کو اُس کی آنکھوں کی تمام شوخیاں ماند پڑ گئیں، دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں، منصور اور دونوں ایک ہی شہر میں بہت عرصے سے رہتے تھے لیکن آج سے پچتر بھی منصور اُسے کالج سے پک نے نہیں آئے تھے۔ پھر..... آج کیا بات تھی.....؟

نادیہ کے معصوم ذہن میں دوسو سے جاگ اُٹھے، وہ منصور کی طبیعت سے، بخوبی واقف تھی، منصور کا شمار باڈرن لڑکوں میں نہیں کیا جا سکتا تھا جو کسی لڑکی کی جانب سے محض ایک نگاہ کرم کے انتظار میں لڑکیوں کالج کے بھاگ کے سامنے یا بس سٹاپ کے قریب گھنٹوں کھڑے ٹھنڈی آہیں بھرنے کے عادی تے ہیں اور جھڑکیاں کھانے کے باوجود ڈھیٹ بنے رہتے ہیں۔ منصور تو عام لڑکوں سے بہت بلند، بت سادہ مگر پڑ وقار شخصیت کے مالک تھے۔ نادیہ سے منسوب ہونے کے باوجود اُنہوں نے کبھی یہ کی ان حدود کو پھلانگنے کی کوشش نہیں کی جو شرافت اور بدنامی کے درمیان حد فاصل بھی جانی۔ ایک دوسرے کے عزیز ہونے کے سبب اُن کے درمیان آپس میں ملنے جلنے میں کوئی روک ٹوک نہیں تھی، وہ جب ملتے، بر ملا ملتے۔ لیکن اُن کے درمیان جو گفتگو ہوتی وہ بے حد شستہ ہوتی، اشاروں اور ہانہوں میں وہ ایک دوسرے سے دل کی بات بھی کہہ جاتے تھے مگر اُنہوں نے بھی اپنے جذبات میں وہ اُلی نہیں آنے دی جو پھر کر طوفان کی شدت اختیار کر لے تو معصوم اور پاکیزہ خوابوں کو ایک ہی ریلے اُپکار بہت دور لے جاتی ہے اور شرافت اور تہذیب کی دھجیاں تار تار کر دیتی ہے۔ وہ اپنے خیالوں میں گم تھی کہ ایک بے تکلف سہیلی نے ٹوکا..... ”یہ ہنستے بولتے تمہیں اچانک بریک ل لگ گیا؟“

”خدا خواستہ کہیں نگاہوں کا تصادم تو نہیں ہو گیا؟“ دوسری بولی۔

”کیا بات ہے نادیہ..... تم کس سوچ میں گم ہو؟“ تیسری سہیلی نے اُسے کریدنے کی کوشش کی۔

نادیہ نے سہیلیوں کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بدستور منصور کی خلاف توقع آمد کے بارے میں کہتی رہی۔ لیکن جب بے تکلف اور ہم جماعت لڑکیوں کی شوخیاں بڑھنے لگیں تو وہ چپ نہ رہ سکی، ہانہ لہجے میں بولی۔ ”آج کوئی ہمیں لینے آیا ہے۔“

”ج..... یہ پتھر میں جو تک کب کی.....؟“

”کون ہے وہ خوش نصیب.....؟“

”کوئی اتنا چٹا ہمیں بھی تو بتاؤ..... کون ہے، کہاں رہتا ہے..... اور کیا کرتا ہے.....؟“

”اُس کا نام کیا ہے.....؟“

”ہاں بار ملاقات کہاں ہوئی اور یہ کہ گفتگو کا آغاز کس کی جانب سے ہوا؟“

”میرا خیال ہے نادیہ ہمیں بتانے کی کوشش کر رہی ہے۔“ افشاں بولی۔ ”ورنہ کہاں یہ اور کہاں

”اوہ.....!“ نادبہ نے منصور کو غور سے دیکھا پھر کچھ سوچ کر مسکرائے گی۔
 کچھ دیر تک ایک خوشگوار سی خاموشی طاری رہی، منصور نظریں سڑک پر جمائے ڈرائیو کرنے میں محو
 لیکن اُن کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ نادبہ سے کچھ کہنا چاہتے تھے۔
 نادبہ نے ایک دو بار نکھیوں سے منصور کی جانب دیکھا، وہ سمجھ رہی تھی کہ منصور اُس سے کوئی خاص
 کرنا چاہتے ہیں ورنہ یوں اُسے کالج لینے بھی نہ آتے۔ ایک بار اُس کے دل میں آئی کہ منصور کی
 ہا آسان کر دے، وہ بات دریافت کر لے جسے کہنے کی خاطر منصور خود کو تیار کرنے میں مصروف تھے
 اُس نے پہل نہیں کی۔ چپ چاپ بیٹھی منصور کی کیفیت پر دل ہی دل میں مسکرائی رہی۔ اُسے
 کی خاموشی بھی بہت خوبصورت اور حسین نظر آرہی تھی۔ وہ منصور کو چور نظروں سے نکتی رہی۔
 جانے کیا بات تھی جسے کہتے ہوئے منصور کو چپکلیا ہٹ محسوس ہو رہی تھی..... کیسی خوشگوار تھی وہ ابھمن
 نے منصور کے چہرے پر رگوں کی کیفیت پیدا کر رکھی تھی..... بھی یلکھت اُن کی نگاہوں میں مسرت کی
 لیا چھوٹے لگتیں۔ پھر..... دوسرے ہی لمحے سوچ کی کوئی لہر اُن کے چہرے پر سنجیدگی بن کر طاری
 لی..... آنکھوں میں غور و فکر کے تاثرات مچنے لگتے۔
 کچھ لمحے یونہی خاموشی سے گزر گئے۔ پھر ایک بار منصور نے تیزی سے محسوس کر دیکھا تو نادبہ اپنی بے
 کا محرم قائم نہ رکھ سکی، نگاہوں کا تصادم ہوا تو وہ بھی اپنی جگہ گڑبڑا کر رہ گئی، کچھ اور نہ بن پڑا تو
 باسے پوچھ بیٹھی۔ ”آپ شاید مجھ سے کچھ کہنا چاہ رہے ہیں؟“
 ”شکریہ.....“ منصور نے اطمینان کا سانس لیا۔
 ”شکریہ کس بات کا؟“
 ”آپ نے میری مشکل آسان کر دی.....“
 ”میں بھی نہیں.....؟“ نادبہ نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔
 ”آپ کا قیاس درست ہے۔“ منصور آہستہ سے بولے۔ ”مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“
 ”فرمائیے، میں بہت گوش ہوں۔“ اُس نے منصور کے لیے میں تنجک محسوس کی تو دوبارہ شیر بن گئی۔
 ”میں سوچ رہا ہوں کہ بات کا آغاز کہاں سے کر دوں؟“
 ”کیا کوئی اہم مسئلہ درپیش ہے؟“
 ”بات اتنی زیادہ اہم بھی نہیں لیکن ڈرتا ہوں کہ اگر آپ نے مجھے غلط سمجھ لیا تو میں خود اپنی نگاہوں
 کی گرجاؤں گا۔“ منصور بہت زیادہ سنجیدہ ہو گئے۔
 ”میرا خیال ہے کہ مسئلوں کو پریشانی سے حل نہیں کیا جاسکتا۔“ اُس نے بڑے سلجھے ہوئے انداز
 با پھر شکایت آمیز لہجے میں بولی۔ ”اور..... آپ نے قبل از وقت یہ اندازہ کیسے قائم کر لیا کہ میں
 سے ناراض ہو جاؤں گی؟“
 منصور نے نظریں گھما کر نادبہ کو دیکھا، کچھ لمحے خاموش رہے پھر بولے۔ ”مجھے یاد آیا..... آپ نے
 بار کہا تھا کہ ذہنوں میں مطابقت اور ہم آہنگی ہو تو زندگی بڑی خوشگوار ہو جاتی ہے۔“
 ”خدا کا شکر ہے..... کہ آپ کو یہ بات جلدی یاد آ گئی۔“ وہ منصور کی مصیبت پر مسکرا دی۔
 ”ایک وعدہ کریں گی آپ.....؟“
 ”کیا.....؟“
 ”اگر آپ کو میری بات ناگوار نہ گزرے تو دل میں نہ رکھئے گا۔“

”تم نہ مانو لیکن یہ حقیقت ہے۔“ نادبہ کے ہونٹوں پر ایک شوخ اور شریسی مسکراہٹ ابھر ائی۔
 ”آج ایک خوبصورت سی گاڑی ہمارے استقبال کے لئے منتظر ہے۔“
 ”کہاں ہے.....؟“ افشاں کے ساتھ دو تین لمبی جلی آوازیں ابھریں۔
 ”وہ رہی سامنے..... وہ سفید رنگ کی کار جو کہنے سے ذرا آگے کھڑی ہے۔“
 لڑکیوں کی نظریں اُس کار پر جم گئیں جس میں منصور بیٹھے تھے اُن ہی کی سمت دیکھ رہے تھے۔
 ”لڑکا تو خاصا سمارٹ نظر آ رہا ہے۔“
 ”رنگ و روپ اور ناک نقشہ بھی واجبی ہے۔“
 ”عمر بھی کچھ زیادہ نہیں لگ رہی۔“
 ”لیکن نیت کا اندازہ معلوم ہوتا ہے۔“ ایک لڑکی نے شوخی سے کہا۔ ”ہماری طرف یوں گھور کر دیکھ
 رہا ہے جیسے آج سے پتھر لڑکی نام کی کوئی شے نہ دیکھی ہو۔“
 ”اے..... خبردار!“ نادبہ نے مصیبت خفگی کا اظہار کیا۔ ”نیت کے بارے میں کوئی غلط بات کی تو
 سے برا کوئی نہ ہوگا۔“
 ”میں نے تو کوئی غلط بات نہیں کی..... سب ہی گواہ ہیں کہ موصوف پلکیں جھپکائے بغیر اسی طرز
 تکلی بائندھے دیکھ رہے ہیں۔“
 ”نام کیا ہے ان ذات شریف کا؟“ افشاں نے رازداری سے دریافت کیا۔
 ”بری بات.....“ نادبہ نے بزرگوں کے انداز میں افشاں کو تنبیہ کی۔ ”تا بالغ بچیاں اس قسم
 باتیں نہیں پوچھا کرتیں۔“
 ”کیا ارادے ہیں.....؟“ ایک شریر لڑکی نے پوچھا۔ ”تم سڑک پار کر کے دوسرے کنارے پہنچو“
 ”یا اُسے ادھر بلا لیا جائے؟“
 ”وہ اتنی دُور آئے ہیں تو اصولاً مجھے بھی کچھ قدم آگے بڑھ لینے چاہئیں۔“
 ”پھر دیر کس بات کی؟“ افشاں بولی۔ ”بسم اللہ کرو، ورنہ بیچارہ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے سوکھ جائے گا۔“
 ”شکریہ..... میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔“ نادبہ نے سہیلیوں پر ایک مسکرائی نگاہ ڈالی پھر آہستہ
 آہستہ قدم اٹھاتی سڑک عبور کرنے لگی، منصور نے اُسے قریب آتے دیکھا تو جلدی سے گاڑی سے
 آگیا، دوسری سمت کا دروازہ کھول کر نادبہ کو فخریہ انداز میں دیکھنے لگے۔ نادبہ نے قریب آ کر منصور
 ایک نظر دیکھا پھر کچھ کہے سے بغیر اگلی نشست پر بیٹھ گئی، منصور دروازہ بند کر کے اپنی نشست پر آگئے
 گاڑی کالج کے سامنے سے دُور نکل آئی تو نادبہ نے منصور کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔
 ”خیریت تو ہے..... میرا مطلب ہے کہ آپ آج.....؟“
 ”مجھے یقین تھا کہ آپ اس قسم کا کوئی سوال ضرور کریں گی۔“ منصور نے مسکراتے ہوئے جواب دیا
 ”کوئی بات خلاف توقع اور اچانک ہو تو تشویش ہونا قدرتی امر ہے۔“
 ”آپ کو میری جہارت پر کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟“
 ”تبدیلیاں اگر خوشگوار ہوں تو ذہن پر کوئی بوجھ مرتب نہیں کرتیں۔“
 ”بڑی خوبصورت بات کہی آپ نے۔“
 ”پہلے یہ بتائیے کہ کھر پر تو سب خیریت ہے؟“ نادبہ نے اپنے اگلیان کی خاطر دریافت کیا۔
 ”پریشانی کی کوئی بات ہوتی تو میں اپنی گاڑی کالج گیٹ کے سامنے کھڑی کرتا۔“

کے لہجے میں شکایت کی آمیزش بھی تھی۔
 ”خدا گواہ ہے کہ میں نے اپنے دل کے کسی گوشے میں کبھی کسی وہم کو داخل ہونے کی اجازت نہیں
 دیا۔ جس انداز میں سوچ رہی ہیں اُس میں میرے ارادے کو کوئی دخل نہیں۔“

”پھر آپ خالہ جان کی وکالت کیوں کر رہے ہیں؟“
 ”کالت نہیں۔۔۔ صرف ایک بات آپ کے گوش گزار کر رہا ہوں۔“ منصور نے رُک رُک کر ٹھوس
 مہیا کہا۔ ”یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ میں اُن کی سگی اولاد نہیں لیکن خدا گواہ ہے کہ مانا نے مجھے
 اس بات کا احساس نہیں ہونے دیا کہ میں ماں کے سائے سے محروم ہوں۔۔۔ میں یقین سے نہیں
 مانا لیکن میرا خیال ہے کہ اگر ماما کی اپنی کوئی اولاد ہوتی تو بھی شاید وہ مجھے ایک لمحہ ایک پل کو بھی
 تانے سے محروم نہ ہونے دیتیں۔۔۔ مجھے یاد ہے کہ ماما نے میری خاطر کیا کچھ قربانیاں دی ہیں۔۔۔ اپنا
 اپنا پیٹنا اور سکھ سب کچھ قربان کر دیا۔۔۔ آج میں زندگی کے جس مقام پر پورے اعتماد سے کھڑا
 اس میں ماما کی دعاؤں کے علاوہ اُن کی تعلیم و تربیت کا بھی دخل ہے۔ مجھے اس بات کا اندازہ بھی
 برا بڑی حساس طبیعت کی مالک ہیں۔۔۔ شاید اس لئے کہ قدرت نے اُن کو سگی اولاد کی نعمت سے
 رکھا ہے۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ ماضی کی کئی یادوں اور تجربات نے ماما کو بے حد حساس بنا دیا ہو۔۔۔ لیکن
 نہ ہے کہ اگر اُن کے احساسات کو نہیں پہنچی تو وہ اندر سے ٹوٹ کر بکھر جائیں گی۔۔۔ ریزہ ریزہ ہو
 گی۔۔۔ میں نے اکثر ماما کو بے حد اُداس اور کھویا کھویا سا محسوس کیا ہے۔ لیکن آج تک اس اُداسی
 پانہ جان رکھا۔۔۔ میں نے کریدنے کی کوشش بھی نہیں کی۔۔۔ اس خیال سے کہ اگر ماضی کے زخم
 ہوئے تو ماما کی ذات کو اور اذیت ہوگی۔۔۔ یہ میرا فرض ہے کہ ماما کو خوش رکھوں۔۔۔ اگر میری وجہ
 بھی کوئی صدمہ یا کوئی دکھ لاحق ہوا تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہ کر سکوں گا۔۔۔ کچھ رشتے
 نازک اور حساس ہوتے ہیں۔۔۔ سطح آب پر اُبھرنے والے ان خوبصورت اور دل فریب بلبلوں کی
 فربے حد حسین نظر آتے ہیں لیکن ہوا کا ایک تیز جھونکا۔۔۔ ٹھہرے ہوئے پانی کا ایک ذرا سا
 مانگی اُن کے وجود کو مٹا دیتا ہے۔۔۔ میں نہیں چاہتا کہ ماما کے احساسات کو کوئی ٹھیس پہنچے۔۔۔ میں
 ہڈیوں کی صداقت کی کوئی قیمت ادا نہیں کر سکتا لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اگر ماما کی خوشیوں کی
 گامیری جان کی بھی ضرورت پیش آئی تو میں دریغ نہیں کروں گا۔۔۔“

اب بڑی توجہ سے منصور کی باتیں سنتی رہی۔۔۔ منصور کی باتوں میں سچائی تھی، خلوص تھا۔۔۔ بندگی
 و فخر غرضی یا بناوٹ کو کوئی دخل نہیں تھا۔۔۔ وہ منصور کے جذبات کو محسوس کر رہی تھی، منصور نے
 مکمل کی تو اُس نے آہستہ سے پوچھا۔ ”آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟“

”میں آپ کو کسی بات کے لئے مجبور نہیں کروں گا لیکن۔۔۔“ منصور کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئے۔
 ”کیا کیا؟“ اُس نے بڑی اِپنائیت سے سوال کیا۔

”اگر آپ ایک ماں کی خوشیوں کی خاطر اُس کی جھولی میں سرتوں کے کچھ پھول ڈال سکیں تو میں
 احسان مند رہوں گا۔“

”کے شرط میری بھی ہوگی۔۔۔“ اُس نے منصور کو پیار سے دیکھا۔
 ”آپ کی ہر شرط منظور ہے۔“ منصور نے جلدی سے کہا۔

”پہلے سچے دل سے وعدہ کیجئے۔“

”اگر آپ کوئی بات ہے تو میں دروغ نہیں کروں گا۔“

”اگر آپ کوئی بات ہے تو میں دروغ نہیں کروں گا۔“

”اگر آپ کوئی بات ہے تو میں دروغ نہیں کروں گا۔“

”اگر آپ کوئی بات ہے تو میں دروغ نہیں کروں گا۔“

”بات کیا ہے آخر۔۔۔؟“ وہ جھلا گئی۔ ”آپ تو معہ حل کرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔“
 ”سنا ہے ٹارا نکل اور اُن کے گھر والے آرہے ہیں؟“

”جی ہاں۔۔۔“ نادیہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”احمر بھائی اور اُن کے والدین
 پرسوں کی فلائٹ سے پہنچ رہے ہیں لیکن۔۔۔“

”مما بتا رہی تھیں کہ ٹارا نکل اس بار ایک خاص مقصد کی خاطر آرہے ہیں۔“
 ”آئی سی۔۔۔“ نادیہ نے طویل سانس لیا۔ ”اب بھی کہ آپ کو کیا فکر ستا رہی ہے۔“

”کیا؟“

”یہی کہ وہم کا علاج حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔“ نادیہ نے کہا پھر منصور کے چہرے پر طار
 سنجیدگی کو پیار بھری نظروں سے گھورتے ہوئے بولی۔ ”آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ گھر میں
 کچھری پک رہی ہے وہ آپ اور احمر بھائی کے سلسلے میں ہے اس لئے آپ کو اپنی صحت پر۔۔۔“

”آپ کا اندازہ غلط ہے۔“ منصور جلدی سے پوئے۔ ”جہاں جذبے صادق ہوں وہاں مایوسی
 اندیشے زیادہ ثابت قدم نہیں ہوتے۔ اور یوں بھی پریشانی میں کسی صلے کی تمنا بڑی محبوب سی بات ہے۔“

”کیا آپ کو کوئی کاروباری اُجھن درپیش ہے؟“ نادیہ دوبارہ سنجیدہ ہو گئی۔

”جی نہیں۔۔۔ ایسی بھی کوئی بات نہیں۔“

”پھر۔۔۔ اور کیا بات ہو سکتی ہے؟“

”اس بات کا تعلق میری ذات سے زیادہ ماما کی ایک معصوم خواہش سے ہے۔“ منصور نے د
 زبان میں کہا۔

”میں اب بھی نہیں سمجھی۔۔۔؟“

”مما کا اندازہ ہے کہ اگر خدا کو منظور ہوا تو ٹارا نکل اپنی واپسی سے پہلے احمر اور شاہجی کی منگی
 رسم ضرور ادا کریں گے۔“

”ہو سکتا ہے خالہ جان کا خیال درست ہو۔ لیکن آپی ڈاکٹر بننے سے پیشتر شادی پر کبھی رضامند
 ہوں گی۔“

”ہونا بھی نہیں چاہئے۔۔۔ آپ کی بہن جو ہیں۔“ منصور نے شوفی سے کہا تو نادیہ کے چہرے پر
 کی سرخی دوڑ گئی۔

”کوئی اعتراض ہے جناب کو؟“ وہ منصور کو گھورتے ہوئے بولی۔ ”کیا تعلیم مکمل کرنے سے ڈ
 عملی زندگی میں قدم رکھنا آپ کے نزدیک مناسب بات ہے؟“

”ہرگز نہیں۔۔۔“

”پھر آپ نے بہن ہونے کا طعنہ کیوں دیا؟“

”آپ کو اُکسانے کی خاطر۔“

”کیا مطلب۔۔۔؟“

”بات بڑی مختصر سی ہے بشرطیکہ آپ کی سمجھ میں آجائے۔“ منصور نے کہا۔ ”جس طرح ٹارا
 اپنی خوشیوں کی ضمانت کے لئے منگی کی رسم ادا کرنا چاہیں گے اسی طرح ماما بھی اپنی ممتا کی ایک
 سی خواہش کی تکمیل کے بارے میں سوچ رہی ہیں۔“

”کیا؟۔۔۔ آپ کو میرے اُپر اعتماد نہیں؟“ نادیہ نے نظریں جھکا کر دبی زبان میں سرگوشی
 کی۔

”آپ آئندہ کبھی اس طرح عاجزی اور ہنساری سے کام نہیں لیں گے۔“
منصور نے تیزی سے گھوم کر دیکھا، نادیر کی غزالی آنکھوں میں لازوال محبت کی خوشیاں دکھ رہی تھیں۔
”گویا آپ نے میری درخواست قبول کر لی.....؟“ منصور نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔
”جی ہاں..... آپ بھی کیا یاد کریں گے کس رئیس زادی سے پالا پڑا ہے۔“
”اگر اجازت ہو تو ایک درخواست اور پیش کروں؟“
”فرمائیے..... اگر درخواست قابل قبول ہوئی تو اس پر بھی غور کیا جاسکتا ہے۔“
”جی نہیں.....“ نادیر نے شوخی سے گھورتے ہوئے ٹھوس آواز میں جواب دیا۔ ”وہ فیصلہ اس کے لیے ہے۔“

”اور اگر میں آپ کو راجیل کی قسم رکھاؤں تو.....؟“ منصور کے لہجے میں شرارت تھی۔
”ایسی صورت میں دو اور دو چار سال بھی ہو سکتے ہیں۔“
”سوری.....“ منصور نے جلدی سے خوف زدہ انداز میں کان کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔
میں ایک غلط بات منہ سے نکل گئی تھی۔“

”آئندہ احتیاط لازم ہے.....“ نادیر نے مسکرا کر جواب دیا پھر بھاگتے ہوئے نظاروں کو دیکھ
منصور بدستور نادیر کے چہرے پر پھوٹنے والی شفقت کو دالہانہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔
○○○
شاملہ بیگم، باورچی کو آنے والے مہمانوں کے سلسلے میں خاص ہدایتیں دے رہی تھیں، شاملہ کے ساتھ ساتھ ان کی بوکھلاہٹ کو پیار بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ مہمانوں کی آمد کے سلسلے میں اہتمام مکمل ہو چکے تھے۔ ایک ایک چیز کو نوک پلک سے درست کیا جا چکا تھا لیکن شاملہ بیگم مطمئن نہیں تھیں۔ گھر کے تمام ملازموں کو سختی سے تاکید کی گئی تھی کہ اگر مہمانوں کی آؤ بھگت مدارات میں ذرا بھی کمی آئی تو انہیں کھڑے گھاٹ ملازمت سے برطرف کر دیا جائے گا۔ خانسماں کو ہدایت کی جارہی تھی کہ وہ فیض تیار کرنے کے سلسلے میں نمک مرچ کا خاص خیال رہے۔ باورچی سے فراغت پا کر وہ باہر نکلیں تو شاملہ نے یونہی ایک شوشہ چھوڑ دیا۔ ”امی جان..... باا کام تو پورے ہو گئے۔ بس ایک اہم فریضہ باقی رہ گیا ہے۔“

”وہ کیا.....؟“ شاملہ بیگم نے ٹٹا کو یوں چونک کر دیکھا جیسے واقعی ان سے کوئی بھول ہو گئی ہو۔
”شوہر.....“ شاملہ نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولی۔ ”اُسے اور تاکید کر دیجئے کہ وقت کی پابندی خیال رکھے۔ یہ نہ ہو کہ وہاں سب مہمان ایئر پورٹ پر گاڑی کے منتظر ہوں اور ڈرائیور صاحب غائب۔“
”مجال ہے اُس کی؟“ شاملہ بیگم بولیں، پھر سوچ کر کہا۔ ”تمہارے والد بھی تو ساتھ ہوں۔“
”وہ تو اپنی گاڑی پر ہوں گے۔“

”تو کیا ہوا..... دونوں گاڑیاں ایک ساتھ گھر سے روانہ ہوں گی..... دفتر کی دین بھی؟ تاکہ سامان آسانی سے آسکے، تم ذرا اپنے باپ کو فون کر کے دین کے لئے یاد دلا دو!“
”میں ابھی فون کئے دیتی ہوں۔ لیکن آپ ڈرائیور کو پھر بھی تاکید کر دیں..... کہیں ایسا نہ عین وقت پر کوئی بہانہ تراش کر چھٹی کی درخواست پیش کر دے۔“

”وہ تو میں کر دوں گی۔ لیکن تم بھی ذرا مہمانوں کا خیال رکھنا۔“ شاملہ بیگم نے ٹٹا کو شفقت سے کہا۔
”فوزیہ بہن دل کی بری نہیں ہیں لیکن اگر کوئی بات بری لگ جائے تو آپ محسوس کرتی ہیں۔“
”مطلق پریشان نہ ہوں، میں کسی کو شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔“
”بات کا خاص خیال رکھنا!“
”کیا.....؟“

”بیک ٹائر بھائی اور فوزیہ بہن یہاں مقیم رہیں تم احمر کے ساتھ زیادہ گھٹنے ملنے سے احتراز برتنا!“
”میں کیا مصلحت ہے؟“ ٹٹا نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔
”فوزیہ بہن لڑکوں کے زیادہ میل جول کے خلاف ہیں۔“
”لیکن احمر تو گھر کے ایک فرد ہیں اور ان سے تو سب ہی بے تکلف ہیں پھر.....“
”تو مجھے کسی کو شش کر دو!“ شاملہ بیگم نے کہا۔ ”اس بار فوزیہ بہن ایک خاص مقصد سے آرہی ہیں۔“
”یادہ نیر دبی سے نکل مکانی کے بارے میں غور کر رہی ہیں؟“
”بات کی زیادہ کرید بھی مناسب نہیں ہوتی..... بس کہہ جو دیا کہ تم احمر سے دور دور رہنا۔“
”بچہ کہنا چاہتی تھی لیکن شرم مانع تھی اس لئے نہایت سعادت مندی سے سرکوشاںات میں جنبش دے لی رہی، شاملہ بیگم نے اپنے کمرے کی سمت قدم بڑھائے تو فرحان بھاگتا ہوا سامنے آ گیا۔
”رحان.....“ شاملہ بیگم نے فرحان کو تنبیہ کی۔ ”تم اپنی اچھل کود اور دوڑ دھوپ سے باز نہیں آؤ۔“
”ساتنے بیٹے بھی نہیں ہو کہ وقت اور موقع مل کو نہ کچھ سکوا، اگر تم نے مہمانوں کے سامنے بھی.....“
”نہ اپنا سبق از بر ہے۔“ فرحان نے شوخی سے جواب دیا پھر ان ہدایات کو بڑی معصومیت سے فر نے لگا جو ماں کی طرف سے جاری ہوئی تھیں..... ”جب تک تایا جان اور تائی جان یہاں مقیم انہم کی شوخی یا شرارت کا مظاہرہ نہ کرنا، بات بات پر صائمہ سے اُلجھ کر دنگا فساد کرنے کی کوشش سب کی موجودگی میں نیک، سعادت مند اور شریف بچوں کی طرح خود کو لئے دیئے رہنا.....“
”نیر جوابی اور شرارت سے بھی پرہیز کرنا، احمر میاں کے ساتھ بہت زیادہ بے تکلفی سے پیش نہ آنا اور پرتائی اماں کا بہت زیادہ خیال رکھنا..... بات بات پر بڑھائی کے معاملے میں بھی سنجی، کی حماقت نہ کرنا اور تائی اماں کو بھی اس بات کا موقع نہ دینا کہ وہ تمہیں کسی بات پر ٹوکیں یا کی شرارت سے بد دل ہوں اور.....“

”بس.....“ شاملہ بیگم نے فرحان کو منع کرتے ہوئے کہا۔ ”سن لیا تمہارا سبق، ابھی تو سب ہے لیکن مہمانوں کے آنے کے بعد بھی یاد رکھنے کی ضرورت ہے۔“
”بات مجھے بھی پوچھنی ہے آپ سے۔“ فرحان سنجیدگی سے بولا۔
”کیا.....؟“

”بات کی اماں کا تعلق بھی حاتم طائی کے خاندان سے ہے؟“
”دع کر دی تم نے اپنی شرارت؟“
”عان.....!“ ٹٹا نے مسکراتے ہوئے بھائی سے کہا۔ ”بری بات ہے..... بڑوں کے ساتھ ایسا کرتے۔“
”لن جانے کے لئے پلٹا لیکن پھر دوبارہ گھومتے ہوئے ماں سے کہا۔ ”ارے ہاں، میں آپ کو یہ تھا کہ راجیل بھائی کی امی تشریف لائی ہیں، میں نے انہیں ڈرائنگ روم میں بیٹھا دیا ہے۔“

”راجیل ہے انکیسی میں یا کہیں گیا ہوا ہے؟“ شائلہ بیگم نے سپاٹ لہجے میں دریافت کیا۔
”راجیل بھائی کچھ دیر پہلے ہی گئے ہیں۔“ فرحان نے بتایا۔

”ٹھیک ہے..... تم چلو، میں جلدی درست کر کے آتی ہوں۔“ فرحان چلا گیا تو شائلہ خاتون جلدی قدم اٹھائی اپنے کمرے میں لگیں اور منہ ہاتھ دھو کر تیار ہونے لگیں۔ لیکن اُن کے چہرے تاثرات اس بات کی چھٹی کھا رہے تھے کہ وہ سمیرا خاتون کی آمد سے خوش نہیں ہیں۔ یوں بھی اس سمیرا خاتون کا قیام عام حالات کے بارے میں کچھ زیادہ طول پکڑتا جا رہا تھا۔

شائلہ بیگم نے جب سے اپنے والدین کی زبانی اقبال احمد کی گرفتاری کی اطلاع سنی تھی اور اس بات کا علم ہوا تھا کہ نوشاہہ اقبال احمد کی سوتیلی بیٹی ہے، وہ اپنی جگہ بہت زیادہ محتاط ہو گئی تھیں، علی اور فرزانہ بیگم نے انہیں یہی مشورہ دیا تھا کہ سمیرا خاتون سے زیادہ راہ ورسم نہ رکھی جائے اور اگر طرح راجیل کے قیام و طعام کا پند و بست بھی کہیں اور ہو جائے تو مناسب ہوگا۔

نوشاہہ اور سمیرا خاتون کے تعلق کے علاوہ شائلہ بیگم کو اس بات کا خطرہ بھی لاحق تھا کہ کہیں خاتون ثانیہ نادیہ کے لئے راجیل کے رشتے کی بات نہ شروع کر دیں، انہیں یہ بات بھی منظور نہیں کہ سمیرا خاتون اور فوزیہ خاتون ایک دوسرے سے ملیں اور کوئی ریشہ دوانی کی صورت پیدا ہو۔

اس وقت بھی شائلہ بیگم انہی پریشان خیالات میں اُبھی ہوئی تھیں لیکن جب انہوں نے ڈراما روم میں قدم رکھا تو مجبوراً سمیرا خاتون سے بے حد تپاک سے ملیں، حالات اور وقت کا تقاضا بھی یہ کہ کوئی ایسی صورت اختیار کی جائے کہ سانپ بھی مر جائے اور لالھی بھی نہ ٹوٹنے پائے چنانچہ شائلہ نے خود کو بے حد سنبھال رکھا تھا۔

”مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو ناوقت زحمت دی لیکن ایک ایسا مسئلہ درپیش ہے جس نے بے حد الجھا رکھا ہے۔“ سمیرا خاتون نے رسمی گفتگو کے بعد کہا۔

”کمال کرتی ہیں آپ..... بھلا آپ کے آجانے سے مجھے کیا زحمت ہوگی؟ آپ جب چاہیں وقت چاہیں تشریف لائیں مجھے خوشی ہوگی۔“

”میں آپ سے ایک خاص معاملے میں کچھ مشورہ چاہتی ہوں۔“ سمیرا خاتون نے سنجیدگی سے کہا۔
”فرمائیے..... اگر میں آپ کے کسی کام آسکی تو یہ میری خوش قسمتی ہوگی۔“

”ایک درخواست ہے میری..... میرے اور آپ کے درمیان جو گفتگو ہو اُس کا علم کم از کم راجا نہیں ہونا چاہئے۔“

”آپ مجھ پر اعتماد کر سکتی ہیں۔“ شائلہ بیگم نے رازداری کا عہد کرتے ہوئے کہا۔
”کرٹل عابد اور نادرہ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟“ سمیرا خاتون نے دریافت کیا

اپنے جیلے کی مزید وضاحت کرتے ہوئے بولیں۔ ”میں یہ سوال آپ سے ایک اولاد کی ماں کی حیثیت سے کر رہی ہوں اس لئے مجھے اُمید ہے کہ آپ نہایت خلوص دل اور صاف گوئی سے کام لیں گی۔“

”میرا خیال ہے کہ میں نادرہ کے سلسلے میں آپ کو پہلے بھی اپنی ناقص رائے سے آگاہ کر ہوں۔ رہا کرٹل عابد صاحب کا معاملہ تو میں اُن کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی، یہی سنا ہے کہ لوگ ہیں اور سکون سے زندگی گزار رہے ہیں۔“

”میں مل چکی ہوں کرٹل عابد سے۔“
”پھر تو آپ نے بھی اُن کے بارے میں کوئی نہ کوئی اندازہ ضرور لگایا ہوگا؟“

سمیرا خاتون نے کوئی جواب نہیں دیا، ایک لمحہ خاموش رہیں پھر پہلو بدل کر بولیں۔ ”خاص طور پر اُن کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟“

”میں آپ کے سوال کی نوعیت نہیں سمجھ سکی۔“ شائلہ بیگم نے محتاط لہجے میں کہا۔ ”بظاہر تو مجھے نادرہ کی کوئی بات نظر نہیں آتی جو میں اس کا ذکر کر سکوں..... رہا دل کا بھید تو وہ سوائے خدا کے اور کون جانتا ہے؟ البتہ نادیہ کا خیال ہے کہ نادرہ ہر اعتبار سے.....“

”کیا آپ راجیل کے سلسلے میں.....“
”یہ میرا نہیں صرف راجیل کا ارادہ ہے۔“ سمیرا خاتون نے تیزی سے کہا۔ ”اُن کے لہجے کی خشکی انہوں کے تاثرات اس بات کی ترجمانی کر رہے تھے کہ نادرہ کے بارے میں اُن کی ذاتی رائے زیادہ اچھی نہیں ہے۔“

”آپ راجیل کی ماں ہیں..... اُس کے اچھے برے کو مجھ سے زیادہ بہتر سمجھ سکتی ہیں، رہا نادرہ کا لڑو میرے خیال میں اُس کی پرورش آزاد ماحول میں ضرور ہوئی ہے لیکن وہ بے داغ کردار کی ہے۔“

”میں آپ کی رائے سے اتفاق کرتی ہوں لیکن تھوڑی دیر کے لئے فرض کر لیجئے کہ راجیل میرا نہیں پکارتا ہے تو کیا آپ نادرہ کو بحیثیت بہو کے اپنے گھر میں قبول کرنے کو آمادہ ہو جائیں گی؟“

سمیرا خاتون کا سوال اس قدر اچانک اور پیچیدہ تھا کہ شائلہ بیگم اپنی جگہ ہٹا کر رہ گئیں، کچھ سوچ کر ل۔ ”مجھے بھی والدین کو اولاد کی پسند اور ناپسند کے سامنے جھلنا ہی پڑتا ہے۔“

”میں نے نادرہ کے بارے میں دریافت کیا تھا.....“ سمیرا خاتون کی آواز میں سمندر کی گہرائی

نڈکی۔
”وہ ماڈرن تہذیب کی پروردہ ایک آزاد خیال لڑکی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ بے حد مہذب، ماحول تعلیم یافتہ بھی ہے۔“ شائلہ بیگم نے اس بار دہی آواز میں کہا۔ ”ماں کا سانسہ سر سے اٹھ جانے کی

سے اُس کی تربیت بھی کرٹل عابد کو کرنی پڑی، اس تربیت میں اگر کوئی خامی رہ گئی ہے تو اُس کا ذمہ نادرہ کو نہیں ٹھہرایا جاسکتا..... ہوسکتا ہے کہ آپ اُسے ممتا کا پیار دیں تو وہ اپنی روش بدل لے..... خود

اُس سانچے میں سونے کی کوشش کرے جو آپ کو پسند ہے۔“
”اور اگر اس کے بعد بھی وہ اپنی روش نہ بدل سکی تو.....؟“

”یہ تو حالات پر منحصر ہے..... کل کیا ہوگا اس کے بارے میں خدا کے سوا کون جان سکتا ہے؟ اور

نپایہ کا معاملہ تو ایک قسم کا اندھا سودا ہوتا ہے۔“
”میں یہ سودا زندگی میں ایک بار پہلے بھی کر چکی ہوں۔“ سمیرا خاتون کی ماضی کی تمام تر تنخیاں اُن

آواز میں اُبھر آئیں۔ ”اُس وقت حالات کی نوعیت بالکل برعکس تھی..... زندگی کی مسرتوں سے لوتہ کرنے کی خاطر مجھے اپنے آپ کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنا پڑا..... خود کو ماڈرن تہذیب کی

پاؤں کے لئے مجبور کرنا پڑا لیکن نتیجہ کیا ظاہر ہوا..... میں زیادہ دُور تک اُن انجانے راستوں پر

پہنچ سکی کہ میری مسرتوں کے ساتھ قدم ملا کر نہ چل سکی..... اُن پیچیدہ راستوں نے میری روح..... میری مسرتوں

کی اپنی تہذیب کو اس بے دردی سے روندنا، کچلا اور منہج کیا کہ میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی.....
میں نے خاردار راہوں پر گری تو لہو لہان ہو گئی..... زخموں کی وہ اذیت ناک ٹیسیں جو کل میرا مقدر

میں بیٹھی سنتی رہیں پھر کچھ سوچ کر بولیں۔ ”کل میرے جیٹھ اور جیٹھانی ایک طویل عرصے کے لیے لارہے ہیں۔۔۔۔۔ آپ نے راجیل سے احمر کے بارے میں تو ضرور سنا ہوگا۔“
 ”ہاں۔۔۔۔۔ احمر کا نام میں متعدد بار سن چکی ہوں۔“
 ”ابا بار میرے جیٹھ احمر ہی کے سلسلے میں تشریف لایا ہے ہیں۔“ شائلہ بیگم نے مسکرا کر کہا۔
 ”کوئی خاص بات۔۔۔۔۔؟“ سمیرا خاتون نے قدرے خش سے دریافت کیا۔
 ”احمر دشا کی بات بہت دنوں سے چل رہی ہے۔ ہو سکتا ہے اس بار منگنی کی رسم بھی ادا ہو جائے۔“
 ”بہت سعادت مند اور سلیقہ شعار بچی ہے۔۔۔۔۔ خدا اُس کے نصیب اچھے کرے۔“
 ”آمین۔۔۔۔۔“ شائلہ بیگم نے جلدی سے آئین کہا پھر کچھ توقف سے بولیں۔ ”دشا کی بات کچی ہو زیادہ کا سلسلہ بھی آگے بڑھے۔“

”ابا کے سلسلے میں آپ نے کیا سوچا ہے؟“ سمیرا خاتون نے دلچسپی کا اظہار کیا۔
 ”سوچنا کیا ہے۔۔۔۔۔ آیا جان تو اُسے پہلے ہی منصور کے لئے مانگ چکی ہیں۔“ شائلہ بیگم نے موقع لہا اٹھاتے ہوئے جلدی سے کہا۔ ”جمال بھائی نے تو منصور کی منگنی کی اگوٹھی بھی میرے پاس اتنا جمع کر رکھی ہے۔“

”بارک ہو آپ کو۔۔۔۔۔“ سمیرا خاتون نے اس بار کی انداز میں مبارکباد دی۔ ”نادیہ اور منصور کے لیے بات سن کر اُن کے دل کو دھچکا سا لگا اس لئے آنکھوں میں ابھرنے والی اُمید کی کرن بھی باندھ کر۔۔۔۔۔“ شائلہ بیگم نے سمیرا خاتون کی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے کہا، پھر بولیں۔ ”آپ کیا کر رہی ہیں، شربت، چائے یا کافی؟“
 ”الٹال کچھ بھی نہیں۔“

”معاذی جانتی ہوں۔۔۔۔۔ مصروفیت کی وجہ سے مجھے دھیان ہی نہ آیا کہ آپ سے۔۔۔۔۔“
 ”کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دوبارہ آؤں گی تو آج کا حساب بھی برابر کر دوں گی۔“
 ”آپ ہی کا گھر ہے۔ جب چاہیں بڑے شوق سے۔۔۔۔۔ سر آنکھوں پر تشریف لائیں۔“
 ”سمیرا خاتون نے کوئی جواب نہیں دیا۔۔۔۔۔ جانے کے ارادے سے اُنھیں تو شائلہ بیگم نے کہا۔ ”ایسی اہل دی۔۔۔۔۔ کچھ دیر تو تشریف رکھئے، دشا کے والد بھی بس آنے والے ہوں گے۔“

”وقت اجازت چاہتی ہوں۔ دو چار روز میں وقت ملا تو دوبارہ چکر لگاؤں گی۔“ سمیرا خاتون نے پھر کچھ توقف سے بولیں۔ ”یہ بھی ممکن ہے کہ ایک دو روز میں واپسی کا پروگرام بھی بن جائے۔“
 ”اگر بیگم سمیرا خاتون کو رخصت کرنے کی خاطر باہر تک آئیں۔ پھر جب راجیل اُنہیں لے کر ہوٹل کے محلے گئے تو شائلہ بیگم نے اطمینان کا سانس لیا جیسے اُن کے ذہن سے کوئی بوجھ اتر گیا ہو۔ اس وقت وہ بہت ہلکا چھکا محسوس کر رہی تھیں۔۔۔۔۔“

”دوسری جانب سمیرا خاتون گاڑی کی پچھلی نشست سے ٹیک لگائے بیٹھی بڑی سنجیدگی سے مستقبل کے بارے میں سوچ میں متفرق تھیں، نادرہ سے راجیل کی دلچسپی ختم کرنے کی خاطر اس نے بھی سوچا تھا کہ جتنی جلد ممکن ہو راجیل کو کسی دوسری لڑکی کے ساتھ منسوب کر دیا جائے، اس کے لیے حد پسند تھی۔ اسی غرض سے وہ بڑی اُمیدیں لے کر شائلہ بیگم کے پاس گئی تھیں لیکن جب نادرہ نادیہ دونوں کے رشتوں کا علم ہوا تو وہ خالی بے نیل مرام واپس لوٹ آئیں۔

میں سلگ رہی ہیں، میں اُنہیں ہوائیں دینا چاہتی۔۔۔۔۔“
 ”مجھے افسوس ہے کہ وقت نے آپ کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔“ شائلہ بیگم نے ہمدردی کا اظہار کر کے وہی کہانی جو میری زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہے ایک بار پھر۔۔۔۔۔ ایک نئے انداز میں میری زندگی میں سر اٹھانے کے لئے پرتول رہی ہے۔“ سمیرا خاتون نے غلاء میں گھورتے ہوئے کہا۔ ”راجیل میری زندگی کا آخری سرمایہ ہے، میری محرومیوں کی زندہ مثال ہے، ایک ماں کی خوشیوں کی بچی کچی بچی ہے۔ میں اُسے داد پر نہیں لگا سکتی کہ جینے کا آخری سہارا بھی اگر مجھ سے چھین گیا تو میں۔۔۔۔۔“ سمیرا خاتون اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر نچلا ہونٹ کاٹنے لگیں، اُن کی آنکھوں میں زندگی کی ناکام حسرتیں چل رہی تھیں، چہرے پر گھبراہٹ کے اندھیروں کے مہیب اور تاریک سائے منڈلا رہے تھے، پلکوں کے گوشوں پر آنسوؤں کے شبنمی قطرے گزر رہے تھے۔

”شائلہ بیگم بھی ماں تھیں، سمیرا خاتون کی حالت دیکھ کر اُن کی آنکھیں بھی بھر آئیں، دل مسوں کر بولیں۔ ”کیا راجیل نے آپ کو اپنی پسند سے آگاہ کر دیا ہے؟“
 ”نہیں۔۔۔۔۔“ سمیرا خاتون نے خود کو سنھالا۔ ”لیکن میں اُس کی ماں ہوں، میں نادرہ کی جانب اس کا جھکاؤ بڑی شدت سے محسوس کر رہی ہوں، مگر یہ رشتہ مجھے پسند نہیں۔“
 ”آپ راجیل کو سمجھا سکتی ہیں، میرا خیال ہے کہ وہ آپ کی بات رد نہیں کرے گا۔“

”مجھے یقین ہے کہ اگر میں اُس کے اور نادرہ کے درمیان چٹان بن کر کھڑی ہو جاؤں تو وہ مجھے پھلانگنے کی جسارت نہیں کرے گا، مجھے اپنی تربیت پر کوئی شک و شبہ نہیں، میرا دل گواہی دیتا ہے کہ میری زبان سے نکلا ہوا انکار کا لفظ سننے کے بعد راجیل خاموش ہو جائے گا، مجھ سے ضد کرنے یا بغاوت پر کم بستہ ہونے کی جرات نہیں کرے گا لیکن۔۔۔۔۔ خاموشی بھی ایک طوفان ہوتی ہے جس میں آتش فشاں کا تباہ کاریاں پوشیدہ ہوتی ہیں اور میں۔۔۔۔۔ راجیل کو کسی طوفان سے ہم آہنگ کرنا نہیں چاہتی۔۔۔۔۔“
 ”مجھے بے بسی کا شکار بنا دیا ہے۔“

”پھر۔۔۔۔۔ آپ نے کیا سوچا ہے؟“
 ”آپ چاہیں تو راجیل کی زندگی سنو سکتی ہے۔“
 ”میں۔۔۔۔۔ میں بھلا کیا کر سکتی ہوں؟“ شائلہ بیگم نے سمیرا خاتون کے سوال کی گہرائی کو محسوس کیا۔
 ”لیکھت سنجیدہ ہو گئیں۔“

”بچے کے ہاتھ سے ایک کھلونا چھین لیا جائے تو اُسے بہلانے کی خاطر کوئی دوسرا کھلونا پیش کر دیتا ہے۔۔۔۔۔“ سمیرا خاتون نے شائلہ بیگم کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے دبی زبان میں کہا۔ ”آپ۔۔۔۔۔ راجیل کی پڑھائی کے سلسلے میں مجھ پر جو احسان کیا ہے میں اُسے کبھی فراموش نہیں کر سکتی، راجیل آپ سے۔۔۔۔۔ آپ کے گھر کے ماحول سے۔۔۔۔۔ اس ماحول میں پروردہ چہروں سے بہت مانوس ہو گیا ہے۔“
 ”آپ اگر اُس کے سر پر ہاتھ رکھنا گوارا کر لیں تو۔۔۔۔۔“

”شائلہ بیگم کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں، وہ خدشہ جو اُنہیں راجیل کے سلسلے میں لاحق تھا اُن کے سامنے آ رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ کسماکسم کر رہ گئیں، سمیرا خاتون ایک ماں کی متناگاہیوں میں سوئے جواب منتظر تھیں لیکن راجیل کے آجانے سے بات ادھوری رہ گئی۔ شائلہ بیگم کو سنھیلنے کا موقع ہاتھ آ گیا۔
 راجیل کی موجودگی میں مجھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں، سمیرا خاتون نے کراچی میں ایک دفتر کے قیام کی تفصیل بتائی شروع کر دی۔ شائلہ بیگم کو نہ راجیل سے کوئی دلچسپی تھی نہ اُس کے دفتر

راستے بھر دونوں ماں بیٹے کے درمیان کوئی گفتگو نہیں ہوئی، سمیرا خاتون اپنے خیالوں میں مگن اور راحیل ماں کی خاموشی کے بارے میں غور کر رہے تھے، ثنا اور نادیر والی بات چونکہ اُن کی موت میں ہوئی تھی اس لئے وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ ماں کو اسی بات کا غم ہے۔ لیکن راحیل ماں کے برعکس ہی اندر خوش ہو رہے تھے کہ ثنا اور نادیر کا معاملہ از خود منٹ گیا۔

ہوٹل پہنچنے کے بعد بھی راحیل نے موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے ماں سے زیادہ بات چ کر نامناسب نہیں سمجھی، ماں کی باتوں کا ”ہوں، ہاں“ میں جواب دیتے رہے۔ لیکن واپسی کے ارادے سے اُسے تو سمیرا خاتون نے انہیں روک لیا، کچھ دیر تک بیٹے کو پڑ خیال انداز میں مکتی رہیں، بولیں۔ ”میرا ارادہ تھا کہ تمہاری کامیابی کے جشن کے بعد کچھ دنوں کے لئے تمہارے ساتھ کی پڑ مقام پر چلوں گی لیکن کراچی میں نئی شاخ کھولنے کے سلسلے میں جو مصروفیت رہی اس کے چلن پروگرام ملتوی کرنا پڑا اور اب میں فوری طور پر لاہور واپسی کے بارے میں غور کر رہی ہوں۔“

”پہلے تو آپ کا ارادہ یہاں مزید قیام کا تھا۔“ راحیل نے چونکتے ہوئے کہا۔ ”اس قدر اچھا جانے کا خیال کیسے آگیا؟“

”مجھے لاہور پہنچ کر کچھ ضروری کاروباری مسئلے سلجھانے ہیں۔“

”دوبارہ کب آنے کا ارادہ ہے؟“

”اب کراچی کی برائچ قائم ہوگئی ہے اس لئے آنا جانا لگا رہے گا۔“ سمیرا خاتون نے کہا۔

”میرے لئے کیا حکم ہے؟“ راحیل نے تھوڑے توقف کے بعد پوچھا۔ ”اگر آپ اجازت دیں تو میں وقار انکل کے گھر سے منتقل ہو کر اُس بنگلے میں شفٹ ہو جاؤں جہاں اُنس قائم ہوا ہے؟“

”کوئی خاص مصلحت؟“ سمیرا خاتون نے بیٹے کو ٹوٹتی نظروں سے دیکھا۔

”وقار انکل کے مہمان آرہے ہیں۔ اس کے علاوہ قریب رہ کر میں کاروباری معاملات کی بہتر طور پر دیکھ بھال کر سکوں گا۔“

”کیا شائلہ بیگم نے تم سے اس ضمن میں کوئی بات کی تھی؟“

”جی نہیں۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔۔ تم اگر مناسب سمجھتے ہو تو اپنے بنگلے میں شفٹ ہو جاؤ۔ لیکن ایک بات کا خیال رہے، تم کسی حالت میں بھی اپنی پڑھائی کی طرف سے غافل نہیں رہو گے۔ کاروباری معاملات کی دیکھ بھال کے لئے میں لاہور پہنچنے ہی کسی مناسب اور پرانے ملازم کو تمہاری مدد کے لئے روانہ کر دوں گی۔“

”آپ مطمئن رہیں۔۔۔۔۔۔“ راحیل نے بڑی سعادت مندی کا مظاہرہ کیا۔ ”میں اپنی سٹڈیز کا پورا خیال رکھوں گا۔“

”تعلیم کا حصول تمہاری زندگی کے لئے سب سے اہم ہے، اس کے بغیر تم زندگی کے کسی شعبے مضبوطی سے قدم نہیں جما سکتے۔“

”کراچی آکر مجھے اس کا احساس ہو گیا ہے۔“

”خدا تمہارے اس احساس کو برقرار رکھے۔“

”آپ کی دُعائیں شامل حال رہیں تو میں بی بی، اے بھی فرسٹ ڈویژن میں کروں گا۔“

”انشاء اللہ۔۔۔۔۔۔“ سمیرا خاتون نے صدقِ دل سے بیٹے کو دُعا دی۔ ”اگر تم ثابت قدم رہو۔“

”آپ مطمئن رہیں۔۔۔۔۔۔“ راحیل نے بڑی سعادت مندی کا مظاہرہ کیا۔ ”میں اپنی سٹڈیز کا پورا خیال رکھوں گا۔“

”تعلیم کا حصول تمہاری زندگی کے لئے سب سے اہم ہے، اس کے بغیر تم زندگی کے کسی شعبے مضبوطی سے قدم نہیں جما سکتے۔“

”کراچی آکر مجھے اس کا احساس ہو گیا ہے۔“

”خدا تمہارے اس احساس کو برقرار رکھے۔“

”آپ کی دُعائیں شامل حال رہیں تو میں بی بی، اے بھی فرسٹ ڈویژن میں کروں گا۔“

”انشاء اللہ۔۔۔۔۔۔“ سمیرا خاتون نے صدقِ دل سے بیٹے کو دُعا دی۔ ”اگر تم ثابت قدم رہو۔“

”آپ مطمئن رہیں۔۔۔۔۔۔“ راحیل نے بڑی سعادت مندی کا مظاہرہ کیا۔ ”میں اپنی سٹڈیز کا پورا خیال رکھوں گا۔“

”تعلیم کا حصول تمہاری زندگی کے لئے سب سے اہم ہے، اس کے بغیر تم زندگی کے کسی شعبے مضبوطی سے قدم نہیں جما سکتے۔“

”کراچی آکر مجھے اس کا احساس ہو گیا ہے۔“

”خدا تمہارے اس احساس کو برقرار رکھے۔“

”آپ کی دُعائیں شامل حال رہیں تو میں بی بی، اے بھی فرسٹ ڈویژن میں کروں گا۔“

”انشاء اللہ۔۔۔۔۔۔“ سمیرا خاتون نے صدقِ دل سے بیٹے کو دُعا دی۔ ”اگر تم ثابت قدم رہو۔“

ماؤں کے آنے کی سب سے زیادہ خوشی فرحان کو تھی اور اُس کی وجہ امر کی ذات تھی جو فرحان ہمیشہ سے بہت زیادہ بے تکلف تھے۔ جب تک کراچی میں رہتے فرحان کو ساتھ ساتھ رکھتے۔ فرحان اور امر نیروبی سے اپنے ہمراہ ڈیڑھ سارے کھلونے اور قیمتی تحائف بھی لائے تھے۔ بار فرحان اور صائمہ نے قبضہ جمالیا اور قیمتی تحفے فوزیہ خاتون نے اپنے ہاتھوں سے تمام بچوں کو دیے، ثار احمد چونکہ ہیروں کے تاجر تھے اس لئے فوزیہ خاتون نادیہ اور ثناء کے لئے بہت ہی اعلیٰ جواہرات کے زپور لائی تھیں۔

بیکہ وقار احمد کے گھر میں ہر وقت گہما گہمی کا سماں رہتا، ثار احمد اور فوزیہ خاتون کی آمد کی اطلاع روں کو بھی مل گئی تھی اس لئے ملنے کے لئے آنے والوں کا بھی تانتا بندھا رہتا، گھر کے ملازم طرح شائلہ بیگم کے اشاروں پر چلتے رہتے اور مہمانوں کی خاطر تواضع میں مصروف رہتے۔ ثناء کام میں ماں کا ہاتھ بٹاتی لیکن وہ اپنی بڑھائی کی طرف سے بھی غافل نہیں تھی، دن بھر ماں کی باتیں شریک رہتی اور رات دیر تک بڑھائی میں مصروف رہتی..... البتہ اُسے ایک بات کا مال تھا کہ امر کو آئے تین دن ہو چکے تھے لیکن ابھی تک امر نے اُس سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ دُور دُور گھومتی، نگاہوں نگاہوں میں پرستش کرتی اور جب یہ خیال آتا کہ کہیں کوئی اُس کی پرستش کو سمجھ نہ دیکھ رہا ہو تو آپ ہی آپ گھبرا جاتی..... جلدی سے نظریں جھکا کر کسی کام میں مصروف ہو جاتی تھی۔ کوئی شکوہ یا شکایت نہیں تھی اس لئے کہ وہ گھر کے ہنگاموں کی صورت حال دیکھ رہی تھی۔ گھر میں بھی کہ امر کو کبھی ماں کی موجودگی کا خیال ہے۔ یہی وجہ ہے جو وہ دیدہ دانستہ دُور دُور گھومتی تھی۔

جان کے علاوہ صائمہ اور نادیہ بھی امر کے ساتھ بے تکلفی سے پیش آتے۔ کبھی شانہ بیگم منصور اور نادیہ کے ساتھ آ جاتیں تو افراد کی نفری مختلف ٹولیوں میں بٹ جاتی، اس وقت بھی کچھ ایسا ہی سماں تھا، وقار احمد اور پروفیسر جمال کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھے گفتگو میں مگن تھے، لاؤنج کے ٹیبل میں شائلہ بیگم، فوزیہ خاتون اور شانہ بیگم کے ہمراہ بیٹھی باتیں کر رہی تھیں، اُن لوگوں سے باقی صائمہ پر منصور، امر، فرحان، صائمہ اور نادیہ کی ٹولی بیٹھی لڈو کھیل رہی تھی اور ثناء کے حکم کے ہمراہوں کے لئے چائے کا اہتمام کرنے میں مصروف تھی۔

وکیل کے کھیل میں بھی امر اور فرحان اس طرح پارٹنر بنے تھے کہ ایک بار فرحان پانسہ پھینکے تو دوسری صائمہ، نادیہ اور منصور علیحدہ علیحدہ تھے۔ فرحان حسب معمول اس وقت بھی اپنی شوخی اور باتیں مصروف تھا لیکن ایک بار جب اُس نے دوسروں کی نظریں بچا کر اپنی گوٹ کھسکا کر محفوظ پارٹی تو نادیہ نے اُس کی حرکت تاڑ لی اور چپ نہ رہ سکی۔ ”فرحان کے بچے..... تم اپنی حرکتوں کیوں آؤ گے؟“ اُس نے بھائی کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”گوٹ کیوں کھسکا کی تم نے؟“ آپ کو وہم ہوا ہے.....“ فرحان نے بڑی ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔ ”میں نے تو گوٹ کو ہاتھ بھی لگایا۔“

”گھومت.....“ نادیہ جھلا کر بولی۔ ”چلو، واپس رکھو اسے اپنی جگہ..... میں نے پہلے ہی حساب لگا کر اگر پانچ آیا تو تمہاری ایک گوٹ پٹ کر واپس گھر میں چلی جائے گی۔“

”تو کوئی بات نہ ہوئی۔“ فرحان نے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا۔ ”آپ کا حساب غلط بھی ہو سکتا ہے۔“

”نآؤ صائمہ.....“ نادیہ نے بہن سے پوچھا۔ ”کیا تم نے فرحان کو گوٹ ہٹاتے نہیں دیکھا؟“

زمین پر آ رہتے ہیں۔“ راجیل نے ماں کی بات کا جواب نہیں دیا، خاموش بیٹھے جوتے کی ٹوکری قائلین کو کریدتے رہے۔ ”کیا کہیں میری نصیحت ناگوار گزری ہے.....؟“

”میں کوشش کروں گا کہ آپ کے تجربوں کی روشنی میں آگے بڑھنے کی کوشش کروں۔“ راجیل ساٹ لہجے میں بولے۔

”نادرہ کے کردار کے بارے میں مجھے کوئی شک و شبہ نہیں لیکن.....“

”آپ کا واپسی کے بارے میں کیا ارادہ ہے؟“ راجیل نے ماں کی بات کا نٹے ہوئے کہا۔

”میں ایک روز اور رزکنا چاہتی ہوں۔“ سمیرا خاتون نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے..... میں پرسوں کے جہاز سے آپ کی سیٹ بک کرائے دیتا ہوں۔“

”تم نے نادرہ کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار نہیں کیا.....؟“

”آپ مطمئن رہیں..... میں آنکھ بند کر کے کسی راستے پر سرپٹ بھاگنے کی حماقت نہیں کروں! سوچ سمجھ کر ہی کوئی قدم اٹھاؤں گا۔“

راجیل کے ذمہ جیسا کہ سمیرا خاتون کو چونکا دیا، انہوں نے نظر بھر کر غور سے بیٹے کو دیکر ایک لمحے کو انہیں یوں محسوس ہوا جیسے راجیل کی جگہ افتخار بیٹھا ہو..... افتخار..... جس نے قدم قدم پر خاتون کی انا کوٹھیں پہنچائی تھی..... جس نے تیس کروڑ صورت فریب دیئے تھے..... زندگی کے کسی موڑ پر دوپل کے لئے بھی اُن کا ہم خیال بننے کی کوشش نہیں کی..... مر گیا تو سمیرا خاتون کے وجود میں یادوں کے زہر گھول گیا..... ایسے گہرے اور کاری زخم چھوڑ گیا جس کی ششیں آج بھی رہ رہ کر اُنہیں..... راجیل بھی افتخار کا خون تھا..... ”تو کیا وہ بھی باپ کے نقش قدم پر چلے گا.....؟“

ماضی کی تلخ یادوں نے اتنی شدت سے سر اُبھارا کہ سمیرا خاتون کی پلکوں کے نیچے گہب اندر پھیلنے لگے، اُن کا سر چکرانے لگا..... پھر اگر راجیل نے تیزی سے اُٹھ کر انہیں اپنی بانہوں کا سہارا ہوتا تو شاید وہ غش کھا کر گر ہی گئی ہوتیں.....!!



مہمانوں کے آ جانے سے جیسے وقار احمد کے گھر میں عید آگئی ہو۔ دونوں بھائی خاصی طویل مد کے بعد ملے تھے اس لئے جب بھی گفتگو کرنے بیٹھے گھٹنوں لگا دیئے۔ دنیا جہان کے موضوع پر بات چیت ہوتی اور ایک دوسرے کے احوال دریافت کئے جاتے۔ ثار احمد چھوٹے بھائی کی کاروباری بوجھ سے خاصے متاثر ہوئے اور انہیں بہت سارے مفید مشوروں سے بھی نوازا۔

فوزیہ خاتون اور شائلہ بیگم میں بھی بہنوں جیسا پیار تھا اس لئے وہ دونوں بھی جب ایک دوسرے کے سامنے آتیں لپک کر بغل گیر ہو جاتیں۔ اور جب باتیں کرنے بیٹھتیں تو کسی بات کا ہوش نہ رہتا البتہ گفتگو کے دوران شائلہ بیگم کو بس ایک ہی فکر رہتی کہ فوزیہ خاتون کب امر اور ثناء کی بات چیت میں؟ انہیں نیروبی سے آئے تین روز ہو گئے تھے لیکن ابھی تک انہوں نے امر کے رشتے کی بات چیت چھیڑی تھی۔ قدرت کی کاری گری بھی عجیب ہوتی ہے ایک طرف شائلہ بیگم کو ثناء کے رشتے کی فکر تھی دوسری جانب فوزیہ خاتون کو اپنے کھرے سونے پر بہت گھمنڈ تھا، انہیں یقین تھا کہ وہ جب بھی ثناء کے رشتے کی بات نکالیں گی شائلہ بیگم اُسے خوش خوشی سے منظور کر لیں گی۔ اس کے علاوہ فوزیہ خاتون بھی نادیہ اور ثناء کو کبھی آنکھوں آنکھوں میں پرکھ رہی تھیں، انہوں نے اپنے دل میں امر کے سلسلے فیصلہ کر رکھا تھا وہ اپنی جگہ اٹل تھا لیکن اس کے باوجود ابھی تک وہ حرف مدعا زبان تک نہیں لائی تھی۔

”آپ بتائیں منصور بھائی!“ صائمہ کے جواب دینے سے پہلے فرحان نے منصور کو مخاطب کیا آپ نے مجھے بے ایمانی کرتے دیکھا ہے؟“

”اس بار واقعی میں نے کچھ نہیں دیکھا۔“ منصور نے اس بار پر زور دیا تو صائمہ جھنجھکی اٹھی۔

”سنا آپ نے منصور بھائی کیا کہہ رہے ہیں۔ مطلب یہ کہ فرحان پہلے بھی گوئیں ادھر رہا ہے۔“

”احمر بھائی۔۔۔۔۔“ نادیا نے احمر کو شکایت بھری نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو تم جھوٹ بولیں یا فرحان کی حمایت لیں، سچ سچ بتائیے کہ فرحان نے بے ایمانی کی ہے یا نہیں؟“

”سوری۔۔۔۔۔“ احمر نے شوخی سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں چونکہ فرحان کا پارٹنر ہوں لے اس کی مخالفت میں گواہی نہیں دے سکتا۔“

”گویا آپ بھی فرحان کے ساتھ شریک ہیں؟“

”پارٹنر کے معنی ہی سامھی یا شریک کے ہوتے ہیں۔“ احمر بدستور مسکراتے رہے۔

”اور آپ۔۔۔۔۔؟“ نادیا نے اس بار منصور سے شکوہ کیا۔ ”آپ بھی سچ نہیں بولیں گے؟“

”میں سچ کہتا ہوں کہ اس بار میں نے فرحان کی کوئی حرکت نہیں دیکھی، البتہ کچھ دیر پہلے میں نے نہایت صفائی اور خوبصورتی سے آپ کی ایک گوٹ کو اٹھا کر واپس اندر رکھ دیا تھا۔“

”جلدی سے اپنی جان چھڑانے کے لئے صاف گوئی سے جواب دیا۔“

”سچ۔۔۔۔۔؟“ ابھی تو میں سوچ رہی تھی کہ میری چار گوئیں باہر تھیں، ایک اندر کیسے چلی گئی؟

”نفس سے فرحان کی طرف دیکھا۔“ اب بتاؤ! تم نے بے ایمانی کی ہے یا نہیں؟“

”کھیل میں اس قسم کی چھوٹی موٹی شرارتیں جائز ہوتی ہیں۔“ فرحان معصومیت سے بولا۔

”میں نے اسی لئے پہلے ہی کہا تھا کہ احمر بھائی اور فرحان کو پارٹنر نہ بننے دیا جائے۔“ صائمہ منہ بنا کر کہا۔ ”سارے کھیل کا مزہ خراب کر دیا۔“

”آپ کے لئے کیا فرق پڑ گیا؟“ فرحان نے تیزی سے کہا۔ ”آپ کی دو گوئیں تو ابھی کے اندر پڑی سوکھ رہی ہیں۔“

”اس میں بھی تمہاری کسی شرارت کو دخل ہوگا۔“ صائمہ چڑ کر بولی۔

”واہ۔۔۔۔۔ یہ بھی ایک رسی۔۔۔۔۔ کھیل خود کو نہیں آتا اور ذمہ دار مجھے ٹھہرایا جا رہا ہے۔“

”اس لئے کہ تم ہر کھیل میں اپنی دھاندلی کا مظاہرہ جو کرتے ہو۔“ نادیا نے فرحان کو ٹوکا۔

”بری بات ہے باجی۔۔۔۔۔ آپ کو احمر بھائی کو ایسا نہیں کہنا چاہئے۔“ فرحان نے سنجیدگی سے کہا۔

”بکومت۔۔۔۔۔ میں احمر بھائی کو نہیں، تمہیں کہہ رہی ہوں۔“

”ایک ہی بات ہے۔۔۔۔۔“ فرحان نے دلیل پیش کی۔ ”ہم دونوں چونکہ پارٹنر ہیں اس لئے میں برابر کے شریک ہیں۔“

”کھیل جاری رکھنے کے سلسلے میں کیا ارادہ ہے؟“ منصور نے دبی زبان میں پوچھا۔

”میں نہیں کھیتی فرحان کے ساتھ۔“ نادیا نے جھلا کر کہا اور اس کے ساتھ ہی تمام کھیل بڑ تیزی سے جانے کے لئے اٹھی تو شائلے بیگم نے آواز دے کر کہا۔ ”نادیا۔۔۔۔۔ یہ کیا حماقت ہے؟“

”امی۔۔۔۔۔ یہ فرحان ہر کھیل میں ہمیشہ بے ایمانی کرتا ہے۔“ نادیا نے فوزیہ خاتون کے خیا بے حد ضبط کرتے ہوئے احتجاج کیا۔

”تم اُسے پیار سے بھی سمجھا سکتی ہو۔“

”فرحان میاں۔۔۔۔۔؟“ فوزیہ خاتون نے پیار سے فرحان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”تم شرارت کر رہی۔۔۔۔۔؟“

”اب ہی بتائیے بڑی اماں۔۔۔۔۔ کیا دشمن کے حملے سے خود کو محفوظ رکھنا بے ایمانی میں شمار ہوگا؟“

”فوزیہ خاتون کے قریب آتے ہوئے بڑی معصومیت سے کہا۔“ میں نے اپنی گوٹ کو پٹنے کی خاطر محفوظ خانے میں رکھ دیا۔“ قسم لے لیجئے جو اس کے علاوہ کوئی اور حرکت کی ہو۔“

”اور یہ بھی تو بتاؤ! کہ اس سے پہلے تم نے باجی کی ایک گوٹ پر ہاتھ کی صفائی بھی دکھائی تھی۔“

”نہیں کی؟“

”نہیں کی صفائی بھی صحت کے زریں اصولوں میں شامل ہے، کیوں احمر بھائی! میں نے کوئی غلط نہیں کی؟“

”احمر نے فرحان کا ساتھ دیا۔“

”اب کی بے جا حمایت ہی نے اسے سر چڑھا رکھا ہے۔“ نادیا بولی۔

”بیگم نے نادیا کو سنجیدگی سے گھورا تو وہ خاموشی سے سر جھکا کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

”اور احمر اٹھ کر کرسیوں پر آگئے۔ صائمہ نے نادیا کو جاتے دیکھا تو وہ خود بھی فرحان کو گھورتے نظر چلی گئی۔“

”اگر نے ٹھیک ہی کہا تھا۔“ فوزیہ خاتون نے فرحان کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”تم واقعی جانتے ہو۔“

”احمر بھائی سے اسی لئے پیار ہے کہ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔“ فرحان نے اتنی معصومیت سے اپنی تعریف کی تصدیق کی کہ فوزیہ خاتون کے علاوہ شائلے بیگم بھی بے اختیار مسکرا دیں۔

”ایک ٹرائل لئے اندر آتی تو سب چائے پینے میں مصروف ہو گئے، چائے کے بعد فرحان نے احمر کے ہاتھوں کھیلنے کی پیشکش کی تو تینوں نے اٹھ لان میں چلے گئے، شائلے کے برتن سمیٹ لئے تو فوزیہ خاتون بڑے لاڈ سے بولیں۔“

”کیوں زحمت کر رہی ہو۔۔۔۔۔؟ ملازم کو آواز دے کر بلا لو، وہ ٹرائل واپس لے جائے گا۔“

”اب میں زحمت کی کیا بات ہے؟“ شائلے بیگم نے جلدی سے کہا۔ ”اگر بچیاں آپ کی خدمت نہ کرتی تو اور کون کرے گا؟“

”تو فرحان کی لیاقت ہے لیکن میں جب سے آئی ہوں یہی دیکھ رہی ہوں کہ شاعر وقت کسی نہ کسی شاعری لکھ رہی ہے۔“

”بیگم نے فوزیہ خاتون کی زبان سے شاکہ کی تعریف سنی تو دل ہی دل میں خوش ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ اشارہ کیا تو شاعر نے لب مسکراتی ٹرائل کو ہسٹری کچن کی طرف واپس چلی گئی۔

”شائلے بیگم نے اشارہ کیا تو شاعر نے شاکہ کے جانے کے بعد کہا۔“ خدا نے چاہا تو دو سال میں ڈاکٹر بن جائے گی۔“

”اب نے کیا سوچا ہے شاکہ کے بارے میں؟“ فوزیہ خاتون نے شائلے بیگم کو مخاطب کیا۔ ”کیا تعلیم دھانے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر بھیجے کا خیال ہے یا۔۔۔۔۔؟“

”اٹھو اور دقار بھائی کی موجودگی میں بھلا میں کون ہوں سوچنے والی؟“ شائلے بیگم نے کرسی پر

پہلو بدلتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ”ویسے میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ تعلیم مکمل ہونے کے بعد ٹائیکس پیل کر دیئے جائیں۔۔۔۔۔ اس کے بعد سسرال والوں کی مرضی پر منحصر ہے۔“

”یہ بھی بڑا مناسب خیال ہے۔۔۔۔۔“ فوزیہ نے تائید کی۔ ”لو لڑکیاں تو یوں بھی پرلاوا من ہیں۔۔۔۔۔ والدین کا اختیار تو اس وقت تک ہوتا ہے جب تک رخصتی کی رسم پوری نہ ہو جائے، اس بعد تو سسرال والوں کا حکم چلتا ہے۔“

قدرت کے قانون بھی بڑے نزلے ہوتے ہیں۔ ”شانہ بیگم نے لمبی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ”سچ کہا آپ نے۔۔۔۔۔“ فوزیہ خاتون بولیں۔ ”اس ٹی مرضی کے بغیر تو ایک تنکا بھی اپنی جگہ جنبش نہیں کر سکتا۔ انسان اپنے جانتے میں سب کچھ کرتا ہے لیکن مقدر کے فیصلے تو اوپر لکھے جاتے ہیں وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔“

”سب نصیب کی بات ہوئی ہے۔“ شانہ بیگم نے کہا۔ ”ہم تو بس خدا سے دعا کر سکتے ہیں لڑکیوں کے نصیب اچھے کرے۔“

”بے شک۔۔۔۔۔“ فوزیہ خاتون نے تائید کی پھر تھوڑے وقف سے کہا۔ ”اولاد کی خاطر ماں باپ کچھ نہیں کرتے۔۔۔۔۔ لیکن مستقبل میں کیا ہے یہ بجز خدا کے اور کوئی نہیں جانتا۔۔۔۔۔ ویسے ایک بات مانتی بڑے گی کہ والدین کی تربیت بھی بچوں کے مستقبل کو بنانے اور بگاڑنے میں بڑا دخل رکھتی ہے اس سلسلے میں یہ بات بھی تسلیم کرنا پڑے گی کہ تم نے اپنے بچوں کو جو تعلیم دی ہے اور جس انداز پر وہان چڑھایا ہے اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔“

”میں نے کیا کیا۔۔۔۔۔؟“ شانہ بیگم نے انکساری سے کہا۔ ”یہ تو بس خدا کی مہربانی ہے۔“

”لیکن مجھے تم سے ایک شکایت بھی ہے۔“

”وہ کیا۔۔۔۔۔؟“

”جس انداز سے تم نے شادی کی تربیت کی وہ بے مثل ہے۔“

”یہ بات تو میں بھی تسلیم کرتی ہوں۔“ شانہ بیگم نے بہن کو دالہانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے ”شانہ بیگم نے شاپر کچھ زیادہ ہی توجہ دی ہے۔“

”کیوں نہ دیتی۔۔۔۔۔ آخر وہ بھی تو میری بیٹی ہے۔“

”بیٹی تو نادیدہ بھی تمہاری ہے لیکن دونوں میں زمین و آسمان کا تضاد نظر آتا ہے۔“ فوزیہ بولیں۔ ”اگر شادی جگہ مشرقی تہذیب کا جیتا جاگتا نمونہ ہے تو نادیہ کی شادی، صاف لکڑی اور لکڑی مگر معصوم باتیں بھی دوسروں کا دل موہ لیتی ہیں۔“

”آپ نے بھی تو احمر کی تربیت میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا۔“ شانہ بیگم نے کہا۔ ”حاک۔۔۔۔۔“ فوزیہ خاتون نے پہلو بدل کر جواب دیا۔ ”میں تو جو کچھ کرتی ہوں اس پر والد بانی پھیر دیتے ہیں، کچھ اُن کے لاڈ پیار نے احمر کو بگاڑ دیا ہے اور جو کسر باقی رہ گئی وہ بھی والد نے پوری کر دی۔۔۔۔۔ نیروبی میں تو جیسے اُس کا دل ہی نہیں لگتا۔ جب دیکھو منہ اٹھائے کراچی کی بھاگنے کی فکر میں لگا رہتا ہے، نہ جانے کیا جادو کر دیا ہے اس پر۔“

”اس میں بھی آپ کی محنت کو دخل ہے جو آپ نے شروع سے خاندان والوں کی اہمیت کا دلا یا ورنہ اس زمانے میں کون کسی کو پوچھتا ہے؟“ شانہ بیگم نے جلدی سے کہا۔ ”اور جہاں تک اُس کے کراچی آنے کی بات ہے تو یہ بھی خون کی کشش کا اثر ہے۔“

”اسی لئے میں نے طے کر لیا ہے کہ اب احمر کو مستقل طور پر تمہارے حوالے کر دوں۔“ فوزیہ نے نکتہ سکر اتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا خیال ہے تمہارا؟“

”اس میں بھلا خیال کی کیا بات ہے؟“ شانہ بیگم بڑی اپنائیت سے بولیں۔ ”چشم ماروشن دل باشاؤ، بڑے شوق سے احمر کو یہاں چھوڑ دیں، خدا نے چاہا تو اُسے اپنے بچوں سے زیادہ چاہوں گی۔“

”کیوں نہیں۔۔۔۔۔“ شانہ بیگم نے جلدی سے کہا۔ ”احمر پر ہمارا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا آپ کا ہے۔“

”اس بار میں یہی فیصلہ کر کے آئی ہوں۔“ فوزیہ خاتون نے احمر کے سلسلے میں اپنا عندیہ ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ”اب دیکھنا یہ ہے کہ شانہ بیگم میری بات رکھتی ہیں یا نال دیتی ہیں۔“

”آپ حکم دے کر دیکھیں۔۔۔۔۔“ شانہ بیگم مسکرا کر بولیں۔

”رہنے کے اعتبار سے میں بڑی ہوں اس لئے حکم بھی دے سکتی ہوں لیکن۔۔۔۔۔“

”لیکن کیا۔۔۔۔۔؟“ شانہ بیگم نے اپنے دل کی دھڑکنوں کو سنبھالتے ہوئے دریافت کیا۔ ”آپ کچھ کہنے خاموش کیوں ہوئیں؟“

”میں دراصل یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ اس بار چونکہ غرض اور ضرورت میری ہے اس لئے حکم کی بجائے درخواست ہی کرنی پڑے گی۔“

”آپ تو شرمندہ کر رہی ہیں۔“ شانہ بیگم نے فوزیہ خاتون کا مفہوم سمجھتے ہوئے دبی زبان میں بے دریاہ ”بھلا ایسی کون سی بات ہے جو آپ کہیں اور میں نہ مانوں؟“

”وقت آنے پر تمہاری اس فرمانبرداری کا امتحان ہو جائے گا۔“ فوزیہ خاتون بڑی اپنائیت سے بولیں۔ ”کچھ کوچ کر پوچھا۔“ جو صاحبزادے تمہارے یہاں قیام پذیر ہیں تم نے کیا نام بتایا تھا اُن کا؟“

”رائیل۔۔۔۔۔“ شانہ بیگم نے جواب دیا۔

”اُن کے والد کیا کرتے ہیں۔۔۔۔۔؟“

”والد تو بے جا رہے خدا کو پیارے ہو گئے، صرف ماں زندہ ہے۔“ شانہ بیگم نے کہا۔ ”آپ نے بہادر آصف علی کا نام سنا ہوگا۔“

”خان بہادر آصف علی۔۔۔۔۔!“ فوزیہ خاتون نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا پھر کچھ یاد کر کے ”یہ آصف علی وہ تو نہیں جن کا لاہور میں کروڑوں روپے کا کاروبار ہے اور کئی ملیں بھی چل رہی

بوریا بستر باندھ کر روانہ ہو چکے ہوتے۔“

”کیا آپس میں خدا نخواستہ کوئی رنجش؟“

”بات رنجش کی تو نہیں ہے لیکن میرا خیال ہے کہ راجیل کی والدہ کو شائلہ سے کوئی شکایت ہوگی“
”شکایت کیسی؟“ ”فوزیہ خاتون نے شائلہ خاتون کی جانب وضاحت طلب نظروں سے“
”راجیل کی والدہ نے شائلہ اور نادیہ کے سلسلے میں اپنا خیال ظاہر کیا تھا لیکن میں نے انکار کرنا شائلہ بیگم نے کہا۔“ ”بس اتنی سی بات تھی۔“

”اچھا ہوا جو تم نے راجیل کے سلسلے میں مجھے تفصیل سے قبل از وقت آگاہ کر دیا۔“ فوزیہ نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ”مجھے اب اپنے احمر کے سلسلے میں بھی زبان کھولنے کی ضرورت ہے۔“

”کمال کرتی ہیں آپ بھی۔“ شائلہ بیگم بولیں۔ ”بھلا احمر اور راجیل کا کیا مقابلہ؟“
”نہ سہی لیکن لڑکے والوں کو تو شروع شروع میں ناک رگڑنی پڑتی ہے۔“

شائلہ بیگم کے علاوہ شائلہ بیگم بھی فوزیہ خاتون کے جواب پر ہنس دیں، فوزیہ خاتون بات بڑھانا چاہتی تھیں لیکن اسی وقت راجیل سلام کرتے ہوئے آگئے اس لئے بات آگے نہ بڑھ سکی۔

○○○

”آہی!۔۔۔۔۔“ نادیہ کی آواز اُس کے کانوں میں گونجی تو اُس کی محویت کا طلسم ٹوٹ گیا۔ دیکھا تو کمرے میں ملگیا اندھیرا بجیل چکا تھا، کسی نے بتی جلانے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کی تھی بھی پڑھائی میں اتنی مصروف تھی کہ گزرتے وقت کا احساس نہ ہوا، دن بھر کی مصروفیت نے اتنے چور کر دیا تھا۔ پھر وقت ملا تو وہ پڑھنے بیٹھ گئی۔

اور اب مغرب کا وقت ہو چلا تھا۔۔۔۔۔ اُس نے نادیہ کو دیکھا تو خود اپنی محویت پر جھکے جھکے مسکرا دی۔ ”ایسا بھی کیا پڑھتا آہی! کہ انسان کو اپنا ہوش و حواس نہ رہے۔“ نادیہ نے بہن کو ہاتھ تکتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے کمرے کی لائٹس بھی نہیں جلائی۔“

”بس اُنھنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ تم آگئیں۔“ اُس نے جلدی سے اُٹھ کر بتیاں روڑن ہوئے کہا۔ ”صائمہ اور فرحان کہاں ہیں؟“

”منصور کے ساتھ کہیں باہر گئے ہیں۔“

”اور سب لوگ کہاں ہیں؟“

”ای جان اپنے کمرے میں ہیں، تائی اماں غالباً ابھی تک خراٹے لے رہی ہوں گی، تانے سے ملنے ملانے گئے ہوئے ہیں اور احمر بھائی۔۔۔۔۔“ نادیہ احمر کا نام لے کر جان بوجھ کر خاموش ہو کر ”تم خاموش کیوں ہو گئیں۔۔۔۔۔؟“ ”شانے پوچھا تو نادیہ کے چہرے پر ایک شرمیلی مسکراہٹ گئی، شوننی سے بولی۔ ”احمر بھائی دو تین بار دراندے کے چکر لگا چکے ہیں۔۔۔۔۔ شاید وہ بھی آپ کو دیکھ کر واپس لوٹ گئے۔“

”تم کہیں باہر جانے کی تیاری کر رہی ہو۔۔۔۔۔؟“ اُس نے نادیہ کی بات کو بڑی خوبصورتی انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ پھر اُسے سر تا پا غور سے دیکھتی ہوئے بولی۔ ”میرا مطلب ہے یہ لالہ ذرا نادرہ کی طرف جارہی ہوں۔۔۔۔۔ اُس نے ابھی فون کر کے بلایا ہے۔“

”کوئی خاص بات۔۔۔۔۔؟“

”بچہ نہیں۔۔۔۔۔“

مغرب کی اذان سنائی دی تو شائلہ جلدی سے اُٹھ کر غسل خانے میں چلی گئی اور نادیہ قدم اٹھاتی ہی لنگی، انکوری رنگ کے شلوار سوٹ میں وہ بڑی دیدہ زیب لگ رہی تھی۔

ایک نماز پڑھ کر فارغ ہوئی تو ذہن پر بوہل بوہل تاثرات بدستور طاری تھے، ذہن کو فریش کرنے کا خاطر باہر لان پر آگئی، چپل اتار کر سبزے پر قدم رکھا تو زندگی کا احساس رگوں میں دوڑ گیا، وہ ہنستا ہنستا نرم گھاس پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک چہل قدمی کرنے لگی، تازہ پھولوں کی مہک ہوا کے لطیف جھونکے بڑے فرحت بخش تھے، کچھ ہی دیر میں اُس کی جھکن جاتی رہی، وہ ماحول کے ہر لطف اندوز ہونے میں اتنی مگن تھی کہ احمر کے دبے قدموں قریب آنے کا احساس تک نہ ہوا۔ اُس کے آخری کنارے پر رات کی رانی کے کج کے قریب پہنچ کر آہستہ سے چلتی تو احمر کو اپنے سامنے بڑھ چکی تھی۔ جب سے احمر نیرونی سے آئے تھے آج پہلی بار اُن دونوں کا تنہائی میں آمناسامنا واقف، ایک لمحہ کو وہ گھبرا سی گئی، جلدی سے نظریں گھما کر دیکھا، لان میں اُن کے سوا اور کوئی نہیں تھا پھر جانے کیوں اُس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔

احمر خاموش کھڑے اُسے یوں دیکھے جا رہے تھے جیسے آج پہلی بار دیکھا ہو، اُن کی آنکھوں میں لگی تھی، اپنائیت کا احساس تھا اور ایسا محسوس تھا جس نے ٹاکو کچھ دیر کے لئے تسخیر کر لیا۔ چند ثانیے تک وہ بت بنی کھڑی رہی پھر اپنے دل کی معصوم دھڑکنوں کو سنبھالتے ہوئے آہستہ سے دہلی زبان میں ”آپ؟“

”جی ہاں۔۔۔۔۔ خاکسار کو احمر کہتے ہیں۔“

”اچھا۔۔۔۔۔“ اُس نے شوننی سے کہا۔ ”تو آپ ہیں احمر۔۔۔۔۔“

”کوئی اعتراض ہے آپ کو۔۔۔۔۔؟“

”جی نہیں، اچھا خاصا بھلا سا نام ہے۔ شاید میں نے بھی کہیں سنا ہے۔“ وہ بڑی معصومیت سے بولی۔ ”کچھ یاد آیا۔ کہاں سنا ہے؟“

”نہ۔۔۔۔۔“ اُس نے زیر لب مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”اپنے دل کی دھڑکنوں سے پوچھئے۔۔۔۔۔ شاید وہ آپ کی مشکل آسان کر دیں۔“

اور۔۔۔۔۔ احمر کے جواب پر وہ لا جواب سی ہو گئی۔ کچھ اور نہ بن پڑا تو ایک ادا سے مسکرا کر دوپٹے کا ایک کونہ لگی۔

”کچھ احساس ہے آپ کو۔۔۔۔۔؟“ احمر نے سنجیدگی سے کہا تو وہ چونک اُٹھی۔

”کس بات کا۔۔۔۔۔؟“ اُس نے نظریں اٹھا کر وضاحت چاہی۔

”میں آپ کا مہمان بھی ہوں۔۔۔۔۔“

”میں نے میرا بانی کے فرائض میں کوئی کوتاہی تو نہیں کی۔“ اُس نے بڑی سادگی سے کہا۔

”میں مجھے شکوہ ہے۔۔۔۔۔“ احمر اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولے۔ ”جب سے آیا ہوں اس سے گفتگو کرتا تو درکنار ٹھیک سے نظر بھر کر دیکھ بھی نہیں سکا۔“

”کس کا خوف لاحق ہے۔۔۔۔۔؟“ ”شانے شوننی سے دریافت کیا۔

”آپ کی بڑی اماں کا جنہوں نے اس بار مجھ پر اپنی نگاہوں کا پہرہ ہمارا رکھا ہے۔“

”یقیناً کوئی جرم سرزد ہوا ہوگا آپ سے۔۔۔۔۔“ وہ معصومیت سے بولی۔

بے شرم کے پانی پانی ہو گئی، جلدی سے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا اور دل کی دھڑکنوں کی تیزی سے اپنے سر کے سمت دوڑنے لگی۔

”میری بات تو سنئے!“ احمر نے شا کو آواز دے کر روکنے کی کوشش کی لیکن وہ رکی ہوئی اندر چلی گئی۔

کچھ دیر اپنی جگہ خاموش کھڑے شا کے بارے میں سوچتے رہے، پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے باب بڑھنے لگے، شا کے تصور میں اتنے محو تھے کہ وہ بھی فوزیہ خاتون کو نہ دیکھ سکے جو بڑی دیر کی سمت کھلنے والی کھڑکی کے قریب کھڑی سب کچھ بڑی گہری نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔

○○○

ان کی میز پر سب ہی موجود تھے۔ غار احمد اور وقار احمد اس وقت بھی کاروباری گفتگو میں تھے۔ شائلے بیگم، فوزیہ خاتون کے سیدھے ہاتھ پر تھیں، فرحان اور صائمہ فوزیہ خاتون کے اُلٹے تھے۔ شامین فوزیہ خاتون کے سامنے بیٹھی تھی اور اُس کے دائیں ہاتھ پر نادیہ جی جس کے بعد چھوڑ کر احمر میز کی دوسری جانب باپ کے سامنے بیٹھے تھے۔

ان نے اپنی دلچسپ باتوں اور حاضر جوابی سے فوزیہ خاتون کو بھی اپنا گرویدہ بنا لیا تھا، یہی وجہ اس وقت احمر کی بجائے فوزیہ خاتون کے بائیں ہاتھ والی کرسی پر بیٹھا تھا۔

ان کے دوران مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی، بظاہر تو فوزیہ خاتون بھی دوسروں کے توجہ سے توجہ دیتی تھیں لیکن اس وقت خلاف توقع وہ کچھ سنجیدہ سنجیدہ نظر آ رہی تھیں، کھانے کے بعد بارودہ بکھیرنے کے بعد احمر کو بھی دیکھ چکی تھیں، فرحان حسب دستور اس وقت بھی صائمہ کو لے کر مصروف تھا۔ ایک بار اُس نے نظر بجا کر صائمہ کی پلیٹ سے شامی کباب اٹھانا چاہا تو بول پکڑا گیا۔ صائمہ نے ماں سے شکایت کی تو شائلے بیگم نے فرحان کو بغور دیکھا

اپنی شرارتوں سے باز نہیں آؤ گے؟“

فرحان نے نہایت معصومیت سے جواب دیا۔ ”میں دراصل آپ کی طرف دیکھ رہا تھا

میں سے ہاتھ صائمہ کی پلیٹ کی طرف چلا گیا۔“

فرحان اس بات کا گواہ ہوں کہ فرحان نے دیدہ و دانستہ کباب اٹھانے کی غلطی نہیں کی تھی۔ احمر

ناکی حمایت لیتے ہوئے کہا۔ ”کیوں پارٹنر؟“

فرحان نے جلدی سے گردن کو اثبات میں ہلا دیا۔

”کے بھائی گرہ کٹ۔“ شائلے بیگم نے پیار سے کہا۔

فرحان کی انہی حمایتوں نے فرحان کو سر چڑھا رکھا ہے۔ نادیہ بولی۔

”اپنے اپنے مقدر کی بات ہے۔“ فرحان نے فوزیہ خاتون کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیوں؟“

”دست کہا آپ نے۔“ فوزیہ خاتون نے بھی فرحان کو لاڈ سے دیکھا پھر دبی زبان میں

”کی تو سر پر نہیں چڑھایا جاسکتا۔“

فرحان نے نادیہ کی طرف دیکھا۔ ”کیا آپ اس حقیقت سے انکار

کر رہے ہیں؟“

”نہ صرف جوہری جانتا ہے؟“

”صائمہ چڑ کر بولی۔“

”جی ہاں۔۔۔۔۔“ احمر کا لہجہ بخار آلود ہو گیا۔ ”اگر آپ برانہ منائیں تو اس جرم کی وضاحت بھی کر دوں؟“

”کیا ضرورت ہے۔۔۔۔۔“ وہ جلدی سے قدرے شرما کر بولی۔ ”ماں بیٹے کا آپس کا معاملہ ہے۔“

”اے کہتے ہیں چوری اور سینہ زوری۔۔۔۔۔“ احمر کی سرسراہٹ آواز اُس کے کانوں میں گونجی تو وہ

کی نفسی میں ڈوب کر رہ گئی، احمر نے ایک ہی جملے میں بہت کچھ کہہ دیا تھا، اُس نے چونک کر بس

نظر احمر کو دیکھا پھر جلدی سے شرما کر نظریں جھکا لیں۔

یوں جیسے اُسے احمر کے جواب پر کوئی اعتراض نہ ہو۔ جیسے اُس نے اپنی چوری تسلیم کر لی ہو۔

کیسے نہ کرنی، جبکہ وہ بھی اس جرم میں احمر کی برابر کی شریک تھی۔۔۔۔۔ اور اس جرم کا احساس اُسے

وقت ہوا جب وہ انجانے میں پوری طرح اس میں ملوث ہو چکی تھی۔۔۔۔۔ فرار کی تمام راہیں مسدود ہو

تھیں۔۔۔۔۔ اسی لئے تو اُس نے احمر کی ہر بات پر سر تسلیم خم کر لیا۔

احمر خاموش کھڑے شا کے چہرے پر چھوٹی دھنک کے بھرے رنگوں کو محبت بھری نگاہوں

دیکھتے رہے پھر کچھ سوچ کر مسکرا دیئے، آہستہ سے بولے۔ ”فرحان بتا رہا تھا کہ آپ کے امتحان،

قریب ہیں۔۔۔۔۔ بڑی تیاریاں کر رہی ہیں آپ۔“

”ابھی تو ڈھیر ساری تیاری کرنی ہے۔“ شائلے بیگم نے نظریں اٹھا کر احمر کو دیکھا جو اس وقت چاکلیٹ

کی قمیض اور لائٹ براؤن کٹر کی پتلون میں بہت خوبصورت نظر آ رہے تھے۔

”امتحان کب ہے آپ کا۔۔۔۔۔؟“ احمر نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”ابھی تو پانچ مہینے باقی ہیں۔“

”اچھا۔۔۔۔۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ بس ایک دو روز میں شروع ہونے والا ہے۔“

”آپ کو تفریق سوچ رہی ہے اور یہاں بول کے مارے ابھی سے مبرا برا حال ہے کہ کوئی

طرح مکمل ہو گا؟“ وہ معصومیت سے بولی۔ ”بھی دیکھا ہے آپ نے۔ ڈاکٹری کی تعلیم میں کتنی

مونی کتابوں سے سرکھانا پڑتا ہے۔“

”اپنی بڑی اماں کا خیال رکھا کیجئے! اُن کی دعا شامل حال رہی تو سب مشکل آسان ہو جائے گی

”آپ نے کیسے اندازہ لگایا کہ میں بڑی اماں کا خیال نہیں رکھتی۔۔۔۔۔ جناب! آپ کی اطلاع

لئے عرض ہے کہ میں بڑی اماں کے کسی کام سے ایک پل بھی غافل نہیں رہتی۔۔۔۔۔ اُن کے آرام

طرح سے پورا پورا خیال رکھتی ہوں۔“

”پھر تو آپ کی کامیابی یقینی ہے۔“ احمر نے مسکرا کر معنی خیز لہجے میں جواب دیا تو وہ ”امتحان

مفہوم سمجھ کر لجا گئی، چھوٹی مونی کے معصوم پودے کی مانند خود ہی اپنے وجود میں سنسنے لگی، اس کا پورا

گنگنا اٹھا اور انگ انگ جھوم اٹھا۔

”کیوں۔۔۔۔۔ کیا آپ کو امتحان میں کامیابی کی تمنا نہیں ہے؟“ احمر نے سرگوشی کی۔

”میری تو خواہش ہے کہ ایک کامیاب ڈاکٹر بن جاؤں۔۔۔۔۔ یہی میری سب سے بڑی آرزو۔“

”کوئی اور آرزو نہیں ہے۔۔۔۔۔؟“ احمر کے لہجے میں پیار بھری شکایت تھی۔

”میں ڈاکٹر بننے کی دعا کرتی ہوں اور آپ۔۔۔۔۔ آپ دوسری آرزو کی دعا مانگئے! اس طرح

کی خواہشات کی تکمیل ہو جائے گی اور پھر۔۔۔۔۔“

شا بولتے بولتے یلخت خاموش ہو گئی، وہ روانی میں جانے کیا کہہ گئی تھی، اپنی بات کا مفہوم سمجھ

”بڑی اماں..... آج تو بہت زیادہ تکلف سے کام لے رہی ہیں۔“ ثناء نے فوزیہ خاتون کی طرز بگھارے ٹینگن کی ڈش بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اسے تو آپ نے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔“
فوزیہ خاتون نے ٹاش کی بات کا کوئی فوری جواب نہیں دیا، تھوڑا سا ٹینگن نکال کر چکھا، پھر برا سادہ بنا کر بولیں۔ ”بڑا سچ ذاتقہ ہے..... مجھے سچ چیزوں سے کوئی رغبت نہیں ہے۔ یوں بھی آج مجھے کچھ بھوک نہیں لگ رہی۔“

”خیریت.....؟“ شائلہ بیگم نے جلدی سے پوچھا۔ ”نصیب دشمن! جی تو اچھا ہے؟“
”ایسی پریشانی کی کوئی بات نہیں..... ٹھنکن کا احساس ہے، آرام کروں گی تو جاتا رہے گا۔“
”آپ یہ قیہ کر لیا چکھیں۔“ نادیا نے فوزیہ خاتون سے کہا۔ ”یہ میری فیورٹ ڈش ہے، آپ بھی پسند آئے گی۔“

فوزیہ خاتون نے نادیا کی سمت غور سے دیکھا، اپنی پلیٹ میں ایک چمچہ نکال کر پچکتے ہوئے بولیں۔
”خوب..... واقعی لطف آگیا۔“
”مجھے ذرا پسند نہیں۔“ شائلہ مصومت سے بولی۔ ”اس کی کڑواہٹ کے بارے میں تو سوچ کر ہر جہر جھری آجاتی ہے۔“

”لیکن ہے بڑی مفید چیز..... خاص طور پر خون کی صفائی کے لئے۔“ فوزیہ خاتون نے آخری جملہ کچھ ایسے انداز میں کہا کہ شائلہ بیگم چمکے بنانہ رہ سکیں۔
”حیرت ہے.....! اصرار نے ماں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”نیرولی میں تو آپ نے کریلے کی ڈش کچھ میز پر نہیں آنے دی۔“

”وہاں کسی نے اتنی محبت سے کھانے پر اصرار بھی نہیں کیا جتنا یہاں نادیا نے بیٹی نے کیا ہے۔“ فوزیہ خاتون نے نادیا کو بڑی اپنائیت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”فرمائش میں خلوص کی مٹھاس شامل ہو تو سچی ذاتقہ بھی تبدیل ہو جاتا ہے۔“
”ایک اور سبب بھی ممکن ہے.....“ فرحان بڑی سنجیدگی سے بولا۔ ”ہو سکتا ہے کہ نیرولی میں نہ چڑھا کر ملا تھا ہو۔“

”کیا بات بنی.....؟“ صائمہ نے پوچھا۔
”تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی..... بڑی اماں سے پوچھ لو!“
”بھائی صاحب..... آپ تو باتوں میں اس درجہ مصروف ہیں کہ پلیٹ جوں کی توں رکھی ہے، شائلہ بیگم نے ٹاراجہ سے کہا پھر شوہر سے بولیں۔“ آپ اکیلے ہی اکیلے کھا رہے ہیں..... کچھ بھلا صاحب کا بھی خیال رکھیں!“

”آپ میری فکر نہ کریں۔“ ٹاراجہ بے تکلفی سے بولے۔ ”میں کھانے کے معاملے میں تکلف سرے سے قائل ہی نہیں۔“

”لیکن مجھے تو بہر حال خیال رکھنا ہے۔“ شائلہ بیگم نے مسکرا کر کہا۔ ”کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ بعد میں یہ کہیں کہ بھائی کے گھر گیا تھا لیکن بھادج نے کوئی خاطر مدارات نہیں کی۔“
”اس بات کا خدشہ آپ کو مجھ سے نہیں، البتہ اپنی جیٹھانی سے ضرور ہو سکتا ہے۔“ ٹاراجہ بولے۔
”کوئی نہیں.....“ شائلہ بیگم نے تیزی سے کہا۔ ”فوزیہ بہن رشتے کے اعتبار سے جیٹھانی ضرور ہیں لیکن میں نے ہمیشہ انہیں بڑی بہن سمجھا ہے اور بہنوں بہنوں میں اس قسم کی باتیں بھی نہیں ہوتیں۔“

”وہ بھی تمہارے جیسی بہن.....“ فوزیہ خاتون پہلو بدل کر بولیں۔ ”مجھے واقعی تمہارے اُد پر بولی ہے۔ تم نے زندگی میں جو قربانیاں دی ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں، تمہاری جگہ میں ہوتی تو کائنات کسی سوڑ پر میرے قدم بھی ڈگمگا جاتے۔ لیکن تم ہمیشہ ثابت قدم رہیں۔“
”اسی کام تو زندگی ہے.....“ شائلہ بیگم نے قدرے سنجیدگی سے جواب دیا پھر جلدی سے باتوں کا بدلے ہوئے بولیں۔ ”آپ تو سچ سچ تکلف سے کام لے رہی ہیں..... ایک رونی جولی بھی وہ ابھی لٹ میں موجود ہے، آدھی بھی تو ختم نہیں ہوئی۔“

”تھوڑا سا سنجی پلاؤ لے لیں۔“ ثناء نے بڑے پیار سے فرمائش کی۔ ”میں نے خاص طور پر آپ کو تاکید کر کے آپ کے لئے تیار کر لیا تھا۔“
”ابھی سہی..... آج میری بھوک کونہ جانے کیا ہو گیا ہے کسی چیز کی خواہش نہیں ہو رہی۔“ فوزیہ نے کھانے سے جواب دیا تو شائلہ بیگم سی اٹھی۔ اُس نے نظر بھر کر فوزیہ خاتون کو دیکھا پھر کھانے پر ہٹ گئی۔ جانے کیوں اُسے رہ رہ کر یہ خیال آ رہا تھا جیسے آج کوئی انہونی ہو رہی ہو۔
”نہیں کو دل نہیں چاہ رہا تو کسٹروڈ پڈنگ لے لیں!“ نادیا نے اصرار کیا۔

”نہ کہہ رہی ہو تو انکار نہیں کروں گی۔“ فوزیہ خاتون نے ٹینگن کی پلیٹ سامنے سے ہٹا دی اور بیٹھا لیں۔

”بار فوزیہ خاتون کی تبدیلی کو اصرار نے بھی محسوس کیا..... خلاف توقع آج دوسری بار انہوں نے ثناء کو روک دیا تھا اور نادیا کی فرمائش کو قبول کیا تھا۔
انے آہستہ سے نظریں اٹھا کر ماں کی سمت دیکھا..... شائلہ بیگم بھی اپنی جگہ کسی سوچ میں گم نظر آ رہی تھیں۔ اُس نے ماں کے چہرے پر بھی غور و فکر کے تاثرات محسوس کیے تو اپنی جگہ کسمسا کر رہ گئی۔
لبیبی عجیب غلطی اُس کے دل کو دہلا رہی تھی..... ایسا کیوں ہو رہا تھا.....؟؟ اُس نے ذہن پر مار کر سوچنا چاہا لیکن کوئی معقول جواز تلاش نہ کر سکی، نظریں جھکائے بیٹھی بس اپنے ذہن کے اکر پیدلی رہی.....!!

○○○

رات کو سونے سے پہلے ماں کو شب بچیر کہنے اُن کے کمرے میں گئے تو اُس وقت بھی فوزیہ بزم پر نیم دراز کسی گہری سوچ میں غرق تھیں، ٹاراجہ چونکہ سونے سے پہلے مطالعہ کے عادی تھے، آرام کر رہی پر بیٹھے کتاب کی درق گردانی میں مصروف تھے، اصرار چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے رہے چلے گئے۔ فوزیہ خاتون نے اصرار کو نگاہوں کے سامنے دیکھا تو ایک لمحہ کو ماں کی مٹا کا لٹا اٹھوں میں اتر آیا لیکن دوسرے ہی لمحے اُن کی پیشانی پر غور و فکر کی ٹنگٹیں نمایاں ہو گئیں،
ماں کی نگاہوں کے بدلتے زاویے دیکھتے تو چپ نہ رہ سکے، آہستہ سے دریافت کیا۔
”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”ہیں کس بات کی تشویش لاحق ہے.....؟“ فوزیہ خاتون نے اصرار کو گھورتے ہوئے سوال کیا تو اُس نے۔
”ماں کے سوال کا مفہوم نہ سمجھ سکے اور مصومت سے بولے۔
”میں محسوس کر رہا ہوں کہ آپ کسی سوچ میں گم ہیں، کھانے کی میز پر بھی!“
”ماں سے خیال میں میری اس کیفیت کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟“ فوزیہ خاتون نے سپاٹ لہجے میں

”مصرفیت..... یا..... مکان۔“

”ذہن پر کوئی ناخوشگوار بوجھ ہو تو بھی انسان اپنی کیفیت دوسروں سے نہیں چھپا سکتا۔“

”آپ کے ذہن پر کمر بات کا بوجھ ہے؟“

”تمہاری شادی نا.....“ فوزیہ خاتون نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں سوچ رہی ہوں کہ اب شامکہ تمہارے سلسلے میں کھل ربات کرلوں..... تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں.....؟“

”میں اس سوال کا جواب آپ کو نیردہی میں بھی دے چکا تھا۔“ احمر نے مدہم لہجے میں کہا۔ ”شامکہ کا ذکر سن کر اُن کے چہرے پر مسرتوں کی لہر دوڑ گئی تھی۔“

”ایک بار پھر سوچ لو..... بات منہ سے نکلتی ہے تو پرانی ہو جاتی ہے، کہیں تمہیں بعد میں میری بات سے اختلاف نہ ہو۔“

”میں آپ ہی کا خون ہوں، آپ کے کسی فیصلے پر بھلا اعتراض کیسے کر سکتا ہوں؟“

”میں بھی تمہاری ماں ہوں۔ اور ماں اپنی اولاد کے حق میں کوئی غلط فیصلہ نہیں کرتی۔“

”میں اب اجازت چاہوں گا۔“ احمر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”شب بخیر۔“

”شب بخیر۔“ فوزیہ خاتون نے بیٹے کے چہرے پر خوشیوں کو منڈلاتے دیکھ کر بڑے پیار سے کہا لیکن جب احمر تیز قدم اٹھاتے کمرے سے رخصت ہو گئے تو اُن کے چہرے پر ایک بار پھر کمرے سنجیدگی طاری ہو گئی۔ اُن کی نگاہوں کے سامنے پھر وہی منظر گھوم گیا جب انہوں نے اپنے کمرے سے باہر لان میں ٹاؤر احمر کو ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل کر باتیں کرتے دیکھا تھا، وہ اُن دونوں کی گفتگو تو سن سکی تھیں لیکن چہرے کے تاثرات سے انہوں نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ ٹاؤر احمر ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہتے ہیں۔

دونوں کے درمیان محبت کا پاکیزہ اور مقدس رشتہ قائم تھا..... جیسی تو وہ تنہائی میں دو گھڑی کے لے ملے تھے لیکن پھر ٹاؤر دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپائے اندر چلی گئی تھی..... احمر نے کوئی ایسی ہی بات کہی تھی جس سے شامکہ کا چہرہ تپ کر گھٹا ہو گیا تھا۔ اور..... یہی وجہ تھی جو احمر بار بار کراچی آنے کے لیے مضطرب اور بے چین رہتے تھے.....

شامکہ ترقی تہذیب کا جیتا جاگتا نمونہ تھی..... شامکہ بیگم نے اُسے تہذیب کے انمول سانچوں میں ڈھال کر کندہ بنا دیا تھا..... قدرت نے اُسے حسن کے معاملے میں بھی دل کھول کر نوازا تھا..... ذہانت کی دولت سے بھی مالا مال کیا تھا..... وہ خوبصورت بھی تھی اور خوب سیرت بھی..... اپنے وجود میں اعتبار سے مکمل تھی..... پھر پور تھی.....

لیکن فوزیہ خاتون کو ایک بہو کی حیثیت میں گوارا نہیں تھی..... انہوں نے احمر کے لیے نادیہ انتخاب کیا تھا، یہ فیصلہ اپنی جگہ بے حد اہل اور مضبوط تھا، اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی، اُن کی کیفیت اُس بلند اور تادور درخت کی مانند تھی جو ٹوٹ تو سکتا تھا لیکن جھک نہیں سکتا تھا..... انہیں ہونے سے پہلے احمر کی زندگی..... اور اُس کے مستقبل کے لیے آخری فیصلہ کرنا تھا۔

فوزیہ خاتون اپنے خیالوں میں متفرق تھیں اور ٹاؤر احمر اپنی جگہ ایک خاموش تماشائی کی حیثیت سے بیٹھے اُس وقت سے بیوی کے چہرے کے آثار چڑھاؤ کا جائزہ لے رہے تھے جب انہیں احمر شامکہ کہنے کے بعد کمرے سے باہر گئے تھے، ٹاؤر احمر نے ماں بیٹے کے درمیان ہونے والی گفتگو سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا تھا کہ جو معاملہ زیر غور ہے اُس کا انجام کیا ہوگا..... بڑی دیر تک وہ کرسی پر بیٹھے

بیوی کے ذہن میں جو طوفان بپا تھا، اُس کی شدت کے بارے میں غور کرتے رہے اور اندر بچہ دہانہ کھاتے رہے۔ وہ ایک طویل عرصے کے بعد چھوٹے بھائی کے گھر آئے تھے اس لیے اچھے تھے کہ کوئی ایسی ناخوشگوار بات ہو جو دلوں میں دراڑیں پیدا کر دے اور جو راہ و رسم پر قرار لگ جاتی رہے۔ دوسری طرف انہیں بیوی کا خیال بھی تھا، وہ یہ بھی جانتے تھے کہ فوزیہ خاتون بولوں کو برقرار رکھنے کی خاطر اپنی زندگی کی تمام خوشیاں داؤ پر لگا سکتی ہیں لیکن ایک بار جو قدم اٹھ جائے اُسے پیچھے ہٹانے پر بھی آمادہ نہیں ہو سکتیں۔ انہی پریشان خیالات نے ٹاؤر احمر کو بھی تھکا، وہ خاصی دیر تک اسی مسئلے پر غور کرتے رہے پھر اٹھ کر بیوی کے قریب آتے ہوئے بولے۔

”ہاں تم ہیں آپ.....؟ میں بہت دیر سے آپ کو تلاش کر رہا ہوں۔“

”اس وقت احمر کے بارے میں سوچ رہی تھی۔“ فوزیہ خاتون نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”لیں..... احمر کو کیا ہوا.....؟“

”مظاہرہ پر چل نکلا ہے..... آج میں نے اُسے تنہائی میں شامکہ کے ساتھ گھل مل کر باتیں کرتے دیکھا، خیال ہے وہ شامکہ کو پسند کرتا ہے۔“

اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ احمر نے اگر شامکہ کا انتخاب کیا ہے تو یہی پسند کو سراہنا چاہئے اس لئے کہ شامکہ اعتبار سے احمر کے لئے ایک بہترین رفیق ثابت ہو گا۔ ٹاؤر احمر نے بڑے سلجھے ہوئے انداز میں بیوی کو قائل کرنے کی کوشش کی۔ ”بظاہر تو اُس زانیہ نظر نہیں آتی۔“

”راہن کے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا؟“ فوزیہ خاتون نے سپاٹ لہجے میں دریافت کیا۔

”راہن ہے کہ والدین کی کسی غلطی کی سزا بچوں کو نہیں ملنی چاہئے۔“

”اُن خون بہر حال اپنا اثر ضرور دکھاتا ہے۔“ فوزیہ خاتون ہونٹ چباتے ہوئے بولیں۔ ”بات پرانی ضرور ہو گئی ہے لیکن میرے دل پر آج بھی نقش ہے..... یاد ہے آپ کو..... اُس وقت کیا ٹاؤر احمر بچی کی ہمدردی اور خدا ترسی میں اس قدر جذباتی ہو گئے تھے کہ انہوں نے صاف

دیا تھا کہ وہ کسی کی نصیحت سننے کو تیار نہیں بلکہ وہ تو اُن لوگوں سے رشتہ ناطہ توڑنے پر بھی آمادہ نہ تھے۔ انہوں نے سمجھانے سمجھانے کی کوشش کی تھی..... کچھ رشتہ دار تو آج تک اسی بات پر ملنا جلتا بیٹھے ہیں۔ لیکن آپ کے بھائی صاحب کو اُن کی مطلق پرواہ نہیں.....“

”پدرت فرما رہی ہیں۔ لیکن ان باتوں کا شامکہ کی ذات سے کیا تعلق ہے..... وہ بے چاری تو انعام سے لاعلم ہے۔“

”لاطم ہے تو ہوا کرے، لیکن ہم تو حالات سے بے خبر نہیں۔“

”مظاہرہ ڈول گا اگر آپ کو ناگوار خاطر نہ ہو۔“

”.....؟“

”الحال اس مسئلے کو ملتوی کر دیجئے..... ورنہ وقار کو دکھ ہوگا۔“

”آپ کے بھائی کے دکھ سے زیادہ اپنی اولاد کا مستقبل عزیز ہے..... میں نے طے کر لیا ہے کہ میں شامکہ سے دونوں بات کر دوں گی۔“ فوزیہ خاتون نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”ماں نصیحت سے مجھے احمر کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کا پورا پورا اختیار ہے..... مجھے نادیہ پسند نہیں آتی آپ کو نیردہی میں بھی بتا چکی ہوں..... احمر کے لئے نادیہ ہر لحاظ سے بہتر ہوگی، رشتہ

مانگنا میرا کام ہے، آگے شاملہ بیگم کی مرضی..... وہ چاہیں تو رشتہ دینے سے انکار کر دیں، مجھے کوئی مان نہ ہوگا..... احمد لاکھوں میں تو کیا کروڑوں میں ایک ہے، اُس کے لئے لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں ہوگی۔
نثار احمد نے بیوی سے الجھنا مناسب سمجھا اس لئے خاموشی اختیار کر لی۔ لیکن فوزیہ خاتون نے
سننے میں جو طوفان اٹھ رہا تھا اُس کی شدتیں ہر لمحہ تیز ہوتی جا رہی تھیں.....!!



ہاکی سلاخوں کے پیچھے گم صم بیٹھا جیتے ہوئے کل کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ بوڑھے قیدی
نے اُسے یوں چونکا دیا جیسے وہ خواب دیکھتے دیکھتے اچانک جاگ اٹھا ہو، اُس نے نظر اٹھا کر
باب دیکھا جو اُسے ناشتے کے ٹوٹے پھوٹے برتن کی سمت متوجہ کر رہا تھا۔
کاہنڈھن بھرنے کے لئے روکھی سوکھی جو بھی ملے اُسی پر گزارہ کر لو..... سنتری برتن سیٹنے آ
دھیر تک خالی پیٹ حالات سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔“

احمد نے بوڑھے کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا، خاموشی سے سوکھے توس کے ٹکڑے ٹھنڈی
بکری کر حلق سے نیچے اتارنے لگا۔ شیدے کا قاتل رفیق بھی ناشتے میں مشغول تھا، اُسے ابھی
لفظی میں متعلق نہیں کیا گیا تھا۔

ہم یہاں آئے تھے اُس وقت خاصے بھلے چنگے نظر آتے تھے لیکن اب.....“ بوڑھا قیدی ایک
لئے خاموش ہوا پھر اُس کی کیفیت کا اندازہ لگاتے ہوئے بولا۔ ”کتنے دنوں کی کھوا کر آئے ہو؟“
احمال کی.....“ اقبال احمد نے سیاٹ لہجے میں جواب دیا۔

”کیا تھا؟“ بوڑھے نے بے پروائی سے سوال کیا۔ ”میرا مطلب یہ ہے کہ کیا واقعی تم کسی جرم
میں یہاں آئے ہو یا محض شیعے کی بنا پر دھر لئے گئے؟“
..... سمجھا نہیں؟“ اُس نے حیرت سے بوڑھے کو دیکھا۔

ادنیٰ ہی کتنے جیتے ہیں..... سال چھ ماہ یہاں رہو گے تو ساری باتوں کا مطلب آہستہ آہستہ
ملے۔“ بوڑھے نے زہر خند سے کہا، پھر چائے کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے بولا۔ ”ایک بات
ماند مانو.....؟“
.....“

ہا چھوڑ دو.....“ بوڑھے نے بڑے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ”یہاں کی دنیا باہر کی دنیا سے
مہے، سلاخوں سے باہر جو غور میں ڈوبا نظر آئے اُسے مفکر اعظم یا پروفیسر اور فلسفی کے نام
لاتا ہے لیکن یہاں ایسے لوگوں کو ڈیوٹ کہا جاتا ہے۔“

ہاکی زبان بھی باہر کی دنیا سے مختلف ہوتی ہے..... شروع شروع میں مجھے یہاں کی بولی
ناجین وقت اور جرج بے نے مجھے ماہر کر دیا ہے.....“ بوڑھے نے بے پروائی سے جواب دیا۔
ہاکی زبان میں ایسے لوگوں کو کہا جاتا ہے جو مردانگی سے سزا کاٹنے کی بجائے بزدلوں کی
دکریا کم صم رہ کر وقت پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔“

بوڑھے کوٹ نہیں ہوتے انہیں کیا کہا جاتا ہے۔؟“ رفیق نے بوڑھے کو گھورتے ہوئے پوچھا۔
مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا ہے مثلاً دادا، استاد، خلیفہ یا بادشاہ..... اور ہم جیسے لوگوں کو جو بار
ہزار کی غرض سے آتے جاتے رہتے ہیں یا جی یا قلندر بادشاہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔“

”عادی مجرم معلوم ہوتے ہو۔“ اقبال احمد نے دبی زبان میں کہا۔

”اپنی اپنی سوچ کی بات ہے میاں صاحب!“ بوڑھے نے تیزی سے جواب دیا۔ ”کچھ لوگ علم و ہمت کی تلاش میں چین و جانیاں جاتے ہیں..... زندگی میں تجربہ حاصل کرنے کی خاطر دنیا بھر کا خاک اڑاتے پھرتے ہیں، پھر بھی ادھر سے رہ جاتے ہیں..... یہی حال سیاحوں کا ہے، وہ بھی دنیا بھر کے ممالک سے دولت اڑاتے ہیں، خوب سے خوب تر کی تلاش میں تمام زندگی بھٹکتے پھرتے ہیں لیکن خود کو ان سب سے زیادہ مفلک اور تجربہ کار سمجھتا ہوں..... اس لئے کہ میں نے ایک اہم راز کو یاد کیا..... زندگی کا نچوڑ..... جو کھلی اور آزاد فضا میں کیا ہے..... یہی وجہ ہے کہ جب میں باہر نکلتا ہوں تو ہنسنا شروع کر دیتا ہوں اور چلا آتا ہوں اور جب یہاں سے واپس جاتا ہوں تو زندگی کے گنت اور بے شمار تجربے میرے ساتھ ہوتے ہیں..... ایسے قیمتی، انمول اور نایاب تجربے جنہیں تم زندگی کا حاصل بھی کہہ سکتے ہو۔“

”تمہاری باتیں بھی تمہاری طرح دلچسپ اور عجیب ہیں۔“ اقبال احمد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”یہی تو میں بھی سمجھا رہا ہوں.....“ بوڑھے نے اقبال احمد کو دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”جب وقت ہی پورا کرنا ہے تو ہنس بول کر کیوں نہ گزارا کر دیا جائے؟ اور پھر درس گاہ میں جو طالب روتا بسورتا ہے وہ کچھ حاصل نہیں کر سکتا..... اپنا آپ گنوا رہتا ہے۔“

”تعلیم یافتہ معلوم ہوتے ہو.....“ اقبال احمد نے اُس کے جملے سے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔

”تعلیم کے ساتھ ساتھ تجربہ بھی شرط ہے..... تجربہ نہ ہو تو تعلیم محض کاغذی سند تک محدود رہ جاتی ہے۔ اور میرا تجربہ بتا رہا ہے کہ تم جب یہاں آئے تھے اُس وقت تمہارے اندر کا انسان بڑا غرور، خوف اور درندہ صفت تھا لیکن.....“ بوڑھے نے ایک لمحے کو خاموشی اختیار کر لی، اُس کی ذہنیں نظر اقبال احمد کے چہرے پر مرکوز تھیں، کچھ توقف کے بعد اُس نے اپنا سلسلہ کلام دوبارہ جاری کر دیا۔ ”اب میں تمہارے اندر ایک نمایاں تبدیلی محسوس کر رہا ہوں، تمہارے اندر جو انسان سوا تھا وہ آہستہ آہستہ بیدار ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ کیوں، کیا میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟“

”تم..... تم شاید مجھے اپنی باتوں سے مرعوب کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔“ اقبال احمد نے شہلاہوئے قدرے جھلا کر کہا تو بوڑھے قیدی نے کوئی جواب نہیں دیا، مسکرا کر رہ گیا۔

اقبال احمد کی نظریں بدستور بوڑھے پر جمی ہوئی تھیں، بوڑھے نے جو کچھ کہا تھا وہ غلط نہیں تھا۔ اقبال احمد اس حقیقت کو کسی اجنبی کی زبان سے سن کر بری طرح تملتا گئے..... شاید اس لئے کہ وہ اپنے لئے خود ذمہ دار تھے..... یا..... پھر اس لئے کہ وہ اپنے ذہن، درد اور اپنی سوچوں میں کسی اور شریک نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انہیں یہ بھی منظور نہیں تھا کہ کوئی دوسرا اُن کے ذہن کے درپچوں سے اُن کی زندگی کے نہاں خانوں میں جھانکے، اُن باتوں کا سراغ یا کھوج لگائے کی کوشش کرے جو باطنی و ذہن لکھوں میں بہت پیچھے کہیں گم ہو کر رہ گئی تھیں۔

کچھ زخم ایسے تھے جو اوپر سے مندل نظر آ رہے تھے لیکن اندر ہی اندر ناسور کی طرح اپنی جڑ مضبوط کر رہے تھے۔ وقت نے انہیں پہنچا کر اُن زخموں کو ہرا کر دیا تھا۔ اقبال احمد اُن زخموں کی لذت سے اپنے آپ کو بھلانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن بوڑھے قیدی نے اُن کے سینے میں دبی چنگاریوں کو ہوادے کر شعلہ بنا دیا تو وہ جھلس کر رہ گئے۔

ہر خیال ہے کہ ہمیں ایک دوسرے کی ذاتیات سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔“

”تمہارے خیال کی بھرپور تائید کرتا ہوں۔“ اقبال احمد نے بدستور سنجیدگی سے کہا۔ ”ہم یہاں ایک ساتھ ہوئے ہیں، ہم نے جو کچھ کیا ہے وہ ہمارا ذاتی اور نجی فعل ہے، اُس کی سزا بھی اُنکے ہی ہاتھ میں ہے..... اگر ہم ایک دوسرے کے زخم پر مرہم نہیں رکھ سکتے تو ہمیں نشتر لگانے یا ہر گز کبھی کوئی حق نہیں۔“

”میں نے یقیناً سنجیدگی اختیار کر لی، باری باری اُس نے اقبال احمد اور پھر رفیق کو دیکھا، اس رجمت بھرے لہجے میں بولا۔ ”اگر میری بات سے کسی کو ذکھ پہنچا ہے تو میں شرمندہ ہوں.....“

”خدا شاکر ہوں۔“

”اس وقت سگریٹ کی طلب بڑی شدت سے ہو رہی ہے۔“ رفیق نے بات کا رخ بدلنے کی کوشش کی۔

”سگریٹ کو آنے دو..... میں تمہارے لئے بہترین سگریٹ منگوا دوں گا۔“ بوڑھے نے مسکرا کر کہا۔ ”یہاں دنیا کا تمام کاروبار چلتا ہے، جیب میں مال ہونا شرط ہے۔“

”لیکن مال کہاں سے آئے گا؟“ رفیق نے حیرت سے پوچھا۔ ”میرا تمام اثاثہ تو گرفتاری کے بعد ہمارے محفوظ کر لیا گیا تھا۔“

”لیکن فرق نہیں پڑتا.....“ بوڑھے نے بڑے یقین سے کہا۔ ”کچھ کاروبار اعتماد کی بنیادوں پر بھی چلتے ہیں جن میں مال لاکھوں کا الٹ پھیر چلتا ہے، سگریٹ کے دو چار پیسے تو بڑی معمولی بات ہے۔ لیکن یہ قرض کون چکائے گا؟“ رفیق نے درد بھرے لہجے میں کہا۔ ”میری زندگی کے لمحے تو گئے گئے ہیں، کون جانے کب پھانسی کا حکم آ جائے اور.....“

”اوی گناہ ہے میرے دوست!“ بوڑھے نے جلدی سے رفیق کو دلاسہ دینے کی خاطر کہا۔ ”اصل مال مجھری والا کرتا ہے، عدالتوں کے فیصلے تو اوپر نیچے ہوتے رہتے ہیں..... ہو سکتا ہے کہ اگلے بھی منظور ہو جائے۔“

”تم نے ایک لمحے کو چونک کر بوڑھے قیدی کو دیکھا، زندگی کی ایک کرن اُس کی آنکھوں میں تیزی سے لڑکھڑکی، لیکن دوسرے ہی لمحے معدوم ہو کر رہ گئی، پھر سنتری کے وزنی جوتوں کی آواز دور سے آئی تو تینوں قیدیوں کی نگاہ راہداری کی جانب اٹھ گئی..... دو بار وردی سپاہی ہاتھوں میں رائفل اٹھائی کی طرف آ رہے تھے۔“

”بالاں احمد کون ہے؟“ دو فیتے والے سنتری نے بھاری بھر کم آواز میں تینوں قیدیوں کو مخاطب کر دیا۔

”بالاں احمد کون ہے؟“ دو فیتے والے سنتری نے بھاری بھر کم آواز میں تینوں قیدیوں کو مخاطب کر دیا۔

”بالاں احمد کون ہے؟“ دو فیتے والے سنتری نے بھاری بھر کم آواز میں تینوں قیدیوں کو مخاطب کر دیا۔

”بالاں احمد کون ہے؟“ دو فیتے والے سنتری نے بھاری بھر کم آواز میں تینوں قیدیوں کو مخاطب کر دیا۔

”بالاں احمد کون ہے؟“ دو فیتے والے سنتری نے بھاری بھر کم آواز میں تینوں قیدیوں کو مخاطب کر دیا۔

”بالاں احمد کون ہے؟“ دو فیتے والے سنتری نے بھاری بھر کم آواز میں تینوں قیدیوں کو مخاطب کر دیا۔

دل اندر سے موس کر رہ گئے، گزرتے وقت کے سنگین لمحوں نے نازلی کو کیسا اُحاذر کر رکھا تھا۔ اقبال احمد کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا، انہوں نے شادی کے بعد سے نازلی بیگم کو کبھی سکون کا سانس نہیں لینے دیا تھا، لہر لہر ہر پل نت نئے ستم ڈھائے تھے، زندگی اجیرن کر دی تھی۔ انہی خواہش کی تکمیل کے آگے انہوں نے نازلی بیگم کو کبھی کوئی اہمیت نہیں دی تھی، اپنے عیش و آرام کی خاطر انہوں نے بیوی کو ایک بے رحم ڈاکو بن کر طرح طرح سے لوٹا، جب تک نازلی بیگم کے پاس مال و دولت رہا اقبال احمد اُسے جھوٹی محبت کی آڑ لے کر گھن کی طرح اندر ہی اندر چاٹتے رہے، پھر گھر کی تمام چیزیں ایک ایک کر کے لوگوں کے ہاتھوں ارزاں داموں میں فروخت ہوتی رہیں لیکن نازلی بیگم بھی زبان سے اُف تک نہ کیا، شوہر کی خوشیوں کو برقرار رکھنے کی خاطر انہوں نے اپنی زندگی کی مسرتوں کو قربان کر دیا، ہر ستم کو نہایت خاموشی سے برداشت کرتی رہیں۔ اُس وقت ایک آدمی جس نے ایک عورت کو گرنے سے سنبھال رکھا تھا۔ ایک مرد کا وجود تھا جس نے حالات کو سہارا رکھا تھا۔ ایک شوہر کی ذات تھی جس نے ایک بیوی کے سہاگ کو زندہ رکھا تھا۔ ایک امید کی آواز تھی جس نے مایوسیوں کے باوجود حوصلوں کو مرنے نہیں دیا۔ ایک آرزو تھی جس نے حسرتوں کے ہجم تمناؤں کے دیپ جلا رکھے تھے لیکن۔ وہی سہارا جب درمیان سے ہٹ گیا تو امیدوں کے کھنڈرات میں بدل گئے۔ زندگی کی تمام تازگیوں نے جیسے سسک سسک کر دم توڑ دیا۔ رنگینیاں گھپ اندھیروں میں ڈوب کر رہ گئیں۔

اگر کچھ باقی تھا تو ایک عورت کا پیار باقی تھا جو ہڈیوں کے ڈھانچے کی صورت میں اقبال احمد سامنے موجود تھا اور محرومیوں کی اسی زندہ مثال نے جب اپنی تباہی اور بربادیوں کے ذمہ دار کو قریب پایا تو اُس کے ہونٹ خشک پتھریوں کی طرح کپکپانے لگے، آنکھوں کے ویران مطنوڑ زندگی کی حسرتیں تر پنے لگیں۔

”تم۔۔۔“ اقبال احمد نے بیوی سے کچھ کہنا چاہا لیکن شرمندگی اور ندامت کے احساس نے اُفت گویائی سلب کر دی۔

”آپ نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟“ نازلی بیگم نے شوہر کو مایوس دیکھ کر بڑے حوصلے۔

”ابھی میں نے ہمت نہیں ہاری، آپ دل چھوٹا کیوں کرتے ہیں، خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے۔“

”میں تم سے شرمندہ ہوں۔“ اقبال احمد نے بمشکل نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔ ”اگر ہو سکے تو مجھے آپ مجھے گنہگار کر رہے ہیں۔“ وہ فرط جذبات سے مغلوب ہو کر بولی۔ ”میری تمام فحش آپ کے دم سے ہیں۔“

”یہ تم کہہ رہی ہو۔۔۔؟“

”بھول جائے پرانی باتوں کو۔“ اُس نے جلدی سے کہا۔ ”میں نے ایک وکیل کر لیا ہے، اُڑ مجھے یقین دلایا ہے کہ آپ بہت جلد ضمانت پر رہا ہو جائیں گے، بڑی عدالت میں اپیل دائر کر رہا ہے، مجھے خدا کی ذات سے امید ہے کہ وہ بہتر کرے گا۔“

”تم۔۔۔ تم بہت بلند، بہت عظیم ہو نازلی!“ اقبال احمد نے گلوگیر لہجے میں ہنسنے لگا۔

”صبح کا بھولا شام کو گھوم رہا ہوں آجائے تو اُسے بھولا نہیں کہتے۔ اور موسم تو بدلتے رہتے ہیں۔ بہار کا موسم بدل گیا تو خزاں کی یہ رُت بھی بیت جائے گی اور پھر۔۔۔“ نازلی کے الفاظ اُس میں گھٹ کر رہ گئے۔ اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بوجھاؤ شروع ہوئی تو اقبال احمد کا کچھ نہ

کر رہ گیا، آج سچے دل سے اُن کا جی چاہا کہ بیوی کو پوری شدت سے اپنے بازوؤں کے حصار لے لیں، اُس کے بچتے ہوئے آنسوؤں کو اپنے دامن کی وسعتوں میں جذب کر لیں اور پھوٹ کر اتار دیں کہ ماضی کی تمام غلطیوں، تمام کوتاہیوں کا کفارہ ادا ہو جائے۔ لیکن آج تقدیر کی گردش نے اُسے اُٹھنے سے روکا۔

”تمہارے آنسو میرے دل کی گہرائیوں میں اُتر رہے ہیں۔“ اقبال احمد بھرائی آواز میں بولے۔

”خوشی کے آنسو ہیں۔۔۔۔۔“ نازلی بیگم نے پلکوں پر تھمے آنسوؤں کو دوپٹے کے پلو سے خشک کرتے ہوئے کہا۔ ”مسرتوں کے احساس نے مجھے جذباتی بنا دیا تھا۔“

”نوشہ کیسی ہے۔۔۔۔۔؟“ اقبال احمد نے گفتگو کے دوران نظریں جھکا کر بیٹی کا ذکر کیا تو نازلی بیگم لہجے کو ششدر رہ گئیں، پھر جلدی سے سرور لہجے میں بولیں۔ ”آج وہ اپنے افس کے کام میں فحش اس لئے۔۔۔۔۔“

”تم نے اچھا کیا جو اُسے ساتھ نہیں لائیں۔۔۔۔۔ میں شاید اُس سے نظریں بھی نہ ملا سکتا۔“

”ایمانت سوچئے۔۔۔۔۔ آپ کے کیس کا فیصلہ ہو جائے تو ہم نئے سرے سے اپنی زندگی کا آغاز مانگے۔“

”ایک بات پوچھوں۔۔۔۔۔؟“

”کیا تم نے واقعی سچے دل سے مجھے معاف کر دیا ہے؟“

”میں نے آپ سے پہلے کبھی کسی بات کا شکوہ کیا ہے جو آج آپ مجھ سے ایسی باتیں کر رہے ہیں؟“

”آج اس لئے دریافت کر رہا ہوں کہ وقت نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔“

”میں نے آپ کو کسی حال میں اپنے سے الگ نہیں سمجھا۔“

”میں تمہارا قرض دار ہوں نازلی۔۔۔۔۔ اگر قسمت نے موقع دیا تو گزرے وقت کے ایک ایک لمحے بت چکاؤں گا۔“

”خدا گواہ ہے۔۔۔۔۔ میں آج بھی آپ سے شاکہ نہیں ہوں۔“

اقبال احمد نے جواب میں کچھ کہنا چاہا لیکن کھاسی کے شدید دورے نے اُن کی حالت ابتر کر دی۔

”شوہر کی حالت دیکھ کر بوکھلا گئیں، لیکن دل مسونے کے سوا اور کچھ کرنا اُن کے اختیار میں نہیں تھا۔ جب کھاسی کی شدت کچھ کم ہوئی تو بولیں۔ ”کیا جیل کے ڈاکٹر نے آپ کا معائنہ نہیں کیا؟“

”میرے مرض ایسے ہوتے ہیں جن کا علاج نہ ہو تو مر لیض کو زیادہ خوشی ہوتی ہے۔“

”کیا مطلب۔۔۔۔۔؟“ نازلی بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

”قدرت کی لالچی نے آواز ہوتی ہے۔۔۔۔۔“ اقبال احمد ایک سر آہ بھر کر بولے۔ ”مجھے جو سزا مل رہی ہے میرے سیاہ اعمال کی طویل فہرست کے مقابلے میں بہت کم ہے۔“

”وقت کا مرہم، ہر زخم کے لئے تریاق ثابت ہوتا ہے۔“ نازلی بیگم نے سنجیدگی سے جواب دیا پھر گفتگو ختم ہوئے بولیں۔ ”اُسے ہاں! میں جلدی میں آپ کو ایک خوشخبری سنانا تو بھول ہی گئی۔“

”کیا۔۔۔۔۔؟“ اقبال احمد نے بڑی حسرت سے پوچھا۔

”میں نے جو اپیل داخل کی ہے کل اُس کی پہلی پیشی ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کل ہی ضمانت پر رہ جائیں۔“

”نازلی..... میری ایک بات مانو گی؟“

”آپ حکم دیجئے؟“

”تم نے جو اپیل داخل کی ہے اُسے واپس لے لو!“

”کیوں.....؟“

”اس لئے کہ قانون نے مجھے جو سزا دی ہے میں اُسے پوری کرنا چاہتا ہوں۔“ اقبال احمد سنجیدگی سے کہا۔ ”میں نے زندگی میں گناہ کئے ہیں اُن کا کفارہ میرے اُد پر فرض ہے۔ ہو سکتا ہے طرح میرے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جائے۔“

”لیکن ہمارا کیا بنے گا.....؟“ نازلی بیگم نے تڑپ کر پوچھا۔

”تمہیں اچھے دنوں کا انتظار کرنا ہوگا۔“

”لیکن.....“

”آج میں زندگی میں پہلی بار تم سے ایک درخواست کر رہا ہوں۔“ اقبال احمد نے بیوی کی بات کاٹتے ہوئے بڑے جذباتی انداز میں کہا۔ ”اپیل دائر کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا..... ممکن ہے وکیل قانون کی نگاہوں میں دھول جھونک کر مجھے آزاد کرانے میں کامیاب ہو جائے، لیکن میں ایسا ہونے دوں گا۔ اگر میں نے عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہو کر اقبال جرم کر لیا تو دنیا کا کوئی میرے ساتھ رعایت نہیں کرے گا..... شاید اُس وقت تمہیں بھی میری حرکت سے صدمہ پہنچے، اسی میں چاہتا ہوں کہ تم اپنا کیس واپس لے لو! جو روپے تم میری ذات پر خرچ کرنا چاہتی ہو وہ تمہارا نہیں گئے۔“

”جب آپ ہی نہ ہوں گے تو روپے میرے کس کام کے ہوں گے؟“ نازلی بیگم کی پگھل گونٹے بھینٹنے لگے۔ ”عورت کا سہاگ مرد کے دم سے قائم رہتا ہے، مرد خواہ کتنا ہی کمزور کیوں لیکن عورت کے لئے سب سے مضبوط اور ٹھوس سہارا ہوتا ہے اور آپ اس سہارے سے مجھے محروم چاہتے ہیں؟“

”کیا تمہیں اس بات کی خوشی نہیں کہ میں ابھی زندہ ہوں؟“

”اقبال.....“ اُس نے تڑپ کر شوہر کو دیکھا۔

”ابھی سانس نے رُوح اور جسم کے رشتوں کو سنبھال رکھا ہے۔“ اقبال احمد نے ہاتھ ملے کہا۔ ”کل تک وقت کے تقاضے میرا تعاقب کرتے رہے لیکن میں نے پلٹ کر پیچھے دیکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی..... آج میں وقت کے تقاضوں کو پورا کرنے کا خواہشمند ہوں۔ قدرت نے مجھے جو سزا دی ہے اگر وہ ہاتھ سے نکل گیا تو پھر ندامت کا احساس تمام عمر میری رُوح کو کچھ کے لگاتا رہے گا۔“

”گناہوں کا کفارہ گھر کی چار دیواری میں بھی ادا کیا جاسکتا ہے۔“ نازلی بیگم نے بڑی دیر سے کہا۔ ”پانچ سال کا عرصہ بہت ہوتا ہے، میں اتنا طویل سفر آپ کے سہارے کے بغیر کیسے سکوں گی؟“

”میں تم سے قریب رہ کر بھی ہمیشہ بہت دُور رہا ہوں اس لئے اب دُور رہ کر تمہارے پاس چاہتا ہوں۔“ اقبال احمد نے نچلا ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا۔ ”باہر کی دنیا کے ہنگاموں کا پھر مجھے کسی کمزور تنکے کی طرح بھا کر میری منزل سے دُور لے جائے گا..... میں ان ہنگاموں سے رہنا چاہتا ہوں..... اپنے اندر کے اس انسان کو مارنا چاہتا ہوں جس نے اپنی زندگی میں نہ جانے

میں کی بہادری کو خزاں سے ہمکنار کیا ہے..... اُس انسان کا مرجانا انسانیت کے لئے بہت ضروری ہے۔ ہر قیمت پر اپنے قدموں تلے روند کر کچل ڈالنا چاہتا ہوں۔ یہ میری زندگی کی سب سے اور آخری تمنا ہے..... ایسی خواہش جس کی تکمیل میرے لئے ایک مقدس فرض بن گئی ہے۔“

”حالات کا وقت پورا ہو چکا ہے.....“ سنتری نے قریب آ کر کہا تو اقبال احمد نے اپنے ہونٹ تلے تختی سے پیچ لے لے، نازلی بیگم شوہر کو حسرت بری نظروں سے نکلے جا رہی تھیں.....

نازلی کی آنکھوں میں التجا تھی..... رحم کی درخواست تھی..... ناکام تمناؤں اور بے چین آرزوؤں کی لہر چل رہی تھیں..... زندگی کی ٹھکن کا احساس تڑپ رہا تھا..... اور..... وقت کی گردش مسکرا رہی تھی.....

”پلوٹی بی..... وقت پورا ہو گیا.....“ سنتری نے دوبارہ قدرے سخت لہجے میں کہا تو نازلی بیگم نے سناٹے کی خاطر پوری شدت سے منھ پھینچ لیں اور ان آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کرنے لگیں۔

ایک گھبراہٹوں سے رہ رہ کر اُن کے دل کی خاطر پھل رہے تھے۔

”میری درخواست کو رد نہ کرنا.....“ اقبال احمد نے دلی زبان میں کہا پھر جلدی سے اپنا چہرہ دوسری کر لیا، ایک لمحے کو اپنی جگہ کسی بے جان بت کی طرح کھڑے رہے پھر آہستہ آہستہ قدم بڑھانے اور نازلی بیگم بدستور آہنی جالیوں کی دوسری سمت حسرت و یاس کی تصویر بنی کھڑی شوہر کو خود سے ہٹا دیتی رہیں..... اندر ہی اندر سستی رہیں.....!!

○○○

صبح کی نماز سے فارغ ہو کر اُنھی تو ذہن پر ابھی تک بچی رات کا ہلکا ہلکا خمار باقی تھا۔ ساری رات نے پگھلنے کے نیچے کاٹ دی تھی، نیند کے انتظار میں کر دینیں بدلتی رہی لیکن ایک پل کو بھی سو نہ سکی۔

کھانے کی میز پر فوزیہ خاتون کے طرز عمل نے جانے کیوں اُسے خوفزدہ کر دیا تھا جو وہ انہی باتوں کا دُغم میں الجھ کر رہ گئی، ذہن میں پڑی گرہ کو جتنا سلجھانے کی کوشش کی، اتنا ہی اُن جھتی چلی گئی۔ رہ رہ کر ایک ہی سوال اُس کے معصوم ذہن کو پریشان کرتا رہا.....

”بڑی اماں مجھ سے خفا کیوں ہیں.....؟“

اُس نے اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی، دلاسہ بھی دیا کہ ممکن ہے اُس نے جو کچھ سوچا ہو وہ اُس کا دُغم ہو، کبھی یوں بھی تو ہوتا ہے کہ بات کچھ بھی نہیں ہوتی لیکن رائی کا پہاڑ بن جاتا ہے اور حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے تو تمام اُن جھنیں خود بخود دُور ہو جاتی ہیں، انسان خود اپنی جگہ پشیمانی کا شکار ہوتا ہے۔ لیکن وہ کوششوں کے باوجود خود کو سمجھ نہ سکی..... اُن جھتی چلی گئی۔ نیند اُچاٹ ہوئی تو نہ وقت گزارنے کے لئے یوں ہی ایک کتاب اُنھالی لیکن پڑھائی میں بھی اُس کا جی نہ لگا تو اُنھ کو اگلیوں میں لپٹنے لگی، خود اپنے باریے میں سوچنے لگی، اس سے پہلے تو وہ بھی اتنی پریشان نہیں ہوئی اور پھر بات اتنی عجیب بھی تو نہ تھی کہ وہ بلاوجہ اضطراب کا شکار ہو گئی۔

ذہنی خاتون نے اگر اُس کے ساتھ وقتی طور پر روکھائی کا رویہ اختیار کر لیا تو کون سی قیامت آگئی اُس نے اُن کی خاموشی کو اپنی ذات سے کیوں منسوب کر لیا؟ گھر میں اُس کے علاوہ دوسرے ہی تو تھے، ہو سکتا ہے اُنہیں نادیہ کی کوئی بات بری لگی ہو، ممکن ہے فرحان کی کسی شرارت نے اُن کو اُن پر مجبور کر دیا ہو۔ یہ بھی بعید از قیاس نہیں تھا کہ وہ اُن کا کوئی ذاتی مسئلہ ہو جس کے اُنھیں اُنھی نظر آ رہی ہوں۔

نہ ہے۔۔۔۔۔ اُس نے بے پروائی سے جواب دیا پھر مریضوں کو دیکھنے میں مصروف ہو گئی۔
کے بعد دوسرا مریض آتا رہا، اُن کے رنگ مختلف تھے، لہجہ جدا گانہ تھا، عمروں میں تضاد تھا،
فرد کرد تھا، کوئی تندرست و توانا، کوئی سرمایہ دار تھا تو کسی کے پاس پوری طرح تن ڈھانپنے کو
بھی نہیں تھے۔ لیکن وہ سب سے ایک ہی انداز میں پیش آتی رہی، اُس کا لہجہ بے حد نرم اور پیار
پر کسی سے پوری توجہ سے اُس کی بیماری کا حال دریافت کرتی، مرض کی نوعیت کو سمجھنے میں کسی
کے کام نہ آتی، مریض کے دکھ درد کے ساتھ ساتھ اُس کی ذہنی نفسیات کو بھی سمجھنے کی کوشش
پہلے سے خطا انداز میں وہ ایں اور پرہیز تجویز کرتی۔۔۔۔۔ مریض کو یقین دلاتی کہ اگر اُس نے
سے علاج جاری رکھا تو وہ ضرور رُو بصحت ہو جائے گا۔

کاروبار مریض کے ساتھ بے حد شفقانہ اور محبت سے بھرپور ہوتا، چھوٹے بڑے اور امیر و
غریب کے بغیر وہ سب سے بڑی اپنائیت سے پیش آتی۔ اُس نے اپنے کاؤنٹر کلرک اور کیشئر کو
ہدایت کر رکھی تھی کہ کسی کو نمبر کے بغیر اُس کے پاس اندر نہ آنے دیا جائے لیکن یہ تاکید بھی کی
کہ کوئی امیر جنسی کیس ہو تو اُسے بلا تاخیر انٹرکام پر اُس کی اطلاع دی جائے، خاص طور پر اُس
کو حکم دے رکھا تھا کہ وہ فیس کی وصولیاتی کے سلسلے میں سختی کا مظاہرہ نہ کرے، اگر کوئی مریض
لے کے قابل نہ ہو تو اُس کی فیس کی رقم کلینک کے اکاؤنٹ میں ڈال دی جائے۔

وقت بھی وہ ایک مریض کو دیکھنے میں مصروف تھی کہ فون کے بزنے اُس کی توجہ اپنی طرف
لے لیا، اُس نے آپریٹر کو تاکید کر رکھی تھی کہ مریضوں کو دیکھتے وقت صرف انتہائی اہم اور ضروری
ڈائریکٹ کی جائے ورنہ نام اور فون نمبر درج کر کے بتا دیا جائے کہ ڈاکٹر اس وقت کسی کیس
ف ہے۔

۔۔۔۔۔ اُس نے مریض سے معذرت چاہتے ہوئے ریسیور اٹھالیا۔

ظہیر ابراہیم کی کال سے میڈم۔۔۔۔۔

اُس نے ناخوشگوار انداز میں کہا اور سامنے پیڑ پر یوں ہی آڑی ترجھی لکیریں کھینچنے لگی۔

۔۔۔۔۔ ڈاکٹر ثناء! دوسری جانب سے سیٹھ ابراہیم کی بھاری بھر کم آواز سنائی دی۔

لاری ہوں۔۔۔۔۔ اُس نے سپاٹ لہجے میں دریافت کیا۔ ”کوئی پر اہم۔۔۔۔۔؟“

ڈاکٹر اائف کو رات سے بخار ہے۔۔۔۔۔ میں نے کچھ دیر پہلے ہی نمبر پر لیا تھا، اس وقت بھی نانٹی

بے ہے۔۔۔۔۔ میں کلینک سے اُنھوں کی تو دیکھتی جاؤں گی۔“ اُس نے جملہ پورا کرتے ہی
ڈال پر رکھ دیا، پھر انٹرکام پر آپریٹر سے رابطہ قائم کر کے ہدایت دی کہ اگر سیٹھ ابراہیم کا
ناتے تو یہ کہہ کر ٹال دیا جائے کہ وہ وارڈ میں جا چکی ہے۔

کی طرف سے فارغ ہو کر وہ دوبارہ مریض کو دیکھنے لگی۔ اور ابھی وہ مریض سے فارغ ہو کر
اپنے کو بلائے کے لئے کال بیل پر انگلی رکھتے بھی نہ پائی تھی کہ دوبارہ فون کا بزن سن کر ریسیور
مبارکھری کی کال تھی۔

۔۔۔۔۔ اُس نے کرسی سے ٹیک لگاتے ہوئے نرم آواز میں کہا۔

طبیعت ٹھیک نہیں ہے، اگر ممکن ہو تو فوراً چلی آؤ!“

۔۔۔۔۔ دو یکفخت پریشان ہو گئی۔

دوسروں نے تو فوزیہ خاتون کی سنجیدگی پر بے اعتنائی کا کوئی اثر نہیں لیا تھا، پھر وہ اتنی پریشان
تھی؟ ہمیشہ رہنے کا ارادہ تو نہیں تھا جو وہ ذرا ذرا سی باتوں کا اتنا گہرا اثر لے رہی تھی۔ اتنی رات
روشنی جلا کر کمرے میں ٹھہلنا بھلا کہاں کی دانشمندی تھی، کوئی دیکھے تو نہ جانے کیا خیال کرے گا؟
سوچے گا اُس کے بارے میں؟ ”کیا بات ہے آپ؟۔۔۔۔۔ آپ ابھی تک جاگ رہی ہیں۔“

نادیہ کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز اُس کے کانوں سے ٹکرائی تو اُس کا دل یوں تیز تیز دھڑکنے لگا
کوئی سنگین جرم کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑ لی گئی ہو، جلدی سے خود کو سنبھالتے ہوئے اُس نے بار
سمت دیکھا، یوں ہی جمایا لیتے ہوئے بولی۔ ”پیارا لگی تھی اس لئے پانی پینے کے ارادے سے اُٹھی تھی
”پلیز آئی۔۔۔۔۔ لائٹ آف کر دو، نیند آؤ گی تو میں سو نہ سکوں گی۔“

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا، جلدی سے لائٹ آف کر کے دوبارہ اپنے بستر پر آ گئی،
اندھیرے میں ہر شے ڈوب کر رہ گئی، لیکن اُس کا ذہن جاگتا رہا۔ ایک بے نام سی بے چینی تھی جو
کسی کروٹ چین نہیں لینے دے رہی تھی۔ معاً ایک خیال اُس کے ذہن میں تیزی سے ابھر۔
نہ وہ نیند کی گولی لے لے، وقتی اُنھیں سے تو نجات مل جائے گی۔ مگر اُسے یہ خیال بھی ترک کر
نیند کی گولی کھانے کی خاطر اُسے دوبارہ اٹھنا پڑتا، جتنی روشن کرنا پڑتی اور گولی کھانے کی خاطر اُ
گھونٹ پانی بھی پینا پڑتا اور پانی کا بہانہ وہ ابھی نادیہ سے کر چکی تھی۔

اُسے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا، خاصی دیر تک خود کو لعنت ملامت کرتی رہی، وہ ڈاکڑی کی
حاصل کر رہی تھی، اُس نے طے کر رکھا تھا کہ وہ ہر قیمت پر خود کو کامیاب ڈاکٹر بنانے کی خاطر سرد
بازی لگا دے گی، پھر دوسروں کی مسیحا میں وہ اپنا تن، من، دھن سب کچھ وقف کر دے گی۔
ڈاکٹر ایسا ہی ہوتا ہے؟۔۔۔۔۔ اتنا کمزور اور حساس کہ ذرا ذرا سی بات پر ہمت ہار کر سوچنے بیٹھ جائے
اُس نے خود سے سوال کیا، پھر اپنے بارے میں سوچنے لگی، خوابوں کے درپے کھلے تو اُس

ایک خوبصورت سا کلینک دیکھا۔ مختصر مگر بے حد روشن، صاف ستھرا اور اُس کی خواہشات کے عین
جس کے بڑے بھانک کے اوپر ”ٹنا کلینک“ کا خوبصورت بورڈ نیون سائن کی روشنی سے جگمگا
پھر اُس نے دیکھا کہ وہ اپنے کلینک کے سامنے ایک حسین گاڑی سے نیچے اتر رہی ہے، یہ گاڑی اُس
ملکیت ہے۔ گاڑی سے اترتے ہی اُس کی نظر اپنی نازک مگر قیمتی دسٹی گھڑی پر پڑی تو ایک لمحہ کو اُس
خوبصورت اور کشادہ پیشانی پر آڑی ترجھی سلوٹیں ابھر آئیں، اُس نے اگلی نشست پر بیٹھے
ڈرائیور سے کہا۔ ”آج تمہاری وجہ سے مجھے کلینک پہنچنے میں دیر منٹ کی دیر ہو گئی۔۔۔۔۔ آئندہ تم
میں مریضوں کو انتظار کی زحمت میں مبتلا رکھنا اپنے پیشے کی توہین سمجھتی ہوں۔۔۔۔۔“

پھر وہ ڈرائیور کے جواب کا انتظار کئے بغیر تیزی سے اُتری اور اپنے مخصوص کمرے کی طرف
بڑھانے لگی، کلینک کا عملہ اُسے پوری طرح چاق و چوبند نظر آ رہا تھا، اُن ڈیوٹی نرس نے اُسے
بیٹھتے ہی اطلاع دی کہ سیٹھ ابراہیم کا فون دوباراً چکا ہے۔

”کیا پر اہم ہے؟“ اُس نے نرس سے پوچھا۔ ”نکل ہی تو میں نے اُن کی وائف کو ڈنٹ
معمولی سا نزلہ زکام ہے، دو ایک روز میں ٹھیک ہو جائے گا۔“

”اُن کا حکم تھا کہ آپ جیسے ہی کلینک تشریف لائیں آپ کو اُن کے بارے میں مطلع کر دیا جا
”تم نے دریافت نہیں کیا کہ کیا ایمر جنسی ہے؟“

”وہ صرف آپ سے گفتگو کرنے کو کہہ رہے تھے۔۔۔۔۔“

”تمہارے بغیر گھر بڑا سونا سونا لگ رہا ہے، کچھ موسم نے بھی تمہاری کمی کے احساس کو۔“

”احمر.....“ اُس نے مسکراتے ہوئے بڑے پیار بھرے انداز میں کہا۔ ”بری بات۔“

جھوٹ نہیں بولتے۔“

”ذرا باہر نکل کر دیکھو..... اودے اودے بادل کس قدر گھر کر آئے ہیں، ہوا میں خنکی بھی ہو گئی ہے، ایمان سے اگر بارش ہوگئی تو.....“

”احمر، پلیز.....“ اُس نے احمر کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”آپ بھول رہے ہیں کہ میں ایک ڈاکر بھی ہوں اور یہ وقت میرے مریضوں کے لئے مخصوص ہے۔“

”اور آپ یہ کیوں فراموش کر رہی ہیں کہ میں بھی مریض ہوں..... مریض محبت، جسے آپ کے پاس دیکھنا بتا رہا ہے۔“

اور احمر کی آواز کانوں میں گونجی تو وہ کلینک سے نکل کر دوبارہ اپنی خوابگاہ میں آگئی۔ احمر کا ذہن میں ابھرا تو اُسے اپنی پریشانی کی وجہ بھی سمجھ میں آگئی۔ فوزیہ خاتون صرف اُس کی بیوی ہی نہیں احمر کی والدہ بھی تھیں۔

احمر..... جسے شانے ٹوٹ کر چاہا تھا..... جس کے پیار کو وہ اپنی زندگی کا سب سے قیمتی اور سہرا سمجھ رہی تھی..... پھر وہ احمر کی ماں کی بدلی ہوئی نظر کو محسوس کر کے پریشان نہ ہوتی تو اور کیا کرتا؟ رات بھر وہ اپنے ذہن میں ابھرنے والے متضاد خیالوں میں ابھی رہی، ابھی احمر کا تصور اُس کے نگاہوں کے سامنے سادوں کے بھرے بادلوں کی طرح ابھرتا تو اُس کی روح مسرتوں کے نادیہ جہاں سے سرشار ہو جاتی، اُس کا ایک ایک خوشیوں کے احساس سے جھومنے لگتا، وہ اندر ہی اندر مٹکتی لگتی..... لیکن جب اُسے فوزیہ خاتون کی بے زنی کا خیال آتا تو وہ یوں کانپ اٹھتی جیسے بادل پر زور سے گزرتے ہوں۔

صبح تک وہ کچھ ایسی ہی کیفیتوں سے دوچار رہی، پھر اذان کی آواز سنائی دی تو جلدی سے بیٹھی، اس خیال سے کہ نہیں روشنی کرنے سے نادیہ کی آنکھ نہ کھل جائے وہ نماز پڑھنے کے لئے لاؤنج میں آگئی..... نماز سے فارغ ہو کر اٹھی تو پریشان رات کے بوجھل بوجھل اثرات ابھی تک کے ذہن پر طاری تھے۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی کرے کی طرف واپس جا رہی تھی کہ احمر کی سن کر زک مٹی، پلٹ کر دیکھا تو احمر چند قدم کے فاصلے پر موجود تھے۔

”صبح بخیر.....“

”صبح بخیر.....“ اُس نے دھڑکتے ہوئے دل سے جواب دیا پھر جلدی سے بولی۔ ”آپ اتنی بے

کیے اٹھ گئے؟“

”کیوں..... کیا اللہ میاں پر صرف آپ ہی کا حق ہے؟“ احمر نے اتنے پیار اور بھولپن سے

دیا کہ وہ چل سی ہو کر رہ گئی۔

”چائے پیئیں گے آپ.....؟“ اُس نے مسکرا کر پوچھا۔

”آج چائے کی خواہش نہیں ہو رہی۔“ احمر نے معنی خیز انداز میں زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

”کیوں..... آج کیا خاص بات ہے؟“ اُس نے دبی زبان میں سوال کیا۔

”رات آپ کی بڑی اماں نے مجھ سے کچھ فیصلہ کن بات کی ہے۔“ احمر یکتا خبیہ ہو کر

اُن کی آنکھوں میں ابھرنے والی مسرتوں کا احساس اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ وہ جان بوجھ کر

اپنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

”کئی خاص بات.....؟“ اُس نے بھی مصنوعی تشویش کا اظہار کیا۔

”پلے وعدہ کیجئے کہ آپ اس بات کو سن کر پریشان نہیں ہوں گی۔“

”اُس نے احمر کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے وعدہ کر لیا۔“

”آپ کو یاد ہے..... میں نے ایک بار آپ کو نیرولی سے فون کیا تھا؟“

”جی ہاں..... اُس روز آپ نے مجھے خاصا پریشان کر دیا تھا۔“

”میں نے اس مذاق کے لئے معذرت بھی طلب کر لی تھی اور.....“ احمر ایک لمحے کو زب کے پھر

دلی والہانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے۔ ”اُس روز میں نے آپ کو ایک خوشخبری بھی سنائی تھی۔“

”اُس..... کچھ یاد آ رہا ہے۔“ اُس نے شوخی سے جواب دیا۔

”میرے نہیں..... ایک دو روز میں آپ کو سب کچھ یاد آ جائے گا۔“

”کیا کوئی خاص حادثہ رونما ہونے والا ہے؟“ اُس نے بڑی مصحوبیت سے پوچھا۔

”بے حد خوشگوار حادثہ.....“ احمر نے سرگوشی کی۔ ”امی جان اور چچی جان کے درمیان آج کل میں

اہم مسئلے ہونے والا ہے۔“

”پھر؟“ اُس نے اپنی معصوم دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے بڑے بھولپن سے کہا۔ ”میں کیا کروں؟“

”ابھی سے شرماتے ہی پریکس شروع کر دیجئے..... بعد میں بہت کام آئے گی۔“

اور احمر کا جواب سن کر اُس کی آنکھیں حیا کے بوجھ سے جھک گئیں، جلدی سے شرماکر پلٹی اور تیز تیز

گلی سے گزرتے میں آگئی..... احمر کے ایک ہی جملے نے اُس کی رات بھر کی تھکن اور بے چینی کو

روا..... ایک ہی پل میں جیسے کا یا پلٹ کر رہ گئی..... جیسے کڑی ڈھوپ کے بعد اچانک بادلوں نے

لڑکر موسم کا انداز بدل دیا ہو..... احمر کا آخری جملہ اُس کے کانوں میں رس گھول رہا تھا..... اس

کی مثالیاؤں کی گونج بھی تھی..... شہنائی کی تیز آواز بھی تھی جو اُس کے وجود کو ہلے ہلے گدگدا

کر رہی تھی۔

”احمر.....“ اُس نے آہستہ سے احمر کا نام لیا پھر آنکھیں موند کر خوابوں کی دنیا میں گم ہو گئی، خیالوں

والے پسوں کی حسین دادیوں میں بہت دُور تک نکل گئی.....!!

○○○

باز پرگلی گھڑی نے دس کا اعلان کیا تو شاملہ بیگم نے اخبار ایک طرف رکھ دیا۔ وقار احمد اور ثار

ب دستور سویرے ہی ناشتے سے فارغ ہو کر دفتر چلے گئے تھے، فرحان اور صائمہ سکول جا چکے

اور اپنے کمرے میں بھی، شانے آج کالج سے نماندہ کیا تھا اس لئے ماں کے قریب بیٹھی تھی۔ احمر

کے دوست سے ملنے کا کہہ کر گئے تھے۔

مگر تمام افراد ناشتے سے فارغ ہو چکے تھے لیکن شاملہ بیگم ابھی تک فوزیہ خاتون کی منتظر تھیں جو

غائب معمول دس بجے تک اپنی خواب گاہ سے باہر نہیں آئی تھیں۔

”اُس نے سرود کی کوئی گولی کھائی یا نہیں؟“ شاملہ بیگم نے ناشے دریافت کیا۔

”معمولی سادو ہے، جاتا رہے گا۔“

”کیا بات ہے.....؟“ شاملہ بیگم نے ناشے کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”تمہارا جی تو ٹھیک ہے؟“

”نہیں کیا ہوا..... بھلی جنگی تو آپ کے سامنے بیٹھی ہوں۔“

کی خاطر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”خمنوں کے کان بہرے..... طبعیت تو ٹھیک ہے آپ کی؟“ شائلہ بیگم نے فوزیہ خاتون سے بے ہمتی سے کہا۔ ”آج خلاف معمول بہت دیر ہوگئی، مجھے تو ہول ہونے لگا تھا۔ ایک دو بار سوچا بھی بردارے پر دستک ڈول لیکن اس خیال سے ارادہ ترک کر دیا کہ کہیں نیند خراب نہ ہو۔“

”رات دیر سے آنکھ لگی تھی اس لئے جلدی بیدار نہ ہو سکی۔“

”ہاں لگواؤں.....؟“

”کیا تم نے ابھی تک ناشتہ نہیں کیا.....؟“ فوزیہ خاتون نے حیرت سے پوچھا۔

”آپ کے بغیر کیسے کر سکتی تھی؟“ شائلہ بیگم نے بڑے خلوص سے جواب دیا، پھر فوزیہ خاتون کو نلے ڈانگ روم میں آگئیں جہاں شائلہ بیگم کے ساتھ مل کر ناشتے کے اہتمام میں مصروف تھی۔

فوزیہ خاتون نے ثنا کو غور سے دیکھا، ایک لمحے کو ان کے چہرے کی رنگت بدلی پھر انہوں نے ثنا کے

کا جواب دیتے ہوئے پوچھ لیا۔

”تم آج کالج نہیں گئیں.....؟“

”کچھ ضروری پڑھائی کرنی تھی اس لئے چھٹی کر لی۔“ ثنا نے نہایت ادب سے کہا۔

”ہاں بیٹی کہاں ہے.....؟“

”اپنے کمرے میں ہوگی۔“ شائلہ بیگم بولیں۔

”کیا وہ بھی کالج نہیں گئی؟“

”اُس کے شروع کے پیریڈ خالی ہیں اس لئے آج دیر سے جائے گی۔“ ثنا نے جواب دیا۔

”اگر کہاں ہے؟“ فوزیہ نے پوچھا۔ ”میرا مطلب ہے کہ کیا وہ ناشتہ کر چکا ہے؟“

”بہت دیر ہوئی.....“ شائلہ بیگم نے پراٹھوں کی پلٹ فوزیہ خاتون کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

”دوست سے ملنے گیا ہے.....“

”یہ زیادتی ہے.....“ فوزیہ خاتون نے اِکساری سے کام لیتے ہوئے شائلہ بیگم سے کہا۔ ”میری وجہ

”میں بھی ناشتے کا انتظار کرنا پڑا۔“

”اس میں زیادتی کی کیا بات ہے؟ رشتے کے اعتبار سے بھی آپ کی خدمت کرنا میرا فرض ہے۔“

”سوچ لو.....“ فوزیہ خاتون نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”کہیں ایسا نہ ہو کہ رشتے والی بات میں

لگاؤ ہو جیسا کہ بنا کر بنا جائے۔“

شائلہ بیگم فوزیہ خاتون کی بات کا مفہوم سمجھ کر مسکرا دیں، انہوں نے ثنا کو جانے کا اشارہ کیا تو ثنا

لے لے کچھ نہ سمجھ سکی، پھر جب ماں کے اشارے کا مقصد سمجھ میں آیا تو اُس نے جلدی سے نظریں

اٹکیں اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ڈانگ روم سے باہر چلی گئی..... جانے کیوں اُس کا دل آپ

آپ دھڑکنے لگا۔

”تم نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔“

”کیا سوچ رہی ہوں کہ کیا جواب دوں۔“ شائلہ بیگم مسکراتے ہوئے بولیں۔

”کیوں..... کیا تمہیں کوئی دشواری پیش آرہی ہے؟“

”دشواری کیسی.....“ شائلہ بیگم نے جلدی سے کہا۔ ”میں رشتے میں آپ سے چھوٹی ہوں اور یہ

تمہیں نے ہمیشہ تسلیم کی ہے۔“

”میں نہیں مان سکتی..... تم نے تو بخار کی حالت میں بھی کالج کا ناغہ نہیں کیا اور اب تو تمہارے

امتحان بھی قریب ہیں۔“

”دراصل آج میری صرف ایک کلاس تھی، سر میں بھی درد تھا اس لئے میں نے سوچا کیوں نہ کر

کر لیا جائے۔“

شائلہ بیگم کچھ کہنا چاہتی تھیں لیکن فون کی گھنٹی بجی تو انہوں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔

جانب سے شائلہ بیگم کی آواز سنائی دی تو بڑے پیار سے بولیں۔ ”سلام آپا جان..... آج آپ نے

ہی صبح کیسے یاد کر لیا، خیریت تو ہے؟“

”میں تم سے ایک مشورہ کرنا چاہ رہی تھی..... فوزیہ خاتون کو کھانے پر بلانے کے سلسلے میں۔“

”اس میں مشورے کی کیا بات ہے؟ بلکہ میں تو کہتی ہوں کہ آپ فوزیہ بہن کو آج ہی دعوت

دیجئے!“

”کہاں ہیں فوزیہ.....؟“

”ابھی تک اپنی خواب گاہ میں ہیں..... میں نے بھی اُن کے انتظار میں ناشتہ نہیں کیا۔“

”تمہارے خیال میں میرا دعوت دینا مناسب ہوگا..... میرا مقصد ہے کہ کہیں فوزیہ خاتون

سمجھیں کہ ہم کسی خاص غرض کی خاطر اُن کی آؤ بھگت کر رہے ہیں۔“ شائلہ بیگم نے سنجیدگی سے

”اسی مصلحت کے تحت میں نے ابھی تک دعوت کا ذکر نہیں چھیڑا، ورنہ منصور کے والد تو کئی بار اس

میں یاد دہانی کر چکے ہیں۔“

”اگر یہ بات ہے تو پھر آپ فی الحال دعوت کو ٹال جائیں۔“ شائلہ بیگم نے سوچتے ہوئے

دیا۔ ”فوزیہ بہن کا تو ابھی رکنے کا ارادہ ہے، جب کوئی بات شروع ہو تو بلاو ادے دیتے گا۔“

”کیا فوزیہ نے ابھی تک احمر کے سلسلے میں کوئی بات نہیں چھیڑی؟“ شائلہ بیگم نے کہا۔ ”اُنے

پیشتر انہوں نے تمہیں جو خط لکھا تھا وہ تو خاصا اُمید افزا تھا۔“

”اشاروں کنایوں میں ایک دو بار فوزیہ بہن نے اس خط کا ذکر چھیڑا تھا لیکن ابھی کھل کر کوئی

نہیں ہوئی، اور جب تک خود اُن کی جانب سے.....“ شائلہ بیگم کو اچانک اس بات کا احساس ہوا،

قریب بیٹھی ہے تو انہوں نے جملہ مکمل نہیں کیا، ناشتہ تیار کرنے کے بہانے اُسے باورچی خانے کی طرف

روانہ کیا پھر بولیں۔ ”معاف کیجئے گا آپا! شاپاس بیٹھی تھی اس لئے میں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔“

”تمہارا کیا خیال ہے..... کیا فوزیہ خاتون کسی وجہ سے توپس وپش نہیں کر رہی ہیں؟“

”ایسی بات ہوئی تو انہیں بلا وجہ خط لکھنے کی کیا ضرورت تھی..... میرا تو خیال ہے کہ انہیں

بات کا علم بھی ضرور ہوگا کہ ثنا اور احمر ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔“ شائلہ بیگم بولیں۔ ”اگر

اُگلوتا بیٹا ہے..... کیا وہ اُس کی خوشی بھی پوری نہ کریں گی؟“

”میں تو ہر وقت خدا سے یہی دعا کرتی ہوں کہ نادیہ کی طرح ثنا کا رشتہ بھی طے ہو جائے۔“

”آپ پریشان نہ ہوں آپا..... خدا بہتر کرے گا۔“

”اگر کوئی بات شروع ہو تو مجھے فوراً مطلع کرنا۔“

”کمال کرتی ہیں آپا..... ثنا کی بات طے ہو اور میں آپ کو اطلاع نہ دوں، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

کچھ دیر بہنوں کے درمیان اسی قسم کی گفتگو ہوتی رہی، پھر فوزیہ خاتون خواب گاہ سے باہر

شائلہ بیگم نے بہن سے پھر کسی وقت فون کرنے کا وعدہ کر کے ریسیور رکھ دیا اور جیشانی کو خوش

”میں چاہتی ہوں کہ اب ہمارے درمیان رشتے کی نوعیت اور مستحکم اور مضبوط ہو جائے۔“ فوزیہ خاتون نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اسی خیال کے تحت میں رات دیر تک جاگتی رہی اور سوچتی رہی کہ وہ بات جو کل ہوئی ہے، تیری کیوں نہ ہو جائے۔“

”ایسی کیا بات ہے جس نے آپ کی راتوں کی نیند اڑا دی۔۔۔۔۔ یہ پریشانی تو صرف لڑکی والوں کے حصے میں لکھی ہوتی ہے۔“

”بچے سب ایک جیسے ہوتے ہیں اور ان کی فکریں بھی ایک ہی جیسی ہوتی ہیں۔“ فوزیہ خاتون نے کہا۔ ”اگر لڑکی والوں کو یہ فکر لاحق ہوتی ہے کہ بچی کا نصیب اچھا ہو تو لڑکے والوں کو بھی یہ فکر دامن گیر دیتی ہے کہ رشتے میں کوئی ایسی اوجھ بچ نہ ہو جو زندگی بھر کا روگ بن جائے۔“

”یہ تو ہے۔۔۔۔۔ لیکن قسمت کے لکھ کو کون مٹا سکتا ہے؟“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔۔۔۔۔ ہوتا وہی ہے جو خدا کو منظور ہو۔ لیکن دیکھ بھال کر قدم اٹھانا بھی ضرور ہے۔“ فوزیہ خاتون نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں نے اسی لئے بہت غور و خوض کے بعد اپنے احقر لئے تمہارے گھر کا انتخاب کیا ہے۔“

”میں اسے بھی اپنی خوش قسمتی سمجھتی ہوں کہ آپ نے ہمارے گھر کو کسی قابل سمجھا۔۔۔۔۔“

”میں چاہتی ہوں کہ یہ معاملہ جتنی جلدی طے پا جائے اتنا ہی اچھا ہے۔“

”ایسی بھی کیا جلدی کہ آپ نے ناشتے سے ہاتھ روک لیا۔۔۔۔۔“ شائلہ بیگم نے مسکراتے ہوئے کہہ پہلے آرام سے ناشتہ کر لیجئے، پھر اطمینان سے بیٹھ کر باتیں بھی ہوتی رہیں گی۔“

فوزیہ خاتون نے شائلہ بیگم کے اصرار پر دو چار نوالے اور لے لئے، پھر چائے پینے کے بعد وہ اکر ڈرائنگ روم میں آگئیں، کچھ دیر تک دونوں کے درمیان رسمی باتیں ہوتی رہیں پھر فوزیہ خاتون سنبھل کر کہا۔ ”میری خواہش ہے کہ نیر دبی جانے سے پیشتر احقر کی منگنی کی رسم ادا کر دی جائے، شائلہ بیگم نے تاریخ بعد میں طے ہوتی رہے گی۔“

”یہ تو بڑا نیک خیال ہے۔“ شائلہ بیگم نے بھی سنجیدگی اختیار کر لی۔ ”انسان اپنے فرائض کی ادا سے جتنی جلدی سبکدوش ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔“

”احقر کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟“ فوزیہ خاتون نے پوچھا۔ ”اگر تمہیں اُس میں برائی یا عیب نظر آتا ہے تو ابھی کھل کر بتا دو۔۔۔۔۔ میں تمہاری بات کا برا نہیں مانوں گی۔“

”کیسی بات کر رہی ہیں آپ۔۔۔۔۔ بھلا میں اور احقر کی برائی کروں گی؟“ شائلہ بیگم نے ہنسا پنائیت سے کہا۔ ”خدا گواہ ہے کہ میں اُسے اپنے بچوں سے کم عزیز نہیں رکھتی۔“

”اسی لئے تو میں اُسے تمہاری فرزندگی میں دینا چاہتی ہوں۔“

”فوزیہ بہن۔۔۔۔۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں فون کر کے آپا جان کو بلا لوں؟“ شائلہ بیگم بولے

”خوشی کے اس بڑے مسرت موقع پر کسی بزرگ کا ہونا بھی ضروری ہے۔۔۔۔۔“

”میرا خیال ہے کہ پہلے بات ہم دونوں کے درمیان طے ہو جائے، پھر خاندان کے دوسرے کو بھی باقاعدہ اطلاع دے دی جائے گی۔“

”جیسی آپ کی مرضی۔۔۔۔۔“

”تم نے شائلہ بیگم کی ذمہ داری جس حسن و خوبی سے پوری کی ہے وہ اپنی مثال آپ۔۔۔۔۔“

”چچ پوچھو تو تم نے اُسے بڑی خوبصورتی سے تراش کر کندن بنا دیا ہے، مجھے شاکر رکھ رکھاؤ، شکریہ کا

والا بھالا سا انداز اور اٹھنے بیٹھنے کا سلیقہ بے حد پسند ہے۔“

”میں بیگم نے کوئی جواب نہیں دیا، شائلہ کی تعریف سن کر اندر ہی اندر خوش ہوتی رہیں۔

”مجھے یقین ہے کہ شائلہ جس گھر میں بیاہ کر جائے گی اُسے اپنی قسمت پر بجا طور پر فخر ہوگا۔“

”میں بیگم بدستور خاموش رہیں۔ لیکن وہ فوزیہ خاتون کی زبان سے وہ بات سننے کو بے چین تھیں کہ انہیں بہت عرصے سے انتظار تھا۔

”مجھے اس بات کا بھی علم ہے کہ احقر شاکر کو پسند کرتا ہے۔۔۔۔۔“

”طبیعت میں یکسانیت ہو تو انسان بہت جلد ایک دوسرے سے مانوس ہو جاتا ہے۔“ شائلہ بیگم نے

بان میں کہا۔ ”احقر شاکر کی عادتیں بھی ایک دوسرے سے بہت ملتی جلتی ہیں۔“

”میں نے قریب رہ کر اس کا اندازہ بھی لگا لیا ہے۔“ فوزیہ خاتون نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

”میں نے اپنی زندگی کے تمام فیصلے ہمارے اوپر چھوڑ دیئے ہیں لیکن اُس کی چھوٹی سی آرزو بھی ہے

لی جھیل کو اُس نے اپنی زندگی کا مقصد بنا رکھا ہے۔۔۔۔۔“

”وہ کیا۔۔۔۔۔؟“

”اُس کی خواہش ہے کہ پہلے اپنی ڈاکٹری کی تعلیم مکمل کر لے، اس کے بعد عملی زندگی میں قدم رکھے۔“

”تو بہت مناسب اور نیک ارادہ ہے۔“ فوزیہ خاتون جلدی سے بولیں۔ ”تمہیں اُس کی خواہش

زام کرنا چاہئے۔ خدا نظر بد سے بچائے۔۔۔۔۔ ماشاء اللہ بہت سعادت مند اور ذہین بچی ہے، مجھے

اوقات سے یقین ہے کہ تمہاری محنت رائیگاں نہیں جائے گی اور شاکر نہ ایک دن ڈاکٹر بن کر بڑا

بار کرے گی۔“

”خدا آپ کی زبان مبارک کرے۔۔۔۔۔“

”تمہاری خوشی میری اپنی خوشی ہے، میں نے تمہیں کبھی اپنے سے الگ نہیں سمجھا، اگر غیر سمجھتی تو

سے پہلے تمہیں احقر کے سلسلے میں وہ خط نہ لکھتی۔“ فوزیہ خاتون نے پہلو بدل کر کہا پھر قدرے دلی

میں بولیں۔ ”تم میری طبیعت سے بھی بخوبی واقف ہو۔۔۔۔۔ خدا نے مجھے جس حال میں بھی رکھا

مانے آئی پر سجدہ شکر ادا کیا۔ البتہ یہ میری کمزوری ہے کہ میں نے اپنے اور برائے خون کی تمیز

اطور طریقہ کبھی نہیں بدلا۔۔۔۔۔ یوں سمجھ لو کہ یہ عادت مجھے خاندانی ورثے میں ملی ہے، خود میری

لے لو! ایک سے ایک اچھے اور بڑے گھرانے کے رشتے موجود تھے۔ لیکن خدا کروٹ کروٹ

سیب کرے ابامیاں کو انہوں نے تمام رشتوں کو بیک جنبش زبان رد کر دیا اور شجرۂ حسب و نسب

کے بعد تمہارے جیٹھ کے حق میں ہاں کر دی۔۔۔۔۔ احقر کے لئے بھی میں نے اسی وجہ سے بہت غور

کے بعد نادیہ کا انتخاب کیا ہے۔۔۔۔۔“

”کی۔۔۔۔۔؟“ شائلہ بیگم نے چونک کر فوزیہ خاتون کی طرف دیکھا۔۔۔۔۔ اُن کی آنکھیں فریاد حیرت

کی کھلی رہ گئیں۔ دل سینے کی گہرائیوں میں ڈوبتا محسوس ہونے لگا۔۔۔۔۔ یہ بات تو اُن کے وہم و

مل میں بھی نہیں تھی کہ فوزیہ خاتون احقر کے لئے شاکر کی بجائے نادیہ کا رشتہ مانگ بیٹھیں گی۔ ایک لمحہ کو

اُن کا سر کھوم کر رہ گیا، پلوں کے نیچے گھب اندھیرے تیرنے لگے، ہکا بکا بیٹھی یوں جیٹھانی کا منہ

باجھے آئیں اپنی قوتِ ساعت پر یقین نہ آ رہا ہو۔

”میں احساس تھا کہ تمہیں میری پسند پر حیرت ہوگی لیکن برا نہ ماننا۔۔۔۔۔ لڑکے لڑکیوں کی شادیاں

اُن کا کھیل نہیں ہوتیں، زندگی بھر کا سودا ہوتا ہے۔ اور میں احقر کے سلسلے میں آنکھ موند کر کوئی

”فوزیہ بہن! میری التجا ہے کہ ان باتوں کو یہیں ختم کر دیں۔“ شائلہ بیگم نے درد بھری آواز میں کہا۔
 ”اُن کا لہجہ کپکپانے لگا، پھر وہ اُن آنسوؤں کو نہ روک سکیں جو ضبط کے سارے بند توڑ کر چلتے پلوں تک آگئے تھے۔“

○○○

پھر دیر پہلے موسم پورے شباب پر تھا، ہوا کے مست خرام جھونکے دلوں کو گدگدا رہے تھے، کلیوں کے احساس کو گدگدا رہے تھے۔ دراز پلکیں حیا کے بوجھ سے بار بار جھک رہی تھیں۔ مسرتوں نے اُسے کس قدر غمور کر دیا تھا۔ اور دل کی دھڑکنیں تو کسی طرح رُکنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ کیا سرگوشیاں کر رہی تھیں کہ وہ آپ ہی آپ شرمائے جا رہی تھی۔ کتنے خوبصورت دلچسپ۔ کس قدر انمول تھیں وہ ساتیں جو زندگی کو نقش و طرب کا نغمہ بنا رہی تھیں۔ کاش! لی رفتار ایسی ایک محور پر تھم جاتی۔ ہمیشہ کے لئے ساکت ہو جاتی۔

یہ وقت کی ایک تنگ روٹ نے سب کچھ برباد کر دیا۔ گھناؤپ بادلوں نے اجانک بلغار کی تو لہار کیوں میں مدغم ہو گئے۔ فضا سہمی سہمی نظر آنے لگی۔ اور۔۔۔ پھر بجلی ٹوٹ کر گری تو گلشن کی ہاریں جل کر خاک ہو گئیں۔ صرف سکتی راگھ کا ڈھیر باقی رہ گیا جس سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔
 جواں۔۔۔ جو اُشیانے کے ٹکڑوں کو پھونک کر فضا میں رقص کر رہا تھا۔
 ناکیوں محسوس ہوا جیسے زمین اُس کے قدموں کے نیچے سے نکلی جا رہی ہو، اُسے گھر کے در و دیوار اٹھ ساتھ اپنا وجود بھی متزلزل نظر آ رہا تھا، اگر اُس نے دیوار کا سہارا نہ لیا ہوتا تو شاید چکر اکر گر جاتا۔ جن پلوں پر چند لمحے پیشتر مسرتوں کے دیئے جھللا رہے تھے اب اُن کے نیچے گھب سے تیر رہے تھے اور وہ اس اندھیرے میں ڈوبتی جا رہی تھی۔ اُس کا وجود کسی حقیر اور کمزور سوکھے لی مانند قہر کا پ رہا تھا۔ زندگی کی ساری خوشیوں نے بل بھر میں اُس سے تمام رشتے ناتے لئے تھے۔ اتنی بے رحمی سے منہ پھیرا کہ وہ تڑپ اُٹھی۔ سسک اُٹھی۔

قت کے بے رحم ہاتھوں نے اُسے اتنی بلندی سے اٹھا کر نیچے پھینکا کہ وہ خوف سے دم بخور ہو گئی۔ نیکی گردش نے اُسے ایک لمحے میں اتنا کمزور بنا دیا کہ اُسے خود اپنی زندگی ایک بوجھ سی محسوس ہو گئی۔ تنہائی کا احساس اتنا شدید اور منہ زور تھا کہ اُسے اپنا دم سینے کی اتھاہ گہرائیوں میں گھٹنا ہوا رہا تھا۔ اُسے حیرت تھی کہ وہ اب تک زندہ کیوں ہے۔؟ اُسے تو مر جانا چاہئے تھا۔!!
 ”دیوار سے لگی کھڑی ہانپتی رہی، اُس کے ذہن میں بس ایک ہی جیلے کی صدائے بازگشت گونج رہی تھی۔“ اُس کے بدچلن باپ نے اُس کی طرف سے آنکھیں پھیر لی تھیں اور ماں نے اپنی کرنی کا

بصرے کے حوالے کر کے شادی رچا لی۔
 پھر دیر تک وہ گنگ سی کھڑی اپنی بے ثباتی پر غور کرتی رہی پھر دیوانہ وار بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں پہنچی تو وہاں شائلہ بیگم نے اُس کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا، اُس کی آنکھیں

میں لکھن بہر چیز بڑی دھندلی دھندلی سی نظر آ رہی تھی، ایک عجیب حقیقت نے بے نقاب ہو کر اُسے

سو انہیں کر سکتی۔“ فوزیہ خاتون نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ ”نادیہ تمہارا اور وقار بھائی کا خون ہے لئے مجھے زیادہ عزیز ہے۔“

”شاکو بھی میں نے اولاد کی طرح پالا ہے۔“ شائلہ بیگم نے خود کو سنبھالتے ہوئے جواب دیا۔
 ”کی قسم میں نے شاکو نادیا سے زیادہ اپنی ممتا کا پیار دیا ہے۔“

”میں مانتی ہوں لیکن بہر حال وہ تمہارے پیٹ کی اولاد نہیں۔۔۔ اُس کے بدچلن باپ نے طرح بیوی اور بیٹی کی طرف سے آنکھیں پھیر لی تھیں، ہمہیں بھی اس کا اندازہ ہے۔“ فوزیہ نے تکیے لہجے میں کہا۔ ”سچ پوچھو تو مجھے شائلہ بیگم کی یہ بات بھی اچھی نہیں لگی کہ انہوں نے اپنی گر پھل تو تمہارے حوالے کر دیا اور خود دوسری شادی رچا لی۔۔۔ خون کے رشتے اس طرح تو اپنی خواہش پر بیٹھتے نہیں چڑھائے جاتے۔۔۔ شائلہ بیگم چاہتیں تو۔۔۔“

”فوزیہ بہن۔۔۔“ شائلہ بیگم نے رندھی ہوئی آواز میں منت کی۔ ”میں آپ کے آگے ہاتھ ہوں، پرانی باتوں کو سینے کی گہرائیوں میں دفن رہنے دیں۔ ورنہ شاکو کا مستقبل اور آپا جان کا برباد ہونا برباد ہو جائیں گے۔“

”بات سے بات نکلی تو میری زبان پر بھولی برسی باتیں یاد آ گئیں۔ ورنہ مجھے ان باتوں سر و کار؟“ فوزیہ خاتون بولیں۔ ”مجھے تو احمر کا مستقبل عزیز ہے۔“

”آپ جانتی ہیں کہ احمر، شاکو۔۔۔“

”احمر جی کی حقیقت سے ناواقف ہے اسی لئے میں اُن کی پسند کو ترجیح دینے سے قاصر ہوں۔“ شائلہ بیگم نے کوئی جواب نہیں دیا، ہونٹ چبا کر رہ گئیں۔ حالات نے اُنہیں ایسے دوراں کھڑا کیا تھا جہاں نہ وہ بول سکتی تھیں نہ خاموشی کی اذیت ناک ٹھٹھن کو برداشت کر سکتی تھیں، ایک بہن کی خوشیوں کا خیال اُن کے دل پر نشتر لگا رہا تھا اور دوسری جانب شاکو کے مستقبل کا سوال تھا۔
 ”تم نے نادیا کے سلسلے میں میری درخواست کا کوئی جواب نہیں دیا۔“

”کیا جواب دوں۔۔۔“ شائلہ بیگم نے بڑی حسرت سے کہا۔ اُن کی آواز میں بے بسی اور کمزوری کا احساس بھی شامل تھا۔

”میں کیا سمجھوں۔۔۔ ہمہیں یہ رشتہ منظور نہیں۔۔۔؟“
 ”خدا کے لئے فوزیہ بہن۔۔۔ مجھے غلط نہ سمجھیں۔“ شائلہ بیگم بڑی عاجزی سے بولیں۔

”مجھے بڑا مجبور کر دیا ہے۔“

”ایسی بھی کیا مجبوری ہے کہ تم میرے سوال کا جواب نہیں دے سکتیں؟“

”آپ نے نادیا کے سلسلے میں دیر کر دی۔۔۔ اب اس پر میرا کوئی حق نہیں رہا۔“

”میں سمجھی نہیں۔۔۔ جو کچھ کہنا ہے کھل کر کہو!“

”نادیا کے رشتے کی بات طے ہو چکی ہے۔“ شائلہ بیگم نے خود کو سنبھالتے ہوئے آہستہ آہستہ

جواب دیا۔ ”جمال بھائی نے منصور اور نادیا کی منگنی کی انگوٹھی بھی میرے پاس بطور امانت رکھا۔“

اور میں۔۔۔ انہیں زبان دے چکی ہوں۔“

”بہت خوب۔۔۔“ فوزیہ خاتون نے کسماتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔ ”گویا شائلہ بیگم نے

اپنی خوشیوں کا تحفظ کر رکھا ہے۔“

دل کی دھڑکنوں میں پھر طغیانی کی کیفیت بیدار ہونے لگی، اُسے اپنے پیروں پر کھڑا ہو کر محسوس ہو رہا تھا، صدے کی شدت نے جیسے اُس کی تمام قوتیں چھین لی تھیں۔
 ”جبر بھائی سے کچھ اُن بن ہو گئی؟“ نادیہ نے شوخی سے دریافت کیا۔
 ”نہیں“ وہ مختصر آواز میں بولی۔ ”ایسی کوئی بات نہیں۔“
 ”پھر آپ کا چہرہ اس قدر زرد کیوں ہو رہا ہے؟“ نادیہ نے ضد کی۔ ”مجھے بتائیے نا آپ! آخر کیا ہے؟“
 ”اگر تمہیں زحمت نہ ہو تو مجھے ایک گلاس پانی لا دو۔“ ثنائے نے بے حد کمزور آواز میں کہا۔
 ”اگر نکل ہو رہا ہے اور مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے ہر شے گردش کر رہی ہو، چکرار ہی ہو۔“
 ”آپ! نادیہ بے تکلف پریشان سی ہو گئی۔
 ”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ ثنائے نے ذہنی آواز میں کہا۔ اُس کے قدم لڑکھڑانے لگے،
 اُن کے نیچے اندھیرا سا پھیلنے لگا اور پھر۔۔۔۔۔
 اُن نادیہ نے اُسے جلدی سے سنبھال نہ لیا ہوتا تو شاید وہ چکرار کر رہی گئی ہوتی۔!!

○○○

شانہ بیگم کو حالات کا علم ہوا تو زمین پیروں تلے سے نکل گئی۔ ماضی کی تلخ یادوں نے سر اُبھارا تو زخم
 دل ہو چکے تھے ایک بار پھر تازہ ہو کر رہنے لگے۔
 ٹاکی معصوم خوشیوں کے لئے اُنہوں نے اپنی زندگی میں جو قربانیاں دی تھیں وہ اس طرح اچانک
 اُن جلی جائیں گی یہ بات اُن کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی، ایک زندگی کی مسرتوں کو زندہ و تائیدہ
 نے خاطر اُنہوں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ، ایک ایک پل داؤ پر لگا دیا تھا، سامتوں کا حساب
 نہ کرتے عمر گواہی تھی، ہر سانس کے ساتھ بس ایک ہی دعا مانگی تھی کہ شا کا مستقبل اُن کی سوچ
 کے زیادہ تائید اور مثالی ثابت ہو۔۔۔۔۔
 اولاد کے مستقبل کی خاطر اُنہوں نے اپنی ممتا کے جذبات کو سینے کی گہرائیوں میں دفن کر لیا۔ اپنی
 لڑکی آخری پونجی بہن کے حوالے کر کے سینے پر پھر رکھ لیا۔ اس لئے کہ شا جب جوان ہو تو اُسے
 اُن کے بعد لکھنؤ میں حصے دار نہ بننا پڑے۔ باپ کی کمی کا احساس نہ ہو، یہی سوچ کر شانہ بیگم نے
 دل ٹھادی پر رضا مندی کا اظہار کر دیا تھا، اولاد کی محبت کے ساتھ ساتھ وطن کی سرزمین کی سوندھی
 بون کو بھی خیر باد کہہ کر لندن چلی گئی تھیں۔
 شانہ بیگم نے جدائی کے لمحے کی اذیتوں کو اُنہوں نے ہنس کر برداشت کیا۔ اس اُمید پر کہ بیٹی کا
 کس شاندار ہوگا۔ اور جب بیاہ کر اپنے گھر کے لئے زحمت ہوگی تو اُسے باپ کی یاد نہیں ستائے
 اُن کی محرومیوں کا احساس اُس کی خوشیوں کی راہ میں کوئی رکاوٹ ثابت نہیں ہوگا۔
 وقت اسی اُمید پر گزرتا گیا۔ آنے والی خوشیوں کے انتظار میں، ماضی کی زہر آلود حقیقتیں آہستہ
 آہستہ اُن کو دور ہوتی گئیں۔ پھر فاصلے گھٹ گئے۔
 ایک طویل عرصے کے بعد شانہ بیگم وطن واپس آئیں تو بیٹی کو دیکھ کر اُن کی مسرتوں کا ٹھکانا نہ رہا۔ وہ
 اُن سے بہت کمزور اور ناتواں چھوڑ گئی تھیں بڑھ کر تناور درخت بن چکا تھا، شانہ بیگم نے شا کی تعلیم و
 تربیت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی، شانہ بیگم نے شا کے زوہپ میں اپنے خوابوں کی تسبیح دیکھی تو ماں کی
 اُٹھال اُٹھال آگیا، اُن کا دل چاہا کہ وہ بیٹی کو پوری شدت سے اپنی کشادہ آغوش میں بھینچ لیں، اپنے سینے

کسی نگین بے بسی میں مبتلا کر دیا تھا۔
 ”آپ! نادیہ نے اُس کے چہرے کی اڑی اڑی رنگت کو حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔“
 ”طبیعت تو ٹھیک ہے۔۔۔۔۔؟“
 ”معاف کرنا نادیہ۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ میں جلدی میں تھی اس لئے تمہیں نہ دیکھ سکی۔“ اُس نے بڑا
 لجاجت سے کہا۔ نادیہ سے بات کرتے ہوئے آج اُسے پہلی بار اجنبیت کا احساس ہو رہا تھا اور اُس
 احساس نے اُس کے وجود کو بھوڑ کر رکھ دیا، وہ اندر ہی اندر تڑپ کر رہ گئی۔
 ”آپ! کچھ پریشان نظر آرہی ہیں۔“
 ”میں نہیں۔۔۔۔۔ نہیں تو۔“ ثنائے نے مسکرائے کی کوشش کی تو ہونٹ کپکپا کر رہ گئے، سہمی سہمی دیر
 سی آنکھوں میں آنسوؤں کے شبنمی قطرے جھلکانے لگے۔
 ”آپ! کہاں تھیں؟“ نادیہ نے بہن کی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔
 ”میں تو تھی۔۔۔۔۔ اسی گھر میں۔۔۔۔۔ اسی چھت کے محفوظ سائے تلے۔“ وہ بہن کی باتیں کرنے لگا
 صدے کی شدتیں آہستہ آہستہ اُس کے ہوش و حواس کو کم کرتی جا رہی تھیں۔
 ”آپ! آپ!۔۔۔۔۔“

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”کیا ہوا مجھے۔۔۔۔۔ کچھ بھی تو نہیں۔۔۔۔۔ ٹھیک ٹھاک
 تو ہوں۔“ اُس نے نادیہ کی بات کا نٹے ہوء کہا پھر جلدی سے بولی۔ ”تمہیں کالج سے دیر ہو رہی
 گی۔۔۔۔۔ میں ڈرائیور سے کہتی ہوں کہ وہ گاڑی تیار کرے۔“
 وہ باہر جانے کے ارادے سے پٹی تو نادیہ تیزی سے اُس کے راستے میں حائل ہو گئی، ثنائے نظر
 اٹھا کر نادیہ کو دیکھا پھر کچھ سوچ کر جلدی سے نظریں جھکا لیں، شاید اس لئے کہ وہ اپنے غم کا اظہار
 کرنا چاہتی تھی، اپنی پریشانی میں کسی کو شریک نہیں کرنا چاہتی تھی۔۔۔۔۔ یہی غم تو اب اُس کی زندگی کا
 سے قیمتی سرمایہ تھا۔ پھر۔۔۔۔۔ وہ اس میں کسی اور کو حصے دار کیوں بناتی۔۔۔۔۔؟
 ”آپ! نادیہ نے اُسے بڑی اپنائیت سے آواز دی۔
 ”کہو۔“ وہ مدھم لہجے میں بولی۔
 ”آپ! میری طرف دیکھیں۔“

وہ ایک لمحے کو بیٹھی، پھر نادیہ کی طرف نظریں اٹھالیں۔
 ”آپ کو میری قسم۔۔۔۔۔ سچ بتائیے کیا بات ہے؟“
 ”میرا جی ٹھیک نہیں ہے۔“ وہ دل کی دھڑکنوں کو سمیٹتے ہوئے بولی۔ ”اسی لئے تو آج کالج نہیں گئی۔“
 ”لیکن کچھ دیر پہلے تو آپ بہت خوش نظر آرہی تھیں۔“
 ”وہ۔۔۔۔۔ کچھ دیر پہلے کی بات تھی۔“ اُس نے بڑے حسرت بھرے انداز میں جواب دیا۔
 ”اور اب کیا ہوا۔۔۔۔۔؟“

”اب وہ وقت بیت گیا۔“ اُس کے لرزیدہ ہونٹوں پر ایک بیمار سے تبسم نے چل کر دم توڑ دیا
 ”کیا امی سے کوئی بات ہوئی ہے۔۔۔۔۔؟“
 ”نہیں۔۔۔۔۔“

”بڑی اماں نے کچھ کہہ دیا؟“
 ثنائے کوئی جواب نہیں دیا، اُس کے ذہن میں ایک بار پھر فوزیہ خاتون کے جلوں کی بار

اختیار میں ہوتا تو وہ اپنی زندگی کی قربانی پیش کر کے بھی ثنا کی خوشیاں خرید سکتی تھیں لیکن انہیں فزنیہ خاتون کے آگے دامن پھیلاتا یا رونا دھونا فضول ہوگا، انہیں احمر کے ساتھ ثنا کی نسبت نے کا اتنا صدمہ نہیں تھا جتنا خوف اس بات کا تھا کہ اگر شوہر کو حالات کا علم ہوا تو اُن کا ردِ عمل منسور کے علم میں جب یہ بات آئے گی کہ احمر کے لئے ثنا کی بجائے نادہ کا رشتہ مانگا گیا اُن کے دل پر کیا گزرے گی..... اور اگر بھی ثنا نے نظر ملا کر اُن سے پوچھ لیا کہ اُسے کیوں ماں سے محروم رکھا گیا تو وہ کیا جواب دیں گی.....؟

وقت بھی وہ حالات کے تانے بانے میں ابھی اپنے پریشان خیالوں میں مستغرق تھیں جب بانوس آواز نے اُبھر کر اُن کے خیالات کے شیرازے کو منتشر کر دیا، جلدی سے خود کو سنبھالتی باہر کی طرف لپکیں۔ اُن کا اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا، جمال احمر کا رے اُتر کر میز ہیوں کی طرف مار رہے تھے۔

بیگم کو شوہر کے اتنی جلدی گھر واپس لوٹ آنے پر حیرت ہوئی، ابھی تو اُن کو دفتر کے لئے روانہ دھنکے بھی نہیں ہوئے تھے، ایک لمحے کو وہ اپنا غم بھول کر شوہر کی واپسی کے بارے میں سوچنے جمال احمر میز ہیاں طے کرتے ہوئے اندر داخل ہوئے تو بیوی کو دروازے کے قریب کھڑے ل گئے، ایک پہل کے لئے انہوں نے شبانہ بیگم کے چہرے کو غور سے دیکھا پھر بڑے نرم لہجے لے۔ ”آپ اور یہاں.....؟“

ارن کی آواز سن کر چلی آئی۔ ”شبانہ بیگم نے اپنے دل کی دھڑکنوں کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ اتنی جلدی کیسے واپس آ گئے.....؟“

کیوں..... کیا آپ کو کوئی اعتراض ہے؟“

ات اعتراض کی نہیں تعجب کی ہے..... پہلے تو آپ اتنی جلدی کبھی واپس نہیں آئے.....“

آج آپ کی یاد ہمیشہ کی نسبت کچھ زیادہ آ رہی تھی اس لئے لوٹ آیا..... یوں کچھ لیجئے، بس دفتر میں لگائیں۔“

نہ بیگم شوہر سے بات کرتے ہوئے خواب گاہ تک آ گئیں، اُن کے ذہن میں ثنا کا تصور ابھی تک نامحسوس کی یادیں اُن کے دل میں نشتر بن کر چھ رہی تھیں، بیٹی کے ساتھ وقت نے جو آنکھ بھولی ماں میں شبانہ بیگم کی ذات کو کوئی دخل تھا تو صرف اتنا کہ وہ اُس کی ماں تھیں.....

ماں..... جس نے اپنے وجود کے ایک اہم حصے کو خود سے علیحدہ کر دیا تھا..... جس نے اولاد کی زندگی نے کی خاطر اپنے ممتا کے جذبات کو پچھل ڈالا تھا..... محض اس لئے کہ وہ اپنی بیٹی کو ایک بد قماش باپ نے سائے سے محفوظ رکھنا چاہتی تھیں..... باپ..... جس نے دولت کی ہوس کی خاطر ایک با وفا کی پریشانی کو ٹھکرا دیا تھا..... جس نے ٹھکنے سکون کے عوض معصوم بیٹی کا سودا کیا تھا.....

انہیں کچھ خطرہ لاحق تھا کہ وہی باپ زندگی کے ہر موڑ پر بیٹی کی خوشیوں کے راستے میں دیوار بننا اسی لئے انہوں نے والدین کے اصرار پر دوسری شادی کر کے وطن سے دور جانا منظور کر لیا، اس سے کہ اگر ایک بد چلن مرد اُس کا تعاقب کرے تو یہ سوچ کر ہی اُس کا پیچھا چھوڑ دے کہ شاید معصوم بیٹی مریجی ہے۔ یہی وجہ تھی جو شبانہ بیگم نے ثنا کو شامک بیگم کی گود میں ڈال کر خود بھی اُس ف سے آنکھیں پھیر لی تھیں، اُس کے تصور کو دل کی اتھاہ گہرائیوں میں چھپا لیا تھا، ابھی اُس کا زبان تک نہیں آنے دیا، مبادا کہ سنگدل باپ کو اپنی اولاد کی زندگی کا نشان مل جائے اور وہ اُسے

کی گہرائیوں میں سمیٹ لیں، لیکن انہوں نے اولاد کی بہتری کی خاطر اپنی ممتا کا گلا گھونٹ دیا۔

ثنا کے مستقبل کے ساتھ ساتھ اب خود شبانہ بیگم کو اپنی آباد زندگی کی خوشیوں کا تحفظ بھی عزیز تھا، جمال احمر نے جس خلوص سے انہیں چاہا تھا، جس انداز میں اُن کے دیران اور سوکھے لبوں کو مسکرائیوں کی تازگی بخشی تھی وہ اُسے نظر انداز یا فراموش نہیں کر سکتی تھیں..... انہیں منسور کا بے انتہا پیارا اور شوہر کا بھرپور اعتماد حاصل تھا۔

لیکن..... بدلتے وقت کی گردش نے ایک بار پھر اُن کا سکون برباد کر دیا..... فلک کج رفتار نے اُن کے ارماتوں کا خون کر دیا..... آرزو میں گھٹ کر رہ گئیں..... خزاں کے نموس بادل پھر اُن کی زندگی پر منڈلانے لگے.....

احمر کے روپ میں شبانہ بیگم نے بیٹی کے شاندار مستقبل کا حسین تاج محل دیکھا تھا، انہیں یقین تھا کہ احمر سے منسوب ہو جانے کے بعد ثنا کی زندگی نہایت سکون اور آرام سے بیت جائے گی لیکن خوشیوں کی فراوانی میں محو ہو کر وہ اس حقیقت کو فراموش کر بیٹھی تھیں کہ وہ راز جسے انہوں نے اپنے دل کے نہاں خانوں میں دفن کر رکھا ہے فزنیہ خاتون بھی اُس سے واقف تھیں اور آج جب انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا تو وقت کی لگام اُن کے ہاتھوں سے نکل چکی تھی۔ وہ بڑی سنجیدگی سے حالات کے شب و فراز کے بارے میں سوچ رہی تھیں۔

ایک طرف انہیں بیٹی کی خوشیوں کے روندے جانے کا صدمہ تھا تو دوسری جانب یہ خوف بڑا پریشان کر رہا تھا کہ اگر جمال احمر کو حالات کا علم ہو گیا تو وہ کیا سوچیں گے..... کیا اعتماد کا وہ رشتہ ایک مدت سے دونوں کے درمیان قائم تھا برقرار رہ سکے گا..... کیا وہ شوہر سے نظر ملا کر کہہ سکیں گی کہ قسمت نے اُن کے ساتھ جو قسم طر بیفیاں کی ہیں اُس میں اُن کی اپنی مرضی کو کوئی دخل نہیں تھا، انہوں نے تو بس ایک مشرقی عورت کی طرح ماں باپ کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کر دیا تھا۔

اور..... اگر جمال احمر نے پوچھ لیا کہ زندگی کے اس اہم راز کو اُن سے پوشیدہ کیوں رکھا گیا تو کیا جواب دیں گی؟ کیا یہ کہہ سکیں گی کہ ایک بار تقدیر کے ہاتھوں محرومیوں کا شکار ہونے کے بعد انہیں دوبارہ ارماتوں کی تیج سجانے کی کوئی تمنا..... کوئی خواہش نہیں تھی، وہ تو اپنی زندگی اس معصوم وجود کے نام وقف کر دینے کی آرزو مند تھیں جسے قدرت نے اُن کی بد نصیبی کا حصہ دار بنادیا تھا..... وہی تو اُن کا دیران زندگی کا ایک سہارا تھی جیسے سینے سے لگا کر وہ زندگی گزار دینے کی خواہشمند تھیں..... وہی تو زندگی کی زونگی بہاروں کی ایک یادگار تھی..... وہ اُسے اپنی آغوش سے ایک لمحے کو بھی جدا کرنے کو تیار نہیں تھیں..... لیکن.....

والدین کی مرضی ایک بار پھر اُن کی خواہشات کی راہ میں حائل ہو گئی۔ انہیں حالات کے سانہ سرنگوں ہو کر ایک بار پھر عروسی جوڑا زیب تن کرنا پڑا۔ مگر یہ سب کچھ شبانہ بیگم نے اپنی خاطر نہیں کیا وہ انہوں نے بیٹی کے تائناک مستقبل کی خاطر اپنی زندگی کو داؤ پر لگایا تھا..... ثنا سے جدائی کے تصور ایک ماں کی ممتا کو کتنے اذیت ناک لمحوں سے دوچار کیا تھا اس کا احساس آج بھی شبانہ بیگم کی زندگی گہرائیوں میں دفن تھا لیکن انہوں نے اولاد کی خوشیوں کی خاطر سب کچھ برداشت کر لیا۔

ہر ذمہ کو وجود کی گہرائیوں میں چھپا لیا..... ہر زہر کو ہنس ہنس کر پی لیا..... کبھی قسمت سے لگتا تھا..... کوئی شکایت زبان تک نہیں آنے دی.....

مگر آج جب شامک بیگم نے انہیں فزنیہ خاتون کی طرف سے انکار کی اطلاع دی تو وہ تڑپ اٹھی

”کی ہے؟“
 ”تو فوزیہ خاتون کا دل ہی جانتا ہوگا۔ لیکن جو کچھ ہوا اچھا نہیں ہوا۔“
 ”ایک بات کہوں.....؟“
 ”سنئے!“

”جچ پوچھئے تو مجھے شروع ہی سے شازیاہ پسند تھی لیکن وہ چونکہ احمر سے مانوس تھی اس لئے میں نے امراض کا اظہار نہیں کیا۔“
 ”شائلہ نے بھی مجھ سے یہی کہا تھا کہ احمر اور شازیاہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اس لئے میں نے ہور کے لئے نادیہ کو پسند کر لیا۔“

”اور اگر احمر کا معاملہ درمیان میں نہ آتا تو کیا آپ شاکو بہو بنانے پر رضا مند ہو جاتیں؟“ جمال نے اچانک سوال کیا تو شائلہ بیگم ایک لمحہ کو شپٹا گئیں، پھر بڑی خوبصورتی سے بات بناتے ہوئے ہی۔ ”شاعر میں نادیہ سے بڑی ہے اس لئے اصولاً پہلے اسی کا رشتہ طے ہونا چاہئے تھا۔“
 ”آپ چاہیں تو اب بھی ممکن ہے.....“
 ”کیا مطلب.....؟“

”مطلب یہ کہ اگر فوزیہ خاتون احمر کے لئے نادیہ کا رشتہ مانگ رہی ہیں تو ان کی خوشی پوری کر دی..... ہم شاکو کو منصور کے لئے.....“

”آپ بھی کیسی بچوں جیسی باتیں کر رہے ہیں۔“ شائلہ بیگم نے تیزی سے کہا۔ ”کیا شادی بیاہ کے گزریوں کا کھیل ہے کہ پل پل میں رشتے بدلتے رہیں؟ اور پھر میرا خیال ہے کہ منصور بھی اس پر آمادہ نہیں ہوگا۔ وہ شاکو بالکل بہنوں کی طرح چاہتا ہے۔“

”آپ جو بہتر سمجھیں..... میں نے تو اس خیال سے ایک بات کہی تھی کہ فوزیہ خاتون کہیں اس مسئلے اپنی انا کا سوال نہ بنالیں۔“ جمال احمد نے بیوی کے چہرے کے تاثرات کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”اے شاکو تو بھائیوں کے دل بھی میلے ہو جائیں گے۔“
 ”مجھے تو احمر کا خیال آ رہا ہے..... اُسے ماں کے فیصلے سے یقیناً صدمہ ہوگا۔“

”کیا آپ کو شاکو سے ہمدردی نہیں.....؟“

”کیوں نہیں..... لیکن احمر بھی میرے لئے کوئی غیر تو نہیں ہے.....“

”ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر ایمان سے کہئے..... آپ کو شاکو اور احمر میں سے کون زیادہ عزیز ہے؟“

”اپنا خون پھر اپنا ہوتا ہے۔“ شائلہ بیگم نے دبی زبان میں کہا۔ پھر جلدی سے موضوع بدلنے کی رولیں۔ ”کیا لباس تبدیل کرنے کا ارادہ نہیں ہے؟“

”سنا بات میں اتنی دیر سے آپ سے کہنی چاہ رہا تھا۔“ جمال احمد نے اس بار گہری سنجیدگی سے کہا۔
 ”کیا مطلب.....؟“

”آپ لباس تبدیل کر لیں تو چل کر شاکو دیکھ آتے ہیں۔“
 ”کیا..... کیا ہوا شاکو.....؟“ شائلہ بیگم نے تیزی سے سوال کیا۔
 ”آج صبح سے اُس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اسی لئے وہ کالج بھی نہیں گئی۔ کیا آپ کو علم نہیں؟“

”آپ.....“ شائلہ بیگم نے شوہر کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے بے چینی سے کہا۔ ”آپ مجھ کو چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں..... آپ کو میری جان کی قسم..... سچ بتائیے کہ شائلہ نے فون پر

بلیک میل کرتا رہے۔
 وقت کی انہی نزاکتوں نے شائلہ بیگم کو مہر بلب کر دیا تھا۔ لیکن فوزیہ خاتون نے ماضی کے زخموں کو پرید کرید کر انہیں پھر سے ہرا کر دیا تھا اور شائلہ بیگم کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اگر ماضی کا منہ اس کا حال پر پڑا تو اس کا انجام کیا ہوگا؟

”آپ کہاں گم ہیں؟“ جمال احمد نے خواب گاہ میں جانے کے بعد شائلہ بیگم سے دریافت کیا تو چونک اٹھیں، جلدی سے دل کی دھڑکنوں کو ایک نڈھال مسکراہٹ کی آڑ میں چھپاتے ہوئے بولیں۔
 ”یہیں..... آپ کے پاس ہی تو ہوں۔“
 ”لیکن مجھے تو کچھ اور محسوس ہو رہا ہے.....“

”کیا.....؟“
 ”ممکن ہے میرا وہم ہو، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آپ میرے پاس ہوتے ہوئے بھی بہت دور ہیں۔“
 ”میں..... میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔“ شائلہ بیگم نے چونک کر شوہر کو وضاحت طلب نظر سے دیکھا۔

”دُکھ اور صدمے اگر مل جل کر بانٹ لئے جائیں تو غم کی شدت کم ہو جاتی ہے۔ دوسری شکل خاموشی کا زہر وجود کی گہرائیوں کو اندر ہی اندر چھپتی کرتا رہتا ہے۔“

”لیکن مجھے کیا دُکھ ہے؟“ شائلہ بیگم نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔
 ”آپ میری شریک حیات ہیں، میرے دُکھ سکھ کی ساتھی..... پھر آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ آپ کو کوئی صدمہ لاحق ہوگا تو مجھے اُس کی تکلیف نہیں ہوگی.....؟“

”مگر.....“

”شائلہ بیگم نے مجھے فون پر حالات سے باخبر کر دیا ہے۔“ جمال احمد نے بڑی اپنائیت سے ”فوزیہ خاتون اگر احمر کے لئے نادیہ کا رشتہ مانگ رہی ہیں تو اس میں برائی کی کیا بات ہے؟“

”لیکن نادیہ کی بات تو اسے منصور سے طے ہو چکی ہے۔“

”یہ بات فوزیہ خاتون کے گوش گزار کر دی گئی ہے۔“ جمال احمد نرم آواز میں بولے۔ ”شاکو احمر سے طے نہیں ہو سکی اس کا مجھے بھی افسوس ہے۔ لیکن وقت ہر نرم کے لئے تریاق بن جاتا ہے سکتا ہے کہ ایک دن فوزیہ خاتون کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہو جائے..... اتنی جلدی ہمیں امید کا ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہئے۔“

”کیا شائلہ نے فوزیہ خاتون کے انکار کی وجہ نہیں بتائی؟“ شائلہ بیگم نے سہمے ہوئے انداز دریافت کیا۔

”اپنی اپنی پسند کی بات ہے۔“ جمال احمد نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”فوزیہ خاتون کو پسند ہے اس لئے ظاہر ہے کہ وہ شاکو کے سلسلے میں انکار ہی کریں گی.....“

”لیکن نادیہ کی بات تو.....“

”میرا خیال ہے کہ یہ بات فوزیہ خاتون کے علم میں نہیں تھی ورنہ وہ جان بوجھ کر نادیہ کا رشتہ مانگتیں۔“

”میں تسلیم کرتی ہوں۔ مگر کیا اپنے بیٹے کی مرضی کی بھی خبر نہ ہوگی؟“
 ”ہو سکتا ہے احمر نے اپنی پسند کا اظہار نہ کیا ہو۔“ جمال احمد نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ورنہ اور“

آپ کو کیا بتایا ہے؟“

”ہمت سے کام لیجئے..... خدا نے چاہا تو سب بہتر ہوگا۔“

”ٹھا.....“ شبنم بیگم کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا، بیمار لہجے میں پوچھا۔ ”کیا ہوا شاکو.....؟“

”اُسے شدید بخار کی وجہ سے ڈاکٹر کے مشورے پر ہسپتال میں داخل کر دیا گیا ہے.....“

”ٹھا..... میری بچی.....“ شبنم بیگم نے رندھی ہوئی آواز میں درد سے تڑپ کر کہا، پھر لباس تبدیل کرنے کی غرض سے تیز تیز قدم اٹھاتی ڈریسنگ روم میں چلی گئیں۔

اور.....

جمال احمد اُن آنسوؤں کی بے جا رگی کے بارے میں غور کرنے لگے جو شاکو کی بیماری کی خبر پر شبنم بیگم کی پلکوں سے سیل رواں کی طرح بہہ نکلے تھے..... کچھ ایسا ہی اذیت ناک کرب تھا بیوی لہجے میں جس نے جمال احمد کو بھی بے چین کر دیا.....!!



شبنم بیگم نے گاڑی سے پہلا قدم نیچے رکھا تو اُن کی آنکھوں کے گوشے پھر سے نمناک ہونے لگے۔ جمال احمد بیوی کے دل کی کیفیت کا اندازہ لگا رہے تھے، جلدی سے قریب آتے ہوئے بولے۔

”جنتوں سے مالوس نہیں ہونا چاہئے۔ حوصلہ رکھئے!“

شبنم بیگم نے شوہر کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا، تیز تیز قدم اٹھاتی ہسپتال میں داخل ہوئیں، پھر کمر کے پتیل وارڈ والے حصے کی جانب گھومتے ہی احمر پر نظر پڑی تو ایک لمحے کو ٹھنک کر رہ گئیں، احمر کے اُڑے ہوئے اداس اور دیران چہرے سے وہ شاکو کی حالت کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

”ٹھا.....“ شبنم بیگم نے دل کی دھڑکنوں کو سنبھالتے ہوئے بیٹی کی کیفیت دریافت کرنے کی کوشش کی۔ الفاظ حلق میں انک کر رہ گئے، پلکوں میں تھمے آنسوؤں سے حلق گرا دامن میں جذب ہونے لگے..... ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ خطرے کی کوئی بات نہیں لیکن.....“ احمر نے جملہ نامعلوم چھوڑا تو شبنم بیگم تڑپ اُٹھیں۔

لیکن کیا.....؟“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔ ”کیا کہا ہے ڈاکٹر نے.....؟“

بخار کی شدت ابھی کم نہیں ہوئی۔“ احمر نے دبی زبان میں جواب دیا۔ ”ڈاکٹروں کے مشورے پر شاکو ابھی کچھ دن ہسپتال میں رہنا ہوگا۔“

شبنم بیگم کے دل کی حالت دگرگوں ہو رہی تھی، جلدی جلدی قدم اٹھاتی کمرے میں داخل ہوئیں تو اس کے قریب ہی یوں جم کر کھڑی کی کھڑی رہ گئیں جیسے جسم کی تمام قوتیں سلب ہو کر رہ گئی ہوں۔ ل میں خون کی گردش ٹھم گئی ہو..... جیسے وہ بے جان مجسمہ ہوں..... جسے مصور نے حسرت و یاس سے لاکر دنیا والوں سے داد وصول کرنے کی خاطر ایسا تہ کر دیا ہو.....

اسانے اچھے بستر پر تکیوں کے سہارے کیسی بے سدھ پڑی تھی، چہرے کی سرخی یوں ماند پڑ کر مائل ہو گئی تھی جیسے خون نے اپنی رنگت بدل لی ہو، اُس کا پھول جیسا نازک، شکستہ شکستہ شاداب مار جھایا مر جھایا سا لگ رہا تھا، ایک ہی جھٹکے میں کیسی کمزور اور لاغر نظر آ رہی تھی.....

نیدرلینڈز میں ملبوس نرس مریضہ کے قریب کھڑی نہایت مستعدی سے برف کی پٹیاں پیشانی پر لگ رہی تھیں۔ نادیدہ، بہن کے بستر کی دوسری جانب پریشان پریشان کھڑی تھی، اُس کے قریب ہی ایک موجود تھیں جو سکتے کی حالت سے دوچار نظر آ رہی تھیں۔ جمال احمد نے پہلی ہی نظر میں اندازہ لگایا تھا کہ شبنم بیگم کی کیفیت سے دوچار ہے۔ وہ بیوی کی حالت کا بھی اندازہ لگاتے تھے جو اپنی جگہ کسی بے جان پتھر کے کسی بے جان بت کی مانند بے حس و حرکت کھڑی شاکو کو ٹھنکاتی ہوئے جارہی تھیں۔

خود کو سنبھالتے..... جمال احمد نے بیوی کے قریب جا کر نرم لہجے میں کہا۔ ”اگر آپ نے ہمت نہ ہارنا اور نادیدہ کا کیا حال ہوگا؟“

یہ کون کہہ سکتا ہے؟“
 تو ٹھیک ہے لیکن انسان کو اپنی توقعات بھی ہوتی ہے۔“
 قعات.....“ شائدہ بیگم کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ نے غمٹاتے دئے کی بجھتی لوکی مانند
 تو زور دیا، درد کی شدتوں کو سینے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولیں۔ ”امید کی خوشی بڑی سہانی
 انگیز ہوتی ہے مگر جب توقعات اچانک دم توڑ دیتی ہیں تو زندگی کے سارے غم از سر توہرے

قوری طور پر اس کو بلایا گیا پھر اسی کے سونے پر.....
 ”تم نے مجھے اطلاع کیوں نہیں دی؟“ شائد نیگم نے آنسو پتے ہوئے دلی زبان میں شکوہ
 ”کس منہ سے شاکی بیماری کی اطلاع دیتی؟“ شائد نیگم غم انگیز کجھ میں بولیں۔ ”کیا خونہ پر
 انکار کو کوئی کم سامجھتا جو میں آپ کو اور پریشان کر دیتی..... اسی خیال سے میں نے جہاں بھائی کو لکھا

ہو جاتے ہیں..... انسان پیاس کی شدت کو کم کرنے کی خاطر جان بوجھ کر کب تک سراب کے ذرے خود کو بہلا سکتا ہے..... کبھی تو تھک کر نڈھال ہوگا..... کبھی تو محرومیوں کا احساس اُس کی زود چھلنی کر دے گا..... مسلسل غم کے بعد اچانک ڈھیر ساری خوشیاں نصیب ہوں تو زندگی دو چند ہو ہے لیکن توقعات ایک بار دم توڑ دیں تو.....“

”موسم کبھی یکساں نہیں رہتا۔“ شائلہ بیگم نے بہن کی دلجوئی کی خاطر جلدی سے کہا۔ ”قدرت ہے کہ وقت ہمیشہ کروٹیں بدلتا رہتا ہے..... کڑی دھوپ کے بعد بادل چھا جائیں تو..... احساسِ پل بھر میں جاتا رہتا ہے۔“

”لیکن رُخ کی نوعیت رُت بدلنے کے نظام سے مختلف ہوتی ہے..... گھاؤ بھرنے میں بڑا درکار ہوتا ہے۔ اکثر یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک عمر بیت جاتی ہے لیکن خلش کم نہیں ہوتی.....“

شائلہ بیگم نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا، بہن کے چہرے کے تاثرات سے اُن کے غموں کا لگاتی رہیں پھر کچھ سوچ کر بولیں۔ ”آخر کے بارے میں کیا سوچا ہے آپ نے.....؟“

”میں کچھ نہیں.....“ شائلہ بیگم نے بہن کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

”شائکی اچانک بیماری نے آخر کو بھی غڈ حال کر دیا ہے لیکن.....“

”ابھی آخر اور شاید دونوں فوزیہ بہن کے فیصلے سے ناواقف ہیں لیکن جب انہیں حالات کا علم اُن کے دلوں پر کیا گزرے گی؟“

”جو غم قسمت میں رقم کر دیے جائیں وہ اٹل ہوتے ہیں۔“ شائلہ بیگم نے بڑی حسرت سے اُن کی طرف دیکھنے لگیں جو بدستور بیہوشی کی کیفیتوں سے دوچار تھیں۔

”ڈیوٹی پر موجود نرس بڑی فرض شناسی سے اپنے کام میں منہمک تھی۔“

”قرینیں اگر فاصلوں میں بدل جائیں تو وقت زخموں کے لئے مرہم بن جاتا ہے۔“

”کیا مطلب.....؟“

”فوزیہ بہن کے انکار کے بعد.....“

”نہیں شائلہ..... نہیں۔“ شائلہ بیگم نے بہن کی بات کا مفہوم سمجھنے کے بعد تڑپ کر کہا۔ ”ما جرم کی سزا بچوں کو نہیں ملنی چاہئے..... سرتیں یوں بھی داغی نہیں ہوتیں، تجھے ماندے مسافر۔ کسی درخت کا دو گھڑی کا سایہ بھی کسی نعمت سے کم نہیں ہوتا..... مرض کی شدت کا احساس نہ ہونے فریب زندگی کے سہارے بھی اپنی خوشیوں کا بھرم برقرار رکھتا ہے۔ دوسری صورت میں رُخ کے تعلق کی کشاکش بڑی اذیت ناک اور سوبانِ رُخ بن جاتی ہے۔“

”آپ کا کہنا بھی درست ہے لیکن.....“

”سب کچھ وقت کے بے رحم ہاتھوں کے حوالے کر دو.....“ شائلہ بیگم ہاتھ ملتے ہوئے

”وقت کی گردش اور تقدیر کے لکھے پر انسان کا بس نہیں چلتا..... اور..... جو کچھ ہوا اُس میں اقصا؟..... وہ..... وہ مجھے آج بھی اتنا ہی عزیز ہے جتنا کل تھا۔“

شائلہ نے کراہ کر روٹ بدلی تو شائلہ بیگم لپکتے ہوئے اُس کے قریب آ گئیں، متا کے جذبول کو کراہ سے نہیں پہنچی تو اُن کی آنکھوں کے گوشے پھر بھگینے لگے۔

”نرس.....“ انہوں نے نرس کی طرف دیکھا، اُس کی آنکھوں میں بے بسی کا احساس تڑپ

”بیماری کی شدت اب پہلے سے کم ہے۔“ نرس نے آہستہ سے جواب دیا پھر ثنا کا نمبر پچر لینے لگی۔

”بیم کی نظر میں بیماری کے معصوم مگر پڑ مردہ چہرے پر پچل رہی تھیں۔“

”بیم کی نظر میں بیماری کے معصوم مگر پڑ مردہ چہرے پر پچل رہی تھیں۔“

”بیم کی نظر میں بیماری کے معصوم مگر پڑ مردہ چہرے پر پچل رہی تھیں۔“

”بیم کی نظر میں بیماری کے معصوم مگر پڑ مردہ چہرے پر پچل رہی تھیں۔“

”بیم کی نظر میں بیماری کے معصوم مگر پڑ مردہ چہرے پر پچل رہی تھیں۔“

”بیم کی نظر میں بیماری کے معصوم مگر پڑ مردہ چہرے پر پچل رہی تھیں۔“

”بیم کی نظر میں بیماری کے معصوم مگر پڑ مردہ چہرے پر پچل رہی تھیں۔“

”بیم کی نظر میں بیماری کے معصوم مگر پڑ مردہ چہرے پر پچل رہی تھیں۔“

”بیم کی نظر میں بیماری کے معصوم مگر پڑ مردہ چہرے پر پچل رہی تھیں۔“

”بیم کی نظر میں بیماری کے معصوم مگر پڑ مردہ چہرے پر پچل رہی تھیں۔“

”بیم کی نظر میں بیماری کے معصوم مگر پڑ مردہ چہرے پر پچل رہی تھیں۔“

”بیم کی نظر میں بیماری کے معصوم مگر پڑ مردہ چہرے پر پچل رہی تھیں۔“

”بیم کی نظر میں بیماری کے معصوم مگر پڑ مردہ چہرے پر پچل رہی تھیں۔“

”بیم کی نظر میں بیماری کے معصوم مگر پڑ مردہ چہرے پر پچل رہی تھیں۔“

”بیم کی نظر میں بیماری کے معصوم مگر پڑ مردہ چہرے پر پچل رہی تھیں۔“

”بیم کی نظر میں بیماری کے معصوم مگر پڑ مردہ چہرے پر پچل رہی تھیں۔“

”بیم کی نظر میں بیماری کے معصوم مگر پڑ مردہ چہرے پر پچل رہی تھیں۔“

”بیم کی نظر میں بیماری کے معصوم مگر پڑ مردہ چہرے پر پچل رہی تھیں۔“

ڈاکٹر.....“نادیہ نے تپتی نظروں سے درخواست کی۔“آپ کچھ تو بتائیں کہ میری آپنی کو کیا بیماری کی وجہ بتا سکتی ہیں؟“ڈاکٹر نے نادیہ کو دیکھتے ہوئے نرم آواز میں دریافت کیا۔“میرا کہہ کر کیا مریضہ کی طبیعت پہلے سے خراب تھی یا.....“
رات تک تو وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔“شائلہ بیگم نے جلدی سے کہا۔“صبح سر میں درد کی اس لئے کالج نہیں گئی، اور پھر اچانک اُس کی حالت بگڑ گئی۔“
ہائیڈریکل کالج میں ہیں۔“نادیہ بولی۔“اُن کے امتحان بھی قریب ہیں اور.....“
پہریشان نہ ہوں۔“ڈاکٹر نے نادیہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔“مجھے یقین ہے کہ آپ کی آپنی بہت ہو جائیں گی۔“
ن اُن کو بیماری کیا ہے.....؟“

ربذات خود ایک ایسی بیماری ہے جس کی بہت ساری شاخیں ہوتی ہیں..... لیکن آپ ان نہیں سمجھ سکیں گی۔“

صرف اتنا بتا دیں ڈاکٹر! کہ آپنی کو کوئی خطرہ تو نہیں ہے؟“نادیہ نے گھبرائی آواز میں غار کی شدت سے پہلے وہ کچھ عجیب سی باتیں کر رہی تھیں۔“

انے اسی لئے عرض کیا تھا کہ ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا..... ہو سکتا ہے اندر کی پیش اور اثر مریضہ کے دماغ پر بھی اثر انداز ہوا ہو۔“ڈاکٹر نے نرم لہجے میں جواب دیا۔“سر درد کی ناکثر دل و دماغ متاثر کر دیتی ہے۔“

پ کا کیا خیال ہے؟“جمال احمد نے سنجیدگی سے پوچھا۔“کیا مریضہ کا ذہن بھی کسی وجہ سے ہے؟“

ب تک مریضہ پوری طرح ہوش میں نہ آجائیں ہم یقین سے کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر سکتے..... آپ اپنا اطمینان کرنا چاہتے ہیں تو پروفیسر شیرازی سے مل لیں، ممکن ہے وہ آپ کو مرض کی بار بار سے کچھ بتا سکیں۔“

پروفیسر شیرازی وہ تو نہیں جو میڈیکل کالج میں بھی ہیں؟“نادیہ بولی۔“میں آپنی سے متعدد بار ان جی ہوں۔“

پ کا اندازہ درست ہے۔“ڈاکٹر نے مسکرا کر جواب دیا، پھر سنجیدگی سے بولا۔“میرا مشورہ یہ کہ اگر مکمل طور پر آرام کرنے دیا جائے تو یہ اُس کے حق میں بہتر ہوگا۔ میرا مطلب ہے اس کے کمرے میں کوئی ایک فرد رہے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ کوئی ایسا فرد جس سے مریضہ بہت لگے ہو..... آپ میں سے مریضہ کی ماں کون ہے.....؟“

اسنے اچانک سوال کیا تو شائلہ بیگم کچھ کہتے کہتے یلکھت خاموش ہو گئیں..... اُن کو ایسا محسوس ہوا کہ جملہ اُن کے وجود پر بجلی بن کر ٹوٹا ہو، فشر بن کر اُن کی روح کی گہرائیوں میں اترتا چلا گیا۔ پھر خود کے اندر سہم کر رہ گئیں، انہیں یوں محسوس ہوا جیسے وہ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی ہوں۔
جو ایک تلخ حقیقت بن کر اُن کے سامنے آ گیا تھا..... کیسی اذیت ناک تعبیر تھی اس نے شائلہ بیگم کو مہر بلب کر دیا تھا۔ وہ ماں ہوتے ہوئے بھی شاکو اپنی بیٹی کہنے سے مجبور وقت نے اُن کے ہونٹ سی دیئے تھے..... حالات کی گردش نے اُن کی ممتا کو کیسی بے بسی

شانہ بیگم کچھ کہنا چاہتی تھیں کہ نرس ایک ڈاکٹر کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی۔ ڈاکٹر نے قرعہ جاکر شاکا معائنہ کیا تو اُس کے چہرے پر تشویش کے گہرے تاثرات ابھر آئے، اُس نے آہستہ نرس سے کچھ کہا تو وہ اثبات بن سر کو جنبش دیتی تیز تیز قدم اٹھاتی کمرے سے چلی گئی۔

شانہ بیگم کے دل پر دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ وہ ڈاکٹر کے چہرے سے شاکا کی بیماری کا حال پڑھنے کی کوشش کر رہی تھیں، شائلہ بیگم ہی دل میں شاکا کی صحت یابی کے لئے خدا کے حضور گڑگڑانے میں مصروف تھیں اور ڈاکٹر کان میں آگئے لگائے شاکا کے دل کی حرکتوں کے نشیب و فراز کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

نرس دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی تو اُس کے ہاتھوں میں ایک سرخ بھی تھی۔ ڈاکٹر نے فوری طور پر شاکا کو انجکشن لگایا پھر اُس کے کلائی پر ہاتھ رکھ کر نبض کی رفتار محسوس کرنے لگا۔

شانہ بیگم سکتے کے عالم میں کھڑی تھی شاکا اور بھی ڈاکٹر کے چہرے کو دیکھے جا رہی تھیں، ایک ماں بے چین دل اس بات کو محسوس کر رہا تھا کہ اُس کی بیٹی کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ ڈاکٹر جس وقت کمرے میں داخل ہوا بہت مطمئن نظر آ رہا تھا لیکن شاکا کا معائنہ کرنے کے بعد وہ پریشان ہو گیا اور پھر اُس یقیناً کچھ محسوس کرنے کے بعد ہی انجکشن لگایا ہوگا۔

“میرے محبوب! میرے ناکردہ گناہوں کی سزا میری معصوم اور بے گناہ بیٹی کو نہ دے۔“شانہ بیگم کے دل کی دھڑکنیں زبان بن گئیں۔“میں تیری خطا کار ہوں۔ اگر کوئی غلطی، کوئی گناہ سرزد ہوا ہے تو اُس کی سزا بھگتنے کو میں تیار ہوں..... تیرے حضور میں ہاتھ باندھ کر درخواست کرتی ہوں میرے مالک! شاکو کو زود بصحت کر دے..... تیرے دربار میں گڑگڑا کر بھیک مانگتی ہوں کہ میری بیٹی کو اپنے مقام سے محفوظ رکھنا..... وہ معصوم ہے اور تیری رحمتوں کی مستحق ہے..... پروردگار عالم ایک ماں تجھ سے تیرے رحم و کرم کی بھیک مانگتی ہے۔ میری جھولی بھری رکھنا میرے مالک..... میری کوکھ کی لان تیرے ہاتھ میں ہے۔ اسے زندہ رکھنا، سلامت رکھنا..... اور اگر تجھے زندگی کا نذرانہ منظور ہے تو میں اپنی حق زندگی تیرے حضور میں پیش کرتی ہوں، اسے قبول کر لے میرے مالک! لیکن میری شاکا کو اچھا دے..... تجھے تیرے حبیب کا واسطہ۔“

شائلہ بیگم بھی وقت کی نزاکت کو محسوس کر رہی تھیں، وہ بہن کی خاطر خود کو سنبھالے ہوئے تھیں لیکن دل ہی دل میں برابر خدا سے شاکا کے حق میں دُعا میں مصروف تھیں۔

کچھ دیر کمرے میں گہرا سکوت طاری رہا، پھر ڈاکٹر نے بستر کے سرہانے لٹکا ہوا چارٹ اٹھا کر ان پر کچھ لکھا، نرس کو دی زبان میں کچھ ہدایت دینے کے بعد واپسی کے لئے پلانا تو شانہ اور شائلہ بیگم بھی ان کے پیچھے پیچھے ہوئیں۔ ڈاکٹر نے کمرے سے باہر قدم رکھا تو شانہ بیگم نے آگے بڑھ کر اُس کا راستہ روک لیا، خود کو بڑی مشکلوں سے سنبھالتے ہوئے بولیں۔“ڈاکٹر..... اب مریضہ کی طبیعت کیسی ہے؟“
”ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“ڈاکٹر نے سنجیدگی سے کہا۔“ویسے مریضہ کو آرام و سکون کا شدید ضرورت ہے۔“

ڈاکٹر کو کمرے سے باہر نکلتا دیکھ کر نادیہ، اجمل اور جمال احمد بھی قریب آ گئے تھے، ڈاکٹر نے غیر متوجہ سا جواب دیا تو جمال احمد نے پوچھا۔“آپ کی تشخیص کیا کہتی ہے.....؟“

”میں نے کہا تھا کہ مریضہ کوئی الحال آرام کی ضرورت ہے۔“
”لیکن اُس کے مرض کی نوعیت کیا ہے؟“احمر نے بے چینی سے سوال کیا۔“کیا بخار کی شدت نے

خدا نخواستہ کوئی خطرناک صورت اختیار کر لی ہے؟“

حاش کر لے گا۔ لیکن ایک طرف فوزیہ خاتون کو اپنے ارادے میں مایوسی کا سامنا کرنا پڑا اور اجاب وہ بیٹے کی کیفیت کا بھی بغور مطالعہ کر رہی تھیں۔
 ہسپتال میں داخل ہوئے پانچ دن گزر چکے تھے، فوزیہ خاتون رشتے کی نوعیت اور تقاضے کے لرزہ دہی دو تین بار ہسپتال جا کر شکا کو دیکھ آئی تھیں، ڈاکٹروں نے اُس کی حالت کو خطرے سے اڑے دیا تھا، محض ضروری نگہداشت اور مکمل آرام کی وجہ سے ہسپتال میں رکھا ہوا تھا لیکن احمر کی بیماری کا بہت گہرا اثر لیا تھا۔

زیر خاتون بیٹے کی ایک ایک نقل و حرکت کا اندازہ لگا رہی تھیں، جب سے بیمار ہوئی تھی احمر کو نہ نے بنے کا ہوش تھا نہ لباس تبدیل کرنے کا۔ ایک دو روز تک تو اُس نے شیو بھی نہیں بنائی، رات دیر چٹال سے واپس لوٹا اور صبح سویرے ہی دنیا دکھاوے کی خاطر اُلٹا سیدھا ناشتہ کر کے ہسپتال چلا احمر کی ان ہی باتوں نے فوزیہ خاتون کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا، انہیں شک کی ذات سے ہر یاد اوت نہیں تھی۔ وہ اُسے بھی کم و بیش اتنا ہی چاہتی تھیں جتنا شائلہ بیگم کے دوسرے بچوں پر کرتی تھیں بلکہ نادیہ کے مقابلے میں انہیں شک کی تعلیم و تربیت، اُس کا رکھ رکھاؤ، سینے پر رونے کا اور گفتگو کرنے کا انداز زیادہ پسند تھا، ناک نقشے اور رنگ رُوب کے اعتبار سے بھی وہ نادیہ کے برابر تھیں، بہت بہتر تھی۔ لیکن شجرے کے اعتبار سے وہ کسی طرح بھی فوزیہ خاتون کے اصولوں پر نہیں اُترتی تھی۔

ناکی اچانک بیماری نے جہاں دوسروں کو پریشان کیا وہاں فوزیہ خاتون کو بھی اس کا صدمہ ہوا لیکن نے شدت سے اس کا اثر قبول کیا تھا وہ فوزیہ خاتون کو ایک آنکھ بھی نہیں بھاتا تھا، احمر کی موجودہ نے انہیں شک کی طرف سے اور بد دل کر دیا۔ وہ اولاد کی خوشیوں کی خاطر دنیا کی ہر قیمتی شے مہیا کر سکتی تھیں، اُن کی ہر فرمائش پوری کر سکتی تھیں لیکن شکا کو بہو کی حیثیت سے قبول نہیں کر سکتی۔ ہر چند کہ انہیں معلوم تھا کہ فلک کج رفتار نے شائلہ بیگم کو جن حالات سے دوچار کیا اُس میں اُن لمذاذات کا کوئی تصور نہیں تھا۔ وہ بھی جانتی تھیں کہ شاپر اُس کے بد قماش باپ کا سایہ بھی نہیں دے سکتے ماضی سے قطعی لاعلم تھیں، اُسے تو یہ بھی خبر نہیں تھی کہ اُس نے کس کی کوکھ سے جنم لیا ہے اور حالات کی پیداوار ہے؟ لیکن ان تمام حقائق کے باوجود شکا کا سب سے بڑا قصور یہ تھا کہ وہ ایک باپ کے نام سے نشتی ہو گئی تھی جسے نہ معاشرے میں کوئی اچھا مقام یا نام حاصل تھا نہ اُسے شکا کے اُسے الگ کیا جاسکتا تھا۔ اور فوزیہ خاتون کو یہ منظور نہ تھا کہ کوئی اُن کے خاندان کی طرف اُننگی نہ کھول کر یہ کہنے کی جسارت کر سکتا کہ اتنے اعلیٰ خاندان کی عورت اپنے اکلوتے بیٹے کے لئے ایسا براہ کرا لاتی ہے جس کا باپ ایک بدنام اور بدکردار شخص تھا جس نے اپنی بیٹی کو دنیا میں قدم اور آنکھ کھولنے سے پہلے ہی اپنی محبت اور شفقتوں سے محروم کر دیا تھا، اُس کی ماں کو طلاق دے دی

طلاق..... جو ایک عورت کے لئے دنیا کی سب سے غلیظ اور گندی گالی ہے..... ایسی کا لک ہے جو کے وجود سے جو تک کی شرح مرے دم تک لپٹی رہتی ہے..... ایسا داغ ہے جو اپنا نشان بھی مٹنے دیتا..... ایسی لعنت ہے جو عورت کو پاکیزگی کو بھی گھن کی طرح اندر ہی اندر چاٹ جاتی ہے..... اگر بدکردار کو بھی داغ دہر کر دیتی ہے..... اُسے معاشرے میں سر اٹھا کر چلنے کا موقع ہی نہیں..... تازیت سرگھوں کیے رہتی ہے..... اور..... جس کی اذیت بیوگی کے غم سے بھی زیادہ کر بناک

کے عالم سے دوچار کر دیا تھا..... دل کی دھڑکنوں میں طوفان کی شدتیں سر مار رہی تھیں..... جذبات طغیانی کا عالم تھا..... رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کی گردش اپنے شباب پر بھی..... لیکن خون کی شناخت کرنے سے گریزاں تھا.....! مجبور تھا.....!! بے بس تھا.....!!! اور..... اس نے شائلہ بیگم کو برف کی طرح اُن کے وجود کے اندر منجمد کر دیا تھا۔

”میں ہوں مریشہ کی ماں.....“ شائلہ بیگم نے بہن کی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے جلدی سے کہا۔ ”آپ ہر طرح سے مریشہ کی دلجوئی کا خیال رکھیں!“ ڈاکٹر نے شائلہ بیگم کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”اُن کے سامنے کوئی ایسی بات نہ کی جائے جو مزید پریشانی یا اُبھتن کا سبب ثابت ہو۔“

”میں خیال رکھوں گی.....“ شائلہ بیگم نے آہستہ سے جواب دیا۔
 ڈاکٹر چلا گیا تو جمال احمد نے بیوی کی طرف غور سے دیکھا، شائلہ بیگم کے مرجھائے ہوئے چہرے پر حسرت و یاس کے گہرے سائے منڈلا رہے تھے۔ شائلہ بیگم ڈاکٹر کے مشورے کی گہرائی تک گئے لئے مضطرب تھیں، انہیں اچانک اس بات کا شبہ سا ہوا کہ کہیں شکا نے وہ باتیں سن تو نہیں لیں اُن کے اور فوزیہ خاتون کے درمیان ہوئی تھیں.....؟

احمر اور نادیہ بھی اپنی اپنی جگہ پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ اور جمال احمد جو فلسفے کے پروفیسر زندگی کے اس فلسفے کی کٹھنی کو کھانے کے بارے میں غور و فکر کر رہے تھے جو ہر لمحہ اُلٹنا ہی جا رہا تھا۔ ”تم شکا کے پاس جاؤ شائلہ..... وہ کمرے میں تنہا ہے۔“ شائلہ بیگم نے دل پر پتھر رکھ کر کہا۔ ”آنسوؤں کو پینے کی کوشش کرنے لگیں جو پلکوں کی اوٹ میں چل رہے تھے.....“

”آپا.....“ شائلہ بیگم نے بہن کے چہرے کی جانب غور سے دیکھا، پھر کچھ سوچ کر جلدی گھوٹیں اور کمرے میں چلی گئیں۔
 ”خالہ جان..... آپ ٹھیک تو ہو جائیں گی نا.....؟“ نادیہ نے ماں کے جانے کے بعد شائلہ بیگم سوال کیا تو انہوں نے تڑپ کر نادیہ کو پوری شدت سے اپنے سینے کی گہرائیوں میں چھپا لیا اور اختیار روکنے لگیں..... آنسوؤں کو بہہ نکلنے کا ایک بہانہ مل گیا تھا.....!!

جمال احمد بدستور اپنے خیالوں میں مستغرق تھے اور احمر کی نگاہیں بار بار اُس کمرے کے دروازے کی جانب اُٹھ رہی تھیں جس کی دوسری جانب شائلہ بیگم کی کیفیت سے دوچار تھی۔
 ثنا..... جو احمر کی محبت تھی..... زندگی بھی.....!!



فوزیہ خاتون برآمدے میں بیٹھی ڈھلکی ڈھوپ کے پھیلتے سایوں کو بہت غور سے دیکھ رہی تھیں، کے ذہن میں شکا کی بیماری کا خیال رہ رہ کر روٹین لے رہا تھا، انہوں نے احمر کے سلسلے میں انتخاب بہت سوچ سمجھ کر اور اپنے ماحول کے عین مطابق کیا تھا، انہیں علم تھا کہ احمر شکا کو چاہتے ہیں وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد اور رویو جولیت کی داستانیں قصہ پارینہ ہیں کتابوں کی حد تک محدود ہو گئی ہیں۔

انہوں نے ابھی تک نہ تو شوہر سے شائلہ بیگم کے ساتھ ہونے والی گفتگو کا ذکر کیا تھا نہ احمر واقعے کی بھک گئے دی تھی، اُن کا خیال تھا کہ موجودہ دور کی محبت اور چاہت بھی وقت کے ساتھ اپنا رنگ بدلتی رہتی ہے۔ انہیں یقین تھا کہ نادیہ کے ساتھ رشتہ طے ہو جانے کے بعد جب وہ اطلاع احمر کو دیں گی تو احمر کی محبت کا رخ شکا کی جانب سے ہٹ کر نادیہ کے وجود میں اپنے چلے جائے گا۔

”لیکن وہ.....“ احمر نے تیزی سے کچھ کہنا چاہا پھر سنبھل کر بولے۔ ”آپ ٹاکو سمجھائیے، مجھے یقین ہے کہ آپ کی بات درست نہیں کرے گی۔“

”اور اگر تمہاری توقع غلط ثابت ہوئی تو.....؟“

”اُمی جان.....“ احمر نے تعجب کا اظہار کیا۔ ”بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ٹاکو اور آپ کی بات ماننے سے کر دے؟“

”کیوں.....؟ تمہیں یہ خوش فہمی کیوں ہے کہ وہ میری بات نہیں ٹالے گی؟“

”اُمی جان.....“ احمر نے جواب نہیں دیا، حیرت سے گم سمجھ کھڑے ماں کے چہرے کو دیکھ رہے۔

”اگر یہ تمہاری خواہش ہے تو میں ٹاکو سمجھانے کی کوشش کروں گی۔“ فوزیہ خاتون نے بیٹے کے تاثرات کو محسوس کرتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”اُمی جان..... کیا آپ کی خواہش یہ نہیں ہے کہ ٹاکو مکمل طور پر صحت یاب ہو کر گھر واپس آئے؟“

”نہ دلی زبان میں سنجیدگی سے پوچھا۔

”تم کہنا کیا چاہ رہے ہو..... کھل کر کہو!“

”آپ نے ایک بار..... نیرولی میں مجھ سے کچھ کہا تھا اور.....“

”یہاں آنے کے بعد بھی میں نے تم سے شکاک بیگم سے رشتے کی بات طے کرنے کا ذکر کیا تھا۔“

”خاتون نے آہستہ سے جواب دیا۔

”اور میں نے آپ کے حکم سے سرتابی نہیں کی تھی۔“ احمر نے دھڑکتے ہوئے دل سے کہا۔

”تمہیں یاد ہے کہ میں نے نیرولی میں تم سے کیا وعدہ کیا تھا؟“

”جی ہاں.....“ احمر نے نظریں جھکاتے ہوئے مدہم لہجے میں جواب دیا۔ ”آپ نے کہا تھا کہ چچی کی بڑی بیٹی آپ کو پسند ہے۔“

”میں اب بھی اپنے فیصلے پر قائم ہوں۔ لیکن.....“

”لیکن کیا امی جان.....؟“ احمر نے بے چینی سے سوال کیا، ماں کی اچانک خاموشی انہیں گراں

رہی تھی۔

”تمہیں شاید یہ سن کر دکھ ہو گا کہ شکاک بیگم نے اس رشتے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔“

”انکار کر دیا ہے.....؟“ احمر نے تڑپ کر کہا پھر ماں کے چہرے کو گھورتے ہوئے بولے۔ ”انکار کی وجہ بھی بتائی ہوگی۔“

”جی، یوں سمجھ لو کہ انہیں میری پسند سے اتفاق نہیں ہے۔“

”لیکن کیوں.....؟“

”ہر بات کو کر دینا مناسب نہیں ہوتا۔“ فوزیہ خاتون ہونٹ کاٹتے ہوئے بولیں۔ ”میرا مشورہ ہے کہ بات کو یہیں ختم کر دو!“

”مگر..... میرا دل نہیں مانتا کہ چچی جان.....“

”دل کے فیصلے ہمیشہ جذباتی ہوتے ہیں۔“ فوزیہ خاتون نے تیزی سے کہا۔ ”انسان کو دل سے

دماغ کے فیصلوں پر عمل کرنا چاہئے۔“

”اُمی جان..... آپ.....“

”مگر کہیں کہیں تبدیلی کر ڈالو، شکاک دور ہو جانے سے ذہن پر ہمیشہ خوشگوار اثر ہوتا ہے۔“ فوزیہ

اور ناقابل برداشت ہوتی ہے۔

فوزیہ خاتون اس وقت ان ہی خیالوں میں الجھی بیٹھی تھیں کہ قدموں کی چاپ سن کر اُڑ خیالات کا شیرازہ منتشر ہو گیا، نظریں گھما کر دیکھا تو احمر نظریں جھکائے اپنے کمرے کی سمت جا تھے۔ جانے کن خیالوں میں گم تھے کہ انہیں ماں کی موجودگی کا علم بھی نہیں ہوا۔ چہرے پر ایسی طاری تھی جیسے انہیں کسی بات کا احساس ہی نہ ہو، بیار بیمار سے نظر آ رہے تھے۔

فوزیہ خاتون نے بیٹے کی حالت محسوس کی تو ممتا کا جذبہ بے چین ہو گیا، کچھ دیر وہ اپنی جگہ بیٹھی موقع اور حالات کی نزاکتوں پر غور کرتی رہیں، پھر آہستہ سے انہیں اور چھوٹے چھوٹے بڑھائی احمر کے کمرے میں داخل ہو گئیں۔

احمر اپنے بستر پر بے سدھ پڑے چھت کو گھور رہے تھے، آنکھوں میں بے بسی اور اضطراب کی کچل رہی تھیں، چہرہ کھلی کھلائے ہوئے پھول کی طرح زندگی سے زوٹھا زوٹھا نظر آ رہا تھا۔ وہ دن بعد گھر واپس آئے تھے لیکن جوتا اتارے بغیر ہی اس طرح بستر پر لیٹ گئے کہ آدھا جسم اوپر تھا اور نیچے۔ اپنے خیالوں میں اتنے مگن تھے کہ انہیں کمرے میں ماں کے آنے کی خبر تک نہ ہوئی۔

فوزیہ خاتون کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔ کچھ دیر وہ دروازے کے پیچہ ساکت و جامد کھڑی بیٹے کی کیفیت کا اندازہ لگاتی رہیں، پھر قدم بڑھائی قریب جا کر آہستہ سے

دی۔ ”احمر.....“

اور احمر یوں ہڑبڑا کر جلدی سے اٹھ بیٹھے جیسے کچی نیند سے بیدار ہوئے ہوں..... یا پھر وہ

سہانا خواب دیکھ رہے تھے جو ماں کی آواز اُبھرنے کے سبب درمیان سے ٹوٹ گیا۔

”آپ.....؟“ احمر نے ماں کو دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

”کیا بات ہے..... کچھ پریشان پریشان سے دکھائی دے رہے ہو۔“

”شکاک کا اثر ہوگا۔“ احمر نے بات بنانے کی کوشش کی۔ ”نکسل کروں گا تو طبیعت بحال ہو جائے گا“

”کہاں سے آ رہے ہو.....؟“ فوزیہ خاتون نے دریافت کیا۔

”ہسپتال سے.....“ احمر دلی زبان میں بولے۔

”شکلی طبیعت اب کیسی ہے؟“

”پہلے سے بہتر ہے لیکن.....“ احمر کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئے۔

”لیکن کیا.....؟“

”کمزوری نے اسے بہت نڈھال کر دیا ہے۔ ہر وقت کسی سوچ میں کھوئی کھوئی سی رہتی ہے۔“

”تمہارا کیا خیال ہے، شکاک کس بات کی فکر نے پریشان کر رکھا ہے.....؟“

”جی.....“ احمر نے ماں کے لہجے کی چھین محسوس کی تو ایک لمحے کو حیرت زدہ رہ گئے، پھر جلدی

بولے۔ ”آپ کو علم ہے کہ اُسے اپنی تعلیم کس قدر عزیز ہے۔ امتحانات قریب ہیں..... ایسے وقت

بیماری.....“

”اس میں پریشانی کی کیا بات ہے.....؟“ فوزیہ خاتون نے بیٹے کے جملے کو کاٹتے ہوئے

سے کہا۔ ”دنیا میں ہر مرض کا علاج ہے۔ شکاک کی بیماری بھی رفتہ رفتہ دور ہو جائے گی۔“

”ڈاکٹر کا مشورہ ہے کہ ابھی شکاک کچھ دن اور ہسپتال میں رہنا چاہئے.....“

”میرا ذاتی خیال بھی یہی ہے کہ شکاک ہسپتال میں رہنا زیادہ مناسب ہوگا۔“

خاتون اپنا جملہ مکمل کر کے تیزی سے جانے کے لئے مڑیں تو احرا لپک کر اُن کی راہ میں حائل ہو گئے۔
 ”امی جان..... پلیز!“ اُن کے لہجے میں التجائی تھی۔ ”مجھے حالات کے تغیر پر یقین نہیں آ رہا۔“
 ”اس لئے کہ تمہیں حالات کا علم نہیں ہے ورنہ شاید تم بھی.....“ فوزیہ خاتون نے ہل کر بیڑا
 حالات سے باخبر کر دینا مناسب سمجھا لیکن نثار احمد کمرے میں داخل ہوئے تو بات ادھوری رہ گئی۔
 اور..... احرا اپنی جگہ بیٹھا کر رہ گئے.....!!

○○○

ایک ٹٹا کے نہ ہونے سے گھر کے ماحول میں جیسے ایک خلا سا پیدا ہو گیا تھا، ہر چیز کی ترتیب بگاڑ کر رکھی تھی، ہر شخص اپنی اپنی جگہ کسی نہ کسی سوچ میں گم رہنے لگا تھا، ہر فرد کی توجہ اسی ایک ذات سے منسوب ہو گئی تھی، روزمرہ کے نظام میں تبدیلی آ جانے سے معمول میں بھی ایک نمایاں فرق محسوس ہونے لگا تھا۔ ٹٹا کی طبیعت جوں جوں بہتر ہوتی جا رہی تھی اسی رفتار سے ذہنوں کے بوجھ بھی چھٹ رہے تھے، اُس کی تیمارداری اور دکھ بھال کے لئے شاملہ بیگم اور شائہ بیگم نے صبح وشام کی گردش کو آپس میں بانٹ لیا تھا، شائہ بیگم مغرب کے بعد سے صبح دس بجے تک ہسپتال میں رہتیں اس کے بعد شاملہ بیگم ٹٹا کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔

نادیہ کی مصروفیات بہن کی بیماری کے سبب بڑھ گئی تھیں، ماں کی غیر موجودگی میں اُسے گھر کے سارے کام کاج کی دیکھ بھال کرنا پڑی تھی۔ خاص طور پر وہ صائمہ اور فرحان کا بے حد خیال رکھتی، کی بیماری نے جہاں بڑوں کے دلوں پر اثر کیا تھا وہاں صائمہ اور فرحان کے معصوم و بے ہوش کو بھی متاثر کیا تھا، خاص طور پر فرحان نے تو شاکا کی علالت کا بہت گہرا اثر قبول کر لیا تھا۔ جس روز سے شاکا کی حالت گجڑی تھی اُس روز سے فرحان کی ساری بذلہ سنجی اور شرارتیں بھی ختم ہو گئی تھیں۔ سنجیدہ و سنجیدہ اور ادا و سادہ نظر آنے لگا تھا۔

اُس وقت بھی نادیا، فوزیہ خاتون کو شام کا ناشتہ کرانے کے بعد ڈانٹنگ رُوم سے باہر نکل کر چلا
اور صائمہ کو لاؤنچ کے ایک گوشے میں بیٹھا دیکھ کر ٹھنک گئی، صائمہ کسی کتاب کی ورق گردانی کر رہی
لیکن فرحان کسی گہری سوچ میں تھا۔ نادیا کو اُس کی معصوم سوچ کا وہ خاموش انداز بڑا خوبصورت اُ
دبے قدم وہ اُس کی پشت پر جا کر ستون کی آڑ میں کھڑی ہو گئی، پیار بھری نظروں سے چھوئے بُھا
کے چہرے کے تاثرات کو محسوس کرنے لگی۔

جیسے غم روزگار اور غم دنیا دونوں کی فکر لاحق ہو..... جیسے کوئی فلسفی وقت کی کسی اوجھی سبھی کو سلجھانے میں ہو..... یا کوئی مفکر وقت کی ضرورتوں اور تقاضوں کے پیش نظر اپنے خیالی میں مستغرق ہو.....

ہو..... یا کوئی سرور ہو تو فرحان کے اس معصوم انداز کو کیوں پریشان کر کے ہمیشہ کے لئے ٹھہرا دیتا؟ اگر وہ کوئی مصور ہو تو فرحان کے اس قدر سنجیدہ بنادیا تھا۔ ہر وقت اسے بس ایک ہی فکر لاحق رہتی تھی، شاکی بیماری نے اسے کیجھت کس قدر سنجیدہ بنادیا تھا۔ ہر وقت اسے بس ایک ہی فکر لاحق رہتی تھی۔ ”بڑی آیا ہسپتال سے کب آئیں گی؟“ جو بھی ہسپتال سے واپس آتا فرحان اس سے بھی کہتا..... چنانچہ اچھا ہونے کی خبر سن کر اس کے چہرے پر زندگی کی مسرتوں کی لہر دوڑ جاتی، کچھ دیر وہ خوش خوش سا رہتا اس کے بعد پھر اداس سا سفر کرنے لگتا۔

نادیہ ستون کی آڑ میں کھڑی اُسے دیکھ رہی تھی کہ سامنے سے احمر آ گئے، فرحان نے احمر کو دیکھا تو اُس کی زبان پر ہمیشہ کی طرح پھر وہی سوال آ گیا۔ ”بڑی آپا کی طبیعت اب کیسی ہے؟“

کاٹکر ہے پارنر..... اب وہ پہلے سے بہتر ہے۔“
 آٹا گھر کب واپس آئیں گی؟“
 ”آخر نے تھکے تھکے انداز میں فرحان کے قریب بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔“تھوڑی
 سی رہ گئی ہے، دو چار دنوں میں وہ بھی جاتی رہے گی۔“
 ”مائی! ایک بات پوچھوں؟“

”کمزوری کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے۔“

بڑی آپا کی کمزوری کی وجہ بھی یہی ہے؟“
کہنا کیا چاہ رہے ہیں.....؟“ احر نے بڑے پیار سے فرحان کو دیکھا۔
بڑی آپا کو خون کی ضرورت ہے تو میں خون دینے کو تیار ہوں۔“ فرحان نے بڑی معصومیت
آپ ڈاکٹر سے پوچھ کر بتائے گا، لیکن امی کو نہ معلوم ہو ورنہ وہ مجھے ڈانٹ دیں گی۔“
احر بھائی، پلیز! صائمہ جلدی سے بولی۔ ”آپ فرحان کے مشورے پر ہرگز عمل نہ کیجئے گا۔“
ا۔.....؟“ فرحان نے براہ راست صائمہ سے پوچھا۔ ”کیا میں بڑی آپا کو خون نہیں دے
سکتا؟ لہجے میں سنجیدگی اور ناراضی کا ملا جلا عنصر شامل تھا۔

..... امر بھائی کو منع کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“
 نے تو بڑی آپا کے بھلے کے لئے ایک بات کہی تھی۔“ صائمہ نے قد رے شوخی سے کہا۔
 کو اگر تم نے خون دیا تو ہو سکتا ہے کہ وہ بھی تمہاری طرح اوٹ پٹانگ قسم کی حرکتیں شروع کر
 لیں امر بھائی..... خون اپنا رنگ اور اثر تو ظاہر کرتا ہے نا.....“
 امشورہ ہے اب آپ کمرے میں جا کر کچھ دیر آرام کر لیں۔“ فرحان نے جلے کٹے لہجے میں
 توفور کی کوڑی تلاش کر کے لائی ہیں..... پیدل چلتے چلتے تھک گئی ہوں گی۔“
 اورہہ بر محل نہیں ہے۔“ صائمہ نے کڑوا سا منہ بنا کر کہا۔

میں نے آپ کی سمجھ میں آ جائے تو کیا برا ہے؟“ فرحان نے برجستہ جواب دیا تو احمر کے اُداس سر کا ہنٹ پھیل گئی، نادیہ بھی بھائی کی بات پر مسکراتے ہوئے سامنے آ گئی، بڑے لاڈ سے

”میں زندہ ہوں تو پھر تمہیں آپلی کو خون دینے کی کیا پریشانی ہے؟“

اب نے اب تک دیا کیوں نہیں؟“
 مائے مسر بقر! کہ ڈاکٹر نے خون کی ضرورت محسوس نہیں کی۔“ نادہ نے بھائی کو پیار سے
 بوسے جواب دیا پھر احمر کے ادا اس چہرے کو دکھتے ہوئے بولی۔ ”اگر ڈاکٹر نے خون کسے لئے
 اگر بھائی بھی آمادہ ہو جاتے..... کیوں احمر بھائی..... میں نے ٹھیک کہا نا؟“

”اُسے سب کے سامنے کھل کر بر ملا نہیں کہا جاتا۔“

اور احمد تو ایک دوسرے کو ٹوٹ کر پیار کرتے تھے۔ اُن کے پیار میں کوئی تضاع، کوئی بناوٹ، دونوں کے درمیان ایک عرصے سے خاموش اور بے حد پاکیزہ محبت کا رشتہ قائم ہے۔ ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم تھے۔ کس قدر معصوم اور انوکھی وابستگی تھی دونوں کے۔ کیا مقدس جذبہ تھا جو وقت کے ساتھ آہستہ آہستہ پروان چڑھ رہا تھا۔ امبریل کی طرح رہا تھا۔ اور محبت تو ایک لازوال جذبہ کا نام ہے۔ ایسا جذبہ جو روح کی گہرائیوں میں کریمہ کے لئے امر ہو جاتا ہے۔ پھر احمد کی طبیعت میں یہ اضطراب کیسا تھا۔ بے چینی کا تھا۔ وہ کیوں اُداس اور غمگین رہنے لگے تھے۔ کیوں! آخر کیوں!!

پانچ انہی خیالوں میں اُن بھی بیٹھی تھی کہ نادرہ آگئی، آج وہ کئی دنوں بعد آئی تھی اس لئے نادیہ بدلتے ہی شکوہ کیا۔ یہ آج تم راستہ کیسے بھول گئیں؟“ پھر کرسیوں پر بیٹھتے پھر کرسیوں پر بیٹھتے دو۔ پھر شکوے شکایت بھی کرنی رہنا۔“ نادرہ نے آرام کرسی پر بیٹھتے پھر کرسیوں پر بیٹھتے دو۔ پھر شکوے شکایت بھی کرنی رہنا۔“ نادرہ نے آرام کرسی پر بیٹھتے پھر کرسیوں پر بیٹھتے دو۔ پھر شکوے شکایت بھی کرنی رہنا۔“ نادرہ نے آرام کرسی پر بیٹھتے

پھر کرسیوں پر بیٹھتے دو۔ پھر شکوے شکایت بھی کرنی رہنا۔“ نادرہ نے آرام کرسی پر بیٹھتے پھر کرسیوں پر بیٹھتے دو۔ پھر شکوے شکایت بھی کرنی رہنا۔“ نادرہ نے آرام کرسی پر بیٹھتے پھر کرسیوں پر بیٹھتے دو۔ پھر شکوے شکایت بھی کرنی رہنا۔“ نادرہ نے آرام کرسی پر بیٹھتے

پھر کرسیوں پر بیٹھتے دو۔ پھر شکوے شکایت بھی کرنی رہنا۔“ نادرہ نے آرام کرسی پر بیٹھتے پھر کرسیوں پر بیٹھتے دو۔ پھر شکوے شکایت بھی کرنی رہنا۔“ نادرہ نے آرام کرسی پر بیٹھتے پھر کرسیوں پر بیٹھتے دو۔ پھر شکوے شکایت بھی کرنی رہنا۔“ نادرہ نے آرام کرسی پر بیٹھتے

”کچھ تکلیف ہے شمار راحتوں سے بھی زیادہ عزیز ہوتی ہے۔“ احمد نے دلی زبان میں جواب دیا۔ ”یہ آپ نے شاعری کب سے شروع کر دی؟ اور وہ بھی نثر میں۔“ نادیہ کے لہجے میں شرارت تھی۔ ”عنوان سامنے ہو۔۔۔۔۔ حالات سازگار ہوں اور مجبوریاں زبان پر تالے ڈال دیں تو دل کی بات بھی شاعری کا رنگ اختیار کر لیتی ہیں۔“

”میرا خیال ہے کہ آج آپ کی طبیعت پہلے کے مقابلے میں زیادہ بہتر ہے۔“

”آپ کو اس کا اندازہ کیسے ہو گیا؟“

”آپ کی خوبصورت باتوں سے۔“ نادیہ نے احمد کو چھیڑنے کی خاطر کہا۔ ”آج آپ کی لہجہ بھی کچھ موزوں دکھائی دے رہی ہے۔“

”وہم اور حقیقت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔“ احمد پہلو بدل کر بولے۔ ”مجھے اس وقت ایک شرم رہا ہے۔“

”رشاد۔۔۔۔۔“ نادیہ نے احمد کے چہرے کے تاثرات کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”مری روح کی حقیقت مرے آنسوؤں سے پوچھو۔“

”مری جگہ تبسم مرا تر جہاں نہیں ہے۔“

”احمد بھائی۔۔۔۔۔“ نادیہ نے لکھتے سنجیدہ ہو گئی۔ ”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔۔۔۔۔؟“

”اپنی حالت کا کچھ احساس نہیں ہے مجھ کو۔“

”میں نے اوروں سے سنا ہے کہ پریشان ہوں میں۔“

”امرے بڑے جذباتی انداز میں دوسرا شعر پڑھا پھر اُٹھتے ہوئے بولا۔ ”چچی جان سے ٹاکے بخنی تیار کرانے کو کہا ہے؟“

”آپ آرام سے بیٹھیں، میں ابھی باورچی کو ضروری ہدایت دے کر آتی ہوں۔“ نادیہ تیز دھڑکی اور باورچی خانے کی سمت چلی گئی۔

”احمد بھائی۔۔۔۔۔ آپ بڑی آیا کے لئے بخنی لے کر جائیں گے تو میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں۔“

فرحان نے سنجیدگی سے درخواست کی۔

”اور میں بھی چلوں گی۔“ صائمہ جلدی سے بولی۔

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ آپ دونوں تیار ہو جائیں، میں ابھی لباس تبدیل کر کے آتا ہوں۔“

کچھ دیر بعد احمد بچوں کو لے کر ہسپتال چلے گئے تو نادیہ غمگین ہوئے باہر لان میں آگئی، احمد ابھی تک اُس کے ذہن میں صدائے بازگشت بن کر گونج رہے تھے، شاکی بیماری نے سب ہی کو ہار کر رکھا تھا لیکن احمد دو تین دنوں سے کچھ زیادہ ہی پریشان نظر آ رہے تھے اور آج تو انہوں نے کے ذریعے دل چیر کر رکھ دیا تھا۔۔۔۔۔ کتنا سوز۔۔۔۔۔ کس قدر گداز تھا ان اشعار میں، کیسے خوبصورت میں احمد نے اپنی بے چینی اور اضطراب کا نقشہ کھینچا تھا۔ لیکن وہ پریشان کیوں تھے؟ شاید تو زندگی کی سست واپس لوٹ رہی تھی۔ ڈاکٹروں نے اُس کی حالت حتمی بخش قرار دے دی تھی، اُس قسم کا کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔ پھر۔۔۔۔۔

احمد کی پریشانی کا سبب کیا تھا۔۔۔۔۔؟ وہ اس قدر غمگین اور اُداس کیوں نظر آ رہے تھے۔

”کہیں ایسا تو نہیں کہ شاہد احمد میں کسی بات پر اُن بن ہو گئی ہو۔“ نادیہ کے ذہن میں لہجے کو یہ خیال ابھرا لیکن دوسرے ہی پل اُس نے اس خیال کو ذہن سے نکال دیا۔

کی جو میزبان کی حیثیت سے ہمارا فرض تھا لیکن جانتی ہو راحیل کی ماں نے اُس کا کیا مطلب نکالا "کیا.....؟"

"اُن کا خیال ہے کہ ڈیڈ مجھے ہر قیمت پر راحیل کے لیے باندھنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ وہ کے برعکس ہے۔" نادہ نے نہایت اطمینان سے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ "در اصل راحیل نے ایک طرف عشق شروع کر دیا تھا اور وہ اپنی مہمی کو بھی ہمارے ہاں اسی ارادے سے لائے تھے کہ وہ میرے گھرانے کو قریب سے دیکھ لیں..... جانتی ہو ہمارے ہاں سے جانے کے بعد انہوں نے رائے قائم کی ہے؟"

"مجھے کیا معلوم.....؟"

"اُن کا خیال ہے کہ میں ایک آزاد خیال، فیشن پرست اور مغربی تہذیب کی دلدادہ لڑکی ہو لئے مجھے کسی شریف گھرانے کی بہو بننے کا کوئی حق نہیں....."

"تم مجھ سے مذاق تو نہیں کر رہیں؟" نادہ نے تعجب سے پوچھا۔

"میں چست لباس پہنتی ہوں جو شریف لڑکیوں کو زیب نہیں دیتا..... پتلون اور ڈھلی ڈھا اگر کوئی پہن لے تو وہ بیک جنبش زبان بے حیا قرار دی جاسکتی ہے..... کھل کر صاف گوئی اور سے بات کرنا سمیرا خاتون کے نزدیک بے شرمی اور بد تہذیبی کی علامت ہے۔ اور کسی لڑکی کا کہ سے ہنس کر بات کرنا صاف ظاہر کرتا ہے کہ وہ لڑکی اُس لڑکے کے زبردستی گلے پڑنے کی کوشش ہے..... اور ایسی صورت میں لڑکے کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ لڑکی اور اُس کے خاندان والوں سے رے ورنہ وہ لڑکی اُس کی تباہی اور بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے۔"

"تمہیں ان باتوں کا علم کیسے ہوا؟"

"خود راحیل نے بتایا ہے....." نادہ نے بے پروائی سے جواب دیا۔

"اور تم نے راحیل کی باتوں کا یقین کر لیا..... کیا تم نہیں جانتیں کہ راحیل کی خصلت لڑکے معاملے میں گریٹ سے کس قدر مطابقت رکھتی ہے....." نادہ نے سنجیدگی سے کہا۔ "میرا خیال راحیل نے تمہیں چڑانے کی خاطر یہ سب بکواس کی ہے۔"

"اگر راحیل نے براہ راست مجھ سے اپنی مہمی کے بارے میں یہ تمام باتیں کہی ہوتیں تو ایک کان سے سن کر دوسرے سے اُڑا دیتی۔"

"پھر.....؟"

"اُس نے ڈیڈ کو پوری تفصیل سے آگاہ کیا ہے اور....." نادہ کچھ کہتے کہتے مسکرا کر خاموش اُس کے چہرے پر حیا کی سرخی پھیل کر گہری ہوتی چلی گئی۔

"اور کیا.....؟"

"راحیل نے بڑے حوصلے سے کام لیتے ہوئے ڈیڈ سے میرے رشتے کی بات بھی کر ڈالی "عابد اٹکل نے کیا جواب دیا.....؟"

"پہلے تو وہ راحیل کو مختلف زاویوں سے شوہنک بجا کر دیکھتے رہے، پھر میری پیشی ہوئی۔ راحیل کی موجودگی میں دریافت کیا کہ کیا میں اس رشتے کے حق میں ہوں۔"

"اور تم نے کیا جواب دیا.....؟" نادہ نے بے صبری سے دریافت کیا۔

"کیا جواب دیتی..... راحیل ایسی قسمی صورت بنائے میری طرف دیکھ رہے تھے کہ؟"

پر رحم آگیا۔"

"مگر یا تم نے اقرار کر لیا....."

"میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن ڈیڈ میری خاموشی سے سمجھ گئے تھے کہ میں راحیل کو ناپسند بھی کرتی۔"

"اور اس کے بعد کیا ہوا؟" نادہ نے دلچسپی لیتے ہوئے سوال کیا۔

"ڈیڈ نے سب سے پہلے اپنی فوجی زندگی کے دو چار ایسے دھواں دھار واقعات سنائے جنہیں میں بھی متحدہ بارسن چکی ہوں۔ اس کے بعد انہوں نے راحیل کو مشورہ دیا کہ جیت ہمیشہ اُسی کی ہوئی جو محاذ پر ڈٹا رہے اور دشمن کے حملوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتا رہے..... آخر میں ڈیڈ نے نہایت لگی اور خوشخوار لہجے میں ایک ایسی بات بھی کہی کہ راحیل اپنی جگہ لرز کر رہ گئے۔"

"وہ کیا.....؟"

"انہوں نے کہا کہ رشتے کی بات چھیڑنے کے بعد اگر پیش قدمی کی بجائے پسپا ہو کر پیچھے ہٹنے کی ش کی گئی تو وہ اُسے گولی مار دیا گئے۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ عابد اٹکل نے اپنی طرف سے منظوری دے دی۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔"

"خیال کی بنی....." نادہ نے غلطی کا اظہار کیا۔ "بات اس حد تک آگے بڑھ گئی اور تو نے مجھے تک نہ دی؟"

"کس بات کی اطلاع دیتی....." نادہ نے شوخی سے کہا۔ "اس بات کی کہ میں نے جسے اُلو بنانے کا فیصلہ کیا اُس کے جال میں پھنس گئی؟"

"نادہ....." نادہ نے بڑی رازداری سے بولی۔ "ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھو....."

"کیا واقعی راحیل سے تمہیں پیار ہو گیا ہے؟"

"پہلے اُس کی حماقت سے پیار ہوا تھا اور اب....." نادہ نے شرما کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ سمیرا خاتون خوشی خوشی اس رشتے پر آمادہ ہو جائیں گی؟"

"یہ سوچنا راحیل کا کام ہے..... میرا نہیں۔"

"لیکن زندگی تو تمہیں اُن کے ساتھ ہی گزارنا ہوگی۔"

"راحیل کی خاطر گزار لیں گے کسی نہ کسی طرح۔" نادہ نے بڑے بڑے زردانی انداز میں ٹھنڈی لڑکھچائی۔ "لیکن نادہ نے اس زور سے چٹکی بھری کہ وہ تھلا کر رہ گئی۔

اُسی وقت شام کے بیگم کی گاڑی احاطے میں آکر رُک گئی تو نادہ تیزی سے اُٹھ کر ماں کے کمرے میں چلی گئی۔

○○○

پروفیسر شیرازی بڑی پہلو دار شخصیت کے مالک تھے۔ کالج میں جہاں طلباء کے حلقے میں انہیں ایک نام مقام اور درجہ حاصل تھا وہاں ہسپتال کے عملے میں بھی انہیں بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا۔ اُن کی عمر اٹھاون سال کی تھی لیکن وہ اپنے ہم عمر پیشہ ور پروفیسروں اور ڈاکٹروں کے مقابلے میں زیادہ چست و توانا اور چاق و چوبند نظر آتے تھے۔

کالج میں طلباء کے درمیان وہ اس قدر کھلے کھلے رہنے کے عادی تھے کہ ہر طالب علم انہیں

کا موقع نہ ملتا یا پھر وہ جمال احمد کو بڑی خوبصورتی سے باتوں میں ٹال جاتے۔

انج بھی پروفیسر شیرازی جب راولپنڈی پر آئے تو جمال احمد اور شانہ بیگم شا کے پاس موجود تھے، رنے حسب معمول کمرے میں داخل ہونے کے بعد سر کی خفیف جنبش سے سب کو دس کیا پھر شا ب جا کر اُس چارٹ کا مطالعہ کرنے لگے جس پر روزمرہ کی تفصیل، دواؤں کی رد و بدل اور ان کی رپورٹ درج تھی۔ رپورٹ پر ایک سرسری نظر ڈالنے کے بعد انہوں نے شا کی طرف دیکھا کہ مقابلے میں آج کچھ بہتر نظر آ رہی تھی۔ ”گڈ..... مجھے خوشی ہے کہ تمہاری ریکوری ٹھیک ہو ہے۔“ پروفیسر شیرازی نے اپنی عادت کے مطابق بے حد پیار۔ کہا۔ پھر اُس کی نبض پر ہاتھ ہوئے بولے۔ ”اور کتنے دن ہسپتال میں قیام کا ارادہ ہے؟“

”یہی بات تو میں آپ سے دریافت کرنا چاہ رہی تھی سر.....“

”ہاٹ.....؟“ پروفیسر شیرازی نے عینک ٹھیک کرتے ہوئے اُسے مخصوص انداز میں گھورا۔

”انہیں کوئی تکلیف ہے؟“

”ہات تکلیف کی نہیں ہے سر لیکن.....“

”تمہارے امتحان قریب آ رہے ہیں..... ڈونٹ وری، یور آ اے بریلیٹ سٹوڈنٹ۔“ پروفیسر شیرازی نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”مجھے قوی امید ہے کہ تم بہت اچھے نمبروں سے کامیاب ہوگی۔“

”شکریہ سر.....“ شا نے مدھم آواز میں جواب دیا پھر کسی گہری سوچ میں گم ہوئی، پروفیسر شیرازی نے بدستور اُس کے چہرے پر جھمی ہوئی تھیں۔

”ہسپتال کے بل کی فکر مت کرو..... دیت آئی ول ہے.....“

”نیرا خیال ہے کہ یہاں پڑے پڑے اُکٹا گئی ہے۔“ شانہ بیگم نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

”آپ کا کیا مشورہ ہے پروفیسر.....؟“ جمال احمد نے دریافت کیا۔ ”کیا شا کا ابھی یہاں رہنا ہے؟“

”اُس کا انھما جھ سے زیادہ شا کی مرضی پر ہے۔“ پروفیسر شیرازی نے شا کو مخاطب کر کے پوچھا۔

”ہاں نا..... تمہارا کیا ارادہ ہے؟“

”میں..... میں کیا کہہ سکتی ہوں سر.....؟“ شا ایک لمحے کو شپٹا گئی، اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ

”یہی بات کا کیا جواب دے؟“

”ڈاکٹر؟“ پروفیسر شیرازی نے قریب کھڑے ہوئے ڈاکٹر سے دریافت کیا۔ ”آپ کا کیا خیال ہے؟“

”میری رائے میں تو مریض کو صرف آرام کی ضرورت ہے..... تھوڑی دینٹنس ضرور ہے لیکن آہستہ

”ڈاکٹر نے اپنی رائے کا اظہار کیا تو پروفیسر شیرازی یوں خلا میں گھورنے

”یہی کہ بھولی بھری یاد کو دیکھنے کی کوشش کر رہے ہوں، کچھ دیر تک وہ خاموش رہے پھر جمال احمد

”اُس نے جواب دیا کہ.....“

”اُس نے اپنی پیشکش سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

”پروفیسر شیرازی کا مفہوم اُن کی سنجیدگی سے بہت واضح ہو گیا۔ جمال احمد نے ایک لمحے کو کچھ سوچا

”تو کمال کی اُچھن بڑھنے لگی، وہ پروفیسر شیرازی کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھنے لگی۔ جانے

”اُس کے دل کی دھڑکنیں آپ ہی آپ تیز ہونے لگیں۔“

دوسرے کے مقابلے میں خود سے زیادہ قریب سمجھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ طلباء برادری اُن کی بے حد عزت کرتی تھی۔ خود پروفیسر شیرازی بھی اپنے شاگردوں کو اپنے بچوں کی طرح عزیز رکھتے تھے جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ قدرت نے اُن کی جوان اولاد کو اُس وقت اُن سے چھین لیا تھا جب وہ میڈیکل کے آخری سال کے امتحانات کی تیاری میں مصروف تھا۔

بیوی کا انتقال شادی کے چار سال بعد ہی ہو چکا تھا، اُس وقت پروفیسر شیرازی جوان تھے، چاہے تو دوسری شادی کر کے اپنے سونے گھر کو آباد کر سکتے تھے لیکن انہوں نے اولاد کی خاطر اپنی خواہشات کی تکمیل کا ارادہ ترک کر دیا اور اپنی تمام تر توجہ بیٹے پر مرکوز کر دی جو اُن کی محبت کی آخری یادگار تھا۔ لیکن قسمت نے خوشیوں کا وہ آخری سہارا بھی اُن سے چھین لیا۔

بیٹے کی موت سے کل بھی وہ کالج کے تمام طلباء سے بے حد پیار کرتے تھے لیکن بیٹے کی موت نے انہیں اپنے شاگردوں سے اور قریب کر دیا، وہ اپنی کلاس سے بے حد پیار کرتے تھے، ایک ایک طالب علم پر نظر رکھتے، اُس کی صلاحیتوں اور کمزوریوں دونوں پر پوری توجہ دیتے اور ہر ایک کی مدد کرنا ان کا فرض سمجھتے تھے، یہی وجوہات تھیں جنہوں نے انہیں میڈیکل کالج کی ہر دلعزیز شخصیت بنا دیا تھا۔

اپنے پیشے کے اعتبار سے بھی پروفیسر شیرازی کا شمار قابل ترین ڈاکٹروں اور سرجنوں میں ہوتا تھا۔ وہ ناممکنات کے قائل نہیں تھے اس لئے لا علاج مرض کا علاج بھی اس یقین سے لگ کر کرتے کہ مریض کو شفا ہو جاتی۔ یہی وجہ تھی کہ قدرت نے اُن کے ہاتھ میں خاص شفا دی تھی، وہ جس مریض کا کیس ہاتھ میں لیتے اُس کی صحت یابی مریض کے لواحقین کے درمیان یقینی سمجھی جاتی تھی۔

پروفیسر شیرازی نے عمر کے آخری حصے میں بھی خود کو اس قدر مصروف کر رکھا تھا کہ انہیں کسی دقت سر اٹھانے کی فرصت نہیں ملتی تھی، جب کالج میں رہتے طلباء اور طالبات کے درمیان گھرے رہتے اور جب ہسپتال میں ہوتے تو اُن کے کمرے کے سامنے مریضوں کی لمبی قطار لگی رہتی۔

اُن کے پاس دولت کی فراوانی تھی لیکن وہ بے حد سادگی پسند واقع ہوئے تھے۔ تھوڑے تھوڑے کوئی سواری اُن کے در سے بھی خالی ہاتھ نہیں جاتا تھا۔ شہر کے بیشتر رفاہی اداروں کو اُن کی اعانت حاصل تھی، اکثر خیراتی اداروں اور تنظیموں کو وہ ہر ماہ بڑی پابندی سے مالی امداد دیا کرتے تھے لیکن اپنے نام کی شہرت انہیں پسند نہیں تھی۔

شا پروفیسر شیرازی کے زیر علاج ہونے کے علاوہ اُن کی شاگردی بھی تھی اس لئے پروفیسر شیرازی اُس کے علاج میں خاص دلچسپی لے رہے تھے، عام مریضوں کو وہ دن میں کسی ایک وقت وزٹ کرنے کے عادی تھے لیکن شا کا معاملہ مختلف تھا، وہ خاص طور پر اُسے دونوں وقت دیکھنے آتے اور جلد از جلد صحت مند ہونے کی تاکید کر کے بڑے بزرگانہ انداز میں شفقت سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے واپس چلے جاتے، انہوں نے جو نیر ڈاکٹروں اور ہسپتال کی نرسوں کو بھی ہدایت کر رکھی تھی کہ ”شا کا خاص خیال رکھیں، ڈاکٹروں کو اس بات پر حیرت تھی کہ پروفیسر شیرازی شا کی ذات میں اس قدر دلچسپی کیوں لے رہے ہیں؟ اُن کے نزدیک شا کی بیماری کی نوعیت اتنی اہم نہیں تھی کہ اُسے ”خاص توجہ“ کے زمرے میں شمار کیا جاتا۔ لیکن چونکہ پروفیسر شیرازی کا حکم تھا اس لئے تمام آن ڈیوٹی ڈاکٹر اور نرسیں شا کا خیال رکھتی تھیں۔

جمال احمد نے کئی بار اس بات کی کوشش کی کہ پروفیسر شیرازی سے شا کے بارے میں کچھ بات کر سکیں لیکن وہ جب بھی اُن سے ملتے پروفیسر شیرازی یا تو اتنے مصروف ہوتے کہ انہیں تفصیلی

ایک انجانا سا خوف اُس کے وجود پر آہستہ آہستہ طاری ہونے لگا۔ اُسے ٹھنکن کا احساس ستانے لگا، وہ اُس بات کا مقصد جاننے کے لئے بے چین ہو گئی کہ پروفیسر نے سب کو کمرے سے کیوں ہٹا دیا؟ ”میں تمہیں ایک خوشخبری سنانا چاہتا ہوں۔“ پروفیسر شیرازی نے بڑے نرم لہجے میں اُسے مخاطب کیا۔ ”تم پوری طرح صحت مند ہو۔“

شانے حیرت سے پروفیسر کو گھورا۔ کیا صرف یہی بات کہنے کے لئے سب کو وہاں سے ہٹایا گیا تھا۔؟؟

”تم اگر اپنی خوشی سے ہسپتال سے جانا چاہتی ہو تو میری طرف سے پوری اجازت ہے۔“ پروفیسر کا لہجہ بے حد شفقت آمیز تھا۔

شانے کی آنکھیں اور بڑھ گئی۔ ”پروفیسر سب کی موجودگی میں بھی اُس کی مرضی معلوم کر سکتا تھا۔ اور اپنی خوشی سے بھلا کون ہسپتال میں رہنا پسند کرے گا۔؟؟“ اُس نے سوچا۔

”میں تمہارا استاد ہوں شا! اور استاد بجائے باپ کے ہوتا ہے۔“ پروفیسر شیرازی نے نرم آواز میں کہا۔ ”ایکس ڈاکٹر ہونے کے ناتے بھی یہ میرا فرض ہے کہ مریض کے دل کا حال جان سکوں۔ اُس کے مرض کی صحیح تشخیص کر سکوں تاکہ علاج میں کوتاہی نہ ہو۔ کل ڈاکٹر بننے کے بعد یہ فرض تم پر بھی عائد ہوگا۔ کیا تم اپنے پیٹے کے ساتھ نا انصافی پسند کرو گی۔؟؟ صرف دولت کے حصول کی خاطر کسی بیٹے کو اپنا نام میرے نزدیک دنیا کی بدترین تجارت ہے۔ جانتی ہو میا کسے کہتے ہیں۔؟؟“

”سر۔“ شانے آہستہ سے کہا پھر ہنٹ چبانے لگی، پروفیسر شیرازی کی باتوں کا مفہوم اُس کی سمجھ میں آ رہا تھا لیکن وہ لب کشائی سے قاصر تھی۔ کیسے بتا دیتی کہ اُسے کیا غم لاحق ہے۔ رشتوں کے تقدس کا بھرم رکھنا بھی تو اُس کا فرض تھا۔ اسی فرض کے احساس نے تو اُسے نمہر بلب کر دیا تھا۔ وہ احسان جو اُس کی ذات پر برسوں سے کئے گئے تھے وہ اُس کا بوجھ محوں میں کیسے اتار سکتی تھی۔ وہ رزم جو اُس کی روح کی گہرائیوں میں ناسور بن کر ریس رہے تھے محض خوبصورت لفظوں کی چاشنی سے منسلک نہیں ہو سکتے تھے۔ یہی ناسور تو اب اُس کی زندگی کا سرمایہ تھے۔ پھر۔۔۔ وہ اس سرمائے کو خود اپنے ہاتھوں کیسے لٹا دیتی؟

”ذہن میں کوئی گرہ، کوئی کاغذ موجود ہو تو انسان اندر ہی اندر گھٹتا رہتا ہے۔ زندگی کی طویل شاہراہوں پر قدم جما کر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ ہر لمحہ ڈگمگا رہتا ہے۔“ پروفیسر شیرازی نے اُس کے چہرے کے تاثرات کا بغور جائزہ لیتے ہوئے بڑی اپنائیت سے کہا۔ ”میں ماہر نفسیات نہ ہوں لیکن اتنا بڑے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ تمہاری بیماری کی وجہ محض معمولی بخار نہیں تھی۔“

شانے کوئی جواب نہیں دیا، چپ چاپ نظریں جھکا ئے بیٹھی اندر ہی اندر سلکتی رہی۔

”اگر میں تمہیں شانے کی بجائے بی بی کہہ کر مخاطب کروں تو تم ناراض تو نہیں ہو گی؟“

”سر۔“ اُس نے نظریں اٹھا کر پروفیسر کو دیکھا، کچھ کہنا چاہا لیکن گھٹ کر رہ گئی۔

”جوابات کھل کر نہ کہی جاسکے اُس کا مفہوم اشاروں کنایوں میں بھی سمجھایا جاسکتا ہے۔ کیا تم میری ذات پر اعتماد نہیں کر سکتیں؟“

”سر۔“ اُس نے نظریں نیچی کر کے دبی زبان میں کہا۔ ”میں ایک کامیاب ڈاکٹر بننا چاہتی ہوں۔ یہ میری زندگی کی پہلی اور آخری خواہش ہے۔“

”میرا تجربہ کہتا ہے کہ تم اپنی خواہش میں ضرور کامیاب ہو گی۔ لیکن، کیا کچھ لوگ اس بات کو پسند

کہ تم اس پروفیشن کو اپناؤ؟“ شانے تیزی سے جواب دیا پھر کچھ سوچ کر بولی۔ ”میں پوری توجہ سے نہیں ہے سر۔۔۔۔۔“ شانے تیزی سے جواب دیا پھر کچھ سوچ کر بولی۔ ”میں پوری توجہ سے جاری رکھنا چاہتی ہوں۔ اور۔۔۔۔۔ میں اپنی خواہش کی تکمیل کے سلسلے میں کسی پر بوجھ نہیں

سمجھانیں۔“ ممکن نہیں ہو سکتا کہ میں ہوسٹل میں رہ کر اپنی پڑھائی کا سلسلہ جاری رکھوں اور اپنے

پرورش کر دوں۔“ پروفیسر شیرازی نے گہری سنجیدگی سے سر ہلاتے ہوئے کہا پھر بڑی اپنائیت سے

ذہن دہی شانے میں میڈیکل کالج میں تمہاری رہائش کا بندوبست کراؤں گا۔۔۔۔۔ اٹ اڑ

۔۔۔۔۔ پورا۔“ اُس کی آواز فرط جذبات سے بھر ا گئی۔ ”میں آپ کا احسان عمر بھر نہیں بھولوں گی۔“

وعدہ کرو گی مجھ سے۔؟؟“ حکم دیتے سر۔۔۔۔۔

کی راہ میں آگے بڑھتے وقت تم پیچھے مڑ کر نہیں دیکھو گی۔ نیور۔“ وعدہ کرتی ہوں۔“ اُس نے جلدی سے وعدہ کر لیا پھر کچھ سوچ کر بولی۔ ”ایک درخواست

ہے۔“ ان باتوں کا تذکرہ کسی اور سے نہیں کریں گے۔“ اُس نے دل مسوس کر کہا۔

نہارا استاد ہوں۔ اور استاد اپنا فرض سمجھتا ہے۔“ پروفیسر نے اُس کے سر پر محبت سے

ہاتھ رکھا۔ ”ناؤ فار گیت ایوری تھنگ۔ سب کچھ بھول جاؤ، صرف یہ یاد رکھو کہ تمہیں

ماہم شن پورا کرنا ہے۔“ فیر کا جواب سن کر شانے کو یوں محسوس ہوا جیسے اُس کے ذہن سے کوئی وزنی بوجھ اتر گیا ہو۔

اُس جواب بھی تک اُس کے معصوم دل میں نشتر بن کر چبھ رہی تھی۔ یہ خلش ماں کے پیار کی

سے وہ ہمیشہ محروم رہی گئی تھی۔ روزِ اوّل سے قسمت نے اُسے محرومیوں کا شکار کر رکھا تھا۔

کے سلسلے میں اُس کی پیاس بدستور قائم تھی۔ وہ آج تک فریب مسلسل میں مبتلا رہی۔ اور

ب اُسے اپنی نفسی کا احساس ہوا تو اُس کی روح میں کانٹے سے پڑنے لگے۔ اُس کی

امت دو چند ہو گئی۔ لیکن حالات نے اُسے مجبور اور بے بس کر دیا تھا۔ اور یہ بے بسی

راکھ کے وجود کو ڈس رہی تھی۔ اندر ہی اندر کھوکھلا کئے دے رہی تھی۔ کیسی کرب انگیز

اک لمحہ وقت کی گردش جس نے اُسے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔!!

بنا بالکل ٹھیک ہے..... اُسے صرف آرام و سکون کی ضرورت ہے۔“ شائلہ بیگم نے جلدی سے بولنے کی خاطر کہا۔ ”مہیں یقین نہیں آ رہا تو خود جا کر دیکھ آؤ۔“

آپ کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی ہیں.....“ اُس نے ماں کے چہرے کے بدلنے تاثرات کو کرتے ہوئے اصرار کیا۔ ”مجھے بتائیے نا می..... پلیز!“

کہ جو دیا کہ تکان کی وجہ سے.....“

میں نے آپ کو اپنی قسم دی ہے امی!“ نادیہ نے ماں کا جملہ کاٹتے ہوئے سنجیدگی سے ضد کی۔

کو تانا ہو گا کہ بات کیا ہے۔“

اگرچہ کو نادیہ کی زبانی جو تفصیل معلوم ہوئی تھی اُس سے اُن کا یہ شبہ کسی حد تک یقین میں بدلتا جا رہا تھا کو نادیہ کی اصلیت اور حالات کی ستم ظریفی کا علم ہو گیا ہے، نادیہ نے بھی اصلیت جاننے کی ضد شائلہ بیگم کی پلکوں کے گوشے بھگنے لگے، کچھ دیر تک بیٹی کو پیار بھری نظروں سے دیکھتی رہیں پھر یہ لہجے میں بولیں۔ ”بری بات ہے نادیہ..... ہر بات کے لئے ضد نہیں کیا کرتے.....“

میں آپ کی بیٹی ہوں..... اگر میں آپ کا غم بانٹنے کی کوشش نہیں کروں گی تو اور کون کرے گا؟“

تم ابھی نا سمجھ اور کسن ہو..... وقت اور حالات کی اہمیت اور نزاکتوں کو نہیں سمجھ سکو گی۔“ شائلہ بیگم نے لہجے میں درد ہی درد تھا۔

پلیز امی..... مجھ سے کوئی بات پوشیدہ نہ رکھیں، میں وعدہ کرتی ہوں کہ کسی سے کچھ نہ کہوں گی۔“

شائلہ بیگم نے کوئی جواب نہیں دیا، ڈبڈبائی نظروں سے نادیہ کو لکتی رہیں جو اپنی جگہ ڈٹی کھڑی تھی۔

کیا خدا خواستہ آپ کو کوئی موذی مرض لاحق ہو گیا ہے.....؟“ نادیہ نے دلی زبان میں پوچھا۔

شائلہ بیگم نے جواب میں اپنی مٹھیاں تختی سے بھیج لیں، آنسوؤں کے کچھ قطرے پلکوں تک آ کر گئے۔ ”سائنس کی پرواز ہمارے خیالوں سے زیادہ بلند ہو چکی ہے۔“ اُس نے ماں کو تسلی دی۔

ہاں آپ کا علاج ممکن نہیں تو ہم انہیں باہر لے جائیں گے۔“

ایک کوئی بات نہیں ہے بیٹی..... ہماری ثنا کو جسدانی طور پر کوئی مرض لاحق نہیں۔“

پھر..... اور کیا بات ہے؟“

کچھ بیماریاں غم کی صورت میں بھی لاحق ہوتی ہیں جن کا تعلق جسم سے نہیں، رُوح کی گہرائیوں

آہے۔“ شائلہ بیگم نے ایک سر آدھ کر جواب دیا تو نادیہ کی بے چینی اور بڑھکائی، تڑپ کر بولی۔

پلیز امی! یہ کیا باتیں کہہ رہی ہیں، مجھے سچ بتائیں کہ بات کیا ہے..... کیا غم لاحق ہو گیا ہے آپ کی کو؟“

نادیہ بیگم نے اُسے قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔“ شائلہ بیگم نے بسورتے ہوئے جواب دیا۔

کیا.....؟“ نادیہ ہششہ رہ گئی۔ ”اب احمر بھائی اور آپ کی شادی نہ ہو سکی گی؟“

نست کو یہی منظور تھا.....“ شائلہ بیگم نے اپنے درد کو چھپاتے ہوئے کہا۔ ”قسمت کے لکھے کو

کسکا ہے؟“

لگا کر وجہ کیا ہے.....؟“ نادیہ نے ماں سے سوال کیا۔

”اگرچہ کسی بڑے گھر کے رشتے کی تلاش میں ہیں۔“ شائلہ بیگم نے مصلحتاً جھوٹ بولا۔

”نادیہ جہ جہانی ہو گئی۔“ بڑی اماں خوشیوں کا سودا میرے اور جواہرات سے کرنا چاہتی ہیں۔“

”ہاں امی! پسند کی بات ہے بیٹی..... ہم کسی کو مجبور تو نہیں کر سکتے۔“

اگرچہ نے اتنی سی بات کو زندگی کا روگ بنالیا ہے؟“

ماں بن کر پالا تھا، ایک عمر سے کیلجے سے لگا رکھا تھا۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ شایہ ہوتی، اُسے کوئی ذمہ تکلیف لاحق ہوتی اور وہ پریشان نہ ہوتیں؟

شروع شروع میں انہیں یہی خیال آیا تھا کہ سر درد کی شدت نے بڑھ کر بخار کی صورت اختیار کر رہا ہے لیکن بعد میں جب اُنہوں نے ثنا کی حالت کا بغور جائزہ لیا، اُس کی نگاہوں کے بدلے ہوئے زاویوں کو محسوس کیا۔ اُنہوں نے پورے دیکھے اور نظروں میں شکوے اور شکایتوں کے تاثرات کو ابھرنے ڈوبتے دیکھا تو تڑپ کر رہ گئیں..... وہ رہ کر انہیں بس ایک ہی خیال ستاتا رہتا..... ”کہیں ثنا نے اُن کے اور فوزیہ خاتون کے درمیان ہونے والی گفتگو تو نہیں سن لی؟“

اس وقت بھی وہ ہسپتال سے واپسی کے بعد سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئیں اور ثنا کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگیں۔ نادیہ نے اندر داخل ہو کر اُنہیں مخاطب کیا۔

”کیا بات ہے؟ آپ گاڑی سے اُنتر کر سیدھی یہاں کیوں آ گئیں..... آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”ہاں..... وہ بالکل ٹھیک ہے، ہو سکتا ہے دو تین روز میں گھر واپس آ جائے۔“

”پھر..... آپ کیوں پریشان ہیں؟“

”وقت تکان کا اثر ہے..... کچھ دیر کر سیدھی کر لوں گی تو جاتا رہے گا۔“

”ٹھیک ہے..... آپ آرام کریں، میں آپ کے لئے گرما گرم چائے لاتی ہوں۔“

نادیہ جانے کے ارادے سے پلٹی تو شائلہ بیگم نے اُسے آواز دے کر روک لیا۔

”جی.....“ اُس نے ماں کے چہرے کی جانب غور سے دیکھا۔

”مجھے تم سے کچھ ضروری بات پوچھنی ہے۔“ شائلہ بیگم نے سنجیدگی سے کہا۔

”کیا بات ہے.....؟“ نادیہ بولی۔ ”یہ آپ اس قدر اُبھی اُبھی کیوں ہیں.....؟“

”میں تم سے ثنا کے بارے میں دریافت کرنا چاہتی ہوں۔“ شائلہ بیگم نے نادیہ کے جملے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تفصیل سے ایک ایک بات بتاؤ..... اُس دن جب ثنا کی طبیعت خراب ہو

تھی تمہارے اور اُس کے درمیان کیا گفتگو ہوئی تھی؟“

نادیہ نے ماں کے چہرے کے تاثرات کو ایک بار پھر بہت غور سے دیکھا، اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ماں کس قسم کی باتوں کی تفصیل جاننا چاہتی ہیں، ایک لمحے کو وہ بھی اُبھی رہی، پھر اُس نے دہرایا

باتیں دہرایاں جو ہسپتال جانے سے پیشتر ثنا اور اُس کے درمیان ہوئی تھیں۔

”نادیہ.....“ شائلہ بیگم نے حالات کی تفصیل معلوم ہونے کے بعد دھڑکتے دل سے پوچھا۔

تمہیں اُس روز ثنا کی باتوں پر حیرت نہیں ہوئی تھی؟“

”مجھے شدید صدمہ ہوا تھا، لیکن بخار کی شدت میں ایسا ہوتا ہے۔ انسان بہکی بہکی اور اُلٹی سید

باتیں کرنے لگتا ہے۔“

”تم بھول رہی ہو.....“ شائلہ بیگم دل مسوس کر بولیں۔ ”پہلے ثنا نے بہکی بہکی باتیں شروع کی تھیں

بخار کی شدت نے بعد میں سر اُبھارا تھا۔“

”ہو سکتا ہے سر درد کی تکلیف نے آپ کو بے حال کر دیا ہو۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہوا ہو۔“ شائلہ بیگم نے حسرت بھرے لہجے میں کہا تو نادیہ چونکے بغیر نہ رہی۔

”کیا مطلب.....؟“ اُس نے ماں کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا، پھر جہ جہانی ہوئی۔ ”آپ

کو میری قسم..... سچ سچ بتائیے! آپ کی طبیعت کیسی ہے، ڈاکٹروں نے کیا بتایا ہے؟“

”جس پر گزرتی ہے درد کی شدت کا اندازہ بھی وہی لگا سکتا ہے۔“

”ہمیں نادیہ..... تجھے میری قسم۔“ شائلہ بیگم نے اُسے اپنی قسم رکھاتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے کہا۔
”تم شائے اس قسم کی کوئی بات نہ کرنا۔ ورنہ اُس کی تکلیف کم ہونے کی بجائے اور بڑھ جائے گی۔“
”اس میں تکلیف اور اذیت کی کیا بات ہے؟“ نادیہ نے کڑوا سا منہ بنا کر کہا۔ ”اگر پسند کی شادی
نہ ہو تو انسان مرتو نہیں جاتا..... نادروہ کی مثال لے لیجئے، محل تک وہ راجیل کو تفریح طبع کا ذریعہ سمجھ رہی
تھی لیکن اب اُسی کے ساتھ شادی کر رہی ہے۔“

”نادرہ اور راحیل کی بات اور ہے..... تم ابھی ان باتوں کو نہیں سمجھ سکو گی۔“ شاملہ بیگم نے بڑا سنجھانے کی خاطر کہا۔ ”ناخن اگر گوشت سے جدا ہو جائے تو کیا درد کا احساس نہیں ہوتا ہے؟“

”ضرور ہوتا ہے..... لیکن وقتی طور پر۔“ نادیہ نے تھملا کر جواب دیا۔ ”کچھ دنوں بعد درد کی شدت میں کمی آ جاتی ہے۔“

”اچھا..... جاؤ، جا کر اپنا کام کرو!“ شائلے بیگم نے نادیدہ سے پیچھا چھڑانے کی خاطر کہا پھر سنجوگی سے بولیں۔ ”اس بات کا خیال رہے کہ میں نے تمہیں اپنی قسم دی ہے..... شا کو اس بات کی بھگ بھی نہیں ملنا چاہئے کہ ہم اُس کے عم سے واقف ہیں۔“

نادیدہ نے کوئی جواب نہیں دیا، کچھ دیر خاموش کھڑی ماں کے چہرے کو کتنی رہی پھر غصے سے پیر پکڑے ہوئے تیزی سے گھومی اور لمبے لمبے ڈگ بھرنی ماں کی خواب گاہ سے باہر چلی گئی..... اور..... شائلے بیگم بستر پر نیم دراز ہو کر رٹنا کے مستقبل کے بارے میں سوچنے لگیں.....!!

سمیرا خاتون اپنے ایئر کنڈیشنڈ آفس میں بیٹھی نوشابہ سے کاروباری سلسلے میں کچھ ضروری باتیں کر رہی تھیں اور ساتھ ساتھ ڈاک بھی دیکھ رہی تھیں، اُن کا موڈ خاصا خوشگوار تھا لیکن ایک لفافے پر نظر پڑتے ہی وہ یوں چومکلیں جیسے کوئی انہونی بات ہو گئی ہے۔

”کوئی خاص بات؟“ نوشابہ نے اُن کے چہرے کی بدلتی رنگت کو محسوس کرتے ہوئے دریافت کیا۔

”راجیل کا خط ہے.....“ سمیرا خاتون نے لفافہ چاک کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”خط لکھتا اُس کی سرشت کے خلاف ہے۔“

”ممکن ہے کوئی ضروری بات ہو۔۔۔۔۔“

”ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔“ سیرا خاتون نے لفافے سے خط نکال کر اُس کی تہہ کھولتے ہوئے کہا۔ پھر جوں جوں راحیل کے خط کا مضمون اُن کی نظروں سے گزرتا گیا اُن کے چہرے کی بنیادی گہری ہوئی گئی۔ راحیل نے لکھا تھا۔

”مائی ڈیر مئی!“
 اُمید ہے آپ خیریت سے ہوں گی اور آپ کا کاروبار ٹھیک ٹھاک چل رہا ہوگا۔ میں کئی دنوں سے آپ سے ایک بہت ضروری اور اہم بات کرنا چاہ رہا تھا، فون پر تقریر یا روز ہی گفتگو ہوتی ہے، متعدد بار میں نے کوشش کی کہ آپ سے اپنے مستقبل کے بارے میں کچھ کہوں لیکن اس خیال سے ارادہ نہ کر دیا کہ کہیں آپ میری بات کو بکواس قرار دے کر فون کا رابطہ منقطع نہ کر دے، اگر ایسا ہوتا تو میری بات

”پھر بھی مسٹر راجیل نے آپ کو اپنے فیصلے سے آگاہ کرنا ضروری سمجھا۔۔۔۔۔ وہ چاہتے تو نہ کرنے کے بعد بھی آپ کو رکھی طور پر اطلاع دے سکتے تھے۔“

”کیا مطلب.....؟“ سمیرا خاتون نے نوشابہ کو گھورتے ہوئے دریافت کیا۔

”میرا خیال ہے کہ آپ کے بیٹے کو اب بھی آپ کی اور آپ کی اجازت کی ضرورت ہے۔“

”اگر میں اجازت دینے سے انکار کر دوں تو..... کیا وہ مان جائے گا؟“

”آپ کو اپنے خون پر اعتماد اور بھروسہ ہونا چاہئے۔“

”وہ اپنے باپ کی روش اختیار کرنے کا خواہشمند ہے۔“ سمیرا خاتون تمللا کر بولیں۔ ”نادرہ جس ماحول میں آنکھ کھولی ہے، جس تہذیب کی گود میں پل کر جوان ہوئی ہے وہ اُس سے کنارہ اختیار کر لے گی..... میں نہیں مان سکتی۔“

”عورت مرد کے مقابلے میں زیادہ صابر ہوتی ہے..... حالات سے سمجھوتہ کر لینا اُس کی فطرت ہے۔“

”تم..... نادرہ کی سفارش کر رہی ہو.....؟“

”اس لئے کہ وہ بھی میری اور آپ کی طرح ایک عورت ہے۔“ نوشابہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں بھی ایک عورت ہے جس نے میری خاطر زندگی سے ایک جوا کھیلنا تھا، پانسہ اُس کے حق میں پھیرا تو وہ حالات سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہو گئی، وہ چاہے تو آج بھی زندگی کے اس عذاب سے بچ حاصل کر سکتی ہے جس نے اُس کے کمزور اور ناتواں وجود کو کانٹوں کی سیج پر ترے اور بار بار زخمی ہر پر مجبور کر دیا ہے..... آپ بھی ایک عورت ہیں، آپ نے زندگی کی مسرتوں کا بھرم قائم رکھنے کی وقت کے ساتھ مفاہمت کر لی تھی..... کیوں؟ صرف اولاد کے مستقبل کی خاطر..... اور آج اسی اولاد ایک چھوٹی سی آرزو کو پورا کرنے کا وقت آیا تو آپ اُس کی خوشیوں کے راستے میں.....“

”نوشابہ.....“ سمیرا خاتون نے زنجی لہجے میں اُسے ٹوکا تو وہ یکبخت خاموش ہو گئی، اپنی حیثیت محسوس کیا تو جلدی سے معذرت طلب کر لی۔

”آئی ایم سوری میڈم..... میں شاید جذبات کی رو میں بہک کر اپنا مقام بھول گئی تھی.....“

سمیرا خاتون نے نوشابہ کو بغور دیکھا، چند ثانیے اُسے کھورنی رہیں پھر کچھ سوچ کر بولیں۔ ”کیا دل گواہی دیتا ہے کہ نادرہ راجیل کی خاطر اپنی زندگی کے طور طریقے اور رنگ و ہنک بدل لے گی؟“

”اگر وہ مسٹر راجیل سے پیار کرتی ہے تو ایسا ضرور کرے گی۔“

”اور اگر ایسا نہ ہوا تو.....؟“

”آپ کو تا گوار خاطر نہ گزرے تو ایک مشورہ دوں.....؟“

”کہو.....“

”آپ نادرہ سے براہ راست مل کر اُس کے پیار کی شدت کا اندازہ لگا سکتی ہیں۔“ نوشابہ نے

”عورت، عورت کے دکھ درد کو زیادہ بہتر سمجھتی ہے، ہو سکتا ہے مسٹر راجیل نے نادرہ کے بارے میں کچھ لکھا ہے وہ ٹھیک ہی ہو۔“

”تم ایک ماں کی ممتا کو امتحان میں ڈال رہی ہو۔“

”اولاد کی خاطر تو ماں کو قربانی دینا ہی پڑتی ہے۔ اور مسٹر راجیل تو آپ کے اکلوتے بیٹے ہیں آپ کی خوشیوں کا آخری سہارا۔“

خاتون نے کوئی جواب نہیں دیا، کچھ دیر تک اپنے خیالوں میں کھوئی رہیں، پھر تھکے ہوئے بناپے سے بولیں۔ ”راجیل کو فون کرو..... میں اسی وقت اُس سے بات کرنا چاہتی ہوں۔“

نے جلدی سے فون کا ریسیور اٹھایا..... راجیل کے نمبر ڈائل کرنے لگی۔ سمیرا خاتون نے فون پر فریم پر نظر ڈالی جس میں افتخار کی تصویر کے ہونٹوں پر آج بھی زندگی سے بھرپور

نکلی رہی تھی۔

افتخار..... اس طرح مت مسکراؤ! میں تمہاری اولاد کی خاطر نہیں بلکہ ایک ماں کی ممتا کے ہوں سے مغلوب ہو کر حالات سے سمجھوتہ کر رہی ہوں.....“

خاتون نے دل ہی دل میں مرحوم شوہر کی یادگار تصویر سے مخاطب ہو کر کہا، پھر تھکے بارے

نہم اٹھائی اپنی کرسی پر آکر بیٹھ گئیں!!



”آپ کا کیا خیال ہے..... کیا ثناء نے امتحان سے بچنے کے لئے خود کو بیمار ڈال لیا تھا؟“ شبانہ بیگم نے پوچھا۔

”ممکن ہے یہ شخص ایک اتفاقہ امر ہو لیکن مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک دو بار میں نے بھی بچنے میں ن کی ڈانٹ ڈپٹ سے بچنے کی خاطر اسی قسم کی حرکت کی تھی۔“ جمال احمد بولے۔ ”بڑے فوائد بے موقع پر بیمار پڑنے کے..... مثلاً یہ کہ اگر رزلٹ خراب ہو تو اُس کی وجہ بیماری کے سرٹالی جا ہے۔ اور اگر شاندار نمبروں سے کامیابی حاصل ہو جائے تو واہ واہ بھی خوب ہوتی ہے..... سب یہی ہیں کہ دیکھو کس قدر ہونہار اور ذہین بچہ ہے، بیماری کے باوجود فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہوا۔“

”آپ کے ساتھ کیا ہوا تھا..... رزلٹ خراب ہوا تھا یا.....“

”بڑی پرانی بات ہے..... اس وقت کچھ یاد نہیں آ رہا۔“ پروفیسر جمال نے کچھ ایسے انداز میں کہا بھی مکرانے بغیر نہ رہ سکی۔

حرفے ثناء کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھی تو ایک لمحے کو اُن کے چہرے پر بھی زندگی کی علامت لوٹ..... دوسرے ہی لمحے وہ اُمید و بیم کی کیفیت سے دوچار نظر آنے لگے۔ جب سے اُنہیں ماں کی اس بات کا علم ہوا تھا کہ شائلہ بیگم نے رشتے کی مانگ سے انکار کر دیا ہے تو وہ ہر وقت کھوئے ن سے رہنے لگے تھے..... جب تک لوگوں کے درمیان ہوتے چہرے پر زبردستی مسکرائیں بے رہتے، دل پر جبر کر کے سب کے ساتھ باتوں میں مشغول رہتے لیکن جب تنہا ہوتے تو بڑے اداؤں اور پریشان سے نظر آتے۔ خوشیوں کا ساتھ اس قدر مختصر اور عارضی ہوگا، یہ بات تو بھی کے دہم میں چھی نہیں آئی تھی، زندگی سے بھرپور تنہا اُن کی جلدی حسرت و یاس کا رنگ اختیار کر لیا۔ خیال تو بھی خواب میں بھی نہیں آیا تھا..... وقت کی ایک ہی کروٹ نے حالات کو یکسر بدل دیا..... جی ثناء کو دیکھتے دیکھتے وہ خوابوں کی دنیا میں کھو جاتے، سرسبز وادیوں اور کوہساروں میں ثناء کا فاسے دور تک نکل جاتے۔ زندگی کے قریب ہوتے تو ہنستے مسکراتے وقت کا احساس ہی نہ ہوتا۔ جب انہیں اپنے اور ثناء کے درمیان ایک خلیج کا خیال آتا تو یکفخت افسردہ نظر آنے لگتے..... یوں زندگی کی تمام خوشیاں..... تمام مسرتیں اُن سے رُوٹھ گئی ہوں۔

اگر کوٹھن کا احساس ہوتا تو پلٹ پلٹ کر ماضی کی ان حسین یادوں کو کریدنے لگتے جہاں نہ جانے موز پر زندگی کی حسرتیں رُوٹھ کر اُن سے چھڑ گئی تھیں..... ان شاہراہوں پر بہتتے بہتتے تھک کر ل ہو جاتے جہاں گردشِ سفر نے قدموں کے سراغ ڈھنڈلا دیئے تھے..... پھر ایک سوال صدائے ت بن کر اُن کے دل و دماغ میں گونجنے لگتا.....

”کون ہے جس نے اُن کی خوشیوں کو اپنے پیروں تلے روند ڈالا..... کون ہے جس نے خواہشات اٹھونٹ کر مار ڈالا..... معصوم آرزوؤں میں پنچوں کا زہر گھول دیا.....“

کیا ثناء؟ جسے ٹوٹ کر چاہا گیا تھا..... زندگی کا سب سے اتمول اثاثہ سمجھ لیا گیا تھا.....

یہ شائلہ بیگم؟ جن کے پیار کی گھنیری چھاؤں تلے دو دلوں کی محبت پروان چڑھی تھی.....

کے غلوں میں احرار نے ممتا کی جھلک دیکھی تھی.....

کیا وہ سب کچھ کرتا تھا..... طلسم تھا..... فریب تھا.....؟؟؟

اس وقت بھی احرار اپنے خیالوں کی ویرانی میں بھٹک رہے تھے جب پروفیسر جمال احمد نے انہیں

بہ آکر مخاطب کیا۔ ”تم ڈرا ثناء کا خیال رکھنا..... میں پروفیسر شیرازی سے ضروری مشورہ کرنے جا

ڈاکٹر تفصیلی معائنہ کر کے واپسی کے ارادے سے پلٹا تو وہ چپ نہ رہ سکی، آہستہ سے پوچھا۔

”کیا پروفیسر شیرازی آج راولپنڈی نہیں آئیں گے؟“

”ہو سکتا ہے وہ لیٹ وِزٹ کریں۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”ایک ضروری کیس اٹینڈ کر رہے

آپ کچھ دریافت کرنا چاہتی ہیں؟“

”جی..... مجھے یہاں سے چھٹی کب ملے گی؟“

”پروفیسر شیرازی کی مرضی پر منحصر ہے..... ویسے میرے خیال میں آپ بالکل تندرست ہیں

کی کمزوری ہے لیکن وہ بھی رفتہ رفتہ جانی رہے گی۔“

ثناء نے کوئی جواب نہیں دیا، چپ چاپ چھت کو گھورنے لگی۔

”کیا سوچنے لگیں.....؟“

”جی.....“ ڈاکٹر کے سوال پر وہ چونکی، جلدی سے اُس کی جانب نظر گھما کر بولی۔ ”میر

اپنے امتحانات.....“

”علم ہے مجھے.....“ ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔ ”پروفیسر شیرازی بتا رہے ہیں کہ آپ اُن کی سٹوا

ہیں..... خاص طور پر آپ کو ابھی سے اپنے پروفیشنل کیریئر کا بہت زیادہ خیال ہے۔“

”یہ کوئی بری بات تو نہیں ہے ڈاکٹر.....“

”یہ میں نے کب کہا..... لیکن بہت زیادہ غور و فکر میں ڈوبے رہنے سے مسائل حل ہو

جاتے..... آپ کو آگے چل کر ڈاکٹر بننا ہے اور ڈاکٹر کے لئے ضروری ہے کہ وہ خود کو ٹینشن

رکھے۔ ورنہ وہ اپنے مریضوں کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتا۔“

”میں..... میں ٹینس تو نہیں ہوں۔“ اُس نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔

”گلد..... ہنسنا مسکرانا زندگی کی علامت ہے..... جسٹ کیری آن و دات۔“

شبانہ بیگم اور پروفیسر جمال بستر کے دوسری جانب موجود تھے، احرار بھی قریب کھڑے ثناء

کے بدلتے تاثرات کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔ ڈاکٹر کمرے سے باہر چلا گیا تو شبانہ بیگم

قریب آتے ہوئے کہا۔ ”خدا کا شکر ہے کہ تمہاری طبیعت اب بالکل ٹھیک ہے۔“

”سب آپ کی دعاؤں کا اثر ہے.....“ اُس نے آہستہ سے جواب دیا۔

”امتحان کی طرف سے پریشان مت ہو..... مجھے یقین ہے کہ تمہارا سال ضائع نہیں جا۔

خدا خواستہ اس سال کوئی کمی رہ گئی تو آئندہ سال پوری ہو جائے گی..... خدا تمہیں سلامتہ

امتحانات تو ہوتے رہیں گے۔“

”لیکن ہر سال امتحانات سے قبل بیمار پڑنا قطعی نا مناسب بات ہے۔“ جمال احمد نے

سے گھورتے ہوئے کہا۔ ”اس قسم کی شرارتیں اگر فرحان میاں کریں تو اور بات ہے..... تم

ذہن اور بردبار طبیعت کی مالک ہو۔“

رہا ہوں۔“

”جی.....“ احمر نے چونک کر کہا۔

”کیا بات ہے..... تم کس خیال میں گم تھے؟“

”کچھ نہیں..... بس، یونہی.....“

”شنا کی بیماری کے بارے میں سوچ رہے تھے.....؟“

احمر ہنسا کر رہ گئے۔

”پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے.....“ جمال احمد نے سنجیدگی سے کہا۔ ”شنا اب بالکل تندرست ہے۔ میں پروفیسر شیرازی سے یہی دریافت کرنے جا رہا ہوں کہ اگر وہ اجازت دیں تو ہم ٹاکو گھر جائیں، ہسپتال کا ماحول مریضوں کے لئے زیادہ مناسب نہیں ہوتا۔“

”کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ شنا کو دو چار روز اور یہاں رکھا جائے؟“

”کوئی خاص مصلحت.....؟“

”گھر کے مقابلے میں یہاں زیادہ بہتر طور پر نگہداشت ہو سکتی ہے۔“ احمر نے سنجیدگی سے کہا۔

”ڈاکٹر کا خیال ہے کہ کمزوری وقت کے ساتھ ساتھ دور ہوگی..... ویسے تم کہتے ہو تو میں پروفیسر شیرازی سے یہی کہوں گا کہ شنا کو دو ایک روز اور روک لیا جائے..... اس عرصے میں تمہیں بھی تیاروار کا موقع مل جائے گا۔“

”میں..... سمجھا نہیں؟“ احمر نے جمال احمد کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

”حوصلہ رکھو پر خردار.....“ جمال احمد نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”ٹھہرے ہوئے پانی میں تیرا“

کے فن کو نہیں آزمایا جاسکتا، مرد وہی ہے جو ہر محاذ پر جو انمردی سے ڈٹا رہے..... فتح ہمیشہ اُن ہی کی ہوتی ہے جو شکست بھی قبول کرنے کی ہمت رکھتے ہیں۔“

”آپ.....“

”میں تمہارا بزرگ ہوں.....“ جمال احمد نے پیار سے احمر کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”میرے لئے تم اور منصور دونوں برابر ہو..... مجھے تمہاری خوشیوں کا بھی اتنا ہی خیال ہے..... حوت سے کام لو! وقت ہر زخم کے لئے تریاق ثابت ہوتا ہے۔“

احمر نے نظریں گھما کر شنا کی طرف دیکھا جو آنکھیں موندے جانے کن خیالوں میں گم تھی۔

جمال احمد اُسے لمبی دے کر دروازے کی طرف قدم اٹھانے لگے، پھر کچھ سوچ کر ڈک گئے، پلٹ کر

شنا بے نیگم کی طرف دیکھا جو شنا کے بستر سے لگی کھڑی اُسے آنکھیں باندھے دیکھے جا رہی تھیں..... ان نظروں میں ممتا کی لہریں بھی کپکپا رہا تھا..... حسرت و یاس کی آمیزش بھی موجود تھی۔

”ڈاکٹر نے دوا کے بارے میں تو کچھ نہیں بتایا؟“

”مجھ سے تو کچھ نہیں کہا۔“ شنا بے نیگم نے آہستہ سے جواب دیا پھر بولیں۔ ”آپ کہاں جا رہے ہیں؟“

”شنا کے سلسلے میں پروفیسر شیرازی سے کچھ مشورہ کرنا ضروری ہے۔“

”اگر کوئی حرج نہ ہو تو میں بھی ساتھ چلوں؟“

”شوق سے تشریف لائیں..... اس میں تکلف کی کیا بات ہے؟“

شنا بے نیگم نے پلٹ کر احمر کی طرف دیکھا، ایک لمحے کو کچھ سوچا پھر خاموشی سے قدم اٹھاتی شوہر کے ساتھ کمرے سے باہر چلی گئیں۔ شنا بدستور آنکھیں بند کئے بیٹی تھی، بخار کی شدت نے چہرے پر کمزوری

لاش اُجاگر کر دی تھیں۔ بڑی کمزور کمزوری نظر آ رہی تھی..... احمر کچھ دیر تک اُسے دُور کھڑے دالہ انداز میں دیکھتے رہے پھر ہمت کر کے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے بستر کے قریب جا کر رُک کر توجہ سے توقف کے بعد دل کی دھڑکنوں کو سنہالتے ہوئے مدھم لہجے میں اُسے آواز دی۔ ”شنا.....“

پانی آنکھوں کے بوجھل پونوں میں ایک ارتعاش پیدا ہوا، یوں جیسے کسی نے پانی کی خاموش سطح پر ٹکری اُچھال دی ہو..... احمر اُسے پلٹیں بھپکائے بغیر دیکھتے رہے، کچھ دیر بعد اُنہوں نے شنا کو

اجاب کیا۔ ”یہ..... میں ہوں..... احمر.....“

ان کے لہجے میں جلی ہوئی ہوئی ناکام حسرتوں کی فریاد تڑپ رہی تھی، شنا نے آنکھیں کھول دیں،

ریب پایا تو اُس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔

اب کیا محسوس کر رہی ہیں آپ.....؟“ احمر نے سنجیدگی سے خیریت دریافت کیا۔

”پہلے سے بہت بہتر ہوں.....“ اُس نے دل کی دھڑکنوں کو سنہالتے ہوئے آہستہ سے جواب دیا۔

”بخار کی شدت نے آپ کو کس قدر کمزور کر دیا ہے؟“

”اُس نے کوئی جواب نہیں دیا، خاموش لیٹی رہی۔

لیکن یہ وقتی کمزوری ہے..... ہسپتال سے رخصت ہونے کے بعد آپ گھر جائیں گی، زندگی کے

ا میں دوبارہ دلچسپی لینا شروع کر دیں گی تو یہ نقاہت بھی دُور ہو جائے گی۔“

انے احمر کو آنکھوں سے دیکھا، پھر اُس کے بیمار ہونوں پر ایک پھیکا سا تبسم اُبھر آیا۔

”کیا آپ کو میری بات کا یقین نہیں آیا؟“

یہ میں نے کب کہا.....؟“ وہ کمزور لہجے میں بولی۔

پھر آپ مسکرائی کیوں تھیں.....؟“

آپ شاید مجھے بہلانے کی کوشش کر رہے تھے.....“ وہ چھت کو ہنستے ہوئے بولی۔

بیماری میں انسان بچوں کی طرح معصوم ہو جاتا ہے..... کمزوری کی گولیاں کھاتے کھاتے اُسکا

ہاتھ اُسے بہلا پھسلا کر دوا پینے پر آمادہ کیا جاتا ہے۔“

لیکن..... میں نے تو ایسا نہیں کیا۔“

آپ کو بیماری میں اتنا ہوش بھی کہاں تھا کہ کسی کی پریشانی کا احساس ہوتا؟“ احمر کے لہجے میں

ل ہو گیا۔

”کون کون پریشان ہوا میری بیماری سے؟“ اُس نے بڑی معصومیت سے دریافت کیا۔

”وہ شخص جسے آپ کی ذات سے لگاؤ ہے..... اُس ہے..... پیار ہے اور.....“

”نئے فکوس ہے.....“

”ک بات کا.....؟“

”کیا کہ آپ کو میری وجہ سے بلاوجہ پریشان ہونا پڑا۔“

”..... احمر تڑپ اُٹھے۔

آپ کا کیا خیال تھا..... آپ بیمار ہوں گی تو مجھے پریشانی نہیں ہوگی؟“ شنا نے کوئی جواب نہیں

دیا..... ”کیا سوچ رہی ہیں.....؟“

بیماری کے دوران اس بے ہوشی کے سلسلے میں جس نے مجھے ہر احساس سے بے نیاز کر دیا تھا۔“

”وہ لمحے بڑے کٹھن اور دلخراش تھے..... شکر ہے آسانی سے گزر گئے۔“

”احمر.....“ اُس نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔ ”آپ کو کچھ یاد ہے میں کتنا عرصہ پہلوں ہوں.....؟“

”اتنی فرصت کے تھی جو ان لمحوں کا حساب رکھتا۔“

”لیکن مجھے یاد ہے..... ایک ایک لمحہ..... ایک ایک بل..... ایک ایک بات.....“

”آپ ذہن پر بوجھ نہ ڈالیں، پھول جائیے ان باتوں کو!“ احمر بولے۔ ”ڈاکٹر نے کہا ہے کہ کو آرام کی شدید ضرورت ہے۔“

”آرام.....“ وہ ایک سرد آہ بھر کر خاموش ہو گئی۔

”ٹھنا.....“ احمر نے اُس کے چہرے پر غموں کے سائے لرزتے دیکھ کر بڑی اپنائیت سے کہا۔ ”آپ سے بہت ساری باتیں کرنا ہیں۔“

”کیا.....؟“

”ابھی نہیں..... جب آپ بالکل تندرست اور چاق و چوبند ہو جائیں گی تب..... ابھی تو آپ اپنے امتحان کی تیاری بھی کرتا ہے۔“

”ہاں..... میں تو بھول ہی گئی تھی کہ مجھے خود کو امتحان کے لئے بھی تیار کرنا ہے۔“ وہ ہونٹوں پر ہلکی مسکراہٹ سجا کر بولی۔ ”میں آپ کی کامیابی کے لئے ہمیشہ دعا گو رہوں گی۔“

”شکریہ.....“

”ایک بات پوچھوں.....؟“

”پوچھیے.....“

”بیجاری کے دوران آپ کو سب سے زیادہ کس کا خیال آتا رہا.....؟“

”ماضی کے اُن خوبصورت لمحوں کا جو بیت چکے ہیں۔“

”حال اور مستقبل کے بارے میں کیا خیال ہے.....؟“

”حال جیسا بھی ہے آپ کے سامنے ہے..... رہا مستقبل تو اُس کے بارے میں یقین سے کہا جا سکتا۔“

”یہ..... آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“

”آپ کو حیرت کس بات پر ہے.....؟“ اُس نے احمر کو غور سے دیکھا پھر جلدی سے نگاہ زاویہ بدل لیا۔

”آج سے پیشتر تو آپ مستقبل کے بارے میں بڑی بڑی امید تھیں۔“ احمر نے اُسے یاد دلایا۔

”کوشش کی۔“ صرف ایک شرط تھی آپ کی میڈیکل کی تعلیم مکمل کرنے کی.....

”یہ میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے۔“

”اور اس خواہش کی تکمیل کے بعد کیا ارادہ ہے.....؟“

”دو کئی انسانوں کی خدمت اور تمارداری۔“ اُس نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ”ان زخموں۔“

مرہم کی تلاش جو بھرنے کی بجائے اندر ہی اندر ناسور کی طرح پھیلتے رہتے ہیں.....

”میرا خیال ہے کہ آپ جذباتی ہو رہی ہیں۔“ احمر نے دلی زبان میں اُسے سمجھانے کی کوشش

کے ہونٹوں پر ایک رخ سی مسکراہٹ پھیل کر گہری ہوتی چلی گئی، کچھ سوچ کر بڑے ٹھوس لہجے میں بولا

”زمین اور جذبات کا بڑا گہرا تعلق ہے..... جذبات اگر مردہ ہو جائیں تو انسان کی بلندیاں پستیوں زیادہ حقیر ثابت ہوتی ہیں..... جذبے ہی تو ہیں جو انسان کو اُس کے ناتواں قدموں پر کھڑے آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتے ہیں..... جذبوں کی شدت میں کمی آجائے تو انسان منہ کے بل زمین پر گر دیتا..... گرا دیا جاتا ہے۔“

”آپ نے تو ڈاکٹر بننے کا پروگرام بنایا تھا..... یہ اچانک فلسفی بننے کا سودا ذہن میں کیسے سما گیا؟“

”شکریہ.....“ اُس نے احمر کو سیات نظروں سے گتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔ ”آپ نے بروقت چوٹ کا دیا..... میں شاید ہیکنے والی تھی۔“

”خدا کا شکر ہے کہ بات جلدی آپ کی سمجھ میں آگئی ورنہ.....“

”اور نہ کیا.....؟“

”مجھے آپ کو باور کرانا پڑتا کہ ابھی آپ کلی طور پر صحت مند نہیں ہوئی ہیں.....“ احمر نے شاکی لہجے میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”اور جب تک آپ پوری طرح صحت یاب نہ ہو جائیں آپ کو ذہن پر کم کا بوجھ نہیں ڈالنا چاہئے..... ڈاکٹر کی اصول بھی یہی ہے۔“

”آپ درست فرما رہے ہیں۔ لیکن ضروری تو نہیں کہ بیٹھے کے اصول ذاتی اصولوں سے بھی نکل سکتے ہوں۔“ اُس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”میرا ذاتی تجربہ تو یہ کہتا ہے کہ انسان جس میں مہارت رکھتا ہے اکثر اسی میں مار کھا جاتا ہے۔“

”مثلاً.....؟“

”خود اپنی مثال لے لیجئے.....“ شاخو کو سنبھالتے ہوئے بولی۔ ”آپ ہیرے جو اہرات کی تجارت کرتے ہیں لیکن کیا یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آپ نے ہمیشہ ہیرے کو ہیرا ہی سمجھ کر انتخاب کیا.....

یوں نہیں ہوا کہ کسی پتھر کو ہیرا سمجھ بیٹھے ہوں۔“

احمر نے جواب پر تھلا اٹھے، شاخو کو معنی خیز نظروں سے گھورتے رہے..... انہیں شدید ٹھٹھن کا احساس تھا، وہ شکایت جو انہیں شام سے ہونی چاہئے تھی وہی شاخو کر رہی تھی..... کوئی اور وقت ہوتا تو شاید وہ لہو نہ رہتے لیکن شاخو کی بیجاری کے پیش نظر دل پر جبر کر کے چپ رہے، البتہ اندر ہی اندر سلگتے رہے۔

”آپ نے کوئی جواب نہیں دیا.....؟“ شاخو نے احمر کے چہرے کے بدلتے تاثرات کو محسوس کرتے دلی زبان سے پوچھا۔

”میں سوچ رہا ہوں کہ کیا جواب دوں.....“ احمر کے لہجے سے بے بسی کا احساس جھلک رہا تھا۔

”کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو انسان کو لا جواب کر دیتی ہیں۔“

”اور کچھ مواقع ایسے ہوتے ہیں جب انسان کو اپنے تا کر وہ گناہوں کو بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے۔“

”ظاہرہ بروقت ادا کر دیا جائے تو ذہن کا بوجھ بڑا ہلکا ہو جاتا ہے۔“

”آزماؤ صداقت کی کسوٹی ہوتی ہے۔“ احمر نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”کسی پر فرد جرم عائد کئے بغیر پتھر ہادیا جائے، یہ اللہ اف تو نہیں.....“

”کی کو بلند یوں تک لے جا کر زمین کی پستیوں کی جانب گرا دیا جائے..... افسے آپ کیا کہیں گے؟“

”نا..... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“ احمر نے حیرت سے پوچھا۔

”حقیقت بڑی تلخ ہوتی ہے..... کیا آپ اس حقیقت سے انکار کر سکیں گے؟“

”میں..... آپ کی باتوں کا مغہور نہیں سمجھ سکتا۔“

نثار احمد کی تمام زندگی ہیرے جواہرات سے کھیلنے گزری تھی، انہیں خوب پہچان تھی کہ کھرے اور کھوٹے میں کیا فرق ہوتا ہے، کاروباری میدان میں لوگ دُور دُور سے اُن سے صلاح و مشورے کرنے آتے تھے۔ اُن کا کہا مستند سمجھا جاتا تھا لیکن گھر کے اندر فزہ خاتون کے فیصلے اٹل ہوتے تھے۔ نثار احمد جو مکمل صلح پسند طبیعت کے مالک تھے اس لئے انہوں نے کبھی گھر کے معاملات میں دخل اندازی نہ کی۔

آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔“ ثار احمد نے جلدی سے وضاحت کی۔ ”نادیہ اور منصور کی بات تو رسی کی وقت طے ہوئی تھی جب جمال احمد اپنی بیوی اور منصور کے ساتھ لندن میں تھے۔ رہا انگوٹھی

مجھے ان باتوں سے کیا سروکار.....؟“ فوزیہ خاتون نے شوہر کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تو یہ کارن ہے کہ ایک تو ہمیں اندھیرے میں رکھا گیا دوسرے یہ کہ منگنی کی بات اُس وقت ظاہر کی جہ میں نے احمر کا رشتہ پیش کیا۔“

اس میں شکایت اور رنج کا کون سا پہلو نکل آیا.....؟“

کیوں..... کیا شامکہ ہمارے کراچی آنے کے بعد بھی منگنی والی بات نہیں بتا سکتی تھیں؟“

مگر ہے انہیں اس کا موقع ہی نہ ملا ہو۔“

پیشی تو ہو سکتا ہے کہ وہ کسی خاص مصلحت کے پیش نظر ہمیں کچھ بتانے سے گریز کر رہی ہوں۔“

یہ اندازہ آپ نے کس طرح قائم کر لیا؟“

ور کیا..... نہ میں احمر کی بات نکالنی اور نہ شامکہ بیگم کو منصور اور نادیہ کا راز اُگلنا پڑتا۔“

ہام کا علاج لقمان حکیم کے پاس بھی نہیں تھا۔“ ثار احمد نے جزبہ ہو کر کہا۔ ”آپ بلاوجہ ایک بات کا بیٹھن بنا رہی ہیں۔“

آپ کیوں نہ لیں گے حمایت..... آخر بھائی کا خون ہے، رنگ تولائے گا۔“

ات مجھے کی کوشش کیجئے.....“ ثار احمد نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”منصور اور

منگنی میں ایسی کوئی بات نہیں تھی جسے رازداری کے پردوں میں چھپا کر رکھا جاتا۔ شامکہ بیگم

ماہین کا دل رکھنے کی خاطر وقت سے پیشتر انگوٹھی قبول کر لی تھی۔“

تار بھی اگر چاہتے تو بڑے بھائی کا دل رکھنے کی خاطر مشورہ لے سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے تو

ہا کیا۔“ فوزیہ خاتون نے ایک معقول دلیل پیش کی تو ثار احمد ایک ٹانے کو اپنی جگہ بچ و تاب کھا

لئے، کچھ دیر تک خاموش رہے پھر بولے۔

میرا خیال ہے کہ جو کچھ ہوا بہتر ہی ہوا..... اگر منصور اور نادیہ کی بات طے نہ ہوئی ہوتی تو حالات

بمورت اختیار کر سکتے تھے۔“

کیا مطلب.....؟“

آپ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ احمر نادیہ کو نہیں شاکو پسند کرتا ہے..... ایسی صورت میں

یاد اور احمر کا رشتہ بے جوڑ نہ ثابت ہوتا؟“

میں احمر کی ماں ہوں..... کیا مجھے اولاد کے حق میں فیصلہ کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے؟“

مگر آپ کا حق تسلیم کر سکتا تھا..... بشرطیکہ بات وقار کی بجائے کسی اور کے گھر کی ہوتی۔“

میں بھی نہیں.....“

نادیہ اور شامکہ ہی ولیز سے وابستہ ہیں..... احمر کے لئے شاید آپ کے حق کو اپنی پسند پر فوقیت

ناتہ ہوتا..... اور اگر ایسا ہو جاتا تو احمر کی زندگی عذاب بن جاتی.....“

گویا آپ کو اس بات کی خوشی ہے کہ نادیہ کا رشتہ کہیں اور طے ہو جانے کے بعد شامکہ اور احمر کے

دلیان ہموار ہو گیا ہے۔“

مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کروں گا۔“ ثار احمد نہایت سنجیدگی سے بولے۔ ”مجھے احمر کے لئے

جس کی وجہ سے وہ الجھ گئی ہیں۔“

”شاکا طبیعت تو ٹھیک ہے نا.....؟“ ثار احمد تھوڑے وقف کے بعد بولے۔

”احمر سے دریافت کر لیجئے..... وہ ابھی ہسپتال سے واپس آیا ہے۔“ فوزیہ خاتون کے لہجے میں

اولاد کی طرف سے شکوہ بھی شامل تھا۔

”میں نے وقار سے دریافت کیا تھا شاکا کے بارے میں..... وہ بتا رہے تھے کہ ایک دور دراز میں ٹاکر

واپس آ جائے گی۔“

”آپ نے احمر کی حالت پر بھی کچھ غور کیا ہے؟“

”کیا ہوا احمر کو.....؟“

”شاکا کی بیماری کا بہت گہرا اثر لیا ہے دل پر۔“ فوزیہ خاتون پہلو بدل کر بولیں۔ ”نہ کھانے کا ہوش

ہے نہ پینے کا۔ جب دیکھو منہ اٹھائے ہسپتال کی سمت بھاگا چلا جا رہا ہے۔“

”یہ ایک فطری عمل ہے۔“ ثار احمد نے بے پروائی کا اظہار کیا پھر جلدی سے بولے۔ ”کسی بیماری

عیادت کرنا تو عین عبادت ہے۔“

”لیکن میں اسے پسند نہیں کرتی..... آپ کسی وقت سمجھائیے گا احمر کو۔“

ثار احمد نے بیوی کو بہت غور سے دیکھا پھر خاموشی سے آرام کرسی پر نیم دراز ہو گئے۔

”ایک بات کہوں اگر آپ کو ناگوار نہ ہو؟“

”کہئے.....“

”میں احمر کو ساتھ لے کر نیروبی واپس جانے کے سلسلے میں غور کر رہی ہوں۔“

”اتنی جلدی.....؟“ ثار احمد نے چونکتے ہوئے کہا۔ ”وقار اور شامکہ کیا کہیں گے؟“

”میرا خیال ہے کہ شامکہ کو ہماری واپسی پر کوئی ملال نہ ہوگا۔“

”خیریت.....؟ آپ مجھے کچھ کبیدہ خاطر نظر آ رہی ہیں۔“ ثار احمد نے سنجیدگی سے معاملے کو

نوعیت سمجھنے کی کوشش کی۔

”میں نے شامکہ سے احمر کے رشتے کی بات چھیڑی تھی.....“ فوزیہ خاتون نے دبی زبان میں کہا۔

”پھر.....؟“

”شامکہ نے انکار کر دیا۔“ فوزیہ خاتون نے ہونٹ چباتے ہوئے خشک لہجے میں کہا۔ ”انہوں نے

نادیہ کا رشتہ منصور سے طے کر دیا ہے اور ہمیں کانوں کان خبر تک نہ ہونے دی.....“

”وقار مجھے نادیہ کے سلسلہ میں بتا چکے ہیں۔“ ثار احمد نے بھائی کی حمایت کرتے ہوئے جواب

دیا۔ ”ابھی صرف منگنی کی انگوٹھی قبول کی گئی ہے، باقاعدہ رشتے کا اعلان اُس وقت کیا جائے گا جب

کی بات بھی طے ہو جائے گی۔“

”لیکن ہم کوئی غیر بھی نہیں تھے کہ اس قدر رازداری سے کام لیا جاتا۔“ فوزیہ خاتون تک

بولیں۔ ”مجھے نہ سہمی لیکن آپ تو بڑے بھائی تھے۔ دوسرا اگر دنیا دکھاوے کی خاطر ہی مشورہ مانگا

جاتا تو کون سی قیامت آ جاتی.....؟“

”وقار نے مجھے اس ضمن میں بھی مطمئن کر دیا ہے..... حالات کا تقاضہ کچھ ایسا ہی تھا کہ شامکہ منصور

کے رشتے سے انکار نہیں کر سکتی تھیں۔“

”مگویا یہ منگنی زبردستی کا سودا ہے۔“

ہم اثر کیا ہے۔“

دن کے منہ میں خاب..... خدا نخواستہ خطرے کی تو کوئی بات نہیں؟“ شائلہ بیگم نے گہرائے ذہن میں سوال کیا۔

باب ہر طرح سے شاکی دلجوئی کا خاص خیال رکھنا ہوگا۔“ وقار احمد نے کوٹ اُتارتے ہوئے سوچ کر بولے۔ ”کھر کے باقی افراد سے بھی تاکید کر دیں کہ وہ شاکی خوشیوں کو ٹھوٹا خاطر کی ایسی بات نہ ہونے دیں جس سے اُس کے ذہن کو مزید کوئی جھٹکا پہنچے۔“

ن سے بتائیے..... میری شاکی کو کوئی خطرہ تو لاحق نہیں؟“ شائلہ بیگم جذباتی ہو گئیں۔ ”اُس کی خاطر میں اپنی جان بھی دے سکتی ہوں، اس کی صحت یابی کے لئے اپنا تمام اثاثہ داؤ پر لگانے کا آپ نہیں سمجھیں گے کہ میں شاکی کو کس قدر چاہتی ہوں، اُسے اگر کچھ ہو گیا تو.....“

اے ارے..... آپ نے تو ایک چھوٹی سی بات کا افسانہ بنا دیا۔“ وقار احمد بیوی کو تسلی دیتے لے۔ ”میں نے تو محض اس خیال سے آپ کو ڈاکٹر کے مشورے سے آگاہ کیا تھا کہ آپ کام لیں..... اگر کوئی خطرے کی بات ہوتی تو شاکی کو گھر آنے کی اجازت کیوں ہوتی..... آپ کو بھی مات کر دیا، ایک دم ہی جذبات کی رو میں بہہ نکلیں۔“

بنے آپا جان کو اطلاع کر دی شاکی گھر آنے کی؟“

تو ہسپتال سے سیدھا چلا آ رہا ہوں۔ ذرا پل بھر میں سستالوں تو شانہ بہن کو مطلع کئے دیتا ہوں۔“

آرام سے لباس تبدیل کر لیں، میں آپا جان کو فون کر کے ابھی آئی۔“ شائلہ بیگم نے دوپٹے، ہنگی، چوکوں کے نمناک گوشوں کو خشک کیا پھر تیز تیز قدم اٹھاتی کمرے سے باہر چلی گئیں۔

مذ نے لباس تبدیل کیا، غسل خانے سے منہ ہاتھ دھو کر تازہ دم باہر نکلے تو شائلہ بیگم چائے کی ناموجودیں۔“ وقار احمد نے بیوی کو غور سے دیکھا، شاکی گھر آنے کی خوشی نے اُن کے چہرے کھاتھا، ٹھکن اور پریشانی کے وہ اثرات جو کچھ دیر پہلے موجود تھے پل بھر میں چھٹ گئے تھے۔

بنے شاکی سلسلے میں کچھ منٹیں بھی تو مان رکھی تھیں۔“

باد ہے..... شاکی کو خیر سے گھر آ لینے دیجئے، ایک ایک منت پوری کروں گی۔“ شائلہ بیگم نے لئے چائے نکالتے ہوئے کہا پھر پہلو بدل کر پوچھا۔ ”آج ٹار بھائی آپ کے ساتھ واپس آیا دیر سے لوٹیں گے؟“

یا کاروباری سلسلے میں کسی سے ملنا تھا..... رات کے کھانے تک آ جائیں گے۔“ وقار احمد نے کچھ دیر خاموش رہے پھر چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے بولے۔ ”میرا خیال ہے کہ بھائی کی نیروبی واپس جانے کے لئے پرتول رہے ہیں۔“

سے کوئی ذکر کیا تھا.....؟“

..... لیکن آج دفتر میں انہوں نے دو ایک ضروری فون کئے تھے، مجھے اُن کی گفتگو سے یہی

یہ وہ جلدی واپس جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔“

یہ بہن بھی دبی زبان میں واپسی کا خیال ظاہر کر چکی ہیں۔“ شائلہ بیگم نے کہا۔ ”نیروبی میں

کی معاملہ ایسا درپیش ہے جس کی خاطر ٹار بھائی کی وہاں موجودگی اشد ضروری ہے۔“

مالی صاحب نے تو مجھ سے ایسی کسی بات کا بالکل ذکر نہیں کیا.....“

اے کی مصلحت کی بنا پر انہوں نے مناسب نہ سمجھا ہو۔“

شاکی شروع ہی سے پسند تھی۔“

”لیکن میری زندگی میں ایسا نہیں ہو سکتا.....“ فوزیہ خاتون نے ہونٹ کاٹتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

”میں اس فیصلے کو آپ کی بے جا ضد کہوں گا.....“ ٹار احمد نے خلا میں گھورتے ہوئے جواب دیا۔

”ہو سکتا ہے کہ کبھی خود آپ کو بھی اس فیصلے پر چھٹنا پڑے.....“

”احمد کو حالات کی اصلیت کا علم نہیں ہے۔“ فوزیہ خاتون بولیں۔ ”اُسے نہیں معلوم کہ جسے وہ اپنے خوابوں کی تعبیر سمجھ رہا ہے وہ آسمان سے ٹوٹا ہوا ایسا ستارہ ہے جو دوبارہ اپنا مقام بھی نہیں حاصل کر سکتا۔“

”محبت کی شدتیں انسان کو دیوانہ بنا دیتی ہیں، لیکن..... آپ ان باتوں کو نہیں سمجھ سکیں گی۔“

”میرے پاس ان فضول باتوں کو سمجھنے کا وقت بھی نہیں ہے.....“

”ایسی صورت میں تو یہی مناسب ہو گا کہ ہم وقار سے کوئی بہانہ کر کے نیروبی واپس لوٹ چلیں۔“

ٹار احمد نے درد بھری آواز میں کہا، پھر کچھ سوچ کر بولے۔ ”کیا وقار کو علم ہے کہ آپ نے امر کارشہ نادیہ کے لئے دیا تھا؟“

”مجھے نہیں معلوم..... میں نے صرف شائلہ کے آگے دامن پھیلانے کی حماقت کی تھی۔“

”میرا خیال ہے کہ ابھی وقار کو حالات کا علم نہیں ہوا۔ ورنہ وہ مجھ سے ضرور ذکر کرتے۔“

”ممکن ہے شائلہ نے کسی خاص مصلحت کی بنا پر شوہر سے بھی رازداری مناسب سمجھی ہو.....“ فوزیہ

خاتون نے جلتے کئے لہجے میں جواب دیا۔ پھر بل کھاتی ہوئی اُنھیں اور لباس تبدیل کرنے کی غرض سے ڈریسنگ روم میں چلی گئیں۔

اور..... ٹار احمد آرام کرسی سے سرٹکا کر چھت کو گھورنے لگے..... ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اولاد کو خوشیوں کو برقرار رکھنے کی خاطر کسی مناسب حل کی تلاش میں ہیں.....!!

○○○

وقار احمد نے بیوی کو شاکی واپس گھر آنے کی خوشخبری سنائی تو شائلہ بیگم کی مسرتوں کا کوئی ٹھکانہ نہ

رہا..... آج اتفاق تھا جو وہ ہسپتال سے جلدی واپس لوٹ آئی تھیں اور آج ہی قدرت نے اُن کی دوا

مراد پوری کر دی۔ اُن کی آنکھوں میں اظہارِ تشکر کے طور پر شبنمی قطروں کی کمی آگئی تو وقار احمد نے کہا۔

”یہ کیا؟ میں نے آپ کو بیٹی کے صحت مند ہونے کی اطلاع دی اور آپ نے آنکھوں کو نمناک کر لیا۔“

یہ خوشی کے اُصول خزانے ہیں جو میرے دل کی گہرائیوں سے شاکی کے لئے اُٹھنے چلے آ رہے

ہیں۔“ شائلہ بیگم نے جلدی سے کہا۔ ”میں نے اسی دن کے لئے خدا سے رورو کر دعائیں کی تھیں۔ اگر

کا کرم ہے کہ اُس نے ہمارا بھرم رکھ لیا ورنہ.....“

”ورنہ کیا.....؟“

”میں آپا جان کو کیا منہ دکھاتی؟“ شائلہ بیگم نے زندگی بھر کی آواز میں کہا۔ ”یہ اور بات ہے کہ میں

نے شاکی کو ہمیشہ نادیہ، صائمہ اور فرحان سے بڑھ کر چاہا لیکن جاننے والے تو یہی کہتے ہیں کہ شاکی

خوشیوں کی خاطر کوئی قربانی نہ دے سکی۔“

”بیٹاری دکھ تو خدا کے ہاتھ ہے، اس میں بندہ بھلا کیا کر سکتا ہے؟“

”نہ سہی..... لیکن دنیا والوں کو بات بنانے کا موقع تو مل جاتا ہے۔“

”میں آج پروفیسر شیرازی سے بھی ملا تھا، اُن کا خیال ہے کہ بخار کی شدت نے ہماری شاکی کو ذہن

راحمہ کی سرسراہٹ ہوئی آواز اُبھری۔
 نا پسندیدگی کی کوئی وجہ بھی ضرور بتائی ہوگی فوزیہ خاتون نے۔“
 اقبال احمد کی آڑ لے رہی ہیں جو خدا جانے کہاں مر کھپ گیا ہے۔“ شائلہ بیگم نے جذباتی

جواب دیا۔
آپ نے انہیں یہ نہیں بتایا کہ ہم نے ثنا کو اپنی اولاد سے بڑھ کر چاہا ہے..... ثنا کے ساتھ
انہیں وقار احمد کا نام آتا ہے۔“
میرزا اول سے تمام باتوں کا علم ہے لیکن اپنی جھوٹی انا کی تسکین کی خاطر ابھی تک شجرے کو
گئے بیٹھی ہیں۔“

ٹاکو تمام باتوں کو علم ہو گیا ہے..... میرا مطلب ہے کہ کیا اُسے اقبال احمد.....“

یقین سے نہیں کہہ سکتی۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اُس نے ہماری کچھ باتوں کو سن ضرور لیا ہے۔“

نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ”میں نے ٹاکو کو ماں پر کر پالا ہے، پروان چڑھایا ہے، میں دیکھ رہی ہوں کہ وہ بیمار پڑی ہے اُس دن سے اُس کے رویے میں بھی تبدیلی آ گئی ہے، ہر وقت موٹا اور کھنچا کھنچا رہتی ہے..... خدا جانے اُس غریب کے دل پر کیا بیت رہی ہو گی؟ میں تو ہی اندر ہی اندر کڑھتی رہی ہوں کہ اگر اُسے اپنی بدبختی کا سراغ مل گیا تو اُس کی ذہنی کیفیت..... کہاں سے گامیری ٹاکو کے مستقبل کا.....؟“

پہریشان نہ ہوں..... خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ وقار احمد نے بیبی کو بسورتے دیکھ کر کہا۔ ”ہماری مثالوں میں کیا کروڑوں میں ایک ہے، مجھے قوی اُمید ہے کہ اُس کا مستقبل روشن ہوگا۔“

آپ کی زبان مبارک کرے لیکن..... اگر میری شا کو کچھ ہو گیا تو میں جیتے جی مر جاؤں گی۔“
 ملے سے کام لیں..... اگر آپ نے ہمت ہار دی تو دوسروں کو بھی بننے کا موقع مل جائے گا۔“
 لہٰذا پھر دہلی زبان میں پوچھا۔ ”کیا شاہنہ بہن کو بھی حالات کا علم ہو گیا ہے؟“

.....
آپ کو ان باتوں کا ذکر ان سے نہیں کرنا چاہئے تھا۔“

مانے بھی سوچا تھا لیکن ثنا کی بیماری نے میرے ہاتھ پیر بھی پھلا دیئے تھے، ثنا کے ہسپتال
 اہونے کی خبر تو آیا جان سے پوشیدہ نہیں رکھی جا سکتی تھی۔“
 جو کچھ ہوا اُسے بھول جائیے..... خدا جو کچھ کرتا ہے اس میں انسان کی بھلائی کا کوئی نہ
 فرد مضر ہوتا ہے۔“

ہاں سب کچھ اپنی ذات پر برداشت کرنے کی کوشش کی تھی۔“ شامکہ بیگم نے کہا۔ ”اسی لئے مجھے ذکر نہیں کیا کہ بلاوجہ جسکے بھائیوں کے درمیان کوئی بد مزگی نہ پیدا ہوئے پائے۔ لیکن آخر ناموش رہا جاسکتا تھا؟“

بھائی! اور بھابھ! سے زیادہ اپنی شاعری ہے۔“ وقار احمد بولے۔ ”موجودہ حالات میں ان لوگوں سے چلا جانا ہی بہتر ہوگا، حالات کی نوعیت کا علم ہو جانے کے بعد اب میں کسی کو روکنے کی حماقت نہ لگاؤں گا۔ شاکر خوش رکھنے اور خوش دیکھنے کے لئے میں بڑی سے بڑی قربانی پیش کر سکتا ہوں۔“

راؤ مشہور یہ ہے کہ آپ انجان بنے رہے..... جیسے آپ کو کسی بات کا سرے سے کوئی علم ہی

”کاروبار میں اُدھ بچ اور نفع نقصان تو ہوتا رہتا ہے، اس میں ایسی پریشانی کی کیا بات ہے؟ ہم بھائی صاحب سے خود بات کروں گا۔“ وقار احمد نے کہا۔ ”ابھی تو وہ آئے ہیں..... انہی جلد ہی کہہ جاسکتے ہیں؟“

”ایک بات کہوں اگر آپ برانہ مانیں؟“
 ”فرمائیے.....!“
 ”میرا خیال ہے کہ آپ نثار بھائی اور فوزیہ بہن سے یہاں رکنے کے لئے زیادہ اصرار نہ کریں
 مناسب ہوگا۔“

”وہ کیوں.....؟“ وقار احمد نے بیوی کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔
 ”کچھ مجبوریاں ایسی ہوتی ہیں جو سب کو نہیں بتائی جاسکتیں۔“
 ”وی تو میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آخر ایسی کون سی مجبوری درپیش آگئی ہے کہ کراچی میں بھلا صاحب کا قیام ناگزیر ہو گیا ہے؟“ وقار احمد نے بیوی کو بخور دیکھتے ہوئے کہا پھر دبی زبان میں بولا۔
 ”ابھی تو احمد اور شا کے رشتے کی بات بھی ہوتا ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ ثنا کی بیماری کے پیش نظر فی الحال ایسی کوئی بات نہ چھیڑی جائے تو اچھا ہے۔“ کیا فرما رہی ہیں آپ..... کیا ثنا کو اس رشتے سے کوئی خوشی نہ ہوگی؟“ وقار احمد بولے۔ ”اُمّ“ حالت دیکھی ہے آپ نے، ثنا کی بیماری کا جتنا اثر اُس نے قبول کیا ہے اتنا شاید کسی اور نے نہ ہو..... کیا جھک کر رہ گیا ہے، میں تو کہتا ہوں کہ یہ معاملہ جتنی جلدی طے ہو جائے.....“

”میں آپ سے شاکی خاطر درخواست کرتی ہوں کہ دہلی چنگاریوں کو نہ کریدیں تو بہتر ہوگا۔ شامکہ بیگم نے ہاتھ ملتے ہوئے اُبھے لہجے میں کہا تو قاترا احمد کے چہرے کا رنگ بدل گیا، بیوی۔ چہرے کے بدلتے تاثرات کو محسوس کر کے بڑی سنجیدگی سے بولے۔

”کیا بھابھی صاحبہ اور آپ کے درمیان اس موضوع پر کوئی گفتگو ہو چکی ہے؟“

”ہاں.....“ شائلہ بیگم نے آہستہ سے جواب دیا۔ ”فوزیہ بہن نے احمر کے لئے نادیہ کا رشتہ مانگا تو ”کسا مطلب.....؟“ وقار احمد جو تک اٹھے۔ ”نادیہ کا رشتہ منظور ہو چکا ہے۔ میں نے“

صاحب کے آتے ہی انہیں یہ بات بتادی تھی۔
 ”ہو سکتا ہے غار بھائی نے اس کا ذکر فوزیہ بہن سے نہ کیا ہو.....“

”نہ سہی..... لیکن یہ بات تو سب ہی جانتے ہیں کہ احمد اور ثنا ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں خود بھائی صاحب نے بھی اشاروں کنایوں میں احمد کے لئے ثنا کی پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔“

”نثار بھائی کی بات اور ہے۔ لیکن فوزیہ بہن کو یہ رشتہ کسی قیمت پر منظور نہیں۔“

”نثار بھائی۔“

”مجھے تو اب اس بات کا یقین آ چلا ہے کہ ثنا نے تمام باتیں اپنے کان سے سن لی ہیں۔“

”نہ اندازہ کیسے لگا با آپ نے؟“

”بتیا کی حالت اُسی دن سے خراب ہے جس دن میرے اور فوزیہ بہن کے درمیان رستے لایا ہوئی تھی۔“

دوقار احمد نے کوئی جواب نہیں دیا، خاموشی سے کمرے میں بچھے دبیر قالین پر بیٹھنے لگے۔ ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک چار رہا تھا۔ تیور بتا رہے تھے کہ وہ بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پا رہا ہے۔ کوشش کر رہے ہیں۔ شام لکھ بیگم چپ چاپ بیٹھی شوہر کو دیکھتی رہیں، خواب گاہ میں مہل سکوت۔

نہیں ہے۔“

”اور اگر بھائی صاحب نے از خود اس کا ذکر چھیڑ دیا تو؟“

”اس وقت آپ کو اختیار ہو گا کہ پلٹ کر اپنی صفائی پیش کر سکیں۔“

”میں آپ کے مشورے پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا۔“ وقار احمد نے ایک طویل سانس بٹھوئے کہا۔ اسی وقت باہر سے نادیدہ نے ماں کو آواز دی تو شانکہ بیگم جلدی سے اٹھیں اور چہرہ در سر کرتی ہوئی باہر چلی گئیں۔

○○○

شا کے گھر آ جانے سے جیسے اُڑے چمن میں بہار آ گئی تھی، شانکہ بیگم نے اُس کے دلیر عبور کر کے صدقہ اور خیرات شروع کر دیا۔ وقار احمد نے غریبوں میں کھانا تقسیم کرایا، ثار احمد نے بھی ایک خطیر سببی پر سے بچھا کر کے ضرورت مندوں میں بانٹ دی۔ نادیدہ، صائمہ اور فرحان کے علاوہ گھر پرانے ملازم بھی بے حد خوش تھے۔ سب کی دیکھی دیکھی اور دنیا دکھاوے کے لئے فوزیہ خاتون نے کچھ رقم خیرات کر دی لیکن انہیں شا سے زیادہ احقر کی فکر لاحق تھی جنہوں نے شا کی بیماری کا بڑا کھراڑ تھا، انہیں احقر اور شا کے درمیان کسی قسم کی کوئی وابستگی پسند نہیں تھی، اگر اُن کے اختیار میں ہوتا تو وہ شاہ ہسپتال سے واپس آنے سے پیشتر ہی نیروبی روانہ ہو جاتیں۔ لیکن شوہر کے بے حد اصرار پر دو تین کے لئے رُکنا منظور کر لیا کہ وہ ایک دم سے کنارہ کش بھی نہیں ہونا چاہتی تھیں۔ انہیں اس بات کا خدا بھی لاحق تھا کہ جوان اولاد کہیں اُن کے جارحانہ سلوک کو دیکھ کر باغی نہ ہو جائے۔ یہی مصلحتیں تھیں انہوں نے دل پر جبر کر کے چند روز کے قیام پر آمادگی کا اظہار کر دیا تھا۔ اور اس وقت بھی احقر دوسروں کو دکھانے کی خاطر بحالت مجبوری ڈرائنگ روم میں گھر کے دیگر تمام افراد کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ نادیدہ نے جو بہن کے آنے سے پھولے نہیں سمار رہی تھی دل بھر کر شا کا لاڈ کیا، شا اُسے اپنے ہاتھ سے لباس تبدیل کرایا، زبردستی اُس کے چہرے پر ہلکا سامیک آپ کیا، اور اس وقت بھی بہن کے ساتھ لگی بیٹھی تھی۔ فرحان اور صائمہ بھی شا کے آس پاس منڈلا رہے تھے، ثار احمد کے علاوہ منصور، جمال اور شانہ بیگم بھی موجود تھیں۔ احقر ماں کے قریب بیٹھے کسی سوچ میں گم سم نظر آ رہے تھے، کبھی بھی تنکبہ سے شا کی طرف دیکھتے پھر اندر ہی اندر دل مسوس کر رہ جاتے۔

خود شا کی حالت بھی اُس معصوم پرندے سے مختلف نہیں تھی جس کی آزادی کو سلب کر کے خوبصورت تیلیوں کے پنجرے میں بند کر دیا گیا ہو۔ جب سے اُسے اپنے ماضی کے بارے میں ایک خاص حقیقت علم ہوا تھا اور فوزیہ خاتون نے بحیثیت بہو کے اُسے قبول کرنے سے انکار کیا تھا اُس کے وجود کے ایک لادو سا سلگ رہا تھا۔ بے بسی کے احساس نے اُسے مجبور کر رکھا دیا تھا۔ وہ سارے ہی ستون ایکا جھٹکے میں بل کھا کر کمزور ہو گئے جس پر وہ تکیہ کئے ہوئے تھی، جس کی بنیادوں پر اُس نے آرزوؤں ا تمنوں کے حسین محل تعمیر کئے تھے، ٹھوس مستقبل کے سہانے خوابوں کی داغ بیل رکھی تھی۔

اگر اُسے اپنی سیاہ جنتی اور وقت کے تقاضوں کا خیال نہ ہوتا تو شاید وہ صحن کے شدید احساس اپنے وجود کے اطراف حصار کے طور پر کبھی برداشت نہ کرتی، چیخ چیخ کر دنیا والوں سے پوچھتی۔ بتاؤ! میرا کیا قصور ہے۔ کیوں مجھے اس جرم کی پاداش میں سسکار کیا جا رہا ہے جس کا میری زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ مجھے ان ناکردہ گناہوں کی سزا کیوں دی جا رہی ہے جن کی میں ابجد سے ناواقف ہوں۔ کیا میرا قصور صرف اتنا ہے کہ میں نے ایک ایسے باپ کے نام سے دنیا میں آنے کو

فرے میں اچھی نظروں سے نہیں دیکھا گیا۔ لیکن باپ کے چہرے کی سیاہی میرے منہ پر لی جا رہی ہے۔ کیا صرف اس لئے کہ میں عورت ہوں، مردوں کے زور و کھڑے ہو کر اپنی کوئی دلیل نہیں پیش کر سکتی۔ محض اس لئے کہ میں ایک کمزور اور ناتواں لڑکی ہوں جسے رحم و کرم کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑ رہا ہے۔ اگر میں نے زبان کھولی تو مجھے یہودہ، بدکیز، اور بد زبان کے خوبصورت القاب سے نوازا جائے گا۔ مگر خدا را مجھے میرا قصور تو بتا دو۔ تم نے باپ سے اُس کی برائیوں کا حساب طلب نہیں کر سکتے تو پھر اس میں میرا کیا دوش۔ اگر مانے اپنا گھر بچانے کی خاطر، اپنی دنیا آباد کرنے کے لئے مجھے دوسروں کی جھولی میں ڈال دیا۔ زہد داری مجھ پر کیوں عائد کی جا رہی ہے؟ میں تو اُس وقت بھی تمہارے اختیار میں تھی۔ تم گدا بار مار کیوں نہیں ڈالا۔ کیا صرف اس لئے میری پردوش کی گئی، مجھے پال پوس کر پروان پاکر جب میں ذی ہوش ہو جاؤں، سرد و گرم کو سمجھنے لگوں تو تم مجھے میری حیثیت اور اوقات کا لاسکو؟ مجھ پر پچھڑا چھلانے کی کوشش کرو۔؟ مجھے اپنی نفرت اور حقارتوں کا نشانہ بنا سکو۔؟ ان کا انصاف ہے کہ تم نے پہلے مجھے پناہ دی اور اب میرا وجود تمہاری نگاہوں میں کانٹنے کی رہا ہے۔ تم نے مجھے قتل دی، شعور بخشا اور اب خود اپنی نظروں سے گرا رہے ہو۔ ذلیل و بے ہو۔ ایک بے سہارا کو اُس کی مجبوریوں کا احساس دلا رہے ہو۔ ایسا کیوں ہے۔ آخر کیوں۔۔۔۔۔؟؟؟

شانہ نے اپنی زبان کھولنے کی جسارت نہیں کی، اُس نے اپنے آپ کو اپنے وجود کے خول کے رلیا۔ اُس نے طے کر لیا تھا کہ بڑی خوبصورتی سے اس ماحول سے کنارہ کش ہو جائے گی جس آسمان کی بلندیوں تک لے جانے کے بعد زمین کی پستیوں کی جانب دھکیل دیا تھا، اُس کا لودہ اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کرے گی۔ اپنے وجود کی بقا کی خاطر۔۔۔۔۔ اپنے مستقبل کو کی خاطر۔۔۔۔۔ انسانیت کی خدمت کے لئے خود کو وقف کر دے گی۔ انسانیت۔! جس نے مٹی میں تلخیوں کا زہر گھول دیا تھا۔ اُس سے جینے کے سہارے چھین لئے تھے۔ اُسے۔۔۔۔۔ پتھاری۔۔۔۔۔ بے بسی اور بے کسی کا احساس دلایا تھا۔ اُس نے اُسی انسانیت کو سر بلند رکھنے باقیا۔۔۔۔۔!!

بات ہے بٹی۔۔۔۔۔ تم اس قدر چپ چپ اور خاموش کیوں ہو؟“ وقار احمد نے اُسے پیار سے باتوہ ایک لمحے کو چونک سی گئی، نظریں اٹھا کر وقار احمد کو دیکھا، جلدی سے مسکراتی ہوئی بولی۔

”آپ سب کی باتیں سن رہی ہوں۔“

میں مکان تو نہیں محسوس ہو رہی؟“ شانہ بیگم نے لاڈ سے دریافت کیا تو اُس کی نگاہوں کے

اٹک۔۔۔۔۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ شانہ نے اپنے قدموں کو زمین پر جھاتے ہوئے کہا۔ ناہاری باجی بہت پیاری لگ رہی ہیں۔“ صائمہ نے معصومیت سے کہا تو فرحان جلدی سے بولا۔

”ہم سویت۔۔۔۔۔ بالکل میری طرح، میں قریب جو بیٹھا ہوں بڑی آپا کے۔“

”صائمہ نے برا سامنہ بنایا۔“ کوئے کی کوچ میں انکور۔۔۔۔۔“

”اکی قدرت۔۔۔۔۔“ فرحان نے محاورہ پورا کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”اپنے اپنے نصیب کی

”مٹھے ٹاکی ہر خوشی منظور ہے۔“ وقار احمد نے شا کو محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”میں اس خیال کے حق میں ووٹ نہیں دے سکتا۔“ پروفیسر نے شامکہ بیگم کی بات رد کرتے ہوئے کہا۔ ”زندگی کا ایک سال بہت قیمتی ہوتا ہے اور خاص طور پر مریض کیل سٹوڈنٹ کے لئے ایک!

ہے، اس کے بعد جیسا ہوگا دیکھا جائے گا۔“
 بہتر نہیں ہے کہ اس وقت اس موضوع کو ٹال دیا جائے۔“ جمال احمد نے موقع کی نزاکت کو محسوس
 نہ ہوئے کہا۔ پھر فرحان کی طرف دیکھتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے بولے۔ ”کیوں فرحان میاں!
 کی بزرگانہ رائے کیا ہے؟“
 مسئلہ خاصا دقیق ہے اس لئے سوچ کر بتاؤں گا۔“ فرحان نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب
 دیا۔ ”صائمہ بول پڑی۔“
 ”یہ کیوں نہیں کہتے کہ احمر بھائی سے مشورہ لینے کے بعد اپنی قابلیت بگھارنے کی کوشش کرو گے؟“
 ”مشورے کا تعلق بھی چونکہ عقل اور ذہانت سے ہوتا ہے اس لئے آپ درمیان میں نہ بولیں تو
 مناسب ہوگا۔“

”اپنے منہ میاں مٹھو بننا اسی کو کہتے ہیں۔“ صائمہ تنک کر بولی۔
 ”تم دونوں ہر وقت لڑنے جھگڑنے سے باز نہیں آؤ گے۔“ شائلہ بیگم نے اکتائے ہوئے انداز
 میں کوسرزیش کی پھر نادیہ کو اشارے سے ہدایت کی کہ وہ شائلہ کو اُس کی خواب گاہ میں لے جائے۔
 ”اور نادیہ کے اٹھتے ہی شائلہ بیگم بھی اُٹھ کھڑی ہوئیں۔“



ماں نے اچانک واپسی کا اعلان کیا تو احمر سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ ایک طرف ماں کا پیار تھا جسے وہ
 بافت پر ٹھکرا نہیں سکتے تھے اور دوسری جانب اُس کی محبت بھی جسے وہ جان سے زیادہ عزیز رکھتے
 تھے۔ یہ بھی منظور نہ تھا کہ شائلہ کو بیماری کی حالت میں چھوڑ کر خاموشی سے واپس نہ دلی چلے جاتے۔
 جب سے ہسپتال میں شائلہ اور اُن کی گفتگو ہوئی تھی اُن کی اُجھن اور بڑھ گئی تھی، شائلہ کی باتوں سے
 ماں نے بھی اندازہ لگایا تھا کہ رشتے کے معاملے میں وہ بے تصور ہے۔ انکار شائلہ بیگم کی جانب سے
 ہوگا وہ شائلہ سے اس مسئلہ پر کھل کر گفتگو کرنے کے خواہشمند تھے، اُسے باور کرانا چاہتے تھے کہ جو کچھ
 اُس میں اُن کی وفاؤں پر کوئی حرف نہیں آتا۔ وقت اور حالات کی ستم ظریفیوں نے دونوں کے
 جان ایک حلق پیدا کر دی ہے۔

احمر کو شائلہ کا ہوشل میں جا کر رہنا بھی پسند نہیں تھا۔ ہر چند کہ تغیر حالات نے اُن کی محبت کا گلا
 شائلہ کی کوشش کی تھی لیکن اس کے باوجود انہیں شائلہ سے اب بھی اتنا ہی لگاؤ تھا جتنا پہلے تھا۔ یہ بات
 شائلہ کی کہ وہ فرسودہ خیالات اور دقیانوسی اصول پسند واقع ہوئے تھے، انہیں صرف اس بات کی فکر
 تھی کہ شائلہ کو ہسپتال سے آئے ابھی دو تین دن ہی ہوئے تھے۔ ڈاکٹروں نے اُسے آرام کا مشورہ
 دیا۔ ایسے میں گھر سے دور رہنا کسی طور مناسب نہیں تھا۔ زیادہ ٹکان اُس کے دل و دماغ پر بھی اثر
 کر سکتی تھی۔ ڈرائنگ روم میں جب نادیہ نے اُن کا خیال دریافت کیا اُس وقت وہ اپنے خیالوں
 کو سمجھنے لگی تھی۔ پھر قبل اس کے کہ وہ سوال کی نوعیت کو سمجھ کر کوئی جواب دیتے فوزیہ خاتون نے
 بیان میں ٹانگ اڑادی اور احمر کو دل پر جبر کر کے خاموش ہو جانا پڑا۔

اس وقت بھی جب ماں نے نیردلی واپس جانے کا ذکر کیگھٹ کیا تھا اُن سے فوری طور پر کوئی
 رد نہیں دیا گیا، اُن کی خواہش تھی کہ واپسی سے پہلے شائلہ سے تنہائی میں دو گھڑی بات کر لیتے، اُسے
 بلا زوال محبت کا یقین دلایا کہ یہ بتانے کے آرزو مند تھے کہ وہ اُن کی پہلی اور آخری محبت ہے جس
 سے وہ مرتے دم تک سبکدوش ہونے کو تیار نہیں ہو سکتے۔ وہ شائلہ بیگم سے بھی پوچھنا چاہتے

جائے۔ رہا ہوشل میں شائلہ کی دیکھ بھال اور پڑھائی کا معاملہ تو میں اس کی ذمہ داری بھی قبول کر
 تیار ہوں۔“ پروفیسر ہونے کے ناتے کچھ حق میرا بھی بنتا ہے۔“
 ”کیوں نہیں۔“ استاد تو بجائے باپ کے ہوتا ہے لیکن۔“
 ”نیک کاموں میں اگر مگر کا زیادہ دخل اکثر بنی بنائی بات خراب کر دیتا ہے۔“
 شائلہ بیگم کی بات ادھوری رہ گئی تو انہوں نے شوہر کی جانب دیکھا لیکن وقار احمد نے بھی اُن
 خاموش رہنے کی تلقین کر دی۔ پھر اس سے پیشتر کے وہ شائلہ کے ہوشل میں رہنے والی بات کے سلسلے
 کوئی بات کرتے پروفیسر شیرازی جانے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ جمال احمد اور وقار احمد کے
 دوسرے تمام افراد بھی پروفیسر کے احترام میں اُٹھ گئے۔

”تم اپنے امتحانات کے سلسلے میں مطلق کوئی فکر نہ کرنا۔“ پروفیسر شیرازی نے جاتے جاتے
 سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”پہلے میں صرف تمہارا پروفیسر اور معالج تھا لیکن اب بڑا
 بھی بن گیا ہوں۔ تمہارے مستقبل کی ذمہ داری بھی اب میرے فرائض میں شامل ہو گئی ہے۔“
 ”شکر یہ سر۔“ شائلہ نے بڑے ادب سے کہا پھر پروفیسر کو خدا حافظ کہنے کی خاطر دروازے تک ا
 کے ساتھ ساتھ گئی۔ پروفیسر شیرازی چلے گئے تو شائلہ نے کہا۔
 ”حصول تعلیم کے لئے تو چین تک جانے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ شائلہ
 بیماری سے ابھی ہے اس لئے پڑھائی کے ساتھ ساتھ صحت کا خیال رکھنا بھی اشد ضروری ہے۔“
 ”امی جان۔“ آپ اگر اجازت دیں تو میں بڑی آپا کے ساتھ چلا جاؤں؟“ فرحان نے مصوبہ
 سے اپنی خدمات پیش کیں۔

”بات پڑھائی کی ہے اس لئے تمہارا ساتھ جانا مناسب نہ ہوگا۔“ صائمہ بولی۔
 فرحان جواب میں کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن نادیہ بول پڑی۔ ”مجھے تو پروفیسر شیرازی کی بات سے
 فیصلہ اتفاق ہے۔“ آپا کے لئے پڑھائی کا مسئلہ تمام دوسری باتوں سے زیادہ اہم ہے۔“
 ”میرا مشورہ بھی یہی ہے کہ ایک قیمتی سال ضائع نہیں ہونا چاہئے۔“ منصور نے پہلی بار گفتگو میں حصہ
 ”آپ کا کیا خیال ہے؟“ نادیہ نے احمر کو دیکھتے ہوئے قدرے جھپٹے ہوئے انداز میں سوال کیا
 ”جی۔“ احمر نادیہ کے اچانک سوال پر ایک لمحے کو ششپا گئے، ایک نظر شائلہ پر ڈالی، کچھ کہنا چاہا۔
 تھے کہ فوزیہ خاتون نے جلدی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

”جب بزرگ موجود ہیں تو چوں کی رائے دریافت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟“
 ”آپ کا غیر جانبدارانہ مشورہ کیا ہے؟“ نادیہ نے فوزیہ خاتون سے پوچھا۔ اُس کے لہجے میں ہلکا سا
 بھی تھا جسے محسوس کر کے شائلہ بیگم اپنی جگہ کسمسا کر رہ گئیں، انہیں یہ بات منظور نہیں تھی کہ سب کی موجودگی
 میں کوئی ایسی ناخوشگوار بات ہو جس کا اثر شائلہ کی صحت پر ہو، شائلہ بیگم نے بھی نادیہ کو چونک کر دیکھا۔
 ”شائلہ ماں ہیں۔“ اور پھر وقار بھائی بھی خدارکھے موجود ہیں۔“ فوزیہ خاتون نے سنجیدگی
 کہا۔ ”ان دونوں کی جو مرضی ہو۔ ہماری رائے کو ماں باپ کے مقابلے میں کیا اہمیت ہوگی۔“
 ”یہ آپ کی سوچ ہے۔“ وقار احمد چپ نہ رہ سکے۔ ”ورنہ شائلہ آپ کو ہمیشہ بڑی اماں کہ
 مخاطب کیا ہے۔ رہا میرا سوال تو میں بھی بھائی صاحب کو باپ کی جگہ تصور کرتا ہوں۔“
 ”میرا مشورہ ہے کہ ہمیں اس معاملے میں اتنی غلبت سے کوئی آخری فیصلہ نہیں کرنا چاہئے۔“
 احمد نے بڑی خوبصورتی سے گفتگو کا رخ بدلنے کی خاطر کہا۔ ”ابھی تو شائلہ کو کچھ دنوں آرام کی

تھے کہ آخر ان سے ایسا کون سا جرم سرزد ہوا تھا جس کی پاداش میں انہیں جس دوام کی سزا سنائی گئی اگر انہیں اُس کا اور شا کا ساتھ منظور نہ تھا تو بہت پہلے ہی ان کے بڑھتے ہوئے قدم روک دیے گئے؟ اس قدر حوصلہ افزائی کیوں کی گئی کہ وہ شا کو اپنی زندگی کیجھ بیٹھے اور جب بات اُن اختیار سے باہر ہوئی تو اُن کے راستے میں رکاوٹیں کیوں پیدا کی جا رہی تھیں؟

”تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“ فوزیہ خاتون نے دریافت کیا تو احمر کے خیالات شیرازہ ٹوٹ کر بکھر گیا۔

”اتنی جلدی کیا ہے واپسی کی؟“ احمر نے دبی زبان میں کہا۔ ”اس بار تو آپ نے کراچی میں طویل قیام کا پروگرام بنایا تھا۔“

”ارادہ تو یہی تھا میرا۔۔۔۔۔۔ لیکن جب دوسروں کو ہماری خوشیاں منظور نہیں تو ہمارا یہاں رکنا بہ نامناسب ہے۔“

”برسوں کی رفاقتیں اتنی جلدی تو ختم نہیں نہیں ہوتیں۔ اور پھر آپ کے اور چچی جان کے درمیان تو۔۔۔۔۔۔ اسی اعتماد نے تو میرے یقین کو ٹھیس پہنچائی ہے۔“

”مجھے چچی جان پر بھی حیرت ہو رہی ہے۔“ احمر نے کہا۔ ”میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ۔۔۔۔۔۔“

”اب ان باتوں کو یاد کرنے سے کیا فائدہ۔۔۔۔۔۔ جو ہوتا تھا ہو چکا۔“ فوزیہ خاتون نے خشک آواز میں جواب دیا۔ ”تم اپنا سوٹ کیس اور ضروری سامان پیک کر لو۔۔۔۔۔۔“

”واپسی کب ہے؟“

”احمر۔۔۔۔۔۔“ فوزیہ خاتون نے بیٹے کی آواز کی نقاہت اور اس میں پوشیدہ درد کی کک کو محسوس کر۔ ہوئے ٹھوس لہجہ اختیار کیا۔ ”تم مرد ذات ہو، چھوٹی چھوٹی باتوں پر یوں افسردہ اور ملول ہونے لگے زندگی کی پڑ پڑ راہوں پر قدم جما کر آگے کس طرح بڑھو گے؟“

”زخم بھرنے میں کچھ وقت لگتا ہے امی جان۔۔۔۔۔۔“ احمر نے ماں کے سپاٹ لہجے کو نظر انداز کر۔ ہوئے بدستور افسردہ لہجے میں جواب دیا۔ ”آپ میری طرف سے پریشان نہ ہوں۔۔۔۔۔۔ میں خوشیوں کی خاطر آپ کا انا کو ٹھیس نہیں لکھنے دوں گا۔“

فوزیہ خاتون نے احمر کو تیز نظروں سے گھورا لیکن کچھ کہے بغیر تیز قدم اٹھاتی خواب گاہ میں چلی گئی۔ احمر کچھ دیر اپنی جگہ ساکت و جامد کھڑے کسی خیال میں کھوئے رہے پھر تھکے تھکے انداز میں لاؤنج سے گزر باہر جانے کے لئے راہداری میں گھومے تو نادیدہ سے مذہبیز ہو گئی، وہ گاڑی سے اتر کر گنگنائی ہوئی اندر داہوری تھی، احمر کو دیکھا تو گنگنائی ہوئی بولی۔ ”سنا ہے آپ لوگ نیرو دبی واپس جا رہے ہیں؟“

”مجھے ابھی ابھی امی جان سے اطلاع ملی ہے۔“

”یہ اچانک واپسی کا پروگرام کیسے بن گیا؟“ نادیدہ نے احمر کو کیریدتے ہوئے پوچھا۔ ”کوئی خاص بات؟“

”نیرو دبی میں والد صاحب کو ضروری کام درپیش آ گیا ہے۔“

”تو وہ اکیلے چلے جائیں۔۔۔۔۔۔ آپ سب کیوں جا رہے ہیں؟“ نادیدہ نے کہا، پھر معنی خیز لہجے بولی۔ ”کیا کراچی سے دل اکتا گیا ہے؟“

احمر نے نادیدہ کو شکایتی نظروں سے دیکھا لیکن بولے نہیں، خاموش ہو گئے۔

”غالباً آپ کو ابھی آپ لوگوں کے جانے کی اطلاع نہیں ملی ورنہ۔۔۔۔۔۔“ نادیدہ کے لہجے میں طنز اور اُس نے اپنے جملے کا اثر احمر کے چہرے پر محسوس کیا تو جلدی سے بات بدل کر بولی۔ ”میں آپ کو“

ے میں بتانا بھول ہی گئی۔۔۔۔۔۔ راحیل یاد ہیں نا آپ کو؟“

اور۔۔۔۔۔۔ وہ آپ کے کرٹل عابد انکل کی صاحبزادی؟“

بی، وی،۔۔۔۔۔۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ کو یاد آ گیا۔ میں تو سمجھتی تھی کہ آپ شاید اُسے بھی بھول گئے۔“

اپ نادرہ کے بارے میں کچھ بتانا چاہ رہی تھیں۔ احمر نے بڑے صبر سے کام لیا۔

”راہیل نے اپنی ماں کی مخالفت کے باوجود نادرہ سے شادی کی ٹھانی لی ہے۔۔۔۔۔۔ ہے نا تعجب کی بات؟“ نادیدہ نے چپھتے ہوئے انداز میں کہا۔ ”کیا راحیل سے یہ توقع کی جا سکتی اس حد تک آگے نکل جائیں گے۔۔۔۔۔۔ نادرہ سے اُن کی کچھ زیادہ پرانی شناسائی بھی نہیں تھی۔“

اپنی اپنی قسمت کی بات ہے۔۔۔۔۔۔ احمر نے مدہم آواز میں کہا۔ ”نادرہ کو میری طرف سے مبارکباد بٹے گا۔“

”یک بات پوچھوں احمر بھائی؟“

”جی۔۔۔۔۔۔“

”س بار آپ کچھ پریشان پریشان اور بدلے بدلے سے دکھائی دے رہے ہیں۔“

”ناہ۔۔۔۔۔۔“

”کوئی خاص وجہ؟“

”کیا شا کی اچانک بیماری میری پریشانی کی وجہ نہیں ہو سکتی؟“ احمر نے آہستہ سے جواب دیا۔

”مجھے آپ سے ایک شکایت بھی ہے۔۔۔۔۔۔“

”کیا؟“

”آپ کی دفعہ آپ ہمارے لئے کوئی تحفہ بھی نہیں لائے۔۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے کوئی ایسا تحفہ جسے یادگار کہیں۔“

”آپ کو یاد نہیں رہا شاید۔۔۔۔۔۔ میں نے آپ کو۔۔۔۔۔۔“

اصلی اور اصلی قسم کے ہیروں کے ٹاپس دیئے تھے۔“ نادیدہ نے جلدی سے کہا، پھر برا سامنے بنا کر ”آئی ایم سوری احمر بھائی! مجھے یاد نہیں رہا تھا۔۔۔۔۔۔ ہو سکتا ہے بات اس لئے ذہن سے اتر گئی ہو ماہیرے جواہرات کی قدر نہیں۔۔۔۔۔۔ آپ جوہری ہیں، آپ کو تو خوب پہچان ہوگی۔“

احمر نے سمجھ رہے تھے کہ نادیدہ کی باتوں کا مفہوم کیا ہے؟ انہیں حیرت تھی کہ اُن کے ساتھ اس قسم در نادرہ سلوک کیوں کیا جا رہا تھا؟ اُن کے دل کا سکون، ہونٹوں کی مسکراہٹیں اور جینے کا سہارا لینے کے بعد اُن پر الفاظ کے نشتر کیوں چلائے جا رہے تھے؟ نادیدہ نے تو ہمیشہ اُن کا احترام کیا لی محبت اور اپنائیت سے پیش آئی تھی، پھر آج وہ اس قسم کی دل آزار باتیں کیوں کر رہی تھی۔

”پتا تھا اُسے۔۔۔۔۔۔ کیوں اُس کی معصوم باتوں میں تینوں کے زہر کی آمیزش آگئی تھی؟“

”نیکس جا رہے تھے آپ؟“ نادیدہ نے احمر کی خاموشی کو بغور محسوس کرتے ہوئے کہا۔

”جی۔۔۔۔۔۔ بازار سے کچھ سامان لینا تھا۔“ احمر نے جھوٹ بولا۔

اور میں بلا وجہ آپ کے راستے میں حائل ہو گئی۔۔۔۔۔۔ آپ نے برا تو نہیں مانا۔۔۔۔۔۔؟“

”نادیدہ۔۔۔۔۔۔ احمر تو پ اٹھے۔“ پلیز! اتنی خشک باتیں نہ کریں۔“

”سوری۔۔۔۔۔۔“ نادیدہ نے تلخ نظروں سے احمر کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”اگر میری کسی بات سے آپ کو پائے تو میں۔۔۔۔۔۔“

آپ مر گئے تھے۔
 از جو شانہ بیگم نے اپنے دل کے نہاں خانوں میں چھپا رکھا تھا فوزیہ خاتون کی زبان پر آ گیا
 کی اسی بد نصیبی نے شانہ بیگم کی طرح اولاد کو بھی ڈس لیا۔ انہیں اس بات کا خوف بھی لاحق
 فوزیہ خاتون کے انکار کی وجہ دوسروں کے علم میں آگئی تو لوگ کیا سوچیں گے۔ شوہر کے دل
 رے کی، منصور کیا خیال کریں گے اور شانہ اگر کبھی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھ لیا کہ اس
 جان کو ماں کی گرم آغوش سے کیوں دور کیا گیا تو وہ کیا جواب دے گی؟ وہ بیماری کے بعد سے
 اپنے سے بھی نمایاں تبدیلی محسوس کر رہی تھیں۔ پہلے وہ شانہ بیگم سے مٹی تو انک کر خالہ جان کہہ
 کے گلے سے چٹ جاتی لیکن بیماری کے بعد سے وہ کچھ ابھی ابھی اور خاموش خاموش سی
 تھی۔ ہر وقت اپنے خیالوں میں گم سم، کوئی بات کرتا تو ہوں، یاں کہہ کر ٹال جاتی۔ صائمہ،
 انادہ بہت زیادہ پیار سے پیش آتے تو اس کی نگاہوں میں می آ جاتی۔ شکر بیگم سے بھی اس کی
 انداز اجنبیوں جیسا ہو گیا تھا۔ یوں جیسے وہ اندر ہی اندر گھٹ رہی ہو، کیلی لکڑی کی مانند سگ

نہ بیگم کو اس بات کا زیادہ ملال نہیں تھا کہ فوزیہ خاتون نے اُن کے ماضی کے بند درپچوں کو
 کی کوشش کی تھی، بیٹی کی خوشیوں کی خاطر وہ اپنی زندگی کی تمام خوشیاں۔ ساری سرسبزیاں داؤ پر
 میں، ہر غم کو گلے لگانے کو تیار ہو سکتی تھیں، ہر زہر کو ہنس کر اسنے وجود کی گہرائیوں میں
 کی ہمت رکھتی تھیں۔ انہیں فکر اس بات کی تھی کہ شاہ کے ہونٹوں کی ہسکرا انہیں چھن گئی تھیں۔
 کے سینے کی دھڑکنوں میں ڈوب کر اصل وجہ جاننے کی خواہشمند تھیں۔

ما کی آوازی کا سبب کیا تھا؟ کیا وہ امر کی جدائی کے خیال سے دل گرفتہ ہو گئی تھی؟ اُسے
 ماجہ سے پڑھائی کے متاثر ہونے کا خیال سنا رہا تھا؟ یا۔۔۔۔۔۔ ماں کی سیہ سختی کا راز پالینے
 وہ اپنی بے ثباتی پر دم بخود رہ گئی تھی!!
 نادیر سے وہ شاہ کے قریب بیٹھی انہی خیالوں میں گم تھیں جب منصور کمرے میں داخل ہوئے، شاہ
 بن بند کئے دیکھ کر وہ بھی یہی سمجھے کہ سو رہی ہے۔ لہذا بے قدموں شانہ بیگم کے قریب آ کر
 "مما! آپ کچھ دیر آرام کر لیں۔ شاہ کے پاس میں بیٹھ جاتا ہوں۔"
 نہارے ڈیڑی ساتھ نہیں آئے؟

وہ مجھے ڈراپ کر کے گھر چلے گئے، رات کو آنے کا کہہ گئے ہیں۔
 تم جا کر منہ ہاتھ دھو لو۔ میں ابھی آ کر تمہیں ناشتہ دیتی ہوں۔
 آپ میری فکر نہ کریں۔ میں ڈیڑی کے ساتھ ہی زبردست ناشتہ کر کے آ رہا ہوں۔ منصور
 ہر شاہ کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے ماں سے پوچھا۔ "اب طبیعت کیسی ہے؟"
 خدا کا شکر ہے۔۔۔۔۔۔

لما۔۔۔۔۔۔ منصور نے ماں کے قریب بیٹھتے ہوئے مدھم آواز میں کہا۔ "کیا آپ بھی اس بات سے
 پا کہ شاہ ہوسٹل میں رہ کر پڑھائی جاری رکھیں؟"
 نہارا کیا مشورہ ہے؟

ہر اتو یہ خیال ہے کہ زندگی سب سے بڑی نعمت ہے۔ صحت برقرار ہے تو سب کچھ ہے ورنہ
 انہیں۔۔۔۔۔۔

"میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں، مجھے اور پریشان نہ کریں۔" امر کے لہجے میں التجائی۔
 "کیا میں آپ کی پریشانی کی وجہ دریافت کرنے کی جرات کر سکتی ہوں؟"
 "کیا کریں گی پوچھ کر۔۔۔۔۔۔" امر ہونٹ چبانے لگے، دھمی لہجے میں بولے۔ "کچھ دکھ ایسے ہو
 ہیں جنہیں دل کی گہرائیوں میں چھپا کر اُن کی پریشانی میں لطف آتا ہے۔"
 "معافی چاہتی ہوں۔۔۔۔۔۔ مجھے افسانوی باتوں سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔" نادیر نے شانہ ا
 کر بے پروائی سے جواب دیا۔

"خدا نہ کرے کہ کبھی ایسا ہو۔۔۔۔۔۔" امر نے سرد آہ بھر کر کہا۔ "حقیقت جب افسانے کا رنگ اختیار
 لے تو سانس بھی دھبہ ہو جاتا ہے لیکن آپ ان باتوں کو نہیں سمجھ سکیں گی۔"
 "میں اس قسم کی باتوں کو سمجھنا بھی وقت کی بربادی تصور کرتی ہوں۔" نادیر بھڑکی۔ "مجھے ا
 لوگوں سے بھی شدید نفرت ہے جو حقیقت کو افسانے کا رنگ دے کر اپنی بے بسی کا رونا روتے ہیں۔
 جب شانہ ناتواں اور کمزور ہوں تو بوجھ اٹھانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"آپ۔۔۔۔۔۔ کیا کہنا چاہ رہی ہیں؟" امر نے اُسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔
 "ارے۔۔۔۔۔۔ آپ تو سنجیدہ ہو گئے۔۔۔۔۔۔" وہ امر کو اُلٹھا دیکھ کر مسکرا دی۔ "میں آپ کو نہیں،
 والوں کے بارے میں کہہ رہی تھی۔۔۔۔۔۔ آپ کا شمار تو خاص قسم کے بہت اہم لوگوں میں ہوتا ہے۔"
 "منصور کو جانتی ہیں آپ۔۔۔۔۔۔؟" امر نے تملاکر ہاتھ ملتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، آں۔۔۔۔۔۔" وہ بے پروائی سے بولی۔ "نام کچھ سنا سنا لگ رہا ہے۔"
 "اگر یہ نام بھی آپ کے ذہن سے زبردستی کھرج کر علیحدہ کر دیا جائے تو کیا محسوس کریں گی آپ؟
 "اس کا فیصلہ تو وقت آنے پر کیا جاسکتا ہے۔" وہ یکتا سنجیدہ ہو گئی، اُس نے امر کو تیز نظروں
 گھورا، اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ امر نے منصور کی مثال کیوں دی ہے؟
 "اور اگر وقت سے پہلے آپ کی طاقت گفتار چھین کر آپ کو حالات کی صلیب پر لٹکا دیا جا۔
 آپ پر کیا گزرے گی؟"

"وہ بھی نہ گزرے گی جو آپ کی پرگز رہی ہے۔۔۔۔۔۔ اس لئے کہ میرا نام شانہ نہیں۔۔۔۔۔۔ نادیر ہے۔"
 نے بڑی حقارت سے جواب دیا پھر تیزی سے پلٹی اور تیز تیز قدم اٹھائی اندر آ گئی۔ شاہ کی بیماری کا ڈ
 نہ ہوتا تو جی بھر کر دل کی بھڑاس کٹائی لیکن اُس نے ایسا نہیں کیا۔ اُسے امر کی اداکاری پر شدید غ
 رہا تھا۔ کس قدر معصوم بنے اپنی پریشانی کا اظہار کر رہے تھے۔ کسی کی زندگی اجرن کر دینے
 بعد بھی ابھی تک ڈھیٹ بنے اُس کی دہلیز پر نکلے ہوئے تھے۔ یوں انجان بن رہے تھے جیسے
 جانتے ہی نہ ہوں۔ ہونہ۔۔۔۔۔۔ مکار۔۔۔۔۔۔! فریبی۔۔۔۔۔۔!! دعا باز۔۔۔۔۔۔!!

شاہ کے کمرے تک وہ صرف امر کے بارے میں اُلجھتی رہی، پھر جب بہن کے کمرے میں دا
 ہوئی تو اُس کے ہونٹوں پر زندگی سے بھرپور مسکراہٹ رکھی کر رہی تھی۔ اور دوسری جانب
 راہداری میں کھڑے ابھی تک نادیر کی باتوں کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔!!



شاہ کی بیماری نے شانہ بیگم کے ماضی کے تمام زخم ہرے کر دیئے تھے۔ یکے بعد دیگرے جو حالا
 زونہا ہوئے تھے اُس نے اُن کے ذہن کو بری طرح اُلجھا دیا تھا۔ انہوں نے اولاد کی خاطر جو قربا
 دی تھیں وہ ساری اکارت ہو گئی تھیں۔۔۔۔۔۔ جو خواب دیکھے تھے وہ شرمندہ تعبیر ہونے سے پہلے ہی گھا

”جی.....؟“ منصور نے چوتکتے ہوئے کہا۔ ”یہ لیٹے لیٹے آپ کو اچانک میرے گھر بسانے کا خیال آگیا.....؟“

”اس لئے کہ میں تمہیں اور نادیا کو ایک ساتھ دیکھنا چاہتی ہوں۔“ اُس نے بڑے خلوص سے کہا۔

”اے میری خواہش سمجھ لو!“

”لیکن مہی کے گلے میں کھنٹی کون باندھے گا؟..... میرا مطلب ہے کہ ماما اور ڈیڈی سے یہ بات کہے گا؟“

”تم اپنی ماما سے بات کرو.....“

”یہ نیک کام آپ کیوں نہیں انجام دیتیں..... میری ماما سے آخر آپ کا بھی تو کوئی رشتہ ہوتا ہے۔“

”اسی رشتے کی نوعیت کی وجہ سے تو میں نہیں چاہتی کہ میرا نام درمیان میں آئے۔“ شا کے لہجے پر تھا، ایک لمحے کو وہ اپنے درد کی ٹیس سے ٹپ اٹھی، پھر جلدی سے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر کر ”تمہیں یہ مشورہ دینے میں میری بھی ایک غرض وابستہ ہے۔“

”وہ کیا.....؟“

”میں شادی کے بکھڑوں میں نہیں پڑنا چاہتی۔“ اُس نے ایک خوبصورت سا بہانہ تراشا۔ ”تم خود ابھی مجھے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرنا ہے، اس کے بعد باؤس جاب کے امتحان سے گزرتا ہے، پھر بچوں پر کھڑا ہونے کے لئے ملازمت کی تلاش کرنی ہوگی۔ کیا تم اتنے عرصے انتظار کر سکو گے؟“

”لیکن پہلا نمبر تو آپ کا ہے.....“ منصور نے کہا۔ ”جب تک آپ کا مسئلہ حل نہیں ہو جاتا میری آگے کس طرح چل سکتی ہے؟“

”یہ دق انوی باتیں ہیں.....“ وہ سرد لہجے میں بولی۔ ”تم اور نادیا ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو، رہی کھنٹی بھی ہو چکی ہے..... پھر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ صرف میری وجہ سے تمہاری خوشیاں رہی رہ جائیں؟“ منصور نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا، خاموش بیٹھے شا کو خالی خالی نظروں دیکھتے رہے۔ ”کیا سوچ رہے ہو.....؟“

”آپ کے مشورے پر سنجیدگی سے غور کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔“

”نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہئے۔“ اُس نے منصور کو اُکسانے کی خاطر زبردستی مسکراتے ہوئے بانڈاز اختیار کیا۔ ”تم نادیا کے دماغ سے بھی واقف ہو..... ایک بات پر زیادہ عرصے قائم رہنا اُس اصول کے خلاف ہے.....“

”یہ تو واقعی خطرے کی بات ہے.....“ منصور نے مصنوعی پریشانی کا اظہار کیا۔ ”ایسی صورت میں لانا خطرے کو دعوت دینے کے مترادف ہوگا۔ لیکن ایک مرحلہ باقی رہ جاتا ہے۔“

”کیا.....؟“

”مختصر یہ میرے سلسلے میں ہامی بھرنے سے پیشتر یہ شرط لگائی تھی کہ وہ بھی تعلیم مکمل کرنے کے لئے تیار ہو۔“

”تم اس کی فکر نہ کرو!“ شا نے جلدی سے کہا۔ ”اول تو اس کی تعلیم مکمل ہونے میں زیادہ عرصہ باقی رہا ہے اور اگر ضرورت پڑی تو میں اُسے منالوں گی، مجھے یقین ہے کہ وہ میری بات نہیں ٹالے گی۔“

”ٹھیک ہے.....“ منصور سسکی صورت بنا کر بولے۔ ”آپ کے بے حد اصرار پر میں پہلی فرصت کوئی مناسب موقع دیکھ کر ماما کو اپنے حق میں ہموار کرنے کی کوشش کروں گا۔“

”میں بھی یہی سوچ رہی تھی لیکن تمہارے ڈیڈی نے پروفیسر شیرازی کے مشورے کی تائید کر لی۔“

”آپ ڈیڈی کو سمجھائیے نا.....“

”کوشش کروں گی.....“ شا نے بیگم نے پُر خیال انداز میں جواب دیا۔

”کون..... منصور؟“ شا کی آواز ابھری تو شا نے بیگم اور منصور دونوں اُس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”کب آئے تم.....؟“ شا نے منصور کو دیکھتے ہوئے بڑی اپنائیت سے پوچھا۔

”بہت دیر سے آپ کے جاگنے کے انتظار میں سوکھ رہا ہوں۔ لیکن آپ کو کیا..... آپ تو سو اتنی مگن ہیں کہ.....“

”کیوں غلط بیانی سے کام لے رہے ہو.....؟“ شا نے بیگم بولیں۔ ”ابھی تمہیں آئے دس منٹ نہیں ہوئے۔“

”نادیا کہاں ہے.....؟“

”ملا کی دوڑ مسجد تک.....“ منصور نے کہا۔ ”سوائے نادیا کے اور کہاں ہو سکتی ہیں؟“

”اچھا..... تم شا کے پاس بیٹھو، میں تمہارے لئے چائے لاتی ہوں۔“ شا نے بیگم نے اُٹھتے ہو پھر شا کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولیں۔ ”تمہارا جی اب کیسا ہے؟“

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ شا نے نظریں جھکا کر جواب دیا پھر اُٹھ کر بیٹھنے لگی تو شا نے بیگم نے ”لیٹی رہو بیٹی..... ڈاکٹر نے تمہیں آرام کی تاکید کی ہے۔“

شا نے کوئی جواب نہیں دیا، شا نے بیگم کمرے سے چلی گئی تو منصور سے بولی۔

”تمہارے کاروبار کا کیا حال ہے؟“

”خدا کا شکر اور آپ کی دعائیں شامل ہیں..... سب ٹھیک ٹھاک ہے۔“

”دفتر سے آنے کے بعد تمہاری کیا مصروفیات رہتی ہیں؟“

”خیریت..... آپ آج میرے بارے میں بڑی متفکر نظر آ رہی ہیں۔“ منصور نے مسکرا کر کہا۔

”کیوں..... تمہیں کوئی اعتراض ہے؟“

”اعتراض تو نہیں البتہ شکوہ ضرور ہے۔“

”شکوہ..... کس بات کا؟“

”یہی کہ اس وقت کس قدر اپنائیت سے مجھ سے بات کر رہی ہیں۔ لیکن ابھی کوئی اور آئے آپ فوراً اُس کی طرف داری شروع کر دیں گی۔“

”واہ..... میں سمجھی تھی کہ کوئی اور بات ہوگی.....“ شا کے ہونٹ ایک دل آویز مسکراہٹ کے جاگ اُٹھے، کچھ سوچ کر بولی۔ ”ایک بات کہوں..... مانو گے؟“

”میں نے پہلے آپ کی کوئی بات مانی ہے جو آپ کو باقاعدہ اجازت کی ضرورت محسوس ہو رہی۔“

”پہلے وعدہ کرو کہ تم اس کا ذکر کسی اور سے نہیں کرو گے۔“

”جی اور سے آپ کا اشارہ کس کی طرف ہے؟“ منصور نے شوخی سے سوال کیا۔

”میرا مقصد ہے کہ جو بات میں تم سے کہنا چاہ رہی ہوں اس کی تحریک تمہاری جانب سے“

”میرا نام کہیں درمیان میں نہ آنے پائے۔“

”معاملہ کیا ہے.....؟“

”تم اپنا گھر بساؤ الو.....“ شا بڑی سنجیدگی سے بولی۔

”لیکن اس شرط پر کہ میرا نام کہیں بھی درمیان میں نہ آنے پائے۔“
 ”منظور ہے..... لیکن ایک شرط میری بھی ہوگی۔“
 ”وہ کیا.....؟“

”میں آپ کی اہماء پر قدم بڑھا رہا ہوں..... اگر میری پیش رفت کی وجہ سے محترمہ کا پارہ چڑھ
 تو اسے اعتدال کی کیفیت میں واپس لانا آپ کی ذمہ داری ہوگی.....“
 ”ابھی سے نادیہ سے اس قدر ڈرتے ہو تو بعد میں تمہاری کیا حالت ہوگی؟“
 ”جب اوکھلی میں سردیا ہے تو دھماکے بھی برداشت کرنے ہوں گے۔“ منصور نے یہ جملہ کچھ ایڑ
 انداز میں کہا کہ شاہے اختیار ہنس دی، اسی وقت شبانہ بیگم کمرے میں داخل ہوئیں۔ شاہ کو ایک عریہ
 بعد ہنسنے دیکھ کر وہ خود بھی نہال ہو گئیں، بڑے لاڈ سے بولیں۔
 ”خدا کا شکر ہے کہ تمہارے چہرے پر ہنسی تو نظر آئی۔“
 ”یہ سب میری موجودگی کا کرشمہ ہے۔ ورنہ انہوں نے تو ہنسنے مسکرانے کی قسم کھا رکھی تھی۔“ منہ
 شانے اُچکاتے ہوئے بولے تو شبانہ بیگم نے شاہ سے پوچھا۔
 ”یہ تمہیں پریشان تو نہیں کر رہا تھا؟“
 ”جی نہیں.....“ شاہ نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔

”ملازم چائے کی ٹرائی اندر لئے داخل ہوا تو شبانہ بیگم منصور کے لئے چائے بنانے لگیں۔ منصور نے شاہ
 اشارے سے اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کی طرف متوجہ ہونے کو کہا پھر اٹھ کر ماں کے قریب آتے ہوئے بڑے
 لاڈ سے بولے۔ ”آپ کیوں زحمت کرتی ہیں ماما! لائیے، میں اپنے ہاتھ سے کپ تیار کئے لیتا ہوں۔“
 ”اور روز کوں تیار کرتا ہے؟“

”روز کی بات اور ہے لیکن آج.....“ منصور نے شبانہ بیگم کے شانوں پر بڑی محبت سے ہاتھ رکھ
 ہوئے اپنا جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔
 ”آج کیا ہوا.....؟“

”آج ہماری ماما بڑی خوبصورت لگ رہی ہیں..... بے حد سارٹ۔“
 ”کوئی خاص بات منوانی ہوگی جیسی یہ خوشامد ہو رہی ہے۔“ شبانہ بیگم نے چائے میں شکر ملا۔
 ہوئے شاہ سے کہا۔ ”سن رہی ہو تم اس کی چالپوسی کی باتیں.....؟“
 ”سن بھی رہی ہوں اور محسوس بھی کر رہی ہوں۔“ شاہ نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی، اُس نے
 لہجے میں حسرتوں کی ٹیس بھی شامل بھی، منصور کو اس طرح ماں کے شانوں پر پیار سے نکا دیکھ کر اُس نے
 اندر چھپی ہوئی ایک معصوم بچی کی آرزوئیں تڑپ اٹھیں..... کتنے خوبصورت اور کس قدر مسرت
 تھے وہ لمحے جس کے تصور سے بھی اُسے ہمیشہ محروم رکھا گیا تھا..... اور..... کیسا المناک تھا وہ منظر
 دیکھنے پر وہ مجبور تھی..... وہ ماں کے ہوتے ہوئے بھی اُس کی ممتا سے محروم تھی..... اُس کے پیار سے
 آشنا تھی۔ اور منصور کتنے خوش نصیب تھے کہ ماں کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے باوجود اُس کی شفقتاً
 سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

”آپ دیکھ رہی ہیں تاکہ ہماری ماما کس قدر گریت پرنائی کی مالک ہیں؟“ منصور نے شاہ سے کہا۔
 ”جی..... خدا آپ کے سر پر آپ کی ماما کا سایہ ہمیشہ سلامت رکھے۔“ اُس نے دل پر جبر کر۔
 منصور کو بڑے خلوص سے دعا دی۔

”کیا ہے جس کی خاطر اس قدر تعریفوں کے پل باندھے جا رہے ہیں؟“ شبانہ بیگم نے مسکرا
 کیا۔

”کچھ بھی نہیں..... اور بہت کچھ ہے..... لیکن فی الحال صرف ایک سوا ایک روپے کا سوال ہے۔“
 ”تو ہے..... کیا ایک سوا ایک روپے کسی کو سلائی میں دینے ہیں؟“
 ”کا بھی دستور ہے ماما..... آج سلائی ڈول گا تو کل خدا کے فضل سے وصول بھی کروں گا۔“
 ”بچوں کی طرح ضد کی۔“ ”شگون نیک ہو تو منزل آسان ہو جاتی ہے۔“

”ابھی تاہی بک رہے ہو..... میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔“
 ”پلیز.....“ منصور نے ماں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔ ”دیر نہ کریں ورنہ سارا کھیل
 بائے گا۔“

”بیم نے منصور کو غور سے دیکھا پھر قریب رکھے ہوئے پرس سے مطلوبہ رقم نکال کر اُس کے
 او منصور خوشی سے چیخ اٹھے..... وہ مارا..... بن گیا کام۔“
 اب آرام سے بیٹھ کر چائے پی لو.....“ شبانہ بیگم نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے پیار سے
 بڑا ہو گیا لیکن ابھی تک بچوں کی طرح شرارتیں کرتا ہے.....“
 ”ما آپ نے؟“ منصور نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے شاہ سے کہا۔ ”ہماری ماما ہمیں کس قدر ٹوٹ کر
 پی۔“

”اپنی خوش نصیب ہو منصور! کہ تمہاری ممتا کو اس قدر پیار کرتی ہیں۔“
 ”کے لہجے میں کوئی ایسی ہی بات تھی جس نے شبانہ بیگم کی متا کو تڑپا دیا، انہوں نے نظریں اٹھا
 طرف دیکھا تو کلیجہ دھک رہ گیا۔ اُس کی بھیگی پلکوں کے پیچھے محرومیوں کی نہ جانے کتنی
 ہل رہی تھیں..... شبانہ بیگم کے ہاتھ کپکپا گئے..... اگر انہوں نے پیالی کو سنبھال نہ لیا ہوتا تو
 ان سے ٹکرا کر پھینکا چور ہو جاتی۔

”آخری جملہ شبانہ بیگم کے وجود کی گہرائیوں میں صدائے بازگشت بن کر گونج رہا تھا.....!!



”بیماری پر کسی کا کیا اختیار چل سکتا ہے؟“
 ”انسان بننے بولنے کی کوشش کرے تو لاکھوں بہانے ہاتھ آجاتے ہیں لیکن آپ.....“
 ”تم چپ کیوں ہو گئیں.....؟“ ثنائے اُس کی خاموشی کو کریدنے کی کوشش کی۔ ”جو کچھ دل میں
 بہاؤا.....“
 ”آئی..... کیا یہ غلط ہے کہ آپ احمر بھائی کے جانے کی خبر سن کر اُداس ہو گئی ہیں؟“ نادیہ مجسم
 بن گئی۔

”کیا تمہیں افسوس نہیں ہوا.....؟“
 ”نہیں.....“ نادیہ نے غصے لہجے میں جواب دیا۔ ”اس بار مجھے ایک ذرہ برابر بھی افسوس نہیں ہو رہا۔“
 ”کیوں..... اس بار کوئی خاص بات ہو گئی ہے؟“ اُس نے ایک بار پھر نادیہ کے جملے کی گہرائی
 یا کرنے کی کوشش کی۔

”ممکن ہے اس کی وجہ آپ کی بیماری ہو۔“
 ”میری بیماری سے احمر کی ذات کا کیا تعلق؟“ اُس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔
 ”پھر آپ کی اُداسی کا سبب کیا ہے..... کیوں آپ نے اچانک اپنے وجود کے گرد خاموشی اور اُداسی
 ل چڑھا لیا ہے..... پہلے تو آپ ایسی نہیں تھیں..... کیا آپ کو کھٹن کا احساس نہیں ہوتا..... کیا یہ
 ہاں یونہی، بلا وجہ زور و زنا ہو رہی ہیں؟ کوئی نہ کوئی سبب تو ہوگا، کوئی بات تو ضرور ہوگی جس نے آپ
 دنوں سے مسکرائیں چھین لی ہیں۔“

”ہاگل ہو گئی ہو تم.....“ وہ دل پر جبر کر کے مسکراتے ہوئے بولی۔ ”میری خاموشی کا سبب مجر
 ن کے اور کیا ہو سکتا ہے؟“

”آئی.....“ نادیہ نے کچھ کہنا چاہا لیکن ماں کی دی ہوئی قسم کا خیال آیا تو جلدی سے اپنے ہونٹ
 لے، جذبات میں طغیانی آئی تو بے اختیار شائے لپٹ کر سکتے گئی۔

”ارے..... یہ کیا ہو رہا ہے تمہیں؟“ اُس نے بہن کو بھلانے کی کوشش کی۔ ”کچھ دنوں کی بات
 لزوری زور ہوئی تو پھر وہی پہلے والی شاہین جاؤں گی، ہر وقت تمہارے، فرحان اور صائمہ کے ساتھ
 ،، بولوں گی، مزے مزے کی باتیں کیا کروں گی..... چلو! اب جلدی سے آنسو پونچھ ڈالو۔ شاہاب!“
 نادیہ نے ماں کی قسم کی لاج رکھنے کی خاطر زبان بند رکھی، بہن کی دلجوئی کی خاطر دوپٹے کے پلو
 نسوخت کر کے مسکرانے لگی، پھر نادرہ کا فون آ گیا۔ وہ کسی ضروری بات کے سلسلے میں مشورہ
 نے کی غرض سے نادیہ کو اپنے ہاں آنے کو کہہ رہی تھی۔ نادیہ نے فون بند کرنے کے بعد شائے کو صورت
 سے آگاہ کیا، جلدی واپسی کا وعدہ کیا، لباس تبدیل کیا اور گنگنائی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔

ادیہ کے جانے کے بعد کچھ دیر تک وہ کھلے دروازے کی اُداس چوکھٹ کو حسرت بھری نظروں سے
 رہی، پھر آہستہ سے پلٹ کر ڈرینگ ٹیبل کے سامنے آئی۔ احمر کا خیال اندر ہی اندر اُسے مضطرب
 ہاتھا، وہ سوچ رہی تھی.....

کیا میں احمر کو آسانی سے بھلا سکوں گی.....؟ اُس کے خیال کو دل کی گہرائیوں سے کھرچ کر زور
 نے میں کہاں تک کامیاب ہوں گی..... وہ جسے میں نے اپنی زندگی کا مسافر سمجھ لیا تھا..... جس کا
 نام کر زندگی کی شاہراہوں پر زور تک نکل جانے کے خواب دکھتے تھے..... کیا اُس کے یوں بچھڑ
 سے زندگی میں کسی خلا کا احساس نہ ہوگا.....؟ کیا دل کی دھڑکنیں یونہی قسمت کی بد نصیبی کا ماتم

وہ ڈرینگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی اپنے اُلجھے بالوں کو سلکھانے میں مصروف تھی کہ اچانک شائے
 احمر کو دیکھ کر چونک سی گئی۔ جانے کیوں اُسے ایک لمحے کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا..... کچھ دیر
 حیرت بھری نظروں سے اُس کے عکس کو بغور سمجھتی رہی، پھر تیزی سے پلٹی تو اُس کے دل کی مو
 دھڑکنیں آپ ہی آپ تیز ہونے لگیں۔

احمر اپنے والدین کے ساتھ کل نیروبی واپس جا رہے تھے۔ یہ خبر اُسے نادیہ نے سنائی تھی۔ اُس
 بھی وہ ایک لمحے کو دم بخود رہ گئی، اُسے نادیہ کی بات کا یقین نہیں آیا تھا۔ شاید اس لئے کہ احمر کی
 سے بہت دور ہو جانے کے باوجود وہ ابھی تک روحانی طور پر خود کو اُس کے بہت قریب محسوس کر رہی
 اُس نے احمر کو ٹوٹ کر چاہا تھا..... دل کے نہاں خانوں میں چھپا کر اُس کی پرستش کی تھی.....
 اتنی جلدی اُسے کیسے فراموش کر سکتی تھی.....؟

”کیا بات ہے آئی.....؟“ نادیہ نے اُس کے چہرے کے بدلتے تاثرات کو محسوس کرتے ہو
 پوچھا۔ ”کیا سوچنے لگیں آپ؟“
 ”کچھ بھی نہیں.....“ اُس نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی تو اور مضحکہ خیز نظر آنے لگی۔

”ایک بات کہوں آئی.....؟“
 ”کہو.....“

”آپ اندر سے بہت کمزور ہو گئی ہیں۔“
 ”شاید.....“ اُس نے اپنے کھڑے خوابوں کو وجود کی گہرائیوں میں سمیٹتے ہوئے جواب دیا، کمر
 سے جانے کے ارادے سے اٹھی تو نادیہ لپک کر اُس کے راستے میں حائل ہو گئی، اُس کی آنکھوں
 ویرانیوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ ”آپ کو کسی کے جانے کا غم ہے.....؟“
 ”یہ اندازہ تم نے کیسے لگایا.....؟“ ثنائے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

”آپ کے چہرے کی اُداسی سے۔“
 ”تمہارا کیا خیال ہے..... کیا مجھے سب کے جانے کی خبر سن کر خوشی کا اظہار کرنا چاہئے تھا؟“
 ”پریشان ہونے سے بھی کیا فائدہ.....؟“

”تمہارے امتحان سر پر ہیں..... پڑھائی میں دل لگایا کرو!“ اُس نے نادیہ کو نالٹا چاہا۔
 ”مشکل ہے.....“
 ”کیوں.....؟“

”جب سے آپ بیمار پڑی ہیں میرا جی پڑھائی سے اُچاٹ ہو گیا ہے۔“ نادیہ نے بڑی اپنا
 سے کہا۔ ”ہر وقت آپ کے بارے میں سوچتی رہتی ہوں۔“
 ”میرے بارے میں.....؟“ شائے چونک اٹھی۔ ”میرے بارے میں کیا سوچتی ہو.....؟“
 ”کبھی آئینے میں غور سے شکل دیکھی ہے..... چہرے کی رنگت کیسی زرد پڑ گئی ہے۔“

کرتی رہیں گی.....؟ انہیں کبھی قرار ملے گا.....؟

ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی وہ یونہی اپنے خیال سے الجھ رہی تھی جب احمر کا عکس آئینے میں دکھائی دیا۔ وہ تڑپ سی اٹھی اور اب..... احمر کے سامنے کسی تراشیدہ بت کی مانند خاموش اور گم سم بیٹھی اُسے دیکھ رہی تھی۔ کچھ لمحے یوں ہی دبے قدموں خاموشی سے گزر گئے، پھر احمر کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی، ابا لرزنی کی لپکاتی آواز ثنا کے کانوں میں گونجی۔ ”کیا میں اندر آ سکتا ہوں.....؟“

”جی.....“ وہ تڑپ اٹھی احمر کے چہرے پر اُداساں رقص کر رہی تھیں، کیسے بچھے بچھے سے نظر رہے تھے۔ شاید انہیں بھی اپنی واپسی کا ملال تھا..... لیکن اُن کے لہجے میں اجنبیت کا احساس کیونکہ جھٹک رہا تھا؟ اُس نے احمر کو بہت غور سے دیکھا، ایک لمحے کو اُس کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ ہوئی..... اُس کا دل چاہا کہ احمر کو بتا دے کہ وہ تو خود اس دلہیز کے لئے اچانک غیر بن گئی ہے، دوسروں کو بھلا دیا اُنے کی کیا اجازت دے سکتی تھی..... لیکن ثنائے ضبط سے کام لیا، آہستہ سے بولیں ”آج آپ کو اجازت کی ضرورت کیوں درپیش آگئی..... پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا تھا؟“

احمر نے جواب میں کچھ نہیں کہا، چپ چاپ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے اندر آ گئے۔ تھوڑے وقف کے بعد رُک رُک کر بولے۔ ”میں..... میں کل جا رہا ہوں۔“

”مجھے نادیہ نے بتایا تھا.....“ ثنا اندر ہی اندر دل مسوس کر رہ گئی۔

”جانے سے پہلے..... میں آپ سے کچھ دریافت کرنا چاہتا ہوں۔“

”پوچھئے.....“

”آپ نے ہسپتال میں کہا تھا کہ ٹھنکن کا احساس شدید ہو جائے تو انسان اپنے آپ پر قابو نہیں پاسکتا۔“

”یاد ہے مجھے.....“

”آپ نے ایک وعدہ اور بھی کیا تھا.....“

”کیا.....؟“

”یہی کہ آپ مجھ پر اعتماد کریں گی۔“

”میں نے غلط نہیں کہا تھا۔“ وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔ ”مجھے آپ پر بھرپور اعتماد ہے..... پہلے مجھ اور..... آئندہ بھی رہے گا، لیکن.....“

”لیکن کیا.....؟“

”مجھے اپنے آپ پر اعتماد نہیں رہا۔“ وہ ہونٹ کانٹتے ہوئے بولی۔ ”شاید بیماری کی وجہ سے“

”اعتمادی پر میری گرفت کمزور پڑ گئی ہے۔“

”بیماری کی وجہ کیا تھی.....؟“ احمر نے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

”قوت مدافعت کی کمی.....“ ثنائے جھپٹے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”میرا خیال ہے کہ آپ جان بوجھ کر مجھ سے کوئی اہم بات چھپانے کی کوشش کر رہی ہیں۔“

”کیا ہو سکتی ہے وہ اہم بات.....؟“ ثنائے برجستہ سوال کیا تو احمر ایک لمحے کو شیشا کر رہ گئے

کچھ سوچ کر بولے۔

”آپ نے ہسپتال میں مجھے بلند یوں اور پست یوں کا طعنہ دیا تھا۔“

”غلط نہیں کہا تھا میں نے.....“

”ثنا.....“ احمر نے جذباتی انداز اختیار کیا۔ ”میری طرف غور سے دیکھئے..... میں احمر ہوں۔“

”میں جانتی ہوں.....“

”م نے ایک دوسرے کے ساتھ، اپنے مستقبل کے بارے میں کچھ فیصلے کئے تھے۔ یاد ہے آپ کو؟“

”نے کوئی جواب نہیں دیا، ایک نظر بھر کر احمر کو دیکھا پھر خلا میں گھورنے لگی۔“

”آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا.....“

”لیا جواب دوں..... یہی سوچ رہی ہوں۔“

”س حقیقت کو بے نقاب کر دیجئے جس نے ہمارے درمیان ایک خلیج پیدا کر دی ہے.....“

”حقیقت بڑی سچ ہوتی ہے..... اس پر پردہ پڑا ہے، اسی میں ہم سب کی بھلائی ہے۔“

”اجازت ہو تو میں اس حقیقت کا پردہ چاک کر دوں..... کوئی اعتراض تو نہ ہوگا آپ کو؟“

”نے جواب میں چونک کر احمر کو دیکھا، اُن کی آنکھوں میں کڑی دھوپ کی تپش چل رہی تھی۔“

”ی جان نے آپ کی والدہ کے سامنے جھولی پھیلا کر میری زندگی کی بھیک مانگی تھی لیکن.....“

”انکار کر دیا۔“ احمر نے ثنا کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو علم ہے ان باتوں کا؟“

”بت روحوں کی پاکیزگی کا نام ہے.....“ ثنائے سرد آہ بھر کر جواب دیا۔ ”ایسا جذبہ ہے جس کی ہادلوں کی گہرائیوں میں ہمیشہ پروان چڑھتی رہتی ہیں.....“

”میری بات کا جواب نہیں ہے۔“

”آپ کیا جاننا چاہتے ہیں.....؟“ اُس نے بڑی سادگی سے دریافت کیا۔

”میں جاننے کے انکار کی وجہ کیا تھی.....؟“ احمر کے سوال میں زندگی کی حسرتیں تڑپ رہی تھیں۔

”خبر.....“ وہ کچھ سوچ کر بولی۔ ”کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم صرف اچھے دوستوں کی طرح ایک کو یاد رکھیں..... مادی باتوں اور رشتوں کو ہمیشہ کے لئے فراموش کر دیں؟“

”میں جان میری بزرگ ہیں..... انہوں نے یقیناً کسی مصلحت کے پیش نظر اس رشتے کی نفی کی ہو“

”نا ایک بات میری سمجھ سے باہر ہے، اگر انہیں یہ رشتہ نامنظور تھا تو وہ اشاروں کنایوں میں مجھ کو ابھار کر مٹکتی تھیں۔“

”زرگوں کی مصلحتیں بھی بزرگ ہی بہتر سمجھ سکتے ہیں۔“ ثنائے دلی زبان میں کہا۔

”میں آپ کے خیال سے متفق ہوں مگر تناور درخت کو کاٹنا تو جاسکتا ہے..... جڑ سے اکھاڑنا بڑا“

”تا ہے۔“ ثنا خاموش کھڑی احمر کے درد کی شدت کا اندازہ کرتی رہی..... ”ثنا..... میں جھوٹی“

”کے سہارے ہی تقدیر کے لکھے کوسہ لوں گا..... آپ صرف مجھے اتنا بتادیں! کہ چچی جان کے“

”آپ کی رائے تو شامل نہیں تھی.....؟“ احمر نے ہاتھ ملتے ہوئے مضطرب انداز میں پوچھا۔

”آپ کا دل کیا کہتا ہے؟“

”مجھے اپنے دل پر اختیار ہوتا تو آپ سے کیوں دریافت کرتا؟“

”یہ مجھ پر بھی اعتماد نہیں رہا.....؟“ ثنا کے سوال میں شکوکے کی چھین بھی شامل تھی۔

”میں انسو کی رفتار سے اعتماد اٹھ جائے تو رُوح اور جسم کا تعلق بھی ختم ہو جاتا ہے۔“ احمر نے تڑپ“

”آپ کی طرح مجھے بھی اپنی محبت پر اعتماد تھا لیکن چچی جان.....“

”.....“ اُس نے جلدی سے احمر کی بات کانٹتے ہوئے کہا۔ ”آپ بار بار ہمیں مورد الزام کیوں“

”ہے ہیں؟“

”آپ کو میری بات ناگوار گزری ہے تو میں معافی کا خواستگار ہوں۔“ احمر نے دکھی انداز میں

”جی.....“ اُس نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔
 ”آپ مجھ سے خفا تو نہیں ہیں؟...؟“
 ”یہ کیسے سوچ لیا آپ نے؟...؟“
 ”ہسپتال میں آپ نے مجھ سے بڑی تلخ باتیں کی تھیں۔“
 ”معاف کر دیجئے احمد.....“ وہ آہستہ سے بولی۔ ”اُس وقت میں ہوش میں نہیں تھی۔“

اُسی رکھ لیا جائے۔“ جمال احمد نے بیوی کی بات کانٹے ہوئے کہا۔ ”یہی فرمانا چاہتی تھیں آپ؟“
 برا فرمانا کچھ غلط بھی نہیں ہے۔“ شبانہ بیگم شوہر کے ساتھ ساتھ خواب گاہ کی جانب قدم اٹھاتی
 ل۔“ ایک تو منصور خدا نظر بد سے بچائے ویسے ہی سارا دن فائلوں سے سرکھپاتا رہتا ہے اوپر

○○○

حلیم..... لیکن میرا خیال ہے کہ شاید اگر گھر پر رہتی تو اس کی صحت زیادہ متاثر ہو سکتی تھی۔“ جمال احمد بی کو پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”مرد کا شمار صرف کرخت میں ہوتا ہے اس لئے وہ غم بانٹنے کے لف بہانے یا آسانی ڈھونڈ لیتا ہے لیکن اس کے مقابلے میں عورت زیادہ غمزہ زدک ہوتی ہے، وہ اپنے سے فرار نہیں حاصل کر سکتی، اس لئے اندر ہی اندر گھٹتی رہتی ہے اور یہی گھٹن اسے گھن کی طرح کر دیتی ہے..... کیا آپ نے شا کی کیفیت کا اندازہ نہیں لگایا..... بظاہر وہ خود کو خوش ظاہر کرنے کی ضرور کرنی ہے لیکن اس کی آنکھوں میں وہ شوخی اور مسکراہٹیں نہیں دکھائی دیتیں جو فوزیہ خاتون نے سے پیشتر شا کی شخصیت کا ایک انتہائی پاکیزہ اور معصوم پہلو نظر آتی تھیں۔“

”میں آپ کی بات سے متفق ہوں لیکن قسمت کے لکھے کو مٹایا بھی تو نہیں جاسکتا۔“ شبنم بیگم نے لہجے میں کہا۔ ”کے خبر تھی کہ فوزیہ خاتون عین وقت پر دو معصوم دلوں کی خوشیوں کو یوں روند آگئی۔“

”جو ہونا تھا ہو گیا..... اب ہمارا فرض ہے کہ شا کی صحت اور خوشیوں کا خیال رکھیں، ڈاکٹروں نے بی مشورہ دیا ہے اور اسی مشورے کے پیش نظر میں نے شا کے ہوشل میں رہنے کی تائید کی تھی۔“

شا کے بغیر شملہ کے دل پر کیا گزرے گی..... کچھ اس کا بھی اندازہ ہے آپ کو؟“

اولاد کی خوشیوں اور اس کے تائناک مستقبل کی خاطر اکثر والدین کو بڑی بڑی قربانیاں دینا پڑتی جمال احمد نے بیوی کے چہرے کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”شبنم بیگم کے لئے تو ہوشل میں نہیں جا مال دو سال کی بات ہے، اس کا دل بہل جائے تو ہم اسے سمجھا بھگا کر واپس گھر لے آئیں گے۔“

”سال..... دو سال.....“ شبنم بیگم نے ہاتھ ملتے ہوئے دبی زبان میں کہا۔ ”کہہ دینا کس قدر ناہوتا ہے لیکن جس کے دل پر گزرتی ہے وہی اس غم کا اندازہ بہتر لگا سکتا ہے۔“

”آپ سال دو سال کی بات کر رہی ہیں..... کچھ والدین تو ایک دن کے لئے بھی بچوں کی جدائی ت نہیں کر سکتے ہیں۔ اور کہیں یوں بھی ہوتا ہے کہ وقت کی مجبوریاں طبع بن کر تمام زندگی کے لئے ماکے درمیان اس طرح حائل ہو جاتی ہیں کہ انسان انہیں عبور کرنا چاہے بھی تو نہیں کر سکتا.....“

شبنم بیگم شہر کی بات پر یوں چونکیں جیسے بر وقت رنگے ہاتھوں پکڑ لی گئی ہوں، ان کے دل کی لٹیکھت تیز ہونے لگیں، چہرے کی رنگت سفید پڑ گئی، وہ جواب میں کچھ کہنا چاہتی تھیں لیکن قوت نے انکار کر دیا، زبان جیسے گنگ ہو کر رہ گئی ہو..... ماضی کے بند دروازے ہوا کے ایک ہی سے لڑکھڑانے لگے۔

”کیا بات ہے..... آپ اس قدر سنجیدہ کیوں نظر آ رہی ہیں.....؟“

”شا..... شبنم بیگم کے ہونٹ کپکپا کر رہ گئے، پلوں کے گوشے نمناک ہونے لگے تو جمال احمد نے کہا آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں.....؟“

”کی..... شبنم بیگم نے سینے کے اندر مچلتے طوفانوں کا زور کم کرنے کی خاطر پوری شدت سے مانتی لیں۔“

”میں رہنے..... میری زندگی میں شا کی خوشیوں کو کوئی نہیں چھین سکے گا۔“ جمال احمد ٹھہرے انداز میں بولے۔ ”براہ راست نہ سہی لیکن آپ کے رشتے سے کچھ میرا حق بھی بنتا ہے نا پر۔“

”مجھے بھی منصور سے کم عزیز نہیں لیکن.....“ شبنم بیگم کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔

”لیکن کی اولاد اور اپنی اولاد میں کچھ زیادہ فرق بھی نہیں ہوتا۔“ جمال احمد نے آہستہ سے کہا پھر

سے آپ نے اس کے سرخی ڈسے داریاں بھی ڈال دی ہیں۔ اگر کام خدا کے فضل سے بڑھ رہا ہے اس کے لئے اور ملازم کا بندوبست بھی ہو سکتا ہے۔“

”بھی اتنے پیار سے ہمارا بھی خیال کر لیا کیجئے۔“ جمال احمد نے بیوی کو پیار بھری شا کی نظروں سے گھورا تو شبنم بیگم مسکرا کر بولیں۔

”آپ میرے اور میرے بیٹے کے پیار سے جلتے کیوں ہیں؟“

”پیار کی شدت میں کمی محسوس ہو یا اس کا بؤارہ کیا جائے تو حسد ہونا لازمی ہے.....“ جمال احمد کہا۔ ”فرض کر لیجئے میں آپ کے سامنے بیٹھ کر ہر وقت شملہ کی باتیں کرتا رہوں تو کیا آپ کو شک نہیں ہوگی؟“

”آگیا درمیان میں کسی نہ کسی طرح شملہ کا ذکر..... آپ کو تو بس بہانہ چاہئے۔“ شبنم بیگم شوخی سے جواب دیا پھر بولیں۔ ”آپ لباس تبدیل کیجئے میں چائے لگواؤں ہوں.....“

”کیا خیال ہے..... آج لان میں چائے نہ لی جائے؟“

”جیسی آپ کی مرضی.....“ شبنم بیگم قدم اٹھاتی باہر آ گئیں اور جمال احمد لباس تبدیل کرنے لگے پھر جب وہ تروتازہ ہو کر باہر نکلے تو ملازم چائے کی ٹرالی لئے لان کی طرف جا رہا تھا۔

”بیگم صاحبہ کہاں ہیں؟“

”لان میں.....“ ملازم نے مختصر جواب دیا۔

جمال احمد قدم اٹھاتے لان میں آ گئے جہاں شبنم بیگم پہلے سے موجود تھیں، ڈوبے سورج آخری کریمیں حد بندی کی دیوار کے ساتھ لگے درختوں سے آگٹھ پجولی کھیل رہی تھیں اور ہوا کے جھونکے ٹہنی پر بل کھاتے پھولوں سے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ کچھ دیر تک جمال احمد موسم سے لا اندوز ہوتے رہے پھر بیوی کی آواز سن کر ان کی طرف متوجہ ہوئے تو شبنم بیگم چائے کا کپ بڑھا ہوئے بولیں۔ ”خدا کا شکر ہے..... آپ کو دھیان تو آیا کہ میں بھی آپ کے قریب موجود ہوں۔“

”میں دراصل اس وقت شملہ کے بارے میں.....“

”پھر وہی شملہ.....“ شبنم بیگم نے ٹوکا۔ ”کیا آپ نے اپنی سالی کو میری چڑ بنا رکھا ہے؟“

”آج شملہ نے مجھے فون کیا تھا.....“

”کوئی خاص بات؟“ شبنم بیگم نے شوہر کو سنجیدہ یا کر جلدی سے پوچھا۔

”پروفیسر شیرازی نے شا کے لئے ہوشل میں رہائش کا بندوبست کر لیا ہے۔“ جمال احمد نے چا کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ شاید دو تین روز میں ہوشل چلی جائے۔“

”میں سمجھ رہی ہوں.....“ شبنم بیگم نے سنجیدگی سے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے آہستہ سے

”شملہ کو شا کی جدائی کا ڈھک ہوگا۔“

”آپ کی بہن کو مجھ سے شکایت ہے کہ میں نے شا کے ہوشل میں رہنے کی تائید کیوں کی۔“

”مجھے بھی اسی بات کا شکوہ ہے.....“ شبنم بیگم بولیں۔ ”آپ کو پروفیسر شیرازی کے مشورے اتفاق نہیں کرتا چاہئے تھا۔“

”شا کا ایک سال ضائع ہو جاتا.....“

”اس ایک سال کو بچانے کی خاطر شا کی صحت بھی اثر انداز ہو سکتی ہے..... تعلیم کو زندگی پر فوٹہ نہیں دی جاسکتی۔“

لہانے کی میز پر آج خلاف توقع سب ہی چپ اور اُداس نظر آ رہے تھے۔ شاسب کے ہاں جھکائے پیچھے تھے، وہ محسوس کر رہی تھی کہ گھر والوں کی اُداسی کا سبب کیا ہے، اس گھر میں وہ رات ایک رات کی مہمان رہ گئی تھی، کل اُسے ہوش چلا جاتا تھا۔ اُس کی جدائی کے احساس نے اُسے سارے ہی افراد کو غور و فکر میں مبتلا کر رکھا تھا۔ ہر شخص اپنے زاویہ نگاہ سے اُس کی جدائی کے میں سوچ رہا تھا، شامکہ بیگم نے متعدد بار اُسے سمجھانے کی کوشش کی، ہر پہلو سے یہ باور کرانے کی ہاکی تھی کہ بیماری کے بعد اُس کا گھر سے دُور رہنا اور پڑھائی کی خاطر صحت پر زور دینا مناسب ہے۔ ہر بار اُس نے نہایت خوبصورتی سے شامکہ بیگم کو اس بات کا یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ وہ کل ٹھیک ہے اور تعلیمی مشاغل اُس کے لئے کسی طور بھی پریشان کن نہیں ہوں گے۔

دی کی دلجوئی کی خاطر وقار احمد نے بھی شامکہ بیگم کی کوشش کی لیکن اُس کے معقول دلائل کے وہ بھی لا جواب ہو گئے، انہیں یقین تھا کہ اگر وہ فیصلہ کن انداز میں ایک آخری حکم صادر کر دیتے ہوش نہیں جاو گی، یہ میرا حتمی فیصلہ ہے تو شامکہ نے سرتابی کی جسارت نہ کرنی لیکن انہوں نے اپنا حکم مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی، حالات کے پیش نظر وہ خود بھی سمجھ رہے تھے کہ وقتی طور پر شامکہ کو اہول سے دُور ہو جانا اور ہوش کا قیام زیادہ مناسب ہے۔ انہوں نے بیوی کو بھی خاموشی غادیا تھا کہ وہ شامکہ کو زیادہ مجبور نہ کریں اور اس بات کا خیال رکھیں کہ شامکہ گھر سے جاتے وقت کسی اطمینان نہ ہو۔ لیکن شامکہ بیگم کی دل کی کیفیت کا حال کچھ وہی بہتر سمجھ سکتی تھیں۔ شامکہ جو کچھ بنتی غم کے ساتھ ساتھ انہیں بہن کی زندگی بھر کی محنت اکارت جانے کا صدمہ بھی لاحق تھا۔ اگر ان بیمار میں ہوتا تو وہ بہن کی خوشیوں کے لئے آسمان کے ستارے بھی توڑ لاتیں، شامکہ کے ہونٹوں پر مس سجانے کی خاطر وہ بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار تھیں۔ لیکن وقت کی بساط کچھ اس انداز کی کہ وہ بے بسی سے تماشہ دیکھنے کے سوا اور کچھ بھی نہ کر سکیں۔ اپنے ساتھ ساتھ انہیں شامکہ اور خاموشی کا احساس بھی ستا رہا تھا۔

لب دو بار اُن کے دل میں آئی بھی کہ شامکہ سے کھل کر دو ٹوک بات کر لیں، اُسے صاف صاف بتا۔ قدرت نے اُن کی خوشیوں کے ساتھ جو خوفناک مذاق کیا ہے اُس میں اُن کی اپنی ذات کو کوئی ل، انہوں نے تو اپنے تئیں یہ چاہا تھا کہ شامکہ کی مانگ میں افشائ بھر دی جائے اور بہن کی تمنائیں ہو جائیں، ان آرزوؤں کی تکمیل کی خاطر انہوں نے جو قربانیاں دی تھیں وہ بے مثال تھیں مگر مالک ہی کروٹ نے اُن کے خوابوں کے سارے محل سمار کر دیئے۔

اکہ بیگم، شامکہ کے دل کی گہرائیوں میں جھانک کر اس بات کا اندازہ لگانا چاہتی تھیں کہ اُس کو کون کا علم ہو چکا ہے اور کون سی بات ابھی تک اُس کے علم میں نہیں آئی، اس بات کا انہیں یقین ہو کر شامکہ نے اُن کے اور فوزیہ خاتون کے درمیان ہونے والی گفتگو کا کچھ حصہ ضرور سن لیا ہے اور وہ جان گئی ہے کہ فوزیہ خاتون نے احمد کے ساتھ اُس کے رشتے کو بیک جنبش زبان رد کر دیا ہے۔ با اُسے یہ بھی خبر ہو گئی ہے کہ وہ کون ہے؟ کن حالات کی پروردہ ہے؟ نقد پر نے اُس معصوم تھکیا کیا گل کھلائے ہیں؟ وہ کس ماں کی آنکھوں سے بچکے ہوئے لہو کا انمول نگینہ تھی اور..... ل کا باپ کون تھا..... کیا تھا.....؟؟

اس سوال اس وقت بھی شامکہ بیگم کے ذہن میں گڈبڈ ہو رہے تھے، اگر انہیں شامکہ کے غم کی شدتوں کا ہوتا تو وہ اُس کی ایک ایک بات کا جواب دے سکتی تھیں..... ان گریہوں کو بڑی خوبصورتی سے

بیوی کو پر اعتماد لہجے میں تسلی دیتے ہوئے بولے۔ ”شامکہ بھی بہت عزیز ہے، بالکل منصوری طرح۔“
”ایک بات کہوں.....؟“
”کہئے.....!“

”کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم شامکہ کو اپنے گھر لے آئیں؟ ہوش کی بجائے وہ یہاں رہ کر بھی اپنے تعلیم سلسلے کو جاری رکھ سکتی ہے۔“ شامکہ بیگم کی ڈنڈبائی نظروں میں ممتا کے سوتے پھوٹ رہے تھے، اُہ ان گنت گریہوں کی چمک رہی تھیں۔

جمال احمد بیوی کی حالت پر مسکرا دیئے، بڑے پیار سے بولے۔ ”وہ آنسو جو کسی کی چاہت کا بن کر پلکوں تک آجائیں بڑے انمول اور نایاب ہوتے ہیں..... آپ پریشان نہ ہوں، وقت پر رکھئے، حالات ہمیشہ یکساں نہیں رہتے، وقت کے ساتھ ساتھ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“
”آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“ شامکہ بیگم کی آواز میں حسرتیں چل رہی تھیں۔

”اپنوں کے دیئے ہوئے غم اپنوں ہی میں رہ کر نہیں بھلائے جاسکتے۔“ جمال احمد نے کرسی پر بدلتے ہوئے کہا۔ ”فی الحال شامکہ کو ہوش میں رہنا ہر اعتبار سے اُس کے حق میں مفید ثابت ہوگا۔“
”آپ کو یقین ہے کہ وہ آسانی سے اپنا غم بھول جائے گی؟“

”ہاں..... ماحول کا اثر انسان پر ہمیشہ ہوتا ہے..... ہوش میں لڑکیوں کے درمیان شامکہ آسانی سے گزر جائے گا۔ وہ بے حد ذہین بچی ہے، اُسے ڈاکٹر بننے کا شوق جنون کی حد تک ہے اور یہی شوق اُس کے غم کی شدتوں کو بتدریج کم کر دے گا۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو.....“ شامکہ بیگم شامکہ کے تذکرے پر طول ہو گئی تھیں، اس لئے جمال احمد تھوڑی دیر کے لئے گفتگو کا سلسلہ اپنے کاروبار کی طرف منتقل کر دیا، پھر جب انہوں نے محسوس کیا بیوی کے چہرے سے غم کی پرچھائیاں چھٹنے لگی ہیں تو مسکرا کر بولے۔

”اگر آپ مجھ پر خود غرضی کا الزام نہ دھریں تو ایک بات کہوں.....؟“

”کوئی خاص بات ہے جو پہلے سے اجازت طلب کی جا رہی ہے؟“

”جی ہاں..... اپنے صاحبزادے کی بات ہے..... بہت ہی خاص۔“

”منصوری کی بات ہے اور اس قدر انکساری سے کام لے رہے ہیں..... بتائیے نا، کیا معاملہ۔“

شامکہ بیگم نے جس کا اظہار کیا تو جمال احمد نے سنہلے ہوئے کہا۔

”میں سوچ رہا ہوں کہ اب منصور کی شادی میں دیر نہیں کرنی چاہئے..... اس طرح شامکہ کا دا

بہل جائے گا اور مجھے جو ایک لڑکی کی تمنائیں، وہ بھی نادیدہ کے آجانے سے پوری ہو جائے گی۔“

”کیا منصور اور نادیدہ کی شادی پر شامکہ کو ملال نہیں ہوگا..... میرا مطلب ہے کہ ابھی اُس کا کم تاز

اس لئے فی الحال اس تذکرے کو نہ چھیڑا جائے تو مناسب ہوگا۔“

”جیسی آپ کی مرضی..... میں نے تو یونہی ایک خواہش کا اظہار کیا تھا۔“

شامکہ بیگم نے کوئی جواب نہیں دیا، منصور اور نادیدہ کی شادی کے ذکر نے اُن کی ممتا کو پھر بھیر

دی تھی لیکن اُن کی یہ کیفیت زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکی، منصور کے آجانے سے ماحول کا رنگ بڑی

تبدیل ہو گیا۔ جمال احمد نے ایک نظریہ بیوی پر ڈالی پھر اطمینان سے کرسی سے ٹیک لگا کر آسمان کی

دیکھنے لگے.....!!

نہ نے اپنا تمام ضروری سامان وغیرہ تو رکھ لیا ہے ساتھ لے جانے کو؟“ وقار احمد نے گفتگو میں نہ ہوئے کہا۔ ”میرا مطلب ہے کہ کوئی ایسی چیز نہ رہ جائے جس سے پریشانی ہو۔“
 آپ بھی کمال کرتے ہیں.....“ شائلہ بیگم بولیں۔ ”کوئی وہ ہمیشہ کے لئے ہوٹل میں قیام کے لئے تو نہیں جاری جو ایک ایک چیز یاد کر کے رکھی جائے۔ اور پھر ہوٹل بھی اسی شہر میں ہے۔ کسی چیز کی ضرورت ہوگی تو نون کر کے منگائی جاسکتی ہے۔“

درمیان میں تو ہفتے میں دو تین چکر لگایا کروں گی آپ کے پاس۔“ نادیہ نے کہا۔
 میں بھی چلا کروں گا.....“ فرحان نے نادیہ کی طرف دیکھتے ہوئے بات چل کر کرنی چاہی تو صائمہ

نہ وہاں نہیں جاسکتے..... لڑکیوں کے ہوٹل میں صرف لڑکیاں جاسکتی ہیں، اس لئے باجی کے لایا گیا کروں گی۔“

فرحان کو دیکھنے میں خود آ جایا کروں گی۔“ ثنائے فرحان کا دل رکھنے کی خاطر آہستہ سے کہا تو لایا چھین کھل گئیں۔

میں تو اب بھی کہتی ہوں شائیلی! کہ ہوٹل کا خیال دل سے نکال دو۔“ شائلہ بیگم نے ایک آخری کی اور کرنے کی خاطر کہا۔ ”تم جس طرح چاہو یہاں گھر پر بھی تمہاری پڑھائی کے لئے ہو سکتا ہے، جتنے پروفیسر چاہو پڑھائی کے لئے تعینات کئے جاسکتے ہیں۔“

آپ تو اس انداز میں پروفیسروں کی تعیناتی کا حکم صادر فرما رہی ہیں جیسے ان کی ترقی اور تبادلوں کے دائرہ اختیار میں ہوں۔“ وقار احمد نے مسکراتے ہوئے کہا پھر شائلہ کے چہرے کے تاثرات کا گاتے ہوئے بولے۔ ”میرا خیال ہے کہ جو بات طے ہو چکی ہے اس میں رد و بدل مناسب نہیں اور پھر ہمیں پروفیسر شیرازی کی محبت کا خیال بھی رکھنا چاہئے۔ انہوں نے کس قدر کوششوں ہماری بیٹی کے لئے ہوٹل میں رہائش کا بندوبست کیا ہے۔“

ایک طریقہ اور بھی ممکن ہے.....“ صائمہ بولی۔

کیا.....؟“ نادیہ نے بہن سے دریافت کیا۔

کیوں نہ ہم ہوٹل کو یہیں اٹھالائیں..... بڑی آیا بھی پھر ہمارے ساتھ ہی رہیں گی۔“

ل..... یہ ٹھیک ہے۔“ ثنائے زبردستی مسکرانے لگی کوشش کی۔

کاج سے تمہاری کیا دشمنی ہے.....؟“ فرحان نے صائمہ کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”اُسے بھی ہوٹل

اٹھالانا، ورنہ بڑی آیا کو روز روز کاج جانے کی زحمت اٹھانا ہوگی۔“

ایڈیا..... تم نے آج پہلی بار ایک معقول بات کہی ہے۔“

جائز ہو تو ایک معقول بات اور کہہ دوں؟“ فرحان نے صائمہ کو دیکھا۔

جائز ہے.....“ صائمہ نے اکثر جواب دیا۔

میں محاورے کی کتاب میں ایک چھوٹی سی رد و بدل کرنا پڑے گی۔“

لیا مطلب.....؟“

مطلب یہ کہ جلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا تو سنا ہے لیکن ہوٹل یا کاج کا ایک جگہ سے دوسری جگہ

نہیں سنا تھا۔“

محاورہ نہیں..... مثل ہے۔“ صائمہ برا سامنہ بنا کر بولی۔

کھول سکتی تھیں جو شائے دل اور اُس کے معصوم ذہن میں خونی رشتوں کی جانب سے پڑ رہی تھیں۔ لیکن وہ اس لاوے سے بے خبر تھیں جو شائے وجود کے آتش فشاں میں اندر ہی اندر سلگ رہا تھا، شائلہ بیگم ڈاکٹر کے مشورے کے پیش نظر شائے کو اس وقت کریدنا بھی نہیں چاہتی تھیں البتہ وہ کئی بار کھکیوں۔ اُس کی جانب دیکھ چکی تھیں۔

شائے نشست پر کیسی سہمی سہمی اور گم صم صم بنی بیٹھی تھی، اجنبی اجنبی سی، جیسے اُس کے قرب و جو میں سب ہی غیر تھے..... کوئی اپنا نہیں تھا، جانے کن خیالوں میں گم تھی..... شاید اُسے بھی اس دلیز عبور کرنے کا تم ستارہ تھا جس سے اُس کی زندگی کی جانے لگی یادیں، کتنی داستانیں وابستہ تھیں..... شاید وہ اس گھر کو اپنی مرضی سے نہیں چھوڑنا چاہتی تھی..... اگر ایسا تھا تو وہ رک کیوں نہیں جاتی؟ کون جو اُس کے جانے سے خوش ہو رہا تھا..... کوئی بھی تو نہیں..... اگر وہ صرف ایک بار اس خیال کا اظہار دیتی کہ وہ ہوٹل جانے کا ارادہ ترک کر چکی ہے تو ماحول کی وہ اداسی بل بھر میں خوشیوں میں بد جاتی..... سب ہی دل کھل اٹھتے، سب کے چہروں پر زندگی سے پھر پور مسکرائیں جاگ اٹھتیں..... لیکن وہ تو سب کے احساسات سے بے نیاز صرف اپنے خیالوں میں گم تھی، یوں جیسے سب کے درمیان ہو۔ ہوئے بھی خود کو بڑا تنہا محسوس کر رہی ہو۔

شائلہ بیگم کے ذہن میں ایک پہچان سی رہا تھی۔ بڑی دیر تک وہ خاموش بیٹھی شائلہ کے چہرے کا جائزہ لیتی رہیں پھر خود کو سنبھالتے ہوئے بولیں۔ ”کیا بات ہے ثنائے..... تم اس قدر خاموش کیوں ہو.....؟“

”جی..... کچھ بھی تو نہیں.....“ وہ یوں ہڑبڑا کر چونکی جیسے کوئی خواب درمیان سے ٹوٹ کر بھر گیا ہو۔ ”طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری.....؟“

”جی ہاں.....“ اُس نے جھوٹ بولا۔ کیسے بتا دیتی کہ اس وقت اُس کے دل پر کیا گزر رہی تھی؟

”تم نے کھانے سے بھی ہاتھ روک رکھا ہے۔“ شائلہ بیگم نے کہا۔ ”آدھا کو تھ بھٹل لیا تھا وہ ابھی تک پلیٹ میں جوں کا توں رکھا ہے۔“

”اس وقت کھانے کی کچھ خواہش نہیں ہو رہی۔“ ثنائے نے بہانہ بنانے کی کوشش کی۔ ”شام کی چائے کے ساتھ سمو سے کھائے تھے۔“

”آپ نے کہاں کھائے تھے باجی.....“ صائمہ نے بڑی معصومیت سے کہا۔ ”اپنے حصے سمو سے تو آپ نے فرحان کو دے دیئے تھے۔“

”اور بڑی آپا کے حصے کے گلاب جاسن اور حبشی حلوے پر کس نے دانت تیز کئے تھے؟“ فرہ تیزی سے بولا۔

”میں نہ کھاتی تو باجی خفا ہو جاتیں..... کیوں باجی.....“ صائمہ نے شائلہ کی طرف دیکھا تو وہ جا سے مسکرا دی۔

”تم تو انکار کر رہی تھیں۔“ اُس نے صائمہ کا دل رکھنے کو کہا۔

”سفید جھوٹ.....“ فرحان نے احتجاج کیا۔ ”حبشی حلوہ تو صائمہ نے بغیر کہے ہرپ کر لیا تھا۔“

”اچھا، بس خاموش رہو.....“ شائلہ بیگم نے فرحان کو بولنے سے منع کیا، پھر شائلہ بولیں۔ اچھا نہ ہو جب بھی ایک روٹی ضرور کھا لینا چاہئے..... بھوکا رہنے سے سر میں درد شروع ہو جاتا ہے۔ ”ٹھیک ہے.....“ اُس نے نہایت سادگی سے جواب دیا پھر خواہش نہ ہونے کے باوجود چھو چھوئے نوالے طلق سے نیچے اتارنے لگی۔

حتمی ہوتی تو اُس کا پلٹنا مشکل ہو جاتا، کس منہ سے وہ فوزیہ خاتون کو اپنی معصومیت اور بے یقین دلائی؟ کس منہ سے امر کو باور کرانے کی کوشش کرتی کہ وہ اپنے ماضی سے تاحال نا اپنی بے بسی اور بے چارگی پر خون کے آنسو بہانے کے سوا اور کیا کرتی؟ زرد جواہر کے تہ پتھرے میں کسی پر کئے چھپی کی طرح تمام عمر پھڑپھڑاتی رہتی، نفس کی تیلیوں سے اپنے وجود رتی رہتی۔ قوت پرواز کے باوجود پرواز سے قاصر رہتی اور کون جانے کہ وحشتیں جب جنون کی سے تجاوز کر جائیں تو اُس کا انجام کیا ہوتا، دیوانگی! خودکشی! یا!..... طبعی موت!.....!!

لی..... کیا سوچ رہی ہیں.....؟“ نادیہ کی آواز اُس کی قوت سماعت سے نکرانی تو وہ ایک دم اُٹھ گئی، خود کو سنبھالتے ہوئے جلدی سے بولی۔

ہمارے بارے میں غور کر رہی تھی.....“

ہمارے بارے میں.....؟“ نادیہ نے حیرت کا اظہار کیا۔

ا.....“ اُس نے نادیہ کو پیار بھری نظروں سے نکتے ہوئے پوچھا۔ ”کیوں، کیا میں تمہارے ا سوجنے کا حق نہیں رکھتی؟“

نے جن کو بڑی اپنائیت سے دیکھا، مسکراتے ہوئے بتی بچھا کر ٹائٹ بلب روشن کیا پھر چھوٹے قدم اٹھائی شا کے قریب آ کر اُس کے بستر پر بیٹھ گئی، اُس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔

ریت..... اس قدر غور سے کیا دیکھ رہی ہو؟“

اڑوں.....؟“

ابھی چکو..... مجھے وحشت سی ہو رہی ہے۔“

ا آپ کی نظروں میں آپ ہی کو تلاش کر رہی ہوں۔“ نادیہ یلکھت سنجیدہ ہو گئی۔

یوں..... میں کہاں کھوئی جا رہی ہوں؟“ اُس نے نادیہ کو ٹوٹنے کی خاطر تعجب سے سوال کیا۔

لی.....“

ہیں..... میں سن رہی ہوں۔“

یا آپ سچ پڑھائی کی وجہ سے گھر چھوڑ کر ہوسٹل میں رہنے جا رہی ہیں؟“

ہارا کیا خیال ہے.....؟“ شا چونک کر بولی۔

ا آپ سے پوچھ رہی ہوں۔“ نادیہ نے بدستور بہن کی نگاہوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

اہرے..... بھلا پڑھائی کے سوا اور کیا وجہ ہو سکتی ہے؟“ شا نے خود کو سنبھالتے ہوئے جواب دیا۔

ر یہ بات ہے تو کھائے میرے سر کی قسم۔“

نے شا کا ہاتھ تھپتھپ کر اپنے سر پر رکھا تو وہ ہلکا سا گئی، دل کی دھڑکنیں یلکھت تیز ہو گئیں، نادیہ کو معنی خیز نظروں سے دیکھا، انہیں نادیہ بھی اُس راز سے واقف تو نہیں ہو گئی جو اُس کی سب سے اذیت ناک المیہ تھا..... یہ خیال شا کے ذہن میں بجلی بن کر کودتا تو ایک لمحے کو وہ دس من بجے ہو کر رہ گئی..... پھر زبردستی مسکراتے ہوئے بولی۔ ”مجھے خبر تھی کہ میرے جانے کا سب سے زیادہ تمہیں ہو گا۔“

بات میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔“ نادیہ نے سنجیدگی کو برقرار رکھا۔

ہیں یہ اچانک ہو کیا رہا ہے.....؟“

نہ وحشت ہو رہی ہے..... مجھ پر دیوانگی کی کیفیتیں طاری ہو رہی ہیں۔“ نادیہ جذباتی ہو گئی۔

”مثلاً ہے تو بھی تم پر صادق آ رہی ہے۔“ فرحان نے برجستہ جواب دیا تو وقار احمد کے علاوہ شاہد بیگم بھی بے اختیار مسکرا دیں۔

کھانے سے فارغ ہو کر سب لوگ ڈرائنگ روم میں آ گئے، وقار احمد جلدی سو جانے کے عادی تھے لیکن شا کے جانے کے خیال سے اور بیوی کی دلجوئی کی خاطر سب کے ساتھ بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ صائمہ اور فرحان میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر دلچسپ نوک جھونک کا سلسلہ جاری رہا۔ وقار احمد نے کافی خواہش کا اظہار کیا تو شا جا کر جلدی سے کافی تیار کر لائی، شامکہ بیگم شا کی ایک ایک حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہی تھیں لیکن شا نے کسی طور انہیں اس بات کا احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ کن حالات کے پیش نظر ہوسٹل جانے پر آمادہ ہوئی ہے۔ وہ سب کے ساتھ بیٹھے بولنے میں مصروف تھے لیکن اندر سے اُس کے دل کی حالت بھی غیر ہو رہی تھی..... اُسے رہ رہ کر شامکہ بیگم کا خیال آ رہا تھا، جنہوں نے اُسے ماں بن کر پالا تھا، اپنی اولادوں سے زیادہ اُس کا خیال رکھا تھا، اُسے کسی بات کی تکلیف نہیں ہونے دی تھی..... وہ کل بھی اُس سے بے پناہ محبت کرتی تھیں اور آج بھی اُن کی نگاہوں سے متا حسرت بھرا احساس چھلک رہا تھا..... لیکن وہ انہیں چھوڑنے پر مجبور تھی، رشتوں کی شناخت نے اُس کے ذہن پر ایسا شدید چرکہ لگایا تھا کہ وہ خود اپنے آپ سے بھی اجنبی بن کر رہ گئی تھی..... اُس کا ماضی تاریک تھا..... گمنام تھا، حال نے راستوں کے گرد و غبار کو ڈور کیا تو وہ اپنی اصلیت محسوس کرے ششدر رہ گئی..... شیشے کے گھر میں بیٹھ کر جنونی حرکات کا ارتکاب دانستہ کی مٹائی تھا، اس نے اُس نے خوبصورتی سے اس دنیا سے کنارہ کش ہو جانے کا مصمم ارادہ کر لیا جسے وہ بچپن سے جوانی تک اپنی دنیا سمجھتی آئی تھی..... وہ اس ماحول میں کھل کر سانس لینے سے قاصر ہو گئی تھی..... ہر شخص اُس نے اپنائیت، پیار و محبت و خلوص کا برتاؤ کر رہا تھا لیکن جانے کیوں اُسے ٹھنکن کا احساس شدید سے شدید ہوتا جا رہا تھا..... ہنستے ہنستے وہ یلکھت سنجیدہ ہو جاتی..... باتیں کرتے کرتے یوں چونک اُٹھتی جیسے کو نادیہ خوف اُسے لاشعوری طور پر اندر ہی اندر دہشت زدہ کر رہا ہو..... پھر اُس کے ذہن میں دسو۔ جاگ اُٹھتے، وہ سوچنے لگتی۔

کل اگر نادیہ نے کسی بات پر اپنے اور پرانے کا طعنہ دے دیا تو اُس کی حالت کیا ہوگی.....؟ بے صائمہ نے اُسے بدلی ہوئی نظروں سے دیکھ لیا تو کیا ہو گا.....؟ فرحان نے بڑا ہو کر اُسے اجنبی نظروں سے غیریت کا احساس دلایا تو کیا وہ شرم سے پانی پانی نہ ہو جائے گی.....؟ کیا وہ ان باتوں کو جھٹلا سکے جو اُس کے وجود کے ساتھ تھیں ہو گئی تھیں.....؟ تصور اُس کا نہ ہی لیکن وہ بہر حال سزا بھگتتے سے گریز نہیں کر سکتی تھی..... اسی لئے اُس نے خود کو شخص اپنی ذات تک محدود کرنے کی ٹھان لی تھی..... تمام خوشیوں اور زندگی کے ہنگاموں سے الگ تھلگ رہنے کا ارادہ کر لیا تھا..... وہ ایسا نہ کرتی تو اور کیا کرتی رات دس بجے تک وہ سب کے درمیان بیٹھی خوشیوں کے الوداعی ہنگام میں حصہ لیتی رہی، جب وقار احمد اور شامکہ بیگم خواب گاہ میں چلے گئے تو وہ بھی نادیہ کے ساتھ اپنی خواب گاہ میں صائمہ اور فرحان پہلے ہی سونے جا چکے تھے۔ نادیہ لباس تبدیل کرنے کی غرض سے ڈرائنگ روم میں تو وہ تھکے تھکے انداز میں اپنے بستر پر نیم دراز ہو گئی..... کمرے کے ساز و سامان کو یوں دیکھنے لگی جیسے کبھی نہ دیکھا ہو..... ان چیزوں سے اُس کی زندگی کو کس قدر طویل اور قریبی نسبت رہی تھی..... اب وہ ان چیزوں سے منہ موڑ کر جانے پر مجبور تھی..... قریب قریب فاصلوں میں بدل جائیں گی یہ تو اُس کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ مگر یہ بھی اچھا ہوا جو وقت نے اُسے سنبھلنے کی مہلت دے دی..... کہیں دو چار

نی غلت کیا ہے.....“ نادیر سر کھجاتے ہوئے بولی۔ ”امتحان ختم ہو جائیں پھر دیکھا جائے گا، اس بڑی شدت سے نیند آرہی ہے۔“

پلہ، اس وقت صرف وعدہ کرلو..... ایضاً عہد بعد میں کرتی رہنا۔“
یامیں پوچھ سکتی ہوں کہ منصور نے آپ کو کیا رشوت دی ہے جو اس وقت آدھی رات گئے اُن کی لی جا رہی ہے؟“

میری اپنی خواہش ہے نادیر..... تمہاری آپلی کی۔“ وہ بڑے خلوص سے بولی۔ ”ہاں..... میں اُن کے رُوب میں دیکھنا چاہتی ہوں..... منصور کی دلہن۔“

آپلی.....“ نادیر پھولوں سے لدی شاخ کی مانند شرمگاہی، کچھ اور نہ بن پڑا تو شاخ کو بے اختیار روئوں کے حصار میں لے لیا۔

بڑی اپنائیت سے نادیر کے ریشمی باتوں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ نادیر کے والہانہ انداز کو محسوس کر یک لمحے کو مسکرا دی، پھر کچھ خیال آیا تو اُس کی پلکوں کے گوشے ننناک ہونے لگے.....!!

❦ ❦ ❦

الکچے برقع میں اُس نے نازی بیگم کے کملائے ہوئے چہرے کو دیکھا تو اندر ہی اندر دل مسوس کر دقت کی گردش نے اُس کے چہرے پر کس قدر دلخراش داستا میں دم کر دی تھیں، اتنی واضح کہ کوئی نظر دیکھ کر اندازہ لگا سکتا تھا کہ اس داستان کا آغاز یقیناً حسین رہا ہوگا لیکن اس کا انجام.....

ایک کھانسی کا دورہ پڑا تو وہ جھنگے کی سنگلاخ جالیوں کو پکڑ کر آہستہ سے پختہ فرش پر بیٹھ گیا، دوسری نازی بیگم کے اُداس چہرے پر جچی ہوئی نم کی دیرخیز یوں کا رنگ اور گھرا آیا، وہ آہنی سلاخوں کو نے سے قاصر تھی لیکن اُس کی دیران آنکھوں میں پیاری کریناک چمک اس بات کی ترجمانی کر کہ وہ بیماری خاطر اپنی زندگی کی قربانی بھی دے سکتی ہے۔ شاید اس لئے کہ وہ اُس کا شوہر تھا۔

زی خدا تھا..... پھر وہ خدا کی پرسش سے منہ کس طرح پھیر لیتی.....؟ وہی تو اُس کی زندگی کی ساخت..... آخری سہارا تھا..... اور..... اُسے چھوڑ کر وہ جا بھی کہاں سکتی تھی.....!!

نئی دیر وہ کھانسا رہا، وہ جالیوں سے لگی پیچی اُسے پریشان کن نظروں سے دیکھتی رہی۔ کھانسی کی میں ایک ذرا آرام ہوا تو بڑے درد بھرے لہجے میں بولی۔ ”ڈاکٹر کیا کہتا ہے..... کب نجات اس مرض سے؟“

نجات.....“ اقبال احمد نے سینہ سہلائے ہوئے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔ ”نجات کا وقت بیت گیا..... قدرت نے ایک ایک کر کے تمام دروازے میرے اوپر بند کر دیئے ہیں۔“

ایمانت کہنے.....“ وہ تڑپ اٹھی۔ ”مایوسی گناہ ہے.....“

میں..... مایوسی نہیں ہوں.....“ وہ ہانپتے ہوئے بولا۔ ”مجھے یقین ہے کہ قدرت میرے ساتھ نفاق کرے گی۔ اسی انصاف کی آرزو نے تو مجھے اب تک زندہ رکھا ہے..... ابھی تو میں نے ماب کا ایک چوتھائی بھی ادا نہیں کیا۔“

خدا کے لئے..... ایسی دلخراش باتیں نہ کیجئے۔“ نازی بیگم نے زندگی ہوئی آواز میں التجا کی۔ سکے دروازے بھی بند نہیں ہوتے.....“

بے سبب بہلاوے کی باتیں ہیں.....“ وہ پوری شدت سے کھانستے ہوئے بولا۔ ”خون کی گرمی کم آتو جوش و خروش بھی پانی کے بلبلے کی مانند بیٹھنے لگتا ہے..... وقت گزر جانے کے بعد جو ماتم کیا

”میں آپ کو بہت بہادر، بے حد دلیر سمجھتی تھی۔ لیکن آج معلوم ہوا کہ آپ اندر سے کس قدر کمزور اور حساس واقع ہوئی ہیں۔“ ثنائے کوئی جواب نہیں دیا۔ حیرت سے نادیر کو تنگی رہی۔ ”مجھے بتائیے آپلی..... کیا کسی اور کو بھی اس آگ کی تپش کا احساس ہوگا جس میں آپ خود کو جھلسا رہی ہیں۔“

”کس کی بات کر رہی ہو تم.....؟“ ثنائے دبی زبان میں پوچھا۔
”اُس عذاب کی..... آپ نے اپنے ذہن..... اپنے دل و دماغ پر مسلط کر رکھا ہے۔“

”مم..... میں..... میں بھی نہیں؟“
”کاش یہ حادثہ میرے ساتھ پیش آیا ہوتا.....“ نادیر نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا، اُس کا چہرہ غصے کی شدت سے تھمتا رہا تھا۔

”تم جو کچھ سمجھ رہی ہو وہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔“ اُس نے آہستہ سے نادیر کو سمجھانے کی کوشش کی۔
”پروفیسر شیرازی کا بھی یہی مشورہ ہے کہ مجھے پڑھائی کا ایک قیمتی سال.....“

”پڑھائی کا خوف اتنا شدید اور ہیا تک نہیں ہوتا کہ انسان ہسپتال میں بے سدھ پڑا موت اور زینت کی کیفیتوں سے دوچار رہے۔“ نادیر نے تیزی سے اُس کا جملہ کاٹتے ہوئے کہا۔ ثنائے لکے

سہم گئی پھر ہمت کر کے بولی۔
”تم کو حالات کی اصلیت کا علم نہیں ہے.....“

”مجھے حالات کی اصلیت کے ساتھ ساتھ لوگوں کی ذہنیت کا اندازہ بھی ہو گیا ہے۔“ نادیر تھلا کر بولی۔ ”امی جان کی قسم کا یاس نہ ہوتا تو میں بڑی اماں کو بتاتی کہ میرے جو اہرات کی چمک دک شبنم کے ایک قطرے کا مول بھی نہیں بن سکتی..... انسان تو انسانیت کی معراج کا دوسرا نام ہے.....“

”مجھے کسی سے کوئی شکوہ، کوئی گلہ، کوئی شکایت نہیں۔“ اُس نے بڑے معصوم اور ٹھہرے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

”پھر..... آپ نے اپنی یہ حالت کیوں بنا رکھی ہے.....؟“
”میں کاش چھ جائے تو وقتی طور پر درد کا احساس ضرور ہوتا ہے، تم اپنی زندگی کا روگ کیوں سمجھ رہی ہو؟“

”گلد.....“ نادیر تیزی سے بولی۔ ”یہ ہوئی نابات.....“
”اب ایک بات میری بھی سنو گی؟“ ثنائے بڑی خوبصورتی سے بات بدلنے کی خاطر کہا۔

”کیا.....؟“
”جذبات کی رو میں بہک کر دوبارہ کبھی کوئی بری فال زبان سے نہ نکالنا..... تم نہیں جانتیں منصور مجھے بہت عزیز ہیں۔“

”مجھ سے بھی زیادہ.....؟“ نادیر اچانک شوخ ہو گئی۔
”ایک اعتبار سے یہ بھی کہا جاسکتا ہے۔“

”اچھا..... ذرا میں بھی سنوں کہ موصوف کس زاویے سے مابدولت سے زیادہ بہتر ہیں؟“
”منصور نے آج تک کبھی میری کوئی بات نہیں مانی، ہر بات سر جھکا کر مان لیتا ہے.....“

”اور میں نے آپ کی کون سی بات رد کی ہے؟“ نادیر نے شکایت آمیز لہجے میں دریافت کیا۔
”اگر میں کہوں کہ تم امتحانات کے بعد منصور کو اپنا لو..... تو؟“

”سو چنا پڑے گا.....“ نادیر نے شریر انداز میں جواب دیا۔
”میرا حکم بھی نہیں مانو گی.....؟“

کا غم نہ کروں تو اور کیا کروں..... اور کون بیٹھا ہے میرا اس دنیا میں جس سے اپنا دکھڑا بیان نازلی بیگم نے بھرائی ہوئی آواز میں شکوہ کیا تو اقبال احمد ہونٹ چبا کر رہ گئے، بیوی کا دھیان ماطر موضوع بدل کر کہا۔ ”نوشابہ کب واپس آئے گی؟“

”ہی تو گئی ہے..... ایک ہفتے بعد واپسی کا کہہ رہی تھی۔“ نازلی بیگم نے جواب دیا پھر کچھ سوچا۔ ”میں نے سنا ہے، کراچی میں علاج معالجے کی زیادہ سہولتیں ہیں؟“

احمد نے کوئی جواب نہیں دیا، نازلی بیگم کو وضاحت طلب نظروں سے گھورنے لگے۔

ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ کو یہاں سے کراچی جیل میں منتقل کر دیا جائے؟“

نا سنے کا تمہاری فریاد.....؟“

”پروردگار۔“ نازلی بیگم نے پُر اعتماد انداز میں کہا۔ ”میں نے سمیرا خاتون سے کراچی جاتے

یا تھا..... انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ واپسی پر میرا کام کرا دیں گی۔“

..... تم مجھے اپنی دنیا سے دُور بھیجتا جا رہی ہو.....؟“

لیسے سوچ لیا آپ نے.....؟“ نازلی بیگم نے جلدی سے کہا۔ ”میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی

..... میرا دل گواہی دیتا ہے کہ وہاں آپ کا علاج بہتر طریقے سے ہو جائے گا..... ماحول کی

خوشگوار ثابت ہوگی۔“

”تمہارا گھر ہے..... تمہارے واقف کار ہیں..... نوشابہ ہے..... اور.....“

”آپ کی خاطر سب کچھ چھوڑ دوں گی۔“

..... بار پہلے بھی یہی حماقت کر چکی ہو۔“ اقبال احمد کے لہجے میں کسک تھی۔ ”کیا مل گیا تمہیں.....

والی، بدنامی اور درد بردی ٹھوکریں.....“

پ صحت مند ہو جائیں، رہا ہو کر واپس آجائیں تو میری خوشیاں بھی لوٹ آئیں گی۔ ہم نئے

نئے اپنی دنیا آباد کریں گے۔ لوگوں کا کیا ہے..... وہ تو کچھ نہ کچھ ہر حال میں کہتے رہتے ہیں۔“

..... بہت عظیم ہونا زلی!“

ر میری سر بلندی بھی آپ کے دم سے قائم ہے..... کبھی یہ بھی سوچا ہے آپ نے؟“

ب سوچنے سے فائدہ کیا.....؟“

روہی ماپوسی کی باتیں شروع کر دیں آپ نے۔ وعدہ کیجئے کہ آپ اپنی صحت کا خیال رکھیں گے۔“

جائے..... تم کہتی ہو تو کوشش کروں گا لیکن.....“ اقبال احمد نے اپنا جملہ مکمل نہیں کیا، سختی سے ہونٹ

.....

ن ویکمن کچھ نہیں.....“ نازلی بیگم نے کہا۔ ”بہت کر لی آپ نے اپنی من مانی..... اب میرے

پر چلنا ہوگا..... بولنے، منظور؟“

ظور.....“ اقبال احمد نے حسرت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

ی نے دُور سے اپنی کرخت آواز میں وقت ختم ہونے کی صدا لگائی تو نازلی بیگم اٹھ کھڑی

قبال احمد بھی کھڑے ہو کر نازلی کی شکل میں اُس خزاں رسیدہ تمنا کو دیکھنے لگے جو بہار کے

ما اُس لگائے زندگی کے دن پورے کر رہی تھی۔

ب ہمت رکھئے..... میں کوشش کروں گی کہ آپ کو کراچی منتقل کر دیا جائے، میں بھی آپ کے

ل کی۔“

جائے وہ صرف اپنے دل کا بہلاوا ہے..... انسان، انسان کو دھوکہ دے سکتا ہے، فریب کاری کے چال میں پھانس سکتا ہے لیکن وہ..... جو اُوپر نیلی چھت پر بیٹھا ہے، وہ دلوں کے مجید جانتا ہے..... وہ مکرو فریب کا شکار نہیں ہو سکتا ہے..... وہ ضرور انصاف کرے گا۔“

”اُس سے انصاف کی نہیں..... رحم کی بھیک مانگئے!“

”رحم.....“ اقبال احمد کے سوکھے ہونٹوں پر ایک بے جان تبسم اُبھر آیا، دل مسوس کر بولا۔ ”رحم

کیوں نازلی..... انصاف کیوں نہیں..... اس لئے کہ اگر اُس نے انصاف کیا تو میرے نامہ اعمال میں

اُس کے قہر کے علاوہ کوئی دوسرا اندراج ممکن نہ ہوگا..... کیسی مضحکہ خیز بات ہے..... کیسا عجیب تراش

ہے..... ہوس کے نشے میں ڈوب کر انسان سب کچھ بھول جاتا ہے..... خدا کو بھی..... اُس کے قہر و

عذاب کو بھی..... اور جب وہ ٹھوکر کھا کر منہ کے بل گرتا ہے..... لبو لبہاں ہو جاتا ہے تو خدا کو پکارتا ہے،

اُس سے رحم کی بھیک مانگتا ہے..... انصاف کا تقاضہ نہیں کرتا اور.....“

”اور وہ بندے کو معاف کر دیتا ہے۔“ نازلی بیگم نے جلدی سے کہا۔ ”اُسے عاجزی اور انکساری

پسند ہے..... وہ نادم ہونے والوں کو بخش دیتا ہے..... یہی تو اُس کی شان کبریائی ہے.....“

اقبال احمد نے جواب میں کچھ کہنا چاہا لیکن کھانسی کی شدت آڑے آگئی، دونوں ہاتھ منہ پر رکھ کر

وہ زور لگا لگا کر کھانسنے لگا۔ نازلی بیگم شوہر کے کرب کا اندازہ لگاتی رہیں۔ پھر جب کھانسی کو قدرے

آرام آیا تو آہستہ سے بولیں۔ ”آج آپ نے نوشابہ کے بارے میں دریافت نہیں کیا.....؟“

”تم کہتی ہو تو پوچھے لیتا ہوں.....“ اقبال احمد کے لہجے میں درد کی شدتیں چل اُٹھیں۔ ”کیسی ہے

تمہاری نوشابہ.....؟“

”میری نوشابہ..... کیا آپ اُسے اپنی بیٹی نہیں سمجھتے؟“ نازلی بیگم نے شکوہ کیا۔

”بیٹی.....“ اقبال احمد نے ایک طویل سانس لی۔ پھر خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔ ”کہاں ہے

میری بیٹی.....؟“

”آج کل کراچی گئی ہوئی ہے..... سمیرا خاتون کے ساتھ۔“ نازلی بیگم نے جواب دیا۔ ”راجیل کی

بات کچی ہو رہی ہے۔“

”کون راجیل.....؟“

”سمیرا خاتون کا اکلوتا بیٹا..... آپ کو شاید یاد نہیں رہا۔“

”ہاں.....“ اقبال احمد نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ”میں آہستہ آہستہ بہت کچھ بھولتا جا رہا ہوں۔“

”صحت جو ٹھیک نہیں رہتی۔“ نازلی بیگم نے ہمدردی کا اظہار کیا پھر دبی زبان میں پوچھا۔ ”ڈاکٹر کب

بتاتا ہے آپ کی پیاری کے بارے میں..... کھانسی تو روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔“

”کھانسی کے بہانے وقت آسانی سے گزر جاتا ہے..... تنہائی کا احساس نہیں ہوتا..... یوں لگتا ہے

جیسے کوئی میرے سینے کی گہرائیوں کے اندر بیٹھا مجھے آوازیں دے رہا ہو..... پکار رہا ہو..... ماضی کی

طرف واپس گھسٹ رہا ہو۔“

”میرا خیال ہے کہ یہاں لاہور میں رہ کر آپ کا علاج ممکن نہیں..... یہاں آپ کی تیمارداری

دھیان سے نہیں ہو رہی۔“

”نادان مت بنو نازلی بیگم.....“ وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”یہ جیل کی دنیا ہے۔ یہاں تمہاری

ہمدردی میرا ساتھ نہیں دے سکتی۔ تم اپنا خیال رکھا کرو..... میرے غم نے تمہیں بھی اندر سے کھوکھلا

ناؤں سے متحرک رکھتی ہیں اور.....“
 ”اور وہ سوچتے سوچتے ایک دن بھانسی کے پھندے پر لٹک کر ختم ہو جاتا ہے..... رفیق کی طرح۔“
 ”رفیق.....“ اقبال احمد نے چونک کر تیزی سے سوال کیا۔ ”کیا رفیق کو پھانسی ہو گئی.....؟“
 ”ہاں..... وہ جیل کی سزا کے ساتھ ساتھ دنیا کی قید سے بھی ہمیشہ کے لئے آزاد ہو گیا۔ لیکن آخری
 میں بھی سوچوں نے اُس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔“ بوڑھے نے سپاٹ آواز میں کہا۔ ”دنیا سے کوچ
 ۲ وقت اُس نے کلمہ نہیں پڑھا..... اپنی سوتیلی ماں کے بارے میں سوچتا رہا..... دیوانوں کی طرح
 ناام لے لے کر پکارتا رہا، پھر ایک ہی جھٹکے میں تمام دن دنیا سے ناتا توڑ کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو
 مجھے بتاؤ! ایسی سوچوں سے کیا فائدہ جن پر انسان کا بس نہ ہو، جو اُس کی پہنچ سے دور ہوں۔“
 اقبال احمد سکتے کی کیفیتوں سے دوچار خاموش بیٹھا بوڑھے کی باتیں سنتا رہا..... اُس کی شکل تکتا
 ہر نیکتہ اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور ہاڑیں مار مار کر رونے لگا۔
 شاید کوئی سوچ نیزے کی آلی بن کر اچاک اُس کے وجود کی گہرائیوں میں اتر گئی تھی!!

○○○

ثالثہ بیگم نے سمیرا خاتون کی آمد کی اطلاع سنی تو باہر لان پر آگئیں جہاں فرحان پہلے ہی سے
 اُن کے ساتھ بیٹھے پرش احوال میں مصروف تھے، سمیرا خاتون کے ساتھ نوشابہ بھی موجود تھیں
 راجیل نظر نہیں آ رہے تھے۔
 سمیرا خاتون نے ثالثہ بیگم کو آتے دیکھا تو اٹھ کھڑی ہوئیں۔ نوشابہ نے بھی اُن کی پیروی کی،
 بیگم نے آگے بڑھ کر نہایت تپاک سے سمیرا خاتون کا استقبال کیا، پھر بولیں۔ ”آپ یہاں رُک
 با..... اندر ڈرائنگ روم میں تشریف لائیں۔“
 ”میرا خیال ہے یہاں کھلی فضا میں بیٹھنا زیادہ مناسب ہوگا۔“ سمیرا خاتون بولیں۔ ”اور پھر میں
 اپنا گھر سمجھ کر آئی ہوں۔ یہاں دل گھبرایا تو اندر جا بیٹھیں گے۔“
 ”جیسی آپ کی مرضی.....“ ثالثہ بیگم نے مہمانوں سے کہا پھر خود بھی بیٹھ گئیں۔ ”اس بار آپ نے
 کی اطلاع بھی نہیں دی..... اور یہ راجیل کہاں ہیں؟“
 ”راجیل کو اس وقت میں جان بوجھ کر ساتھ نہیں لائی۔“ سمیرا خاتون نے سنجیدگی سے جواب دیا۔
 ”اُن کی آمد کی اطلاع نہ دینے کا مسئلہ تو اس بار راجیل کو بھی میرے آنے کی کوئی خبر نہیں تھی۔“
 ”کوئی کاروباری مسئلہ درپیش ہوگا۔“
 ”جی نہیں..... اس بار راجیل کے مستقبل کا مسئلہ حل کرنے کی غرض سے آئی ہوں۔“
 ”خیریت.....؟“ ثالثہ بیگم نے وضاحت چاہی۔
 ”میں نے سوچا ہے کہ اب راجیل کی شادی طے کر دی جائے۔“
 ”جہ نیک اور مبارک خیال ہے..... لیکن اتنی جلدی کیا ہے، ابھی تو راجیل کی پڑھائی کا سلسلہ
 با ہے۔“
 ”فرحان..... آپ کی نادیہ اور ثناء باجی نظر نہیں آ رہیں۔“ نوشابہ نے فرحان سے دریافت کیا۔ ”کیا
 رہیں ہیں؟“
 ”نادیہ باجی تو اندر موجود ہیں، البتہ بڑی آپا کا قیام آج کل ہوٹل میں ہے۔“
 ”اُسے ہاں.....“ سمیرا خاتون نے جلدی سے کہا۔ ”میں معذرت خواہ ہوں کہ شاکی طبیعت کے

”وہاں کون ہے تمہارا..... میرا مطلب ہے کہ کس کے پاس ٹھہرو گی؟“
 ”آپ ان باتوں کی فکر نہ کریں..... خوش رہنے کی کوشش کیا کیجئے! میری صرف یہی التجا ہے۔“
 ”نازلی، تم.....“

سنتری لیفٹ راجت کرتا، اپنی بڑی بڑی خوفناک گھنیری مونچھوں کو تاؤ دیتا قریب آیا تو اقبال احمد کا
 جملہ حلق میں گھٹ کر رہ گیا۔ ”اوئے..... سنا نہیں تو نے؟“ سنتری نے نازلی بیگم کو کھاتر سے لگاکر۔
 ”دہم ختم ہو گیا، چل رستہ تاپ اپنا!“
 نازلی بیگم نے ایک نظر شوہر پر ڈالی، تیزی سے پلٹیں اور نقاب چہرے پر ڈالتی تیز تیز قدم اٹھاتی
 واپس لوٹ گئیں۔ اقبال احمد کی نظریں نازلی کا تعاقب کرتی رہیں۔ پھر جب وہ نگاہوں سے اوجھل ہو
 گئی تو وہ بھی پلٹ کر اپنی کوٹھڑی میں آگئے جہاں بوڑھا قیدی نہایت آرام سے ٹیک لگائے ٹنگے فرش پر
 پاؤں پھیلائے یوں بیٹھا تھا جیسے اُسے غم روزگار اور غم دنیا سے کوئی سروکار نہ ہو..... جیل کی وہی کوٹھڑی
 اُس کی آخری منزل تھی جہاں پہنچ کر وہ پُر سکون ہو گیا تھا۔

”کون آیا تھا ملنے؟“ بوڑھے قیدی نے سنتری کے واپس جانے کے بعد سوال کیا۔ ”تمہاری گھر والی؟“
 ”ہاں.....“
 ”کوئی نازی خبر.....؟“
 ”نہیں.....“

”خیریت تو ہے.....؟“ بوڑھے نے دریافت کیا۔ ”بڑے بچھے بچھے سے نظر آ رہے ہو۔“
 ”اُسی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔“ اقبال احمد نے سرد آہ بھر کر کہا۔ ”اُسے ابھی تک یقین ہے
 کہ میں یہاں سے زندہ واپس نکل جاؤں گا۔“

”مرد کے مقابلے میں عورت زیادہ وفادار ہوتی ہے..... ایک بار جس کی ہو جائے مرتے دم تک
 اُسی کے نام کی بالا چسپی رہتی ہے، مرد پر کوئی برا وقت آ پڑے تو وہ اُس کے تمام مظالم لحوں میں فراموش
 کر دیتی ہے..... اس کے برعکس مرد کی ذات بڑی سپیوٹی ہوتی ہے، جب تک اپنا انتقام پورا نہ کر لے
 چین سے نہیں بیٹھتی۔“

”آج وہ ایک نئی امید کا دامن تمام کر آئی تھی.....“ اقبال احمد نے زہر خند سے کہا۔ ”اُس کا خیال
 ہے کہ کراچی میں میری بیماری کا علاج مناسب طریقے سے ہو سکتا ہے۔“
 ”کیا تم نے اُسے بتا دیا کہ تمہیں کیا بیماری ہے.....؟“ بوڑھا چونک اٹھا۔
 ”نہیں.....“

”اچھا کیا.....“ بوڑھا اطمینان کی سانس لے کر بولا۔ ”اگر اُسے علم ہو گیا کہ تمہیں جیل کی سختیوں
 سے زیادہ جب دق کے موذی مرض نے دبوچ رکھا ہے تو اُس کا سکون برابرا ہو جائے گا..... اُسے یہی
 بتاتے رہو کہ معمولی کھانسی ہے، وقت کے ساتھ ساتھ یہ بھی گزر جائے گی۔“

”لیکن میں آخر تک اُسے دھوکا دیتا رہوں گا..... ایک نہ ایک دن تو.....“
 ”سوچنا چھوڑ دو!“ بوڑھے نے بے پروائی سے کہا۔ ”مجھے بھی اتنی فرصت نہیں ملی کہ بقراط کے بارے
 میں کچھ بڑھ سکتا، لیکن میرا خیال ہے کہ وہ بھی سوچتے سوچتے خراج ہو گیا ہوگا۔ تمہارا کیا خیال ہے؟“
 ”کچھ باتیں..... کچھ یادیں ایسی ہوتی ہیں جو مرتے دم تک پیچھا نہیں چھوڑتیں..... انسان کو کب نہ
 کچھ تو سوچنا پڑتا ہے، اپنے ماضی کے بارے میں، حال کے بارے میں اور مستقبل کے لئے۔“

بارے میں نہ پوچھ سکی، راحیل نے فون پر اطلاع دی تھی کہ شاید کچھ بیمار تھی۔
 ”جی ہاں..... مگر خدا کا شکر ہے کہ پریشانی آ کر ساتھ خیریت کے گزر گئی۔“ شاملہ بیگم نے مختصر
 کے بارے میں بتایا تو سمیرا خاتون نے کرسی پر پہلو بدل کر کہا۔

”شادی بڑی ذہن اور ہونہار بچی ہے، مجھے یقین ہے کہ اُس کی محنت رائیگاں نہیں جائے گی۔“
 ”خدا آپ کی زبان مبارک کرے۔“ شاملہ بیگم بولیں، پھر نوشاہہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”تم چاہ
 اندر نادیہ کے پاس چلی جاؤ یا اُسے یہاں بلوا لو۔“

”میرا خیال ہے کہ آپ لوگ یہاں بیٹھ کر باتیں کریں، میں نوشاہہ باجی کو اندر لے کر جا رہا ہوں
 آئیے نوشاہہ باجی!“ فرحان نے اُٹھتے ہوئے کہا پھر نوشاہہ کو ساتھ لے کر اندر چلا گیا۔
 سمیرا خاتون کچھ دیر تک شاملہ بیگم سے رسی باتیں کرتی رہیں۔ شاہ کے بارے میں پوچھتی رہیں،
 اصل مقصد کی جانب آتے ہوئے بولیں۔

”میں نادرہ کے سلسلے میں آپ سے کچھ صلاح مشورہ کرنے کی غرض سے آئی ہوں..... راحیل
 مستقبل سنوارنے میں چونکہ آپ کی محبت اور شفقتوں کو کبھی دخل رہا ہے اس لئے مجھے یقین ہے کہ آ
 اُس کے بارے میں یقیناً مفید مشورہ دیں گی۔“

”ذرا نوازی ہے آپ کی جو مجھے عزت بخش رہی ہیں۔“ شاملہ بیگم نے سنبھل کر سنجیدگی سے جواب
 دیا۔ ”رہا نادرہ کا سوال تو میرا خیال ہے کہ میں پہلے بھی آپ کو اپنی رائے سے مطلع کر چکی ہوں۔“
 ”اُس وقت میں نے نادرہ کو اپنی نگاہوں سے پرکھا تھا۔“ سمیرا خاتون نے ٹھوس لہجے میں کہ
 ”اب راحیل کی ماں کی حیثیت سے ایک بہو کے انتخاب کا مسئلہ درپیش ہے۔“

”کیا نادرہ خدا نخواستہ آپ کے انتخاب پر پوری نہیں اُتری؟“
 ”مجھے اُس کی ضرورت سے زیادہ آزادی ناپسند ہے..... لباس اور گفتار کے اعتبار سے بھی اُس
 جب تہذیب کا دامن تھام رکھا ہے وہ بھی میری نظروں میں معیوب ہے لیکن..... راحیل کا خیال ہے
 شادی کے بعد وہ اپنی روش تبدیل کر لے گی۔“

”کیا راحیل نے نادرہ سے شادی کا فیصلہ کر لیا ہے؟“ شاملہ بیگم نے دلی زبان میں دریافت
 پھر سمیرا خاتون کو کم صم پا کر جلدی سے بولیں۔ ”میں نے نادیہ کی زبانی کچھ بھٹک سنی تھی۔“
 ”آپ کی اطلاع درست ہے۔“ سمیرا خاتون نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”راحیل مجھے ا
 ارادے سے مطلع کر چکے ہیں، میری آمد کا مقصد یہی ہے کہ کوئی حتیٰ فیصلہ نہ کروں۔“

”پھر..... کیا سوچا ہے آپ نے؟“
 ”مجھے آپ کا مشورہ درکار ہے۔ نادیہ اور نادرہ کے درمیان گہرا ربط ہے، اس لئے آپ لوگوں نے میر
 مقابلے میں نادرہ کو زیادہ قریب سے دیکھا ہوگا۔ کیا آپ راحیل کے سلسلے میں نادرہ کے حق میں ہیں؟“
 شاملہ بیگم نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا، چند ثنائے کچھ سوچتی رہیں پھر سنبھل کر بولیں۔ ”آ

نے میرے اوپر بہت بڑی ذمہ داری ڈال دی ہے، سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا جواب دوں۔“
 ”میں کرنل عابد کو اپنی آمد سے مطلع کر چکی ہوں..... کل اُنہوں نے مجھے اپنے دولت خانے پڑا
 ہے، میرے پاس جو مختصر وقت ہے اُسی میں مجھے آخری فیصلہ کرنا ہے..... یہ بھی محسوس گزار کر دوں
 میرے فیصلے کا انحصار آپ کے مشورے پر ہوگا۔“

”آپ تو میرے ہاتھ پیر پھلائے دے رہی ہیں۔“ شاملہ بیگم مسکرا کر بولیں۔ ”آخر اتنی جلدی کہ

”؟“
 ”میرا خیال ہے کہ جب تک یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا، راحیل پوری یکسوئی سے اپنی تعلیم پر توجہ نہیں
 دے گا۔“

”میں سمجھ رہی ہوں لیکن.....“
 ”میں آپ کی اُجھن بھی محسوس کر رہی ہوں.....“ سمیرا خاتون نے کہا۔ ”شادی بیاہ کے معاملے
 فریق کی ذمہ داری نہیں لی جاسکتی، آج جو شے بظاہر کندہ نظر آرہی ہے کل وہی مٹی بھی ثابت
 ہے..... میرا خیال ہے کہ یہ سب تقدیر کے کھیل ہوتے ہیں..... ایک ایسا جو انسان کی قسمت
 دے سکتا ہے اور تباہی کے راستے پر بھی ڈال سکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود انسان اپنی سی کوشش
 کرتا ہے..... آگے جو اُس کے نصیب میں لکھا ہے اُسے ہر حال میں بھگتنا پڑتا ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ نادرہ کے سلسلے میں آپ کا انتخاب نامناسب نہیں ہوگا۔“ شاملہ بیگم نے تھوڑے
 کے بعد کہنا شروع کیا۔ ”میرے آگے بھی بیٹیاں موجود ہیں اس لئے میں کسی دوسرے کی بیٹی
 ے میں کوئی غلط بیانی کر کے اپنی عاقبت خراب نہیں کروں گی..... جہاں تک نادرہ کی آزادی کا
 ہے تو یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ اُس کی پرورش مغربی انداز میں ہوتی ہے لیکن اس میں نادرہ
 ، اُن حالات کا دخل ہے جنہوں نے اُسے ایسی روش اختیار کرنے پر مجبور کر دیا..... ماں کا سایہ سر
 ہ جانے کے بعد اُس کی پرورش کی ذمہ داری بھی کرنل عابد پر آ پڑی..... کرنل صاحب چونکہ
 سے آزاد خیال تھے اس لئے اُنہوں نے بیٹی کو بھی اسی رنگ میں رنگنا چاہا..... اس سلسلے میں کرنل
 کو بھی قصور وار نہیں ٹھہرایا جاسکتا..... ماں اور باپ میں بڑا فرق ہوتا ہے..... مرد صرف بیرونی
 بولوں کو بہتر طور پر سنبھال سکتا ہے، بچوں کی پرورش کی ذمہ داری ماں کی ہوتی ہے اور خاص طور پر
 کے لئے ماں کی موجودگی اشد ضروری ہوتی ہے..... میں نے نادرہ کو بہت قریب سے دیکھا
 ن نے مغربی تہذیب میں پرورش ضرور پائی ہے لیکن اُس شرم و حیا کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا جو
 کا خاصہ سمجھا جاتا ہے، وہ بڑوں کا ادب اور چھوٹوں کا لحاظ کرنا جانتی ہے، کوئی بات پیار اور محبت
 بھائی جانے تو جانور بھی اشاروں پر چلنے لگتا ہے..... نادرہ تو پھر ایک مہذب گھرانے کا روشن
 ہے..... مجھے قوی اُمید ہے کہ اگر آپ نے ماں بن کر شفقت اور پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ رکھا
 پ کو مایوس نہیں کرے گی۔“

”گویا آپ راحیل اور نادرہ کی شادی کے حق میں فیصلہ دے رہی ہیں۔“
 ”آپ ماں ہیں اس لئے اولاد کے بھلے اور برے کو مجھ سے زیادہ بہتر سمجھ سکتی ہیں۔ مگر میرا خیال
 یہ شادی بے جواز ثابت نہیں ہوگی۔“ شاملہ بیگم نے کہا۔ ”نادرہ کے معاملے میں چونکہ راحیل کی
 گما دخل ہے اس لئے یہ رشتہ ہر اعتبار سے مناسب رہے گا۔“

”آپ نے میرے سر سے ایک بوجھ اتار دیا.....“ سمیرا خاتون بولیں۔ ”میرا ذاتی خیال بھی یہی
 والدین کو بلاوجہ بچوں کی خوشیوں کے درمیان دیوار بن کر حائل نہیں ہونا چاہئے..... اس قسم کی
 ت کا انجام کبھی کبھی زندگی کا روگ بھی بن جاتا ہے۔“

”ایک بات پوچھوں اگر ناگوار خاطر نہ گزرے؟“
 ”ضرور پوچھیے.....“
 ”آپ نے پہلی نظر میں نادرہ کے انتخاب سے گریز کیوں کیا تھا؟“

ایت خوبصورتی سے ثنا اور احمر کے درمیان غلط فہمی کی ایک دیوار کھڑی کر دی تھی۔ احمر کے دل میں بہم کی طرف سے ایسی گرہ ڈال دی تھی جو اُن کے خیال میں کھٹنی ناممکن تھی لیکن اُن کا یہ اندازہ غلط ہوا کہ وقت کے ساتھ ساتھ احمر کے دل میں ثنا کے پیار کا جذبہ ماند پڑ جائے گا۔ انہیں کراچی کے تین ماہ گزر چکے تھے، اس عرصے میں انہوں نے احمر کے ہونٹوں پر بھیجی بھولے سے ایک بار لراہٹ نہیں دیکھی..... منے کی یہی خاموشی اور اداسی انہیں ہر وقت بے چین رکھ رہی تھی۔

نرنے ماں سے کوئی شکوہ، کوئی شکایت بھی نہیں کی شاید اس لئے کہ شاملہ بیگم کے سامنے ہاتھ پھیلا کر کی بھیک نہیں مانگنا چاہتے تھے، چچا اور چچی کے مقابلے میں وہ ماں کی سبکی بھی پسند کرنے کو تیار تھے۔ انہی مصلحتوں کے پیش نظر انہوں نے ایک بار بھی ماں کے سامنے ثنا کا ذکر نہیں چھیڑا، لیکن باپ سے ایک لمحے کو غافل بھی نہیں ہوئے..... اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، ہر لمحہ، ہر بل انہیں ثنا کا لائق رہتا۔

نر کا خیال تھا کہ شاملہ بیگم تصور ہے، اُن کی طرح وہ بھی حالات کا شکار ہوئی ہے، اُس نے بھی ماں ملوں کے آگے سر تسلیم خم کر دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ ثنا کے معصوم تصور کو اپنے سینے کی اتھارہ ہوں میں چھپائے ہوئے تھے..... ایک انمول خزانے کی طرح..... ایسی یاد کی مانند جو اُن کی زندگی میں..... خوشبو کی طرح..... جس کی بھینٹی بھینٹی مہک نے اُن کے وجود کو اپنے حصار میں لے رکھا اور..... یہی خوشبو اُن کے جینے کا سہارا بن گئی تھی۔

نرنے طے کر لیا تھا کہ ثنا کی محبت پر کسی اور کا قبضہ نہیں ہونے دیں گے۔ وقت کے بے رحم ہاتھوں نے اسے ناسر ضرور چھین لی تھی لیکن اُس کی محبت پر کسی کا زور نہیں چل سکا تھا، اسی محبت کو وہ سینے سے زندگی کے سفر پر قدم بڑھا رہے تھے..... ایسے مسافر کی طرح جس کو اپنی منزل کا پتہ نہیں تھا، جس در راہ سے کترا کر گزرنے کی کوشش نہیں کی تھی، پوری ثابت قدمی سے رواں دواں تھا لیکن کم صم، ما خاموش اور اداس اداس..... یوں جیسے اُسے زندگی کے ہنگاموں سے کوئی دلچسپی، کوئی سروکار نہ جیسے اُس نے مسکراہٹوں کو اپنے لبوں تک آنے سے روک دیا ہو..... قہقہوں کو دل کی گہرائیوں ن کر لیا ہو..... ہر بات سے بے نیاز ہو گیا ہو..... صرف جینے کی خاطر جینے جا رہا تھا۔

نر احمر کی اسی کیفیت نے فوزیہ خاتون کی ممتا کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ ثنا کے سلسلے میں کراچی میں لہ کر آئی تھیں اُس کی جانب پلٹ کر دیکھنا یا نظر ثانی کرنا اُن کے اصول اور انا کے خلاف تھا۔ لیکن نے بیٹے کی حالت بھی نہیں دیکھی جاتی تھی..... انہیں خوف تھا کہ اگر احمر نے اپنی روش نہ بدلی، ثنا کی لپا سے کھرچ کر علیحدہ نہ کیا تو وہ اپنی زندگی کو کوئی روگ لگا بیٹھیں گے۔

بچی اُن کے دل میں ممتا کا جذبہ غالب آتا تو وہ سوچیں کہ اولاد کی معصوم محبت کو اپنے قدموں تلے رانہوں نے اچھا نہیں کیا، ثنا کو احمر کی زندگی سے دور کر کے انہوں نے اپنے گھر کی خوشبو کو ٹھکرا بل مجبور و بے کس لڑکی کے مستقبل کو طوفان کی شدتوں سے دوچار کر کے انہوں نے کوئی کارنامہ نکل دیا تھا..... وہ جاہلیں تو وقت کے دھاروں کو دوبارہ ماضی کی سمت پلٹ سکتی تھیں، اولاد کی لہ کو دوبارہ حاصل کر سکتی تھیں، انہیں یقین تھا کہ شاملہ بیگم اُن کے فیصلے کی تبدیلی کو خوشی خوشی منظور مانی۔ لیکن جب ثنا کے ساتھ اُس کے باپ کا تصور اُن کی نگاہوں کے سامنے آ بھڑتا تو فوزیہ خاتون لڑکی عورت کی انا بیدار ہو جاتی..... اُن کی پیشانی پر آڑی ترچھی اُن گنت شکنیں ابھرتیں، چہرے لڑکی کے تاثرات بیدار ہونے لگتے۔ وہ ثنا کو قبول کر سکتی تھیں لیکن اقبال احمد کے نام کو اُس کے وجود

”میں عرض کر چکی ہوں کہ اُس وقت میں نے نادرہ کو راحیل کی ماں کی حیثیت سے نہیں اپنی نظر سے دیکھا تھا۔“ سمیرا خاتون نے سپاٹ آواز میں جواب دیا۔ ”ہو سکتا ہے زندگی کے سخت تجربوں مجھے ضرورت سے زیادہ محتاط بنا دیا ہو۔ لیکن یہی تجربے اکثر عملی زندگی میں بے حد کارآمد ثابت ہو ہیں..... راحیل میری اکلوتی اولاد ہے۔ میں اُسے ہر حال میں پھولتا پھلتا دیکھنا چاہتی ہوں۔“

”میرا مشورہ ہے کہ آپ خدا کا نام لے کر قدم آگے بڑھائیں۔ نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہئے“

”میری ایک درخواست اور بھی ہے۔“ سمیرا خاتون نے کہا۔ ”کل آپ کو میرے ہمراہ کرنل عابد دولت خانے تک جانے کی زحمت اٹھانا پڑے گی..... میری خوشی اور راحیل کے بہتر مستقبل کی خاطر۔“

”اگر یہ آپ کا حکم ہے تو بھلا مجھے کیا انکار ہو سکتا ہے؟“

خاصی دیر تک دونوں خواتین کے درمیان راحیل اور نادرہ کے رشتے کی باتیں ہوتی رہیں، پھر خاتون نے جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو شاملہ بیگم نے کہا۔ ”یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ بغیر ناشہ واپس چلی جائیں۔ اور اس وقت تو میں آپ کو منہ میٹھا کئے بغیر بھی نہ جانے دوں گی۔“

”بات راحیل کی طے ہوئی ہے اس لئے قاعدے سے یہ میرا فرض ہے کہ میں آپ کا منہ میٹھا کر اؤں“

”کیوں..... کیا راحیل پر میرا کوئی حق نہیں؟“ شاملہ بیگم نے کچھ ایسے انداز سے اپنائیت کا اظہار کہ سمیرا خاتون لا جواب ہو گئیں۔ شاملہ بیگم انہیں اپنے ساتھ اندر لے آئیں جہاں نادیا اور نوشاہہ مل جل کر پہلے ہی سے پر تکلف ناشتے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ تھوڑی سی دیر میں وہ دونوں اس قدر تکلف ہو گئی تھیں جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔

ناشتے کے دوران نادیا اور نوشاہہ کو نادرہ اور راحیل کے بارے میں سمیرا خاتون کے حتی فیصلے ہوا تو اُن دونوں نے بھی دل کھول کر مبارکباد دی۔ فرحان نے بڑی سنجیدگی سے سمیرا خاتون دریافت کیا۔ ”آئی..... کیا راحیل بھائی بچ چکے کے ڈلہا ہیں گے؟“

”کیوں.....“ سمیرا خاتون کی بجائے شاملہ بیگم نے پوچھا۔ ”تمہیں یقین نہیں آ رہا.....؟“

”پھر تو آتش بازی بھی ضرور چھوٹے گی۔“ فرحان نے کہا۔

”تم تو اس طرح کہہ رہے ہو جیسے پہلے کوئی شادی دیکھی ہی نہیں۔“ صائمہ نے فرحان کو جھجھک کر خاطر کہا۔

”راحیل بھائی کی شادی کی بات کچھ اور ہوگی۔“ فرحان نے نادیا کو دیکھتے ہوئے شرارت بھر انداز میں کہا۔ ”کیوں باجی..... میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟“

”ابھی سے کوئی شرارت سوچ رہی ہے۔“ نادیا نے مسکرا کر جواب دیا تو سمیرا خاتون بول پڑیں۔

”آپ کو شرارت کا موقع کب ملے گا..... آپ تو راحیل بھائی کے شہ بالا بنے ہوں گے۔“

”شہ بالا.....“ فرحان نے معصومیت سے دریافت کیا۔ ”یہ کیا ہوتا ہے.....؟“

”ڈلہا کے ساتھ جو بچ ہوتی ہے اُسے کہتے ہیں۔“ صائمہ نے شوفی سے جواب دیا۔

”لیکن بچ تو مونث ہوتی ہے.....“ فرحان نے برجستہ کہا تو سب اُس کی ذہانت پر بے اختیار پڑے۔



فوزیہ خاتون صرف ایک خاندانی عورت ہی نہیں..... ایک ماں بھی تھیں۔ کراچی سے واپسی کے سے وہ احمر کے رنگ و دھنک کا بخوبی جائزہ لے رہی تھیں، اپنے خاندانی وقار کو بلند رکھنے کی خاطر

”میں..... اب بھی نہیں سمجھا۔“ احمر نے ماں کی طرف وضاحت طلب نظروں سے دیکھا، فوزیہ
 ذہن کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔
 ”میرا اشارہ شا کی طرف ہے.....“ فوزیہ خاتون نے پہلو بدل کر کہا۔
 ”امی جان..... میں نے آپ کے فیصلے پر کوئی احتجاج نہیں کیا لیکن.....“
 ”لیکن میں دیکھ رہی ہوں کہ اُس کی یاد چھپیں اندر ہی اندر چھن کی طرح چاٹ رہی ہے..... شاید
 مالے کہ تم اس کی حقیقت سے لاعلم ہو..... یہ نہیں جانتے کہ شا کی اصلیت کیا ہے.....؟“ فوزیہ
 ان کے صبر کا پیمانہ چھلک اٹھا۔
 ”امی جان.....“ احمر نے تڑپ کر کہا پھر اٹھ کھڑے ہوئے، جانے کے لئے قدم بڑھائے تو فوزیہ
 ان کا لہجہ شکسانہ ہو گیا۔

”زک جاؤ احمر.....!“ احمر کے بڑھتے ہوئے قدم تھم گئے۔
 ”میں تمہیں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ تم جسے ایک انمول ہیرا سمجھ کر اپنی انگوٹھی میں سجانا چاہتے ہو، وہ
 اُج کے ایک معمولی نگوڑے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ لیکن آج تم نے مجھے زبان کھولنے پر مجبور کر دیا
 ہے۔“ فوزیہ خاتون نے حقارت بھرے لہجے میں کہا۔ ”کیا تم کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ شائلہ بیگم شا کی
 نانہیں ہیں.....“

احمر نے پلٹ کر ماں کو حیرت سے دیکھا، انہیں اپنی قوت سماعت پر شبہ ہو رہا تھا۔
 ”وقار احمد نے شا کے مستقبل کو تحفظ دینے کی خاطر اُسے محض باپ کا ایک عارضی سہارا فراہم کیا
 ہے..... وہ شا کے والد نہیں ہیں۔“

”پھر..... شا کون ہے؟“ احمر نے خود کو سنہا لے ہوئے دریافت کیا۔
 ”ایک ایسے بد چلن اور بد کردار باپ کی بیٹی جس کا کوئی پہ کوئی نشان نہیں۔“
 ”اور آپ نے پھر بھی شا کو میری زندگی کا ہم سفر بنانا چاہا..... آخر کیوں؟“
 ”میں نے شائلہ سے تمہارے لئے شا کا نہیں..... نادیدہ کارشتہ مانگا تھا اس لئے کہ وہی شائلہ کی بڑی
 نانہیں ہے۔“

احمر نے ماں کے چہرے کو بہت غور سے دیکھا، جواب میں پلٹ کر کچھ کہنا چاہا لیکن ماں کے تقدس
 خیال کر کے ارادہ ترک کر دیا..... تیزی سے پلٹے اور لمبے لمبے قدم اٹھاتے باہر نکل گئے.....!!



سے علیحدہ کرنے کے بعد..... لیکن یہ نامکن تھا اور اسی موڑ پر آکر وہ کٹکٹش کا شکار ہو جاتیں۔
 اس وقت بھی وہ برآمدے میں بیٹھی انہی پہلوؤں پر غور کر رہی تھیں جب احمر کے قدموں کی مار
 آواز نے انہیں چونکا دیا۔ فوزیہ خاتون نے نظریں اٹھا کر دیکھا، احمر گردن جھکائے اپنے کمرے
 سمت جا رہے تھے۔ اتنے اُداس اور فکر مند دکھائی دے رہے تھے جیسے دنیا کے تمام دکھوں کو اپنے
 میں سمو کر زندہ رہنے کی ٹھان رکھی ہو..... فوزیہ خاتون کی ممتا کو اولاد کے چہرے کی ویرانی دیکھ کر اُج
 تھیں سی لگی..... انہوں نے آواز دی تو احمر کے بڑھتے ہوئے قدم رُک گئے، پلٹ کر ماں کی طرف
 دیکھا، کچھ کہے بغیر قدم اٹھاتے فوزیہ خاتون کے قریب آکر بیٹھ گئے..... تھکے تھکے سے..... جیسے
 دُور کی مسافت طے کر کے آئے ہوں۔

”کہاں سے آرہے ہو.....؟“
 ”کچھ ضروری سامان کی بنگلہ کرانے کی غرض سے بندرگاہ کی طرف گیا تھا۔“
 ”تمہاری طبیعت تو خدا نخواستہ خراب نہیں ہے؟“
 ”جی نہیں.....“
 ”خاموش خاموش سے کیوں ہو.....؟“ فوزیہ خاتون نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔ ”کوئی پر
 لاحق ہے؟“

”خدا کا دیا سب کچھ تو ہے..... پھر پریشانی کس بات کی۔“ احمر نے دبی زبان میں جواب دیا۔
 ”ایک چیز کی کمی ہے۔“ فوزیہ خاتون نے کچھ سوچ کر کہا۔
 ”وہ کیا.....؟“ احمر نے ساٹ آواز میں دریافت کیا۔
 ”ایک چاندی ہو..... ایک مخصوص سی ڈھلن جو میرے گھر کے آگن میں اُجالے بکھیر سکے۔ اگر تم
 ”مجھے افسوس ہے.....“ احمر نے بڑے جذباتی انداز میں ماں کا جملہ کاٹنے ہوئے کہا۔ ”میں
 بھی عرض کر چکا ہوں کہ فی الحال اس موضوع پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتا.....“
 ”کیوں..... کوئی خاص وجہ.....؟“

”ابھی میں نے اس سلسلے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا۔“ احمر نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔ چہرہ
 اُلجھ کے تاثرات پھیل کر اور گہرے ہونے شروع ہو گئے۔
 ”فیصلہ نہیں کیا..... پا کر نا نہیں چاہتے؟“ فوزیہ خاتون کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ احمر خاموش
 زمین کو تنہا رہے..... کوئی جواب نہیں دیا۔ ”کیا سوچ رہے ہو.....؟“
 ”کچھ بھی نہیں.....“ احمر کے لہجے میں درد ہی درد تھا۔

”میں جانتی ہوں کہ تمہاری اُبھن کا سبب کیا ہے.....“ احمر نے خاموشی برقرار رکھی۔ ”تم نے
 اعصاب پر جو ہند طاری کر رکھی ہے میں اُسے حماقت کا نام دوں گی۔“ احمر کے دل کو دھچکا لگا.....
 کی بات کا جواب دینے کی بجائے ہونٹ کاٹنے لگے۔ ”سراب کے پیچھے بھاگنے سے پیاس کی شد
 نہیں ہوتی..... اور بڑھ جاتی ہے۔“ فوزیہ خاتون نے احمر کی خاموشی سے اُلجھتے ہوئے تلملا کر
 ”قریب کو زندگی کا نام تو نہیں دیا جاسکتا.....“

”میں..... آپ کی گفتگو کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔“ احمر نے آہستہ سے احتجاج کیا۔
 ”جس دن میری بات کا مطلب تمہاری سمجھ میں آگیا، اُس دن سے تم اپنے ماضی سے کرا
 کرنے لگو گے..... حقیقت بڑی تلخ ہوتی ہے، تم شاید اس کی کڑواہٹ برداشت نہ کر سکو۔“

ہسپتال میں بستر پر لیٹی وہ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچتی رہتی..... ساری ساری رات پکوں زار دیتی..... خود اپنی تنگ دامنی پر چپکے چپکے آنسو بہاتی رہتی..... کروٹیں بدلتی رہتی..... سسکتی رہتی..... قدرت کو رحم آجاتا تو نیند دے قدموں آگے بڑھ کر اُس کے معصوم وجود کو اپنی آغوش میں سمیٹ دیتا۔ تھپک کر دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیتی..... لیکن یہ بے خبری بڑی مختصر، بڑی ناپائیدار ہوتی۔ آج جب اُس کی آنکھ کھلتی تو دوسرے پھر رُوح کو ڈسنے کی خاطر اُس کے ارد گرد منڈلانے لگتے۔ اُن کے اُسے صحت مند ہونے کا مژدہ سناتے تو وہ سہم کر اُن کا چہرہ دیکھنے لگتی..... دل ہی دل میں ہانکنا شروع کر دیتی کہ اُس کی بیماری کبھی ختم نہ ہو..... اور زندگی کے اس اہم اور پُر پیچ دورا ہے فیئر شیرازی نے اُس کے وجود کو سہارا دیا تو زندگی کی تمنا ایک بار پھر تڑپ کر پوری شدت سے ہو گئی..... یوں جیسے ڈوہتے کو تھکے کا سہارا مل گیا۔

گھر سے ہوش متعل ہونے کے بعد اُسے یوں لگا جیسے اُس نے دنیا میں نئے سرے سے جنم لیا ہو، زندگی کے ہنگاموں میں کوئی اُس کا ساتھی..... کوئی ہم سفر نہ ہو..... لیکن اُس نے بڑی ہمت اور سہ سے کام لیا، مستقبل کو سنوارنے کی خاطر حال کے سامنے سینہ سپر ہو گئی..... ماضی کی تینوں کو لپ کرنے کی خاطر اُس نے خود کو موتی موتی کتابوں تلے دبا دیا..... ہر بات سے بے نیاز ہو کر لمبی مشاغل میں مصروف ہو گئی۔

وہل میں آنے کے بعد اُس نے بہت جلد خود کو وہاں کے ماحول کے سانچوں میں ڈھال لیا، میں مقیم لڑکیاں اُس کے اخلاق اور رکھ رکھاؤ کے سبب اُس کی گرویدہ بنتی گئیں، وہ سب سے مسکرا لڑکیاں خندہ پیشانی سے پیش آتی..... لیکن ہر لمحہ خود کو لئے دیئے رہتی۔ اس حصار سے باہر نکلنے کی ہمت نہ کرتی جسے اُس نے اپنی زندگی کے گرد بڑی مضبوطی سے قائم کر لیا تھا۔

گھر سے کوئی ملنے کے لئے آتا تو وہ بڑے تپاک سے ملتی، سب کی خیریت دریافت کرتی، کسی کو ت کا مطلق احساس نہ ہونے دیتی کہ اُس نے ایک نئی دنیا بنانے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے..... شروع میں اُسے ٹھنک کا احساس ہوا، نئی ڈگر پر قدم جماتے ہوئے وہ کئی بار لڑکھائی، پھر آہستہ آہستہ مانگی..... اور اب تو وہ زندگی کے ساتھ ایک جھجھکوتہ کر لینے کے بعد ان باتوں کی عادی بنی ہو گئی تھی۔ لی اُسے ماں کی مٹا کا خیال آتا تو اُس کی پلکیں نمناک ہو جاتیں..... جب بھی شائد بیگم اُس سے نمٹنا کی رُوح کے اندر سوئی ہوئی وہ معصوم بچی تڑپ کر بیدار ہو جاتی جو ماں کے پیار سے ہمیشہ اری..... اُس کی آغوش کی گرمی بھی محسوس نہ کر سکتی..... مٹا کے ان جذبول کو قریب سے دیکھنے رام رہی جو اولاد کے لئے قارون کے خزانے سے زیادہ انمول، مقدس اور پاکیزہ ہوتے ہیں..... اجنت کو ہاتھ بھی نہ لگا سکی جو ماں کے قدموں تلے موجود تھی..... اُس کے بہت قریب ہونے کے بہت دور ہو گئی تھی..... وہ اگر چاہتی تو ان فاصلوں کو گھٹا سکتی تھی..... مٹا سکتی تھی..... اس سحر کو توڑ ماں اور بیٹی کے درمیان حالات نے پیدا کر دیئے تھے..... لیکن شائد اس طلسم کو توڑنے کی کوشش میں کی..... اس لئے کہ وہ ان حالات سے ناواقف تھی جس نے مقدس رشتوں کے درمیان حد کی دیوار کھڑی کر دی تھی..... وہ اس راز کے بھرم کو برقرار رکھنا چاہتی تھی جس نے اُسے ماں کی ماسے دور کر دیا تھا..... اس لئے کہ اس سحر کی آڑ میں ماں کی خوشیوں کا مسئلہ درپیش تھا..... طلسم ٹ جاتا تو شاید قیامت آ جاتی..... رشتوں کا شیرازہ منتشر ہوتا تو کون جانے کس پر کیا گزرتی..... یسے طوفان اٹھ کھڑے ہوتے..... کیسے کیسے نشین جل کر راکھ ہو جاتے.....

آخری پرچہ دینے کے بعد اُس نے امتحان ہال سے قدم باہر رکھا تو پروفیسر شیرازی کو سامنے دیکھ ششدر رہ گئی۔ وہ ایک ساتھی پیکچرار کے ساتھ کھڑے باتیں کر رہے تھے، ایک لمحے کو اُس کے ذہن میں خیال ابھرا کہ شاید پروفیسر شیرازی اُسی کے منتظر ہوں لیکن پھر اُس نے اپنا خیال رد کر دیا، خوشی ایک کرن جو اُس کے معصوم ذہن میں ابھری تھی ٹھناتے دیئے کی مانند بجھ گئی۔ لمحے بھر کو اُس نے جذبات میں جو پھل پچی تھی وہ پل بھر میں دم گھٹ کر اپنی موت آپ مر گئی۔

پروفیسر شیرازی اُس کے حسن تھے جنہوں نے زندگی کے ایک اہم موڑ پر اُس کی مدد کی تھی..... لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ انہیں اس کے علاوہ کوئی دوسرا عزیز نہیں تھا۔ کالج کے نہ جانے کتنے لڑکے اور لڑکیاں ہر وقت اُن کے گرد منڈلاتے رہتے۔ وہ سب سے بڑی اپنائیت، نہایت خلوص اور محبت بھر۔ انداز میں پیش آتے، اُن کے گفتگو کے انداز میں کچھ ایسی ہی مقناطیسی کشش تھی کہ ہر فرد بڑی جلد اُن کا گرویدہ ہو جاتا۔ ہر لڑکا یہی خیال کرتا کہ پروفیسر شیرازی اُس کے لئے اپنے دل میں ایک خام جگہ، ایک خاص مقام رکھتے ہیں..... ہر لڑکی اُن سے جھک کر ملتی، یوں احترام سے پیش آتی جیسے وہ کوئی غیر نہ ہوں، اُس کے اپنے ہوں۔

ثنا تو خاص طور پر اُن کی احسان مند تھی۔ پروفیسر شیرازی نے اُسے ایک ایسے ماحول سے چھٹا دلا یا تھا جو اُس کی ہنسی مسکرائی زندگی میں اچانک ایک بھیانک خواب بن کر ابھرا اور اُس کی رُوح چھلنی کر گیا تھا۔ اُس ماحول کی ٹھنک اُس کے وجود کو اندر ہی اندر ڈسنے لگی..... اجنبیت کے احساس۔ اُس کو خود اپنے آپ سے بیگانہ کر دیا..... اس احساس کی ناقابل برداشت شدتوں نے اُس کے اعصاب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا..... سب سے زیادہ بیماری نے اُس کا ساتھ دیا، بیہوشی کے لمحے اُس کے بہترین رفیق ثابت ہوئے، ہسپتال کے ماحول میں اُس کو پہلی بار ہوش آیا تو اُس نے بڑے سکون سانس لیا۔ لیکن مانوس اور دیکھے بھالے چروں پر غیریت کے لہراتے سائے اُسے پل پل ہراساں کرتے رہے..... کڑوی سیلی دواؤں اور رنگ برنگی گولیوں کو طلق سے نیچے اتارتے وقت ایک خیال صدائے بازگشت بن کر اُس کی رُوح کے سناٹوں میں گونجنے لگتا.....

ثنا..... وقت کی ایک ہی کروٹ نے تجھے زندگی کی سنگلاخ چٹانوں پر پھینک دیا..... وہ جو تیرا اپنے تھے..... پلک جھپکتے میں غیر ہو گئے..... خوشیوں کا تمام اثاثہ یوں چھن گیا جیسے تیرا ماضی محض ایک خواب تھا..... سراب..... جس کا طلسم ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گیا..... اور..... ابھی تو صرف ایک حقیقت پردہ چاک ہوا ہے..... کل جانے تجھے اور کیا کیا کچھ سننا پڑے گا..... وقت نئی کروٹ لے گا تو جانے کیا کیا حقائق بے نقاب ہوں گے..... کب تک تو عارضی خوشیوں کے سہارے اپنی زندگی کو فریب دینے رہے گی..... بھی تو زخم رستے رستے ناسور کی شکل اختیار کر لیں گے..... اُس وقت کیا ہوگا..... کیا تو تنہا ان طوفانوں کا مقابلہ کر سکے گی جو تجھے برباد کرنے کی خاطر اچانک اٹھ کھڑے ہوئے ہیں.....؟

نہیں..... نہیں..... نہیں.....!!!

اور تمہارے اوپر کیا ہوتی ہے؟“ ثنائی نے رُوحی سے سوال کیا۔
 مجھے تو اس بات کی خوشی ہے کہ امتحان کی اُنجھن سے نجات مل گئی۔“
 کیا مطلب.....؟“ نگار نے اُسے چھیڑا۔ ”کیا آگے پڑھنے کا ارادہ نہیں ہے..... میرا مطلب
 جی کے گھر والوں نے تمہارے حق میں فاضل اگزام کا اعلان کر دیا ہے؟“
 اسی بات کا تو روتا ہے.....“ رُوحی نے چڑنے کی بجائے لطف اندوز ہوتے ہوئے جواب دیا۔
 فاضل اگزام کے لئے تین چار سال اور انتظار کرنا پڑے گا۔“
 یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔“ ثنائی بولی۔ ”تعلیم مکمل کرنے سے پیشتر شادی بیاہ کی اُنجھنیں پڑھائی پر
 اڑھوئی ہیں۔“

پہلے میرا ذاتی خیال بھی یہی تھا۔ لیکن اب حالات کا تقاضہ میرے سامنے یہی تھیں کہ پرسوں جمانے
 ال بار بار پیش کر رہا ہے۔“ رُوحی نے سنجیدگی سے کہا تو نگار مسکرا دی۔
 اُنے تعجب سے دریافت کیا۔ ”میں کبھی نہیں..... اتنی جگت کس بات کی ہے؟“
 تم نہیں سمجھ سکو گی۔“ نگار نے سرد آہ بھر کر جواب دیا۔ ”جس کے دل پر گزرتی ہے وہی بہتر جانتا ہے۔“
 پھر بھی کیا بات ہے؟“ ثنائی بدستور سنجیدگی سے پوچھا۔ ”خدا خواست کوئی ایسی دینی بات تو نہیں ہے؟“
 ایسی بات تو خیر نہیں ہے، لیکن دینی کے بارے میں ضرور خدشہ لاحق ہے۔“ نگار نے معنی خیز
 میں رُوحی کو گھورتے ہوئے کہا تو ثنائی اُلجھ گئی۔

پہیلیاں کیوں بچھو رہی ہو..... کھل کر بتاؤ کہ قصہ کیا ہے؟“
 فی الحال نوبت ابھی قصے تک بھی نہیں پہنچی۔“ اس بار رُوحی نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔ ”رہا کہانی
 یہ تو وہ ابھی شروعات یا ابتدائی مرحلوں میں ہے اور تم بھی اس کہانی سے کچھ کچھ واقف ہو گی۔“
 ”میں.....“ ثنائی حیرت کا اظہار کیا۔ ”میں کسی کہانی سے واقف نہیں ہوں۔“

کیوں..... کیا تم نے تانیہ کو نہیں دیکھا؟“ رُوحی نے تیزی سے سوال کیا
 تانیہ..... وہ تو نہیں جو تھرڈ ایئر میں ہے؟“ ثنائی نے ذہن پر زور دے کر یاد کرتے ہوئے کہا۔
 ہاں مختلفہ کے ساتھ ملاقات ہوئی تھی..... لیکن تانیہ سے کسی کہانی کا کیا تعلق ہے.....؟“
 ”تم نہیں جانتیں.....“ نگار شوخی سے بولی۔ ”آج کل بقول رُوحی کے جی اور تانیہ ساتھ ساتھ
 جا رہے ہیں۔“

تو اس میں کہانی کا پہلو کہاں سے نکل آیا..... ہو سکتا ہے تانیہ اور جمشید ایک ہی گروپ میں ہوں۔“
 ”گروپ میں صرف جمشید ہی نہیں..... اور بھی لڑکے ہوں گے۔“ رُوحی بولی۔ ”لیکن تانیہ خاص
 جمشید کے ساتھ رہنا پسند کرتی ہے۔“

”تم نے جمشید سے بات کی اس سلسلے میں؟“ ثنائی نے رُوحی سے دریافت کیا
 ”اُسے کیا ضرورت ہے خود اپنے پیروں پر کھڑی ماری کی؟“ نگار نے جلدی سے کہا۔ ”یہ تو خدا
 پاتنی ہے کہ جی اور تانیہ کا سیکینڈل کھڑا ہو جائے تاکہ اس کی راہ صاف ہو جائے۔“
 ”کیا مطلب.....؟“ ثنائی نے پوچھا۔

”مطلب یہ کہ آج کل ہماری رُوحی بھی مولوی زبیر الدین کے ہاتھوں پر اسلام لانے کی کوشش کر
 رہی ہے۔“
 ”زبیر الدین.....“ ثنائی مسکراتے ہوئے کہا۔ ”زبیر وہی تو نہیں جو خشکی داڑھی اور شرعی پاجامے

اسی خیال سے ثنائی نے اپنے ہونٹ سی لئے تھے لیکن ایک تشنگی تھی جو اُسے ہر لمحہ بے چین کر
 رہی تھی..... ایک احساس تھا جو اُسے مضطرب کئے رہتا..... ایک سوال بار بار اُس کے ذہن کے پردوں
 تبدیل کی صورت اُبھر آتا..... اُس کا باپ کون تھا.....؟ کون تھا وہ مرد جس نے اپنی بیٹی..... اپنی بیوی
 کیسے فراموش کر دیا تھا.....؟ وہ اُس انسان سے ملنا چاہتی تھی..... اُسے تلاش کرنے کی آرزو مند تھی.....
 قریب سے دیکھنے کی خواہشمند تھی..... اور..... مل کر بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی.....!!

لیکن ثنائی نے ان خواہشات کو اپنے سینے کی اتھار گہرائیوں میں دفن کر لیا..... اس لئے کہ وہ اس
 وجود کو مستحکم کرنے کی خاطر اپنی تعلیم مکمل کرنا چاہتی تھی..... اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہتی تھی..... ڈاکٹر
 کر دوسروں کے ڈھکے دردور کرنا چاہتی تھی..... ایک نئے عزم کے ساتھ منزل کی تلاش کے حصول
 اُس کے لئے جو راستے وضع کر دیئے تھے وہ پوری ہمت کے ساتھ اُن پر رواں دواں تھی۔

وقت کی گردش نے جو قیمتی لمحے ضائع کر دیئے تھے ثنائی نے ہر اس لمحہ کو ہوش آئے
 بعد اُس نے اپنی تعلیم پر شب و روز توجہ دینا شروع کر دی۔ اُسے اپنی ذات پر اعتماد تھا۔ میڈیکل کا پہ
 امتحان اُس کی زندگی کا پہلا زینہ تھا، وہ اُس زینے سے سرفراز ہو کر گزرتا چاہتی تھی..... اُسے اس
 ارادے میں ناکامی نہیں ہوئی، اُس کا ہر پرچہ اُس کی توقعات سے کہیں زیادہ اچھا ہوا تھا۔ شاید
 سبب تھا کہ آج جب وہ آخری پرچہ دے کر امتحان ہال سے باہر نکلی تو خود کو بے حد ہلکا چھکا محسوس
 رہی تھی۔ جیسے ذہن سے کوئی وزنی بوجھ اُتر گیا ہو..... پروفیسر شیرازی کو سامنے دیکھ کر ایک لمحے کو پا
 بھولی بصری یادیں تازہ ہو گئیں..... جانے کیوں وہ جب بھی پروفیسر شیرازی کو دیکھتی، اپنائیت
 احساس بھرے بادلوں کی مانند سایہ بن کر اُس کے وجود پر چھانے لگتا، اُس کا دل چاہتا وہ پروفیسر
 جی بھر کر باتیں کرے، دنیا جہان کے مسئلوں پر گفتگو کرے..... لیکن اس گفتگو کے دوران کوئی دوس
 شریک نہ ہو..... کوئی دوسرا مداخلت نہ کرے..... اکثر وہ پروفیسر کو دوسرے طلباء اور طالبات کے ساتھ
 کھل مل کر باتیں کرتا دیکھتی تو ایک عجیب سا احساس اُس کے ذہن کو چوکے لگانے لگتا..... حد کا ما
 اُبھرنے لگتا..... اُس نے بہت سارے رشتوں کو کھو کر پروفیسر شیرازی کی محبت کو پایا تھا..... وہ اس
 شفقتوں سے محروم نہیں ہونا چاہتی تھی۔

اس وقت بھی وہ انہی احساسات میں مبتلا تھی جب نگار کی آواز سن کر یلکھت چوٹ اٹھی۔ نظریں
 کر دیکھا تو نگار اور رُوحی قدم بڑھاتی اُس کی جانب آ رہی تھیں۔ نگار اُس کی رُوم میٹ 100M
 (MATE) تھی، بے حد ذہین اور حاضر جواب لڑکی تھی، بڑے گھرانے سے وابستگی کے باوجود اس
 ہوشل میں مقیم تھی کہ تعلیم پر پوری توجہ دے سکے۔ ثنائی اور نگار کے خیالات اور طبیعتیں آپس میں بہت
 جلتی تھیں اس لئے دونوں ایک دوسرے کے ساتھ شیر و شکر ہو گئیں۔ رُوحی ان دونوں کی ہم جماعت
 ہونے کے علاوہ مشترکہ دوست تھی، کالج ہی کے ایک سینئر طالب علم جمشید سے اُس کی منگنی ہو چکی
 اس لئے دونوں کے چہرے بہت عام تھے۔

”کیا بات ہے ثنائی.....“ نگار نے قریب آتے ہوئے دریافت کیا۔ ”اس قدر چپ چاپ اور خاموش
 کیوں کھڑی ہو..... پرچہ کیا ہوا؟“

”خدا کا شکر ہے.....“ ثنائی نے کہا۔ ”تم سناؤ..... تمہارا پرچہ کیا رہا؟“
 ”فرسٹ کلاس۔“ نگار مسکراتے ہوئے بولی۔ ”دو سوال تو وہی آ گئے جو ہم نے رات کو یاد کئے تھے۔“
 باقی سوالات بھی غیر متوقع نہیں تھے۔“

وچتا ہے تو سوچتا رہے..... میں کوئی چوری چھپے تو جانیں رہی..... سب جانتے ہیں کہ جی میرا ہے۔“ رُوحی نے بے پروائی سے جواب دیا۔

لایا خیال ہے نا.....؟“ نگار نے کہا۔ ”مرغا کر دیا جائے حلال.....؟“

یہی تمہاری مرضی.....“

لایا مطلب..... تم ساتھ نہیں چلو گی؟“

”نہ تو معاف ہی رکھو پلیز!“ ثنائے کہا۔ ”آج کے دن میں صرف آرام کرنا چاہتی ہوں.....“

یز یوش (As You Wish)“ نگار نے جواب دیا۔ پھر رُوحی کے ساتھ قدم بڑھاتی کالج دروازے کی سمت چلی گئی۔

کچھ دیر یونہی گم سم کھڑی دونوں کو لکتی رہی..... رُوحی کے پارے میں سوچتی رہی جو جشید کے ملاقاتی، بڑے فخر سے سہیلیوں کے سامنے اُس کا تذکرہ کرتی..... دونوں کے درمیان بڑی اچھی جھگڑا تھا، دونوں ایک دوسرے کے مزاج کو سمجھتے تھے..... نگار کے علاوہ اکثر دوسری لڑکیاں بد اور تانیہ کے میل جول کے بارے میں رُوحی کو اُکسانے کی بار بار کوشش کر چکی تھیں لیکن رُوحی کو ایک کان سے سنتی تو دوسرے سے اُڑا دیتی..... اُسے جشید پر بے حد اعتماد تھا اور اسی اعتماد کا کہ دونوں ہنستے مسکراتے زندگی کا سفر طے کر رہے تھے۔

ساعت وہ رُوحی کی قسمت پر رشک کرتی رہی، پھر ہوسٹل جانے کے ارادے سے آگے بڑھی تو ٹیرازی سامنے آ گئے۔ ثنائے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ پروفیسر شیرازی کی نگاہوں میں راپنائیت دیکھ کر اُس کی رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کی گردش اور تیز ہو گئی..... چہرہ مسرتوں اُن سے دک اٹھا جیسے اچانک اُسے کوئی خزانہ مل گیا ہو۔

”اُس نے بڑے ادب سے پروفیسر شیرازی کو سلام کیا۔

یہی رہو..... تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔“

ر..... آپ.....“ اُس کی زبان لڑکھڑا گئی، پروفیسر کے جملے کی چاشنی محسوس کر کے اُس کا سر فخر لیا، بڑی عقیدت بھری نظروں سے پروفیسر کو دیکھنے لگی اور اسی شدت کے باعث مارے خوشی اُس کے حلق میں پھنس کر رہ گئے۔ وہ اپنی مسرت کا اظہار کرنا چاہتی تھی لیکن جانے کیوں نے اُس کا ساتھ نہیں دیا۔

”چہ کیا ہوا.....؟“ پروفیسر نے روایتی محبت سے دریافت کیا۔

”وہ دن سر..... سب آپ کی مہربانیوں کا نتیجہ ہے۔“ اُس نے خود کو سنبھالتے ہوئے بپے تلے جواب دیا۔

لویا تمہاری محنت رابگیاں نہیں گئی۔“

”ما کا کرم ہے سر.....“

”نیپے کے بارے میں کیا تخمینہ ہے تمہارا..... اول، دوئم یا سوئم؟“

اُن نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی ہے سر..... آگے جو قدرت کو منظور ہو.....“ وہ آہستہ سے بولی۔ ”اور ابھی تو پریکٹیکل کے مرحلے سے بھی گزر رہا ہے۔“

”یقین ہے کہ تم ہر مرحلے سے کامیاب گزر رہی گی۔“ پروفیسر شیرازی کے لہجے میں شفقت کوٹ بھری تھی۔

میں نظر آتے ہیں؟“

”ٹھیک سمجھیں تم.....“

”اے خبردار.....“ رُوحی نے نگار کو گھورتے ہوئے خشکی کا اظہار کیا۔ ”اب میں اتنی گئی گزری بھی نہیں کہ مولوی زبیر الدین کے ساتھ اپنی تقدیر پھوڑنے کی کوشش کروں گی..... سبھی جی اور زبیر کو ساتھ کھڑا کر کے دیکھو! کہاں راجہ بھوج اور کہاں لنگو تیلی۔ میں مذاق میں بھی کم از کم زبیر کے ساتھ اپنا نام سننا پسند نہیں کر سکتی۔“

”کیا جشید اور تانیہ والی بات سچ ہے؟“ ثنائے بڑی مصیبت سے نگار سے پوچھا۔

”ابھی تو خیر ایسی خطرے کی کوئی بات نہیں۔ لیکن جی بے چارہ سیدھا سادھا معصوم سال لڑکا ہے اور اُس کے مقابلہ میں تانیہ..... تم نے خود دیکھا نہیں کہ وہ ہر وقت کس قدر بنی سنوری رہتی ہے؟“

”خیال ہے تمہارا.....“ ثنائے رُوحی کی طرف داری کی۔ ”ہماری رُوحی اور تانیہ کا بھلا کیا مقابلہ؟“

”بات مقابلے کی نہیں، مرد ذات کی ہے۔“ نگار بولی۔ ”ہماری دادی اماں اکثر کہا کرتی ہیں کہ مرد ذات پر کبھی اعتبار نہیں کرنا چاہئے..... اُس کی طبیعت میں بقول دادی اماں کے نغیدہ پن زیادہ ہوتا ہے اس لئے ہر اچھی اور بھلی چیز پر اُس کی رال بھی بہت جلدی ٹپکنے لگتی ہے۔ ایسی صورت میں تانیہ.....“

”بس، خاموش.....“ رُوحی نے مصنوعی غصے کا اظہار کیا۔ ”آج کی تاریخ میں اس سے زیادہ مذاق کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔“

”گو یا یہ ساری باتیں مذاق میں ہو رہی تھیں؟“ ثنائے حیرت کا اظہار کیا۔

”اور مختصر کہ کیا خیال ہے.....“ رُوحی بولی۔ ”کیا میں ہاتھ پیر میں اتنی کمزور نظر آتی ہوں کہ تانیہ جیسی لڑکی کو اپنے سہاگ پر شرب خون راتا دیکھ کر خاموش رہوں گی؟“

”تو یہ ہے رُوحی!“ ثنائے اُسے ٹوکا۔ ”تم نے ابھی سے اتنی بڑی بڑی باتیں کہاں سے سیکھ لی ہیں؟“

”پھر کسی وقت اطمینان سے بتاؤں گی۔“ رُوحی نے کہا۔ ”یہ بتاؤ! اس وقت تمہارا پروگرام کیا ہے؟“

”آج امتحان سے فراغت ملی ہے اس لئے آج آرام کا ارادہ ہے۔“ ثنائے جواب دیا۔

”کیا بھوک ہڑتال کا بھی ارادہ ہے.....؟“ نگار نے پوچھا۔

”یہ میں نے کب کہا.....؟“

”تو پھر ہمارے ساتھ چلو!“ نگار بولی۔ ”آج رُوحی ہمیں لُچ کی دعوت دے رہی ہے۔“

”سفید جھوٹ.....“ رُوحی نے کہا۔ ”دعوت میری طرف سے نہیں جشید کی طرف سے ہے۔“

”وہ تو تمہاری ہوگی..... ہم کس شمار تظار میں ہوں گے؟“ نازیر لب مسکراتے ہوئے بولی۔

”کباب میں ہڈی..... وہ بھی ایک چھوڑ، دو دو۔“ نگار نے رُوحی سے کہا۔ ”سوچ لو..... کہیں تمہارے جی کے پیسے ہماری وجہ سے ضائع نہ ہوں اور بعد میں وہ تم سے شکایت کریں۔“

”بکومت.....“ رُوحی نے نگار کو گھورا۔ ”کیا جی نے خود تم کو دعوت نہیں دی تھی؟“

”ہو سکتا ہے مردوتا کہہ دیا ہو.....“ نگار نے ثنائے اُچکائے تو رُوحی بولی۔

”اب زیادہ بخرے نہ دکھاؤ..... سیدھی طرح چلنا ہے تو چلو ورنہ مجھے اجازت دو۔“

”ایسی بھی کیا بے صبری.....؟“

”کیوں نہ ہو.....؟ وہ بے چارہ باہر گاڑی میں بیٹھا میرے انتظار میں سوکھ رہا ہوگا۔“

”آہستہ بولو پلیز.....“ ثنائے رُوحی کو ٹوکا۔ ”کوئی سے گا تو کیا سوچے گا؟“

ہاں کی شدت کو برداشت نہ کر سکے گا..... مر جائے گا۔ تو کیا یہ عقلمندی ہے کہ ہم اُسے ہوش میں پیش کریں.....؟ میں بنیادی طور پر ایک سرجن ہوں فلسفے کا ماہر نہیں۔ لیکن وقت اور حالات نے مجھے فلسفے کی ایجاد سے ضرور روشناس کرا دیا ہے..... میرے پاس دولت کی فراوانی ہاں تو تمام عمر بغیر ہاتھ پیر ہلائے سکون سے بیٹھ کر گزرا سکتا ہوں مگر میں بھی ایسا نہیں سوچتا، کہ میں جانتا ہوں کہ متحرک رہنا زندگی کی علامت ہے..... جمود کی کیفیت انسان کی ذہنی کو زنگ آلود کر دیتی ہے۔

خواہش ہے کہ تم بھی اپنی جدوجہد جاری رکھو..... آگے بڑھنے کے لئے انسان کو اکثر ہجوم
ن سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے، یہی وقت آزمائش کا ہوتا ہے..... تم اسے وقت کی کسوٹی بھی سمجھ
رشتے ناتوں کی کھوج میں کیا رکھا ہے..... اپنا وہی ہے جو وقت پر کام آجائے..... رہا خون کا
کبھی بھی بے رنگ نہیں ہوتا..... البتہ اُس کے رنگ آج اگر کرنے کے لئے وقت کا انتظار
ہے..... مگر وقت کے انتظار میں ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا بھی میرے اصول کے مطابق حماقت کی
..... تم اپنی راہ پر ڈٹی رہو..... پورے عزم، پوری ہمت اور اعتماد کے ساتھ..... یہی راستے
اکر کوئی ایسا موڑ بھی ضرور پیدا کر دیں گے جہاں خوشیاں وامن پھیلانے تمہاری منتظر ہوں گی۔
نے کے بعد اپنے اور پراپوں کی شناخت زیادہ آسان ہو جاتی ہے..... اور.....
تم میری باتیں سمجھ رہی ہو.....؟“

بہر نے اچانک سوال کیا تو وہ ایک لمحے کو گڑبڑا گئی، وہ پروفیسر کی باتوں کا مقصد سمجھ رہی تھی، مباحثات اور خون کے رنگ کے حوالوں سے وہ ان باتوں کی تہ تک پہنچ گئی تھی جو اُسے اور کنایوں میں سمجھائی جا رہی تھیں..... پروفیسر نے غالباً اُس کی زندگی کے راز کو پالیا تھا..... بڑی کے اصول کے تحت اُس کے زخموں پر نشتر لگا کر اُس ناسور کو تلاش کرنا چاہتے تھے جسے ثنا اپنی ذات تک محدود کر رکھا تھا..... اُس نے پروفیسر کی بات کا جواب دینے میں جلد بازی کا اہل کیا، نگاہوں نگاہوں میں انہیں تولتی رہی۔

..... یاد آیا۔“ پروفیسر نے اپنے سوال کے جواب کا انتظار کئے بغیر چوٹکتے ہوئے دریافت

بہر! کون ذات شریف ہیں.....؟“

..... وہ اور بولھا گئی۔ تیزی سے دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ ”احمر میرے تایا زاد ام ہے۔“

روبی میں قیام ہے غالباً.....؟“
 ماما جی ہاں.....“
 نوجوان وہی تو نہیں جس نے تمہاری بیماری کے دوران بلاوجہ شیوہ بنانا ترک کر دیا تھا.....؟“
 نے بزرگانہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا پھر سر ہلاتے ہوئے بولے۔ ”لڑکا ذہین ہونے کے
 تھوڑا اندیش بھی معلوم ہوتا ہے۔“
 ا..... میں سمجھی نہیں سر.....“ اُس نے ہمت کر کے وضاحت چاہی۔

نمر نے تمہارے نام میری معرفت ایک خط ارسال کیا ہے۔“ پروفیسر نے کوٹ کی جیب سے رنگ کا ایک لفافہ نکال کر ثنا کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اُسے شاید ہوشل میں تمہارے کا نام معلوم نہیں۔۔۔۔۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اُس نے مجھے بہت زیادہ قابل اعتماد سمجھ لیا ہو۔“

”آپ کی دُعائیں شامل حال رہیں تو ایسا ہی ہوگا.....“
”تمہیں ہوشل میں کسی قسم کی کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟“
”جی نہیں۔“

”میں نے جان بوجھ کر تمہیں نگار والے رُوم میں بیٹھ دلانے کی کوشش کی تھی..... نگار بڑی ذہین اور مہونہار بچی ہے، مجھے یقین ہے کہ تم دونوں کا ساتھ دونوں کے لئے مفید ثابت ہوگا۔“

”میں آپ کی احسان مند ہوں سر.....“ اس نے دبی زبان میں کہا۔ ”اگر آپ نے میری مدد نہ کرتی تو.....“

”بیڈ..... دیری بیڈ۔“ پروفیسر نے اُس کی بات رد کرتے ہوئے ٹھوس لہجہ اختیار کیا۔ ”میری ایک نصیحت ہمیشہ یاد رکھنا! ڈاکٹر کے لئے حساس ہونا اُس کی ناکامی کا سبب بن جاتا ہے۔ اُس کا کام دوسرور کی چارہ گری کرنا ہے۔ اگر وہ خود اپنا ڈکھڑا لے کر بیٹھ جائے تو مریضوں کی تیار داری کیا خاک کرے گا؟“

”آپ..... آپ ٹھیک کہتے ہیں سر!“ وہ سنبھل کر بولی۔

”میں چاہتا ہوں کہ تمہارا مستقبل شاندار ہو..... تم اسے میری خواہش بھی سمجھ سکتی ہو۔“

شانے کوئی جواب نہیں دیا، پروفیسر کے خلوص کو محسوس کرتی رہی۔

”تم شاید ہوشل جا رہی نہیں.....“

”جی ہاں.....“

”چلو..... کچھ دُور میں بھی تمہارا ساتھ دے سکتا ہوں۔“ پروفیسر نے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ چلے خاموش رہے پھر کھوئے کھوئے انداز میں بولے۔ ”وہ شے جو اذیت کا سبب ہو..... جس بارے میں سوچ کر ذہن پر یوجہ طاری ہو، اُسے بھول جانا عقلمندی کی بات ہے۔ خواہ وہ انسان کا ماضی ہی کیوں نہ ہو..... میری مثال لے لو! میری بیوی، میرا بیٹا..... دونوں مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ میں انہیں دوبارہ نہیں پا سکتا..... اُن کے بارے میں سوچ سکتا ہوں..... انہیں یاد کر سکتا ہوں، لیکن فائدہ..... ایسا کرنے سے میرے دُکھوں میں اضافہ ہوگا تو میں تم لوگوں کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتا گا..... اسی لئے میں نے ماضی کو بھلا کر اپنے حال میں مگن رہنے کی عادت ڈال لی ہے..... ارد گرد ماحول سے اپنے حصے کی خوشیاں تلاش کر کے اُن یادوں کو فراموش کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں جنہیں شاید میں ابھی نہ بھلا سکوں..... یہی بہلاوے انسان کو سہارا دیتے رہتے ہیں۔ ورنہ وہ ٹوٹ کر پھاڑے جاتے..... ریزہ ریزہ ہو جاتے۔“

جائے..... روبرو دروازہ ہو جائے.....
میں بے شمار لوگوں کو جانتا ہوں جو ہر وقت قہقہہ لگاتے رہتے ہیں..... ہر محفل میں اپنی خوش گفتار
کی وجہ سے مرکز نگاہ بن جاتے ہیں..... لیکن یہی لوگ اندر سے بڑے رنجیدہ اور ملول ہیں..... ان-
زخم بڑے گہرے اور مہلک ہیں..... ناسور کی مانند، جو اندر ہی اندر اپنی جڑیں مضبوط کر رہا ہوتا ہے
بڑے عظیم لوگ ہیں جو اپنے ذکھوں کو سینے میں سمیٹے ہونٹوں پر مسکراہٹیں سجائے رکھتے ہیں..... دوسر
کو اپنے ساتھ رنجیدہ کرنے کی کوشش نہیں کرتے..... اپنا بوجھ خود اپنے کندھوں پر اٹھانے کے عا
ہوتے ہیں..... یہ لوگ میرے نزدیک قابل فخر ہیں..... گریٹ..... گریٹ..... دیر کی گریٹ
تم نے کبھی کوئی ایسا شخص دیکھا ہے جو اپنے کسی عزیز کی قبر پر کھڑا پوانہ وار قہقہہ لگا رہا ہو
اُسے دیوانہ کہتے ہیں..... پاگل کے نام سے یاد کرتے ہیں لیکن وہ یہی نہیں سمجھتے کہ وہی دیوانگی اُس
زندگی کا راز ہے..... اُس کی حیات کی کلید ہے..... جس دن دیوانگی کا سرمایہ اُس کی ذات سے علیحدہ

رسوائی ہوگی.....
 میں یہ خط پروفیسر شیرازی کی معرفت لکھ رہا ہوں، اس یقین کے ساتھ کہ تم کہیں بھی ہو یہ تم تک
 نہ گا..... پروفیسر کی شخصیت ہمارے لئے انتہائی سہی لیکن اس پر اعتماد کرنے کو جی چاہتا ہے.....
 یں کی طرح.....!!

اطلاع اور ہے تمہارے لئے، امی جان میری شادی کے خواب دیکھ رہی ہیں..... میں یقین
 کہہ سکتا کہ اس خواب کی تعبیر کیا ہوگی البتہ اس بات کو سوچ کر ہنسی ضرور آتی ہے کہ جو کان اولاد
 کا نہ سن سکے..... جو دل بیٹے کی تڑپ پر دھڑک نہ سکا اُس پر شہنائیوں کی گونج کا کیا اثر ہوگا؟
 لوں کا کیا ہے، یہ ہر حال میں اپنی خوشبو بکھیرتے رہتے ہیں چاہے سہرے کی لڑکیوں میں پرو
 یں یا کسی تہرکی گلی کی مٹی پر بکھیر دیئے جائیں۔

پھر وہی شعر یاد آ رہا ہے جو ایک بار میں نے تمہاری ڈائری پر بڑے ارمانوں سے لکھا تھا
 جو ہو سکے تو مری روح میں سما جاؤ
 دل و نگاہ کے رشتے تو ٹوٹ جاتے ہیں

خبر تھی کہ یہی شعر میری زندگی کے لئے ایک تازیانہ ثابت ہوگا..... شاید اسی لئے کچھ لوگ یہ
 ہیں کہ خوابوں کی تعبیر ہمیشہ اٹلی ہوتی ہے.....!
 میں توقع رکھوں کہ تم میرے خط کا جواب دوگی.....!!

فقط..... تمہارا دوست..... احمر

نے احمر کے خط کو بار بار پڑھا..... تحریر کا ایک ایک لفظ اُس کے لئے بے حد معنی خیز تھا۔ احمر نے
 خوبصورتی سے حالات کی ستم ظریفیوں کو الفاظ کے قالب میں سمو دیا تھا..... ہر بات کو عیاں کر
 ، بعد بھی ایک پردہ برقرار رہنے دیا اور کیسے ڈھکے چھپے لفظوں میں یہ بھی کہہ گئے زندگی کے
 رنگ صرف اُسی کا انتظار کریں گے۔

کے خط سے اُس نے اس بات کا بخوبی اندازہ لگا لیا کہ انہیں بھی کسی حد تک حالات کا علم ہو گیا
 ہے فوریہ خاتون نے یہ نہ بتایا ہو کہ وہ کون ہے..... اُس کی اصلیت کیا ہے؟ لیکن اتنا ضرور
 کہ شادی سے انکار کی مصلحت کیا ہے؟ اسی انکار کی خاطر تو انہوں نے احمر سے کہا تھا کہ اُس
 بڑی بیٹی کا انتخاب کریں گی۔ انہیں علم تھا کہ بڑی بیٹی نادیہ ہے..... وہ نہیں ہے..... اپنی انا کی
 یہ خاتون نے کیسی خوبصورتی سے خود اپنی اولاد کی خوشیوں کو خاک میں ملا دیا..... کیسی انوکھی
 ، جس نے دو دلوں کی بجائے دو گھرانوں کی مسرتوں کو برباد کر دیا۔ خونی رشتوں کے درمیان
 اس ڈال دی گئیں، کیسے فاصلے پیدا کر دیئے..... ایسا صورت پھونکا کہ دلوں کی دھڑکنیں دلوں
 کی گھٹ گھٹ کر دم توڑ دینے پر مجبور ہو گئیں..... زبانوں پر تالے پڑ گئے..... ہر شخص سہا ہوا
 ف زوہ تھا..... ایک ایسے راز سے جو محض ایک ذات سے تعلق رکھتا تھا..... لیکن اُس کے افشا
 سے نہ جانے کتنی زندگیاں متاثر ہو سکتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ ہونٹ سی لئے گئے تھے، قوت
 ب کر لی گئی تھی۔

نے احمر کے خط کو ایک بار پھر بہت غور سے پڑھا، پھر جانے کیا سوچ کر اُسے بے اختیار چوم
 ار ازادری سے خط کو ایک ڈائری میں محفوظ کر کے الماری میں مقفل کر دیا پھر بستر پر نیم دراز ہو
 لہ بارے میں سوچنے لگی.....

ثنا نے کوئی جواب نہیں دیا، احمر کا خط ہاتھ میں لئے مجرم سی بنی چھوئے چھوئے قدم اٹھاتی رہی
 اُس کے ذہن میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دے؟ عجیب محضے میں گرفتار ہو کر رہ گئی تھی۔
 ”پریکٹیکل کی تیاری کی طرف سے غافل نہ ہونا..... ڈاکٹر کے لئے پریکٹیکل لائف کی بہت زیاد
 اہمیت ہوتی ہے..... میری دُعائیں تمہارے ساتھ ہیں..... آئی وٹ یو گریت ٹیکسز
 پروفیسر شیرازی اُسے ہوسٹل کے دروازے پر چھوڑ کر واپس ہوئے تو ثنا نے سکون کا سانس لیا۔
 دوپٹے کے آچل سے پیشانی پر ابھرنے والے پسینے کے ننھے ننھے قطرہوں کو پوچھتی تیزی سے ہوسٹل کے
 احاطے میں داخل ہوئی، لمبے لمبے قدم اٹھاتی اپنے کمرے تک گئی پھر دروازہ اندر سے بند کرنے کے بعد
 جلدی سے لفافہ چاک کیا..... دھڑکتے دل کے ساتھ احمر کا خط پڑھنے لگی..... احمر نے لکھا تھا.....
 ”ثنا.....

امید ہے کہ تم خیر و عافیت سے ہوگی.....!

آج تین ماہ بعد تمہیں خط لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں..... ایک دوست کی حیثیت سے..... یاد ہے
 تم نے کراچی سے روانگی کے وقت کہا تھا..... ہم آئندہ جب بھی ملیں گے، مخلص اور اچھے دوستوں کی
 طرح ملیں گے۔

نیروبی آنے کے بعد میں جس کیفیت کا شکار رہا، ہو سکتا ہے اُس کا اندازہ کچھ تمہیں بھی ہو۔ چچ
 جان کی بدلی ہوئی نظریں..... نادیہ کی سب باتوں کے تیر و نشتر مجھے کچھ کے لگاتے رہے..... میں اس بات
 کو سمجھنے سے قاصر تھا کہ میرا قصور کیا ہے..... کس جرم کی پاداش میں مجھے نگاہوں سے گرایا جا رہا ہے.....
 کیوں میری زندگی کو میری ذات سے علیحدہ کیا جا رہا ہے..... میں بہت دنوں تک حالات کے تشہیر
 فراز پر غور کرتا رہا..... سوچتا رہا کہ تمہاری اچانک بیماری کا سبب کیا ہے، وہ کون سا غم تھا جس نے تمہیں
 نڈھال کر دیا، کیا وجہ تھی جو رشتوں کی نوعیت نے ایک نیا رنگ اختیار کر لیا؟

امی جان نے کراچی سے اچانک واپسی کا فیصلہ کیا تو میں تڑپ اٹھا، شاید اس لئے کہ میں تمہیں
 بیماری کی حالت میں چھوڑنا نہیں چاہتا تھا..... کچھ نازک سے احساسات مجھے تمہارے قریب رہنے
 اکسارے تھے۔ لیکن وقت کے تقاضوں نے مجھے امی جان کا حکم ماننے پر مجبور کر دیا۔ اُس وقت میرے
 دل پر جو گزری، اُس کا اندازہ کوئی اور نہیں لگا سکتا..... ماحول کی گھٹن نے سانس لینا دوبھر کر دیا تھا۔ پھر
 تم نے ایک دوست کی حیثیت سے میری جانب ہاتھ بڑھایا تو مجھے جینے کا ایک نیا سہارا مل گیا۔ میں نے
 اسی سہارے اپنی زندگی گزارنے کا فیصلہ کر لیا ہے.....!

ہاں ثنا..... ایک دوست کی حیثیت سے۔ لیکن تم جانتی ہو کہ دوست کسے کہتے ہیں، دوست وہ ہے
 ہے جو وقت پر ایک دوسرے کے کام آئے..... دوستی ایک مقدس رشتے کا نام ہے جس میں اعتماد، محبت
 اور آخری شرط ہے..... اگر اعتماد اٹھ جائے تو دوستی کا بھرم نام کو باقی رہتا ہے..... تم نے مجھ پر اعتماد نہیں
 کیا، مجھے اس کا شکوہ ہے۔ شاید میری طرح تمہاری قوت گویائی بھی چھین لی گئی تھی۔ اُس وقت مجھے
 حالات کا اندازہ نہیں تھا لیکن اب..... میں سوچتا ہوں، ہماری خاموشی ہی مناسب ہے۔ اس لئے کہ اگر
 اب ہم نے بولنے کی کوشش کی تو اُن رشتوں کا بھرم خاک میں مل جائے گا جو بڑے مقدس، قابل
 احترام ہوتے ہیں..... ہم جن رشتوں کے احسانات کے مقروض ہیں اُن کے سامنے نظر اٹھا کر بات کرنا
 ہمیں زیب نہ دے گا.....!!

فی الحال میں اس سے زیادہ لکھنا مناسب نہیں سمجھتا..... زخموں کو کریدنے سے حاصل بھی کیا ہوگا!

بہت اچھے ہوئے ہیں۔ اُسے خدا کی ذات سے اُمید ہے کہ شاندار نمبروں سے کامیاب ہوگی۔
 اپنے ماحول سے بہت خوش..... بہت مطمئن دکھائی دے رہی تھی..... لیکن.....
 لیکن کیا؟“ وقار احمد نے بیوی کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے دریافت کیا۔
 امیرا خیال ہے کہ شانے ہمیں دکھانے کے لئے اپنے اُور خوشیوں اور مسرتوں کا خوبصورت سا
 پڑھا رکھا ہے۔ وہ خود کو جس قدر مطمئن ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی ہے شاید اندر سے اتنی ہی
 بے ہے.....

آپ نے کیسے اندازہ لگالیا.....؟“
 امیرا دل گواہی دیتا ہے..... میں نے اُسے بال پوس کر بڑا کیا ہے۔“ شائلہ بیگم نے درد بھرے
 لب کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ ٹا کو تمام حالات کا علم ہو گیا ہے..... شاید اسی لئے وہ ہم سے کترانے
 ش کر رہی ہے۔“
 زخم ابھی تازہ ہیں..... انہیں بھرتے بھرتے کچھ وقت تو ضرور لگے گا۔“ وقار احمد نے بیوی کو تسلی
 کی خاطر کہا۔
 میں سمجھتی ہوں..... لیکن مجھے ایک خدشہ اور بھی ہے.....“
 وہ کیا.....؟“

کہیں ایسا نہ ہو کہ وقت کے ساتھ ساتھ ہمارے درمیان فاصلے بھی بڑھتے جائیں۔“ شائلہ بیگم کی
 ہراسناکی..... ”میں نے شائے سے بڑے پیار سے کہا تھا کہ دو چار روز کے لئے گھر آ جائے..... لیکن وہ
 لی کا بھانہ کر کے بات بنا گئی۔“
 آپ پریشان نہ ہوں..... میں اُسے سمجھا بچھا کر لے آؤں گا۔“
 ”امیرا دل چاہا کہ شائے پوچھوں..... میرا قصور کیا ہے..... کسی اور کے کئے کی سزا مجھے کیوں دی جا
 ہے؟ لیکن میں دل پر جبر کر کے رہ گئی۔“

”اچھا کیا جو آپ نے وہ پردہ برقرار رکھا جو ہمارے اور شانے کے درمیان قائم ہے۔“
 ”مجھے کیا خبر تھی کہ فوزیہ بہن یہاں آ کر ہماری خوشیوں کو برباد کر دیں گی..... میں نے تو کبھی سوچا
 نہ تھا کہ وہ شان کو میرے علاوہ کسی اور کی اولاد سمجھیں گی۔“ شائلہ بیگم بولیں۔ ”مجھے تو اُن کی ذہنیت پر
 ماہور ہا ہے..... ہم نے بھی سی بچی کو گود لیا، اُس کی پرورش کے لئے اپنا آرام و سکون برباد کیا.....
 دن اور رات کو رات نہ سمجھا، بیس اکیس سال تک اُسے پیٹ کی اولاد کی طرح پیٹنے سے لگائے
 خدا گواہ ہے کہ ہم نے بھی ٹا کو اپنے بچوں سے کم نہیں سمجھا۔ لیکن فوزیہ بہن کو ان فریبانیوں کا ذرا
 اند آ یا..... کیسا نہ کھول کر اور پل بھر میں نگاہیں بدل کر طویطے کی طرح بے مروت بن گئیں۔“
 ”مجھے بھی بھابھی صاحبہ سے اس رویے کی مطلق توقع نہیں تھی۔ اگر انہیں کسی وجہ سے شاپسند نہیں تھی
 مل کر انکار کر دیتیں۔ لیکن اس طرح کسی معصوم کے دل کو کھیں پہنچانا انہیں زیب نہیں دیتا تھا۔“
 ”بڑی اصول پسند اور ناک والی جو بنی پھرتی ہیں۔“ شائلہ بیگم نے قدرے درشت لہجے میں کہا۔
 لانا کو ناک پر رکھے گھومتی رہتی ہیں..... بڑے فخر سے بیان کرتی ہیں کہ اُن کے خاندان میں
 سے ہی نمل کے تھان بکھرے بڑے ہیں، ٹاٹ یا کھدر کی خوشبو تو جیسے کبھی بھی نہیں..... شان کا
 لہ تھا..... شاربھائی کا شرم دلچاظ بھی مانع تھا وہ نہ میں بھی خاموش نہ رہتی..... اگر وہ ہمارے بارے
 جانتی ہیں تو ہم بھی اتنے بے خبر نہیں کہ جواب میں کچھ نہ کہہ سکیں.....“

احمر..... جو اُس کا دوست تھا..... ساتھی..... قابل اعتماد اور پُر وقار..... وقت اور حالات نے دو
 کے درمیان فاصلے ضرور بڑھا دیئے تھے لیکن قربتوں کا احساس آج بھی دلوں کی دھڑکنوں کے
 زندہ تھا..... اُس نے طے کر لیا تھا کہ اس احساس کو بھی فنا نہ ہونے دے گی..... احمر کو ہمیشہ یاد
 گی..... ایک دوست کی طرح..... دوست، جو قابل اعتماد ہو تو زندگی کا سب سے عظیم اور انمول
 ہوتا ہے..... یہی سرمایہ تو اُس کی زندگی کی آخری جمع پونجی تھی..... یہ پونجی بھی ہاتھ سے نکل جائے
 باقی کیا بچے گا؟ زندگی کا عذاب..... جو بڑا کر بناک..... بے حد اذیت ناک ہوتا ہے.....!!

وہ احمر کے بارے میں سوچتی رہی..... سوچتی رہی..... ایک دوست کی حیثیت سے..... احمر
 کا ایک ایک جملہ اُس کے ذہن میں میٹھے جھرنوں کی آواز بن کر گونج رہا تھا..... اُس نے سوچا کہ وہ
 کو سمجھانے کی کوشش کرے گی..... اس بات کے لئے آمادہ کرے گی کہ وہ ماں کے حکم کے آگے
 خم کر دیں..... ماں کی خوشیوں کی خاطر شادی کر لیں..... انہیں بتائے گی کہ محبت کیا ہوتی ہے.....
 کا احساس ہی کس قدر رُوح افزا ہوتا ہے..... ماں..... اس رشتے کے اندر اتنی مہاس ہوتی ہے کہ
 کی تمام خوشیاں، تمام مسرتیں مل کر بھی اس نعمت کا لعم البدل ثابت نہیں ہو سکتیں.....

احمر کو شاید ماں کی محبت..... اُس کی ممتا کا احساس نہیں تھا..... اس لئے کہ وہ دولت..... وہ
 انہیں حاصل تھی..... لیکن وہ اس نعمت سے محروم کر دی گئی تھی..... ماں کے سامنے ہوتے ہوئے
 اُسے ماں کہہ کر مخاطب کرنے سے قاصر تھی۔

”ماں.....“ شانے کے ہونٹوں کو جیش ہوئی، ایک تڑپتی ہوئی گھٹی گھٹی آواز اُس کے لبوں سے نکلا
 ہوٹل کے مختصر سے کمرے کے در و دیوار سے ٹکرا کر فنا ہو گئی..... شانے اپنے آپ کو سنبھالنے کی
 کی لیکن اس سیلاب پر قابو نہ پاسکی جو ممتا کی فطرتی کے احساس سے اُس کے سینے سے ابھر کر پکھول
 آنے کو چل رہا تھا..... پھر..... وہ نیکی میں منہ چھپا کر بے اختیار سسکنے لگی۔



شائلہ بیگم تیسری بار پانی پینے کے لئے انہیں تو وقار احمد نے آنکھیں کھول کر انہیں بہت غو
 دیکھا۔ شائلہ بیگم کے چہرے پر فکر و پریشانی کے طے جلے تاثرات نظر آرہے تھے۔ پانی پی کر وہ
 لینے لگیں تو وقار احمد چپ نہ رہ سکے، بیوی کی کیفیت جاننے کے خیال سے بولے۔ ”کیا بات۔“
 آپ کو نیند نہیں آ رہی.....؟“

”آپ جاگ رہے ہیں ابھی تک.....؟“ شائلہ بیگم نے چونک کر شوہر کی سمت دیکھا۔ ”میں
 رہی تھی کہ آپ سو چکے ہیں۔“

”آپ کچھ پریشان سی ہیں.....؟“
 شائلہ بیگم نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا، ایک لمحے چھت کو گھورتی رہیں پھر آہستہ سے
 ”آج میں فرحان کے ساتھ ہوٹل گئی تھی.....“

”شائیسے.....؟“ وقار احمد نے تیزی سے پوچھا۔
 ”اُس نے خود کو اپنے ارد گرد کے ماحول میں بہت مصروف کر لیا ہے۔“

”میں سمجھا نہیں.....؟“
 ”مجھے دیکھ کر وہ بڑے تپاک سے ملی..... دیر تک میرے سینے سے لگی میری گردن اور بالوں کو
 رہی..... فرحان کو پلٹائے بیٹھی مجھ سے میٹھی میٹھی باتیں کرتی رہی..... مجھے بتا رہی تھی کہ اُس۔“

پھر.....؟

صبح کا بھولا اگر شام کو گھر واپس آ جائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔
 ناممکن.....“ شائلہ بیگم ہنرک اٹھیں۔ ”میری زندگی میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ فوزیہ خاتون اگر سونے
 بن کر آجائیں، یا میری دلہیز پر تمام زندگی ناک رگڑتی رہیں تو بھی میں ہاں نہیں کروں گی۔“
 میرا خیال ہے یہ آپ کی زیادتی ہوگی۔“ وقار احمد نے کہا۔ ”شنا اور احمر ایک دوسرے سے کتنا پیار
 ہیں اس کا اندازہ آپ کو بھی ہے..... اس کے علاوہ ہمیں شبانہ بہن کی خوشیوں کا بھی خیال رکھنا
 کیا یہ اُن کی خواہش نہیں تھی کہ شاکی شادی احمر سے ہو؟“

اُس وقت بات اور بھی.....“ شائلہ بیگم نے جواب دیا۔ ”آپا جان کو شاکی خوشیاں منظور تھیں اس
 ہوں نے بھی احمر کے حق میں اپنی مرضی کا اظہار کر دیا تھا.....“
 ار احمد کچھ دیر خاموش رہے، پھر بولے۔ ”تیارہ اور راجل کی منگنی کی رسم کس روز ادا کی جا رہی ہے؟“
 خیریت..... بات اس وقت شاکی ہو رہی تھی، آپ کو تیارہ اور راجل کی منگنی کا خیال کیسے آگیا؟“
 میرا خیال ہے کہ اس موقع پر شنا کو دو چار روز کے لئے گھر لایا جاسکتا ہے۔“

اچھا یاد دلایا آپ نے..... میں دو ایک روز بعد تادیہ کو بھیجوں گی شنا کے پاس۔“
 ضرور بھیج دیجئے..... لیکن شنا کو لینے کی خاطر میں بنفس نفیس جاؤں گا، آپ دیکھئے گا کہ میری بیٹی
 نذر خوشی خوشی میرے ساتھ کھڑی رہے.....“
 خدا کرے وہ آپ ہی کی بات مان جائے۔“ شائلہ بیگم کی پلکوں کے گوشے نمناک ہونے لگے،
 دس کر بولیں۔ ”خدا گواہ ہے کہ شنا کے بغیر یہ گھر بڑا سوتا سوتا لگتا ہے۔“

خدا پر بھروسہ رکھئے..... وہ بہتر کرے گا۔“
 اب تو دن رات اُسی کی رحمت سے آس لگائے بیٹھی ہوں۔“
 ایک بات کہوں..... آپ اپنی طرف سے شنا کو بھی اس بات کا احساس نہ ہونے دیجئے گا کہ آپ
 کے غم سے واقف ہیں۔“

میں اتنی بیوقوف بھی نہیں ہوں کہ ایسی حماقت کریں۔ جب تک پردہ پڑا رہے مناسب ہے۔“
 آپ نے تیارہ کی منگنی کے سلسلے میں نہیں بتایا؟“ وقار احمد نے تھوڑے وقف کے بعد دریافت کیا۔
 ”تیارہ تاریخ طے پائی ہے.....“
 ”گویا ابھی دس دن باقی ہیں۔“ وقار احمد نے بڑے وثوق سے کہا۔ ”انشاء اللہ میں اپنی شنا کو منگنی
 لین جاؤں گا۔“

شائلہ بیگم نے جواب میں ایک سرد آہ بھری پھر ہاتھ بڑھا کر بند لیب بچھا دیا۔
 وقار احمد نے سونے کے ارادے سے دوسری کروٹ بدل لی لیکن اُن کا ذہن بدستور شنا کے بارے
 اور کر رہا تھا.....!!

○○○

”توبہ ہے شنا..... یہ بھی کوئی وقت ہے پڑھنے کا؟ ذرا باہر نکل کر دیکھو، موسم کس قدر خوشگوار ہو رہا
 “ نگار نے دوبارہ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا تو شنا نے جلدی سے کتاب بند کر دی، گھڑی
 ڈالی تو شام کے چھ بج رہے تھے۔
 ”کیا ہوا.....؟“ وہ ایک جمائی لیتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”کون جیتا، کون ہارا.....؟“

”خیر..... جو ہوا سو ہوا..... اب بات بڑھانے سے حاصل بھی کیا ہوگا؟“

”ایسی بات کا تو انفسوس ہے کہ وہ ہمارے گھر میں آگ لگا کر چلی گئیں اور خود نیردلی میں بیٹھی ہیں
 کی بیٹی بجاری ہوں گی۔“ شائلہ بیگم نے تھلا کر کہا۔ ”اُس دن شنا گھر میں نہ ہوتی تو میں بھی منہ
 گھٹکھٹیاں ڈالے نہ بیٹھی رہتی..... اگر انہیں اپنے احمر پر بڑا ناز ہے تو ہماری شنا اور تادیہ بھی کسی سے
 نہیں..... ایک چھوڑ ہزاروں ایسے رشتے مل سکتے ہیں جسے دیکھ کر فوزیہ بہن کے سینے پر تمام زندگی
 سانپ لوٹنے رہیں۔ لیکن دکھ تو اس بات کا ہے کہ میرے ارمان دل کے دل میں ہی رہ گئے.....“
 ”آپ دل چھوٹا نہ کریں..... خدا نے چاہا تو اب بھی ویسا ہی ہوگا جیسا آپ چاہتی ہیں۔ انسان
 نیت صاف ہو تو قدرت بھی اُس پر مہربانی ضرور کرتی ہے.....“ وقار احمد نے کہا۔ ”ہم انشاء اللہ
 بچیوں کی شادیاں اس قدر دھوم دھام سے کریں گے کہ دنیا دیکھے گی۔“

”مجھے دنیا کو نہیں صرف آپ کے بھائی بھادج کو دکھانا ہے.....“
 ”ارے ارے.....“ وقار احمد نے بیوی کے تیور بگڑنے دیکھ کر کہا۔ ”یہ آپ مجھ پر کس جرم
 پاداش میں خفا ہو رہی ہیں، آخر میرا کیا قصور ہے.....؟“
 ”کیوں نہیں ہے قصور..... آپ ثار بھائی کو تو سمجھا سکتے تھے۔“ شائلہ بیگم جھلا کر بولیں۔ ”وہ اپنی بیٹی
 صاحبہ سے کم از کم اتنی باز پرس تو کر ہی سکتے تھے کہ انہیں دوسروں کی پگڑی اچھالنے کا کیا حق ہے؟“
 ”آپ کا کیا خیال ہے..... کیا بھائی صاحب کو شنا اور احمر کے بات ختم ہو جانے کا ملال نہیں ہے؟“
 ”ملال ہوتا تو وہ اتنی خاموشی سے بیوی کے حکم کے آگے سر جھکا کر یوریا بستر باندھ کر واپس نہ
 ہوتے.....“

”ہو سکتا ہے کہ اس میں بھائی صاحب کی کوئی مصلحت ہو۔“
 ”ذرا میں بھی تو سنوں کہ بیوی کے سامنے دبو بنے رہنے میں کیا مصلحت درپیش تھی؟“ شائلہ بی
 بولیں۔ ”اور سانپ نکل جانے کے بعد اب لٹھی پٹیتے رہنے سے کیا حاصل ہوگا.....؟“
 ”اگر آپ ٹھنڈے دل و دماغ سے سیں تو میں بھی کچھ عرض کروں۔“
 ”فرمائیے..... سن رہی ہوں۔“

”پرسوں بھائی صاحب کا فون آیا تھا..... وہ بتا رہے تھے کہ احمر کی طبیعت خراب ہے۔“
 ”ہوتی ہے تو ہوا کرے۔ جو دوسروں کے لئے برا چاہتا ہے اُس کے آگے بھی کچھ نہ کچھ ضرور آتا ہے۔“
 ”بھائی صاحب کا خیال ہے کہ احمر نے بھی ماں کی باتوں کا اثر بڑی شدت سے دل پر لیا ہے۔
 وقار احمد نے بیوی کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ”ماں ہر حال میں ماں ہوتی ہے
 بھابھی صاحبہ بھی احمر کی بیماری کی وجہ سے بہت زیادہ پریشان ہیں۔“

”کیا احمر کو معلوم ہو گیا کہ شنا کون ہے.....؟“
 ”اس کا ذکر درمیان میں نہیں آیا۔ البتہ بھائی صاحب دلی زبان میں کہہ رہے تھے کہ انہیں حالانہ
 بہتر ہونے کی امید ہے۔“

”کیا.....؟“ شائلہ بیگم نے چونک کر شہر کو وضاحت طلب نظروں سے گھورا۔ ”حالات بہتر ہو۔
 سے اُن کی کیا مراد ہے؟“
 ”ممکن ہے بیٹی کی بیماری کی وجہ سے بھابھی صاحبہ کو اس بات کا خیال آجائے کہ انہوں نے غلط
 اور جلد بازی میں جو فیصلہ کیا وہ سخت نامناسب تھا.....“

و ناپسند نہیں کرتے..... اپنی دنیا میں گن رہتے ہیں۔“

بالکل تمہاری طرح.....“ نگار بولی۔ ”مجھے دُعا میں دو جو تمہارے سلسلے میں ڈھال بنی ہوئی ہوں،
ج کی لڑکیاں اب تک تمہیں ہزاروں اونگے بونگے خطابات سے نواز چکی ہوتیں۔“

”کیوں..... میں نے کیا نگار اے کسی کا؟“ ثناء نے بڑی مصصومیت سے دریافت کیا۔
”نہ سہی..... لیکن یہ جو تم ہر وقت گرم کتب یعنی کتابوں کا کیزا بنی رہتی ہو، یہ بھی دوسروں کے لئے
برداشت ہے۔ طلباء کی زبان میں تم جیسی لڑکیوں کو آدم بیزار یا بغلول کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔“
”بڑھائی میں دل لگانا کوئی عیب تو نہیں.....“

”لیکن ماحول سے بیزاری بھی صحت مند علامت نہیں کہی جاسکتی۔“

”چھوڑو.....“ ثناء نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں میڈم نسرین کی بات کر رہی تھی۔“

”دُعا کرو..... کبھی خواب میں بھی محترمہ سے واسطہ نہ پڑے۔“ نگار کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے
”ایک بار میں نے میڈم سے صرف اتنا پوچھ لیا تھا کہ فنگس (FUNGS) کتنے اقسام کے
ہیں..... خدا کی پناہ..... وہ تو اس بری طرح چڑھ دوڑیں مجھ پر، جیسے میں نے کوئی گالی دے دی
.. اتفاق ہی سمجھو جو اُس وقت میڈم کی کال آگئی ورنہ میرے لئے تو پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا تھا۔

”ن سے میں ہمیشہ دُور دُور ہی رہتی ہوں۔“

”پریکٹیکل میں کیا کرو گی؟“

”جُل تو جلال تو کا ورد کرتی ہوئی کمرے میں داخل ہوں گی..... ویسے مجھے میڈم کی ایک کمزوری کا
لم ہے۔“ نگار نے کہا۔ ”گفتگو کے دوران اگر تم کسی نہ کسی طرح میری میر کا ذکر نکال کر برائی
کر دو تو میڈم کی باجیس اس طرح کھل جاتی ہیں جیسے سسکیاں بھرتے ہوئے بچے کے ہاتھ میں
پامن پند کھلونا آگیا ہو۔“

”بات کیا بنی؟“

”اصلیت کیا ہے یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ لیکن اُڑتی اُڑتی سنی گئی ہے کہ میڈم کا ایک دُھواں
افیر (AFFAIR) بری طرح ناکام ہو گیا تھا جس نے انہیں چڑچڑایا بنا دیا..... یہی وجہ ہے کہ
انے آج تک شادی نہیں کی..... مس کہلانے میں بھی بڑا فخر محسوس کرتی ہیں۔“

”میرا خیال ہے میڈم نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر کے دانشمندی کا ثبوت دیا۔“ ثناء نے سنجیدگی
با۔ ”وہ جو نوٹ کر کسی کو چاہتے ہیں ناکامی کے بعد بھی ذہنی طور پر اسی سے تمام عمر وابستہ رہنا پسند
تے ہیں..... اسی کو محبت اور وفا کی معراج کہا جاتا ہے۔“

نگار نے کوئی جواب نہیں دیا..... جلدی جلدی پللیں جھپکا کر شاکو حیرت سے گھورنے لگی۔

”اس طرح کیا دیکھ رہی ہو؟“

”تمہارے چہرے پر میری لٹی میر کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔“

”سوری..... رائگ نمبر.....“ ثناء نے تیزی سے خود کو سنبھالتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں نے محض
کتابی جملہ ذہر ادا دیا تھا۔“

”اور میرا خیال ہے کہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔“

”تم تو اس طرح کہہ رہی ہو جیسے تم نے چہرہ شناسی میں باقاعدہ پی، ایچ، ڈی کر رکھی ہے..... ثناء
نگار کی گہری سنجیدگی پر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”وقت ضائع مت کرو..... میرے سلسلے میں تمہارا نجوم

”آج میں ہار گئی..... رُوحی کو چڑانے کی خاطر۔“ نگار نے کہا۔ ”ثانیہ کی خاطر بھی منظور تھی.....“

”ایک بات پوچھوں.....؟“

”پوچھو.....!“

”نگار رُوحی کو واقعی ثانیہ سے حسد ہے..... میرا مطلب ہے وہ جسید سے جس طرح کھلے بندوں ملتی
ہے کیا رُوحی کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا.....؟“

”اعتراض کس بات کا؟“ نگار نے سنجیدگی سے کہا پھر مسکرا کر بولی۔ ”تمہارا کیا خیال ہے..... اگر تم
رُوحی کی جگہ ہوتیں تو تمہارے احساسات کیا ہوتے..... کیا تم جسید سے شکوہ کرتیں؟“

”میں رُوحی کی جگہ ہوتی ہی کیوں.....“ نگار نے جلدی سے کہا پھر تولیہ اٹھا کر ہاتھ رُوم میں چلی گئی،
منہ ہاتھ دھو کر باہر نکلی تو نگار لباس تبدیل کر چکی تھی.....

”خیریت..... نہیں جانے کا ارادہ ہے؟“ اُس نے نگار سے دریافت کیا۔

”ضروری تو نہیں کہ لباس کہیں جانے کے لئے ہی تبدیل کیا جائے.....“ نگار نے آئینے کے سامنے
کھڑے ہو کر بالوں کو برش کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”تھیل کی وجہ سے پسینہ آگیا تھا اس لئے
تبدیل کر لیا۔“

”اب کیا پروگرام ہے.....؟“

”کیا مطلب.....؟“ نگار نے برش بستر کی سمت اُچھالتے ہوئے ثنا کو گھورا۔

”پروفیسر شیرازی بتا رہے تھے کہ میڈم نسرین بہت سخت طبیعت کی مالک ہیں..... کسی کے ساتھ کوئی
رعایت نہیں کریں۔“

”بالکل ٹھیک کہا پروفیسر شیرازی نے۔“ نگار کڑوا سا منہ بنا کر بولی۔ ”میڈم نسرین کے ساتھ وہی
مثل ہے کہ طویلے کی بلا بندر کے سر..... قصور کسی اور کا تھا، مزاحم غریب طالب علم بھگت رہے ہیں۔“

”قصہ کیا ہے.....؟“ ثنا بالوں کو ہلکا سا کنگھا کر کے میز کی طرف بڑھی تو نگار نے جھپٹ کر اُس کی
کلائی پر گرفت مضبوط کر لی۔

”خبردار..... اگر تم نے اس وقت پھر بوریت پھیلائی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔“

”نگار، پلیز! ذرا سوچو..... دو روز بعد ہمارا پریکٹیکل ہے۔“

”ایک لفظ بھی نہیں سنوں گی..... پہلے شرافت سے ٹھکو کمرے سے باہر..... کھلی فضا میں چل کر
پچھپھو دوں کو تازہ ہوا بہم پہنچاؤ، پھر پریکٹیکل بھی ہوتا رہے گا۔“

ثناء نے نگار کی بات مان لی۔ یوں بھی وہ بہت دیر سے کتابوں سے سرکھپا رہی تھی۔ ذہن پر ہلکا ہلکا
غبار سا محسوس کر رہی تھی..... کمرے سے باہر نکلی تو موسم واقعی بڑا ارومانگ ہو رہا تھا..... لان میں ابھی

تک بیڈنٹن کا کھیل جاری تھا۔ وہ نگار کے ساتھ ہمتی ہوئی کامن رُوم والے حصے کے سامنے جا کر چھری
ٹھنڈی پنچ پر بیٹھ گئی، کچھ لڑکیاں سبزے پر بیٹھی آپس میں ہنسی مذاق کرنے میں مصروف تھیں۔

”تم نے میڈم نسرین کا قصہ نہیں سنایا۔“

”کیا تم نہیں جانتیں میڈم کے بارے میں.....؟“

”جانتی تو تم سے کیوں پوچھتی؟“ ثناء نے کہا۔ ”اور سچ پوچھو تو میں نے کبھی انہیں غصے میں بھی نہیں
دیکھا..... میڈم دوسروں کے ساتھ بے تکلف ہونا پسند نہیں کرتیں..... ریزرو (RESERVE) رہتی ہیں

لیکن یہ کوئی ایسی بری بات تو نہیں، دنیا میں ایسے ہزاروں افراد موجود ہوتے ہیں جو ہر کس دنیا کس سے

میں نے قبول کر لیا۔

زبان میں کہا۔ ”جیسی آپ میرے مقابلے میں دوسروں کی تعریف کرتی ہیں.....“

احمر ماں کی طبیعت سے واقف تھے۔ یہ بات بھی بخوبی جانتے تھے کہ ماں اپنی انا کے معاملے ٹوٹ تو سکتی ہیں لیکن اُن کے اندر کوئی جگہ کوئی جھکاؤ پیدا نہیں ہو سکتا۔ احمر کو اس بات پر فخر تھا کہ اپنے والدین کی اکلوی اولاد ہیں۔ انہیں یقین تھا کہ اگر زندگی میں بھی کوئی موڑ ایسا آیا جہاں ماں اور اچھوتے بیٹے کی خواہش کا سوال پیدا ہوا تو ماں کی متابیٹہ کی خوشی کے آگے سرنگوں ہو جائے گی! ثناء کے سلسلے میں ایسا نہیں ہوا۔

احمر کو ماں سے اس بات کا شکوہ تھا کہ انہوں نے کبھی ثناء کی اصلیت سے آگاہ نہیں کیا۔ جب ثناء بیکم کی لڑکیوں کا ذکر آتا، وہ ثناء کی سب سے زیادہ تعریف کرتیں لیکن ترجیح ہمیشہ نادیا کو دیتیں۔ نے بھی اس پہلو پر غور نہیں کیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اُن کے خوابوں کی تعبیر اُن کی توقعات خلاف ثابت ہوگی۔

وہ ثناء کو ٹوٹ کر چاہتے تھے، اس کا اندازہ فوزیہ خاتون کو بھی تھا لیکن انہوں نے کبھی اشارہ کنایوں میں بھی احمر کو چوگانے کی کوشش نہیں کی کہ وہ جس راستے پر بڑھ رہے ہیں اُس کی منزل سراغِ ماں کی انا سے ٹکرا کر دھند میں گم ہو جائے گا۔ نیرولی سے رواجی سے پیشتر بھی فوزیہ خاتون نہایت خوشی خوشی احمر کو اس بات کا یقین دلایا تھا کہ وہ اُن کی خوشی کی خاطر ثناء بیکم سے اُن کی لڑکی کا رشتہ مانگ لیں گی۔

یہ شاید ایک ماں کا مذاق تھا لیکن جب اس ہولناک مذاق کی اصلیت کھل کر سامنے آئی تو احمر رہ گئے۔ ماں کی شکل حیرت سے تکتے رہے لیکن ماں کا احترام مانع تھا اس لئے اس طوفان کو سینے اندر ہی دبایا جو اُن کے وجود کو آتش فشاں کی طرح جھلسائے دے رہا تھا، خاکستر کئے جا رہا تھا۔ احمر نے خود کو بہلانے کی کوشش کی۔ کام کی مصروفیات میں بے پناہ اضافہ کر لیا، ماں سے ممکنہ کٹاؤ سے بچنے کی خاطر دیر تک گھر سے باہر رہنا شروع کر دیا۔ لیکن ثناء کا تصور ہر راہ، ہر دم اُن کا تعاقب کرتا رہا۔ سوتے جاگتے، اُٹھتے بیٹھتے ایک بل کے لئے بھی ثناء کو نہیں بھول سکے۔ انہیں ثناء کی بیماری کا خیال آتا تو تڑپ اُٹھتے۔ نادیا کی رُوحی رُوحی رخ باتیں صدائے بازگشت، گونجیں تو اُن کا سکون برباد ہو جاتا۔ ثناء بیکم کی بے بس خاموشی کا خیال آتا تو دل موس جاتے۔ کبھی تھک ہار کر دو گھڑی کے لئے آنکھیں بند کرتے تو ثناء کا تصور حقیقت کا روپ دھار کر کے سامنے آ جاتا۔ وہ بڑے معصوم انداز میں سوال کرتی۔

احمر..... خدارا مجھے صرف اتنا بتا دو! کہ میرا تصور کیا ہے؟ کیوں مجھے جیتے جی موت کو وادیوں میں جھونکا جا رہا ہے۔ زندہ درگور ہونے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ کیوں؟ ہم نے تو زندگی ساتھ گزارنے کی قسم کھائی تھی..... پھر ہمارے راستے الگ الگ..... جدا جدا ہو گئے؟ کیا صرف اس جرم کی پاداش میں کہ میں خود نہیں جانتی کہ میرا باپ کون ہے..... کیوں نے مجھے اس دنیا میں لانے کی خاطر ایک مرد کی روایتی شان و شوکت کے ساتھ ایک عورت کے جھوٹی محبت کا ڈھونگ رچایا..... ذرا سوچو احمر..... وہ بھی تو تمہاری ہی طرح ایک مرد تھا..... پھر ایک کے جرم کی سزا ایک کمزور اور بے بس عورت کو کیوں دی جا رہی ہے..... آخر کیوں؟

کیا محض اس لئے کہ عورت ظلم سینے کی عادی ہوتی ہے..... اپنے ماحول..... اپنی تہذیب اور جا کے خلاف بغاوت کا علم بلند نہیں کر سکتی..... اور ہر فریب کو ہنس ہنس کر برداشت کر لیتی ہے..... ہر مسکرا مسکرا کر پی جاتی ہے..... زہر کے ٹھونٹ کی طرح.....

لیکن یہ ظلم کب تک روا رہے گا..... کب تک قوتِ برداشت جواب نہ دے گی..... کبھی تو صبر کا لبریز ہو کر پھٹکے گا..... کبھی تو انتقام کا جذبہ بیدار ہوگا.....

سوچو احمر..... سوچو..... اُس روز کیا ہوگا؟ اور اگر ایسا نہ ہوا تو تمہاری ثناء بھی دنیا کی بے شمار معصوم اور بے زبان عورتوں کی طرح اپنے وجود ادھم گٹ کر مر جائے گی..... فنا ہو جائے گی..... اپنی وفا کے نام پر ہتے مسکراتے قربان ہو جائے اور..... اس کی موت کے بعد اگر تمہیں ہوش آیا تو کیا حاصل.....!!

اس وقت بھی وہ بستر پر بے سدھ پڑے نیم غنودگی کے عالم میں ثناء کے تصور سے دل بہلا رہے تھے دروازے پر قدموں کی آہٹ سن کر خوابوں کا ظلم ٹوٹ گیا..... آہستہ سے آنکھیں کھول کر دیکھا تو یہ خاتون سوغار صورت بنائے کمرے میں داخل ہو رہی تھیں۔ احمر نے ماں کو دیکھا تو ہونٹ کاٹ کر ٹپے، سینے کے اندر کچھ احساسات آپس میں ٹکرائے تو اُن کی آنکھیں نمناک ہونے لگیں۔ فوزیہ خاتون نے ایک نظر کمرے کی بے ترتیبی پر ڈالی پھر احمر کے قریب آ کر بولیں۔ ”کیسی طبیعت میرے چاند؟“

”ٹھیک ہوں.....“ احمر نے کراہ کر جواب دیا۔
”میں نے ملازم کو کمرے کی صفائی کے لئے بھیجا تھا۔ تم شاید سو رہے تھے اس لئے وہ واپس چلا گیا۔“
”جی نہیں امی جان.....“ احمر نے دبی زبان میں کہا۔ ”وہ آپ کے حکم کی تعمیل میں صفائی کر گیا تھا۔“
”پھر..... یہ سب کیا ہے؟“ فوزیہ خاتون نے حیرت سے پوچھا۔

”یہ..... یہ میری دیوانگی کا عکس ہے۔“ احمر نے بھری ہوئی چیزوں پر نظر ڈالی پھر ماں کی طرف ہل کر بولے۔ ”جانے کیوں مجھے پرانی ترتیب سے جڑی ہو گئی ہے..... وقت کے ساتھ ساتھ چیزوں کی ترتیب میں بھی تبدیلی ہونی چاہئے۔ یکسانیت ہمیشہ آکٹاہٹ کو جنم دیتی ہے، میں نے یہ بات کسی اب میں پڑھی تھی..... بھلا سا نام تھا..... اس وقت یاد نہیں آ رہا۔“
”احمر.....“ فوزیہ خاتون نے بیٹے کے غم کو محسوس کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ”تم شاید مجھ سے اہو.....“

”خفا.....“ احمر کے ہونٹوں پر ایک بیمار قسم تڑپ اُٹھا۔ ”آپ نے کیسے اندازہ لگایا؟“
”تمہاری بیماری سے..... تمہاری باتوں سے.....“
”سوری امی جان.....“ احمر نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ”مجھ سے اگر کوئی گستاخی سرزد ہوگی ہو تو میں ان کی کا خواستگار ہوں۔“

”تمہاری خفگی کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ تم نے وقت پر دوا نہیں پی۔“ فوزیہ خاتون نے سائیڈ ٹیبل پر لی ہوئی دواؤں کی طرف اشارہ کیا۔
”کڑی کیسی چیزیں حلق میں پھندا بن کر اٹکنے لگتی ہیں۔“ احمر نے چھت کی طرف گھورتے ہوئے اترے سے کہا۔

”صحت اور تندرستی کی خاطر یہ سب ضروری ہے..... تم نے ایک ہفتے سے شیو بھی نہیں بنایا۔“ فوزیہ اُٹھ بولیں۔ ”شکل دیکھی ہے آئینے میں..... کیا حلیہ بنا رکھا ہے.....“
احمر نے جواب میں تیزی سے ماں کی سمت دیکھا، پھر ہاتھ مٹ کر خاموش ہو گئے۔
”زندگی سب سے قیمتی شے کا نام ہے..... بھی اس بات پر غور کیا ہے تم نے؟“ فوزیہ خاتون نے

سکیوں میں کی آنے لگی۔ پھر اُن کے اعصاب کا تناؤ دُور ہونے لگا۔ کچھ ہی دیر میں وہ یوں ر آنے لگے جیسے گہری نیند کی کیفیت سے دوچار ہوں..... جیسے کوئی طوفان آ کر زلزلہ مچا رہا ہو.....
خاتون بیٹے کے سر ہانے بیٹھی اُس کے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھیں اور دل ہی دل میں صحت دُعائیں مانگ رہی تھیں۔ ڈاکٹر نے انجکشن لگانے کے بعد احمر کی نبض دیکھی..... کچھ سوچتے احمد سے دریافت کیا۔ ”مریض کی یہ کیفیت کب سے ہے؟“
راور کزوری کی حالت تو بہت دنوں سے ہے جس کا علاج بھی ہو رہا تھا۔ لیکن دورے کی ج پہلی بار زدنما ہوئی ہے۔“ ثناء احمد نے پریشان انداز میں کہا۔ پھر بولے۔ ”کوئی تشویش کی ما ہے؟“

احمد چیک اپ کے بغیر کوئی بات یقین سے نہیں کہی جاسکتی..... میں نے فی الحال انجکشن لگا دیا میرا مشورہ ہے کہ اگر آپ پہلی فرصت میں کسی ماہر قلب سے بھی رجوع کر لیں تو زیادہ دگ۔“

لڑ..... ”فوزیہ خاتون نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ”کیا خدا نخواستہ میرے احمر کو.....؟“
ر سے کام لیجئے.....“ ڈاکٹر نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”میں نے ایک امکاکی بات کی ہے۔ ہو برا اندازہ غلط ہو۔“

حمد نے بڑی اذیتناک سنجیدگی سے ایک نظر بیوی پر ڈالی، پھر ڈاکٹر کو رخصت کرنے کی خاطر ماتھ کمرے سے باہر چلے گئے.....!!



عابد کی کوشی آج قعدہ نور بنی ہوئی تھی..... سمیرا خاتون کی گاڑی بنگلے کے اندر آ کر رُک کر ٹول کرٹل فوڈ آگے بڑھ کر مہمانوں کا استقبال کیا۔ سب سے پہلے سمیرا خاتون گاڑی سے اتریں، پھر اُن راجیل کار سے باہر آئے جنہوں نے لائٹ چاکلیٹ کمر کا سوٹ پہن رکھا تھا اور خاصے سارٹ پہ تھے۔ فرحان اُن کے ساتھ ساتھ تھا۔

عابد نے مخصوص فوجی انداز میں راجیل کو سر سے پاؤں تک دیکھا، کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن ر آصف علی کو قریب آتا دیکھ کر جلدی سے اُن کی طرف چلے گئے۔ نادرہ کی سیہیلیوں نے مہمان ہاتھوں ہاتھ لیا اور اُس وقت تک اُن پر گلاب کی پتھریوں کی بو چھاڑ کر رہیں جب تک وہ اکر نشتوں پر بیٹھ نہیں سکیں۔

نادرہ کی بات کرٹل عابد اور سمیرا خاتون کے درمیان پہلے سے طے تھی کہ منگنی کی رسم کو سادگی سے ے گا۔ لیکن دونوں جانب سے خاصا اہتمام کیا گیا تھا..... سمیرا خاتون نے نادرہ کے لئے ہلکے کا بناری کپڑے کا غرارہ سوٹ تیار کرایا تھا..... زیورات میں ردی کا جڑاؤ اور بھاری سیٹ ساتھ وہ چار نوکرے پھلوں کے اور چار نوکرے مٹھائی کے لائی تھیں۔ اس کے علاوہ اور بھی شمار چیزیں تھیں..... کرٹل عابد نے بھی راجیل کے لئے دل کھول کر خرچ کیا تھا۔

نوں کی تعداد چونکہ زیادہ نہیں تھی اس لئے لان پر ایک جانب نشست اور دوسری جانب کھانے کیا گیا تھا۔ نادرہ اور راجیل کے لئے لان کے درمیان حد بندی کی دیوار کے قریب ایک علیحدہ فائتہام تھا جس کے اطراف نیم دائرے کی شکل میں دوسری نشستوں کا بندوبست اس انداز یا تھا کہ چھوٹی ٹولیاں الگ الگ بیٹھ سکیں اور ہوا بھی اسی طرح..... بزرگوں نے اپنی بیشک

بیٹے کو سمجھانے کی کوشش کی۔
”غور کرتا ہوں تو ذہن چکرانے لگتا ہے.....“

”یہ کمزوری کی علامت ہے..... تمہیں اس کمزوری کا علاج کرنا چاہئے۔“
”بیماری کا علاج انسان کے اختیار میں ہو تو پھر ڈاکٹر اور مسیحا کیا کریں گے؟“
”ان باتوں سے کیا فائدہ ہوگا.....؟“

”ہائیں کرنے سے جی بھل جاتا ہے ورنہ جانے کیوں ٹھن ہوتی رہتی ہے.....“
”اٹھو..... میرے ساتھ باہر لان میں چلو۔ بند کمرے میں لیٹے لیٹے ٹھن نہ ہوگی تو اور کیا ہوگا۔“
”رہنے دیجئے امی جان..... میں جہاں ہوں بہت سکون سے ہوں۔“ احمر کے لہجے میں درد شدتیں چل رہی تھیں۔

فوزیہ خاتون نے بیٹے کی آنکھوں میں نمی دیکھی تو مٹا کے جذبوں کو ٹھن گئی، ایک لمحے کو اُن کا د چاہا کہ اولاد کی خاطر اپنی انا کو توڑ دیں، احمر کی خوشیوں کی خاطر حالات سے سمجھوتہ کر لیں لیکن دوسرے ہی لمحے اقبال احمد کا خیال ذہن میں اُبھرا تو اُن کی کشادہ پیشانی ٹھن آلود ہو گئی۔ دل پر جبر کرے بولیں۔ ”تم ماں کی مٹا کا امتحان لینا چاہتے ہو.....؟“
”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں..... کیا میں اپنے فرض کی ادائیگی سے کوتاہی کر رہا ہوں.....؟“ احمر لہجے میں بولے۔

”میں دیکھ رہی ہوں، تم کس طرح اپنے فرض کی ادائیگی کر رہے ہو۔“ فوزیہ خاتون تمللا اٹھیں۔
احمر خاموش رہے۔

”تم اپنی ضد کے آگے ماں کو مجبور کرنا چاہتے ہو.....“
احمر نے پوری شدت سے اپنی مٹھیاں جھنجھکی لیں، چہرے پر خون کی گردش کا دباؤ تیز ہو گیا۔
”شاک کے علاوہ اپنی ماں سے کوئی اور چیز مانگو..... میں تمہاری ہر خواہش پوری کروں گی۔“
احمر نے اپنا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا، پلکیں جھپکائے بغیر جھٹ کو گھورتے رہے، جیسے کسی جند کچلنے کی کوشش کر رہے ہوں..... چہرے پر وحشت بریں رہی تھی۔

”جپ نہ رہو احمر..... بولو..... تمہیں میری قسم۔“
”آئی جان.....“ آنسوؤں کی طغیانی ضبط کے بندھن توڑ کر اُبھری تو احمر کی آواز ڈوب کر رہ گئی۔

”خود کو سنبھالو احمر..... یہ تمہیں کیا ہو رہا ہے؟“
”میری ایک التجا ہے.....“ احمر نے سسکتے ہوئے کہا۔ ”ایک..... آخری خواہش.....“

”کیا.....؟“ فوزیہ خاتون نے بڑے پیار سے دریافت کیا۔
”مجھے..... مجھے..... تھوڑا سا..... زہر.....“

”احمر.....“ فوزیہ خاتون تڑپ اٹھیں..... احمر نے کوئی جواب دینے کی بجائے آنکھیں موند لے پھر بے اعتبار ہچکیاں لے کر رونے لگے.....

فوزیہ خاتون نے ملازم کو آواز دی۔ چند لمحوں میں پورے گھر کو خبر ہو گئی کہ احمر دورے کی کیفیت دوچار ہیں۔ ثناء احمد بوکھلائے ہوئے دفتر سے گھر پہنچے تو ڈاکٹر بھی اُن کے ساتھ تھا، احمر کو آوازیں گئیں لیکن شاید وہ ہوش میں نہیں تھے۔ پورا جسم یوں ٹپکپک رہا تھا جیسے شدید سردی کی کیفیت سے ”ٹھن ٹھن“ سسکیوں کی آواز بتدریج تیز ہوتی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر نے فوری طور پر انجکشن دیا تو اج

لیا کہا۔۔۔۔۔؟“ نادیر نے مصنوعی غصے کا اظہار کیا تو نیلو فر جلدی سے دوسری لڑکی کی آڑ میں ہو گئی۔
سری طرف کرل عابد، خان بہادر آصف علی سے کھانے کا اصرار کر رہے تھے۔ ”آپ تو بڑے
سے کام لے رہے ہیں۔۔۔۔۔ اور کچھ نہیں تو یہ شامی کباب ہی چکھ کر دیکھیں! میں نے خاص طور پر
بے گوشت کے بنوائے ہیں۔“

بھی اس قدر خستہ ہیں۔“ خان بہادر صاحب نے کباب چکھتے ہوئے کہا۔ ”ہرن کے گوشت کا
بہت کچھ اور ہوتا ہے۔“

نذر دانی ہے آپ کی۔۔۔۔۔ ورنہ ہرن کس قابل ہے۔“

ن بہادر صاحب نے چونک کر کرل عابد کو دیکھا، پھر جملے کی لطافت پر غور کیا تو قبضہ لگائے بغیر
لے۔ ار جند بانو قریب آتے ہوئے بولیں۔ ”کھانے میں ذرا احتیاط سے کام لیجئے گا۔ ڈاکٹر نے
پرہیز کی تاکید کی ہے۔“

نیل اپنے دوست کے ہمراہ ایک طرف جانے لگے تو فرحان نے کھنکھارتے ہوئے کہا۔ ”راہیل
... کوئی آپ کو گھور رہا ہے۔“ راہیل نے پلٹ کر نادیر کی سمت دیکھا تو قریب کھڑی لڑکیوں کے
دنادرہ بھی اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکی۔۔۔۔۔

ابھی سے خوف کا یہ عالم ہے تو بعد میں کیا ہوگا۔۔۔۔۔ ایک لڑکی نے شوخی سے کہا۔

جد میں راہیل بھائی نے اگر ذرا بھی کوئی غلط قدم اٹھایا تو کرل انکل ان کو گولی مار دیں گے۔“ فرحان
بل کو دیکھتے ہوئے کہا، پھر نادیر کو مخاطب کر کے بولا۔ ”باجی۔۔۔۔۔ شٹل کاک کو اردو میں کیا کہتے ہیں؟“

فرحان۔۔۔۔۔“ نادیر نے بھائی کو تنبیہ کی۔ ”تم چپ نہیں رہ سکتے؟“

حان نے راہیل کو دیکھا پھر چہرے پر سنجیدگی طاری کرنے کی مضحکہ خیز کوشش کرنے لگا۔

ب جانب سمیرا خاتون، شائلہ اور شانہ بیگم کے ساتھ باتوں میں مصروف تھیں۔ کرل عابد کے

ماکی ایک ٹوٹی سب سے الگ تھلگ دکھائی دے رہی تھی۔ نادیر کئی بار بہن کی کیفیت کا اندازہ لگا

۔ ایک بار شاقریب سے گزری تو نادیر چپ نہ رہ سکی، قریب جا کر بولی۔ ”کیا بات ہے آپنی۔۔۔۔۔

نہ کوئی کھوئی سی نظر آ رہی ہیں۔“

خیال ہے تمہارا۔۔۔۔۔ وہ جلدی سے مسکرا دی۔

پھر آپ یہ دور دور کیوں گھوم رہی ہیں؟

تمہارے اور منصور کے خیال سے۔“ ثناء نے بڑی خوبصورتی سے بات ٹالتے ہوئے کہا۔ ”سچ۔۔۔۔۔

مور کو نظر لگ رہی ہے۔“

شروع کر دی آپ نے دوسروں کی طرف داری۔۔۔۔۔“ نادیر نے معصوم لہجے میں شکوہ کیا۔

ایمان سے کہنا۔ کیا کوئی اور منصور کے مقابلے میں نظر آ رہا ہے؟“

نادیر کے سامنے نہ کہہ دیجئے گا۔۔۔۔۔“ نادیر شوخ ہو گئی۔ ”اُسے تو آج صرف اپنا چاکلیٹ ہیرو

ہا ہے۔“

مور لپکتے ہوئے قریب آ گئے، کیرہ سنبھالا تو نادیر نے منہ بنا کر زبان باہر نکال دی۔

بڑی بات۔۔۔۔۔“ منصور نے کہا۔ ”اچھے بچے بزرگوں کے سامنے اس قسم کی شرارت نہیں کرتے۔“

شکل دیکھی ہے آئینے میں۔۔۔۔۔ بڑے آئے۔۔۔۔۔ بزرگ۔“

میں نے اپنے لئے نہیں، ثناء باجی کے لئے کہا تھا۔“ منصور نے وضاحت کی پھر ثناء سے بولے۔

ایک طرف جمالی اور نو جوانوں نے دوسری جانب اپنی محفل گرم رکھی تھی۔

سب سے پہلے مہمانوں کی تواضع مشروبات سے کی گئی، پھر نادیر نے سہیلیوں کے بھرمت

لان میں قدم رکھا تو ہر نگاہ اُس کی جانب اٹھ گئی، اُسے راہیل کے برابر لاکر بٹھایا گیا تو سمیرا خاتون

نے اٹھ کر دونوں پر سے خاصی معقول رقم نچھاور دی اور اُسے غربا میں تقسیم کرنے کی غرض سے دیا۔

راہیل اور نادیر دونوں ہی مہمانوں کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے تھے لیکن نادیر خاص طور پر مش

لباس میں بے حد سچ رہی تھی۔ نادیر نے نادیر کے قریب نشست سنبھال رکھی تھی اور فرحان، راہیل

برابر براجمان تھا۔ رسموں کا سلسلہ شروع ہوا تو پہلے سمیرا خاتون نے اپنی ہونے والی بہو کو ہیروں

انگوٹھی پہنائی اور گیارہ سو روپے سلامی میں دیئے۔ پھر کرل عابد نے راہیل کو انگوٹھی پہنائی اور دو

ایک روپے سلامی کے دیئے۔ اس کے بعد دوسرے مہمانوں نے بھی تحفے تحائف پیش کئے۔

مبارک سلامت اور دوسری رسموں کا سلسلہ ختم ہوا تو مہمانوں کو کھانے کے لئے لان کے دوسر

حصے کی سمت لے جایا گیا جہاں میزوں پر انواع و اقسام کے کھانے نہایت سلیقے سے چنے ہوئے

منصور آج خاص طور پر اس پر تکلف تقریب کو مختلف زاویوں سے فوٹو گرافی کے ذریعے بطور یادگار

کر رہے تھے۔ ایک بار وہ راہیل اور نادیر کو فوکس کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے کہ نادیر کی

بے تکلف سہیلی نے قریب آ کر کہا۔ ”ہم سب دیکھ رہے ہیں کہ کیرے کے لینس کے ذریعے کیا تا

جھا تک ہو رہی ہے۔“

منصور چونکے، جواب دینا چاہتے تھے کہ دوسری لڑکی نے اُن کی توجہ اپنی سمت مبذول کرائی۔

نے تو سنا تھا کہ تصویر یار دل کے آئینے میں ہوتی ہے، لیکن آج کل کے ماڈرن مجنوں کیروں کا۔

لیتے ہیں۔“

”میں۔۔۔۔۔ آپ کا مقصد نہیں سمجھا۔“

”لیکن ہم آپ کا مقصد بخوبی سمجھ رہے ہیں۔“ پہلی لڑکی نے قدرے سنجیدگی کا مظاہرہ کیا۔ ”ا

کو اس طرح چوری چھپے نادیر کی تصویر نہیں اُتارنی چاہئے۔“

”آپ کی تعریف۔۔۔۔۔؟“ منصور نے سنبھل کر پوچھا

”مجھے نیلو فر کہتے ہیں۔۔۔۔۔ میں نادیر کی کلاس فیلو ہوں۔“

”خوش ہوئی آپ سے مل کر۔“ منصور نے شوخی سے کہا۔ ”اگر آپ نادیر کی ہم جماعت ہیں

میرا بھی کچھ رشتہ نکلتا ہے۔“

”کیا مطلب۔۔۔۔۔؟“ نیلو فر نے گھورتے ہوئے دریافت کیا

”مطلب بعد میں عرض کروں گا۔۔۔۔۔ فی الحال اگر آپ چہرے کی کڑختگی کو ایک لطیف سی مسکرا

تبسم میں بدل لیں تو تواضع ہوگی۔“ منصور کیرہ درست کرتے ہوئے بولے۔ ”ایک یادگار تصویر

کی بھی بنا لوں۔“ اُسی وقت نادیر مسکراتی ہوئی قریب آئی تو نیلو فر نے معنی خیز انداز میں کہا۔

”ذرا موصوف کو سنبھال کر رکھو۔۔۔۔۔ جگہ جگہ پھسلنے کے عادی نظر آتے ہیں۔“

”تصور کچھ تمہارا بھی ہے۔۔۔۔۔“ نادیر نے بڑی خوبصورتی سے منصور کی طرف داری کرتے

جواب دیا۔ ”آج تم واقعی قیامت ڈھا رہی ہو۔۔۔۔۔ میں بھی چھٹی چلی آئی۔“

منصور نے جلدی سے نادیر اور نیلو فر کی تصویر اُتاری، پھر شکریہ ادا کرتے ہوئے دوسری طرف

گئے تو نیلو فر نے سرگوشی کی۔ ”ایمان سے۔۔۔۔۔ تیرا یہ ہیر و سچ چاہے جانے کے قابل ہے۔“

لی بیگم نے کوئی جواب نہیں دیا، شائبہ بیگم کو ٹھٹھکی ماندھے حیرت سے دیکھتی رہیں..... شاید انہوں نے کی آواز نہیں سنی تھی..... یا سن کر نظر انداز کر گئی تھیں۔

لہم صاحبہ کو اس قدر غور سے کیوں دیکھ رہی ہیں؟“ نوشاہہ نے سمیرا خاتون کو ماں کی نگاہوں کا ہونے کی حیرت سے دریافت کیا۔

”..... کچھ نہیں.....“ نازی بیگم نے چونک کر نوشاہہ کی طرف دیکھا، پھر شائبہ سے باتیں کرنے

ن اُن کا ذہن ابھی تک شائبہ بیگم کی شخصیت میں الجھا ہوا تھا..... وہ چہرہ بڑا مانوس اور جانا پہچانا

ہا تھا..... یادوں کی لہروں میں ایک بالچلی سی پناہ تھی..... جانے کیوں رہ رہ کر یہی خیال آ رہا تھا

انہ بیگم کو پہلے بھی دیکھ کی ہیں..... پھر یکبخت اُن کی آنکھیں چمک اُنھیں..... جیسے راستے کی

ٹ گئی ہو..... تاریکی کا پردہ چاک ہو گیا ہو.....

لی بیگم نے نگاہوں کا زاویہ تیزی سے بدلا اور شائبہ بیگم کو پھر مجس نظروں سے دیکھنے لگیں.....!!



”پلیز..... آپ ہی ذرا پبلک کو سمجھائیں.....“

”پبلک ایک بار قابو سے باہر ہو جائے تو اس کا سنبھالنا آسان نہیں ہوتا۔“ نادیہ نے اکر کر جواب دیا،

”میں کب لاشی چارج کر رہا ہوں..... صرف ایک عدد تصویر کا سوال ہے..... شائبہ جی کے سامنے مسکرائی ہوئی۔

”آپ کے نام پر درخواست کی جا رہی ہے تو مبادولت نے قبول کیا۔“ نادیہ بولی، پھر شائبہ

میں بڑے پیار سے باہیں ڈال کر کھڑی ہو گئی..... منصور تصویر اُتار کر چلے گئے تو شائبہ نے پوچھا۔

”نوشاہہ نظر نہیں آ رہی..... کیا اُسے شرکت کی دعوت نہیں دی گئی؟“

”یہی سوال میں نے سمیرا آنتی سے کیا تھا۔“ نادیہ نے جواب دیا۔ ”نوشاہہ دراصل اپنی اسی

ساتھ کسی بیمار عزم کو دیکھنے گئی ہے..... اُس نے یہاں براہ راست آنے کو کہا تھا۔

اسی لمحے نیلو فر نے نادیہ کو آواز دی تو وہ شائبہ سے اجازت لے کر اپنی سہیلیوں کی طرف چلی گئی

نے ایک نظر شائبہ بیگم کو دیکھا..... اُسے قدرت کی ستم ظریفی پر ہنسی آ گئی..... کیسی عجیب سی چوہن شائبہ

خون کے رشتے اتنے فریب ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے اجنبیت کا اظہار کر رہے تھے.....

کارنگ ایک تھا..... لیکن اُس کی پہچان میں رد و بدل ہو گئی تھی..... نام بدل دئے گئے تھے..... جذ

کی صداقت صرف دل کی گہرائیوں تک محدود تھی..... ایک ایسی آہ کی مانند جولیوں تک آنے سے

تھی..... وہ ماں کو کچھ دیر تک حسرت بھری نظروں سے دیکھتی رہی پھر کسی بارے ہوئے جواری کی

گردن جھکا کر پتی تو پروفسر جمال احمد کو سامنے دیکھ کر بوکھلاسی گئی۔

”کیسی ہو شائبہ.....“ جمال احمد نے بڑی اپنائیت کا اظہار کیا، پھر بولے۔ ”مٹھائی کب کھلا رہی ہے

”مٹھائی..... کس بات کی؟“

”اپنی کامیابی کی۔“

”ابھی نتیجہ آنے میں دیر ہے.....“ اُس نے نہایت سادگی سے جواب دیا۔

”لیکن میں بڑے یقین اور اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ تمہارا نتیجہ شاندار ہو گا..... تمہاری توفیق

سے کہیں بہتر..... چونکا دینے والا۔“

وہ جواب میں کچھ نہ کہہ سکی..... مسکرا کر رہ گئی۔ جمال احمد اُس کے سر پر شفقت سے ہاتھ

چلے گئے تو اُس کا دل چاہا کہ پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دے..... اپنی بے بسی پر..... اپنی

اپنی کیفیت پر..... وہ اُس لہر کی مانند تھی جو تڑپتی ہوئی ساحل تک پہنچتی اور ٹکرا کر بے نیل

واپس لوٹ جاتی..... لہروں میں مل جل کر گہرے سمندر کی وسعتوں میں گم ہو جاتی۔

نوشاہہ کی آواز کانوں میں گونجی تو وہ ایک دم ہوش میں آ گئی۔

”کہاں تھیں تم؟ اتنی دیر سے انتظار کر رہی ہوں۔“ اُس نے نوشاہہ سے اپنائیت کا اظہار کیا پھر

عورت کو دیکھنے لگی جو نوشاہہ کے ساتھ کھڑی تھی۔

”یہ میری امی ہیں۔“ نوشاہہ نے تعارف کرایا تو شائبہ نے جلدی سے سلام کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے

”جیتتی رہو.....“ نازی بیگم نے دُعا دی، پھر دوبارہ اُن کی نظریں اُس سمت اٹھ گئیں جہاں

بیگم، سمیرا خاتون کے ساتھ کھڑی تھیں۔

نازی بیگم کی نظروں میں مجس تھا..... اضطراب تھا..... بے چینی تھی۔

”کیا بات ہے ماں.....؟“ نوشاہہ نے آہستہ سے پوچھا۔ ”آپ کا جی تو اچھا ہے.....؟“

نی.....“صائمہ نے تھوڑے وقف کے بعد کہا۔“آپ کو ہوسٹل میں ڈرتو نہیں لگتا؟“
.....کس بات کا؟“

پ وہاں اکیلے جو رہتی ہیں۔“
لپٹے کیوں؟ ہوسٹل میں میرے علاوہ اور بھی بہت ساری لڑکیاں ہوتی ہیں۔ تم نے دیکھا تو ہے۔“
ن آپ اپنے کمرے میں تو اکیلی ہوتی ہیں۔“
رے ٹیل بھی میرے ساتھ نگار رہتی ہے۔“ ثنائے آہستہ سے جواب دیا۔
تو رہتی ہیں..... لیکن گھر والا تو کوئی نہیں ہوتا.....“ صائمہ نے اپنا مدعا بیان کیا تو ثنائے ایک لمحے کو دراز بالوں میں کنگھا کرنے میں مصروف ہو گئی۔
نی.....“ صائمہ نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد دوبارہ اُسے آواز دی۔
.....

پ ہوسٹل میں کب تک رہیں گی.....؟“
ب تک پڑھائی کا سلسلہ ختم نہیں ہو جاتا۔“
ن چار سال.....“ صائمہ نے مصومیت سے حیرت کا اظہار کیا پھر بولی۔“پہلے تو آپ گھر پر ہی بیٹھیں۔“
کڑی کی پڑھائی بڑی مشکل ہوتی ہے اس لئے.....“
یا آپ اتنے دنوں ہم سے دور رہیں گی؟“ صائمہ نے اُس کا جملہ کاٹتے ہوئے اپنا نیت سے تو ایک لمحہ کو وہ گنگ سی رہ گئی، پھر جلدی سے بات بناتے ہوئے بولی۔
ہارا نتیجہ کب آ رہا ہے..... اب کے کیا ارادے ہیں..... فرحان سے بازی جیتو گی یا.....“
جان کا نتیجہ تو آ بھی چکا.....“ آپ کو نہیں معلوم کیا؟“
ے ہاں..... نادیہ نے بتایا تو تھا۔“ ثنائے دھڑکتے ہوئے دل سے جھوٹ بولا۔“میں فرحان باتو بھول ہی گئی.....“

جی! ایک بات پوچھوں آپ سے.....؟“
ہیو، کیا بات ہے؟“ ثنائے کنگھا ایک طرف رکھ کر صائمہ کے بالوں میں چوٹی گوندھتے ہوئے کہا۔
حالی ختم ہونے کے بعد تو آپ ہمارے پاس آ جائیں گی.....؟“
ائمہ.....“ ثنائے کا دل بھر آیا۔ خود پر قابو پاتے ہوئے دبی زبان میں پوچھا۔“کیا تم مجھے یاد کرتی ہو؟“
ب ہی یاد کرتے ہیں۔“ صائمہ بولی۔“امی جان تو روز کھانے کی میز پر آپ کی باتیں کرتی ہیں۔“
پچھا..... کیا باتیں کرتی ہیں.....؟“

رحان کہہ رہا تھا کہ آپ ڈاکٹر بننے کے بعد لندن یا امریکہ چلی جائیں گی..... اعلیٰ تعلیم حاصل کے لئے۔“

ناید ایسا ممکن ہو.....“ اُس نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔
روہاں سے واپس آنے کے بعد آپ کہاں رہیں گی.....؟“

ہتال میں.....“
ہتال میں کیوں.....؟“ صائمہ نے چونک کر پوچھا۔
باربن کر نہیں..... ڈاکٹر بن کر.....“ اُس نے پیار سے صائمہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔“مریضوں

صائمہ بال خشک کرتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی تو فرحان نے ثنائے سے دریافت کیا۔“
آپ..... آپ نے دو سال میں آدمی ڈاکٹری تو پڑھ لی ہوگی۔“
”ابھی نہیں..... ابھی تو ابتدا ہے۔“
”اور کتنے سال لگیں گے ڈاکٹر بننے میں.....؟“
”کم از کم تین سال.....“ وہ فرحان کے چہرے کی سنجیدگی کو محسوس کرتے ہوئے بولی۔“لڑکوں ہنگامے شروع کر دیئے تو ایک در سال ضائع بھی ہو سکتے ہیں۔“
”یہ لڑکے ہنگامے کیوں کرتے ہیں.....؟“

”اس لئے کہ امتحان نہ دینا پڑے۔“ صائمہ نے جلدی سے کہا۔“جب پڑھائی کا حال چوٹ ہے اور امتحان سر پر آ جائے تو یہی ایک راستہ ہوتا ہے بچت کا لڑکوں کے پاس۔“ صائمہ نے آخری پر زور دیا تو فرحان نے اُسے گھور کر دیکھا، پھر ثنائے سے شکایت کرتے ہوئے کہا۔
”آپ گواہ ہیں بڑی آیا! کہ اس وقت پہل کس کی جانب سے ہوئی ہے۔“
”میں نے کوئی غلط بات نہیں کی.....“ صائمہ نے بھائی سے کہا۔“مہیں یقین نہیں آتا تو باجی پوچھ لو۔“

”میرا شمار بھی تو لڑکوں میں ہوتا ہے..... میں نے تو امتحان کے دنوں میں کبھی ہنگامہ نہیں کیا۔“
میرا نتیجہ بھی ہمیشہ شاندار ہوتا ہے.....“ فرحان نے قدرے شان سے جواب دیا تو صائمہ بولی۔
”اخباروں میں شائع ہونے والے نتائج کو بھی دیکھ لیا کرو..... لڑکیاں ہمیشہ لڑکوں سے بازی لیتی ہیں۔“

”اس میں بھی مردوں کی رعایت شامل ہوتی ہے۔“ فرحان نے کہا۔“ممتحن مرد ہوتے ہیں لئے ترس کھا کر.....“
”شکل دیکھی ہے آئینے میں.....“ صائمہ چڑ کر بولی۔“ترس کھا کر رعایت کرتے ہیں..... بچار۔“
”جی بات ہمیشہ کڑی ہوتی ہے..... اس لئے کڑوی گولی کی طرح حلق سے نیچے ذرا مشکل اترتی ہے۔“

”فرحان!“ ثنائے پیار سے فرحان کو ٹوکا۔“صائمہ تمہاری بڑی بہن ہے..... اس کی عزت کیا کر“
”آپ کہتی ہیں تو آئندہ سے خیال رکھوں گا..... ترس کھا کر۔“ فرحان نے آخری بات آہستہ کبھی تھی تا کہ ثنائے سن سکے..... صائمہ کو فرحان کی اس بات پر جج غصہ آ گیا۔ لیکن قبل اس کے جواب میں کچھ کہتی باہر سے منصور نے فرحان کو آواز دی تو وہ صائمہ کو منہ چڑاتا ہوا تیزی سے کمرے سے باہر چلا گیا اور صائمہ اندر رہی اندر تمللا کر رہ گئی۔

”ادھر آؤ..... میں تمہارے بال سلکھا دوں“ ثنائے نے بڑی اپنائیت سے صائمہ کو قریب بلایا۔
اُسے اپنے سامنے قالین پر بٹھا کر اُس کے بالوں کو کٹھن سے سنوارنے لگی۔

ن گستاخی کی معافی چاہتی ہوں آپ! لیکن زندگی اتنی مختصر ہے کہ نام تو نہیں جسے ایک موڑ پر لا کر یا جائے اور پھر کسی ایسی منزل کی تلاش سے کیا حاصل جو ہوا کے جموں کے سے اپنا مقام تبدیل کر دے اگر مضبوط نہ ہوں تو انہیں توڑ دینا چاہئے..... آنکھوں سے ٹپکے ہوئے آنسو بڑے انمول ہیں لیکن صحراؤں کی چٹائی ریت پر گر جانے سے کیا فائدہ کہ اُن کی کمی کی دم بھر برقرار نہ رہ سکے۔“

ن تمہارا مطلب نہیں سمجھی.....؟“ ثناء نے دل کی دھڑکنوں کو سمیٹتے ہوئے کہا۔
ہ..... جو حالات کے غلام ہوں..... زندگی کے ہمسفر نہیں بن سکتے.....“ نادیا کا چہرہ غصے کی پیش آٹھا، ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی۔“ ان باتوں کو پوچھنے سے کیا فائدہ جو اپنی مرضی سے حرکت بھی

ن.....“ ثناء نے حالات کا غلط اندازہ لگایا ہے.....“ ثناء نے گھٹے گھٹے لہجے میں جواب دیا۔
ن..... حقیقت کیا ہے؟“

قیقت یہ ہے کہ ماں کے پیروں تلے جنت ہوتی ہے۔ یہ جنت رُوٹھ جائے..... چھن جائے تو اولاد اور اطمینان بھی ریت پر بنے گھر وندوں کی مانند مسمار ہو جاتا ہے..... تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔“
لطی کس کی ثابت ہوئی..... ریت کی؟ جس پر گھر وندے تعمیر کئے گئے..... یا اُس معمار کی جس بندے بنانے سے عیش تر اپنی ماں سے مشورہ نہیں کیا.....؟“

ن..... ثناء نے ٹھہرے ہوئے انداز میں سوال کیا۔
س تخلیق کار کو جس نے ایک خوبصورت کہانی میں زندگی کے شوخ رنگوں کی بجائے زہر گھول دیے نے نفرت کا اظہار کیا۔

ن نادان ہو.....“ ثناء کے ہونٹوں پر زہر خند ابھر آیا، ساٹ آواز میں بولی۔“ کہانی اور افسانے اور واقعات کا مرقع ہوتے ہیں جن کی ترتیب بگڑ جائے تو کرداروں کے رنگ بھی پھیکے نظر آتے درمیان کی ایک اہم کڑی کم ہو جائے تو افسانے کی شکل بھی ہمیشہ برقرار رہتی ہے..... اُسے مربوط انام نہیں دیا جاسکتا..... لیکن تم..... ان باتوں کو نہیں سمجھ سکو گی۔“

نادیا اس لئے کہ میں دو ٹوک فیصلہ کرنے کی عادی ہوں۔ پیچیدگیاں اور الجھاوے مجھے پسند نہیں۔“
ن صرف جذبات کی فراوانی رُوح کی تسکین کا سبب نہیں بن سکتی۔ زندگی کی خوشیاں اگر آسانی سے آئیں تو پھر انسان جدوجہد کیوں کرے؟ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا موت کی علامت ہے۔“
ن.....“ نادیا کی آنکھیں چمک اٹھیں۔“ یہی تو میں آپ کو سمجھانا چاہتی ہوں کہ آپ جسے منزل مانتے ہیں وہ فریب نظر ہے..... دھوکہ ہے..... سراب ہے جس کے تعاقب میں دوڑتے رہنے سے ہان ہو سکتے ہیں لیکن پیاس نہیں بجھ سکتی۔“

نادیا.....“ ثناء کی آنکھیں نمناک ہو گئیں، بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔“ کچھ زخم ایسے ہوتے ہیں ن.....“ ثناء نے ماسور کی شکل اختیار کر لیتے ہیں..... پھر اُن کا کوئی علاج نہیں ہوتا.....“

ن.....“ ثناء نے درخواست ہے کہ اس موضوع کو یہیں ختم کر دو!“

ن.....“ ثناء نے پوچھ لیا۔

ن.....“ ثناء نے پوچھ لیا۔

ن.....“ ثناء نے پوچھ لیا۔

کی خدمت کرنے کے لئے ڈاکٹروں کا قریب رہنا ضروری ہوتا ہے..... اسی کو بیمار داری کہتے ہیں۔“
ن.....“ ثناء نے شرارت سے جواب دیا تو صائمہ جلدی سے اُسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا، لاڈ سے بولی۔

ن.....“ ثناء نے شرارت سے جواب دیا تو صائمہ جلدی سے اُسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا، لاڈ سے بولی۔
ن.....“ ثناء نے شرارت سے جواب دیا تو صائمہ جلدی سے اُسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا، لاڈ سے بولی۔

ن.....“ ثناء نے شرارت سے جواب دیا تو صائمہ جلدی سے اُسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا، لاڈ سے بولی۔
ن.....“ ثناء نے شرارت سے جواب دیا تو صائمہ جلدی سے اُسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا، لاڈ سے بولی۔

ن.....“ ثناء نے شرارت سے جواب دیا تو صائمہ جلدی سے اُسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا، لاڈ سے بولی۔
ن.....“ ثناء نے شرارت سے جواب دیا تو صائمہ جلدی سے اُسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا، لاڈ سے بولی۔

ن.....“ ثناء نے شرارت سے جواب دیا تو صائمہ جلدی سے اُسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا، لاڈ سے بولی۔
ن.....“ ثناء نے شرارت سے جواب دیا تو صائمہ جلدی سے اُسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا، لاڈ سے بولی۔

ن.....“ ثناء نے شرارت سے جواب دیا تو صائمہ جلدی سے اُسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا، لاڈ سے بولی۔
ن.....“ ثناء نے شرارت سے جواب دیا تو صائمہ جلدی سے اُسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا، لاڈ سے بولی۔

ن.....“ ثناء نے شرارت سے جواب دیا تو صائمہ جلدی سے اُسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا، لاڈ سے بولی۔
ن.....“ ثناء نے شرارت سے جواب دیا تو صائمہ جلدی سے اُسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا، لاڈ سے بولی۔

ن.....“ ثناء نے شرارت سے جواب دیا تو صائمہ جلدی سے اُسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا، لاڈ سے بولی۔
ن.....“ ثناء نے شرارت سے جواب دیا تو صائمہ جلدی سے اُسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا، لاڈ سے بولی۔

ن.....“ ثناء نے شرارت سے جواب دیا تو صائمہ جلدی سے اُسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا، لاڈ سے بولی۔
ن.....“ ثناء نے شرارت سے جواب دیا تو صائمہ جلدی سے اُسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا، لاڈ سے بولی۔

ن.....“ ثناء نے شرارت سے جواب دیا تو صائمہ جلدی سے اُسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا، لاڈ سے بولی۔
ن.....“ ثناء نے شرارت سے جواب دیا تو صائمہ جلدی سے اُسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا، لاڈ سے بولی۔

ن.....“ ثناء نے شرارت سے جواب دیا تو صائمہ جلدی سے اُسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا، لاڈ سے بولی۔
ن.....“ ثناء نے شرارت سے جواب دیا تو صائمہ جلدی سے اُسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا، لاڈ سے بولی۔

ن.....“ ثناء نے شرارت سے جواب دیا تو صائمہ جلدی سے اُسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا، لاڈ سے بولی۔
ن.....“ ثناء نے شرارت سے جواب دیا تو صائمہ جلدی سے اُسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا، لاڈ سے بولی۔

... وہ نادیہ کو پلکیں جھپکائے بغیر دیکھتی رہی..... یوں جیسے نادیہ اُس کے اپنے حسین خوابوں کی جیتی تصویر ہو.....!!

’نا.....‘ شامکہ بیگم نے قدرے سنجیدگی سے دریافت کیا۔ ”تم بتاؤ بیٹی..... آخر بات کیا ہے؟ یہ تو نطرح بات کو اُلجھانے کی عادی ہے..... کہو کھیت کی اور سنے گی کھلیان کی۔“

’بات یہ ہے کہ نادیہ کے امتحان ختم ہو چکے ہیں اس لئے.....“

’مجھے اُس نتیجے کا انتظار ہے جو بغیر کسی امتحان کے نکلنے والا ہے۔“ نادیہ نے دوبارہ بات کو اُلجھایا تو بیگم جھلانے کی بجائے مسکرا دیں پھر شام سے بولیں۔

’آپا جان تمہیں اور نادیہ کو ایک دودن کے لئے اپنے گھر لے جانا چاہتی ہیں۔“

’جی.....‘ شام نے چونک کر شامکہ بیگم کو یوں دیکھا جیسے شامہ بیگم کی خواہش سن کر شدید حیرت ہوئی ہو۔

’مجھے معلوم ہے کہ تم کل واپس ہو سٹل جانا چاہتی ہو..... لیکن ایک دن میں بھلا ایسا کون سا فرق پڑ گا؟“ شامکہ بیگم نے بڑے لاڈ سے کہا۔ ”آپا جان نے بڑے چاؤ سے تم دونوں کو لے جانے کی رکی ہے..... اگر تم نے انکار کیا تو انہیں افسوس ہوگا۔“

’نا..... کوئی جواب نہیں دیا..... یہی سوچتی رہی کہ کیا جواب دے؟

’تم نہیں جانتیں شام..... آپا جان کا دل پہلے ہی ڈکھا ہوا ہے۔“

’کوئی خاص بات.....؟“ اُس نے نظریں اٹھا کر سوال کیا تو شامکہ بیگم شٹا کر رہ گئیں، بات بنانے اطر بولیں۔

’آپا جان نے تمہاری بیماری کا بہت گہرا اثر لیا ہے دل پر..... انہیں تمہارے ہو سٹل چلے جانے کا نوس ہے۔“

’بیماری میرے اختیار کی بات نہیں تھی۔ اور ہو سٹل میں قیام اس لئے ضروری ہے کہ میں اپنا مستقبل ناپا جاتی ہوں۔“ شام نے مدھم مگر ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”کیا آپ سب کو میرا مستقبل عزیز نہیں؟“

’یہ میں نے کب کہا.....؟“ شامکہ بیگم نے اپنی غلطی محسوس کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”تمہاری خوشی ہاری خوشی ہے..... تمہارا مستقبل شاندار ہو، یہ ہماری دلی تمنا ہے لیکن کسی کا دل رکھ لینے میں کوئی بھی نہیں۔“

’نا جواب میں اپنی مسکراہٹ پر قابو نہ پاسکی۔

’مسکراہٹ..... جو اُس کی زوچ کو خوشی کر کے لبوں تک آگئی تھی..... کتنے اربانوں اور نہ جانے کتنی م آرزوؤں کا خون چھلک رہا تھا اُس کی مسکراہٹ میں.....!! وقت نے کیسی مضحکہ خیز صورت

رک لی تھی..... وہ جسے سہاروں کی ضرورت تھی..... جسے حسرت تھی کہ کوئی اُس کے سر پر شفقت بھرا رکھ کر اُس کے غموں کو بھلا دے..... پیار کے ایک بیٹھے بول کی خاطر وہ اپنی زندگی بھی قربان کر

لیکن..... ڈکھوں نے جیسے اُس کے گرد احاطہ کر لیا تھا اور منادی کر دی تھی کہ کوئی اس حصار کو

لڑنے کی کوشش نہ کرے..... اُسے تنہا چھوڑ دیا جائے..... دنیا کے رحم و کرم پر..... حالات کی اُس

پر جس کے بیچ و خم اُس کے لئے اجنبی تھے..... اُسے تو خود اپنے زخموں کے لئے مرہم کی ضرورت

وہ دوسروں کے درد کا کیا درماں کرتی..... اور دوسرے بھی وہ..... جو اُس کے اپنے ہوتے

بھی غیر بن گئے تھے.....!!

فلک بچ رفتار کی یہ کروٹ بھی عجیب تھی..... اُس کا دل چاہا پوری شدت سے دیوانہ وار تہقہ لگانا

اختیار آگے بڑھی اور شام سے بڑے والہانہ انداز میں لپٹ کر آہستہ آہستہ سسکنے لگی۔

’نا اُس کی پیٹھ چھپھپاتی رہی، جب طوفان کی شدت کم ہوئی تو سب کچھ بھول کر بڑے پیار بولی۔“ نادیہ..... میں نے تمہاری شرط مان لی..... اب تم میری درخواست بھی قبول کر لو.....“

جواب میں نادیہ نے شام کو ایک نظر دیکھا پھر دوبارہ اُس کے سینے میں سما گئی..... بہت دیر تک دا

دھڑکنیں زبان بنی رہیں پھر باہر سے شامکہ بیگم کی آواز سنائی دی تو دونوں جلدی سے علیحدہ ہو گئیں۔

’میں نے تمہیں شام کو بلانے کی خاطر بھیجا تھا اور تم.....“ شامکہ بیگم اپنا جملہ مکمل نہ کر سکیں۔

’نا..... کی نمناک آنکھوں کو دیکھا تو حیرت سے بولیں۔“ یہ تم دونوں کی آنکھیں کیوں سرخ ہو رہی ہیں

’آپنی نے زلدا.....“ نادیہ نے پیار سے شکوہ کیا۔

’جھوٹ.....“ شامکہ بیگم نے شام کا ساتھ دیا۔ ”ضرورت میں شام کو پریشان کیا ہوگا۔“

’آپ کو میری بات کا یقین نہیں آتا تو آپی سے دریافت کر لیں!“ نادیہ نے شوخ لہجے میں گلہ

’یہی مجھے بھی اُکسار ہی تھیں۔“

’اُکسار ہی تھیں..... کس بات پر؟“

’گھر چھوڑنے پر.....“

’کیوں غلط بیانی کر رہی ہو.....“ شامکہ بیگم نے نادیہ کو ٹوکا پھر شام سے پوچھا۔

’تم بتاؤ بیٹی! یہ کیا اول فولیہ کے جارہی ہے؟“

’میں..... نادیہ کو سمجھا رہی تھی کہ.....“

’کہ یہ کمرہ جس میں ہم نے اتنے عرصے قیام کر لیا اب گنجائش کے اعتبار سے کچھ چھوٹا

ہونے لگا ہے اس لئے ہمیں یا تو ہو سٹل میں منتقل ہو جانا چاہئے یا پھر کسی نئے گھر کا بندوبست کر

چاہئے۔“ نادیہ نے شام کا جملہ اپنے انداز میں مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ”کیوں آپی..... آپ مجھے یہ

رہی نہیں نا.....؟“

’ہاں.....“ شام، نادیہ کے چہرے پر دکنے والی خوشیوں کو محسوس کرتے ہوئے بولی۔ ”تم نے

ٹھیک کہا ہے..... بس بات ذرا اُلجھ گئی ہے۔ ورنہ مقصد وہی ہے جو تم چاہتی ہو۔“

’میں چاہتی ہوں.....“ نادیہ نے شام کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”اللہ آپی! اس قدر سفید جھوٹ

ایمان سے بتائیے، بات کس نے شروع کی تھی؟“

’میں نے..... لیکن لڈو کہیں اور پھوٹ رہے ہیں۔“

’گھر..... ہو سٹل..... سفید جھوٹ..... لڈو.....“ شامکہ بیگم نے پوچھا۔ ”کچھ مجھے بھی تو معلوم

آخر بات کیا ہے؟“

’بات تو تھی..... جیسی تو بات سے بات نکلتے ہوئے لڈو تک آ پہنچی..... اب رہا یہ سوال کہ وہ

کیا تھی..... تو بات میں اس بات کا یہ آپ کو بھی ہو جائے گا..... مگر ابھی نہیں.....“ نادیہ نے شر

میں ماں کو اُلجھانے کی کوشش کی تو شام مسکرا دی۔

’نا..... نادیہ کے شگفتہ چہرے پر زندگی سے بھر پور مسکراہٹیں بڑی بھلی لگ رہی تھیں..... کسی گلاب کی

کلی کی مانند وہ کھلی پڑ رہی تھی..... اُس کی آنکھوں میں شرارتیں رقص کر رہی تھیں..... اُس کی حُسنِ

خوشیوں کے جلن رنگ بگ رہے تھے..... مسرتیں کھٹک رہی تھیں..... ایک آرزو کے تصور ہی نے اُسے

قدر بدست کر دیا تھا..... پانی کی گود میں کھلے اُس کنول کی مانند جو ہوا کی سرگوشیوں سے بھی چلک

کمرے سے باہر چلی گئی۔

نادیہ اس وقت بڑی مسرور تھی۔ آپ نے اُسے بلاوجہ خفا کر دیا۔“ ثنائے شامکے بیگم سے شکوہ کیا۔ مجھے اُس کی بے وقت کی راگنی اچھی نہیں لگی۔“

بہی راگنیاں کبھی زندگی کی علامت بن جاتی ہیں اور کبھی..... وہ روانی میں ایک تلخ بات زبان سے لاتے رک گئی، پھر کچھ سوچ کر بولی۔ ”میں نے نادیہ کو بڑی مشکلوں سے اپنی ایک خواہش ل پر آمادہ کیا تھا۔“

وہ کیا.....؟“

میں چاہتی ہوں کہ نادیہ اور منصور کا معاملہ جتنی جلدی خوش اسلوبی سے طے پا جائے اتنا ہی اچھا ثنائے رک رک کر جملہ مکمل کیا۔ شاید اس لئے کہ اُس نے پہلی بار بزرگوں کے سامنے زبان کی جسارت کی تھی۔

ہماری بھی یہی تمنا ہے لیکن جب تک.....“

یہ سب فرسودہ اور دقیانوسی باتیں ہیں۔“ اُس نے شامکے بیگم کا جملہ مکمل ہونے نہیں دیا۔ بڑے نرم لہجے میں بولی۔ ”مجھے ابھی اپنی تعلیم مکمل کرنی ہے..... منزل تک پہنچنے کے لئے ایک طویل سفر ہے..... عملی زندگی کے پڑچڑاستوں پر اپنے قدم بھانے ہیں۔ ہو سکتا ہے اس تک دو دو میں پانچ لک جائیں یا اس سے بھی زیادہ وقت درکار ہو۔ ایسی صورت میں کیا یہ مناسب ہوگا کہ میری ذات یہ کی خوشیوں کے درمیان حائل کیا جائے؟“

تمہاری دلیل نہایت مناسب اور معقول ہے۔ مگر دنیا کیا کہے گی؟“ شامکے بیگم نے اُسے سمجھانے کی..... ”لوگ تو یہی خیال کریں گے کہ میں نے اپنی خوشیاں پوری کرنے کی خاطر جلد بازی م لیا اور دوسروں کی مسرتوں کا ذرا لحاظ نہ کیا۔“

اپنی خوشیاں بہر حال اپنی ہوتی ہیں۔“ ثنائے دل میں اٹھتے طوفانوں کی شدت کو سینے کی اتھاہوں میں دباتے ہوئے کہا۔ ”انسان کو وقت اور حالات کا خیال بھی کرنا پڑتا ہے..... کبھی یوں بھی ہے کہ اپنی مسرتوں کی خاطر انسان کو خود اپنی خوشیوں کا گلا گھونٹنا پڑتا ہے..... وقت کی ضرورتوں کا اپنی دانشمندی ہے..... لوگوں کا کیا ہے..... وہ کچھ نہ کچھ تو ضرور کہیں گے۔ اور پھر دوسروں کی بات کی خاطر اپنی خوشیوں کو پامال کرنا بھی میرے نزدیک نامناسب ہے..... دیے آپ بزرگ..... تجربے کار ہیں..... مجھ سے زیادہ بہتر طور پر حالات کے نشیب و فراز کو سمجھ سکتی ہیں۔“

ارشاد کا ایک ایک جملہ، ایک ایک لفظ شامکے بیگم کے دل و دماغ پر نشتر بن کر چبھتا رہا..... ان زخموں کو گہرا جو پوری طور پر مندمل نہ ہو سکے تھے، وہ بہر حال ایک ماں تھیں..... اور ماں کی متانتیں ت کا یقین دلا رہی تھی کہ شاید کچھ کہہ رہی ہے اُسے نادیہ کی خوشیوں کی سفارش سمجھ کر نظر انداز لیا جاسکتا..... انہیں یقین ہو گیا کہ شاید حالات کا اندازہ ہو چکا ہے۔ وہ راز جو شامکے بیگم کی زندگی سے ہولناک سرمایہ تھا لپٹ چکا تھا۔

وٹا کے چہرے کو سہمی ہوئی نظروں سے نکلے جا رہی تھیں جہاں بظاہر ہنسیاؤں دکھائی دے رہا تھا لیکن ال کی نگاہیں اُس ہنسیاؤں کے اندر پوشیدہ اُن طوفانوں کو بھی محسوس کر رہی تھیں جو پھٹ پڑنے کے ل رہا تھا..... شامکے بیگم بھی اتنی بچہ نہیں تھیں کہ اس سنگین موزوں کو نہ دیکھ سکتیں جس پر ماں اور بیٹی سامنے کھڑے تھے..... شاید باتوں نے اُن کی یہ خوش فہمی بھی ختم کر لی کہ وہ حالات سے بے خبر

شروع کر دے اور چیخ چیخ کر کہے..... ”دیکھو دنیا والو..... میں وہی بد نصیب ہوں جسے وقت اندیشوں نے ماں کی آغوش سے گھٹھ کر دوسروں کے رحم و کرم پر ڈال دیا..... میری معصوم خوشیوں کیسے کیسے فریب دیئے گئے..... کتنی بے رحمی سے میری تمنائوں کا خون کیا گیا..... کس قدر بے دردی..... مجھے منزل سے دُور رکھا گیا..... مجھ سے میری اپنی شناخت چھین لی گئی..... وہ نقوش مٹا دیئے گئے مجھے میری منزل کا سراغ دے سکتے تھے..... لیکن میں نے کسی سے کوئی گلہ، کوئی شکوہ نہیں کیا..... ہر روز اپنے وجود کی گہرائیوں میں سمیٹ لیا..... کبھی اُف تک نہ کی..... کسی سے پناہ کی ہیک نہیں مانگی..... آج..... مجھے دوسروں کا دل رکھنے کی تلقین کی جا رہی ہے..... یہ کیسا مذاق ہے.....

ذرا سوچو..... جو خود بے سہارا ہو وہ بھلا کسی اور کو کیا سہارا دے گا..... جس کے اپنے ہونٹوں کی زوٹھ لگی ہو، وہ اوروں کی خوشیوں کا سامان کہاں سے فراہم کر سکتا ہے..... دیپ تو دیپ سے روشن جاتے ہیں..... دھوئیں کی بل کھاتی لہریں چراغ تو روشن نہیں کر سکتیں.....!! فنا اور بقا کا بھلا کیا جوڑ..... وہ اپنے خیالوں میں گم تھی، کسی حقیر تنکے کی طرح سرکش موجوں کے رحم و کرم پر ڈگمگ رہی تھی؟ جب شامکے بیگم نے کمرے میں قدم رکھا تو یکنخت سنبھل گئی..... دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے ا نے ایک نظر ماں کے چہرے پر ڈالی پھر جانے کیا سوچ کر نظر بھجوا لیں.....

”خدا نظر بد سے بچائے.....“ نادیہ نے خالہ کو دیکھ کر کہا۔ ”بڑی لمبی عمر ہے آپ کی..... ابھی آ ہی کا ذکر ہو رہا تھا۔“

”اور میں تم لوگوں کا باہر انتظار کر رہی تھی.....“ شامکے بیگم نے نادیہ سے مسکرا کر کہا۔ پھر ثنائے بولیں۔ ”تم کہاں گم ہو ثابتی؟“

”اپنے آپ کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔“ اُسے جواب دینے کا ایک موقع ہاتھ آ د ل کا غبار کچھ کم ہوا تو موقع کی نزاکت کے تقاضوں کو محسوس کرتے ہوئے بولی۔ ”منصور کہاں ہیں ابھی تھوڑی دیر پہلے تو اُن کی باتوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔“

”منصور، فرحان اور صائمہ کو لے کر ذرا بازار تک گیا ہے..... آتا ہی ہوگا۔“ شامکے بیگم نے کہا، دبی زبان میں پوچھا۔ ”وقار بھائی بتا رہے تھے کہ تم کل واپس ہو مل جا رہی ہو.....“

”ابھی تو تمہارا نتیجہ آنے میں دیر ہے.....“

”بس! کچھ دنوں کی بات ہے۔“ اُس نے سنبھل کر کہا۔ ”لیکن نتیجے کے انتظار میں وقت کا زیاں مناسب نہیں، میرا مطلب ہے کہ میڈیکل کی پڑھائی میں ایک ایک لمحہ بڑا قیمتی اور انمول ہوتا ہے۔“

”ایسا بھی کیا کہ انسان کو کھانے پینے اور ہنسنے بولنے کا ہوش بھی نہ ہو۔“

”آپ درست فرما رہی ہیں لیکن.....“ وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

”لیکن کیا.....؟“

”جو وقت برباد ہو چکا ہے اُس کی تلافی بہت ضروری ہے۔“ اُس نے دبی زبان میں کہا۔

”تلافی بھی ہوتی رہے گی۔“ شامکے بیگم بولیں۔ ”ابھی تو ایک عرصہ باقی ہے۔“

”اور تعلیمی مصروفیات کے ساتھ ساتھ آپ کو دیگر ذمہ داریاں بھی تو نبھانی ہیں۔“ نادیہ دبی زبان میں بولی۔ ”کچھ وقت کا زیاں تو ان ہنگاموں کی نذر بھی ہوگا..... کیوں آئی..... میں نے ٹھیک کہا تھا؟“

”تم کچھ دیر کے لئے خاموش نہیں رہ سکتیں؟“ شامکے بیگم نے نادیہ کو سرزنش کی تو وہ تیز تیز

ان کے ماضی کو نہ کر دیا جائے۔
 یکن جب حالات نے گروٹ بدلی اور اقبال احمد کے چڑھتے سورج کو گہن لگا تو یہی تصویر ان کی
 ن میں متعدد بار آنسوؤں کی نمی بن کر ابھری تھی۔ ایک بار نازی بیگم کے بے حد اصرار پر اقبال
 نے اس تصویر کی گرد صاف کرنے کی کوشش کی تھی۔ اپنے ماضی کے اس باب کو دہرایا تھا جس
 پر عورت کی کھٹی کھٹی چیخ شامل تھا۔ ایک ایسی بد نصیب کی داستان رقم تھی جو ہاتھوں کی مہندی
 نے سے پیشتر ہی بیوہ ہو گئی۔ جس کے ارمان دل کی گہرائیوں میں گھٹ کر رہ گئے۔ جو شوہر کے
 ہوتے ہوئے بھی مر گئی تھی لیکن ایک معصوم زندگی کو پروان چڑھانے کی خاطر جی رہی تھی۔

ہر یہ داستان جیتے ہوئے وقت کی طرح۔ یاد ماضی بن کر دھند میں گم ہو گئی۔ ایک مرد نے
 رہن بنایا، اس کی زندگی کے بائیں سے کھیلا رہا۔ اُسے کٹی سے پھول بنایا، پھر ہر جانی ہنسنے
 نڈاڑ کر اس کی زندگی سے دور چلا گیا۔ چڑھتے دریا کی سرکش موجوں کی طرح سکنتی آہوں اور
 ہارمانوں کو پل کر بہت دور نکل گیا۔

بندگی اس مرد کے لئے ایک تجارت تھی۔ اس نے کبھی گھائے یا خسارے کا سودا نہیں کیا۔
 نزل سے گزرا شاد ماں گزرا۔ قہقہے لگاتا رہا۔ دولت سمیٹا رہا۔ معصوم زندگیوں کو روندنا۔
 کے نشے میں سرشار اس منزل کی جانب رواں دواں تھا جس کا کوئی واضح نشان نہیں تھا۔ پھر
 لوفان کی شدت کم ہوئی۔ موجوں کا زور ٹوٹا تو وہ ایک کنارے پر آ کر کھم گیا۔ وقت نے اُسے
 ن طور پر بڑا نڈا حال۔ بڑا کمزور کر دیا لیکن اس کی ذہنیت نہ بدلی، دولت کی ہوس نے اس کی
 ن پر جو پٹی باندھ رکھی تھی اس نے اُسے زندگی کے تمام رشتے ناتوں سے بے نیاز کر رکھا تھا۔
 سکوں کے مقابلے میں اس کی نظروں میں اور کسی شے کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہی۔ وہ خود
 ہوتا جا رہا تھا لیکن اس کی خواہشیں۔ اس کی خباثتیں جو ان مسکوں کی مانند ہونے لگیں ہو رہی
 پھر دولت کی ہوس کا خسار اس روز ٹوٹا جب ہمیرا خاتون نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے
 جیل کی آہنی سلاخوں تک پہنچا دیا۔

اور پھر۔۔۔ جب قید و بند کی زندگی گزارتے ہوئے امراض نے اس کی زندگی کا احاطہ کیا تو اس کی
 اعانت دوبارہ بحال ہو گئی۔ اس کی بصارت روزانہ دیوار زنداں ہو گئی۔ پہلی بار اُسے اپنی
 کا بڑی شدت سے احساس ہوا۔ پہلی بار اس نے ہلک کر اپنے ماضی میں جھانکا تو اس کی رُوح
 مٹی۔ وہ کرب سے نڈا حال ہو گیا۔ پہلی بار وقت کی گرفت نے اُسے اپنے شکنجوں میں جکڑ کر
 اوت سے جھنجھوڑا تو سارے احساسات تڑپ کر بیدار ہو گئے۔

ثرافت! مرگوت! انسانیت!!!

اپنی سوتیلی بیٹی کی ہنسی مسکراتی زندگی کا سودا کرتے وقت اُسے رشتوں کے تقدس کا کوئی خیال نہیں
 ان جب قدرت کی بے آواز لاشی گھوی تو اُسے یاد آ گیا۔ اس کی اپنی بھی ایک بیٹی تھی۔ ایک
 زندگی۔ دولت کی ہوس کی خاطر۔ ہوس کی تسکین کی خاطر۔ زندگی کی ان گنت خوشیوں کو
 نے کی خاطر وہ اپنی خوشی فروخت کر آیا تھا۔ یکسر فراموش کر بیٹھا تھا لیکن جب اُسے ہوش آیا تو
 ارا احساس ہوا کہ وہ معصوم سی زندگی بے حد قیمتی۔ بڑی اُمول تھی۔

اور جیل سے کراچی کے لئے روانہ ہوتے وقت اقبال احمد نے بڑی رقت بھری آواز میں التجا کی
 "نازلی۔۔۔ مجھے یہیں پڑا رہنے دو۔۔۔ کراچی نہ لے جاؤ۔"

ہے۔ شاید یہی وجہ تھی جو شانے ان کی دلہیز چھوڑ کر ہوٹل میں رہنا گوارا کیا۔ ان کے بار بار بلانے
 کے باوجود وہ ہمیشہ کتڑا کر نکل جاتی۔ وقت نے اُسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ اپنی منزل تلاش کرے۔
 حالات کے اسی دورا ہے پر شانہ بیگم نے شانہ کو سمجھا نا مناسب نہیں سمجھا، دل پر جبر کر کے نہایت دور
 اندیشی سے کام لیتے ہوئے بویں۔ "ہم تمہارے بزرگ ضرور ہیں لیکن تم بھی نادیہ کی بڑی بہن ہو۔
 اُس کے لئے جو مشورہ دو گی وہ یقیناً اُس کی بہتری کے لئے ہوگا۔ نادیہ کا نتیجہ آئیے دو۔۔۔ پھر وہی
 ہوگا جو تمہاری مرضی۔۔۔ تمہاری خوشی ہوگی۔"

"شکریہ۔۔۔" شانے نادیہ کی خوشیوں کی خاطر زبردستی اپنے ہونٹوں پر تبسم جگا لیا۔
 "نا۔۔۔" شانہ بیگم نے بڑی حسرت بھری آواز میں کہا۔ "میری خواہش ہے کہ تم ہوٹل جانے
 سے پہلے ایک دو روز ہمارے پاس بھی رہو۔۔۔ کچھ ہمارا بھی حق ہے۔"

"کیوں نہیں۔" اُس نے تسکین سے کہا۔ "میں ضرور آؤں گی۔ لیکن ابھی نہیں۔ وقت آنے پر
 نادیہ کی بڑی بہن کی حیثیت سے اُس کے حصے کی خوشیاں مانگنے کی خاطر۔ اور میں بھی کوئی غیر تو نہیں۔"
 باہر سے نادیہ نے اُسے آواز دی تو شانے ماں کے چہرے پر لرزرتے سایوں کو بڑی حسرت سے
 دیکھا پھر خود کو سنبھالتی۔ شانہ بیگم کے قریب سے کتڑا کر باہر چلی گئی۔ شانہ بیگم، شانے کے
 بعد کچھ دیر تک کھلے دروازے کو نمناک نگاہوں سے دیکھتی رہیں، پھر صبر کا پیمانہ لبریز ہو کر چھلکنے لگا آیا تو بے
 اختیار بہن سے گلے لگ کر بڑے دردناک لہجے میں التجا کی۔

"شانہ۔۔۔ میری نا۔۔۔ میری بیٹی، مجھے واپس لوٹا دو۔۔۔"

○○○

نازلی بیگم نے اہم کا چوتھا صفہ پلٹا تو ان کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ پوری توجہ سے وہ اس
 تصویر کو دیکھنے لگیں جس میں اقبال احمد شیروانی اور پاچاے میں ملبوس ایک ایسی نوجوان عورت کے
 ساتھ کھڑے تھے جس کے خوبصورت جسم پر عریض لباس نظر آ رہا تھا۔ نازی بیگم کی نگاہیں عورت کی تصویر
 پر جم کر رہ گئیں۔

وہی ناک۔۔۔ وہی کتابی چہرہ۔۔۔ وہی کشادہ پیشانی جس پر مشرق کا تقدس دمک رہا تھا۔ بڑی
 بڑی حسین آنکھیں جن میں زندگی کی دھنک کے رنگ موجود تھے۔ وہی مخرطی ہونٹ جنہیں دیکھ کر
 قدرت کی صنائی کو بے اختیار داد دینے کو جی چاہے۔ اُسی انداز کا غراہ سوٹ جو جسم پر بچنے کے بعد
 پہننے والے کی شخصیت کو چار چاند لگا دے۔ لیکن وقت کی مسافت درمیان میں حائل نظر آ رہی تھی۔
 جس نے چہرے کے نقوش دھندلا دیے تھے۔ کشادہ پیشانی پر گزرے وقت کی کہانی رقم کر رہی
 تھی۔ خدوخال کی جاذبیت ڈھلتے وقت اور ماہ و سال کی لپیٹ میں آ کر کلاسی گئی تھی۔ دھوپ میں
 کھلے گلاب کی مانند جو سورج کی پیش کے آگے سرنگوں ہو جاتا ہے۔ غلافی آنکھیں بھی وہی تھیں لیکن
 حالات نے ان میں جیتے دنوں کی تھک گھول دی تھی۔ لبوں پر ان کی کہانیاں بچتی نظر آتی تھیں۔
 شخصیت میں اب بھی وہی آن بان تھی مگر ان کے رنگ پھلے اور مدھم پڑ چکے تھے۔

نازلی بیگم بڑی دیر تک عورت کی تصویر دیکھتی رہیں۔ ان کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ یہ انہی شانہ بیگم
 کی ایک یادگار تصویر تھی جو اُس وقت چھپی گئی تھی جب وہ اقبال احمد سے منسوب تھیں۔ مگر بے وقت
 کی یہی ایک ایسی نشانی تھی جسے اقبال احمد نے بہت احتیاط سے سنہال کر رکھا تھا۔ نازی نے کئی بار
 اُس تصویر کے بارے میں دریافت کیا لیکن اقبال احمد نے یا تو مسکرا کر ٹال دیا۔ یا سختی سے سرزنش کر

عدہ کرو! کہ میری بات صبر و تحمل اور ٹھنڈے دل سے سنو گی۔“

عدہ.....
ہ تصویر جو میرے اہم میں محفوظ ہے اُس سے میری زندگی کا ایک رشتہ ابھی تک قائم ہے۔“
آپ دل لگا کر اپنا علاج کرا لیں..... میں وعدہ کرتی ہوں کہ آپ کے اور تصویر کے رشتے کے
سے.....

میں نازی..... مجھے غلط نہ سمجھو۔“

پھر آپ نازی سے اور کیا چاہتے ہیں؟“

صرف ایک عہد..... ایک چھوٹا سا وعدہ۔“ اقبال احمد نے ٹوٹے ہوئے انداز میں کہا۔ کچھ دیر
رہے پھر ایک طویل سانس لے کر بولے۔“ اُس وفا شعار عورت نے میری خوشیوں کو جنم دیا تھا
اُسے ٹھکرا کر اتنی دُور نکل آیا جہاں سے پلٹ کر واپس دیکھنا میری بساط سے باہر ہے..... مجھے
میں معلوم کہ میری خوشیاں زندہ ہیں یا.....“ اقبال احمد اپنا جملہ مکمل نہ کر سکے، کھانسی کا دورہ پڑا تو
اُس ہو گئے، کھانسی کے ساتھ پہلی بار نازی نے شوہر کے منہ سے خون نکلتے دیکھا تو اوسان خطا ہو
کھلا کر بولیں۔

یہ آپ کے منہ سے خون کیوں نکل رہا ہے.....؟“

قدرت شاید مجھ سے اسی دنیا میں میرے گناہوں کا خراج وصول کرنا چاہتی ہے..... اچھا ہے۔

سر سے اتر جائے قیمتی ہے.....“ اقبال احمد نے ہانپتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر نے کیا مرض تشخیص کیا ہے.....؟“

چپ دق.....

اور آپ نے آج تک مجھ سے چھپائے رکھا.....“ نازی بیگم نے شکوہ کیا۔

بتانے سے فائدہ بھی کیا تھا..... تمہارے ڈکھوں میں اور اضافہ ہو جاتا.....“

آپ پریشان نہ ہوں۔“ نازی بیگم نے شوہر کی ڈھارس بندھانے کی خاطر بڑے یقین سے کہا۔

دق اب اتنا مہلک مرض نہیں رہا جتنا پہلے تھا..... اگر بروقت علاج ہو جائے تو انسان بالکل

ت ہو جاتا ہے۔“

شاید قدرت کو تمہاری بے کسی پر رحم آجائے۔“ اقبال احمد نے بیوی کے لہجے میں چھپے درد کو محسوس

رہے۔“ میں تمہیں اپنی معصوم بچی کے بارے میں بتا رہا تھا جسے میں نے زندگی میں ایک بار بھی

دیکھا۔ شاید یہی حسرت میری زندگی کو سہارا دیئے ہوئے ہے۔ ہاں نازی..... میں اپنی بیوی کو صرف

بار دیکھنا چاہتا ہوں..... دُور ہی سے سہی..... اُس کے بعد مجھے اپنی موت کا کوئی غم نہیں ہوگا۔“

”کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کی بیٹی کہاں ہے.....؟“ نازی بیگم نے کہا۔ ”میرا مطلب ہے کہ

لی ماں کا نام کیا ہے..... کون ہے..... کہاں رہتی ہے..... اُسے کس طرح تلاش کیا جاسکتا ہے.....؟“

”میری تو فاسوس ہے کہ میں اُس کا نام اپنی زبان تک نہیں لاسکتا.....“

”کیوں.....؟“

”وہ مجھ سے بہت بلند ہے..... بڑی عظیم ہے اور..... اب مجھے اُس سے کیا لینا..... اگر کوئی تمنا ہے

رف اتنی کہ اپنی بچی کی ایک جھلک دیکھ لوں..... اب تو وہ سیانی ہو گئی ہوگی..... نوشاہیہ کی طرح۔“

آپ مجھے اُس عورت کا نام اور پتہ دیں..... میں وعدہ کرتی ہوں کہ یہ راز میرے دل کی

”کیوں.....؟“ نازی نے دریافت کیا۔ ”کیا آپ کو اپنا علاج نہیں کرانا..... کتنی مشکلوں سے
میں نے سمیرا خاتون کے آگے ہاتھ باندھ کر، منت سماجت کر کے آپ کے کراچی منتقل کئے جانے
بندوبست کرایا ہے۔“

”میں سمیرا خاتون کا یہ احسان کبھی نہ بھولوں گا لیکن.....“

”لیکن کیا؟“ نازی بیگم نے شوہر کی آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے چمکتے دیکھے تو بے چین

گئیں۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔ ”آپ کچھ کہتے کہتے خاموش کیوں ہو گئے..... کیا سوچ رہے ہیں؟

”میں اپنی بیماری کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔“ اقبال احمد نے ہونٹ کاٹنے ہوئے جواب دیا

”اسی بیماری کے علاج کی غرض سے تو میں آپ کو کراچی لے جانا چاہتی ہوں۔“

”میں..... اپنا علاج نہیں کرنا چاہتا۔“

”کیوں.....؟“ نازی بیگم نے حیرت سے دریافت کیا۔

”اس لئے کہ مجھے اپنی غلطیوں کا کفارہ ادا کرنا ہے..... میری روح پر زندگی کے کچھ قرض باقی ہیں

میں انہیں چکانا چاہتا ہوں..... ایسی اذیتاں موت سے جو میرا مقدر بن چکی ہے۔“

”ایسا مت کیجئے! موت اور زندگی خدا کے اختیار میں ہے۔“ نازی بیگم نے شوہر کے غموں کو دلا

دینے کی کوشش کی۔ ”وہ غفور الرحیم ہے..... بڑا کریم ہے..... اُس کی رحمتوں سے مایوسی گناہ ہے۔“

”کراچی جا کر میرا مرض کم نہیں ہوگا..... ڈکھوں میں اور اضافہ ہو جائے گا۔“

”آپ پریشان نہ ہوں..... میں آپ کے پاس رہوں گی۔ اور ہاں..... نوشاہیہ نے بھی میر

ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

”نوشاہیہ.....“ اقبال احمد نے بڑے درد بھرے لہجے میں سوتیلی بیٹی کا نام اپنی زبان سے دہرایا۔

”سمیرا خاتون نے اپنے کاروبار کی ایک شاخ کراچی میں بھی کھولی ہے۔ نوشاہیہ وہیں کام کرے گی۔

”میری زندگی کا آغاز بھی کراچی سے ہوا تھا..... کچھ بھولی بسری یادیں جیل کی ویرانیوں میں

میرا تعاقب کرتی رہتی ہیں۔“

”ڈاکٹر نے آپ کو خوش رہنے کی تاکید کی ہے.....“

”مجھے یاد ہے۔“

”اور آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اپنے ماضی کے بارے میں نہیں سوچیں گے۔“

”اب..... سوچنے کے لئے باقی ہی کیا رہا ہے؟“ اقبال احمد نے سکتے ہوئے کہا تو نازی بیگم۔

چین ہو گئیں۔ شوہر کے ویران اور آجائز چہرے کو محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولیں۔

”آپ کی زندگی پر کچھ ہمارا بھی حق ہے۔“

”نازی.....“ اقبال احمد تڑپ اٹھے۔

”اگر خدا خواستہ کچھ ہو گیا تو میرا کیا بنے گا..... میں کس کے سہارے جیوں گی؟ نوشاہیہ کے سر

کون ہاتھ رکھے گا..... کون اُسے ذہن بنا کر ڈولی میں بٹھائے گا..... کون گلے لگا کر رخصت کرے گا۔

”بس کرو نازی..... خدا کے لئے بس کرو۔“ اقبال احمد نے آہنی سلاخوں پر اپنی گرفت مضب

کرنے کی ناکام کوشش کی۔ بڑے اداس اور نحیف لہجے میں کہا۔ ”تمہاری خوشی کی خاطر کراچی چلے

تیار ہوں مگر ایک شرط پر.....“

”مجھے آپ کی ہر شرط قبول ہے۔“

گہرائیوں میں دفن رہے گا۔“

”نہیں.....“ اقبال احمد نے جواب دیا۔ ”میں اپنے گناہوں میں اضافہ نہیں کرنا چاہتا۔“

”اور آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں.....؟“

”ایک مختصر سا وعدہ..... زندگی کے کسی سوڑ پر اگر وہ تصویر تمہارے سامنے آجائے تو اس کا تعاقب کر کے میری بچی کا سراغ ضرور لگانا..... اگر میں زندہ رہوں تو کسی بہانے سے مجھے میری بیٹی ایک نظر دکھا دینا اور اگر مر جاؤں تو اُسے اس بات کا یقین دلا دینا کہ میں نے آخری سانسوں تک اُسے بڑی شدت سے یاد کیا تھا.....“

پھر بات ادھوری رہ گئی۔ ملاقات کا وقت ختم ہوا تو نازی بیگم اپنے دکھوں کو سمیٹے واپس گھر آ گئیں۔ اس کے بعد نہ اقبال احمد نے اُس کا ذکر چھیڑا نہ نازی بیگم نے اس خیال سے کریدنا مناسب سمجھا کہ زخم دوبارہ ہرے ہو کر رسنے لگیں گے..... لیکن جب سے انہوں نے شبانہ بیگم کو دیکھا تھا شوہر کی آخری خواہش رہ رہ کر اُن کے ذہن میں کروٹیں لے رہی تھی۔

دروازے پر قدموں کی آہٹ سنائی دی تو نازی بیگم نے الم کو جلدی سے بستر کے نیچے چھپا دیا، نوشابہ کو آتے دیکھا تو اٹھ کھڑی ہوئیں، پرانی ٹائم ٹیٹس پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔ ”آج تم وقت سے پہلے کیسے آ گئیں..... ابھی تو ایک بجھی نہیں بجا.....“

”بیگم صاحبہ کو ایئر پورٹ چھوڑ کر آ رہی ہوں۔“ نوشابہ نے ہاتھ میں دبا پرس بستر پر اچھالتے ہوئے کہا، پھر ماں کے قریب آتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو ایک خوشخبری بھی سنائی ہے..... بیگم صاحبہ کی مہربانی سے سول ہسپتال میں علاج کرانے کی اجازت بھی مل گئی ہے..... مریض کو ایک دو روز میں جیل سے ہسپتال منتقل کر دیا جائے گا۔“

”وہ مریض تمہارا باپ ہے نوشابہ.....“ نازی بیگم نے بیٹی سے شکوہ کیا۔ ”کیا تم اُسے کبھی باپ تسلیم نہیں کرو گی..... میرے حوالے سے بھی نہیں.....؟“

”سوری اماں.....“ نوشابہ نے ماں کا دل رکھنے کی خاطر دل پر جبر کر کے کہا۔ ”میرا مطلب یہی تھا کہ اب ابا جان کی دیکھ بھال اور تیمارداری زیادہ بہتر طور پر ہو سکے گی.....“

”ہسپتال کے اخراجات کون برداشت کرے گا.....؟ بیگم صاحبہ کے ہمارے اوپر ویسے ہی بہت احسان ہیں۔“

”آپ اس کی فکر نہ کریں اور جلدی سے کھانا نکالیں..... مجھے بڑی زور کی بھوک لگ رہی ہے۔“ نوشابہ نے ماں کو ٹالنے کی خاطر کہا، پھر منہ ہاتھ دھونے اور لباس تبدیل کرنے کی غرض سے غسل خانے میں چلی گئی۔

کچھ دیر بعد وہ باہر آئی تو نازی بیگم کھانے پر اُس کا انتظار کر رہی تھیں۔ کھانے کے دوران نوشابہ اپنی دفتری مصروفیات کے بارے میں بتاتی رہی، پھر جب وہ کھانے سے فارغ ہو کر آرام کرنے کی غرض سے لیٹی تو نازی بیگم نے دلی زبان میں دریافت کیا۔

”راجیل اور تادہ کی شادی کے بارے میں کیا طے پایا.....؟“

”ابھی تو ممکن ہی ہوئی ہے..... شادی اتنی جلدی کیسے ہوسکتی ہے؟ لیکن میرا خیال ہے بیگم صاحبہ زیادہ دیر بھی پسند نہیں کریں گی۔“ نوشابہ نے دھکم پیل میں کہا۔ ”اُن کے آنے کے بعد ہی کچھ پتہ چلے گا۔“

”تم نے ایک بار ذکر کیا تھا کہ پہلے راجیل کی شادی کی بات شامکہ بیگم کی کسی بیٹی سے ہو رہی تھی۔“ کچھ سلسلہ تو تھا..... لیکن رشتہ طے نہ ہو سکا۔“

”کوئی خاص وجہ.....؟“

”مجھے پوری طرح حالات کا علم نہیں مگر میرا خیال ہے جب بیگم صاحبہ نے رشتہ دیا اُس وقت نادیہ دونوں کی بات طے ہو چکی تھی۔“ نوشابہ نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ”نادیہ کا رشتہ تو اُس کے ادبھی منصور سے طے ہوا ہے..... وہی جو اُس روز منگنی میں سب کی تصویریں کھینچتے پھر رہے تھے باجی کی بات اُن کے تایا کے بیٹے احمر سے طے ہوئی ہے۔“

”منصور کی والدہ کا کیا نام ہے.....؟“ نازی بیگم نے یوہی پوچھ لیا۔

”شبانہ بیگم..... آپ کو بتایا تو تھا پہلے.....“

”کیا منصور کے علاوہ شبانہ بیگم کی کوئی اولاد نہیں.....؟“ نازی بیگم نے اصل مقصد کی طرف آتے ہیجڑی سے دریافت کیا۔

”نہیں..... منصور اُن کے اکلوتے بیٹے ہیں۔“ نوشابہ نے جمائی لیتے ہوئے کہا پھر کروٹ بدل لی

نازی بیگم بڑی حسرت سے سوچنے لگیں..... کیا بیٹی سے ملنے کی آرزو حسرت بن کر آخری

ن تک ایک باپ کی بے چین رُوح کو ڈستی رہے گی.....؟؟

○○○

شام ہی سے لڑکیوں کے درمیان یہ افواہ گرم تھی کہ نتیجہ آنے والا ہے۔ ہوٹل کی تمام لڑکیاں باہر

پر بھی آپس میں رزلٹ کے بارے میں جھگڑائیں کر رہی تھیں، کچھ لڑکیوں نے اخبار کے دفتروں

ان نمبر کھڑکھڑانے شروع کر دیے تھے لیکن انہیں اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی..... تمام

ات سے ایک ہی جواب دیا گیا..... ”ہمارے پاس رزلٹ کی ابھی کوئی اطلاع نہیں.....“

”مجھے پہلے ہی شبہ تھا کہ نتیجہ والی اطلاع غلط ہوگی۔“ ایک لڑکی نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

”بڑی جی سانس لی تم نے.....“ دوسری نے استفسار کیا۔ ”خیریت تو ہے؟“

”اچھا ہوا جو رزلٹ ایک دن اور مل گیا.....“

”کیا مطلب.....؟“

”خدا جانے ہمارا کیا انجام ہوتا؟ پاس ہو جاتے تو واہ واہ ہوتی لیکن اگر کہیں لڑھک گئے ہوتے تو گھر

ما سے یہی بہانہ کرنا ہوتا کہ متحج نے یا تو اقربا پروری سے کام لیا ہے یا جان بوجھ کر دشمنی کی ہے۔“

”مگر تم تو کہہ رہی تھیں کہ تمہارے سارے پرچے اچھے ہوئے ہیں..... پریکٹیکل میں بھی کوئی

رہی نہیں ہوئی۔“

”اتحان دینے کے بعد ننانوے فیصد طالب علم یہی ظاہر کرتے ہیں کہ امتحان ہال میں اپنی قابلیت کا بڑا

لا کر آئے ہیں لیکن اصلیت تو اُس وقت ظاہر ہوتی ہے جب ڈھونڈے سے رول نمبر کہیں نظر نہیں آتا۔“

”لیکن نتیجے کا انتظار بھی بڑا جان لیوا ہوتا ہے..... گردن جیسے سولی پر لٹکی ہوئی ہے۔“

”ذرا اُس ریحانہ کو دیکھو..... ایسی مطمئن نظر آ رہی ہے جیسے اُسے رزلٹ کی مطلق کوئی پرواہ نہ ہو۔“

”خون جلانے سے فائدہ.....“ ریحانہ نے بڑے پتے کی بات کی۔ ”جو مقدر میں لکھا ہو گا سامنے آ

گا۔“

”جانا تو پڑے گا۔۔۔۔۔“ نگار نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”بے کچھ ایسی ہی بات۔۔۔۔۔“

”خیریت۔۔۔۔۔؟“ شانے اُس کی مسکراہٹ کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

”ابھی یقین سے نہیں کہہ سکتی۔۔۔۔۔ مگر میرا خیال ہے کہ گھر میں کچھ پھنسی پک رہی ہے۔“

”پھر۔۔۔۔۔ کیا تمہاری پڑھائی کھٹائی میں پڑ جائے گی؟“

”ناممکن۔۔۔۔۔“ نگار بولی۔ ”میڈیکل تو میں ہر قیمت پر کمپلیٹ کروں گی۔۔۔۔۔“

”اور اگر کوئی چکر چل گیا تو۔۔۔۔۔؟“

”اس کی نوبت نہیں آنے دوں گی۔۔۔۔۔“

”اگر یہ بات ہے تو پھر لوگوں کے سامنے آنے سے فائدہ۔۔۔۔۔؟“

”مئی کی خوشی کی خاطر مجھے مجبوراً جانا پڑے گا۔“ نگار بولی۔ ”میں نے شاید تمہیں مئی کی کیفیت کے بارے میں نہیں بتایا۔“

”کیا مطلب۔۔۔۔۔؟“

”مئی کو خلیان کے دورے پڑتے ہیں۔ ڈاکٹروں نے بڑی سخت تاکید کر رکھی ہے کہ انہیں خوش کی کوشش کی جائے ورنہ مرض بڑھ کر خطرناک صورت بھی اختیار کر سکتا ہے۔۔۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ہاسپیٹ سے انکار نہیں کرتے۔۔۔۔۔ وہ جس بات کی ضد کرتی ہیں وہ مان لی جاتی ہے لیکن دورے بہت زیادہ دیر نہیں رہتی۔۔۔۔۔ نارمل ہونے کے بعد ہم سمجھا سمجھا کر مئی سے اپنی بات منوا لیتے۔۔۔۔۔ مجھ سے تو وہ خاص طور پر ٹوٹ کر محبت کرتی ہیں۔۔۔۔۔ مجھے یاد نہیں کہ مئی نے آج تک میری کسی لپو پورا نہ کیا ہو۔۔۔۔۔“

نگار کے ساتھ باتیں کرتی وہ لان کے حصے میں آئی تو لڑکیوں کے درمیان پھر زلزلے کے بارے میں گرم بحث جاری تھی۔ لڑکیوں کا ایک گروپ اس بات پر اڑا ہوا تھا کہ جب اخبار والوں کو سرے سے قہقہے کا کوئی علم ہی نہیں تو دوسرے دن اس کے آؤٹ ہونے کا سوال ہی نہیں تھا۔ لیکن دوسرا گروپ نیال کا اظہار کر رہا تھا کہ اخبار والوں نے محض اس لئے طلباء برادری سے جھوٹ بولا ہے کہ لڑکے کو معلوم کرنے کے لئے اُن کے دفاتر پر بلہ نہ بول دیں۔ نگار اس بحث سے کتراتا جا رہی تھی۔ ریحانہ نے آواز دی تو اُسے چاروٹا چار جانا پڑا۔۔۔۔۔ شاخاموشی سے قدم اٹھاتی کمرے میں آگئی۔

جانے کیوں اُس کے سر درد میں چائے پینے کے باوجود کوئی کمی واقع نہیں ہوئی، طبیعت پر کچھ عجیب البوجھل سے اثرات مرتب ہو رہے تھے۔ وہ لباس تبدیل کئے بغیر یوں ہی کچھ دیر آرام کی غرض ستر پر لیٹ رہی۔ آنکھیں بند کیں تو ماں کا چہرہ نگاہوں کے سامنے ابھر آیا۔۔۔۔۔ ذہن پر ہلکی ہلکی لاسی طاری ہونے لگی۔

شانہ بیگم نے کتنے چاؤ سے اُسے گھر آنے کی دعوت دی تھی۔۔۔۔۔ کتنی حسرت سے یہ یاد کرانے کی ناک تھی کہ شانہ پر اُن کا بھی کچھ حق ہے۔۔۔۔۔ ایک لمحے کو تو اُس کا دل چاہا کہ ماں کے ساتھ چلی۔۔۔۔۔ اپنے سکون کی خاطر نہ سہی، ماں کی متنا کی خاطر، اُن کا دل رکھنے کی خاطر ہی بات مان لیتی لیکن سنے دل پر چہر کر کے بڑی خوبصورتی سے بات بنا دی۔۔۔۔۔ شاید اس لئے کہ وہ اپنی زندگی میں کوئی کوئی مزید بدگئی نہیں پھیلاتا جا رہی تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ اگر بھی سوئے ہوئے جذبوں میں طغیانی تو زندگی کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔۔۔۔۔ رشتوں کا بھرم ٹوٹا تو مصلحتوں کا شیرازہ بکھر جائے گا۔

ال کے بارے میں سوچتے سوچتے وہ نیند کی وادیوں میں گم ہو کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئی۔۔۔۔۔

”ہم خوب جانتے ہیں تمہارے اطمینان کی وجہ۔۔۔۔۔“ ایک لڑکی نے تیزی سے کہا۔ ”تمہارے اچونکہ مشہور و معروف سرجن ہیں اس لئے اُن کی سفارش تمہارے کام آئے گی۔۔۔۔۔“

”اور میں نے جو مہینے بھر سے کمرے میں بند ہو کر گھونٹا لگاتا شروع کیا ہوا تھا۔۔۔۔۔ وہ کس کھاتے جائے گا؟“ ریحانہ نے احتجاج کیا۔

”زلزلے آنے کی اطلاع سب سے پہلے کس نے دی تھی؟“ ایک لڑکی نے سوال کیا۔

”مجھ سے تو ارجمند نے کہا تھا۔“

”اے خبردار۔۔۔۔۔“ ارجمند نے جان چھڑانے کے لئے جلدی سے جواب دیا۔ ”میرا نام بلا وجہ کیہ بدنام کرتی ہو؟ مجھ سے نتیجے کا ذکر شہلانے کیا تھا۔۔۔۔۔ میں نے تمہیں بتا دیا۔“

”لیکن یہ شہلا کہاں ہے۔۔۔۔۔ کہیں نظر نہیں آ رہی۔“

”ابھی اُس کی صبح نہیں ہوئی۔“ دوسری بولی۔ ”اپنے کمرے میں بند خراٹے لے رہی ہوگی۔“

”کیا خیال ہے۔۔۔۔۔ اُسے چل کر جگایا نہ جائے؟“

”فائدہ۔۔۔۔۔ اگر وہ کمرے سے نکلی بھی تو یہاں کسی بیچ پر لیٹ کر انا غفیل ہو جائے گی۔“

”عجب طبیعت کی مالک ہے۔۔۔۔۔ دن بھر گھوڑے بیچ کر سوتی ہے اور رات بھر پڑھتی رہتی ہے۔“

”ڈاکٹر بننے کے بعد کیا کرے گی؟“

”ٹائٹ ڈیوٹی۔۔۔۔۔ مریضوں کو ساری رات جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اُن کی خیریت دریافت کرتی پھرے گی۔“

”کچھ بھی ہو۔۔۔۔۔ لڑکی ذہین ہے۔ میٹرک میں فرسٹ ڈویژن کے ساتھ تین مضامین میں اعزاز نمبر حاصل کئے تھے۔ ایف، ایس، سی میں بھی سیونی سیون پرسنٹ لائی تھی۔“

”مجھے تو میڈم نسرین سے خوف محسوس ہو رہا ہے۔“ ایک اور لڑکی نے کہا۔ ”اُن کے موڈ کا کوئی نہیں۔ ہنستی بھی ہیں تو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ غصے میں بیٹھی نکال رہی ہیں یا بیچ بچ بچ پر ظلم ڈھا رہی ہیں۔“

”جھوڑواں باتوں کو۔۔۔۔۔“ ریحانہ بولی۔ ”اچھی خاصی شرم زلزلے کے خوف سے برباد ہو گئی۔“

ایک دو گیم بیڈمنٹن کے ہو جائیں۔“

”سوری۔۔۔۔۔ اس وقت ذرا موڈ نہیں ہے۔“

وہ بھی نگار کے ساتھ لڑکیوں کے درمیان بیٹھی ہنستی مسکراتی رہی، پھر جب درختوں کے سائے پھیل کر لے ہوئے لگے تو جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کہاں چلیں۔۔۔۔۔؟“ نگار نے پوچھا۔

”اپنے روم میں جا رہی ہوں۔۔۔۔۔“

”خیریت۔۔۔۔۔؟“

”سر میں خفیف درد سامحوس ہو رہا ہے۔۔۔۔۔ کچھ دیر آرام کر لوں تو شاید جاتا رہے۔“

”چلو! چائے پیتے ہیں۔“ نگار بولی۔ ”نتیجے نے اچھی خاصی بوریت پھیلا دی۔“

نگار نے اصرار کیا تو وہ اُس کے ساتھ ہوئی۔۔۔۔۔ چائے پی کر واپس لوٹی تو راستے میں نگار۔

پوچھا۔ ”زلزلے آنے کے بعد تمہارا کیا پروگرام ہے؟“

”پروگرام سے تمہارا کیا مطلب ہے۔۔۔۔۔ ظاہر ہے کہ نئے سال کی پڑھائی شروع کروں گی۔“

”میں غالباً تین چار روز کے لئے گھر چلی جاؤں۔“

”اتنے دنوں سے خیال کیوں نہ آیا؟“ شانے کہا۔ ”کالج کھلنے کے بعد جا کر کیا کرو گی؟“

میری آنکھوں کی نیند بھی اُجاٹ ہو گئی ہے..... میں بھی گھٹن کے احساس سے تڑپتا رہتا ہوں.....“

کیوں..... تمہیں کس بات کا غم ہے.....؟“

دوستی کے اُس نئے رشتے کا جس نے مجھ سے میری زندگی چھین لی.....“

تم نے اپنے خط میں بھی ایسی ہی باتیں تحریر کی تھیں۔“ وہ دبے لہجے میں بولی۔

یہ بھی میرے دل کی آواز تھی..... پھر بھی، کوئی بات ناگوار گزری ہو تو.....“

پلیز احمر..... آگے کچھ مت کہنا۔“ اُس نے تڑپ کر کہا۔ ”میں نے زندگی میں کبھی تمہاری کسی

ابراہیم منایا.....“

اور مجھے قابلِ اعتماد بھی نہیں سمجھا۔“

یہ الزام ہے.....“

اور وہ مجبوری تھی جس نے تمہیں مہر بلب کر دیا تھا.....؟“

”زخموں کو کیریدنے سے کیا حاصل..... خود اپنی زسوائی ہو گی۔“ اُس نے احمر کو یاد دلایا۔ ”تم نے

خط میں اسی بات کی تلقین کی تھی۔“

”غم بانٹ لئے جائیں تو دلوں کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔“

”مجھے یہ غم بہت عزیز ہیں.....“

”مجھ سے بھی زیادہ.....؟“ احمر نے سوال کیا تو وہ کوئی جواب نہ دے سکی۔ دل کی دھڑکنوں میں

کردیکھا تو وہاں بھی احمر کی تصویر نظر آئی۔ ”تمہارا نتیجہ کب آ رہا ہے.....؟“

”شاید..... کل.....“

”میری دُعا ہے کہ تم زندگی کے ہر امتحان میں کامیاب ہو..... سرفراز ہو۔“

”مجھے تم سے اسی دُعا کی توقع تھی۔“ اُس نے نظریں اٹھا کر احمر کو دیکھا، کچھ سوچ کر بولی۔ ”ایک

ہوں..... مانو گے؟“

”تمہیں آج بھی میرے اُپر اختیار ہے..... حکم دو نا!“

”تم..... بڑی اماں کی بات مان لو..... شادی کر لو۔“

”مجھے صرف اپنے اُپر اختیار ہے نا..... دل پر نہیں۔“

”اس ضد سے کیا فائدہ.....؟“

”میرے دل کا وہ خانہ ہمیشہ خالی رہے گا جہاں تم ایک دوست کی حیثیت سے مقیم ہو۔“

”ماں کا رشتہ دنیا کے تمام رشتوں سے زیادہ انمول اور مقدس ہوتا ہے۔“

”کبھی ماں سے ملاقات ہوئی تو یہی جملہ اُن کے سامنے دُہراؤں گا۔“

”تم کس ماں کی بات کر رہے ہو.....؟“ ثناء نے چونک کر سوال کیا۔

”اُسی ماں کی جس نے اپنی خوشیوں..... اپنی انا کی خاطر ہم دونوں کی زندگی میں زہر گھول دیا۔“ احمر

دُنت کاٹتے ہوئے کہا۔ ”اُسی ماں کی بات کر رہا ہوں نا! جس نے تمہیں گھر سے بے گھر کر دیا۔“

”احمر.....“ وہ چیخ اُٹھی۔ ”تم کیا جانتے ہو میرے بارے میں.....؟“

”وہ سب کچھ جو تمہاری طرح پہلے مجھے بھی معلوم نہیں تھا.....“

”احمر.....“ ثناء کے لہجے میں التجا کا رنگ آ گیا۔ ”مجھ سے وعدہ کرو..... میری زندگی کے اس راز کو

اپنے سینے کی گہرائیوں تک محدود رکھو گے..... کبھی اس نام کو اپنی زبان پر نہیں لاؤ گے جو خود

پڑ سکون ہوگی لیکن یہ سکون زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکا..... ذہن دوبارہ جاگا تو اُسے گھٹن کا شدت

احساس ہوا جیسے کوئی اُس کا گلا گھونٹ رہا ہو..... جیسے بے شمار نا دیدہ قوتیں اُس کے وجود کو ہڑب

جانے کی خاطر منہ پھاڑے اُس کی جانب بڑھ رہی ہوں۔ گھپ اندھیرے اور پڑ ہول سناٹے سے

کروہ کسی کھلی فضا میں سانس لینے کی خاطر باہر آ گئی۔

ہوا کا ایک عطر بیز جھونکا اُسے جھو کر گزرا تو اُس نے سکون کا سانس لیا، کمرے کے سامنے راہد

میں برقی قمقمے بھی اونگھتے دکھائی دے رہے تھے۔ نیچے لان پر گہرا سکوت طاری تھا وہ کسی ایسے ہی

سکون ماحول کی تلاش میں تھی جہاں بھولی ببری یادیں اُسے تنگ نہ کریں..... جانے پہچانے چہرے ا

کے سامنے نہ آئیں.....

جہاں صرف وہ ہو..... اُس کا اپنا وجود ہو..... مستقبل کو سنوارنے کا عزم ہو..... اور..... ماضی

درستجے نہ ہوں..... کچھ دیر وہ سبزے پر کھری چاندنی کو تکتی رہی پھر ہولے ہولے قدم اٹھائی نیچے آگے

بھگی بھگی محلی گھاس پر ننگے پیر چلنا اُسے بے حد بھلا لگ رہا تھا۔ دل و دماغ کو ایسا سکون مل رہا تھا

کی تلاش میں وہ نہ جانے کب سے بھٹک رہی تھی..... بڑی دیر تک وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھ

خوابیدہ سبزے کو چگانی رہی، پھر ایک بچہ پر بیٹھ کر آسمان کو دیکھنے لگی جہاں ستاروں کی آنکھیں بھی

کے غمار سے جھپکتی نظر آ رہی تھیں..... جانے کیوں اُس کے ہونٹوں پر ایک دلکش تبسم جاگ اٹھا،

نیلگوں آسمان پر بکھرے تاروں کو دیکھتی رہی، نگاہوں نگاہوں میں راز و نیاز کرتی رہی، پھر ایک ما

سی آواز پڑ سکون ماحول کا سینہ چیرتی اُبھری تو وہ چونک اُٹھی.....

”ثناء.....“

اُس نے آہستہ سے پلٹ کر دیکھا تو دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔ احمر قریب کھڑے تھے

بیمار بیمار سے نظر آ رہے تھے، اُن کی آنکھوں میں شکوہ تھا..... شکایت تھی، چہرے پر ایسی دیرانی تھی

دیکھ کر وہ تڑپ اُٹھی۔

”احمر..... آپ.....“ اُس کے ہونٹوں کو ہلکی سی جنبش ہوئی۔

”ہاں ثناء..... یہ میں ہوں..... تمہارا احمر.....“

”اپنی رات گئے..... یہاں.....“ اُس نے سبھی نظروں سے اطراف کا جائزہ لیا۔ وہاں اُس کے

احمر کے سوا کوئی نہیں تھا۔

”تمہیں میرا آنا ناگوار ہو تو واپس چلا جاؤں.....“ احمر کے لہجے میں دردی نہیں مچل رہی تھیں۔

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا، خاموش کھڑی دل کی دھڑکنوں کو سمیٹتی رہی۔

”ثناء.....“

”جی.....“

”تم نے میرے خط کا جواب نہیں دیا۔“

”سوری احمر.....“ اُس نے جلدی سے کہا۔ ”امتحان میں اتنی مصروف تھی کہ خیال ہی نہ آیا۔“

”ہم دوست ہیں۔ یاد ہے، تم نے یہی کہا تھا کہ جب بھی ملیں گے اچھے دوستوں کی طرح ملیں گے

”مجھے یاد ہے.....“

”اس وقت، اتنی رات ڈھلے یہاں کیا کر رہی ہو؟“

”کمرے میں گھٹن ہو رہی تھی..... دل بہلانے کی خاطر نیچے آ گئی۔“

میرے لئے بھی اجنبی بن چکا ہے۔“
 ”اجنبیت کا یہی احساس..... یہی تھکن ہماری زندگیوں کو گھن کی طرح چاٹ جائے گا.....“
 ”میں التجا کرتی ہوں..... بنتی کرتی ہوں۔“ وہ مجسم التجا بن گئی۔ ”دریا کی خاموشی پر کبھی کوئی کڑ
 بھول کر بھی جھینکنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ جوہریں اٹھیں گی وہ زندگی کے بچے کچھ سکون کو بھی ساتھ بہا
 لے جائیں گی..... اتنی دُور کہ شاید تم ان کا تعاقب بھی نہ کر سکو.....“
 ”شائیں.....“

”مجھے پریشان مت کرو..... پلیر..... مجھے تنہا چھوڑ دو..... سکون سے مر جانے دو۔“
 ”شائیں.....“

”مر گئی شائیں..... اُسے دفنا دو..... بھول جاؤ..... ہمیشہ کے لئے۔“
 ”شائیں.....“ نگار نے زبرد سے بازو پکڑ کر بھڑکنا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی..... حسرت سے آنکھ
 پھاڑے نگار کو گھورنے لگی۔ ”ہینکس گاؤ.....“ نگار نے کہا۔ ”تم شاید خواب میں ڈر گئی تھیں۔“
 ”ہاں.....“ شائیں نے اپنے ذہن کو قابو کرتے ہوئے آہستہ سے جواب دیا۔ ”شاید وہ خواب ہی تھا۔“
 ”کیا دیکھ رہی تھیں تم.....؟“
 ”اپنا رزلٹ.....“ اُس نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی تو اور مضحکہ خیز بن گئی۔

○○○

نادیہ لان پر بیٹھی ریسالے کے مطالعے میں محو تھی جب نادیرہ کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔ آج ناد
 بہت دنوں بعد ادھر آئی تھی اس لئے نادیہ نے رونگٹے بچھڑائے پوچھا۔ ”یہ آج تم غلطی سے ادھر کارا۔
 کیسے بھول گئیں؟“

”مجھے معلوم تھا کہ تم خفا ہو گی لیکن.....“
 ”لیکن دیکھ کچھ نہیں.....“ نادیہ نے اُسے گھورا۔ ”سیدھی طرح میری غیر حاضری کا مکمل حسا
 کتاب پیش کرو اور نہ چلتی پھرتی نظر آؤ۔“
 ”غیر حاضری کے حساب کتاب سے تمہاری کیا مراد ہے؟“ نادیرہ نے مسکراتے ہوئے دریافت
 پھر قریب دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔

”حساب سے مراد یہ ہے کہ تم نے معنی کے بعد گھر سے نکلنا اور گھومنا کیوں بند کر رکھا ہے اور کتا
 سے میرا مقصد وہی ذات شریف ہیں جن کے بارے میں کسی شاعر نے کہا ہے کہ
 عشق نے یار و نکو بنا کر دیا..... ورنہ ہم بھی آدمی چوکور تھے.....“

”یہ نکو بنا سے کیا مراد ہے.....؟“ نادیرہ نے بڑی شرافت کا ثبوت پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”دو تو
 ہم دونوں ہو گئے..... لیکن یہ تیسرا کون ہے..... کہیں تم تو نہیں.....“
 ”شکل دیکھی ہے تم نے آئیے میں۔“ نادیہ تنک کر بولی۔
 ”کس کی.....؟ اپنی یا راحیل کی؟“ نادیرہ نے مسکراتے ہوئے ایک خوبصورت بات کہی تو نادیہ
 ہنس کر بولی۔

”کیا بات ہے..... آج بہت زیادہ موڈ میں نظر آ رہی ہو.....“
 ”بات کچھ اور آگے بڑھ رہی ہے۔“ نادیرہ نے تجاہل عارفانہ سے جواب دیا۔ ”اُڑتی اُڑتی
 ہے کہ دو روز پیٹرز ڈیڈ اور راحیل کی امی کے درمیان ٹیلیفون پر خاصا طویل مذاکرہ ہوا ہے.....“

”اُڑتی اُڑتی کی بچی.....“ نادیہ غرائی۔ ”ٹھک ٹھک بتا..... معاملہ کیا ہے.....؟“
 ”ابھی تو معاملہ بدستور کھٹائی میں ہے لیکن اگر راحیل اسی طرح ماں سے جلد بازی کی ضد کرتے
 رہے تو مصالحت کی نوبت بہت جلد آ جائے گی۔“
 ”دماغ چل گیا ہے راحیل کا.....“ نادیہ نے کہا۔ ”کیا آگے بڑھنے کا ارادہ نہیں ہے.....؟“
 ”کیا ضرورت ہے.....؟“ نادیہ شوشی سے بولی۔ ”کچھ وہ پہلے ہی پڑھ چکے ہیں۔ باقی تعلیم شادی
 کے بعد میں پوری کر دوں گی۔“

”بے شرم کہیں کی.....“ نادیہ نے اُسے گھورا۔ ”تیری زبان تو اب بالکل قہقہے کی طرح چلنے لگی ہے۔“
 ”اور یہ قہقہے بھی مجھے تم نے عنایت کی تھی..... یہ اور بات ہے کہ اُس نے مجھ جیسے آزاد چھچی کے بھی
 پتھنج کر اسیر قفس بنا دیا۔“

”خدا غارت کرے تجھے..... یہ اتنی گاڑھی اُردو بولی کب سے آگئی؟“
 ”ابتدائے عشق سے روتا رہا کیا..... آگے آگے.....“

لیکن نادیرہ اپنا شعر مکمل نہ کر سکی۔ پورٹیکو میں گاڑی آ کر رُکی اور اُس میں سے شاملہ بیگم نیچے اُتریں
 تو نادیہ کی توجہ بھی ماں کی طرف مبذول ہو گئی جو کچھ اُبھی اُبھی اور پریشان دکھائی دے رہی تھیں۔
 گاڑی سے اُترنے کے بعد شاملہ بیگم نے ایک نظر نادیہ اور نادیرہ کی جانب ڈالی، ایک لمحے کو ایسا محسوس
 ہوا جیسے وہ اسی سمت آئیں گی، لیکن دوسرے ہی لمحے انہوں نے اپنا رخ تبدیل کیا اور تیز تیز قدم اٹھائی
 اندر چلی گئیں۔

”خیریت تو ہے.....“ نادیرہ نے پوچھا۔ ”آئی مجھے کچھ پریشان دکھائی دے رہی ہیں۔“
 ”نانی اماں کی طرف گئی تھیں..... خدا خیر کرے۔“ نادیہ تیزی سے اٹھتے ہوئے بولی۔ ”تم بیٹھو.....“
 ”نانی اماں کی پریشانی کی وجہ معلوم کر کے ابھی آتی ہوں.....“

”میں بھی اب چلتی ہوں..... موقع لگا تو کل آؤں گی۔“
 نادیرہ کو خدا حافظ کہہ کر وہ اندر آئی تو شاملہ بیگم لاؤج میں بیٹھی کسی سوچ میں غرق تھیں۔ قدم اٹھاتی
 وہ تیزی سے ماں کے قریب چلی گئی، بڑے پیار سے اُن کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ ”کیا بات
 ہے امی..... آپ کچھ پریشان نظر آ رہی ہیں۔“ نانا جان اور نانی اماں کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”نادیرہ چلی گئی کیا؟“ شاملہ بیگم نے نادیہ کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔
 ”جی ہاں..... کل آنے کو کہہ گئی ہے۔“

”کوئی بات کرنے آئی تھی.....؟“
 ”جی نہیں.....“ نادیہ نے ماں کو غور سے دیکھا پھر سنجیدگی سے بولی۔ ”آپ نے میرے سوال کا
 جواب نہیں دیا۔“

”تمہاری نانی اماں تو خدا کے فضل سے خیریت سے ہیں لیکن ابامیاں کچھ پریشان ہیں۔“
 ”پریشانی کس قسم کی ہے.....؟“

”ہے کچھ جائیداد کا قصہ..... تم جا کر اپنا کام کرو! ہر بات میں کرید اچھی نہیں لگتی۔“ شاملہ بیگم نے
 اٹھتے ہوئے جواب دیا۔ پھر اٹھ کر اندر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ نادیہ خاموشی سے اپنے ڈرائنگ روم
 میں آگئی جہاں فرحان اور صائمہ خلاف توقع پہلی بار سنجیدگی اور خاموشی سے لڑو کھیلنے میں مصروف تھے۔
 رات کو کھانے کی میز پر بھی نادیہ نے اس بات کو خاص طور پر محسوس کیا کہ شاملہ بیگم کچھ خاموش

”نادرہ اور نوشاہہ کی دوستی سے وہ کیوں؟“

”آپ کو شاید نہیں معلوم.....“ شائلہ بیگم نے شوہر کو یاد دلاتے ہوئے کہا۔ ”اُسی نوشاہہ کو فروخت کرنے کے جرم میں تو اُس بدکردار کو جیل کی چکی پستنی نصیب ہوئی تھی۔“

”یہ جمال بھائی کی شرافت ہے جو وہ آپا کا اتنا خیال کر رہے ہیں ورنہ آج کل اپنی اولاد کے آگے کون کسی دوسرے کی خوشی کا خیال رکھتا ہے؟“

”یہ تو آپ نے اور بری خبر سنائی..... ہم نادیہ کو حالات سے باخبر کئے بغیر نوشاہی سے دور رہنے کا تاکید بھی نہیں کر سکتے۔“

”نوشاہی کے علاوہ اُس کی ماں بھی کراچی میں موجود ہے..... نازی بیگم۔“ شاملہ بیگم نے بتایا ”راجیل کی منگنی میں میری اُس کی ملاقات بھی ہو چکی ہے.....“

”خدا خیر ہی کرے..... اگر جمال صاحب اور منصور وغیرہ کو حالات کا علم ہو گیا تو ہم کسی کو کیا مدد دکھائیں گے؟“

”مجھے تو آپا جان کا خیال مارے دے رہا ہے.....“ شاملہ بیگم رندھی ہوئی آواز میں بولیں۔ ”ابھی ثنا اور احمر کا تم ہی تازہ ہے۔ اگر نیا گھاؤ لگا تو وہ کیسے سنبھل سکیں گی؟“

”کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم شہانہ بہن کو سمجھا بجا کر نادیہ اور منصور کی شادی پر آمادہ کر لیں؟“

”اس سے کیا فرق پڑے گا.....؟“

”فرق کیوں نہیں ہوگا.....“ وقار احمد نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ”ابھی ہماری اور جملا صاحب کی براہ راست کوئی رشتہ داری نہیں ہے لیکن نادیہ اور منصور کی شادی کے بعد ہم اُن کو اعتماد دینے لے سکتے ہیں۔“

”سوچ لیجئے..... کہیں ایسا نہ ہو کہ بعد میں نادیہ کو بھی خدا نخواستہ حالات کا شکار ہونا پڑے۔“

”ایسی بری فال منہ سے کیوں نکالتی ہیں؟ خدا جو کرتا ہے اُس میں انسان کی کوئی نہ کوئی بھلائی ضرور ہوتی ہے۔ آپ اللہ کا نام لے کر شہانہ بہن کو شادی کے لئے رضا مند کیجئے باقی باتیں مجھ پر چھوڑ دیجئے۔“

”شاملہ بیگم نے کوئی جواب نہیں دیا، شوہر نے دلا سہ دیا تو اُن کی پریشانی کچھ کم ہو گئی لیکن ایک خیال رہ رہ کر اُن کے ذہن کو چمکے گا رہا تھا.....“

اگر گے ہوں کے ساتھ نہیں کھن بھی پس گیا..... تو کیا ہوگا.....؟؟

○○○

وہ وارڈس (WARDS) کر کے واپس لوٹ رہی تھی کہ سر جیکل ٹو کے قریب پروفیسر شیرازی نے مڈ بھیڑ ہو گئی جو سرجن طارق کے ساتھ کھڑے کسی مریض کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ نگار بھی کے ساتھ تھی۔ اُس نے کتر اگر نکل جانا چاہا لیکن پروفیسر شیرازی نے اُسے آواز دے کر روک لیا۔

”میں چلوں گی ثنا.....“ نگار نے سرگوشی کی۔

”ایسی بھی کیا جلدی..... ساتھ ہی چلتے ہیں۔“ اُس نے نگار کو روکنے کی کوشش کی۔

”نہ بابا..... میرے پیٹ میں تو جو ہے کدور ہے ہیں۔ اگر پروفیسر نے روک لیا تو چھٹی ہو جائے گی۔“

نگار تیز تیز قدم اٹھاتی چلی گئی تو وہ پلٹ کر پروفیسر کے پاس آگئی۔

”میری بہت ہی ہونہار اور سعادت مند شاگرد ہے۔“ پروفیسر شیرازی نے سرجن طارق سے اُس کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

سرجن طارق نے اُس کی جانب دیکھا تو ثنائی بڑے مہذب انداز میں سلام کیا۔

”آپ کون سے ایئر میں ہیں مس ثنا.....؟“ سرجن طارق نے سپاٹ آواز میں دریافت کیا۔

”تھرڈ ایئر سر.....“

”میڈیکل کرنے کے بعد کیا پروگرام ہے..... گائنی؟“

”نوسر.....“ اُس نے سنجیدگی اور اعتماد سے جواب دیا۔ ”میں جنرل سرجن بننا پسند کروں گی۔“

.....“ سرجن طارق نے اُسے سراپا پھر پروفیسر شیرازی سے رخصت لے کر چلے گئے تو ثنائی کہا۔

”مجھے آپ سے ایک مریض کے بارے میں ڈسکس کرنا ہے۔“

”دیکھ رہا ہوں کہ تم وارڈ میں خاصی دلچسپی لے رہی ہو..... پروفیسر مسرور اور ڈاکٹر ارشد دونوں زلیف کر رہے تھے۔“ پروفیسر شیرازی نے اُسے فاتحانہ نظروں سے دیکھا۔ ”مجھے یقین ہے کہ بیٹے میں آگے چل کر بڑا نام پیدا کرو گی۔“

”بیک یوسر.....“

ہارے وہ عزیز جو نیرولی میں مقیم ہیں کیا نام ہے اُن.....“

”.....“ وہ ایک لمحہ کو چوٹی، سنبھل کر بولی۔ ”اُن کا نام ثنائی احمد ہے سر.....“

”ابھی..... میرا مقصد اُن کے لڑکے سے تھا جس نے تمہاری بیماری کے موقع.....“

”اُن کا نام احمر ہے.....“ قبل اس کے پروفیسر شیرازی پھر یہی کہتے کہ جس نے تمہاری بیماری کے بلاوجہ شیو بڑھا رکھی تھی، اُس نے جملہ مکمل کر دیا۔

”بٹ.....“ پروفیسر نے جیب سے ایک لفافہ نکال کر اُسے دیتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ ثنائی کا کامیابی پر احمر نے مبارکباد کا پیغام روانہ کیا ہے۔“

پ نے کیسے اندازہ لگا لیا سر.....؟“ اُس نے لفافہ لیتے ہوئے مدھم لہجے میں سوال کیا۔

”یہ بات بڑے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ تم نے کزن کے پہلے خط کا جواب ابھی تک.....“

.....“ وہ ایک بار پھر چوکی۔

”ٹ از ویری شمل.....“ پروفیسر شیرازی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اگر تم نے ہوٹل کا ایڈریس اتو یہ دوسرا خط میری معرفت بھی نہ آتا۔“

”میں نے ابھی کسی مریض کا ذکر کیا تھا.....“

”سر.....“ وہ جلدی سے ہڑبڑا کر بولی۔ ”میں گزشتہ دو دنوں سے اُسے دیکھ رہی ہوں..... وہ رڈ میں بیڈ نمبر تھرٹین پر ہے۔“

”یہ کیا ہے.....؟“

”یہ شیٹ کے مطابق اُسے ٹی بی ڈائنگھوس کیا گیا ہے۔“

”نہارا کیا خیال ہے..... کیا مریض کی کیس شیٹ غلط تیار کی گئی ہے؟“

”وردی سر.....“ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“

”اکٹر کے لئے ضروری ہے مائی چائلڈ! کہ وہ کسی مریض کے سلسلے میں جب بھی کوئی بات کرے“

”مجھے سمجھ کر کرے۔“ پروفیسر شیرازی نے اُسے پیار سے سمجھایا۔ ”الفاظ کی اُلٹ پھیر اکثر مریض کو اکا شکار بنا دیتی ہے۔ یہی دوسرے مریض کی جان بھی لے سکتے ہیں..... کم آن! اب مجھے بتاؤ“

”بیڈ نمبر تھرٹین کے بارے میں کیا نتیجہ اخذ کیا ہے؟“

”میرا خیال ہے سر کہ وہ نفسیاتی کیس ہے.....“

”کوئی وجہ.....؟“

”میں دونوں بار جب بھی اُس کے سامنے گئی ہوں وہ دیوانوں کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے

بے آنکھیں پھاڑے گھورتا رہا، پھر بڑے تھکے تھکے اور اُداس لہجے میں بولا۔

”گناہ بھی مایوسی کی پیداوار ہے..... میں اسی کی سزا بھگت رہا ہوں۔“

”انسان زندہ رہنے کی تمنا کر لے تو وقت کی رفتار بھی ٹھم جاتی ہے۔“ ثناء نے نرم آواز میں کہا۔

”تا مسکرانا زندگی کی علامت ہے۔“

”تم کبھی ہو تو ہنس لیتا ہوں۔“ مریض نے ایک بیمار سا قسم اپنے ہونٹوں پر سجایا۔

”تمہارا نام کیا ہے.....؟“ ثناء نے اپنائیت کا اظہار کیا۔

”اقبال..... لیکن میں نے اپنی غلطیوں کا اعتراف بہت دیر سے کیا ہے۔“ مریض کے لہجے میں بے تھا۔

”لیٹ اُس گو (Let us go)“ پروفیسر شیرازی نے جو ثناء اور مریض دونوں کو بہت غور سے دیکھ رہے تھے اچانک اپنا فیصلہ صادر فرمایا تو ثناء کو مجبوراً اُن کے حکم کی پیروی کرنی پڑی۔

”سر.....“ وارڈ سے باہر کھلی فضا میں آنے کے بعد اُس نے پروفیسر شیرازی کو مخاطب کیا۔ ”بید نمبر

لین کے بارے میں آپ نے کیا اندازہ لگایا؟“

”اُن کی (Un Lucky)“ پروفیسر نے بڑا مختصر جواب دیا۔

”میں بھی نہیں سر.....“

”سٹڈی کرو..... کیس کی جڑ تک پہنچنے کی کوشش کرو..... یہی تجربے ڈاکٹر کی کامیابی کی ضمانت بن

تے ہیں۔“

”مریض کی ذہنی کیفیت.....“

”فرسٹریشن (Frustration) کا شکار نظر آتا ہے لیکن اِٹ اِز ٹو لَٹ (It is to late)“

فیسر نے آہستہ سے کہا۔ ”کوئی معجزہ ہی اُس کی زندگی بچا سکتا ہے.....“

ثناء کو پروفیسر کا آخری جملہ سن کر ڈھکھ بولا لیکن اُس نے کوئی جواب نہیں دیا، تھوڑی دُور تک پروفیسر

ساتھ ساتھ قدم اٹھاتی رہی، پھر ایک موڑ سے کٹ کر وہ ہوسٹل کی طرف آ گئی۔ منہ ہاتھ دھو کر تازہ

ہوئی تو احمر کے لفافے کا خیال آ گیا۔ خط نکال کر دیکھا تو پروفیسر شیرازی کا اندازہ درست ثابت

احمر نے بڑے خوبصورت انداز میں اُسے مبارکباد کا پیغام ارسال کیا تھا..... لکھا تھا.....

”ثناء.....“

امید سے کہ تم بخیر و عافیت ہوگی۔

آج پھر تمہیں خط لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں..... کل اخبار میں تمہارا زلزلہ دیکھا، خوشی ہوئی اور

رمز بھی..... خوشی اس لئے کہ تم شاندار نمبروں سے کامیاب ہو میں اور صدمہ اس لئے کہ تم نے پہلی

پیشن حاصل نہیں کی..... میں تمہیں ہمیشہ کامیاب دیکھنا چاہتا ہوں..... سر فرسٹ..... سب سے

گے..... سب سے بلند و برتر.....

یہی خوشیاں تو اب زیست کا حاصل..... جینے کا سہارا رہ گئی ہیں..... انہی خوشیوں کو سمیٹ کر.....

سہمناؤں..... اور پُر غلوں دعاؤں کے ساتھ..... تمہیں تمہاری کامیابی پر کوئی انمول سا تحفہ ارسال

روں گا لیکن..... یہ ارادہ ترک کر دیا..... وہ چیزیں جو الماری میں سجا کر رکھ لی جائیں..... شوکیں کی

بنت اُن کی آخری منزل ہو..... بھلا ایسے تحفوں سے کیا فائدہ؟ اسی لئے آج خوبصورت الفاظ کا سہارا

لے رہا ہوں..... باتیں اچھی ہوں..... خوبصورت ہوں تو ذہن میں محفوظ رہ جاتی ہیں..... دل میں جگہ

گھورنے لگتا ہے..... ون منٹ سر.....“ اُس نے پروفیسر کو اپنی طرف متوجہ ہوتے دیکھ کر جلدی سے

کہا۔ ”میرے ساتھ نگار، رُوبی اور شگفتہ بھی تھیں۔ آدھا گروپ موجود تھا لیکن اُس نے میرے علاوہ کسی

اور کو نہیں دیکھا.....“

”اور صرف اتنی سی وجہ سے تم نے اُسے نفسیات کا کیس بنا دیا؟“

”میرا دل یہی کہتا ہے سر.....“

”لیٹ اُس سی (Let us see)“ پروفیسر شیرازی نے ثناء کے چہرے کے تاثرات کو بغور دیکھتے ہوئے

کہا پھر جزل وارڈ کی طرف قدم اٹھا دیئے..... ثناء بھی نے تلے قدم بڑھانے لگی۔

بید نمبر تھرٹین کا مریض اُس وقت آنکھیں بند کئے لیٹا تھا، پروفیسر نے قریب جا کر اُس کی کیس

شیت کو غور سے دیکھنا شروع کر دیا، ثناء کی نظریں مریض کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں جو زندگی کی حرارتوں

سے یکسر بے نیاز نظر آ رہا تھا۔ چہرے پر بڑھی ہوئی داڑھی اور سر کے اُلجھے ہوئے بالوں نے اُس کی

شخصیت کو اور ویران بنا رکھا تھا۔ اُس کے پوٹوں میں ہونے والی حرکت اس بات کی غمازی کر رہی تھی

کہ وہ سو نہیں رہا لیکن اُس نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔

پروفیسر شیرازی کو وارڈ میں دیکھ کر اُن ڈیوٹی ڈاکٹر ارشد دوسرے مریضوں کو چھوڑ کر تیز قدم

اٹھتا بید نمبر تھرٹین کے قریب آ گیا..... پروفیسر شیرازی نے کیس شیت کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک نظر

مریض کو دیکھا پھر ڈاکٹر ارشد سے پوچھا۔ ”تمہاری پرسنل رپورٹ کیا ہے.....؟“

”نو ہوپ سر.....“ ڈاکٹر ارشد نے آہستہ سے کہا۔ ”کیس خاصا بگڑنے کے بعد ہمیں ریفر کیا گیا

ہے۔ اِٹ اِز ٹھوڑا بچ.....“ ثناء نے ڈاکٹر ارشد کی بات سنی تو ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔ جانے کیوں اُسے ڈاکٹر

کی رائے پسند نہیں آتی تھی لیکن اُس نے کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا، خاموش کھڑی پروفیسر شیرازی کو

دیکھتی رہی۔

”کیا یہ سو رہا ہے.....؟“

ڈاکٹر ارشد نے پروفیسر کے اشارے پر قریب جا کر مریض کو آواز دی تو اُس نے آنکھیں کھول

دیں..... اُس کی آنکھوں سے بیزاری جھلک رہی تھی۔ اُس نے حقارت بھری نظروں سے ڈاکٹر کو دیکھا،

منہ دوسری طرف پھیرنا چاہتا تھا کہ ثناء سامنے آ گئی..... ثناء کو دیکھ کر بس ایک لمحے کو اُس کی نگاہوں میں

زندگی کی رقی نمودار ہوئی، پھر وہ چھت کو گھورنے لگا۔ اب اُس کی آنکھوں میں حسرتوں کے سائے

منڈلا رہے تھے۔

”کیا محسوس کر رہے ہو.....؟“ پروفیسر نے بستر کی دوسری جانب سے مریض کے قریب جاتے

ہوئے سوال کیا۔

”کچھ بھی نہیں.....“ اُس نے نجیف آواز میں جواب دیا۔

”دوا کھا لی تم نے.....؟“

”ہاں.....“ مریض نے بیزاری کا اظہار کیا۔

”پریشان مت ہو..... تم ٹھیک ہو جاؤ گے.....“

”کیا فرق پڑے گا پھر.....؟“ اُس نے پروفیسر کو تیز نظروں سے گھورا۔ جتنی لکھی ہے اتنی تو ہر حال

میں بچھتی ہے۔“

”مایوسی گناہ ہے.....“ ثناء نے پہلی بار اُسے مخاطب کیا، جواب میں اُس نے پلٹ کر ثناء کو دیکھا، کچھ

کر لیتی ہیں..... بشرطیکہ دلوں میں گنجائش ہو..... چاہت کا احساس ہو.....
بات تو جب ہے کہ انسان اپنی خوشیوں کے ساتھ ساتھ دوسرے کے دکھ کا بھی خیال کرے..... جو
بازی جیت کر ہار دی جائے وہ رنج نہیں کہلاتی..... اُسے مجبوری کہتے ہیں..... اور وہ بازی جو ہار کر جیت
لی جائے؟؟؟

خواب بھی کتنے حسین 'دور سہانے' ہوتے ہیں.....! کم از کم انسان کو بہلاتے تو ہیں.....!!
میری دُعا ہے کہ تمام زندگی میں ہر گام پر نیت نئی کامیابیوں سے ہمکنار ہوئی رہو..... خوشیاں
تمہارے قدم چومیں..... اور..... میں..... ہمیشہ تمہیں مبارکباد دیتا رہوں.....!
جواب دینے کے لئے اصرار نہیں کروں گا ورنہ انتظار کی اُبھرنی تلخیوں کو جنم دیتی رہے گی..... میں
تلخیوں سے گھبرانے لگا ہوں..... چاہتا ہوں کہ زندگی کی یہ تلخیاں ختم ہو جائیں..... ہمیشہ ہمیشہ کے
لئے..... تم بھی میرے حق میں دُعا کرنا..... ایک دوست کی حیثیت سے.....!!
اُس نے احر کے خط کو بہت غور سے پڑھا..... کوئی ایسی ہی بات تھی جو شا کی پلکوں کے گوشے بھیجنے
لگے..... اُس نے بڑے خلوص..... بڑی عقیدت اور اپنائیت سے خط چوم لیا پھر آہستہ سے بولی.....
”احر..... میں جانتی ہوں کہ تم مجھ سے شا کی ہو..... تمہیں شکوہ ہے کہ میں نے تمہارے خط کا
جواب کیوں نہیں دیا..... لیکن..... کاش تم جان سکتے کہ شائے کبھی تمہیں ایک لمحہ..... ایک ہل کو بھی خود
سے دُور نہیں محسوس کیا..... دھڑکنیں ہی تو زندگی کی علامت ہوتی ہیں..... اور.....“
وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی..... آپ ہی آپ شرما کر اپنے ہی وجود میں سینے کی کوشش کرنے
لگی.....!!



یہ نے روشن موسم بیوں کو گل کرنے کے بعد کیک کاٹا تو ڈرائنگ روم تالیوں کی آواز سے گونج
روز چستر نادیہ کا زلٹ آیا تھا، توقع کے عین مطابق وہ فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہوئی تھی
اس کی سالگرہ تھی جس میں جمال احمد، شائد بیگم اور منصور کے علاوہ نادرہ اور راحیل نے بھی
ہاتھی..... نوشاہ کو نادیہ نے مدعو کر لیا تھا اور نگار کو شائے اپنے ساتھ لائی تھی.....
..... کتنے کے بعد سب نے نادیہ کو مبارکباد کے ساتھ ساتھ تحفے دیے..... فرحان خاص طور پر ہر
میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا تھا..... نادرہ کے بعد جب راحیل نے ایک خوبصورت سا پیکٹ
پس کیا تو فرحان نے بے حد سنجیدگی سے کہا..... ”راحیل بھائی..... میں بوجھ سکتا ہوں کہ آپ نے
تحفے میں کیا دیا ہوگا.....“

پ کو کیسے معلوم ہوا.....؟؟“ راحیل نے جواب دینے کے ساتھ ساتھ کن انکیوں سے نادرہ کی
لہا تو نادیہ بول پڑی.....

میں سے فرما کر داری کا یہ عالم ہے تو آئندہ کیا ہوگا؟“
”اپنی قسمت ہے.....“ نادرہ نے سرگوشی کی پھر مسکراتی ہوئی منصور کے قریب آگئی جو آج بلکے
بلک کے سوٹ میں بے حد سمارٹ نظر آ رہے تھے اور دُور کھڑے نادیہ کو سب سے تحفہ وصول
دیکھ رہے تھے..... شاد اور نگار بھی منصور کے قریب ہی موجود تھیں..... نادرہ نے منصور سے بڑی شوخی
فٹ کیا..... ”دُور دُور کھڑے دیکھتے ہی رہیں گے یا کوئی تحفہ بھی دیں گے؟“

تحفے کا ارادہ تھا لیکن.....“ منصور نے بات ادھوری چھوڑ دی.....
”کین کیا.....؟“ نادرہ بول پڑی..... ”آج یہ سنجوی بالکل نہیں چلے گی..... تحفہ آپ کو ہر حال میں

پ کاغذ اور پیکنگ کی ذمہ داری قبول کر لیجئے..... میں تیار ہوں.....“ منصور نے نہایت معصومیت

اور تہی کا بندوبست کون کرے گا؟“ نادرہ نے جواب میں دریافت کیا تو منصور نے برجستہ کہا.....

پ غلط سمجھیں..... میں راحیل صاحب کی نہیں..... اپنی بات کر رہا تھا.....“

سے مسٹر..... خبردار!“ نادیہ مسکراتے ہوئے بولی..... ”آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ راحیل کے لئے

اچکا دھا کہ ہی بہت ہے جس میں وہ پہلے ہی بندھ چکے ہیں..... اب آپ کی باری ہے.....“

پہنچے.....“ منصور نے لمبی سانس لے کر بڑی حسرت سے کہا..... ”آپ کی زبان کب مبارک

.....“

نہ..... آپ تو جیسے اُدھار کھائے بیٹھے ہیں.....“ نادرہ ہنستی ہوئی نادیہ کی طرف واپس چلی گئی تو

منا سے دریافت کیا.....
ادرہ اور راحیل صاحب کی کہانی تو میں سن چکی ہوں..... منصور صاحب اور نادیہ کا کیا معاملہ ہے؟“

”کیا مطلب.....؟“

”میرا مطلب اس کہانی سے ہے جو ابھی آپ سنا رہے تھے۔“ منصور نے بڑی لا جواب اداکاری سے ہوتے کہا۔ ”بات روزگاروں تک پہنچی تھی جہاں آپ ٹھک وقت پر پہنچ گئے تھے لیکن وہ.....“

”ہائیں.....“ نادرہ نے منصور کا مقصد سمجھتے ہوئے راحیل کو گھورا۔ ”یہ وہ کون تھی.....؟“

”وہ..... وہ معنی سے پہلے والی تھی۔“ نادیہ نے شونی سے کہا۔

”گو یا معنی کے بعد والی کے بھی امکانات ہیں..... کیوں مسٹر راحیل؟“

”بالکل نہیں.....“ راحیل گڑبڑا کر بولے۔ ”یہ منصور صاحب کی عادت ہے مذاق کرنے کی۔“

”آپ بتائیں ثاباجی!“ نادرہ نے ثنا سے دریافت کیا۔ ”یہ روزگاروں کا کیا معاملہ تھا.....؟“

”راحیل چونکہ میرے شاگرد رہ چکے ہیں اس لئے میں انہی کا ساتھ دوں گی۔“ ثنا نے کہا۔ ”منصور ہذا مذاق کر رہے تھے۔“

”راحیل بھائی.....“ صائمہ نے درمیان میں دخل دیتے ہوئے راحیل کو مخاطب کیا۔ ”آپ کی ٹائی

ں جانور کی تصویر بنی ہوئی ہے؟“

”میاؤں..... یعنی بلی کی.....“ راحیل نے جلدی سے جواب دیا۔

”نکالو دس روپے.....“ صائمہ نے پلٹ کر فرحان سے کہا۔ ”میں جیت گئی شرط۔“

”وہ..... راحیل بھائی کے کہنے سے کیا ہوتا ہے؟“ فرحان نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ہار جیت کا فیصلہ

زیت کے فیصلے سے ہوگا۔“

”تم اب دھاندلی کر رہے ہو۔“ صائمہ نے اُسے خفگی سے گھورا۔

”قصہ کیا ہے.....؟“ نادرہ نے صائمہ سے دریافت کیا۔

”فرحان نے مجھ سے دس روپے کی شرط لگائی تھی۔“ صائمہ فرحان کو گھورتے ہوئے بولی۔ ”میں

کہا تھا کہ راحیل بھائی کی ٹائی پر بلی کی تصویر بنی ہے لیکن یہ کسی اور جانور کا نام لے رہا تھا۔“

صائمہ کے بیان پر سب کی نظریں راحیل کی ٹائی کی جانب اٹھ گئیں جس پر ایک نہایت خوبصورت

کی تصویر نظر آرہی تھی۔ نادیہ نے فرحان کی طرف دیکھا جو بے حد سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔

”تمہارا کیا کہنا ہے اس تصویر کے بارے میں؟“ اُس نے فرحان سے دریافت کیا۔

”اود بلاؤ۔“ فرحان بولا۔ ”یہ بلی سے ملتا جلتا ایک جانور ہوتا ہے جو دریاؤں کے کنارے رہتا ہے۔“

”فرحان.....“ ثنا نے فرحان کو ٹوکا۔ ”پری بات ہے۔ تمہیں اس قسم کی باتوں سے پرہیز کرنا چاہئے۔“

”اور نہیں تو کیا.....“ نادیہ نے نادرہ کو کہنی مارتے ہوئے شونی سے کہا۔ ”اچھے بھلے جانور کو اود بلاؤ

یا۔“

”منصور.....“ نادرہ نے منصور کو گھورا۔ ”آپ سمجھائیں اپنی بلی کو ورنہ.....“ اور نادیہ نے اس زور

بھنگی لی کہ نادرہ تمللا کر رہ گئی، کمر سہلاتے ہوئے بولی۔

”کھسائی بلی کھبا نو چے۔“

”غصہ ہوا جو میں درمیان میں نہیں بولا۔“ منصور نے مسکری صورت بنا کر کہا تو نادیہ اُسے گھورنے

لاگن اس گھورنے کے انداز میں نفرت یا غصے سے زیادہ اپنائیت اور چاہت کا احساس جھلک رہا تھا۔

”منصور صاحب.....“ نگار بولی۔ ”ایک مفت مشورہ دے رہی ہوں..... اگر ہو سکے تو پہلی فرصت

مازندگی کا بیمہ کرائیں۔“

”منصور، نادیہ کے منگیتر ہیں اور عنقریب دونوں کی شادی ہونے والی ہے.....“ ثنا نے منصور

بڑے پیار سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”پیشگی مبارکباد قبول کیجئے.....“ نگار نے براہ راست منصور کو مخاطب کیا۔

”تھینکس.....“ منصور نے سنجیدگی سے کہا پھر ثنا سے بولے۔ ”آپ کا کیا خیال ہے..... آج پبلک

بہت زیادہ خوش نظر آرہی ہے۔“

”خوشی تو تمہارے چہرے سے بھی پھوٹ رہی ہے۔“ ثنا نے کہا۔ ”رہا نادیہ کا معاملہ تو وہ ہمیشہ ہینے

بولتے رہنے کی قائل ہے۔“

”ایک بات اور دریافت کروں.....؟“ منصور نے سرگوشی کی۔

”پوچھو.....“

”آپ تھے میں کیا لائی ہیں.....؟“

”ڈھیر ساری دُعائیں اور ٹنگ تمنائیں۔“

”سب اپنوں کو بانٹ دیں گی یا میرے حصے میں بھی کچھ آئے گا.....“

”چلو..... تم اصرار کرتے ہو تو فنی فنی کر دوں گی۔“ ثنا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

منصور نے جواب میں بڑی سادگی سے ثنا کے آگے ہاتھ پھیلا دیا۔ اُسی وقت راحیل نے قریب

آتے ہوئے کہا۔ ”خیریت تو ہے..... یہ ہاتھ کس خوشی میں پھیلا یا جا رہا ہے؟“

”کچھ پیسے مانگ رہا ہوں۔“ منصور سنجیدگی سے بولے۔

”کھلے پیسے.....“ راحیل نے حیرت سے پوچھا۔ ”کھلے پیسے کیا ہوں گے؟“

”آپ کی نظر اُتاروں گا..... ایمان سے، آج تو آپ غضب ڈھا رہے ہیں۔“ منصور نے راحیل

کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

”اود..... آپ شاید مذاق کر رہے ہیں۔“

”جی نہیں..... میں اتنی سنجیدگی کا مذاق نہیں کرتا۔“

”راحیل صاحب.....“ اچانک نگار نے براہ راست راحیل سے کہا۔ ”منصور غلط نہیں کہہ رہے.....

آپ تھری پیس میں واقعی بہت سمارٹ اور چارمنگ نظر آرہے ہیں.....“

”آپ کی تعریف..... میرا مطلب ہے کہ میں شاید آج آپ سے پہلی بار مل رہا ہوں۔“ راحیل

نے ٹائی کی گرہ درست کرتے ہوئے کہا۔

”میرا نام نگار ہے..... ثنا اور میں ہوں کے ایک ہی کمرے میں رہتے ہیں۔“ نگار نے خود ہی اپنا

تعارف کرایا۔

”خوشی ہوئی آپ سے مل کر.....“

”شکریہ.....“ نگار بولی۔ ”کبھی ہمارے ہوٹل تشریف لائیے نا۔ سنا ہے آپ بیڈمنٹن بہت اچھا

کھیلتے ہیں۔“

راحیل اپنی تعریف سن کر پھولے نہیں سارے تھے، مگر قبل اس کے کہ وہ نگار کے دعوت نامے پر غور

کر کے کوئی جواب دیتے نادیہ اور نادرہ قریب آ گئیں۔ فرحان اور صائمہ بھی ساتھ ساتھ لگے ہوئے

تھے۔ راحیل نے نادرہ کو دیکھا تو یکنخت سنجیدہ ہو گئے۔ منصور نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

”ہاں راحیل صاحب! پھر آگے کیا ہوا؟“

”مشورہ نہایت معقول اور مفید ہے.....“ نادرہ نے جلدی سے کہا۔

اُسی وقت نوشاہہ نے قریب آکر کُٹا سے کہا کہ اُسے شبنم بیگم بلاری ہیں۔ شنانے ایک لمحے کو کچھ سوچا پھر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھائی شبنم بیگم کی طرف بڑھنے لگی جو پروفیسر جمال احمد کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ دوسرے صوفے پر وقار احمد اور شائلہ بیگم موجود تھیں۔ شاقریب گئی تو شبنم بیگم نے بڑے پیار سے اُسے اپنے برابر بٹھالیا پھر مسکراتے ہوئے بولیں۔

”شنا..... آج ہم تمہیں ایک اہم ذمہ داری سونپنا چاہتے ہیں۔“

”جی.....“ اُس نے سنجیدگی سے شبنم بیگم کی طرف وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

”ہم نے اس وقت جو فیصلہ کیا ہے اس میں چونکہ تمہاری خوشی اور مرضی کا خاص دخل ہے اس لئے یہ نیک کام تم ہی کو انجام دینا ہوگا۔“

”میں بھی نہیں.....“ اُس نے دھڑکتے ہوئے دل سے دریافت کیا۔

جواب میں شبنم بیگم نے قریب رہی ہوئی سرخ جمل کی ڈبیا سے ایک خوبصورت انگوٹھی نکال کر شاقریب کی طرف بڑھاتے ہوئے بڑے لاڈ سے کہا۔ ”یہ انگوٹھی شائلہ کے پاس میری امانت تھی۔ میں چاہتی ہوں کہ آج تم اسے اپنے ہاتھوں سے نادیہ کو پہنا دو۔“

شنانے ایک نظر پروفیسر جمال احمد کی طرف ڈالی پھر شبنم بیگم سے انگوٹھی لے لی۔ اپنی جگہ سے اٹھی تو وقار احمد بولے۔ ”نادیہ کا مسئلہ تو حل ہو گیا..... لیکن منصور کو انگوٹھی کون پہنائے گا؟“

”یہ حق تو آپ کا یا شائلہ کا بنتا ہے۔“ شبنم بیگم نے کہا۔

”میرا خیال ہے کہ اگر دونوں انگوٹھیاں ہی شنا، نادیہ اور منصور کو پہنا دے تو مجھے زیادہ خوشی ہوگی۔“ شائلہ بیگم نے متاثر ہو کر لہجے میں کہا پھر شاقریب کو پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگیں۔

”مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا.....“ جمال احمد جلدی سے بولے۔ ”میرے لئے سب سچے برابر ہیں۔“

”کیا منصور اور نادیہ کو علم ہے کہ آج اُن کی منگنی ہو رہی ہے؟“ شنانے جمال احمد سے دریافت کیا۔

”نہیں..... یہ فیصلہ ہم نے اُجائیک کیا ہے..... تمہاری خوشی کی خاطر۔“

”میں نے تو کچھ اور درخواست کی تھی۔“ اُس نے دلی زبان میں کہا۔

”نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہئے بیٹی.....“ شبنم بیگم نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”آج منگنی کی رسم سادگی سے ہو جائے۔ رہا شادی کا معاملہ تو وہ بھی خدا نے چاہا تو بہت جلد طے ہو جائے گا۔“

شبنم بیگم کے ساتھ جمال احمد، وقار احمد اور شائلہ بیگم بھی اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ شنانے دونوں انگوٹھیاں اپنی منگنی میں چھپا رکھی تھیں، اُس کی نگاہیں منصور اور نادیہ کو دیکھ رہی تھیں جو راجیل، نادرہ، نگار اور نوشاہہ کے ساتھ کھڑے گفتگو کر رہے تھے۔

بزرگوں کی ٹولی قریب پہنچی تو سب سنجیدہ ہو گئے۔ نادرہ نے شائلہ بیگم سے کہا۔

”آئی..... آپ نے ہماری نادیہ کو اس کامیابی پر کوئی تحفہ نہیں دیا۔“

”تم نہیں جانتیں بیٹی.....“ شائلہ بیگم بولیں۔ ”اُس نے تو رزلٹ آتے ہی تمہارے انگل سے خچے کی رقم وصول کر لی ہے۔“

”یہ تو رقم تھی امی!“ نادیہ نے کہا۔ ”نادرہ خچے کی بات کر رہی ہے۔“

”تحفہ بھی تو رقم ہی سے خریدا جاتا ہے۔“ وقار احمد بولے۔

”لیکن وہ تو میری کامیابی کا انعام تھا۔“ نادیہ نے جواز پیش کیا۔ ”آج میرا برتھ ڈے ہے۔ اس کا

نٹ کہاں ہے؟“

”آج کا پرنٹ تمہیں میری بیٹی شادے گی.....“ شبنم بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”آئی..... آپ.....؟“ نادیہ نے شاقریب کی طرف دیکھا۔

”کیوں..... کیا میں تم سے بڑی نہیں ہوں.....؟“ شنانے اُسے بڑی اپنائیت سے اپنے قریب بلایا اہستہ سے بولی۔ ”بولو..... کیا تحفہ لوگی؟“

”جو آپ پیار سے دے دیں۔“

”اچھا..... تو پھر آنکھیں بند کر دو.....“

نادیہ نے جواب میں آنکھیں بند کر لیں تو شنانے اُس کا ہاتھ تھاما اور انگوٹھی پہنا دی..... نادیہ نے حیرت کھول کر انگوٹھی کو دیکھا تو چپک کر بولی۔

”اوہ آئی..... اٹ اڑ ریلی ونڈرفل..... میں اسے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھوں گی۔“

”مجھے خوشی ہے کہ تم نے میری بات مان لی.....“ شنانے مدھم مدھم آواز میں سرگوشی کی۔ ”اس انگوٹھی کے ساتھ منصور کا بھی خیال رکھنا۔“

شنانے دوسری انگوٹھی منصور کو پہنائی تو نادیہ پھولوں سے لدی شاخ کی مانند جک کر رہ گئی، چہرے یا کی سرخی پھیلی تو تب کر اور گنار ہو گئی۔ نظریں جھکائے خاموش کھڑی اپنے دل کی لطیف دھڑکنوں کو رہی جو نہ جانے کیا کہنا چاہ رہی تھیں.....

ایک لمحے کو سب ہی دیگ رہ گئے پھر جب شائلہ بیگم، وقار احمد، جمال احمد اور شبنم بیگم نے آپس ایک دوسرے کو مبارکباد دی تو نادرہ خوشی سے جج اُٹھی..... منصور چپ چاپ کھڑے بڑے فاتحانہ از میں مسکرا رہے تھے۔ شنانے آگے بڑھ کر نادیہ کو پیار کیا تو وہ بے اختیار شنانے پٹ کر سسکنے لگی۔ شنا آنکھوں میں بھی آنسوؤں کے شبنمی قطروں کی ٹپ پھیل کر بتدریج گہری ہونے لگی..... اور.....

شبنم بیگم قریب کھڑی بیٹی کی منناک نگاہوں سے اُس کی دل کی کیفیت کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھیں.....!!

○○○

نثار احمد رات گئے واپس لوٹے تو فوزیہ خاتون نماز پڑھنے میں مصروف تھیں۔ انہوں نے ایک لمحے بیوی کو غور سے دیکھا پھر ہونٹ کاٹنے اپنی خواب گاہ میں چلے گئے۔ لباس تبدیل کر کے واپس مے میں آئے تو فوزیہ خاتون نماز سے فارغ ہو چکی تھیں انہوں نے شوہر کے چہرے پر اُداسی اور ن کے ملے جلے تاثرات دیکھے تو کیچہ دھک سے رہ گیا۔

آخر گزشتہ دس روز سے ہسپتال میں داخل تھے۔ ڈاکٹروں نے انہیں مکمل نگہداشت اور آرام کی سہ ہسپتال میں داخل کیا تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ اگر اگر کچھ دنوں تک مکمل آرام کریں اور اپنے پیار کی قسم کا بوجھ نہ ڈالیں تو مرض کو بڑھنے سے روکا جاسکتا ہے لیکن فوزیہ خاتون جانتی تھیں کہ بیٹے شق کا جو مرض لاحق ہے اُس کا علاج اتنا آسان نہیں جتنا ڈاکٹر سمجھ رہے تھے۔ اسی غم کو جو روگ کی مانتا اختیار کرتا جا رہا تھا دُور کرنے کی خاطر فوزیہ خاتون نے چاہا کہ بیٹے کی شادی کر دی جائے لیکن نے اس ضمن میں کوئی گفتگو کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ بخوبی جانتے تھے کہ شاقریب کا وجود ماں اور بیٹے درمیان ایک دیوار بن کر حائل ہو گیا ہے۔

دیوار..... جو بظاہر بڑی کمزور اور ناپائیدار تھی۔ لیکن اُس کی جڑیں کسی اور کے وجود میں اندر تک پھیل

پھر..... آپ نے کیا سوچا ہے؟“
میں صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ اگر خدا نخواستہ مرض نے بڑھ کر کوئی تشویشناک صورت اختیار کر لی تو...
خدا کے لئے ایسی بری فال زبان سے مت نکالئے۔“ فوزیہ خاتون نے تڑپ کر کہا۔ ”میرا دل
دیتا ہے کہ امر ٹھیک ہو جائے گا۔“
خدا کرے ایسا ہی ہو۔“

میں تو اس وقت کو دور ہی ہوں جب ہم نے کراچی جانے کا فیصلہ کیا تھا۔“
راحمہ نے جواب دینے کی بجائے بیوی کو سیٹ انداز میں دیکھا۔

نہ ہم کراچی جاتے..... نہ شائلہ سے شادی کی بات ہوتی اور نہ احمر کو دشمنوں کی نظر لگتی.....
وقت کے فیصلے بڑے اہل اور ٹھوس ہوتے ہیں۔“ ثار احمد نے کہا۔ ”ہونے والی بات ہو کر رہتی ہے۔“
مجھے شروع ہی سے اندیشہ تھا کہ شادی بد نصیبی اور نحوست ہمارے گھر کی خوشیوں کو بھی برباد کر دے گی۔“
دل کی بھڑاس نکالنا اور بات سے ورنہ ہم شاکو قصور وار نہیں کہہ سکتے۔“ ثار احمد نے جواب دیا۔
زناؤں سے تقدیر کے ہاتھوں میں کھلونا بنی ہو، وہ بھلا کسی اور کو کیا برباد کر سکتی ہے؟“
بڑی ہمدردی ہو رہی ہے آپ کو شائے.....“

سچ پوچھئے تو وہ ہماری نفرتوں سے زیادہ ہماری محبت کی مستحق ہے۔“ ثار احمد پہلو بدل کر بولے۔
اب کو اندازہ نہیں ہے کہ آپ کی سچ باتوں نے اُس کے ماضی کو بے نقاب کر کے اُس کے وجود
زنگائے ہیں وہ کس قدر دردناک اور ناقابل برداشت ہیں.....“
میں نے کوئی غلط بات نہیں کی تھی۔“

میں جانتا ہوں..... آپ کی سچائی نے شاکو گھر سے بے گھر کر دیا..... مگر ذرا سوچئے، اس میں شاکا
در ہے؟“

اور اُس کی وجہ سے ہمارے احمر کی زندگی میں جو زہر شامل ہوا ہے..... اُسے آپ کیا کہیں گے؟“
ہو سکتا ہے یہ ایسی بد نصیب کے دل سے نکلے ہوئی آہ کا سبب ہو۔“ ثار احمد نے بڑے سنجیدگی میں کہا۔
آپ جانتے ہیں کہ میں اپنے خاندان میں.....“

کسی گندے خون کی ملاوٹ برداشت نہیں کر سکتی۔“ ثار احمد جملہ مکمل کرتے ہوئے بولے۔ ”میں
شادی سے اب تک سینکڑوں بار آپ کی زبان سے سن چکا ہوں..... اسی غرور اور تکبر نے آپ کو
بیاری کی سزا دی ہے..... اب بھی وقت ہے، خدا کے لئے دوسروں کے دل کو ہمیں پہنچانے کی
ترک کر دیجئے..... احمر کی خاطر.....“

آپ کیا چاہتے ہیں..... کیا میں شاکے آگے جھک جاؤں..... گھٹنے ٹیک دوں؟“
مجھے معلوم ہے..... آپ نہیں جھکیں گی..... چاہے کوئی ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائے۔“
زیر خاتون نے شوہر کے جملے کی گہرائی کو محسوس کیا تو کانپ کر رہ گئیں۔ کچھ دیر خاموش بیٹھی
چبائی رہیں، پھر قدرے نرمی سے بولیں۔ ”میرا خیال ہے کہ اگر آپ محبت سے احمر کو سمجھائیں تو
وہ بات ضرور مان لے گا۔“

”کیا سمجھاؤں؟“..... ثار احمد نے تھکے تھکے لہجے میں پوچھا۔

”یہی کہ وہ شاکا خیال دل سے نکال دے..... اُس کے لئے لڑکیوں اور رشتوں کی کیا کمی ہے؟“
مجھے حیرت ہے کہ آپ اپنی اولاد کو اپنی انا کی خاطر قربان کر دینا چاہتی ہیں۔“ ثار احمد نے تیزی

پکی تھیں..... کسی ایسے تناور درخت کی مانند جس کو کاٹا تو جاسکتا تھا لیکن جڑ سے نہیں اکھاڑا جاسکتا تھا۔
فوزیہ خاتون کو اپنے خون اور اپنی تربیت پر اعتماد تھا۔ انہیں یقین تھا کہ احمر ان کی مرضی کے بغیر
کوئی ایسا قدم نہیں اٹھا سکتے جو اس کی عقل کا سبب بن جائے لیکن وہ یہ بھی محسوس کر رہی تھیں کہ احمر
اپنی محبت کو اپنی زندگی کا سب سے پیچیدہ مسئلہ بنا لیا ہے۔ وہ ماں کے سامنے زبان کھولنے کی گستاخی
اور کتاب نہیں کر سکتے تھے لیکن شاکو محبت سے پھر بھی دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھے جو روگ بن کر ان کا
مسکراہٹوں کو ملیا میٹ کرنی جا رہی تھی۔

فوزیہ خاتون کو اس بات کا بھی علم تھا کہ شائے اُن کے اور شائلہ بیگم کے درمیان ہونے والی گفتگو
سن لی تھی..... اسی صدمے کے زیر اثر وہ بیماری سے دوچار ہوئی پھر اُس نے وہ دہلیز بھی چھوڑ دی جس
سے اُس کے ماضی کی الٹا داستانیں وابستہ تھیں۔ حالات نے اُسے اندر سے توڑ دیا تھا، ہوا کا ایک
بھرا ہوا جھونکا بھی اُس کے وجود کو خشک پتوں کی مانند دور دور تک بکھیر سکتا تھا..... فوزیہ خاتون کی ایک
بدلی ہوئی نظر ہی شاکو اپنی جگہ محتاط ہو جانے پر مجبور کر سکتی تھی لیکن وہ احمر کے آگے بے گن تھیں۔ شاید
اس لئے کہ وہ اُن کا اگھوتا بیٹا تھا..... اُن کی خوشیوں اور مسرتوں کا واحد گہوارہ تھا..... اُن کے گھر
روشن چراغ تھا..... پھر..... وہ اس چراغ کی لو کو دم کیسے کر سکتی تھیں؟

حالات کی انہی پیچیدگیوں نے فوزیہ خاتون کو بڑا غمناک اور بے بس کر دیا تھا۔ چنانچہ اس وقت
بھی جب انہوں نے شوہر کو گم صدمہ دیکھا تو فوری طور پر ماں کی ممتا میں یہ سوچ کر اُبال آ گیا کہ کبیر
نصیب دشمنان احمر کی طبیعت زیادہ ناساز تو نہیں؟ جاننا تو تہہ کر کے تکیوں پر رکھتے ہوئے وہ تیزی
قدم اٹھاتی شوہر کے قریب آ گئیں۔ دھڑکتے دل سے پوچھا۔ ”آپ ہسپتال گئے تھے؟“
”ہوں.....“

”ہمارا احمر کیا ہے؟“
”ٹھیک ہے.....“ ثار احمد نے ایک لمبا سانس لیتے ہوئے جواب دیا تو فوزیہ خاتون کی بے چینی بڑھ گئی۔

”کیا بات ہے..... آپ کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں؟“
”کام کی تکان ہے، کچھ دیر آرام کروں گا تو.....“

”آپ کو میری قسم.....“ فوزیہ خاتون تیزی سے بولیں۔ ”سچ سچ بتائیے..... ڈاکٹر کیا کہتا ہے.....“
احمر ٹھیک تو ہو جائے گا.....؟“

”اس کا انحصار ڈاکٹروں کی مسیحا اور دواؤں سے زیادہ احمر کی اپنی ذات پر ہے۔“
”میں سمجھی نہیں.....“

”احمر کو دواؤں اور تیمارداری سے زیادہ خوش رہنے کی ضرورت ہے..... ذہن کا ایک ہلکا سا دباؤ
بو جھ بھی اُس کے دل پر اثر انداز ہو سکتا ہے.....“ ثار احمد نے کہا پھر بیوی کو غور سے دیکھتے ہوئے
بولے۔ ”احمر کو صرف خوشیوں کی ضرورت ہے۔ ایسے ماحول کی جہاں ہر طرف خوشیاں اور مسکراہٹیں
موجود ہوں۔“

”کیا ماحول کی تبدیلی احمر کے لئے خوشگوار ہوگی.....؟“
”ڈاکٹروں کا یہی خیال ہے.....“ ثار احمد نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”پروفیسر مارٹن بھی یہی کہہ

رہے تھے کہ تبدیلی آب و ہوا بھی اس مرض میں فائدہ مند ہو سکتی ہے بشرطیکہ مریض اپنے معائنے سے
تعاون کرے۔“

سے کہا۔ ”میں ڈاکٹروں کو احمر کی زندگی کے اس تلخ باب سے آگاہ کر چکا ہوں..... جانتی ہیں انہوں نے کیا مشورہ دیا ہے؟“

”ٹاکو احمر کی ضرورت سمجھ کر نہیں تو دوا سمجھ کر اُس کے قریب بلا لیا جائے۔“
 فوزیہ خاتون نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُن کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔
 ”پروفیسر مارٹن کا خیال ہے کہ احمر کا علاج کراچی میں زیادہ بہتر طور پر ہو سکتا ہے.....“
 ”پھر..... آپ نے کیا فیصلہ کیا؟“
 ”میں پروفیسر کا مشورہ سن کر خاموش ہو گیا۔“
 ”کیوں.....؟“

”آپ بھول رہی ہیں..... کراچی میں شام بھی رہتی ہے۔“
 ”رہتی ہے تو رہا کرے..... ہمیں اُس سے کیا لینا؟“

”آپ نے وجہ نہیں دریافت کی کہ پروفیسر نے دنیا کے دوسرے ترقی یافتہ ممالک کے مقابلے ایک شہر کو کیوں فوقیت دی؟“
 ”کیوں.....؟“

”اس لئے کہ وہاں شام بھی ہے۔“ ثار احمد نے کہا۔ ”منزل کی دوری کا احساس ختم ہو جانے بھی احمر کے مرض میں افادہ ہو سکتا ہے..... مجھے اتنی سنگین نظروں سے نہ گھورئے..... یہ میرا ڈاکٹروں کا خیال ہے۔“

”اگر یہ بات ہے تو میں احمر کو کراچی ضرور لے جاؤں گی۔“ فوزیہ خاتون بولیں..... ”کچھ ایسے ہوتے ہیں جن کا علاج زہر سے بھی کیا جاتا ہے.....“

”میرا خیال ہے کہ آپ ایک بار پھر احمر کے سلسلے میں جلد بازی سے کام لے رہی ہیں۔“

”ہاں..... اس لئے کہ یہ میرے بیٹے کی زندگی کا سوال ہے۔“

”آج میری وقار سے فون پر گفتگو ہوئی تھی۔“

”کوئی نئی خوشخبری.....؟“ فوزیہ خاتون نے بڑے تکیے انداز میں سوال کیا۔

”منصور اور نادیرہ کی منگنی ہو گئی ہے.....“

”ہمیں یہ جاننے کی خاطر کہ انہیں احمر کی بیماری کا کوئی ملال نہیں.....؟“

”اس منگنی میں وقار یا جمال احمر کی مرضی سے زیادہ ٹاکو خوشیوں کو دخل تھا۔“

”بہت خوب..... گویا اب شام لڈیگم ٹاکو کی مرضی کے تابع ہیں۔“

”بات شام لڈیگم کی نہیں..... شام لڈیگم کی ہے۔“ ثار احمد نے کہا۔ ”وہ بھی کسی بد نصیب کی ماں بیٹی کیا انہیں اولاد کی خوشیوں کا خیال رکھنے کا کوئی حق حاصل نہیں؟“

”یہ بھی اچھا حق ہے جو بیس برس بعد جتایا جا رہا ہے..... اُس وقت شام لڈیگم کی ممتا کو کیا سوچا گیا تھا جب ایک معصوم بچی کو ماں کے دودھ کی ضرورت تھی؟“

”آپ معصوم بچی کسے کہہ رہی ہیں..... ٹاکو.....؟“

فوزیہ خاتون نے شوہر کی طنزیہ اور چبھتے ہوئے جملے کو محسوس کیا تو تلملا کر رہ گئیں، کوئی جواب کی بجائے بل کھاتی تیزی سے انھیں اور خانساں کو کھانے کی ہدایت دینے کی خاطر بارہی جا

ت قدم اٹھانے لگیں..... اس کیفیت میں بس ایک لمحے کو شام لڈیگم کا خیال اُن کے ذہن میں ابھرا تھا۔
 ”ٹاکو..... جو ہوش سنبھالنے سے پیشتر ہی ماں کی شفقتوں سے محروم ہو گئی..... جس نے پوری طرح اُن کے دودھ کا ذائقہ بھی نہیں چکھا..... کیا وہ صرف نفرتوں کی تسخیر تھی.....؟“
 لیکن دوسرے ہی لمحے فوزیہ خاتون نے ٹاکو کے منہ سے نکلتی بڑی خفا سے ذہن سے نکال دیا۔

○○○

اُس نے وارڈ میں قدم رکھا تو ڈاکٹر ارشد سے منڈھیڑ ہو گئی۔ حسب معمول ڈاکٹر نے اُسے دیکھا تو ایک لمحے کو مسکرا دی، پھر سنجیدگی سے بولی۔ ”بیڈ نمبر تھرٹین کا کیا حال ہے.....؟“
 ”میں ابھی اسی طرف سے آ رہا ہوں..... پہلے سے کچھ بہتر نظر آ رہا ہے لیکن.....“
 ”لیکن کیا.....؟“

”ایک پرسنل سوال کروں بشرطیکہ آپ برا نہ مانیں؟“
 ”جی.....“

”آپ بیڈ نمبر تھرٹین میں اس قدر دلچسپی کیوں لے رہی ہیں..... میرا مطلب ہے کہ اسی وارڈ میں دوسری دو چار سیریس کیمرز موجود ہیں جو ہم سب کی توجہ کے مستحق ہیں۔“

”آپ بھول رہے ہیں ڈاکٹر..... میں ابھی تھریڈ ایئر کی سٹوڈنٹ ہوں۔“ اُس نے مسکرا کر بات لے کر کوشش کی۔ ”ایک وقت میں اتنے سارے مریضوں کی دیکھ بھال کرنے کے لئے بڑے تجربے رجمہارت کی ضرورت ہوتی ہے.....“

”اور اس مہارت کے لئے میڈیکل سٹوڈنٹس کو پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ اپنے فرض کی انگلی کرنی چاہئے۔“ ڈاکٹر ارشد نے کہا۔ ”اگر پہلے ہی مرحلے پر آپ نے ہمت ہار دی تو آگے چل کر یا کر سکیں گی.....؟“

”آئی ایم سوری ڈاکٹر.....“ وہ خفیف سی ہو گئی۔

”میرا خیال ہے کہ آپ نفسیاتی طور پر اُس مریض سے بہت زیادہ قریب ہو گئی ہیں..... ایسا ہوتا ہے۔“ ڈاکٹر ارشد نے مسکرا کر کہا۔ ”مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں نے وارڈ رس شروع کیا تھا تو

میں ایک ایسی مریضہ سے بے حد ہمدردی ہو گئی تھی جس کی ایک ٹانگ کسی حادثے کا شکار ہو گئی تھی۔ ل جب بھی اُس وارڈ میں جاتا خاص طور پر اُس مریضہ پر ضرور توجہ دیتا۔ اُس کی آنکھیں بڑی

بصورت اور چارمگ تھیں..... خاص طور پر اُس کے دیکھنے کا انداز.....“

”آپ کس چیز سے زیادہ متاثر ہوئے تھے؟“ ٹاکو نے قدرے بے تکلفی سے دریافت کیا۔ ”اُس

بگ سے جو حادثے کا شکار ہوئی تھی یا اُن آنکھوں سے جو اپنے مسیحا کو بڑی چارمگ نظروں سے

دیکھتی تھیں؟“

”اب آپ نے دریافت کر ہی لیا ہے تو میں پہلی بار اعتراف کر رہا ہوں کہ مجھے اُس کی آنکھیں

بہت پسند تھیں اور انہی آنکھوں کی وجہ سے مجھے ایک عرصے تک اپنے ہم جماعت ساتھیوں کے مذاق کا

ٹانہ بننا پڑا۔“

”کوئی خاص بات.....؟“

”جی ہاں.....“ ڈاکٹر ارشد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یہ بات کچھ دنوں بعد معلوم ہوئی کہ وہ

ریضہ پیدا ہونے لگا تھا۔“

میں اپنے لئے کسی اور کو پریشان نہیں کرنا چاہتا۔“ اقبال احمد نے بڑے دردناک لہجے میں جواب دیا۔
کیوں.....؟“ ثنائے بہت پیار سے پوچھا۔
وہ کام..... جو میں نے تمام عمر کیا ہے اب اس سے گریز ضروری ہے۔“
پرانی باتوں کو سوچنے سے مرض میں افادہ نہیں..... اضافہ ہوتا ہے۔“
میں جانتا ہوں.....“

اس کے باوجود..... تم کو اپنی صحت کا خیال نہیں.....؟“
ہاں..... شاید اس لئے کہ میں کھلی فضا میں زندگی کی آخری سانس لینا چاہتا ہوں۔“ اقبال احمد کی
ہل حشر میں چل رہی تھیں، شا کو غور سے دیکھتے ہوئے بولے۔“ میں اسیری سے تنگ آچکا ہوں۔
کا عذاب میرے اوپر ایک علیحدہ بوجھ ہے.....“
اگر تم مایوسی کی باتیں کرو گے تو میں کل سے تمہارے وارڈ میں نہیں آؤں گی۔“
نہیں..... نہیں۔ ایسا مت کرنا۔“ اقبال احمد نے مضطرب لہجے میں کہا پھر بری طرح کھانسنے
چہرے پر اذیت کے تاثرات اور گہرے ہو گئے۔ دورے کی کیفیت میں بھی اُن کی نظریں بار
لی جانب اٹھ رہی تھیں..... کھانسی کی شدت میں کمی ہوئی تو شخص کو سنبھالتے ہوئے کہا۔“ اگر تم
ایہاں آنا ترک کر دیا تو..... شاید.....“

کہا ہوگا میرے یہاں نہ آنے سے.....؟“ اُس نے مریض کو ٹٹولنے کی خاطر دریافت کیا۔
زندگی کی وہ آس ٹوٹ جائے گی جس کے انتظار میں آج تک میری آنکھیں کھلی نظر آ رہی ہیں۔“
کون ہے وہ.....؟“

میری زندگی کا سرمایہ..... جسے میں خود اپنے ہاتھوں سے لٹا چکا ہوں۔“
اور مجھے دیکھ کر تمہیں صبر آ جاتا ہے.....“

ہاں.....“
ایک بات کہوں..... مانو گے تم؟“

میں تمہاری ہر بات مان سکتا ہوں لیکن ایک شرط پر..... تم روزانہ صرف ایک بار مجھے اپنی شکل
لکھاؤ گی۔“

کیا نظر آتا ہے تمہیں میری شکل میں؟“ ثنائے ایک بار پھر اُس کے درد کو کیریدنے کی کوشش کی۔
ماضی کی ایک ذہنی سی تصویر..... فضا میں لہرائی ہوئی..... نہیں دیکھتا ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے میری
ہت قریب ہے۔ یہ خیال مجھے زندہ کئے ہوئے ہے کہ شاید کبھی خواب حقیقت کی شکل اختیار کر لیں۔“
اس خواب سے تمہاری زندگی کا کیا رشتہ ہے.....؟“

بڑا مقدس..... بے حد پاکیزہ رشتہ تھا.....“ اقبال احمد کی آواز رندہ گئی، حسرت بھرے لہجے میں
۔“ میں نے اُس نازک آنکھیں کو اپنے ہاتھوں سے توڑ دیا..... شاید اُسی کی کرچیں ہیں جو میری
لوچھنی کر رہی ہیں..... مجھے زندگی کی کوئی تمنا..... کوئی آرزو..... کوئی حسرت نہیں..... بس مرنے
تک ایک نظر اُسے دیکھنا چاہتا ہوں۔“

پھر تو تمہیں اپنی صحت کا اور بھی خیال رکھنا چاہئے۔“ ثنائے بولی۔“ اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے
ن کو بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ ذرا سوچو! اگر زندگی نے تمہارا ساتھ نہ دیا اور تم اُسے دیکھنے بغیر.....“
نہیں.....“ اقبال احمد نے کھانستے ہوئے جواب دیا۔“ اگر موت میرا مقدر ہوئی تو بہت پہلے مجھے

”اوہ..... رینکی سیڈ (Really Sad)“ ثنائے ہمدردی کا اظہار کیا۔
”بیڈ نمبر تھریٹن کا کیس بھی مجھے نفسیاتی نوعیت کا معلوم ہوتا ہے۔“ ڈاکٹر ارشد نے سنجیدگی اختیار
کرتے ہوئے کہا۔“ میں نے اکثر محسوس کیا ہے کہ جتنی دیر آپ اُس کے قریب ہوتی ہیں اُس کی حالت
ٹھیک رہتی ہے..... اور آپ کے جانے کے بعد شاید وہ آپ کے دوبارہ آنے کے انتظار میں موت سے
جنگ کرتا رہتا ہے.....“

”ڈاکٹر..... کیا آپ کے خیال میں وہ دوبارہ کبھی تندرست نہیں ہو سکتا؟“
”وہاں تاٹ..... میں نے ایسے کیسز بھی دیکھے ہیں جن کے بارے میں تمام ماہرین نے ایک ہی
رائے قائم کی تھی..... نو ہوپ (No hope) لیکن بعد میں وہی مریض حیرت انگیز طور پر رُوبصحت ہو
گیا..... ایسے معجزوں سے ہم انکار نہیں کر سکتے..... یہ اور بات ہے کہ ایسا بہت کم ہوتا ہے.....“
”ڈاکٹر..... کیا میں آپ سے ایک درخواست کر سکتی ہوں؟“

”ہمارے پیشے میں تکلفات اکثر خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ آپ جو کہنا چاہتی ہیں فوراً کہہ ڈالئے۔“
”کیا آپ اُس مریض کو بیڈ نمبر تھریٹن سے کسی اور نمبر پر.....“
”اسٹیوپڈ (Stupid)“ ڈاکٹر ارشد نے اُس کی بات کو کاٹتے ہوئے تیزی سے کہا۔“ میڈیکل
سائنس میں اس قسم کے واہموں کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی..... یہ تمام فرسودہ باتیں ہیں۔ کمزور ذہنوں
کی اختراع۔“

”میں آپ کے خیال کی تردید نہیں کروں گی لیکن بسا اوقات یہی چھوٹے چھوٹے واہے زندگی کا
روگ بن جاتے ہیں..... ہو سکتا ہے بیڈ نمبر تھریٹن کا مریض بھی کسی ایسے واہے کا شکار ہو..... ابھی کچھ
دیر پیشتر آپ نے بھی اس مرض کی نوعیت کو نفسیاتی قرار دیا تھا..... کیا نفسیات اور واہموں کی آپس میں
کوئی نسبت نہیں ہوتی.....؟“

”آئی سی..... ممکن ہے آپ کا اندازہ درست ہو۔“ ڈاکٹر ارشد نے ثنائے کی بات سے اتفاق کرتے
ہوئے کہا۔“ میں آج ہی کسی وقت اُس کا بیڈ تبدیل کراؤں گا.....“
”شکریہ ڈاکٹر.....“

پھر ڈاکٹر ارشد نیور ماسنڈ کہتا ہوا دوسرے مریضوں کی طرف راؤنڈ پر چلا گیا تو ثنائے بڑے اعتماد سے
نے تلے قدم اٹھائی بیڈ نمبر تھریٹن کے قریب چلی گئی جس پر اقبال احمد خاموش لینا چھت کو گھور رہا تھا۔
اُس کی آنکھوں میں کرب اور بے چینی کے بڑے بڑے خورازیت ناک تاثرات نظر آ رہے تھے۔
ثنائے قریب جا کر اُس کی خیریت دریافت کی تو وہ یوں چونکا جیسے کوئی خواب دیکھتے دیکھتے اچانک
بیدار ہو گیا ہو۔ چند ثنائے کے لئے اُس کی کیفیت اضطرابی ہو گئی پھر وہ حسب معمول ثنا کو حسرت بھری
نظروں سے دیکھنے لگا۔ ثنائے بڑی اپنائیت سے کہا۔

”خدا کا شکر ہے..... آج تمہاری حالت پہلے سے بہتر نظر آ رہی ہے۔“ اقبال احمد نے کوئی جواب نہیں
دیا۔ ایک ناک ثنا کو ٹٹکتا رہا..... ”بڑے ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گے۔“ اُس نے
مریض کو تسلی دی۔ جواب میں اقبال احمد کے سوتے مرجھائے ہونوں پر ایک نیم ترپ کر بندھا ہوا گیا۔
”تم ہر وقت کس خیال میں کم رہتے ہو..... کیا تمہارے عزیز دار تمہیں دیکھنے نہیں آتے؟ میرا
مطلب ہے کہ تمہارے عزیز دار تو ضرور ہوں گے..... اُن میں سے کسی ایک کو تیار داری کی خاطر ہر
وقت تمہارے قریب رہنا چاہئے۔“

”جی نہیں.....“ ثنائے مسکرا کر کہا۔ ”میں یہاں مریضوں کی دیکھ بھال کے لئے آتی ہوں۔ یہ باری پڑھائی کا ایک اہم حصہ ہے۔“

”تمہاری امی کیسی ہیں.....؟“

”ٹھیک ہیں.....“ ثنائے جواب دیا اور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”نوشابہ نظر نہیں آ رہی۔ کیا تجھ آتی ہیں؟“

”ایک عزیز ساتھ ہیں.....“ نازی بیگم نے جھوٹ بولا۔ ”باہر گاڑی پارک کر رہے ہیں..... آتے ہیں گے۔“

”آپ جس مریض کو دیکھنے آئی ہیں کیا وہ اسی وارڈ میں ہیں؟“ ثنائے دریافت کیا۔

”ہاں.....“

”آپ کہیں تو میں ڈاکٹر سے کہہ دوں کہ وہ مریض کا.....“

”اس کی ضرورت نہیں ہے بیٹی!“ نازی بیگم نے پھر دروغ گوئی سے کام لیا۔ ”اب تو مرض برائے ہو گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک دو روز میں چھٹی ہو جائے۔“

نازی بیگم سے زخمت ہو کر وہ ہوشل جانے کے ارادے سے تیز تیز قدم اٹھانے لگی..... کچھ ہی لمحوں کی گئی کہ ایک جانی پہچانی آواز سن کر ٹھٹھکی گئی۔ پلٹ کر بائیں جانب دیکھا تو پروفیسر جمال احمد اسی دروازے پر آ رہے تھے۔ وہ یلخت سنجیدہ ہو گئی۔ جمال احمد کو دیکھ کر جانے کیوں اُس کے دل کی دھڑکنیں تیز نہ لگیں..... وہ اپنے اور جمال احمد کے نازک رشتے سے بھی بخوبی واقف تھی لیکن پہلے بھی انہیں لرہ اس طرح سنجیدہ نہیں ہوئی تھی..... ایک طرح سے وہ اُن کی احسان مند تھی۔ ہوشل کے قیام ملے میں پروفیسر شیرازی کے بعد جمال احمد ہی وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے اُس کے ارادے کی بر حمایت کی تھی..... کچھ لمحے اپنی جگہ گم سم کھڑی رہی، پھر خود کو سنبھالتی آگے بڑھی، قریب جا کر بے ادب سے سلام کیا، خیریت دریافت کی تو جمال احمد نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔

”ثنائے مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔ کیا تم کچھ دیر کو میرے ساتھ چل سکو گی؟“

”کیا ہوشل کا کامن روم مناسب نہیں رہے گا؟“

”نہیں.....“ جمال احمد کا جواب سننے کے بعد وہ خاموشی سے اُن کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ نازی بیگم نے انکار بھی کر سکتی تھی لیکن اُس نے ایسا نہیں کیا، شاید اس لئے کہ وہ رشتے میں اُس کے باپ تھے اُس کے حسن تھے، اس کے علاوہ جب بھی ملے ایک خلص اور بے تکلف دوست کی طرح ملے تھے۔ نازی بیگم نے نازی خواہشات کا احترام کیا تھا۔ پھر وہ اُن کی خواہش کو کس طرح رد کر سکتی تھی؟ کچھ دیر تک شاہد اور جمال احمد کے درمیان کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ گاڑی کشادہ سڑکوں پر دوڑتی رہی، جب ٹریفک کے پڑ پڑ جھوم سے نکل کر ایک پرسکون روڈ پر آئی تو جمال احمد نے گفتگو کا آغاز کیا۔

”تم نے دوپہر کا کھانا کھالیا ہے.....؟“

”جی نہیں.....“

”کیا خیال ہے اگر ہم.....“

”جی نہیں.....“ اُس نے جلدی سے جمال احمد کی دعوت سے انکار کرتے ہوئے کہا۔ ”اڈل تو ابھی کوئی نہیں ہے، دوسرے یہ کہ میں دوپہر کا کھانا ہمیشہ نگار کے ساتھ کھاتی ہوں۔ وہ میری منتظر ہوگی۔“

”گویا تمہیں واپسی کی بھی جلدی ہے.....؟“

زندگی کے کرب سے نجات دلا چکی ہوتی..... میرا دل گواہی دیتا ہے کہ مرنے سے پیشتر میں اُسے اپنا بار ضرور دیکھوں گا..... قدرت میری بد نصیبی پر اتنا رحم تو ضرور کرے گی کہ میری آخری آرزو.....

”اُس آرزو کا کوئی نام بھی ضرور ہوگا.....“ ثنائے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اُس بارے میں بتاؤ! شاید میں تمہارے کسی کام آ سکوں۔“

”تمہارا نام کیا ہے.....؟“ اقبال احمد نے جواب دینے کی بجائے اُسے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

”ثنائے.....“

”پیارا نام ہے..... تمہارے والد کیا کرتے ہیں؟“

”میرے والد.....“ وہ ایک لمحے کو گڑ بڑا سی گئی، اسی الجھن میں تھی کہ کیا بہانہ کرے کہ نرس۔ قریب آ کر اُس کی مشکل حل کر دی۔

”دوائی کھائی تم نے.....؟“

”نہیں.....“ اقبال احمد نے برا سامنے بنا کر جواب دیا۔

”اب کیا ارادہ ہے.....؟“ نرس نے بڑے رُوکھے اور کھردرے لہجے میں پوچھا۔ ”کھانی۔ دوائی یا بائسٹ میں سے کتنی ہے؟“

”نرس پلیز!“ ثنائے جلدی سے نرس کو ٹوکا۔ ”کہاں ہے دوا؟ مجھے بتاؤ! میں کھلاؤں دیتی ہوں۔“ نرس نے شا کو غور سے دیکھا، پلٹ کر سائینڈ میل کی دروازے سے کچھ دوائیں نکالیں پھر انہیں ثنائے حوالے کرنے کے بعد دبی زبان میں بڑبڑاتی دوسرے مریض کی جانب چلی گئی..... ثنائے بڑی شفقت سے اقبال احمد کو دوائیں کھلائیں پھر دبی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے بولی۔ ”میں اب اجازت چاہوں..... کل پھر آؤں گی، مگر اس شرط پر کہ تم مجھے ہتے مسکراتے نظر آؤ گے۔“ بولو..... وعدہ.....؟“

”کوشش کروں گا.....“

”چلو..... یہ بھی منظور.....“ ثنائے چادر اُس کے سینے تک کھینچتے ہوئے کہا۔ ”تم کوشش کرو تو بہر جلد ٹھیک ہو سکتے ہو۔“

”تم نے اپنے والد کے بارے میں نہیں بتایا..... کیا نام ہے اُن کا..... کیا کرتے ہیں؟“

”آج کی باتوں کا کوئی پورا ہو گیا..... اب تم آرام کرو! باقی سوال و جواب کل ہوں گے۔ او، کے..... خدا حافظ۔“

”جیتی رہو..... خوش رہو.....“ اقبال احمد نے دل کی گہرائیوں سے اُس کو دعا دی۔ ”خدا تمہیں کامیابیوں اور کامیابیوں سے ہمکنار کرے۔“

اُس نے مسکرا کر اقبال احمد کو الوداعی نظروں سے دیکھا پھر پلٹ کر دروازے کی سمت قدم اٹھا۔ گئی۔ وارڈ سے باہر نکل کر سیڑھیاں ملے کر رہی تھی کہ نازی بیگم کو سامنے سے آتا دیکھ کر رُک گئی۔

”آپ.....؟“ قریب آنے پر اُس نے نازی بیگم سے دریافت کیا۔ ”یہاں کیسے.....؟“

”ایک مریض کو دیکھنے آئی ہوں.....“ نازی بیگم نے آہستہ سے جواب دیا۔ ثنائے نگاہیں ہوتے ہی اُن کے ذہن میں شبانہ بیگم کا تصور ابھر آیا۔

”نوشابہ نے بتایا تھا کہ آپ کا کوئی عزیز بیمار ہے..... میں کوئی مدد کر سکتی ہوں؟“

”ضرورت محسوس ہوئی تو تکلیف دوں گی نہیں۔“ نازی بیگم نے جلدی سے کہا پھر بات ٹالنے خاطر بولیں۔ ”تم یہاں ہسپتال میں کیا کر رہی تھیں..... خدا نخواستہ کیا تمہارا بھی.....؟“

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا، سڑک پر نظر میں جمائے خاموش بیٹھی رہی۔
 ”ٹھا.....“ جمال احمد نے ایک لمحے کے توقف کے بعد اُسے دوبارہ مخاطب کیا۔ ”کیا تم میرے ایک سوال کا جواب دو گی؟“
 ”پوچھئے.....“ وہ اپنی جگہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔
 ”میرے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے.....؟“
 ”میں سمجھی نہیں.....“
 ”میں یہ دریافت کرنا چاہ رہا تھا کہ تم مجھے کیا سمجھتی ہو۔ بزرگ، رشتے دار، یا ایک بے تکلف دوست؟“
 ”میں نینوں ہی زاویوں سے آپ کا بے حد احترام کرتی ہوں۔“ اُس نے سوچ کر جواب دیا۔
 ”آپ میرے محسن بھی ہیں۔“
 ”شکریہ.....“ جمال احمد نے کہا پھر مسکرا کر بولے۔ ”اگر میں یہ کہوں کہ آج ہم دوستوں کی طرز ایک دوسرے سے کھل کر گفتگو کریں تو.....؟“
 ”میں آپ کے حکم کا احترام کروں گی.....“ ٹٹانے بڑے محتاط انداز میں کہا۔
 ”ایک شرط اور بھی ہے.....“
 ”وہ کیا.....؟“

”آج ہمارے درمیان جو باتیں ہوں گی وہ صرف ہماری ذات تک محدود رہیں گی۔ اور ہم باہم کرتے وقت کسی تکلف سے کام نہیں لیں گے۔“
 ”میں کوشش کروں گی کہ آپ کو میری ذات سے شکایت کا موقع نہ ملے۔“
 ”گنڈ..... مجھے تم سے اسی جواب کی توقع تھی۔“ جمال احمد نے پلٹ کر ایک نظر اُسے غور سے دیکھ پھر آہستہ سے بولے۔ ”احمر کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟“
 ”میں..... اُسے اپنا دوست سمجھتی ہوں.....“ اُس نے رُک رُک کر کہا۔ ”مخلص..... دیانت دار اور اچھے کردار کا مالک۔“
 ”اس کے باوجود تمہیں احمر کے بارے میں کوئی تردید..... کوئی فکر..... کوئی احساس نہیں ہے؟“
 ”میں..... سمجھی نہیں۔“ ٹٹانے پلٹ کر تیزی سے پوچھا۔ جمال احمد کو سنجیدہ دیکھ کر اُس کے دل کا دھڑکنیں پھر تیز ہونے لگیں۔
 ”احمر بہت سخت بیمار ہے۔“

”مجھے کسی نے اُس کی بیماری کی اطلاع نہیں دی.....“
 ”دوستوں کو دوستوں کی طرف سے اتنا لاعلم اور بے خبر بھی نہیں رہنا چاہئے۔“ جمال احمد نے کہا۔
 ”ابھی بات زیادہ تشویشناک نہیں ہوئی لیکن ڈاکٹروں نے اُسے انتہائی نگہداشت کے خیال سے ہسپتال میں داخل کر رکھا ہے..... معالجوں کا خیال ہے کہ اگر احمر کے دل و دماغ پر بوجھ کی شدت میں کوئی اضافہ ہوا تو صورت حال خراب بھی ہو سکتی ہے۔“
 ”مرض کی تشخیص کیا ہوئی ہے.....؟“ ٹٹانے خود پر قابو پانے کی کوشش کرتے سوال کیا۔
 ”عارضہ قلب.....!“ جمال احمد نے مختصر جواب دیا۔
 ”کیا..... دورہ بھی پڑ چکا ہے.....؟“
 ”مجھے اس کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے البتہ اتنا معلوم ہوا ہے کہ ٹٹا احمد صاحب ڈاکٹروں کے

شورے پر اُسے کراچی لانے کے بارے میں غور کر رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہاں کی آب و ہوا اُس کے لئے سودمند ثابت ہو..... تمہارا کیا خیال ہے.....؟“
 ”میں..... میں بھلا یقین سے کیا کہہ سکتی ہوں؟“ اُس نے دل کی دھڑکنوں کو سمیٹنے کی کوشش کی۔
 ”احمر نے تمہیں خطوط تحریر کئے تھے لیکن تم نے اُن کا کوئی جواب نہیں دیا۔“
 ”آپ کو کیسے علم ہوا.....؟“ وہ چونکی۔
 ”مجھے برو فیئر شیرازی نے بتایا تھا..... اس کے علاوہ ہم تمہاری طرف سے بے خبر بھی نہیں ہیں۔“
 ”ٹٹا خاموش رہی، اُسے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ احمر کے خطوط کے جواب میں اُس نے خاموشی اختیار کر کے اچھا نہیں کیا تھا..... ممکن ہے یہی بات احمر کو ناگوار گزری ہو۔ ہو سکتا ہے احمر نے اس ذرا سی بات کا اپنے دل پر بہت گہرا اثر لیا ہو..... اُس نے فوری طور پر دل میں ایک فیصلہ کر لیا..... وہ پہلی فرصت میں احمر کو بہت تفصیل سے خط لکھے گی، بڑے خلوص سے جواب کی تاخیر کے سلسلے میں معذرت کرے گی..... اُسے بتائے گی کہ وقت اور حالات نے فاصلے ضرور قائم کر دیئے ہیں لیکن وہ کبھی اُس کے خیال سے غافل نہیں ہوئی۔“
 ”کیا سوچ رہی ہو.....؟“

”جی.....“ اُس نے چونک کر جمال احمد کی طرف دیکھا، جلدی سے بولی۔ ”احمر کی بیماری کا سن کر ڈکھ ہوا۔“
 ”احمر کے کراچی آنے کے بعد تمہارا رویہ کیا ہوگا؟“ جمال احمد نے سنجیدگی سے کہا پھر خود ہی وضاحت کرتے ہوئے بولے۔ ”میرا خیال ہے کہ تمہاری مسیاتی احمر کے حق میں زیادہ مفید ثابت ہوگی۔“
 ”آپ بھول رہے ہیں شاید..... میں انہی تھڑا ایئر کی سٹوڈنٹ ہوں۔“ ٹٹانے دل مسوس کر دہلی زبان میں جواب دیا۔

”میں اس کے علاوہ بھی بہت کچھ جانتا ہوں۔“
 ”جی.....؟“ اُس نے چونک کر جمال احمد کے چہرے کی جانب دیکھا جس پر سنجیدگی کے گہرے بادل منڈلا رہے تھے۔

”اگر میں تمہیں ٹٹا کی بجائے بیٹی کہہ کر مخاطب کروں تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہ ہوگا؟“ جمال احمد نے بدستور ٹھوس مگر نرم لہجے میں دریافت کیا۔
 ”آپ بزرگ ہیں..... جو چاہے کہہ سکتے ہیں۔“

”میں بزرگی کی نہیں..... اپنے حق کی بات کر رہا ہوں۔“
 ”ٹٹا گنگ رہ گئی..... دل کی دھڑکنوں میں مزید اضافہ ہو گیا..... جمال احمد کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھنے لگی۔

”وقار بھائی اور ٹٹا بھن کا خیال تھا کہ تم امتحان سے فارغ ہونے کے بعد گھر واپس آ جاؤ گی لیکن میرا خیال اس کے برعکس تھا۔“
 ”کیوں.....؟“ ٹٹانے دل کی دھڑکنوں کو سنبھالتے ہوئے لرزتی آواز میں سوال کیا۔

”شاید اس لئے کہ میں فلسفے کا پروفیسر رہ چکا ہوں..... انسان کی نفسیات کا مطالعہ کرنا میری ہوئی ہے۔“ جمال احمد نے ٹٹا کے ہونے انداز میں جواب دیا۔ ”میں بخوبی جانتا ہوں کہ انسان جب قنوطیت کا شکار ہوتا ہے تو ذہنی طور پر بڑا مفلوج اور بے حد فلاح ہو جاتا ہے..... ایسی حالت میں وہ ہمیشہ ہوا کی مخالف سمت میں بھاگنے کی کوشش کرتا ہے، بھٹک کر جو راستہ اختیار کر لیتا ہے اُسی پر قدم

میں فوزیہ خاتون کے سلسلے میں کوئی حتمی بات نہیں کہہ سکتا..... البتہ نثار احمد صاحب تمہیں احمر سے سمجھتے۔

”میں جانتی ہوں.....“

”پھر تم نے کیا فیصلہ کیا.....؟“

”آپ جو مناسب سمجھیں.....“ ثناء نے اُلجھے ہوئے انداز میں جواب دیا پھر نظریں گھما کر اُن بلند سکوڑے کی طرف دیکھنے لگی جو بڑی تیزی سے اُس کی نگاہوں سے اوجھل ہوتی جا رہی تھیں۔

مال احمد نے کن اکھیوں سے ٹاکو دیکھا، ایک لمحے تک اُس کے چہرے کے تاثرات کو پڑھتے پھر کچھ سوچ کر گاڑی کا رخ واپس میڈیکل کالج کی طرف موڑ دیا۔ ٹابڈ سٹور کھڑکی سے باہر رہی۔ وہ نظارے جو ایک بار اُس کی نظروں سے گزر چکے تھے، گاڑی کا رخ مڑنے کے بعد اُس کی نگاہوں کے سامنے اُبھرنے لگے.....!!

○○○

زلی بیگم نے وقتی طور پر ٹاکو ٹال دیا لیکن اُس کے چلے جانے کے بعد اُنہوں نے سوچا کہ ٹاکو اچھا نہیں کیا۔ اُنہیں اقبال احمد اور ٹاکو ملا دینا چاہئے تھے۔ اس پردے کو درمیان سے اٹھا دینا، تھا جس نے خون کے اہم رشتوں کو ابھی تک ایک دوسرے سے دور کر رکھا تھا۔

ایک طرف اقبال احمد کی ذات تھی جو بستر مرگ پر بھی بیٹی سے ملنے کی آس لگائے خداوند کریم سے کی سائیں مستعار لے رہے تھے اور دوسری جانب ثناء تھی جس نے ابھی تک باپ کو ایک نظر بھی دیکھا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے متلاشی تھے..... ایک دوسرے کے قریب اور آگے سامنے کے باوجود ایک دوسرے سے ناواقف تھے۔

زلی بیگم کو شوہر کی آخری خواہش کا احترام بھی تھا اور اس بات کی فکر بھی لاحق تھی کہ کہیں اقبال احمد کے اچانک مل جانے کی خوشی اتنی مہنگی نہ پڑے کہ وہ شادی مرگ کا شکار ہو جائیں لیکن ثناء کے بعد ایک نئے خیال نے سر اُبھارا تو وہ پریشان ہو گئیں..... اُنہوں نے سوچا کہ اگر اقبال احمد سے ملے بغیر دنیا سے رخصت ہو گئے تو اُن کی روح اولاد کے غم میں تاقیامت بھٹکتی رہے گی..... وہ ٹر شوہر کو کیا منہ دکھائیں گی..... کیا یہ خیال تمام زندگی اُنہیں کچوکے نہ لگا تا رہے گا کہ اُنہوں نے بوجھتے باب بیٹی کو ایک دوسرے سے دور رکھا..... شوہر کی آخری خواہش کا احترام نہ کیا۔

در اگر بھی ٹاکو حالات کا علم ہو گیا تو وہ اُن کے بارے میں کیا سوچے گی.....؟ کیا وہ زلی بیگم کو کر دے گی؟..... نہیں..... کبھی نہیں.....!!

زلی بیگم بڑی دیر تک اپنے خیالوں میں اُلجھی رہیں، پھر اُنہوں نے طے کر لیا کہ پہلی فرصت میں وہ اقبال احمد کو باپ بیٹی کی حیثیت سے ملا دیں گی خواہ اس کا نتیجہ کچھ بھی ہو..... اپنے ذہن سے اس رائے کو اُتارنے کے بعد وہ وارڈ کے اندر گئیں تو اقبال احمد کی حالت غیر نظر آ رہی تھی۔ ڈاکٹر اُن کے بستر پر کھڑا اُن کے سینے کی دھڑکنوں کو محسوس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اقبال احمد آنکھیں بند کئے دھڑکے تھے لیکن بھکی بھکی بٹاری تھیں کہ وہ کسی بات پر رو چکے ہیں۔ چہرے پر آنسوؤں کی نمی غیر مستحکم اور چمکی دیوار پر بارش کے قطرے کی کٹھن کی کٹھن سی لکیر کی مانند دکھائی دے رہی تھی۔

زلی بیگم دور کھڑی وقت کی نزاکت کو دھڑکتے دل سے محسوس کرتی رہیں، ڈاکٹر معائنہ کرنے کے بعد پلٹا تو وہ اُس کے سامنے پہنچ کر مجسم سوال بن گئیں، ڈاکٹر ارشد کو تیار دار اور مریض کا رشتہ

بڑھا تا رہتا ہے..... پچھلی تمام باتوں کو یکسر فراموش کر دیتا ہے..... رشتے، ناتے، غلوں، قربانی..... وقت کی اہمیت اور خون کی پیچان..... یہ ساری باتیں اُس کے لئے بے معنی بن جاتی ہیں..... تم نے ایسے مریضوں کے بارے میں ضرور پڑھا ہو گا جو ’خواب بیداری‘ کا شکار ہوتے ہیں۔ نیند کی حالت میں وہ عام انسانوں کی طرح چلتے پھرتے ہیں لیکن ہوش آنے کے بعد سب کچھ فراموش کر دیتے ہیں..... ان تمام باتوں..... غم ہو جاتے ہیں جو خواب کی حالت میں سرزد ہو چکی ہوتی ہیں..... لیکن حقیقت بہر حال اپنی جگہ ستم رہتی ہے..... اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا..... وقتی طور پر انسان زندگی سے جو فرار حاصل کرتا ہے اُس کے نتائج بھی عارضی ہوتے ہیں.....“

”مجھے حالات اور وقت کے تقاضے بھی پیروں کی زنجیر بن جاتے ہیں۔“ ثناء نے نظریں جھکا کر آہستہ سے کہا۔ ”ہو سکتا ہے میرا خیال غلط ہو..... لیکن کیا کسی ایسے مریض کو سلو پوائزن کر کے ہلاک کر دینا مناسب نہیں جس کے زندہ رہنے سے جراثیم کی افزائش کا خطرہ ہو..... متعدد زندگیوں کی موت کا اندیشہ لاحق ہو۔“

”میں تمہارے خیال کی تائید کرتا ہوں.....“ جمال احمد نے تیزی سے کہا۔ ”لیکن ذرا حالات پر غور کرو تو شاید تمہیں اپنی حماقت کا اندازہ ہو جائے..... تم نے ان جرائم کو ختم کرنے کی بجائے اور آزادی فراہم کر دی ہے جو مربوط رشتوں کے درمیان زہر پھیلا رہا ہے۔“

ثناء نے جمال احمد کی بات پر غور کیا تو لا جواب ہو گئی۔

”آپ میرے بارے میں اور کیا جانتے ہیں؟“ اُس نے دھڑکتے ہوئے دل سے سوال کیا۔

”ہر وہ بات جو تمہارے علم میں نہیں ہے.....“ جمال احمد نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”مجھے پروفیسر شیرازی کی زبانی یہ بھی علم ہوا ہے کہ تم آج کل ایک ایسے مریض میں دلچسپی لے رہی ہو جو موت کے دہانے پر کھڑا زندگی کی آخری سائیں گن رہا ہے۔“

”لیکن اُسے یقین ہے کہ موت سے پہلے اُس کی آخری خواہش ضرور پوری ہوگی.....“

”تم اسے سب کا نام دے سکتی ہو..... ایک رخ اور اذیت کا حقیقت بھی سمجھ سکتی ہو۔“ جمال احمد نے کہا۔ ”پروفیسر شیرازی بتا رہے تھے کہ وہ مریض جب تمہیں قریب دیکھتا ہے تو زندگی کی علامتیں اُس کے مدقوق وجود پر عکس ہوتی ہیں۔ تم اس جذبے کو کیا نام دو گی؟“

”ایک اتفاقیہ مطابقت.....“

”اور یہی مطابقت اگر حقیقت کا جامہ پہن لے تو کیا تم اسے قدرت کا کرشمہ نہیں کہو گی؟“ جمال احمد نے تیزی سے کہا پھر سنبھل کر تھوڑے توقف سے بولے..... ”مجھے یقین ہے کہ تمہارا قرب احمر کی زندگی بچانے میں بھی موثر ثابت ہوگا..... دوستی کے رشتے کے علاوہ بھی ہمارے درمیان ایک اور رشتہ قائم ہے..... انسانیت کا رشتہ..... تم احمر کے لئے دعا بھی کرو اور دوا بھی۔“

”لیکن.....“

”شاملہ بہن کو بھی تمہاری جدائی منظور نہیں تھی لیکن تم نے بڑی خوبصورتی سے ایک درمیانی راستہ نکال لیا..... احمر کے سلسلے میں بھی مجھے تم سے مثبت طرزِ عمل کی توقع ہے..... میں نے تمہیں بیٹی کہا ہے تو کچھ میرا بھی حق ہے..... مجھے یقین ہے کہ تم مجھے مایوس نہیں کرو گی۔“ جمال احمد نے کہا۔ ”نثار احمد صاحب تمہاری جانب سے کوئی مناسب جواب ملنے کے بعد بھی کراچی آنے کا فیصلہ کریں گے۔“

”بڑی اماں کا کیا فیصلہ ہے..... کیا وہ مجھے احمر کے قریب دیکھنا پسند کریں گی.....؟“

”تم اس سے ملی تھیں۔۔۔۔۔؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ میں نے اُسے دُور سے دیکھا ہے۔“

”اب تو۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔“ اقبال احمد نے بات کرنے کی کوشش کی تو کھانسی کا شدید دورہ پڑ گیا۔

”خدا کے لئے۔۔۔۔۔“ نازی بیگم تڑپ اٹھیں۔ ”اپنی صحت کا خیال رکھئے!“

”نازلی۔۔۔۔۔ مجھ سے۔۔۔۔۔ جھوٹ۔۔۔۔۔ نہ۔۔۔۔۔ بولنا۔۔۔۔۔ ورنہ۔۔۔۔۔“ اقبال احمد نے بمشکل کھانسی

لے دوران اپنا جملہ مکمل کیا، سینے پر زور پڑا تو خون کے قطرے کھانسی کے ساتھ یوں تک ڈھلک گئے۔

نازلی بیگم نے شوہر کی حالت مگڑتے دیکھی تو بدحواس ہو گئیں، دوڑ کر ڈاکٹر ارشد کو بلا لائیں۔ ڈاکٹر

شد نے دوبارہ اقبال احمد کے دل کی دھڑکنوں کا معائنہ کیا تو پریشان ہو گئے، نرس کو آواز دے کر کوئی

شن تیار کرنے کی ہدایت کرنے لگے۔ اقبال احمد بری طرح کھائس رہے تھے لیکن اُن کی بیمار نظریں

ستور نازی بیگم کے چہرے پر جمی تھیں۔

ڈاکٹر ارشد نے انجکشن لگایا تو کھانسی کی شدت میں قدرے کمی ہو گئی پھر اقبال احمد کی آنکھوں میں

لذکا خمار ابھر کر گہرا ہونے لگا۔۔۔۔۔ انہوں نے بوجھل اور ڈوختی آواز میں کہا۔

”نازلی۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ اُسے دیکھے بغیر۔۔۔۔۔ مرنا نہیں۔۔۔۔۔ چاہتا۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ مم۔۔۔۔۔ میری۔۔۔۔۔

شیبوں کی۔۔۔۔۔ آ۔۔۔۔۔ آخری۔۔۔۔۔ نفس۔۔۔۔۔ شش۔۔۔۔۔“

انجکشن نے اپنا اثر دکھایا تو اقبال احمد دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئے۔ نازی بیگم نے دبی زبان میں

اکثر سے دریافت کیا۔ ”اب ان کی طبیعت کیسی ہے۔۔۔۔۔؟“

”میرا خیال ہے کہ آپ نے کوئی ایسی بات کی ہے جس سے مریض کو بہت زیادہ صدمہ پہنچا ہے

۔۔۔۔۔ پلیز! آئندہ ایسی باتوں سے پرہیز کیجئے گا ورنہ ہم کچھ بھی نہ کر سکیں گے۔“ ڈاکٹر ارشد نے سنجیدگی

سے کہا پھر لمبے لمبے قدم اٹھاتا نازی بیگم کے قریب سے کتر کر گزر گیا۔

نازلی بیگم ساکت و جامت کھڑی شوہر کے چہرے کو کھتی رہیں۔ پھر اُن کے دل سے ایک آواز ابھر کر

دل تک آ گئی۔۔۔۔۔ ”آپ مایوس نہ ہوں۔۔۔۔۔ میں آپ کی ثنا آپ سے ضرور ملاؤں گی۔ وعدہ رہا۔“

○○○

وہ احمر کا خط لیٹر بکس میں ڈالنے کے بعد چلی تو اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اُس کے دل سے کوئی بوجھ

تر گیا ہو۔۔۔۔۔ اُس نے احمر کو بڑا تفصیلی خط لکھا تھا، اپنی زندگی کے ہر موڑ کو بے نقاب کر دیا تھا اور خطوط

کے جواب نہ دینے کی معذرت بھی کر لی تھی، البتہ اُس کے ذہن کی ایک گرہ ابھی تک اُلجھی ہوئی تھی۔

اُس کا باپ کون تھا؟۔۔۔۔۔ اب کہاں ہے؟۔۔۔۔۔ زندہ بھی ہے یا موت کے ہاتھوں شکست کھا کر

ہاں فانی سے کوچ کر گیا۔۔۔۔۔؟

جمال احمد سے آخری ملاقات کے بعد اُسے اس بات کا شبہ ہوا تھا کہ وہ اُس کی زندگی کے بارے

میں بہت کچھ جانتے ہیں۔۔۔۔۔ انہیں فوزیہ خاتون اور ثناء بیگم کے درمیان ہونے والی گفتگو کا علم بھی

نہ تھا۔۔۔۔۔ ثناء کے ہوش منتقل ہونے کی وجہ بھی معلوم تھی۔ اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ثناء شہانہ بیگم کی بیٹی

ہے۔۔۔۔۔ باتوں باتوں میں جمال احمد نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ ہر اُس بات سے باخبر ہیں جو ثناء کو نہیں

معلوم۔۔۔۔۔ اُس وقت وہ چونک کر خاموش ہو گئی تھی لیکن اُسے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا، اُسے پروفیسر

جمال احمد سے اُس شخص کا نام اور پتہ دریافت کر لینا چاہئے تھا قدرت نے جسے اُس کا باپ ہونے کا

رجع عطا کر دیا تھا۔

معلوم تھا، اُس نے نازی بیگم کے چہرے پر کھڑے تاثرات کو بہت غور سے دیکھا۔

”ہم اپنی پوری کوشش کر رہے ہیں۔۔۔۔۔ آگے جو خدا کو منظور ہو۔“

”اس وقت کیا حالت ہے۔۔۔۔۔؟“

”کچھ دیر بیشتر بالکل ٹھیک تھا کہ تھے لیکن مس ثناء کے جانے کے بعد ان کی کیفیت اچانک بدل گئی۔

”ثناء۔۔۔۔۔“ نازی بیگم کا دل دھڑک اٹھا۔

”ہمارے کالج کی ایک ہونہار طالبہ۔۔۔۔۔ خاص طور پر آپ کے شوہر کا بے حد خیال رکھتی ہیں۔“

”ڈاکٹر۔۔۔۔۔“ نازی بیگم نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔ ”کیا آپ کو مریض کی زندگی کی امید ہے؟

”ہمارے نزدیک مایوسی گناہ ہے۔۔۔۔۔ پیشے کے اعتبار سے بھی ہمیں مرض سے آخری دم تک بچ

کرنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اگر ہم ہی ہمت ہار دیں تو پھر مریض کا کیا بنے گا؟“

”آپ شاید مجھے سلی دے رہے ہیں۔“

”یہ بھی ہمارے اُپر فرض ہے جسے ہم اپنی ذمہ داری سمجھ کر نبھاتے ہیں۔“

”لیکن وارڈ کے بڑے ڈاکٹر نے مجھ سے کچھ اور کہا تھا۔“

”کیا۔۔۔۔۔؟“

”مریض کی زندگی اگر بچ گئی تو یہ ایک معجزہ ہوگا۔۔۔۔۔“ نازی بیگم نے حسرت بھری نظروں سے

کے بستر کی جانب دیکھا۔

”پھر بھی۔۔۔۔۔ ہمیں اپنی کوشش جاری رکھنا ہوگی۔“

ایک نرس نے قریب آ کر کسی دوسرے مریض کی حالت سے آگاہ کیا تو ڈاکٹر ارشد معذرت کر

ہوئے نرس کے ساتھ چلے گئے۔ نازی بیگم قدم اٹھاتی شوہر کے قریب گئیں، چند لمحے مریض کی کیفیت

اندازہ لگاتی رہیں پھر آہستہ سے آواز دی تو اقبال احمد نے آنکھیں کھول دیں، بیوی کے چہرے پر غم

کے سائے منڈلاتے دیکھے تو اُن کی پلکوں کے گوشے پھر بھگنے لگے۔

”کیا بات ہے۔۔۔۔۔؟“ نازی بیگم نے شوہر کا کمزور ہاتھ سہلاتے ہوئے بڑی اپنائیت سے

”آپ کچھ پریشان نظر آ رہے ہیں۔“

”مجھے اپنے خوابوں کی تعبیر پوری ہوتی نظر نہیں آ رہی۔۔۔۔۔“ اقبال احمد کے لہجے میں حسرتیں تڑپ

تھیں۔ بڑے آداس اور غمناک انداز میں بولے۔ ”کب تک خدا سے زندگی کی بھیک مانگتا رہوں گا؟“

”آپ مایوس نہ ہوں۔۔۔۔۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ آپ کی خواہش ضرور پوری ہوگی۔“

”کب؟۔۔۔۔۔ میری موت کے بعد۔۔۔۔۔؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ آپ کی زندگی میں۔۔۔۔۔ بہت جلد۔“ نازی بیگم نے جلدی سے کہا۔ ”میں نے آپ

خوشیوں کا سراغ پالیا ہے۔“

”تم مجھے دلا سہ تو نہیں دے رہیں؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ ایک دو روز میں آپ کے خوابوں کی تعبیر آپ کے سامنے ہوگی

”سچ۔۔۔۔۔؟“ اقبال احمد کی بیمار آنکھوں میں زندگی کے دیپ ٹمٹانے لگے۔

”آپ نازی پر بھروسہ کیجئے۔۔۔۔۔“

”وہ۔۔۔۔۔ وہ کیسی ہے۔۔۔۔۔ کہاں ہے۔۔۔۔۔؟“ اقبال احمد نے خوشی سے ہانپتے ہوئے دریافت کیا۔

”اسی شہر میں ہے۔ آپ کے خوابوں کی طرح بے حد معصوم، بڑی خوبصورت، بالکل گڑیا جیسی۔“

باپ..... جس کے رشتے کی جڑیں اُس کے وجود کی گہرائیوں میں اتنی مضبوط ہو گئی تھیں کہ زندگی کے بیس سال گزر جانے کے باوجود وہ اُس نادیہ سائے سے چھٹکارا نہیں حاصل کر سکی تھی۔ وہ اُس خزاں رسیدہ درخت کو ایک نظر دیکھنا چاہتی تھی جس نے اپنے ساتھ ساتھ اپنی شاخوں، پھول اور پتوں کو بھی اپنی محسوس کی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ وہ جانتا چاہتی تھی کہ وہ کیا حالات تھے جنہوں نے ایک باپ اور بیٹی کے مقدس رشتے کے درمیان دراڑیں پیدا کر دی تھیں۔ ایک عورت اور اُس کے مجازی خدا کو ہمیشہ کے لئے الگ الگ کر دیا۔ وہ واقعات کیا تھے جنہوں نے ایک ہرے بھرے گھر کو اجاڑ دیا تھا۔ اور..... قصور وار کون تھا؟ ماں..... باپ..... بیٹی.....؟؟؟

اپنے خیالوں میں گم وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوٹل کی طرف واپس جا رہی تھی کہ ایک گاڑی تیزی سے اُس کے قریب آ کر رکی۔ ایک لمحے کو اُس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا، سبھی ہوئی نظروں سے دیکھا تو منصور گاڑی کے شیرنگ وکیل پر بیٹھے اُس کی ہولکا ہٹ پر مسکرا رہے تھے۔ اُس نے منصور کی شرارت پر ڈانٹا جا لیکن شبانہ بیگم پر نظر پڑی تو اپنے ارادے کو ملتوی کر کے سنجیدہ بن گئی۔

”تسلیم عرض کرتا ہوں.....“ منصور نے ثنا کے چہرے کے بدلے تاثرات کو محسوس کرتے ہوئے شوق سے کہا۔

”جیتے رہو.....“ ثنا نے بزرگوں جیسے انداز میں دعا دی۔

”ڈرگمیں تا آخر..... میں تو آپ کو بہت بہادر سمجھتا تھا۔“ منصور نے گاڑی سے نیچے اترتے ہوئے کہا۔ وہ کوئی خوبصورت سا جواب دینا چاہتی تھی لیکن شبانہ بیگم کے قریب آ جانے سے خاموش رہ گئی۔ دبی زبان میں سلام کیا تو شبانہ بیگم نے اُسے دھیر ساری دعائیں دے ڈالیں۔

”میرے لئے کیا حکم ہے.....؟“ منصور نے ماں سے سوال کیا۔

”کیوں.....؟“ اُس نے منصور سے دریافت کیا۔ ”بہت جلدی میں ہو.....؟“

”آپ بھول رہی ہیں شاید کہ جہاں آپ کا قیام ہے اسے گرلز ہوٹل کہتے ہیں اور میں.....“ منصور اپنا جملہ نام مکمل چھوڑ کر مسکرائے لگے۔

”کچھ دیر تو رکو..... اتنی جلدی بھی کیا ہے.....؟“

”مما کو آپ سے کچھ خاص گفتگو کرنا ہے۔ اتنی دیر میں، میں بھی ایک دو ضروری کام نپٹائے آتا ہوں۔“ منصور مسکراتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ کر چلے گئے تو شبانہ بیگم نے کہا۔ ”جب سے اس کی منگنی ہوئی ہے بہت خوش رہنے لگا ہے۔“

”خوشی کی بات بھی ہے.....“ ثنا نے سنجیدگی سے کہا پھر شبانہ بیگم کے ساتھ ہوٹل میں آ کر ایک قدرے پڑ سکون گوشے میں بیٹھ گئی۔

”ثنا.....“ کچھ دیر تک رسمی گفتگو کرنے کے بعد شبانہ بیگم نے بیٹی کو بڑی اپنائیت سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”آج میں تم سے ایک فیصلہ کرنے آئی ہوں..... اس امید پر کہ تم مجھے مایوس نہیں کرو گی۔“

”آپ بزرگ ہیں..... مجھے حکم بھی دے سکتی ہیں۔“ ثنا نے سنبھل کر جواب دیا۔

”ہوٹل میں کب تک رہنے کا ارادہ ہے.....؟“

”بیاری کے سبب پڑھائی میں جو کمی رہ گئی ہے وہ پوری کر لوں، پھر سوچوں گی۔“ اُس نے ماں کو ٹالنے کی خاطر کہا۔

”کیا اس بار فرسٹ پوزیشن لانے کا ارادہ ہے.....؟“

”اگر آپ لوگوں کی دعائیں شامل حال رہیں تو.....“

”تمہارا کیا خیال ہے..... کیا ہم تمہارے لئے دعائیں نہیں کرتے.....؟“

”یہ میں نے کب کہا؟“

”شاملہ تمہارے چلے آنے سے بہت اُداس اُداس اور پریشان رہتی ہے..... وقار بھائی بھی جب لے ہیں تمہارا ذکر کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اُن کی پریشانی کا خیال کرنا چاہیے.....“

”شروع شروع کی بات ہے..... کچھ وقت اور گزرے گا تو یہ بے چینی بھی جالی رہے گی۔“ وہ اپنی میں ایک نئی بات کہہ گئی، پھر بات بنانے کی خاطر جلدی سے بولی۔ ”نگار اور اُس کے گھر والوں کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔“

”ثنا..... ایک بات پوچھوں.....؟“

”کیا تم نے صرف پڑھائی کی خاطر ہوٹل کے قیام کو گھر کے سکون پر ترجیح دی ہے.....؟“

”اور کیا وجہ ہو سکتی ہے.....؟“

”تمہاری بیماری.....“ شبانہ بیگم نے ایک سر آہ بھر کر کہا۔ ”اگر تم بیمار نہ پڑتیں تو شاید یہ سب کچھ ہوتا جواب ہو رہا ہے۔“

”بیاری پر بھلا انسان کا کیا اختیار..... یہ تو خدا کی مہربانی ہے کہ اُس نے مجھے نئی زندگی دے دی۔“

”تم جسے زندگی سمجھ رہی ہو وہ ہمارے لئے سوحان زوج سے کم نہیں.....“ شبانہ بیگم نے بیٹی کو سرت بھری نظروں سے دیکھا۔ ”کوئی ٹھن..... کوئی خلش باقی رہ جائے تو انسان اندر ہی اندر کیلی لڑی کی پابند سلگتا رہتا ہے.....“

”میں سمجھی نہیں؟“ وہ انجان بن گئی۔ مصومیت سے بولی۔ ”آپ کیسی ٹھن، کس خلش کی بات کر رہی ہیں؟“

”تم نہیں سمجھ سکو گی ثنا..... اس لئے کہ تم صرف بیٹی ہو..... ماں نہیں ہو، اس لئے کسی ماں کے دل کی دھڑکنوں کی آواز نہیں سن سکو گی..... ممتا کے اُس درد کو محسوس نہیں کر سکو گی جو اولاد کے غم اور اُس کی بدائی کا سہارا لے کر روح کی گہرائیوں سے جنم لیتا ہے۔“ شبانہ بیگم نے بڑے ڈھکی لچھے میں کہا۔ ”طوفان کی شدت کا اندازہ ساحل پر بیٹھ کر نہیں لگایا جاتا۔ تلاطم اور مد و جزیر کے پیچھے ہزاروں محرکات دتے ہیں جو سمندر کو اکساتے رہتے ہیں..... ٹھہرے ہوئے سمندر کی کبھی بھی موجوں کی آغوش میں کتنے آتش فشاں پوشیدہ ہوتے ہیں اس کا اندازہ گہرائی میں اترے بغیر نہیں لگایا جاسکتا.....“

”ثنا نے ماں کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بظاہر خاموش رہی لیکن ماں کے لچھے میں کوئی ایسا درد، نئی کک ضرور مگی جسے محسوس کر کے وہ اندر ہی اندر لرز اٹھی۔ چپ چاپ بیٹھی دل کی ان دھڑکنوں کی کیفیت کا اندازہ لگاتی رہی جو آج پہلی بار اُس کے وجود کے نہاں خانوں سے بیدار ہوئی تھی۔“

”تم..... خاموش کیوں ہو گئیں؟“ شبانہ بیگم نے بیٹی کے چہرے کے تغیر کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

”کوئی جواب نہیں دیا میری بات کا.....“

”جی.....؟“ ثنا نے چونک کر ماں کی نمناک آنکھوں کو دیکھا، پہلو بدل کر آہستہ سے بولی۔ ”یہی موج رہی ہوں کہ کیا جواب دوں..... آپ کی باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں..... آپ سمندر کے سینے میں دبے طوفانوں کی مثال دے رہی ہیں اور میں..... میری مثال تو اُس کشتی کی مانند ہے جس کا ناخدا

”مگنی بھی تمہاری مرضی سے ہوئی تھی اس لئے اب شادی کی تاریخ بھی تم ہی طے کرو گی۔“
 ”کیوں نہیں.....“ وہ بڑے خلوص سے بولی۔ ”آخر منصور میرا بھائی جو ہے.....“
 ”ثنا.....“ شبانہ بیگم کی آواز بھرا گئی، حسرت بھری نظروں سے ثنا کو دیکھنے لگیں۔
 ”جی.....“ ثنائے ہولے سے جواب دیا۔ اُس کے لہجے میں ندامت اور شرمندگی کا احساس تڑپ رہا تھا۔
 چند لمحے یوں ہی خاموشی سے دبے پاؤں گزر گئے۔ شبانہ بیگم اور ثنا ایک دوسرے کو یوں دیکھتے رہے
 برسوں کی جدائی کے بعد اچانک آگنا سا مانا ہو گیا ہو..... دلوں کی دھڑکنیں جذبات کی تڑپا کی تر ہمانی کا
 رانجام دے رہی تھیں۔ اچانک منصور کی گاڑی کے ہارن کی تیز آواز سنائی دی تو دونوں ہی چونک
 یوں، جیسے کوئی خوبصورت اور حسین خواب ادھورا رہ گیا ہو..... درمیان سے ٹوٹ گیا ہو.....
 شبانہ بیگم کھڑی ہوئیں تو ثنا بھی اُن کی پیروی میں اُنھ کھڑی ہوئی۔ دونوں چپ چاپ قدم اٹھاتی
 کے احاطے سے باہر آئیں جہاں منصور گاڑی سے نکل لگائے کھڑے اُن کی راہ دیکھ رہے تھے۔
 ”مما..... کوئی بات بنی.....؟“ منظور نے دونوں کے قریب آنے پر شبانہ بیگم سے دریافت کیا۔ اُن
 لہجے میں خوشیاں رقص کر رہی تھیں۔
 ”سن رہی ہو ثنا..... یہ کیا کہہ رہا ہے.....“
 ”لوگ تو انقلاب زندہ باد اور آزادی کے نعرے بلند کرتے ہیں.....“ منصور نے نہایت معصومیت
 سے کہا۔ ”میں تو اپنی اسیری کی تاریخ مقرر کئے جانے کی درخواست کر رہا ہوں۔“

”یہی کہ میں کون ہوں..... میری ذات سے کون سا ایسا خوفناک راز وابستہ ہیں جس کے سبب بڑی اماں نے بیک جنبشِ زباں مجھے منحوس اور لا وارث قرار دے دیا..... میری خوشیوں کو پل بھر میں رونا ڈالا.....“ شاجذ بانی ہونے لگی۔ ”وہ کہانی جو میری ذات سے شروع ہوئی ہے اور ایک دن میرے وجود پر ختم ہو جائے گی..... اس کا عنوان کیا ہے..... پلیز! اگر آپ مظلوم ہیں تو پھر مجھے اُس ظالم کا نام دے دیجئے تاکہ مجھے اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے میں آسانی ہو.....“ شاکِ آواز گلوگیرہ گئی۔ ”میں اپنی زندگی بھر کی محرومیوں کے عوض آپ سے بس یہی ایک سوال پوچھ رہی ہوں..... یہ باپ کون ہے؟..... اس کے بعد میں کسی سے کوئی گلہ، کوئی شکوہ، کوئی شکایت نہیں کروں گی.....“

”ننا..... میری بچی..... صبر سے کام لو۔“ شاجذ بیگم نے آنچل سے اپنی پلکوں کے گوشے خشک کرنے ہوئے کہا۔ ”تمہارا باپ انسان کے زُوب میں ایک بھیڑیا تھا..... سفاک درندہ..... جس نے میرے معصومیت پر شخون مارنے کے بعد گرگٹ کی طرح اپنی نگاہیں پھیر لیں..... اُسے عورت کی وفا سے نہیں کھٹکتے سکوں گی جھنکار سے محبت تھی..... وہ دولت کا پجاری تھا..... دولت..... جس کی ہوس نے اُسے از کم ظرف اور اندھا بنا دیا کہ اُس نے تمہاری معصوم زندگی کے بھی بول لگا دیئے..... مجھے اُس بدکردار سے اس بات کا خوف لاحق تھا کہ کہیں وہ تم کو مجھ سے چھین نہ لے..... اسی خوف کے مارے میں..... دوسری شادی پر رضا مندی کا اظہار کر دیا..... تمہارے نانا نے اُس بد بخت کے منہ مانگے دام چ

”گھر آؤ نہیں، تمہاری یہ خواہش بھی بہت جلد پوری کر دی جائے گی۔“

”مجھے یقین تھا کہ آپ کی عدالت سے پہلی ہی پیشی پر میرے حق میں فیصلہ سنا دیا جائے گا اس مٹھائی بھی پیشگی ساتھ لایا ہوں۔“ منصور نے گاڑی سے مٹھائی کا ایک وزنی ڈبہ نکال کر نکال دیا اور بڑھاتے ہوئے بڑی فیاضی سے کہا۔ ”خود بھی کھائیے..... اپنی تمام سہیلیوں کو بھی پیٹ بھر کر کھلا..... وہ بھی کیا یاد کر لیں گی کہ کس رئیس سے پالا پڑا ہے۔“

”چشم بد دور..... اب تو تم میاں مٹھو کی طرح بولنا سیکھ گئے ہو.....“ ثناء نے مسکرا کر کہا۔
”سب استاد کی نظر کرم اور سکھائے ہوئے سبق کا نتیجہ ہے ورنہ من آئم کہ من دانم۔“
منصور نے اس معصومیت اور سعادت مندی سے سر جھکا کر کہا کہ ثناء کے علاوہ ثناء بیگم بھی اختیار مسکرا دیں۔ آج ان کی مسکراہٹ میں زندگی تھی..... زندہ رہنے کی تمنا تھی.....!!

○○○

چیر بیڈ ختم ہوا تو وہ تیز تیز قدم اٹھاتی کلاس روم سے باہر آ گئی۔ آج وہ بہت مسرور تھی۔ ایک طر عرصے کے بعد اُس کے چہرے پر خوشیاں دمک رہی تھیں.....

ماں کے پیار کی مٹھاس نے ساری رات اُسے بستر پر بیٹھے بیٹھے اور سہانے خوابوں سے دوچار رکھا تھا۔ وقت کی گردش نے اُس کے ہونٹوں کی مسکراہٹیں لوٹا دی تھیں، ابھی درمیان سے ایک پردہ تھا اور اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس کی زندگی کے تمام خزانے مل گئے ہوں۔ اُس نے تمام ر پلکوں تلے گزار دی..... صرف ماں کے بارے میں سوچتی رہی۔ تصور ہی تصور میں ماں کی آغوش سمٹی سمٹائی بیٹھی رہی، اُس کے سینے کی گرمی سے اپنے وجود کی ہلکی سی آبراب کرتی رہی، جانے اُس خواب ہی خواب میں ماں سے کتنے ڈھیر سارے شکوے اور گلے کر ڈالے اور ماں جواب میں مسک رہی۔ اُسے پیار بھری نظروں سے دیکھتی رہی.....

کسی بھر پور مسکراہٹ بھری ہوئی تھی ماں کے لبوں پر..... جس میں ماں کی مٹا کوٹ کوٹ کر تھی..... پیار ہی پیار تھا..... مسرتوں کے پیغام تھے..... خوشیوں کے شادمانے بچ رہے تھے..... اور ان پیار بھری نظروں میں نہ جانے کیسا سحر تھا جس میں ڈوب کر وہ زندگی کی تمام تلخیاں بھول گئی پیاروں کی طرح جھوم اُٹھی..... ہر غم..... تمام دیکھ ساری پریشاناں جیسے یکسر ختم ہو گئی ہوں..... قیمتی تھے وہ لمحے..... کیسی انمول ساعتیں تھیں جنہوں نے اُس کی زندگی میں ایک سورج طلوع تھا..... وہ تمام رات بس یہی سوچتی رہی..... جس زندگی کا آغاز اتنا خوبصورت ہے اُس کے ہر میل پر کیسی کیسی حسین مسرتیں اُس کی منتظر ہوں گی..... ماں کے قرب نے جیسے سارے زخم مندھ دیئے تھے..... محرومیوں کا تمام احساس پانی کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا..... ایک نئی زندگی کی اُمتک کے وجود کے نہاں خانوں سے پھوٹ رہی تھی جس نے ہر سمت اُجالے نکھیر دیئے تھے..... دسکتے..... روشن اُجالے.....

لابر پری کے سامنے والے احاطے کو عبور کر کے وہ ہسپتال جانے والی روش پر آئی تو نازی نے دیکھ کر زک گئی۔ نازی بیگم کے چہرے پر کوئی ایسی ہی غم انگیز کہانی رقم تھی جسے محسوس کر کے وہ ایک کوہ گم کی، قریب جا کر آہستہ سے پوچھا۔ ”آپ کا مریض اب کیسا ہے؟“
”اُسی کو دیکھنے جا رہی تھی..... سوچا تم کو بھی ساتھ لے لوں۔“ نازی بیگم کے لہجے میں درد کی شا ترپ رہی تھیں۔

”لیکن..... آپ نے تو کہا تھا کہ عنقریب چھٹی ہونے والی ہے.....“

”میں نے غلط نہیں کہا تھا ثناء بیٹی.....“ نازی بیگم کی آواز لرز گئی۔ ”زندگی کے دن پورے ہو جائیں تو نسان ہر غم، ہر فکر سے آزاد ہو جاتا ہے..... اُس کی چھٹی ہو جاتی ہے.....“

”ماپوسی گناہ ہے.....“ ثناء جلدی سے بولی۔ ”وقت ہر زخم کو مندھ کر دیتا ہے۔“

”میلے میرا یہی خیال تھا لیکن اب“ نازی بیگم نے ثناء کو گھورتے ہوئے کچھ کہنا چاہا لیکن الفاظ حلق میں گھٹ کر رہ گئے۔

”اب کیا ہوا.....؟“

”حسرتیں پوری ہو جائیں تو روح کو قرار آ جاتا ہے..... یہی ٹھہراؤ زندگی کی آخری منزل ہے.....

س جہود کو تم موت کا نام دے سکتی ہو۔“

”آپ آج کیسی باتیں کر رہی ہیں؟“ ثناء نے پوچھا۔ ”کل تک تو خاصی بڑا امید تھیں۔“

”شاید اس لئے کہ کل تک میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔“

”کیسا فیصلہ.....؟“ ثناء نے حیرت سے دریافت کیا۔

”آرزوؤں کی تکمیل کا.....“ نازی بیگم نے ڈوبتی آواز میں کہا۔ ”میرا خیال تھا کہ تکمیل آرزو کی

واپس میرے سہاگ کو زندہ و سلامت رکھے گی لیکن اب..... اگر زندگی کی ساعتیں ختم ہو گئیں تو میں

وہ کو بھی معاف نہیں کر سکوں گی۔“

”کیا..... آپ کے شوہر.....؟“

”ہاں.....“ نازی بیگم نے ثناء کو حسرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کچھ تعلق تمہارا بھی ہے..... میرے

بہاگ سے.....“

”جی..... میں سمجھی نہیں۔“

”میرے شوہر کا نام..... اقبال احمد ہے..... ڈاکٹر ارشد تیار ہے تھے کہ تم.....“

”آپ بیڈ نمبر تھریٹن کے مریض کی بات کر رہی ہیں؟“ ثناء نے چونکتے ہوئے کہا۔

نازی بیگم نے کوئی جواب نہیں دیا، پلکوں کی اوٹ سے اُڈتے آنسوؤں کو پینے کی کوشش کرتی

ہیں، پھر ثناء کے ساتھ وہ بھی جنرل وارڈ کی طرف قدم اٹھانے لگیں.....

”آپ نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا کہ اقبال احمد آپ کے شوہر ہیں.....“ ثناء نے قدم بڑھاتے

وئے شکایت کی۔

”میں..... تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔“

”ڈاکٹر کا کام مریض کی تیمارداری ہوتا ہے..... اس میں پریشان کرنے کی کیا بات تھی.....؟“

”کیا تم جانتی ہو مریض کے بارے میں..... میرا مطلب ہے کہ اُن کا مرض کیا ہے؟“

”ڈاکٹروں نے آپ کو کیا بتایا ہے.....؟“ ثناء نے بات ٹالنے کی خاطر سوال کیا۔

”ٹی بی.....“ نازی بیگم نے درد بھرے لہجے میں کہا پھر ایک سرد آہ بھر کر بولیں۔ ”ڈاکٹر اسی موذی مرض کا

لاج کر رہے ہیں لیکن میں جانتی ہوں کہ وہ کون سا زخم ہے جو اندر اندر ناسور کی شکل اختیار کر رہا ہے۔“

”کیا مطلب.....؟“

”کچھ مرض زندگی کا روگ بن جاتے ہیں..... ایسا روگ جو زندگی کی آخری سانسیں تک باقی رہتا ہے۔“

ثناء نے پلٹ کر ایک نظر نازی بیگم کو دیکھا، تیز تیز قدم اٹھاتی سیڑھیاں طے کرتی وارڈ میں داخل ہوئی

اُس کی نگاہوں کے سامنے موجود تھا لیکن اُس کی زندگی کے لمحے گئے چنے رہ گئے تھے۔ اُس کا چاہا قدرت کی اس ستم ظریفی پر چیخ چیخ کر روئے لیکن اُس نے بڑے ضبط سے کام لیا، اقبال احمد کا تھام کر آہستہ سے بولی۔ ”ابو.....“

”ٹھا..... میری بیٹی.....“ اقبال احمد کی حالت غیر ہونے لگی۔

ڈاکٹر ارشد نے جلدی سے مریض کے دل کی دھڑکنوں کو محسوس کیا، ٹٹانے ڈاکٹر کے چہرے پر کے تاثرات دیکھے تو تڑپ اٹھی، باپ کے قریب ہو کر بڑے لاڈ سے بولی۔ ”ابو..... آپ جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔ دل پر کوئی بوجھ محسوس نہ کریں۔“

”ٹھا.....“ اقبال احمد نے کپکپاتی ہوئی لاغر آواز میں کہا۔ ”میں..... تمہاری ماں..... اور تمہارا لں کا گناہگار ہوں.....“

”ابو پلیز.....“ ٹٹانے دھڑکتے ہوئے دل سے التجا کی۔ ”اس وقت آپ کو سکون کی ضرورت ہے۔“ ”سکون.....“ اقبال احمد کے چہرے پر ایک تلخ مسکراہٹ نے تڑپ کر دم توڑ دیا، کرب کی حالت بولے۔ ”جس نے..... ہمیشہ..... دوسروں کا..... سکون و آرام..... برباد کیا ہو..... اُسے صرف سکون دے سکتی ہے.....“

”ابو.....“ ٹٹا چیخ اٹھی۔ ”خدا..... ایسی باتیں مت کیجئے!“

”میں نے..... تمہاری ماں کی..... زندگی حرام کر دی تھی..... خدا..... مجھے میرے گناہوں کی..... دے رہا ہے..... یہ میرا انعام ہے..... ہاں میری بیٹی..... میری ٹٹا!“

”مجھے آپ سے کوئی شکوہ..... کوئی شکایت نہیں.....“ ٹٹانے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”میرے..... اور قریب آؤ.....“

ٹٹا باپ کے بستر پر بیٹھ گئی۔

”اپنا..... ہاتھ..... مجھے..... دے دو.....“ اقبال احمد نے گلوگیر آواز میں درخواست کی۔

ٹٹانے ہاتھ آگے بڑھایا تو اقبال احمد نے اُس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بڑی حسرت سے کہا۔

”مجھے..... معاف کر دینا..... میری..... ٹٹا..... ٹٹن..... آ.....“

اقبال احمد نے ٹٹا کے ہاتھوں پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کی کوشش کی لیکن شاید قدرت کو یہ منظور نہ اقبال احمد کی گرفت کمزور پڑ گئی، پھر اُن کا ہاتھ بستر پر ڈھلک گیا۔ آنکھیں ٹٹا پر مرکوز تھیں۔ اُن میں زندگی کی حسرتیں مجید ہو چکی تھیں۔

اُسی وقت پر و فیروزہ قدم اٹھاتے ہوئے مریض کے قریب آئے، انہوں نے جلدی سے دل کی ت کا معائنہ کیا پھر مایوسی کے انداز میں گردن جھکا لی۔ ڈاکٹر ارشد نے ہاتھ بڑھا کر اقبال احمد کی آنکھوں کو آہستہ سے بند کیا پھر چادر چہرے تک پہنچ دی۔ نازی بیگم کو بیوگی کا احساس ہوا تو لں نے ہاتھ کی چوڑیاں توڑ دیں۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

لیکن ٹٹا..... وہ اپنی جگہ یوں گھس گھس رہی تھی..... جیسے اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا ہو..... جیسے کی ہولناک خواب تھا..... جسے وہ کلی نظروں سے دیکھ رہی تھی!!



تو بیڈ نمبر تھرٹین کے قریب ڈاکٹر ارشد کو ڈیوٹی نرس کے ساتھ کھڑا دیکھ کر اُس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ نزدیک جا کر دیکھا تو مریض بے سندہ نظر آ رہا تھا۔ شخص کی رفتار بھی غیر عادی محسوس ہو رہی تھی، اُس نے ڈاکٹر ارشد کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”اچھا ہوا جو آپ آگئیں.....“ ڈاکٹر ارشد نے آہستہ سے نازی بیگم کو مخاطب کیا۔ ”مریض کچھ دیر پیشتر آپ کو یاد کر رہا تھا۔“

”ڈاکٹر.....“ ٹٹانے ڈاکٹر ارشد کو دوبارہ اپنی جانب متوجہ کیا۔

”سوری مس ٹٹا..... میرا خیال ہے کہ مریض کا وقت پورا ہو چکا ہے۔“ ڈاکٹر نے انگریزی میں جواب دیا۔ ”پھر بھی میں نے پروفیسر فدا کو اطلاع کرا دی ہے..... ہو سکتا ہے کہ اُن کی سیمانی مریض کے کام آجائے.....“

نازی بیگم نے ڈاکٹر کی رائے سنی تو اُن کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ اُن کی آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے۔ ایک نظر ٹٹا کو دیکھا پھر آہستہ آہستہ کپکپاتی آواز میں شوہر کو بکارنے لگیں۔ ٹٹا خاموش کھڑی مریض کی کیفیت کا اندازہ لگا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اقبال احمد نے آنکھیں کھول دیں۔ باری باری ٹٹا اور نازی بیگم کو دیکھا پھر اُن کے ہونٹوں کو جنمیش ہوئی، بڑی نجیف آواز میں بولے۔

”نازی..... میرا وقت..... پورا ہو رہا ہے.....“

”خدا کے لئے..... ایسی باتیں نہ کیجئے۔“ نازی بیگم رندھی ہوئی آواز میں بولیں۔

”تم نے..... اپنا وعدہ..... پورا نہیں کیا..... شاید.....“

”ہمت سے کام لیجئے.....“ نازی بیگم نے سسکتے ہوئے کہا۔ ”میں آپ کی خوشیاں اپنے ساتھ لائی ہوں۔“

”اب..... جھوٹے دلاسون..... سے..... کوئی..... فائدہ نہیں.....“ اقبال احمد نے بڑے کرب کے

عالم میں کھانتے ہوئے بمشکل اپنا جملہ مکمل کیا۔ ”میرے..... گناہوں کی..... یہی سزا ہے.....“

”اس بیٹی کو غور سے دیکھئے.....“ نازی بیگم نے پاس کھڑی ٹٹا کی طرف اشارہ کیا۔ اسے پہچاننے کی کوشش کیجئے۔“

”یہ..... میری محسنہ ہے..... خدا..... اسے سلامت رکھے.....“

”یہ ٹٹا ہے..... آپ کی اپنی ٹٹا.....“

”میری..... ٹٹا.....؟“ اقبال احمد نے حیرت سے کہا۔ ”نازی..... میں..... تمہارا.....“

”یہ ٹٹا ہے..... آپ کی..... بیٹی.....“

اور ٹٹا کو ایک لمحے کو یوں محسوس ہوا جیسے اُس کا پورا وجود لرز اٹھا ہو..... نازی بیگم کی بات سن کر وہ یوں چونکی جیسے کسی طویل خواب سے اچانک اُس کی آنکھ کھل گئی ہو..... اُس کے دل کی دھڑکنیں یلکھت تیز ہو گئیں..... نازی بیگم نے جو انکشاف کیا تھا وہ ٹٹا کے لئے اُس کی زندگی کا سب سے قیمتی انعام تھا۔

اُس نے پہلی بار اقبال احمد کو بہت غور سے دیکھا، اقبال احمد کی نظریں بھی ٹٹا کے چہرے پر مرکوز تھیں ایک لمحے تک باپ بیٹی ایک دوسرے کو حیرت بھری والہانہ نظروں سے دیکھتے رہے پھر اقبال احمد کی آنکھوں کے پیانے یلکھت چھلک اٹھے..... انہوں نے نظریں گھما کر نازی بیگم کی طرف دیکھا.....

جیسے پوچھنا چاہ رہے ہوں کہ کہیں آخری وقت میں انہیں بہلاوا تو نہیں دیا جا رہا؟

اقبال احمد کی نظریں دوبارہ ٹٹا کے چہرے پر جم گئیں۔ اُن کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب اُمڈا پڑ رہا تھا، ٹٹا کی اپنی حالت بھی غیر ہو رہی تھی، اُس نے زندگی میں جس شخص کی تلاش کی تھی وہ اُس کا باپ

کفارہ ادا کرنے کا وقت آیا تو موت نے رُوح اور جسم کا تعلق ختم کر دیا۔۔۔۔۔ موت کے دھانے پر
ہو کر اقبال احمد نے زندگی میں پہلی اور آخری بار ثنا کے ہاتھوں پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کی
لیکن فرشتہ اجل نے اتنا موقع نہیں دیا۔

..... حیات کا شیرازہ موت کے ہاتھوں بکھر گیا.....!!

نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن باپ کی موت کا غم ابھی تازہ تھا اس لئے چہرے سے وہ
ورنہ کر سکی جس نے اُس کے وجود کو دوسروں کے لئے ایک سوال بنا دیا تھا۔۔۔۔۔ آج بھی وہ
ممول سو کر اٹھی، جلدی جلدی کانچ جانے کے لئے تیار ہوئی، نگار کے ساتھ قدم ملائی کمرے
کلی تو یکنخت باپ کے آخری جملے اُس کے کانوں میں گونج اٹھے۔۔۔۔۔

..... معاف کر دینا۔ میری ثنا۔۔۔۔۔ باپ کا معنوم چہرہ نگاہوں کے سامنے ابھرا تو وہ اداس
..... بڑھتے ہوئے قدم آپ ہی آپ تھم سے گئے۔

..... کیا بات ہے؟..... نگار نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

..... کچھ بھی تو نہیں..... اُس نے اپنی رُوح کے زخموں کو چھپانے کی خاطر مسکراتے کی
اور مضحکہ خیز بن گئی۔

..... تم رُک کیوں گئی؟

..... میں اپنا قلم..... ڈریسنگ ٹیبل پر پھول گئی۔ اُس نے نگار کو ٹالنے کی کوشش کی۔ ”تم چلو۔
لے کر آئی ہوں۔“

اکوئی تار دور درخت تو نہیں ہے جسے اکھاڑنے میں تمہیں گھنٹوں لگیں گے۔۔۔۔۔ نگار بولی۔ ”چلو!
..... پیڑ بڑ شروع ہونے میں بہت تھوڑا وقت رہ گیا ہے۔“

..... پلیز!..... وہ مجسم التجا بن گئی۔

..... ج بھی چھٹی کا ارادہ ہے.....؟

..... صرف آج اور..... وہ جلدی سے جان چھڑانے کی خاطر بولی۔ ”کل سے چلوں گی۔ وعدہ۔“

..... روز سے تم برابر یہی کہہ رہی ہو..... آخر سلسلہ کیا ہے؟..... نگار نے اُسے بہت غور سے دیکھا
..... کیا ابھی تک بیڈ نمبر تھریٹن کی موت کا سوگ پورا نہیں ہوا.....؟

..... کوئی جواب نہیں دیا۔ اندر ہی اندر تڑپ کر رہ گئی۔

..... ٹ بی سی (Don't be silly)..... نگار نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”اگر تم نے ابھی
..... اُس کی موت کا اتنا اثر لینا شروع کر دیا تو ڈاکٹری کیا خاک کر دے گی..... وارڈس میں تو روزانہ
..... ہسپتال کو پیارے ہوتے رہتے ہیں، تم کس کس کا سوگ مناؤ گی؟“

..... ہر شخص کی بات اور سنی۔ وہ آنسو پیٹتے ہوئے بولی۔

..... کیا تم اُسے پہلے سے جانتی تھیں؟

..... بات کا تو طال ہے کہ میں اُسے پہلے سے نہیں جانتی تھی۔۔۔۔۔ ثنا کی پلکیں جھپکنے لگیں۔
..... عزیز یا رشتہ دار.....؟

..... تھا.....؟

..... ثنا کچھ کہتے کہتے یکنخت رُک گئی۔ جلدی سے بات بنا کر بولی۔ ”وہ بھی ہماری طرح

خواب..... جو بڑا تلخ..... بے حد بھیانک اور ڈراؤنا تھا.....

چند لمحے وہ یونہی گم صم کھڑی وقت کی رفتار کا اندازہ لگاتی رہی..... اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں
رہا تھا۔ جو سانحہ پلک جھپکنے میں رونما ہو کر اُس کی رُوح کو زخمی کر گیا تھا۔ وہ اُسے اپنا وہم سمجھ رہا
تھی..... یقین کس طرح گر لیتی؟ وہ..... جس کی خاطر اُس نے اپنی زندگی کی تمام خوشیوں کو یکسر ختم
دیا..... اپنا سکون..... اپنا آرام برباد کر لیا..... تمام رشتے ناتوں کو چھوڑ کر گھر سے کانچ کے ہوٹل میں
چلی گئی..... جس کی تلاش میں دنیا کا کوئی ناچھان مارنے کا عزم کر رکھا تھا.....

وہ..... جو اُس کا باپ تھا..... اُس کی شناخت اسی کے دم سے تھی۔ اور وہ اس شناخت کو گھر۔
ڈھونڈنے لگی تھی..... اُس نے طے کر لیا تھا کہ جب تک وہ اسے گمشدہ ماضی کو تلاش نہیں کر۔
گی..... اپنی کتاب زندگی کے اوراق کو جمع کر کے مکمل نہیں کر لے گی..... گھر واپس نہیں جائے گی۔
اُس کی اپنی سوچ تھی..... اُس کا اپنا ارادہ تھا.....

لیکن..... وقت کی گردش کی رفتار اس قدر تیز و تند تھی کہ وہ سکتے کی کیفیت سے دوچار ہو گئی۔ اُسے
کچھ دیر تک یہی محسوس ہوتا رہا جیسے وہ سب کچھ محض ایک خیال ہو..... وہم ہو..... مگر جب حقیقت

احساس ہوا تو وہ تڑپ اٹھی..... بلک بلک کر روئی..... وہ باپ کے سائے سے محروم ہو گئی تھی.....!!

..... شاید وہ خون ہی کا اثر تھا جس نے لاعلمی میں اُسے اقبال احمد سے اس قدر قریب کر دیا تھا..... و
شب و روز اسی مریض کے بارے میں سوچتی رہتی جو کوئی غیر نہیں..... اُس کا باپ تھا..... راستے کے

اندھیروں نے رشتوں کی شناخت مشکل کر دی تھی..... لیکن..... جب تاریکی کا سینہ جاک ہوا تو اُس
اپنا دل نگار ہو گیا..... موت کے بے رحم ہاتھوں نے اُس کی زندگی کی وہ متاع، وہ قیمتی اثاثہ چھین لیا
جس کے سہارے اُس نے مستقبل میں سر بلند ہو کر چلنے کا ارادہ کیا تھا..... کاتب تقدیر نے اُس کے حق

میں کیسا انوکھا..... کس قدر عجیب فیصلہ رقم کر دیا تھا۔ اور اُس کی تلاش رائیگاں نہیں گئی۔

وہ راستوں کے نشیب و فراز سے گزر کر منزل تک پہنچی..... پھر تھیم ہو گئی.....!! حیرتیں دل ہی دل
میں گھٹ کر رہ گئیں..... آرزو میں تڑپ تڑپ کر بڑھال ہو گئیں..... خواب..... خواب بن کر رہ گئے۔

لیکن وہ پھر بھی قدرت کی کارگیری سے شاک نہیں تھی..... یہی کیا کم تھا کہ حالات کی گردش نے
باپ تک پہنچا دیا..... اگر کہیں وہ باپ سے ملے بغیر ہی تھیم ہو گئی ہوتی تو شاید اُس کی حیرتوں کو بھی
قرار نہ آتا..... قدرت کے ساتھ ساتھ وہ اپنے باپ کی شکر گزار تھی جس نے مرتے مرتے اُس کی

زندگی کے بہت سارے دوسرے دور کر دیئے تھے..... ماں کی طرف سے اُس کے دل میں جو معصوم
خواہشات اور شبہات جنم لے رہے تھے وہ یکسر دُور ہو گئے۔

اقبال احمد نے زندگی کی آخری سانسیں پوری کرنے سے پیشتر ثنا کے سامنے اعتراف کر لیا تھا کہ
قصور اُن کا اپنا تھا، جس نے ایک بے بسائے گھر کی معصوم خوشیاں برباد کر دی تھیں..... ایک بیوی سے

اُس کا سہاگ چھین لیا..... ایک معصوم بچی سے ماں کی متا چھین لی..... اور جب غلطیوں کا احساس

”کیوں..... کیا دوپہر کو میرا گھر آنا منع ہے.....؟“

”یہ میں نے کب کہا لیکن.....“

”ٹٹا کی طرف گیا تھا..... واپسی میں آپ کا خیال آیا تو دفتر کا اِرادہ ترک کر کے گھر آ گیا۔“

”آپ لباس تبدیل کیجئے، میں ملازم سے کھانے کا کہتی ہوں۔“

”آپ آرام سے لیٹی رہیں..... میں نے دفتر سے روانہ ہوتے وقت کھانا کھا لیا تھا.....“ وقار احمد

تبدیل کرنے کے اِرادے سے ڈرینگ روم میں چلے گئے تو شامک بیگم کو معاً اس بات کا خیال آیا

شوہر نے کیا کہا تھا..... عام طور پر وہ جب بھی ٹٹا سے ملنے جاتے، شام کو جاتے تھے اور شامک بیگم بھی

ہ ہوتی تھیں..... پھر آج دوپہر میں ٹٹا کے پاس جانے کا کیا مقصد تھا.....؟ کیا کوئی خاص وجہ تھی یا

دفتری کام کو نمٹانے کے بعد ہوٹل راستے میں پڑنے کی وجہ سے سرسری ملاقات کا خیال آ گیا؟

جب سے شامک بیگم کو اپنے والد کے ذریعے اس بات کا علم ہوا تھا کہ اقبال احمد کو سول ہسپتال میں

با علاج داخل کرایا گیا ہے اُن کی راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام ہو گیا تھا..... لہذا اس وقت بھی

یشان ہوئیں۔ جب تک وقار احمد ڈرائیونگ روم سے باہر نہیں آ گئے طرح طرح کے دوسو سے ذہن

پیدا ہوتے رہے۔ پھر شوہر کے سامنے آتے ہی اُنہوں نے پہلا سوال کیا۔

”آج دوپہر میں ٹٹا کے پاس کیسے جانا ہوا.....؟“

”کیوں..... کیا وہ صرف آپ ہی کی بیٹی ہے..... میرا کوئی حق نہیں ہے اُس پر؟“

”میرا خیال ہے کہ آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں۔“ شامک بیگم نے شوہر کو ٹٹولنے کی کوشش کی۔

”بچے کہاں ہیں.....؟“ وقار احمد کرسی پر بیٹھے ہوئے بولے۔ ”نظر نہیں آ رہے۔“

”نادیہ ابھی کھانے کے بعد نادیرہ کی طرف گئی ہے..... فرحان اور صائمہ اپنے کمرے میں ہوں

۔“ شامک بیگم نے شوہر کے چہرے کے تاثرات کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے میری بات

اب نہیں دیا۔“

”میں دراصل جمال صاحب کے مشورے پر ہوٹل گیا تھا۔“ وقار احمد نے سنجیدگی اختیار کرتے

ہے مختصر جواب دیا تو شامک بیگم کی بے چینی اور بڑھ گئی۔

”خدا کے لئے جلدی بنا دیجئے کہ بات کیا ہے..... آپ کو کیا معلوم کہ میرے دل پر کیا گزر رہی ہے۔“

”حوصلے اور ہمت سے کام لیجئے۔ پریشانی مسائل کا حل نہیں ہوتی۔“ وقار احمد نے کہا پھر لمبی سانس

رہا۔ ”اقبال احمد کا انتقال ہو چکا ہے.....“

”کیا.....؟“ شامک بیگم اس خبر پر چونک اُٹھیں۔ ”کب ہوا اُس کا انتقال؟“

”ایک ہفتہ پہلے کی بات ہے۔“

”خس کم جہاں پاک..... اچھا ہوا جو ہمارے راستے کا کاٹنا صاف ہو گیا۔“ شامک بیگم نے اطمینان

س لے کر کہا۔ ”جیسی کئی دنوں سے نوشاہہ کا آنا نہیں ہوا.....“

”آج نہیں تو کل نادیرہ کو بھی علم ہو جائے گا..... موت کی اطلاع پوشیدہ تو نہیں رہ سکتی۔“

”ہوتا ہے تو ہوا کرے..... نادیرہ کو کیا خبر کہ اندرونی حالات کیا ہیں۔“ شامک بیگم بولیں۔ ”مجھے تو

ت کی خوشی ہے کہ اقبال احمد کے ساتھ ساتھ وہ راز بھی دُن ہو گیا جو ہمارے سروں پر خطرہ بن کر

بہتا تھا۔“

”میری بات ہے..... مرنے والے کو اس طرح یاد نہیں کرتے۔“

”انسان تھا۔ کیا انسانیت کا رشتہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا.....؟“

”ڈاکٹری اور فلسفے میں زمین اور آسمان کا فرق ہے.....“

”یہ فرق کس نے پیدا کیا.....؟“ ٹٹا نے جذباتی انداز میں تیزی سے سوال کیا۔

”انسان نے.....“ ٹٹا نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

”کوئی وجہ.....؟“

”نہایت معقول وجہ ہے..... اور وہ یہ کہ ہر انسان ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے اس لئے ہر

انسان سے سوچے سمجھے بنا ہمدردی نہیں کی جاسکتی..... بڑے بڑے تھرمین کی مثال لے لو..... کیا تم جانتی ہو کہ

اُس کا تعلق انسانیت کے جس جتنے سے تھا؟ اُس کا ماضی کیا تھا..... کون تھا وہ..... اور ایک جان لیوا

موذی مرض کا شکار ہونے میں کون سے محرکات.....“

”ٹٹا..... پلیز!“ ٹٹا نے اُسے روکنے کی کوشش کی۔

”میں بتاتی ہوں تمہیں، وہ کون تھا.....؟ وہ ایک مجرم تھا، ایک سزایاب مجرم جسے جیل حکام نے

بغرض علاج یہاں داخل کرا دیا تھا.....“

ٹٹا نے جلدی سے نظریں جھکا لیں، دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔

”سننا پسند کرو گی کہ اُس کا جرم کیا تھا.....؟“ ٹٹا نے نہایت جھارت سے اپنا سلسلہ کلام جاری

رکھتے ہوئے کہا۔ ”اُس نے دولت کے لالچ میں اپنی سوتیلی بیٹی کو ایک اوباش آدمی کے ہاتھوں فروخت

کرنے کی کوشش کی تھی..... بولو، کیا تم ایسے گھناؤنے جرم کا ارتکاب کرنے والے کو انسان کہو گی.....

اُسے انسانی ہمدردی کا مستحق سمجھو گی؟“

”تمہیں یہ باتیں کیسے معلوم ہوئیں؟“ ٹٹا نے سہمے ہوئے انداز میں دریافت کیا۔ ٹٹا کی باتیں اُس

کی رُوح کے زخم کو کچھ کے لگا رہی تھیں۔

”مجھے ڈیوٹی نرس نے بتایا تھا.....“ ٹٹا بے پروائی سے بولی۔ ”شاید یہی وجہ تھی کہ نرسیں اور

سسرُس اُس پر کوئی توجہ نہیں دیتی تھیں.....“

”تمہیں کانچ کو دیر ہو رہی ہے.....“ ٹٹا نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

”بکومت.....“ ٹٹا جھلا گئی۔ ”اب تو پیریڈ شروع ہو چکا ہوگا.....“

”خفا ہو مجھ سے.....؟“ ٹٹا نے بڑی مصومیت سے پوچھا۔

”تم سے نہیں..... تمہاری حماقتوں سے۔“ ٹٹا کے لہجے میں خلوص تھا۔ اُس نے ٹٹا کو پیار بھری

نظروں سے گھورا، پھر لاہریری کی جانب چلی گئی۔

ٹٹا کچھ دیر راہداری میں خاموش کھڑی گزرنے وقت کی نزاکتوں کا اندازہ لگاتی رہی پھر تھکے تھکے

انداز میں دوبارہ اپنے کمرے میں آئی..... لباس تبدیل کئے بغیر ہی بڑھال سی بستر پر لیٹ کر آنکھیں

موند لیں..... ٹٹا کی باتیں اُس کے ذہن میں صدائے بازگشت بن کر گونجتی رہیں.....!!

○○○

شامک بیگم حسب معمول کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کرنے کی غرض سے اپنی خوابگاہ میں جا کر

لیٹی تھیں۔ ابھی غنودگی کی کیفیت سے دوچار تھیں کہ دروازہ کھلنے کی آواز سے چونک اُٹھیں، پھر خلاف

توقع شوہر کو لگا ہوں کے سامنے پایا تو جلدی سے ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھیں۔

”آپ..... خیریت سے تو ہیں؟“ اُنہوں نے شوہر سے پرسش احوال کی۔

”آپ کیا چاہتے ہیں..... میں اقبال احمد کا سوگ مناؤں؟“ شائلہ بیگم نے عہدت سے کہا۔
 ”آپ نے یہ دریافت نہیں کیا کہ جمال احمد صاحب کو اقبال احمد کی موت کی اطلاع کس طرح ہوئی؟“ وقار احمد کے لہجے میں کوئی ایسی ہی بات تھی کہ شائلہ بیگم کے چہرے پر دکتی خوشی پل بھر میں کافور ہوگئی، پہلو بدلتی کر شوہر کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔

”کیا کہا تھا جمال بعد اُن کے آپ سے.....؟“

”تفصیل میں جانے سے پیشتر آپ کو مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا.....“

”وعدہ..... میں سمجھی نہیں۔“ شائلہ بیگم کی پریشانی دو چند ہوگئی۔ ”قصہ کیا ہے آخر.....؟“

”پہلے وعدہ کیجئے کہ آپ ان باتوں کا تذکرہ کسی اور سے نہیں کریں گی۔“

”آپ کو میرے اوپر بھروسہ نہیں ہے جو وعدہ لینے پر بھند ہیں؟“

وقار احمد نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا، ایک لمحے تک بیوی کے چہرے پر نظریں جمائے اُن کی پریشانی کا اندازہ لگاتے رہے پھر نہایت سنجیدگی سے بولے۔ ”جمال احمد کو شادی سے پہلے ہی تمام حالات کا علم تھا۔“

”آپ کو کیسے معلوم ہوا.....؟“ شائلہ بیگم نے حیرت سے دریافت کیا۔

”خود جمال صاحب نے اقرار کیا ہے..... اقبال احمد کی موت کا سانحہ رومنا نہ ہوتا تو شاید وہ اب بھی اپنی زبان بند رکھتے۔“ وقار احمد نے کہا۔ ”مجھے پہلے ہی شبہ تھا کہ وہ پہلے سے باخبر ہوں گے۔ ورنہ شاکلہ ذات میں اتنی دلچسپی لینے کی بظاہر اور کیا وجہ ہو سکتی تھی.....؟“

”کیا آپا جان کو بھی علم ہے کہ جمال بھائی.....؟“

”نہیں..... شائلہ بہن کو آج تک اس کا شبہ بھی نہیں ہو سکا کہ جمال احمد الف سے لے کر بے تک سب کچھ جانتے ہیں۔ اسی لئے اُنہوں نے بڑے خلوص سے درخواست کی ہے کہ ان باتوں کا تذکرہ کسی اور سے نہ کیا جائے۔“

”میں سمجھی نہیں..... اگر جمال بھائی اس راز کو راز رکھنا چاہتے تھے تو آپ سے ذکر کرنے کی کیا ضرورت پیش آ سکتی؟“

”شاکلہ کی خاطر اُنہوں نے ہمیں اعتماد میں لینے کی کوشش کی ہے.....“

”کیا مطلب..... کیا شائلہ.....؟“

”ہاں.....“ وقار احمد نے کہا۔ ”جمال صاحب کو پروفیسر شیرازی کے ذریعے اس بات کا علم ہوا ہے کہ نازلی بیگم نے جو اقبال احمد کی موت کے وقت ہسپتال میں موجود تھیں باپ بیٹی کو ایک دوسرے سے متعارف کرا دیا..... شائلہ نے باپ کی موت کا بڑا گہرا اثر لیا ہے.....“

”یہ تو بہت برا ہوا.....“ شائلہ بیگم نے بڑے رُود کا مظاہرہ کیا۔ ”نازلی بیگم اور نوشاہہ کا منہ کون بند کرے گا؟“

”آپ اس کی فکر نہ کریں..... جمال صاحب ملاقات کر چکے ہیں نازلی بیگم سے۔ اُن کے کہنے کے مطابق نازلی بیگم کا تعلق شریف گھرانے سے ہے..... جمال صاحب کا خیال ہے کہ وہ اس سلسلے میں اپنی زبان نہیں کھولیں گی۔“

”ہماری شاکلہ پر کیا گزر رہی ہوگی.....“ شائلہ بیگم کی آواز شدت غم سے بھرا گئی۔ ”اُس کا کیا حال ہوگا؟“

”میں شائلہ سے اس لئے ملتا تھا کہ اُس کے دکھ کا اندازہ کر سکوں..... وہ بڑے ظریف اور صبر و ضبط کی

ہے..... مجھے اس بات کا اندازہ ہی نہ ہونے دیا کہ وہ اقبال احمد کے بارے میں کچھ جانتی بھی نہیں نے اُس کی پریشانی کا سبب دریافت کیا تو یہ کہہ کر ٹال گئی کہ پڑھائی کی تکان کے علاوہ دلی وجہ نہیں..... جمال بھائی نے اسی غرض سے مجھے وہاں بھیجا تھا کہ میں شاکلہ پر باپ کی موت کا معلوم کر سکوں..... وہ نہیں چاہتے کہ شائلہ بہن کو یا بچوں میں کسی کو اس بات کا علم ہو کہ اُن کے ان آپس میں کیا رشتہ ہے.....“

”لیکن کب تک.....؟“

”جب تک خدا کو منظور ہو۔“ وقار احمد بولے۔ ”کل کیا ہوگا یہ اُس کے سوا اور کون جانتا ہے؟“

”کیا شاکلہ کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اُس کی ماں.....؟“ شائلہ بیگم اپنا جملہ مکمل نہ کر سکیں، شدت سے اُن کی آواز کی پکیا کی تو جملہ حلق میں پھنس کر رہ گیا۔

”صبر سے کام لیجئے بیگم.....“ وقار احمد نے بیوی کو دلاسا دیا۔ ”لڑکیاں تو یوں بھی پر ایا دھن ہوتی..... شادی کے بعد تو بہر حال ماں باپ سے جدا ہونا پڑتا ہے.....“

”وہ اور بات ہے..... لیکن میں نے شاکلہ کو ماں بن کر پالا ہے، اس لئے دکھ تو ہوگا۔“

”شائلہ بہن کی مثال سامنے ہے..... اُن کے دل سے پوچھئے جنہوں نے متا کی تڑپ کو سینے میں لراہیک عمر پتادی اور اُف تک نہ کی..... اب تو بس یہ دعا کیجئے کہ نادیہ کے ساتھ شاکلہ گھر بھی آباد

ئے۔“ ”دونوں اپنے اپنے گھروں کی ہو جائیں تو پھر کسی بات کا خدشہ نہیں رہے گا۔“

”میں تو دن رات خدا سے شاکلہ کے مستقبل اور اُس کی بھلائی کی دعائیں مانگتی ہوں..... فوزیہ خاتون

ای زبان نے زہر نہ اُگلا ہوتا اور گڑے مُردے نہ اُکھاڑے ہوتے تو ہماری شایوں گھر سے بے گھر

ٹی۔ اب تک اُس کے ہاتھ بھی پیلے ہو چکے ہوتے۔“

”ماپوس نہ ہوں..... ممکن ہے ان باتوں میں خدا کی کوئی مصلحت کار فرما ہو..... وہ جو کرتا ہے انسان

ہلے کی خاطر کرتا ہے..... ہم نہ سمجھ سکیں تو اس میں ہماری کوتاہی ہے.....“

شائلہ بیگم نے کوئی جواب نہیں دیا، دوپٹے کے پلو سے خاموش بیٹھی پلکوں سے اُنڈتے آنسوؤں کو

کرتی رہیں۔ وقار احمد نے تھوڑے وقفے کے بعد کہا۔

”شائلہ بہن یا شائلہ سے ملتے وقت اس بات کا خیال رکھئے گا کہ آپ کی ذرا سی لغزش حالات کو خراب

تا ہے۔“

”مجھے سب کچھ منظور ہے..... لیکن ایک شرط پر۔“

”وہ کیا.....؟“

”میں شاکلہ کو دہن بنا کر اپنی دلہن سے رخصت کروں گی۔“ شائلہ بیگم نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا

بے اختیار چہرے کو دونوں ہاتھوں کے درمیان چھپا کر سکنے لگیں۔

وقار احمد نے بیوی کے جذبات کی صداقت کو محسوس کیا تو اُن کی پلکوں پر بھی آنسوؤں کے شبنمی

اُبل اُبل آئے!!

ہے۔ اس طرح ڈاکٹر نفسیاتی طور پر احمر کی بیماری کا احوال معلوم کرنا چاہتے تھے۔ انہیں اپنے نفسیاتی طریقہ علاج میں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ جب سے احمر کو کراچی جانے کا علم ہوا تھا ان کے چہرے پر خوشگوار تاثرات پیدا ہو چکے تھے۔

فوزیہ خاتون ماں تھیں..... ان کی نظریں اولاد کے دل میں جھانکنے کی قوت رکھتی تھیں۔ احمر کی زندگی بچانے کی خاطر وہ سب کچھ قربان کر سکتی تھیں لیکن شاکو انہوں نے اپنی انا کا مسئلہ بنا رکھا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جہاں وہ احمر کے مرض میں افاقے کو دیکھ کر بہت خوش تھیں وہاں اکثر ایک خیال ذہن میں ابھر کر انہیں پریشان بھی کر جاتا۔

کراچی کا نام سن کر احمر کے بیمار چہرے پر زندگی کی مسرتیں واپس لوٹ آئی تھیں..... آنکھوں میں زندہ رہنے کی آرزو جھلنے لگی تھی..... اس لئے کہ کراچی میں شاربہ تھی..... لیکن.....

صحت یاب ہونے کے بعد جب کراچی سے نیرونی کی واپسی کا سوال اٹھے گا..... اُس وقت کیا ہو گا؟..... کیا احمر کراچی کو خیر یاد کہنے پر آمادہ ہو جائیں گے؟..... اس شہر سے منہ موڑ لیں گے جہاں اُن کی زندگی..... اُن کی شاربہ تھی؟..... کیا شاربہ سے جدائی کا خیال احمر کے دل و دماغ پر دوبارہ کوئی مضرت اثرات مرتب نہیں کرے گا؟..... اور اگر حالات نے اچانک کوئی مخدوش صورت اختیار کر لی تو.....؟ یہی ایک سوال تھا فوزیہ خاتون کو اکثر پریشان کر دیتا تھا مگر وہ اولاد کی زندگی کی خاطر یہ جوا بھی کھیلنے کو تیار تھیں۔ انہوں نے اس خیال سے اپنے دل کو تسلی دے رکھی تھی کہ بیٹے کی صحت یابی بنیادی مسئلہ ہے۔ باقی ثانوی باتیں ہیں جو موقع محل کے اعتبار سے پٹائی جاسکتی تھیں۔

پروفیسر مارٹن کے مشوروں کی روشنی میں فوزیہ خاتون نے اولاد سے طرز عمل میں نمایاں تبدیلیاں پیدا کر لی تھیں۔ ماں ہونے کے ناتے وہ ہر نماز میں احمر کی صحت کی خاطر خدا کے حضور سر بسجود ہو کر گز گزائی رہتیں، اُن کی تندرستی اور مستقبل کی بہتری کے لئے دُعائیں مانگتی رہتیں۔ جتنی دیر احمر اُن کی آنکھوں کے سامنے رہتے، وہ اُسے خوش رکھنے اور خوش دیکھنے کی باتیں کرتیں اور جب وہ احمر سے دور ہوتیں تو بھی احمر ہی کا خیال اُن کے دل و دماغ میں رجا بسا رہتا۔

آج صبح بھی جب وہ احمر کے کمرے میں ناشپے کے گرد اُٹھ کر بیٹھیں تو وہ آرام کرسی پر نیم دراز اخبار کے مطالعے میں مصروف تھے۔ چہرے پر تازگی اور شگفتگی کے تاثرات نظر آ رہے تھے۔ ڈاکٹروں نے اس خیال سے اخبار پڑھنے کے سلسلے میں تاکید کر رکھی تھی کہ کوئی خبر مریض کے دل پر ناخوشگوار اثر نہ ڈالے۔ فوزیہ خاتون نے ناشپے کی ٹرائی احمر کے قریب چھوڑ کر اُن کے ہاتھ سے اخبار لیا تو احمر ایک لمحے کو چونک سے گئے، پھر ماں کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے سلام کے لئے ہاتھ اٹھا دیا۔

”جیتے رہو..... خوش رہو..... سدا سکھی رہو لیکن.....“

”اس میں ملازم کی غلطی کا کوئی دخل نہیں۔“ احمر نے جلدی سے وضاحت کی۔ ”پڑے پڑے دل گھبرا رہا تھا، میں نے سوچا کیوں نہ اخبار سے دل بہلایا جائے.....“

”اخبار تمہارے کمرے میں کون لایا تھا.....؟“

”میں خود لایا تھا۔“

”تم..... فوزیہ خاتون پریشان ہو گئیں۔“ تم چل کر گئے تھے باہر برآمدے تک.....؟“

”ہاں! سی ٹکان ضرور ہوئی..... لیکن اچھا لگا۔“

”ٹھیک ہے..... اگر تم نے اپنی من مانی شروع کر دی ہے تو پھر علاج کے لئے کراچی جانے سے کیا

نہ.....؟“

”بھولے سے ایک چھوٹی سی غلطی سرزد ہو گئی۔“ احمر نے ماں کا فیصلہ سنا تو بڑی سنجیدگی اور مصومیت سے بولے۔ ”پراس..... دوسری بار ایسی کوئی غلطی نہیں ہوگی.....“

فوزیہ خاتون بیٹے کی مصومیت پر مسکرا دیں لیکن اس کے ساتھ ہی انہیں اس بات کا بھی شدت سے احساس ہوا کہ کراچی نہ جانے کاسن کر احمر کے چہرے پر اچانک جو تاثرات نمودار ہوئے تھے، وہ ماں کی بیماری کے لئے صحت مند نہیں کہے جاسکتے تھے۔ بیٹے کو بہلانے کی خاطر جلدی سے بولیں۔

”ہم نے سڑکی ساری تیاری مکمل کر لی ہے..... تمہارے والد آج پروفیسر مارٹن سے ملیں گے۔ اگر اکثر نے ہاں کر دی تو ہم کل ہی کراچی کے لئے پرواز کر جائیں گے۔“

”ہمارا قیام کہاں ہو گا.....؟“ احمر نے دریافت کیا تو فوزیہ خاتون ایک لمحے کو الجھی گئیں۔ لیکن لاد کی خاطر ہونٹوں پر تبسم نکھیر کر بولیں۔

”تم جب تک مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہو جاؤ گے، ہسپتال میں رہو گے۔“

”اور آپ لوگ.....؟“

”ہم تمہارے قریب ہی رہیں گے۔“ فوزیہ خاتون نے کہا۔ ”تمہارے والد نے تمام انتظامات کر لئے ہیں۔“

”امی جان..... ایک بات پوچھوں.....؟“

”پوچھو.....!“

”کیا کراچی والوں کو میری بیماری کی اطلاع نہیں ملی.....؟“

”احمر.....“ فوزیہ خاتون نے بیٹے کے جملے کی کک کو محسوس کیا تو پریشان ہو گئیں۔ ایک ٹانے کے لئے احمر کے چہرے کو بہت غور سے دیکھا پھر دل کی دھڑکنوں کو سمیٹتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ”تم نے مجھ سے کچھ وعدے کئے تھے..... یاد ہیں؟“

”آپ فکر مند نہ ہوں امی جان..... میں نے یونہی.....“

”بالکل نہیں..... جب تک تم پوری طرح صحت مند نہیں ہو جاتے تمہیں اپنا وعدہ نبھانا ہو گا ورنہ پھر لٹھا ہو جاؤں گی۔“

”آپ بھی خفا ہو گئیں تو پھر میری زندگی میں باقی کیا بچے گا؟“

”پھر شروع کر دیں تم نے وہی باتیں جس کے لئے ڈاکٹروں نے سختی سے تاکید کی ہے۔“ فوزیہ اتون نے پلٹ کر احمر کو سرزنش کی پھر بڑے لاڈ سے اُس کے بھرے بالوں میں انگلیوں سے کنگھا

لرتے ہوئے بولیں۔ ”میں ڈاکٹروں کے مشورے پر عمل کرنا چاہئے۔ اپنی خاطر نہ سہی..... اپنی ماں کی خاطر سہی۔ یوں بھی اچھے بچے بزرگوں کا کہا بھی نہیں ٹالتے۔“

”آپ مطمئن رہیں امی جان..... میں آپ کی خوشیوں کے خلاف کبھی کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گا۔“

نرنے سادگی سے مسکرا کر جواب دیا، پھر ناشپے میں مصروف ہو گئے۔ فوزیہ خاتون نے بیٹے کے جملے کی گہرائی کو محسوس کیا اور اندر ہی اندر دل مسوس کر رہ گئیں! اُسی روز دوپہر کی ڈاک میں خلاف توقع نئے رنگ کا لفاظ سامنے آیا تو فوزیہ خاتون کی پیشانی پر ٹری تریجی ان گنت سلوٹیں ابھر آئیں۔ لفاظی کی پشت پر لگی ڈاک کی مہر جیسے اُن کا منہ چڑا رہی تھی۔ احمر کے نام تھا اور طرز تحریر پر ایک نظر پڑے ہی فوزیہ خاتون کے ذہن میں جو نام ابھرا وہ شاکے سوا

اور کسی کا نہیں تھا۔ ایک لمحے کو فوزیہ خاتون کے دل میں یہ خیال ابھرا کہ وہ لافانہ کھوئے بغیر اُسے نذر آتش کر دیں، پھر انہوں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ ملازم کو اس بات کی سختی سے تاکید کرنے کے بعد کہ خط کے بارے میں کسی سے کوئی ذکر نہ کیا جائے وہ لاؤنج سے اُٹھ کر اپنی خواب گاہ میں آ گئیں۔ نفرت بھرے انداز میں لافانہ چاک کیا اور تیوری پر بل ڈال کر خط کا مضمون پڑھنا شروع کیا۔

”احمر..... ہمیشہ خوش رہو.....!“

تمہارے دونوں خط میرے سامنے موجود ہیں..... مجھے خوشی ہے کہ تم نے ایک مخلص دوست کی حیثیت سے یاد رکھا..... میں شکر گزار ہوں کہ تم نے امتحان کی کامیابی کے سلسلے میں مجھے مبارکباد کا پیغام ارسال کیا..... اور..... اس بات کی شرمندگی بھی کہ میں اس قدر تاخیر سے تمہارے خط کا جواب دے رہی ہوں..... امید کرتی ہوں کہ تم میری مجبوریوں کا خیال کرتے ہوئے اس تاخیر کو نظر انداز کر دو گے۔ دوستوں کے درمیان حجاب اور تکلف برقرار رہے تو دوستی کی عمر زیادہ طویل نہیں ہوتی۔ اس لئے بڑی صاف گوئی سے بات کہہ رہی ہوں کہ اگر مجھے جمال صاحب کی زبانی بیماری کا علم نہ ہوتا تو شاید میں اب بھی تمہیں جواب دینے کی جسارت بھی نہ کرتی۔

تمہارے پہلے خط کا ایک حصہ نقل کر رہی ہوں..... اُسے غور سے پڑھو۔

”میں سوچتا ہوں..... تمہاری خاموشی ہی مناسب ہے۔ اس لئے کہ اگر ہم نے بولنے کی کوشش کی تو اُن رشتوں کا بھرم خاک میں مل جائے گا جو بڑے مقدس، بڑے قابل احترام ہوتے ہیں..... ہم جن رشتوں کے احسانات کے مقروض ہیں اُن کے سامنے نظر اٹھا کر بات کرنا بھی ہمیں زیب نہ دے گا۔“

مجھے تمہاری بات سے اتفاق ہے..... اسی لئے میں نے اپنی زبان پر تالے ڈال لئے ہیں..... مقدس رشتوں کے بھرم کو قائم رکھنے کی خاطر اُس دلیز کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دیا جس سے زندگی کی لاکھوں یادیں وابستہ ہیں..... کچھ بخ اور کچھ شیریں یادیں..... انہی یادوں نے میری زندگی کے توازن کو بگاڑ دیا..... لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ توازن ایک بار پھر برقرار ہوگا..... کب؟..... میں دُشوک کے ساتھ نہیں کہہ سکتی.....

میرا خیال ہے کہ تم میری زندگی کے اُن پہلوں سے بھی واقف ہو چکے ہو گے جو میرے لئے ابھی تک ایک معمہ بنے ہوئے ہیں..... بڑی اماں نے شاید تمہیں میرے بارے میں سب کچھ تفصیل سے بتا دیا ہو۔ یہ کہ میں کون ہوں؟..... میرا باپ کون ہے؟..... کہاں ہے؟..... ہے بھی یا.....؟

وہ حالات اور واقعات کیا تھے جن کی ذمہ داری آ کر میرے حصے کی بہاریں خزاں کا رنگ اختیار کر گئیں..... ماں کے ہوتے ہوئے بھی مجھے اُس کی ممتا سے محروم کر دیا گیا..... باپ کی موجودگی کے باوجود میری شناخت دوسروں کے ناموں سے ہوئی رہی..... یہ باتیں بڑی اذیتناک اور سوبان زوح تھیں..... میری قوت برداشت جواب دے گئی..... صدمہ اتنا شدید تھا کہ میں سنبھل نہ سکی۔

ہسپتال میں گزرے ہوئے وہ لمحے مجھے آج بھی یاد ہیں..... اُس وقت زخم تازہ تھا اس لئے میں نے موت کی تمنا کی تھی لیکن آج شکر گزار ہوں کہ ڈاکٹروں کی محنت میرے کام آگئی..... اب مجھے اُس شخص کی تلاش ہے جو میرا باپ ہے..... میں ان رشتوں کو دُور رہ کر بہت قریب سے دیکھنا چاہتی ہوں جو اپنے ہوتے ہوئے بھی پرانے بن گئے ہیں..... کیسی عجیب اور دلچسپ صورت حال ہے۔

میں بڑی اماں کی احسان مند ہوں کہ اُن کی وجہ سے مجھے اپنی تم گشتہ زندگی کا سراغ مل گیا..... مجھے اُن سے کوئی شکایت، کوئی شکوہ نہیں..... اُن کی جگہ میں ہوتی تو شاید میرا ردِ عمل زیادہ شدید ہوتا.....

افسوس اگر ہے تو اس بات کا ہے کہ مجھے اپنے ناکردہ گناہوں کی سزا بھگتنی پڑ رہی ہے لیکن اس زندگی میں بھی جولطف ہے وہ صرف میں ہی جانتی ہوں۔ یہی دُھمل حالات میری کامیابی کی ضمانت ہیں، میں ان حالات کی احسان مند ہوں جنہوں نے مجھے زندگی کا قرینہ سکھا دیا..... گھٹ گھٹ کر جینا سکھا دیا..... تم نے دوسرے خط میں مجھے میری کامیابی پر مبارکباد دی ہے..... شکر ہے! لیکن یہ امتحانات میرے لئے کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتے..... ڈگریوں کا حصول انسان کے لئے اُس کے شاندار مستقبل کی ضمانت تو بن سکتا ہے، رنجوں کے لئے مرہم نہیں بن سکتا جو حالات اور وقت کے پیدا کردہ ہوتے ہیں۔ دُعا کرتا کہ میں زندگی کے اس امتحان میں بھی کامیاب رہوں جس نے مجھے زندگی کے اُس دوراے پر لا کھڑا کیا ہے جہاں ایک جانب میرا مستقبل ہے اور دوسری سمت اُلجھے رشتوں کے وہ تانے بانے ہیں جن کا سراشاہد میرے دنیا میں قدم رکھتے ہی کم ہو گیا تھا..... مجھے اُس سرے کی تلاش ہے۔

اور ہاں..... تم نے اپنی زندگی کو یہ کون سا روگ لگا لیا..... جمال احمد بتا رہے تھے کہ ڈاکٹروں نے عارضہ قلب تشخیص کیا ہے..... یہ بھی کوئی مرض ہے..... میں ابھی مکمل ڈاکٹر نہیں بنی لیکن بڑے دُشوک سے کہہ سکتی ہوں کہ انسان اس مرض میں اُس وقت مبتلا ہوتا ہے جب اُس کی قوت برداشت جواب دے جاتی ہے..... وہ غم کی شدتوں کو اپنے اوپر مسلط کر لیتا ہے..... مایوسی کو مقدر سمجھ بیٹھتا ہے..... اُن حالات کا شکار ہو جاتا ہے جو اُس کی دسترس سے باہر ہوتے ہیں..... پانچوہرہ حفظانِ صحت کے اصولوں پر اپنی تندرستی کا خیال رکھنے کی طرف سے غفلت برتنے لگے۔

تمہارے ساتھ ایسا کون سا حادثہ پیش آ گیا..... دولت، عزت، شہرت، صحت اور ماں باپ کا پیار..... سب کچھ تو حاصل ہے تمہیں۔ پھر یہ دل کا روگ کہاں سے آ گیا درمیان میں.....؟ کہیں تم نے حالات سے دلبرداشتہ ہو کر ہمت تو نہیں ہار دی..... اگر ایسا ہے تو میں اسے بزدلی کا نام دوں گی۔

ہاں احمر..... وہ جو وقت کے سامنے ہتھیار ڈال دیں زندگی میں کبھی ترقی نہیں کر سکتے..... تم نے مشکلات کے سامنے سینہ سپر ہونا سیکھا تھا، پھر یہ انقلاب کیسے آ گیا..... کہیں اس کی وجہ بھی میری محسوس ذات تو نہیں.....؟

سنو احمر..... تم نے مجھے دوست کہا ہے..... ہمیشہ دوستی نبھانے کا وعدہ کیا ہے..... اگر تم نے رشتہ قائم کیا ہے تو پھر میری خاطر اس کی لاج بھی رکھنا ہوگی.....

تم نے لکھا تھا کہ بڑی اماں تمہاری شادی کی خواہشمند ہیں۔ میری درخواست ہے کہ تم ماں کی خواہش کے آگے سر تسلیم خم کر دو..... اُس ماں کی خاطر جس کے پیروں تلے اولاد کی جنت ہوتی ہے۔ یہ جنت زوٹھ جاتی ہے تو بڑا دُکھ..... بڑا ملال ہوتا ہے..... میری مثال تمہارے سامنے ہے۔ میرے حالات سے سبق لینے کی کوشش کرو۔

مجھے یقین ہے احمر! کہ تم اپنی دوستی کا بھرم قائم رکھنے کی خاطر بڑی اماں کی خواہش کا احترام ضرور کرو گے۔ ماں کا رشتہ دنیا کے تمام رشتوں سے زیادہ مقدس اور پاک ہوتا ہے..... اور..... وہ جو اس مقدس رشتے کو نہ نبھاسکے بھلا کی اور رشتے کو کیا نبھاسکے گا..... مجھے امید ہے کہ تم میری درخواست پر غمزدہ دل سے غور کرو گے اور خود کو حالات کے اس خول سے باہر نکالنے کی کوشش کرو گے جہاں ممکن..... رسوائی اور مایوسیوں کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

جمال صاحب نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ تم شاید علاج کی غرض سے کراچی آ رہے ہو..... میری اہمیت ہے کہ میں بھی ایک تیماردار کی حیثیت سے تمہارے کام آؤں۔ لیکن میں اُس وقت تک تمہاری

نگاہوں کے سامنے نہیں آؤں گی جب تک تم بڑی اماں کی خواہش کا احترام نہیں کرو گے۔ یہ میرا سہم ہے اور آخری فیصلہ۔

اب تم بتاؤ احمد۔ تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟ مجھے تمہارے جواب کا شدت سے انتظار رہے گا۔ تمہارے جواب پر ہی ہماری دوستی کا اٹھارہ قائم ہے۔!! اگر حالات سازگار ہوں تو بڑی اماں کی خدمت میں میرا دست بستہ سلام ضرور عرض کر دیتا!

فقط تمہاری صحت یابی کے لئے دعا گو۔ شا۔!! شا۔!! شا۔!!

فوزیہ خاتون کے دماغ میں شا کے نام کی بازگشت جاری تھی۔ پھر باہر سے غار احمد کی آواز سنائی دی تو انہوں نے شا کے خط کو جلدی سے الماری کھول کر کپڑوں کے نیچے چھپا دیا اور دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتی باہر آ گئیں۔!

○○○

نادرہ تیز تیز قدم اٹھاتی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو گھر کے تمام افراد کو سامنے دیکھ کر ٹھٹکی گئی۔ بڑے ادب سے وقار احمد اور شائلہ بیگم کو سلام کیا، پھر قدم بڑھاتی نادیا کے قریب چلی گئی جو ریڈیو گرام کے قریب بیٹھی نادرہ کے چہرے پر دکنی مسرتوں کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔

صائمہ اور فرحان قائلین پر بیٹھے لٹو کھیل رہے تھے، فرحان کی بازی قدرے کمزور تھی اس لئے نادرہ کو دیکھتے ہی اس نے کھیل ختم کرنے کا اعلان کیا تو صائمہ تھلا گئی۔

”شروع کر دیا تم نے رونا۔۔۔۔۔“ صائمہ نے احتجاج کیا۔
”اس میں رونے کی کیا بات ہے؟“ فرحان نے جرح کی۔ ”جب تک نادرہ آتی ہیں کھیل بند کئے دیتے ہیں، اس کے بعد موقع ملتے ہی تم کھیل بگاڑ دو گے۔ یہ پرانی عادت ہے تمہاری۔“

”کیا بات ہے فرحان۔۔۔۔۔“ شائلہ بیگم نے فرحان سے دریافت کیا۔ ”پھر شروع کر دی تم نے شرارت؟“

”آپ فیصلہ کریں امی جان!“ صائمہ نے ماں کی عدالت میں کیس چلایا۔ ”میری دو گونیمیں پاٹ ہو چکی ہیں اور فرحان کا ابھی تک توڑ بھی نہیں ہوا۔ اب یہ ہارنے لگا تو کھیل ختم کرنے کو کہہ رہا ہے۔“

”میں تو رعایت کر رہا تھا۔“ فرحان نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔ ”ورنہ میرے لئے جوڑ توڑ کرنا کیا مشکل ہے؟“

”شکل دیکھی ہے آئینے میں۔۔۔۔۔ بڑے آئے رعایت کرنے والے۔“ صائمہ تک کر بولی۔

”تم باز نہیں آؤ گے فرحان؟“ شائلہ بیگم نے بیٹے کو پیار سے سرزنش کی۔

”میرا کیا قصور ہے۔۔۔۔۔ آپ ہی کے حکم کی تعمیل کر رہا تھا۔“ فرحان نے بڑی مصومیت سے کہا۔

”آپ ہی تو کہتی ہیں کہ بڑی بہن کی عزت کیا کرو۔۔۔۔۔ خیال کیا کرو۔۔۔۔۔ اسی لئے میں نے جان بوجھ کر غلط کھیل کھیلا اور اب آپ بھی۔۔۔۔۔“

”آئندہ میں کبھی تمہارے ساتھ نہیں کھیلوں گی۔“ صائمہ نے کھیل بگاڑتے ہوئے کہا، پھر روضے

ہوئے انداز میں اٹھ کر چلی گئی۔

”ناراض کر دیا تم نے بڑی بہن کو۔۔۔۔۔“

”ہو سکتا ہے اس میں بھی کوئی چال ہو۔۔۔۔۔ میں اپنی چاکلیٹ میز پر چھوڑ آیا تھا۔“ فرحان نے یاد

دے ہوئے کہا پھر تیزی سے لپکتا ہوا صائمہ کے تعاقب میں چلا گیا۔

”ہر وقت اسی طرح لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔“ شائلہ بیگم نے شوہر سے کہا۔ ”آپ نے فرحان بہت ڈھیل دے رکھی ہے، ابھی پیار سے بھی ڈانٹنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔“

”ابھی بچے ہیں۔۔۔۔۔ بڑے ہوں گے تو عقل آ جائے گی۔“ وقار احمد نے کہا پھر دوبار مطالعے میں روف ہو گئے۔

شائلہ بیگم نے گردن کو خفیف سی حرکت دی پھر نادرہ سے بولیں۔ ”تم کیسی ہونا رہ بیٹی۔۔۔۔۔ ارے ڈیڈی تو خیریت سے ہیں؟“

”آپ کی دعا سے سب خیریت سے ہیں۔“

”گھر جا کر اپنی نظر اُترالینا۔۔۔۔۔“ شائلہ بیگم نے بڑی اپنائیت سے کہا۔ ”دھانی رنگ کے شلوار

ٹ میں تم ہمیشہ بہت پیاری لگتی ہو۔“

”شکریہ آئی!“

پھر شائلہ بیگم نے اُون سلائی کی جانب توجہ مبذول کی تو نادیا نے نادرہ کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”ذرا

بی طرف تو دیکھنا۔“

”کیوں۔۔۔۔۔ آج میرے اندر ایسی کون سی خاص بات نظر آ رہی ہے؟“ نادرہ نے انجان بننے کی

ش کی لیکن چہرے پر پھوٹی مسرتوں کی ان کرنوں کا کیا کرئی جنہوں نے اُسے گلزار بنا دیا تھا۔ ہلکے

رنگ کے شلوار سوٹ میں وہ خاصی سمارٹ نظر آ رہی تھی۔

”یہ تمہارے چہرے پر اُداسی کے بادل کیوں منڈلا رہے ہیں؟“

”اُداسی کے بادل۔۔۔۔۔ اور میرے چہرے پر۔۔۔۔۔؟ تمہارے منہ میں خاک۔“ نادرہ نے شوفی سے

”آج تو میں بہت خوش ہوں۔“

”کیا سیرا خاتون کی طرف سے نہا ہو گئی؟“

”اے۔۔۔۔۔ خبردار! جو تم نے ایسی بدشگونی کی بات منہ سے نکالی۔“

”ایک شرط پر۔۔۔۔۔“

”وہ کیا۔۔۔۔۔؟“

”جلدی سے بتا دو کہ اس وقت تمہارے چہرے کا سبب کیا ہے؟“

”یہی بات تم شرافت سے بھی پوچھ سکتی تھیں۔۔۔۔۔“ نادرہ نے کہا پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر

”بات عید کے چاند میں سنہری ہے۔“

”سچ؟“ نادیا نے اُسے پیار سے گھورا۔

”ڈیڈ نے بتایا ہے۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔“

”لیکن کیا۔۔۔۔۔؟“ نادیا نے تجسس سے دریافت کیا۔

”عید کے چاند میں ابھی دو ماہ باقی ہیں۔۔۔۔۔ کیسے کہیں گے یہ ساٹھ دن۔۔۔۔۔؟“

جواب میں نادیا نے اس زور سے چٹکی لی کہ وہ تھلا کر رہ گئی۔ ”شرم نہیں آتی تھے ایسی بے غیری کی

ما کرتے؟“ نادیا نے گھور کر کہا پھر مسکرا کر بولی۔ ”مبارک ہو تمہیں عید کا چاند اور قربانی کا بکرا۔“

”ڈنہ کہو۔۔۔۔۔“ نادرہ نے کہا۔ ”آج کل تو وہ مارے خوشی کے پھولتے جارہے ہیں۔“

”میرا مشورہ ہے کہ تم اب راجیل سے پردہ شروع کر دو!“ نادیا بخنبدہ ہو گئی۔

”پردہ..... وہ کس لئے؟“ نادرہ نے حیرت سے پوچھا۔

”وجہ تو مجھے نہیں معلوم۔ لیکن سنا یہی ہے کہ شادی کی بات طے ہو جانے کے بعد لڑکے اور لڑکی ایک دوسرے سے ملنے نہیں دیا جاتا..... شاید اس لئے کہ انتظار کے بعد اچانک ایک دوسرے کو پا لے کی زیادہ خوشی ہوتی ہے۔“

”اچھا.....“ نادرہ نے شوشی سے کہا۔ ”پھر تمہارا اور منصور کا پردہ کب شروع ہو رہا ہے؟“

”آہستہ بول.....“ نادیہ نے والدین کی طرف ہنکھوٹوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں تیری طرح بے شرم نہیں ہوں کہ اپنی بات سبکی ہونے کا ڈھنڈورا پیٹتی پھروں گی.....“

”کیا مطلب..... کیا چوری چھپے شادی کرنے کا ارادہ ہے؟“

نادیہ پلٹ کر کوئی مناسب جواب دینا چاہتی تھی کہ قدموں کی آہٹ سن کر چونکی..... پلٹ کر دیکھا منصور دروازے سے داخل ہو رہے تھے۔ سر سے پاؤں تک سفید لباس میں ملبوس وہ بہت زیادہ بچہ دار تھے۔ ایک لمحے کے لئے نگاہوں کا تصادم ہوا، پھر منصور قدم اٹھاتے وقار احمد کے قریب چلے گئے۔

”کسی نے سچ کہا ہے..... شیطان کے بارے میں سوچو تو وہ آنے میں در نہیں کرتا۔“ نادرہ۔

شوشی سے کہا۔ پھر اس سے پہلے کہ نادیہ کوئی جوابی کارروائی کرتی، وہ تیزی سے اٹھی اور منصور کے براہ والے صوفے پر جا کر بیٹھ گئی۔

نادیہ کو بھی اپنی جگہ سے اٹھنا پڑا، اُس نے ماں کے برابر والے صوفے پر قبضہ جمالیا۔ منصور اُپر کے بالکل سامنے بیٹھے تھے لیکن اس وقت وہ خلاف توقع کچھ سنجیدہ سنجیدہ اور بچھے بچھے سے نظر آ رہے تھے۔ چہرے کا یہ تغیر وقار احمد اور شاملہ بیگم کی نظروں سے بھی پوشیدہ نہ رہ سکا۔

”آپا جان کیسی ہیں؟“ شاملہ بیگم نے دریافت کیا۔

”خدا کا شکر ہے..... ماما اور ڈیڈی دونوں خیریت سے ہیں۔“

”تم اس وقت کہاں سے آرہے ہو؟“ وقار احمد نے پوچھا۔

”ہسپتال سے.....“

”ہسپتال سے..... خیریت تو ہے؟“ شاملہ بیگم اور وقار احمد نے یک زبان ہو کر پوچھا۔

”احمر کو دیکھنے گیا تھا۔“ منصور نے اس بار بھی سنجیدگی سے مختصر جواب دیا۔

”کیا بھائی صاحب وغیرہ کراچی آگئے ہیں؟“ وقار احمد نے تیزی سے پہلو بدلتے ہوئے سوال کیا۔

”شاملہ بیگم اور نادیہ کے علاوہ نادرہ بھی احمر اور ہسپتال کے نام پر چونک اٹھیں۔“

”مجھے ڈیڈی کی زبانی علم ہوا ہے کہ وہ لوگ آج صبح ہی آئے ہیں۔“

”احمر کی طبیعت کیسی ہے..... خطرے کی کوئی بات تو نہیں؟“ شاملہ بیگم نے دریافت کیا۔

”ابھی کسی کو احمر کے کمرے میں جانے کی اجازت نہیں ہے۔“ منصور بولے۔ ”ڈاکٹروں نے انتہائی نگہداشت کی خاطر یہ پابندی لگائی ہے۔ ہو سکتا ہے کل تک پیش واد کے کمرے میں منتقل کر دے جائے۔ لیکن فی الحال یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“

”بھائی صاحب اور بھابھی صاحبہ کا قیام کہاں ہے؟“ وقار احمد نے پوچھا۔

”مجھے علم نہیں..... ہو سکتا ہے ڈیڈی کو معلوم ہو۔“

”کیا جمال بھائی تمہارے ساتھ ہی ہسپتال گئے تھے؟“ شاملہ بیگم نے سوال کیا۔

”جی ہاں..... ڈیڈی غالباً اب بھی شار انکل کے ساتھ ہسپتال میں ہوں گے۔“ منصور نے کہا۔

”انہوں نے مجھے خاص طور پر یہاں روانہ کیا ہے تاکہ میں آپ لوگوں کو اطلاع کر دوں۔“

”کیا تمہاری ملاقات فوزیہ بیگم سے نہیں ہوئی؟“

”جی نہیں.....“

”ہو سکتا ہے بھائی صاحب نے ہسپتال کے قریب کسی ہوٹل میں قیام کا بندوبست کیا ہو۔“ وقار احمد نے بیوی کی جانب دیکھتے ہوئے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

”میرا مشورہ ہے کہ آپ کو اسی وقت جانا چاہئے۔“ شاملہ بیگم نے شوہر کی بے چینی کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

”میں اب اجازت چاہوں گا۔“ منصور اٹھتے ہوئے بولے۔ ”ابھی گھر جا کر ماما کو بھی اطلاع دینی ہے۔“

منصور چلے گئے تو نادرہ نے بھی اجازت چاہی۔ نادیہ بدستور اپنی جگہ جم صم بیٹھی کسی گہری سوچ میں غرق تھی۔

”آپ نے کیا سوچا ہے..... میرا مطلب ہے کہ کیا آپ ابھی میرے ساتھ چلیں گی؟“

”فی الحال آپ ہوا آئیں۔ اس وقت میرا جانا مناسب نہ ہوگا۔ ویسے اگر آپ کا حکم ہے تو میں ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔“

”ٹھیک ہے..... میں جا کر صورت حال کا اندازہ کرتا ہوں اس کے بعد ہی کچھ طے کیا جائے گا۔“

وقار احمد اپنا جملہ مکمل کر کے جانے کے ارادے سے چلے تو شاملہ بیگم نے روک کر سمجھاتے ہوئے کہا۔

”ذور اندیشی سے کام لے کر کوشش کیجئے گا..... ہمارا احمر سے بھی کوئی جھگڑا نہیں..... ویسے بھی دل کے مریض کو بہت سکون اور آرام کی ضرورت ہوتی ہے..... شار بھائی بھی بیٹے کی بیماری سے پریشان ہوں گے، اُن کی دلجوئی بھی ہمارا فرض ہے۔“

وقار احمد نے کوئی جواب نہیں دیا، بیوی کے چہرے کو ایک نظر غور سے دیکھا پھر اثبات میں سر ہلاتے چلے گئے۔ شاملہ بیگم نے بھی قدم اٹھائے لیکن نادیہ کو سوچ میں دیکھ کر رُک گئیں۔

”تم کس سوچ میں کھوئی ہو.....؟“

”میں قدرت کی اُس لاٹھی کے بارے میں غور کر رہی ہوں جو بڑی مؤثر مگر بے آواز ہوتی ہے۔“

نادیہ نے رخ لہجے میں کہا۔

”کیا مطلب.....؟“

”وہ جو دوسروں کا برا چاہتے ہیں خود بھی بڑے سکون نہیں رہتے۔“

”خاموش رہو.....“ شاملہ بیگم نے بیٹی کو سرزنش کی۔ ”یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔“

”مجھے یقین تھا..... آپ کی ماں صبر ایک نہ ایک دن ضرور رنگ لائے گا۔“ نادیہ زہر خند سے بولی۔

”حماقت کی باتیں مت کرو..... تمہارے ڈیڈی سنیں گے تو کیا کہیں گے؟“ شاملہ نے نادیہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”اور پھر احمر سے ہمارا کیا جھگڑا..... اُس نے کیا قصور کیا ہے؟“

”فساد کی جڑ تو وہی تھی امی جان!“ نادیہ ہاتھ ملتے ہوئے بولی۔ ”اگر انہوں نے بزدلی کا ثبوت دیا ہوتا تو.....“

”نادیہ.....“ شاملہ بیگم نے تیزی سے جملہ کاٹتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”میں تمہیں حکم دیتی ہوں کہ اب زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکالنا..... وقت اور حالات کی نزاکت کو سمجھنے کی کوشش کرو!“

نادیہ تملکا کر رہ گئی۔ ماں کے سامنے کچھ اور نہ کہہ سکی تو ہونٹ کا قاتی تیزی سے اٹھی اور غصے سے بل

”جیسی آپ کی مرضی.....“

”کیوں..... کیا آپ پسند نہیں کرتے کہ انہیں کھانے پر بلا لیا جائے؟“

”میں نے انکار بھی نہیں کیا..... لیکن کیا صرف جمال صاحب اور منصور کو بلانا مناسب ہوگا، میرا طلب ہے کہ شبانہ بیگم بھی تو اُسی گھر میں رہتی ہیں جس میں جمال صاحب کا قیام ہے۔“

”چشم مارون دل ماشاد..... آپ چاہتے ہیں تو شبانہ بیگم کو بھی بلا لیجئے۔“ فوزیہ خاتون نے خلاف توقع راز دلی کا مظاہرہ کیا تو ثار احمد کو حیرت ہوئی۔ بیوی کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھنے لگے۔ انہیں اس بات کا یقین نہیں آ رہا تھا کہ فوزیہ خاتون اتنی جلدی شبانہ بیگم کو دعوت دینے پر آمادہ ہو جائیں گی۔

”آپ مجھے اس طرح گھور گھور کر کیوں دیکھ رہے ہیں؟“

”آپ شاید بھول رہی ہیں کہ شبانہ بیگم ثاکی والدہ ہیں۔“

”مجھے خوب یاد ہے.....“ فوزیہ خاتون نے سنجیدگی سے جواب دیا، پھر بولیں۔ ”ثا سے میری کوئی اتنی دشمنی نہیں ہے..... جو اختلاف تھا وہ احمد کی پسند سے تھا اور اُس کے پیش نظر میں نے جو کچھ کیا اُس مجھے کوئی ملال نہیں ہے..... اور اب بھی میں جو قدم اٹھاؤں گی وہ سوچ سمجھ کر اٹھاؤں گی.....“

ثار احمد نے بیوی سے الجھنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس لئے لباس تبدیل کرنے کی غرض سے اٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد تر و تازہ ہو کر واپس آئے تو فوزیہ خاتون نے پھر اُن کی دکھتی رگ کو چھیر دیا۔

”اور کون کون لوگ ہسپتال آئے تھے.....؟“

”کچھ دیر پیشتر وقار آئے تھے..... غالباً جمال صاحب نے منصور کے ذریعہ انہیں خبر کرادی تھی۔“

”شاملہ نہیں آئی.....؟“

”وقار انہیں کل لانے کو کہہ رہے تھے لیکن.....“

”لیکن کیا.....؟“ فوزیہ خاتون نے شوہر کی اچانک خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے دریافت کیا۔

”میں نے وقار کو منع کر دیا۔“

”اچھا کیا.....“ فوزیہ خاتون نے مختصر جواب دیا، پھر شوہر کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھنے لگیں۔

”وقار نے مجھ سے کوئی شکوہ شکایت نہیں کی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ انہیں یہ بات ضرور محسوس ہوئی ہوگی کہ ہم نے اُن کے مقابلے میں جمال احمد کو ترجیح دی۔“ ثار احمد نے دبی زبان میں اپنے خدشے کا لہجہ کیا۔

”میرا خیال ہے کہ شاملہ کو ہم سے..... خاص طور پر مجھ سے سخت شکایت ہوگی۔“ فوزیہ خاتون نے ایت سنجیدگی مگر متانت سے کہا۔ ”لیکن آپ اس کی فکر نہ کریں..... یہ میرا اور شاملہ کا ذاتی معاملہ ہے، مجھے یقین ہے کہ وہ جب بھی مجھے دیکھے گی فوزیہ بیگم کہہ کر بے اختیار سارے گلے شکوے بھول کر مجھ سے لپٹ جائے گی..... میں اُس کی طبیعت سے واقف ہوں۔“

”میں سمجھا نہیں.....“ ثار احمد نے حیرت سے دریافت کیا۔ ”کیا آپ جائیں گی وقار کے گھر؟“

”إرادہ تو ہے.....“ فوزیہ خاتون بولیں۔ ”شاملہ میری ہی وجہ سے خفا ہوئی ہے۔ اب اُسے منانا میرا فرض ہے۔“

”میں اسے کیا کہوں..... انقلاب یا موسم کی تبدیلی؟“

”ایک بات تو چھو..... آپ کو ناگوار خاطر تو نہ ہوگی؟“ فوزیہ خاتون نے شوہر کے سوال کو نظر راز کرتے ہوئے کہا۔

کھاتی لیے لیے قدم اٹھاتی باہر چلی گئی..... اُس کی نگاہوں میں ثا کے پیار کی سرخی تیر رہی تھی اور اصر سے نفرت کا احساس بھی چھلک رہا تھا.....!!

○○○

ثار احمد ہسپتال سے ہوٹل پہنچے تو بڑے تھکے تھکے سے نظر آ رہے تھے۔ چھوٹے بھائی سے ملنے کے بعد انہیں اس بات کا اور بھی ملال ہو رہا تھا کہ انہوں نے اپنے کراچی پہنچنے کی اطلاع جمال احمد کو تودی لیکن وقار احمد کو نظر انداز کر دیا تھا۔ اس میں ثار احمد کی اپنی مرضی سے زیادہ فوزیہ خاتون کا دخل تھا جنہوں نے نیرونی سے رخت سفر باندھتے وقت ہی کھلے الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ..... میں احمد کے علاج کی غرض سے کراچی جا رہی ہوں..... اور احمد کی بیماری کی نوعیت ایسی نہیں ہے کہ وہ رشتہ داروں کی ریشہ دوانیوں کی متحمل ہو سکے، اس لئے کسی کو اطلاع دینے کی چنداں کوئی ضرورت نہیں.....“

ثار احمد نے بیوی کے خیال سے وقار احمد کو اپنی آمد کی اطلاع دینا مناسب نہیں سمجھی، وہ بھائی کو تو صورت حال سے آگاہ کر کے مطمئن کر سکتے تھے لیکن بیوی کو قائل کرنا اُس کے بس کی بات نہیں تھی، کراچی میں رہائش کا بندوبست جمال احمد کے ذریعے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ ثار احمد کا خیال تھا کہ احمد کی طرف سے اطمینان ہو جانے کے بعد وہ کوئی مناسب موقع دیکھ کر خود ہی وقار احمد کو صورت حال کی نزاکت سے باخبر کر دیں گے لیکن جمال احمد کے ذریعے اطلاع مل جانے کے بعد جب وقار احمد نے ہسپتال پہنچنے میں پہل کر دی تو ثار احمد کو شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا۔

گفتگو کے دوران ہر چند کہ انہوں نے چھوٹے بھائی کو مطمئن کر دیا تھا لیکن بزرگ ہونے کے ناتے انہیں وہ رد کہ یہی خیال ستا رہا تھا کہ بیوی کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے انہیں شرمندہ ہونا پڑا۔ انہیں یہ فکر بھی دامن گیر تھی کہ شاملہ بیگم نہ جانے اُن کے بارے میں کیا سوچ رہی ہوں گی..... بہر حال! انہیں اس بات کی خوشی تھی کہ سفر کے دوران احمد کو زیادہ ٹکان نہیں ہوئی، ڈاکٹروں نے وقتی طور پر احتیاط کے پیش نظر چوبیس گھنٹوں کے لئے احمد کو انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں رکھنا مناسب سمجھا، فوری طور پر جتنے بھی میٹ اور چیک اپ ہوئے وہ نلی بخش تھے۔

خوشی اور تاسف کے ملے جلے تاثرات چہرے پر لئے جب ثار احمد نے ہوٹل کے کمرے میں قدم رکھا تو فوزیہ خاتون پریشان ہو گئیں، جلدی سے بولیں۔ ”احمد کی طبیعت کیسی ہے؟“

”خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ احمد کی طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔“

”جہاز کے سفر سے ٹکان تو نہیں ہوئی؟“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے.....“ ثار احمد نے تھکے تھکے انداز میں صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”ڈاکٹروں نے ہر طرح سے اطمینان دلا دیا ہے۔ میرا خیال ہے کل شام تک احمد کو پیش وارڈ میں منتقل کر دیا جائے گا۔“

”ابھی کہاں ہے.....؟“ فوزیہ خاتون نے تیزی سے سوال کیا۔

”ضروری دیکھ بھال والے حصے میں۔“ ثار احمد نے بیوی کو اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔ ”آپ قطعی پریشان نہ ہوں۔ میں نے آج ایک نرس کو احمد کے لئے کنج کر لیا ہے، صرف ایک دن کی بات ہے، وہ پینل وارڈ میں آجائے تو پھر رات کو میں یا آپ اُس کے پاس رہیں گے۔“

”جمال صاحب کو ہماری وجہ سے بہت پریشانی ہوئی۔“ فوزیہ خاتون نے بیٹے کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ ایک دو روز میں منصور اور جمال صاحب کو کھانے پر بلا لیا جائے۔“

احمر اور ثناء ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہتے تھے..... اُن کی محبت پاک، نہایت پاکیزہ اور بڑی مقدس تھی..... وہ لازم و ملزوم تھے..... اُن کے سینوں میں معصوم فرشتوں کے دل دھڑک رہے تھے..... لیکن..... حالات کی گردش اور دقت کی ستم ظریفی نے دونوں کی راہیں جدا کر دیں۔ فوزیہ خاتون کے درمیان میں آ جانے سے دھڑکوں کی خوشیاں برباد ہو گئیں، احمر کی تربیت جس احوال میں ہوئی تھی اُس نے مرد ہوتے ہوئے بھی انہیں بغاوت پر آمادہ ہونے سے روک رکھا اور ثناء شرعی سانچوں میں پل پوس کر جوان ہوئی تھی اس لئے وہ مُہر بلب رہی۔

شانہ بیگم کو علم تھا کہ فوزیہ خاتون بڑے سخت اصولوں کی مالک ہیں، خاندانی رِایات اور باب دادا کے بنائے ہوئے فرسودہ اصول انہیں نہ صرف بہت عزیز تھے بلکہ وہ ان اصولوں پر سختی سے کار بند تھیں۔ ثناء اور احمر کے رشتے کے درمیان بھی یہی اصول آڑے آ گئے۔

فوزیہ خاتون ثناء کو پسند کرتی تھیں، اُس کی تعلیم و تربیت، رکھ رکھاؤ، نشست و برخاست کے آداب، اندازِ تکلم اور جامہ زیبی کی ہمیشہ تعریف کرتی تھیں۔ جیب بھی کراچی آئیں شانہ بیگم اس کی تربیت کی تعریف ضرور کرتیں جو انہوں نے نادیدہ اور صائمہ کو دی تھی..... انہیں تمام بچوں میں ثناء سب سے زیادہ عزیز تھی۔ لیکن جب ثناء اور احمر کی وابستگی کا مسئلہ سامنے آیا تو فوزیہ خاتون کے تیور بدل گئے..... رگوں میں دوڑتے ہوئے خاندانی خون کی گردش اچانک تیز ہوئی تو بے قابو ہو کر انہوں نے ثناء کی زندگی سے وابستہ وہ تمام راز اُگل دیئے جنہیں شانہ بیگم نے اپنے سینے میں دفن کر رکھا تھا..... فوزیہ خاتون اگر چاہیں تو سیدھے سادے لفظوں میں بھی اس رشتے سے انکار کر سکتی تھیں لیکن انہوں نے اپنی فطرت کے خلاف بے حد سخت انداز اختیار کیا..... شاید اس لئے کہ معاملہ قریبی رشتہ داروں کا تھا اور وہ اس پنگاری کو شعلوں کا زُوپ اختیار کرنے سے پہلے ہی راہ کا ڈھیر بنا دینا چاہتی تھیں.....

فوزیہ خاتون کو اپنے مقصد میں ناکامی نہیں ہوئی..... ثناء اور احمر کے راستے الگ الگ ہو گئے لیکن محبت کی وہ چنگاری جو پاکیزہ دلوں میں سلگ رہی تھیں سرور اکھ نہ بن سکی۔ اندر ہی اندر سلگتی رہی۔ اور اسی چنگاری نے احمر کو دل کا روگ لگا دیا..... ثناء کو دنیا کے ہنگاموں سے کنارہ کش ہونے پر مجبور کر دیا۔ شانہ بیگم ثناء کے رشتے سے ہٹ کر بھی احمر کو بہت چاہتی تھیں اسی لئے جب سے انہیں علم ہوا تھا کہ احمر کراچی ہی کے ایک ہسپتال میں زیرِ علاج ہے تو وہ متعدد پار پرش احوال کے لئے، عیادت کے لئے جانے کا سوچ چکی تھیں لیکن فوزیہ خاتون کے خیال سے اور اس وجہ سے بھی کہ اگر بات بڑھ گئی تو احمر کی بیماری پر برا اثر پڑے گا، اپنی خواہشات کو سینے کے اندر دفن کئے رہیں۔

شانہ بیگم کو اس بات کا علم بھی ہو گیا تھا کہ کراچی میں ثناء احمد کے قیام کا بندوبست اُن کے شوہر نے کیا ہے۔ انہیں یہ سن کر بھی صدمہ ہوا کہ وقار احمد کو کراچی پہنچنے کی اطلاع مفسور کے ذریعے ہوئی، ثناء احمد کی شخصیت کے بارے میں وہ بخوبی جانتی تھیں کہ وہ فرشتہ صفت خصلت کے مالک ہیں..... انہیں موردِ لزوم نہیں ٹھہرایا جاسکتا اس لئے ظاہر ہے جو کچھ ہوا اس میں فوزیہ خاتون کی مرضی کو زیادہ دخل رہا ہوگا۔

اس وقت بھی شانہ بیگم انہی خیالات میں متفرق تھیں جب شانہ بیگم نے کمرے میں قدم رکھا۔ ثناء بیگم نے بہن کو دیکھا تو دل کی گہرائیوں میں مچلتے ہوئے جذبوں میں طفیلی آ گئی، کچھ لمحے تک دونوں بہنیں ایک دوسرے کو دھکتی رہیں، نگاہوں نگاہوں میں خیالات کے تبادلے ہوئے پھر دونوں بے اختیار گلے مل کر سسکنے لگیں۔ دلی کی دھڑکنیں جیذبوں کی ترجمانی کرتی رہیں، پھر آنسوؤں کا سیلاب نما تو شانہ بیگم نے آہستہ سے دریافت کیا۔ ”تم کی تھیں احمر کو دیکھنے.....؟“

”میں..... اور آپ کی بات کا برا منادوں کا؟“
”احمر اور ثناء کے معاملے میں اگر میری جگہ آپ ہوتے تو کیا آپ وہ فیصلہ نہ کرتے جو میں نے کیا تھا؟“
”ہو سکتا ہے کہ آپ درست کہہ رہی ہوں لیکن.....“
”اُس وقت میں حالات کے پیش نظر جذباتی ہو گئی تھی..... میں اس غلطی کو تسلیم کرتی ہوں۔ لیکن میں نے جو کچھ کیا تھا وہ غلط نہیں تھا۔“

”اب ان باتوں سے کیا فائدہ.....؟“ ثناء احمد پہلو بدل کر بولے۔ ”وقار کے گھرانے سے میل جول بڑھا تو احمر اور ثناء کا مسئلہ دوبارہ اُٹھ سکتا ہے۔“
”خیال ہے آپ کا.....“ فوزیہ خاتون نے تیزی سے کہا۔ ”شانہ اب اس ذکر کو دوبارہ کبھی نہیں چھیڑے گی۔ وہ میری طبیعت اور مزاج دونوں سے واقف ہے۔“
”آگ اور پٹرول کا ساتھ دانشمندی کے خلاف ہے۔“
”میں سمجھی نہیں.....“

”میں نے یہ بات احمر کے حوالے سے کہی ہے۔ ثناء اُس کی کمزوری ہے، ہو سکتا ہے کہ اُس کے دُخ پھر سے برے ہو جائیں۔“

”میں احمر کی ماں ہوں..... دشمن نہیں.....“ فوزیہ خاتون نے سنجیدگی سے کہا۔ ”آپ فکر مند نہ ہوں..... میں اب کوئی ایسی صورت پیدا نہیں ہونے دوں گی جو احمر کے حق میں نقصان دہ ہو..... رہا ثناء؟ معاملہ تو میری نظروں میں جوکل بھی..... وہی آج بھی ہے..... یہ بات ہے کہ اُس کے ساتھ جو کچھ ہوا، اُس میں ثناء کی اپنی ذات کی کوئی غلطی نہیں تھی۔“

”قسمت کی بد نصیبی کو بھلا کون مٹا سکتا ہے؟“ ثناء احمد نے کبیدہ خاطر ہوتے ہوئے کہا۔ ”وہ جس ارادے سے وقار کا گھر چھوڑ کر ہوسٹل منتقل ہوئی تھی وہ بھی اُس کی زندگی میں ایک نئے اور تازہ دُخ کا اضافہ کر کے رُخصت ہو گیا۔“
”کیا مطلب.....؟“

”جمال صاحب بتا رہے تھے کہ اقبال احمد کا سایہ بھی ثناء کے سر سے اُٹھ گیا..... اور ثناء کو اس مقدس رشتے کا علم اُس وقت ہوا جب اُس کا باپ بسترِ مرگ پر پڑا زندگی کی آخری سانسیں پوری کر رہا تھا۔“
”شاید اسی میں قدرت کو ثناء کی بہتری منظور ہو۔“

”شاید.....“ ثناء احمد نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا پھر سونے کے ارادے سے دوسری کمرہ لے لی۔ فوزیہ خاتون نے ہاتھ بڑھا کر بیڈ سوچ آف کیا تو ماحول گھپ اندھیروں میں ڈوب گیا۔

○○○

شانہ بیگم کو جب سے احمر کی بیماری، ثناء احمد اور فوزیہ خاتون کی آمد کی اطلاع ملی تھی اُن کے دل کے نہاں خانوں میں اُمید کی ایک کرن پھر سے جھلکانے لگی تھی۔ احمر اور ثناء ایک دوسرے سے منسوب ہو جائیں، یہ اُن کی بڑی دیرینہ خواہش تھی اور اس خواہش نے ایک بار پھر اُن کے دل و دماغ میں کلبلا نا شروع کر دیا تھا۔

وقت کی کڑی دُھوپ اور حالات کے تراشیدہ ناہموار راستوں نے انہیں زندگی کے بیشتر تجربات سے دوچار کیا تھا۔ انہیں بخوبی علم تھا کہ ثناء نے شانہ بیگم کے گھر کو کس لئے چھوڑا تھا اور وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ احمر کی بیماری کا سبب کیا ہے.....

”نہیں.....“ شاملہ بیگم نے تجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”نثار بھائی نے فی الحال منع کر دیا ہے۔“
 ”مصلحت بھی اسی میں ہے کہ ہم لوگ دُور رہیں۔ ورنہ اس کا اثر احمر کی بیماری پر ہوگا۔“
 ”کیسی عجیب بات ہے آپ.....“ شاملہ بیگم نے سرد آہ بھر کر کہا۔ ”فوزیہ خاتون نے پہلے تو کبھی ایسی بے زنی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ جہاں چار برتن ہوتے ہیں وہاں اُن کے نگرانے کی آواز بھی ضرور سنائی دیتی ہے۔ لیکن آواز کی خاطر انہیں اُٹھا کر گھر سے باہر تو نہیں پھینک دیا جاتا.....“
 ”ہو سکتا ہے احمر کی وجہ سے فوزیہ نے ابھی ہم سے ملنا چلنا مناسب نہ سمجھا ہو.....“
 ”اب ایسی کون سی بات ہے..... رشتے کی جو بات تھی وہ اُسی دن ختم ہو گئی جس دن فوزیہ بہن کی زبان بے قابو ہوئی تھی..... اب ہم کون سا اصرار کر رہے ہیں جو وہ ہم سے کترا رہی ہیں؟“
 ”ایک بات کہوں شاملہ.....؟“
 ”کیا.....؟“

”کیا یہ ممکن نہیں کہ ہمارے درمیان جو رنجش پیدا ہوئی ہے وہ ختم ہو جائے اور احمر اور شاملہ.....“
 ”آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں آیا جان.....؟“ شاملہ بیگم تیزی سے بولیں۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے..... ہماری ٹھانی گری بڑی بھی نہیں ہے کہ اُسے احمر کے سوا کوئی رشتہ نہیں ملے گا..... رہا احمر کا سوال تو فوزیہ بہن اپنی غلطی تسلیم کریں گی اور نہ ہم جھوٹی پھیلا کر اُن کے دروازے پر بھیک مانگنے جائیں گے.....“
 ”انسان کی بزرگی اور بڑائی اسی میں ہے کہ وہ اپنی غلطی تسلیم کر لے..... یہ اور بات ہے کہ جھوٹی انا کی خاطر رشتوں سے منہ موڑ لیا جائے۔“
 ”اب اس قصے کو بھول ہی جائے.....“

”کوشش تو کرنی ہوں لیکن کامیاب نہیں ہو پاتی۔“ شاملہ بیگم کے لہجے میں حسرتیں تڑپ اُٹھیں۔
 ”سوچو شاملہ..... یہ بھلا کہاں کا انصاف ہے کہ غلطیاں بزرگوں کی ہوں اور اس کی سزا معصوم بچوں کو بھگتنی پڑے۔“

”جو ہوتا تھا ہو چکا..... پرانی باتوں کو دُہرانے سے کیا حاصل؟“
 ”تم شاید اسے میری دیوانگی سمجھو..... لیکن میں نے منہ مان رکھی ہے کہ اگر احمر اور شاملہ کی بات ملے ہوگی تو میں مشکل کشا کے نام پر دیکھیں پکوا کر غریبوں میں تقسیم کروں گی..... اس کے یہاں دیر ہے، اندھیر نہیں ہے۔“
 ”میں آج صبح شاملہ کی طرف بھی گئی تھی۔“ شاملہ بیگم نے گفتگو کا رخ بدلنے کی خاطر کہا۔
 ”کیا شاملہ کو احمر کی بیماری کا علم ہو گیا ہے؟“

”باتوں سے اندازہ نہیں ہوا..... البتہ وہ کچھ کچھ بھی سمجھی ہی نظر آرہی تھی۔“
 ”خوشیاں رُوٹھ جائیں تو انسان کب تک معنوی مسکراہٹوں کا سہارا لے سکتا ہے؟“ شاملہ بیگم نے متاثر ہرے لہجے میں کہا۔ ”میں تو خدا کی احسان مند اور شکر گزار ہوں کہ شاملہ نے میری کوتاہیوں کو معاف کر دیا..... اب تو وہ مجھ سے محل کر بڑی اپنائیت سے ملتی ہے، شاید اُسے میری مجبوریوں پر رحم آ گیا ہے..... لیکن.....“

”لیکن کیا.....؟“ شاملہ بیگم نے بہن کی آنکھوں کے گوشے بھیکتے دیکھے تو بڑے پیار سے بولیں۔
 ”اب آپ کو کس بات کا غم ہے.....؟“
 ”شاملہ نے آپ کو ماں کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے..... کیا یہ کم خوشی کی بات ہے؟“

”مگر یہ کیسی مجبوری اور بے بسی ہے کہ میں اُسے اپنے پاس نہیں رکھ سکتی..... دنیا کے سامنے اُسے بیٹی کہہ کر چلنے سے نہیں لگا سکتی۔“
 ”اسی میں ہماری بہتری ہے۔“ شاملہ بیگم نے بہن کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”شاملہ کے مستقبل کا دارو مدار بھی ہماری خاموشی پر ہے ورنہ دنیا والوں کو مفت میں باتیں بنانے کا موقع مل جائے گا..... ہم کس کس کی زبان روکتے پھر س گے..... خدا سے دُعا کیجئے کہ شاملہ اپنے گھر کی ہو جائے.....“
 ”میں نے اُسے ہموار کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ بڑی خوبصورتی سے ٹال گئی۔“ شاملہ بیگم نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ وہ ڈاکٹری کی تعلیم مکمل کئے بغیر اس موضوع پر سوچنا بھی پسند نہیں کرے گی۔“
 ”پہلے بھی اُس کا یہی عزم تھا..... خدا اُسے اُس کے ارادوں میں کامیاب کرے۔“
 ”آمین.....“ شاملہ بیگم نے صدق دل سے کہا۔

اسی وقت جمال احمد اندر داخل ہوئے۔ شاملہ بیگم کو شاملہ بیگم کے ساتھ دیکھا تو ایک لمحے کو خشکے پھر مسکرا کر بولے۔ ”میں ابھی آپ ہی کی طرف جانے کو سوچ رہا تھا۔ اچھا ہوا جو یہیں ملاقات ہو گئی۔“
 ”کوئی خاص بات.....؟“ شاملہ بیگم نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔
 ”بہت دنوں سے دیکھا نہیں تھا..... یہ کیا کسی خاص بات سے کم ہے؟“
 ”بس رہنے دیجئے جمال بھائی..... یہ سب منہ دیکھے کی باتیں ہیں ورنہ آج کل آپ کو فوزیہ خاتون کی جی حضوری سے اتنی فرصت کہاں جو ہم غریبوں کا خیال آسکے۔“
 ”آپ میری مصروفیت کو یہ سوچ کر بھی نظر انداز کر سکتی ہیں کہ..... نیا نودن اور پرانا سودن.....“
 ”گویا اب ہم آپ کی نظروں میں پرانے ہو گئے۔“ شاملہ بیگم نے بہن کی جانب دیکھتے ہوئے بدستہ کہا۔ ”سن رہی ہیں آپا جان؟“

”یہ تم دونوں کا معاملہ ہے اس لئے مجھے تو دُور ہی رکھو۔“ شاملہ بیگم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
 ”کچھ دیر تک اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں، پھر شاملہ بیگم چلی گئیں تو جمال احمد نے بیوی سے کہا۔
 ”آج فوزیہ خاتون نے ہمیں کھانے کی دعوت دی ہے..... ہم سب کو بلایا ہے۔“
 ”احمر کی طبیعت اب کیسی ہے؟“

”خدا کا شکر ہے.....“ جمال احمد بولے۔ ”پہلے روز تو ڈاکٹروں کی بھاگ دوڑ نے سب کو خوفزدہ کر دیا تھا۔ لیکن اب ڈاکٹروں نے بستر سے اُتر کر صوفے پر کچھ دیر بیٹھنے کی اجازت دے دی ہے..... تین روز کے اندر اندر احمر کی طبیعت حیرت انگیز طور پر ٹھیک ہوئی ہے..... اگر یہی صورت حال برقرار رہی تو ایک دو ہفتے میں چلنے پھرنے کی اجازت بھی مل جائے گی۔ ڈاکٹروں کا یہی خیال ہے۔“
 ”خدا کرے ایسا ہی ہو.....“ شاملہ بیگم نے بڑے خلوص سے کہا۔ ”میں احمر کے لئے دُعا کرنے سے کبھی غافل نہیں ہوتی۔“

”آپ نے فوزیہ خاتون کی دعوت کے سلسلے میں کوئی جواب نہیں دیا۔“
 ”میرا خیال ہے کہ آپ اور منصور شرکت کر لیں۔“
 ”اور آپ.....؟“

”میں نے جب احمر کی عیادت کے لئے جانا مناسب نہیں سمجھا تو دعوت میں جانا کچھ عجیب سا لگتا ہے..... اس کے علاوہ مجھے وقار بھائی اور شاملہ کا بھی خیال ہے۔“
 ”مجھے یقین تھا کہ آپ یہی جواب دیں گی اس لئے میں نے دعوت کو فی الحال اپنی کاروباری

مصروفیات کا بہانہ کر کے ٹال دیا ہے۔“ جمال احمد نے سنجیدگی سے کہا۔ ”شاملہ اور وقار احمد مجھے بھی بہت عزیز ہیں۔“

”فوزیہ نے آپ کے انکار کو محسوس تو نہیں کیا.....؟“

”نہیں..... لیکن میرے جواب پر اُن کے چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ ضرور ابھری تھی۔“

”میں بھی نہیں.....“ شاملہ بیگم نے قدرے سبے ہوئے انداز میں سوال کیا۔

”میں نے بھی زیادہ سمجھنے کی کوشش نہیں کی، اس لئے کہ مجھے شک کی خوشیاں دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہیں اور میری زندگی میں شک کی خوشیوں کو کوئی نہیں چھین سکتا۔“ جمال احمد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر کرسی کی پشت پر سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں..... اور

1 شاملہ بیگم اس جیسے کی گہرائی تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگیں جو بڑے اعتماد سے کہا گیا تھا.....!!

○○○

منصور کے آنے کا سن کر اُس نے جلدی جلدی لباس تبدیل کیا، آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بالوں کو برش سے یوں ہی ترتیب دیا پھر قدم اٹھاتی راہداری سے گزر کر وزیٹس روم میں داخل ہوئی تو اُس کے قدم دلہیز پر ہی ٹھم کر رہ گئے۔ وہ ششدر سی رہ گئی..... ایک لمحے کو یوں لگا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔ منصور ساتھ نہ ہوتے تو شاید وہ فوزیہ خاتون کی اس طرح خلاف توقع آمد کو خواب ہی سمجھتی۔ اُسے اپنی قوتِ پیدائشی پر شبہ سا ہورہا تھا۔ چند لمحے اپنی جگہ ساکت و جامد کھڑی دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتی رہی پھر اُس نے خود کو سنبھالا.....

فوزیہ خاتون نے اُس کی زندگی کو طوفانوں سے دوچار کیا تھا..... اُسے گھر سے بے گھر کر دیا..... اُس کے ہونٹوں کی مسکراہٹیں چھین لیں..... سانسوں میں زہر مگھول دیا.....

لیکن..... فوزیہ خاتون ہی کی وجہ سے اُس کی ملاقات اپنے باپ سے بھی ہو گئی..... اگر باپ سے ملے بنا یتیم ہو گئی ہوتی تو یہ خلش تمام زندگی ختم نہ ہوتی..... اُس کے وجود کو دُستی رہتی..... اور..... فوزیہ خاتون احمد کی ماں بھی تھیں۔

دوپٹے کے پلو کو سر پر سنبھالتی اُس نے قریب جا کر بڑے ادب سے فوزیہ خاتون کو سلام کیا، اُن کے برابر بیٹھ کر منصور کو تنکھیوں سے دیکھا تو اُس کا دل خوشی سے جھوم اٹھا..... منصور کے ہونٹوں پر کھلی مسکراہٹوں کو احمد کی صحت یابی کی ضمانت سمجھ کر اُس کا دل بارغ بارغ ہو گیا..... وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ فوزیہ خاتون کی آواز اُس کے کانوں میں گونجی..... ”تمہیں اس طرح میرا آنا برا تو نہیں لگا؟“

”یہ کیسے سوچ لیا آپ نے؟“ اُس نے جلدی سے کہا پھر سنبھل کر بولی۔ ”آپ بزرگ ہیں..... ناحق تکلیف کی..... مجھے بلوا لیا ہوتا۔“

”مجھے دیکھ کر تعجب تو ہوا ہوگا.....“ فوزیہ خاتون نے بدستور سنجیدگی سے پوچھا۔

”خوشی بھی ہوئی.....“

فوزیہ خاتون نے پلٹ کر منصور کی طرف دیکھا تو وہ جلدی سے اٹھ کھڑے ہوئے، مسکراتے ہوئے باہر چلے گئے تو شاملہ بیگم کا احساس ہونے لگا۔ وہ سمجھ گئی کہ منصور فوزیہ خاتون کا اشارہ پا کر وہاں سے بٹے ہیں..... لیکن کیوں.....؟ آخر فوزیہ خاتون اُس سے تنہائی میں کیا گفتگو کرنا چاہتی تھیں؟..... اب اُن کے ترش میں وہ کون سا تیر باقی رہ گیا تھا جسے آزمانے کی حسرت اب بھی اُن کے دل میں موجود تھی.....؟ اُس نے تو خود کو محض ہوش کے ایک مختصر سے کمرے تک محدود کر لیا تھا..... تمام رشتے ناتوں سے الگ

ہوئی تھی..... احمد کے راستے سے بھی کتر کر نکل گئی..... پھر..... اب فوزیہ خاتون کو اور کیا منظور تھا.....؟؟

شاک کے معصوم ذہن میں دوسوے ابھرتے رہے۔ وزیٹس روم میں اس وقت اتفاق سے اُس کے اور فوزیہ خاتون کے سوا اور کوئی نہیں تھا..... وہ گم سم بیٹھی آنے والے لمحات کا انتظار کرتی رہی۔

”میرے پاس تمہاری کچھ امانتیں محفوظ ہیں۔“ فوزیہ خاتون کی آواز کانوں میں گونجی تو اُس نے خود کو سنبھالا، معصومیت سے بولی۔ ”امانت..... میں بھی نہیں؟“

جواب میں فوزیہ خاتون نے نیلے رنگ کا لفافہ پرس سے نکالا تو اُس کا دل دھک سے رہ گیا، جلدی سے نظریں جھکا کر دل کی دھڑکنوں کو گنتے لگی..... ایک لمحے کو اُسے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا، ناپید اُسے وہ خط احمد کو نہیں لکھا تھا چاہئے تھا۔ مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا..... اُس کی واپسی ناممکن تھی۔

”یہ وہ خط ہے جو تم نے احمد کو لکھا تھا۔“

”جی.....“ اُس نے مدھم آواز میں جواب دیا۔

”تم نے ایسا خط کیوں لکھا.....؟“

”جی.....“ وہ چونک اٹھی، جلدی سے پیشانی پر نمودار ہونے والے پسینے کے جھلملاتے ذروں کو آنکھ سے خشک کرتے ہوئے بولی۔ ”میں نے کوئی غلط بات تو نہیں لکھی.....“

”خط لکھنے کی ضرورت کیا پیش آگئی تھی.....؟“

”میں احمد کی بیماری کا سن کر پریشان ہو گئی تھی۔“ اُس نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔ ”میری نراہش تھی کہ احمد آپ کا کہا مان لیں..... اُن کا مستقبل سنور جائے.....“

”میں احمد کی ماں ہوں..... پھر تمہیں اُس کا مستقبل سنوارنے کا خیال کیسے آ گیا؟“

”میں..... میں معافی کی خواستگار ہوں۔“ شاملہ بیگم نے بولی۔ ”آپ بزرگ ہیں..... مجھ سے جو بھول سرزد ہو گئی ہے اُسے معاف کر دیجئے۔“

”تمہارا یہ خط احمد کی بیماری پر کوئی خوشگوار اثر نہیں ڈال سکتا تھا اس لئے میں نے اسے تمہاری امانت مجھ کو محفوظ کر لیا۔“ شاملہ بیگم نے جواب نہیں دیا، چوری بینی بیٹھی اپنے آپ کو ملامت کرتی رہی۔

”میں نے تمہارے خط کے آخر میں اپنے کچھ تاثرات لکھ دیئے ہیں..... تم چاہو تو اسے پڑھ سکتی ہو۔“ فوزیہ خاتون نے لفافہ اُس کی جانب بڑھایا تو اُس کے معصوم دل کی دھڑکنیں اور تیز ہو گئیں۔ اگر اُس کے اختیار میں ہوتا تو اُنھ کو وہاں سے بھاگ جانی..... اتنی دُور جہاں جانے پہچانے چہرے اُس کا ناقاب نہ کر پاتے۔ لیکن وہ ایسا کرنے سے قاصر تھی۔ اُسے منصور پر بھی غصہ آ رہا تھا جس نے اپنی آمد کی اطلاع دے کر اُسے دُروگوں حالات سے دوچار کر دیا تھا۔

لرزتے ہاتھوں سے اُس نے لفافہ تھام لیا..... لیکن اُسے کھولنے کی ہمت نہ کر سکی، نہ جانے کیوں ابھی سہمی بیٹھی رہی۔ ”میری خواہش ہے کہ کم میری موجودگی میں وہ جواب پڑھ لو جو میں نے بہت سوچ کر اپنے ہاتھوں سے تحریر کیا ہے۔“

شاملہ بیگم نے ایک نظر فوزیہ خاتون کے چہرے پر ڈالی، پھر دھڑکتے دل سے لفافہ کھولا، کاغذ کی تہہ کھول کر اُس نے خط کے اختتام پر نظر ڈالی تو جیسے لنگ سی رہ گئی..... اُس پر شادی مرگ کی کیفیت طاری ہونے لگی.....

”شاملہ..... تم جیت گئیں.....“

وہ جواب ہر چند کہ بہت مختصر تھا لیکن دو زندگیوں کی تمام مسرتوں پر محیط تھا۔ کچھ دیر کے لئے وہ اباؤں کی وادیوں میں پرواز کرتی رہی پھر سنبھل کر بڑے محاط لہجے میں بولی۔

نہیں کرو گی؟“

”بڑی اماں.....“ ثناء نے کچھ کہنا چاہا تو اُس کی آواز رندہ گئی، دُکھے دل کو پیار کی ٹھیس لگی تو دل کے نہاں خانوں میں مچلتے آنسو چھلک کر پلکوں تک آ گئے۔

فوزیہ خاتون نے آگے بڑھ کر اُسے اپنے سینے کی گہرائیوں میں چھپالیا، بڑے لاڈ سے بولیں۔
 ”آج سے تم صرف میری بیٹی ہو..... بڑی اماں کی بیٹی..... شائلہ اور شبنم بیگم اپنی من مانی کر چکیں، اب میرا حکم چلے گا..... دیکھتی ہوں اب میری ثناء کی خوشیوں کی راہ میں کون کون سا رکاوٹ ہے.....“
 ثناء کو اپنائیت کا احساس ہوا تو وہ بے اختیار فوزیہ خاتون سے لپٹ کر سکنے لگی۔ فوزیہ خاتون بڑی شفقت سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتی رہیں..... اُس کے بالوں کو چومتی رہی..... یوں، جیسے آج برسوں بعد انہیں اپنی کھوئی ہوئی خوشیوں کا سراغ مل گیا تھا.....!!

○○○

شائلہ بیگم نادیہ کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں کہ منصور نے سامنے آ کر بڑے ادب سے سلام کیا، نادیہ نے ایک نظر منصور کو غور سے دیکھا۔ خلاف توقع منصور کچھ زیادہ ہی سنجیدہ نظر آ رہے تھے۔ پھر وہ صائمہ کی طرف دیکھنے لگے۔
 ”جیتے رہو..... خوش رہو!“ شائلہ بیگم نے منصور کو ڈھیر ساری دُعاؤں دے ڈالیں، پھر بولیں۔
 ”بیٹھو بیٹے..... اور سناؤ، آپا جان اور جمال بھائی کا کیا حال ہے.....؟“

”بائی تو سب خیریت سے لیکن.....“
 ”لیکن کیا.....؟“ شائلہ بیگم نے قدرے سنجیدگی سے دریافت کیا۔ ”یہ تم اس قدر سنجیدہ کیوں دکھائی دے رہے ہو..... خیریت تو ہے؟“

”جی..... وہ بات دراصل یہ ہے کہ میں اس وقت تنہا نہیں ہوں۔“
 ”تنہا نہیں ہوں.....“ شائلہ بیگم بولیں۔ ”اور کون ہے تمہارے ساتھ؟“
 ”بوکھلا ہٹ.....“ نادیہ نے دلی زبان میں کہا۔

منصور نے نظریں گھما کر نادیہ کو دیکھا جو اپنا مدعا ظاہر کرنے کے بعد اس طرح انجان بن گئی تھی جیسے اُس نے کچھ کہا ہی نہ ہو..... تجامل عارفانہ کی کیفیت نے اُس کے حسن کی معصومیت کو کچھ اور نظر فریب بنادیا۔ منصور کو نظارہ تھے کہ شائلہ بیگم نے انہیں دوبارہ مخاطب کیا۔
 ”تم نے بتایا نہیں منصور میاں..... اور کون ہے تمہارے ساتھ؟“

”دو مہمان اور بھی ہیں جو باہر گاڑی میں بیٹھے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“
 ”میرا انتظار.....؟“ شائلہ بیگم نے حیرت سے پوچھا۔ ”ایسے کون سے مہمان ہیں جو اندر آنے کی بجائے باہر گاڑی میں بیٹھے میرا انتظار کر رہے ہیں..... بات کیا ہے؟“

”مناسب ہو گا اگر آپ بنفس نفیس چل کر خود اپنی نظروں سے صورت حال کا اندازہ لگالیں۔“
 منصور نے نہایت معصومیت سے درخواست کی تو شائلہ بیگم اٹھ کھڑی ہوئیں۔ نادیہ نے ایک بار پھر منصور کو تنکھوں سے دیکھا، پھر اٹھ کر وہ بھی ماں کے ساتھ قدم بڑھانے لگی۔

شائلہ بیگم آنے والے مہمانوں کے بارے میں سوچتی باہر آئیں تو ایک لمحے کو انہیں یوں محسوس ہوا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔ نادیہ بھی کچھ ایسی ہی حالت سے دوچار ماں کے پیچھے کھڑی فوزیہ خاتون اور ثناء کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ بات کچھ ایسی ہی حیرت انگیز تھی کہ شائلہ بیگم بھی سکتے کی حالت

”احمر کی حالت اب کیسی ہے.....؟“

”کراچی آنے کے بعد اُس کی صحت پر بڑا خوشگوار اثر پڑا ہے۔“ فوزیہ خاتون نے بڑے شگفتہ انداز میں جواب دیا پھر بولیں۔ ”مجھے تم سے شکایت ہے..... تم ابھی تک اُسے دیکھنے نہیں گئیں۔“

”کیا احمر نے آپ کی خوشیوں کی تکمیل کا وعدہ کر لیا ہے؟“ اُس نے مدہم آواز میں سنجیدگی سے پوچھا۔
 ”اُسے پوری طرح صحت یاب ہو لینے دو..... وہ میرے حکم سے سرتابی نہیں کرے گا۔“ فوزیہ خاتون نے محبت بھری نظروں سے ثناء کو دیکھا۔ ”تم نے اپنی تعلیم کے بارے میں کیا سوچا ہے؟“
 ”ڈاکٹری کی تعلیم مکمل کرنا میری زندگی کی سب سے بڑی آرزو ہے۔“

”اور اپنے مستقبل کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے.....؟“
 ”ابھی میں نے اس بارے میں غور نہیں کیا۔“ ثناء نے فوزیہ خاتون کے جملے کا مفہوم سمجھتے ہوئے جواب دیا۔ ”تعلیم کا حصول میرے لئے دنیا کی تمام ضرورتوں سے زیادہ افضل اور مقدم ہے۔“
 ”بزرگوں کے حکم سے بھی زیادہ.....؟“

ثناء خاموش رہی..... اُس نے کوئی جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔
 ”خفا ہو اپنی بڑی اماں سے.....؟“ فوزیہ خاتون کے لہجے میں ممتا کی مٹھاس شامل تھی۔ ”غلطیاری صرف بچوں ہی سے سرزد نہیں ہوتی، کبھی کبھی بڑوں سے بھی ہو جاتی ہیں۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہے۔“
 ”آپ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں۔“

”شائلہ بھی مجھ سے ناراض ہے۔ نہ احمر کو دیکھنے آئی نہ مجھ سے ملنے کا خیال آیا اُسے۔“ فوزیہ خاتون نے کہا۔ ”اب مجھے اُسے بھی منانا پڑے گا..... تم اس وقت مصروف تو نہیں ہو؟“
 ”جی نہیں..... ایسی کوئی خاص مصروفیت بھی نہیں۔“

”تو پھر تیار ہو جا..... تم ساتھ ہو گی تو شائلہ کو شکوہ شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔“
 ”کیا میرا جانا مناسب ہو گا.....؟“

”کیوں..... اس میں نامناسب کی کیا بات ہے.....؟“ ثناء جواب دینے کی بجائے ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔ ”جی.....“ فوزیہ خاتون نے اُس کے چہرے پر ابھرتے ہوئے تاثرات کا اندازہ لگاتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ”مجھے احساس ہے کہ میں نے کچھ ایسی سخت اور تلخ باتیں کہہ دی تھیں جو نہیں کہو چاہئیں تھیں..... لیکن اُس وقت مجھے اپنے آپ پر قابو نہیں رہا تھا۔“

”آپ نے جو کچھ کہا تھا وہ غلط نہیں تھا.....“ وہ دوپٹے کے انچل کو مسلتے ہوئے بولی۔ ”مجھے خوش ہے کہ آپ نے مجھے زندگی کی ایک تلخ حقیقت سے بردقت آگاہ کر دیا ورنہ شاید میں بھٹک گئی ہوتی۔“
 ”ثناء..... ایک بات کہوں؟“

”جی.....“
 ”اعتبار کرو گی میری بات کا.....؟“

”میں نے پہلے بھی آپ کی بات پر اعتبار کر لیا تھا۔“ اُس کے لہجے میں ہلکا سا طنز بھی شامل تھا۔
 ”تم..... ہاں ثناء..... تم مجھے احمر سے زیادہ عزیز ہو۔“ فوزیہ خاتون نے بڑی اپنائیت سے کہا۔
 ”یہ احساس آپ کو کب ہوا.....؟“ وہ روانی میں کہہ گئی۔

”اُس وقت جب تمہارا خط مجھے ملا..... تحریر شخصیت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔“ فوزیہ خاتون نے فراخ دلی کا ثبوت دیا۔ ”میں تمہارے جذبوں کی قدر کرتی ہوں..... کیا تم اب بھی اپنی بڑی اماں کو معاف

سے دو چار تھیں۔

”اس طرح حیرت سے انکھیں پھاڑے کہا دیکھ رہی ہو؟“ فوزیہ خاتون نے ثنا کی طرف پیار سے دیکھتے ہوئے شاملہ بیگم سے کہا۔ ”کیا ہم ماں بیٹی کو اندر آنے کو نہیں کہو گی؟“

شاملہ بیگم پر گویا شادی مرگ کی کیفیت طاری تھی۔ فوزیہ خاتون کو مسکراتے دیکھا تو بے اختیار آگے بڑھیں اور فوزیہ بہن کہتے ہوئے گلے لگ گئیں۔ نادیا ابھی صورت حال کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی کہ منصور نے قریب آ کر سرگوشی کی۔ ”آپ کس بولھلاہٹ کا شکار ہیں؟“

نادیا نے چونک کر منصور کو دیکھا، کچھ جواب دینا چاہتی تھیں کہ ثنا قریب آ گئی۔ اس لئے وہ کوئی جواب دینے کی بجائے ثنا سے بغل گیر ہو گئی۔ دلی زبان میں بہن سے پوچھا۔

”آپنی..... ماجرا کیا ہے؟“ یہ بڑی اماں اور آپ ساتھ ساتھ.....؟“

”یہ سب تمہارے منصور کی شرارت ہے۔“

”جی..... کچھ مجھ سے کہا آپ نے؟“ منصور نے اپنا نام نہ کر پوچھا تو ثنا مسکرا کر اُسے پیار سے دیکھنے لگی۔

فوزیہ خاتون اور ثنا کو ایک ساتھ دیکھ کر شاملہ بیگم کی مسرتوں کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ دل کی تمام رنجشیں اور کدورتیں جیسے پل بھر میں کا فور ہو کر رہ گئیں۔ بڑے چاؤ سے ہاتھ تمام کر بیٹھائی کو اندر لائیں، بڑی اپنائیت سے بولیں۔ ”مجھے خدا کی ذات سے اُمید تھی کہ وہ ضرور اپنا کرم کرے گا۔“

”اُس نے تو اپنا کرم کر دکھایا۔ لیکن تمہیں ذرا رحم نہ آیا۔“ فوزیہ خاتون نے شکایت کی۔ ”میں تو چلو بری سہی لیکن نتیجے نے تمہارا کیا لگاڑا تھا؟ اُسے دیکھنے کے لئے ہسپتال تک جانے کی زحمت بھی گوارا نہ کی۔“

”فوزیہ بہن..... میں تو.....“

”بس رہے دو..... سب منہ دیکھے کی باتیں ہیں۔“ فوزیہ خاتون نے جملہ کاٹتے ہوئے کہا۔ ”میں نہ آتی تو تمہارے کان پر جوں بھی نہ رینگتی۔“

”خدا کی قسم فوزیہ بہن! میں تو خبر ملتے ہی نادیا کے والد سے.....“

”اب ان باتوں سے کیا حاصل؟“ فوزیہ خاتون اٹھتے ہوئے بولیں۔ ”میں نے اپنا فرض پورا کر دیا۔ اب تم جانو اور تمہارا کام۔“

”یہ آپ کھڑی کیوں ہو گئیں..... کیا صرف دلہیز بھلا گئے کی قسم کھا کر آئی تھیں؟“ شاملہ بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں اس وقت ذرا جلدی میں ہوں..... ابھی شاملہ بیگم سے بھی دو دو ہاتھ کرنے ہیں..... تم چاہو تو تم بھی ساتھ چلو۔“

”آپ بیٹھے تو سہی..... تیار ہونے میں تھوڑا وقت تو لگے گا۔“

”اب اس عمر میں بچوں کے سامنے کیا بناؤ سنگھار کر دو گی..... بہن کے گھر ہی تو جانا ہے، بالوں میں سنگھار پھیرو اور چل کر گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔“

فوزیہ خاتون نے کچھ ایسے ہی انداز میں کہا کہ شاملہ بیگم چھینپ کر رہ گئی۔ ثنا نے مسکراتے ہوئے گردن جھکا لی۔ نادیا منصور سے نظریں چرائے کی کوشش کر رہی تھی کہ فوزیہ خاتون نے اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”یہ تم اتنی دیر سے دُور دُور کھڑی کیا کر رہی ہو..... کیا اپنی ماں کی طرح تم بھی.....“

”یہ آپ نے کیسے سوچ لیا..... بھلا میں اور آپ سے ناراض ہو سکتی ہوں؟“ نادیا نے موقع کی

نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے آگے بڑھ کر گلے میں بائیں ڈالیں تو فوزیہ خاتون نے بڑی شفقت سے اُسے پیار کرتے ہوئے کہا۔

”جیتتی رہو..... خدا تمہیں زندگی کے ہر شعبے میں کامیابی و کامرانی نصیب کرے۔“

اسی وقت صائمہ اور فرحان سامنے آئے تو فوزیہ خاتون نے دونوں بچوں کو گلے لگا کر ڈھیر ساری دُعا میں دیں۔ ثنا خاموش کھڑی سب کچھ دیکھ رہی تھی اور منصور کی نظریں بار بار نادیا کی جانب اٹھ رہی تھیں جو اس وقت فرحان اور فوزیہ خاتون کی باتیں سننے میں محو تھی..... ہلکی ہلکی اور شوخ مسکرائیں بار بار اُس کے لبوں پر ابھر کر اُس کے چہرے کو گلہنا بنا رہی تھیں۔

شاملہ بیگم تیار ہو کر آئیں تو فرحان نے بھی ساتھ جانے کی ضد کی۔ صائمہ بھی آمادہ نظر آ رہی تھی لیکن شاملہ بیگم نے بچوں کو منع کر دیا پھر نادیا سے بولیں۔

”تم اپنے باپ کو فون کر کے بلا لو..... ان ہی کے ساتھ تم، صائمہ اور فرحان بھی آ جا جان کے ہاں آ جانا۔“ اور نادیا کو ضروری ہدایات دینے کے بعد وہ باہر آ کر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر فوزیہ خاتون کے ساتھ بیٹھ گئیں۔ ثنا منصور کے ساتھ اگلی سیٹ پر تھی!!

○○○

احمر بستر کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھے سامنے دیوار پر لگی تصویر کو بڑی توجہ سے دیکھ رہے تھے۔ تصویر میں ایک روشن شمع پر ایک چلتے کو منڈلاتے دکھایا گیا تھا..... منصور نے اس تصویر کو ”زندگی اور بندگی“ کا عنوان دیا تھا..... احمر اس تصویر کو ہمیشہ بڑی توجہ اور دلچسپی سے دیکھتے اور پھر اُسے دیکھتے دیکھتے نہ جانے تصورات کی کس دنیا میں گم ہو جاتے۔

اس وقت بھی وہ خواب و خیال کی منزلوں میں بھٹک رہے تھے جب دروازے پر کسی کے قدموں کی آہٹ ابھری..... پلٹ کر دروازے کی سمت نظر اٹھائی تو اُن کا چہرہ خوشی سے تپتا اٹھا..... آج خواب نے حقیقت کا رُوب اختیار کر لیا تھا.....

شرم و حیا کے پیکر میں لپٹی وہ آہستہ آہستہ اُن کے قریب آ رہی تھی..... نظریں جھکائے..... چھوٹی چھوٹے قدم اٹھاتی..... لجائی..... شرمائی..... زندگی کے تمام حسن کو اپنے وجود میں سمیٹے.....

احمر کی نگاہیں ثنا کے چہرے پر جم کر رہ گئیں..... دل کی دھڑکنیں بدترج تیز ہونے لگیں۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر اُسے دیکھتے رہے، مبادا انہیں خواب ٹوٹ کر بھر نہ جائے..... لیکن وہ خواب نہیں حقیقت تھی۔ بستر کے قریب پہنچ کر ثنائے نظریں اٹھا کر احمر کو دیکھا تو احمر کی سر تیں جھوم جھوم اٹھیں۔

”ثنا..... احمر نے مدھم آواز میں اُسے پکارا۔

”جی.....“ ثنا کے ہونٹ گنگنا اٹھے۔

”یہ تم ہی ہوتا..... میں..... خواب تو نہیں دیکھ رہا؟“

”آپ اب کیسے ہیں؟“ ثنا نے دلی زبان میں خیریت دریافت کی۔

”اتنی جلدی خیال آیا تمہیں.....“ احمر نے ٹھوہ کیا۔ ”اگر کہیں میرا انتظار تمہارے آنے سے پہلے.....“

”نہیں احمر..... نہیں۔“ وہ تڑپ اٹھی۔ ”خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کیجئے۔“

”میں جانتا ہوں..... قدرت نے ہمارے راستے میں کانٹے بکھیر دیئے ہیں۔“ احمر کے لہجے میں

ماپوسی کارنگ ابھر آیا۔ ”ہم نے منزل کی سمت قدم اٹھایا تو لہو لہان ہو جائیں گے۔“

”نہیں.....“ ثنا نے دراز پلکیں آنکھوں پر چلن کرتے ہوئے کہا۔ ”اب ایسا نہیں ہوگا۔“

”تم..... شاید مجھے تسلی دے رہی ہو.....“
 ”احمر.....“ اُس نے شکوہ کیا..... ”آپ کو میری بات کا یقین نہیں.....؟“
 ”رشتوں کا بھرم راستے کی دیوار بن گیا تو.....؟“
 ”جذبے صادق ہوں تو راستے کی تمام دیواریں آپ ہی آپ ڈھے جاتی ہیں.....“
 ”گزرے وقت کی اذیتناک یادوں نے مجھے بزدل بنا دیا ہے.....“
 ”آپ نے یہ نہیں پوچھا کہ مجھے یہاں کون لایا ہے۔“ ثناء نے گفتگو کا رخ بدلنے کی کوشش کی۔
 ”کون ہے وہ مہربان.....؟“ احمر نے ایک سرد آہ بھری۔
 ”جو مجھے تو جانیں.....“ اُس نے احمر کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔
 ”جمال انگل.....؟“
 ”نہیں.....!“
 ”منصور تو نہیں.....؟“
 ”اوہو نہہ.....“ وہ شوخی سے مسکرائی، پھر نظریں جھکا کر بولی۔ ”مجھے یہاں بڑی اماں لائی ہیں.....“

میری بڑی اماں۔“
 ”سچ.....؟“ فرط جذبات اور مسرت سے احمر کی آنکھوں کے گوشے بھگنے لگے۔
 ”ابھی آپ کو میری بات کا یقین آ جائے گا۔“
 ”کیا ہمارے راستے کی دھند چھٹ گئی..... یا موسم نے صرف انگڑائی لی ہے؟“
 ”ماپوی گناہ ہے.....“ اُس نے بڑی اپنائیت سے کہا۔ ”آپ کو اپنی صحت کا خیال رکھنا چاہئے۔“
 ”کس کی خاطر.....؟“ احمر نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔
 ”کسی ایسے دوست کی خاطر..... جو آپ کو بہت عزیز ہو۔“ وہ شوخی سے بولی۔
 ”ایک شرط پر.....“
 ”وہ کیا.....؟“

”تم مجھ سے کبھی دُور نہیں رہو گی۔“
 ”منصور..... لیکن میری بھی ایک شرط ہے۔“ اُس نے آہستہ سے کہا۔ ”ذاکری کی ڈگری حاصل کرنا میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے..... اس سے پہلے ہم صرف دوست رہیں گے۔“
 ”منگیترا کا رشتہ بھی چل سکتا ہے۔“

پشت سے منصور کی آواز سنائی دی تو دونوں ہی چونک اُٹھے۔ ثناء نے شرما کر ہونٹ چبانا شروع کر دیا، احمر نے منصور سے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔ ”کیا تم کچھ دیر صبر نہیں کر سکتے تھے.....؟“
 ”نیکلی برباد گناہ لازم.....“ منصور نے برا سامنہ بنا کر جواب دیا۔ ”ایک تو میں آپ حضرات کو یہ اطلاع دینے آ گیا کہ بزرگوں کی فوج آپ دونوں کو انگوٹھی پہنانے کی غرض سے کسی لمحے بھی یہاں پہنچنے والی ہے اور آپ مجھے بے صبرا کہہ رہے ہیں.....“

احمر کوئی جواب دینا چاہتے تھے کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور سب سے پہلے جمال احمر اندر داخل ہوئے، اُن کے پیچھے وقار احمد تھے، پھر فوزیہ خاتون، شبانہ بیگم اور شائلہ خاتون کا ہاتھ تھا۔ اندر آئیں۔ اُن کے پیچھے نادیا، صائمہ اور فرحان تھے۔ احمر کے چہرے پر زندگی سے بھرپور مسرتیں رقص کر رہی تھیں۔ کچھ دیر تک رکی باتیں ہوتی رہیں پھر جمال احمر نے پہلے احمر کو ایک قیمتی انگوٹھی پہنائی، اس کے

دوسری انگوٹھی لئے ثناء کے قریب آ کر بولے۔ ”یہ احمر کی خوشیوں کی نشانی ہے جو میں تمہیں ایک ست کی حیثیت سے سونپ رہا ہوں۔ ویسے بزرگ ہونے کی حیثیت سے اگر تم چاہو تو مجھے اپنا باپ سمجھ سکتی ہو۔“

پھر جمال احمر نے ثناء کی انگلی میں انگوٹھی پہنائی تو سب کے چہرے خوشی سے دمک اُٹھے۔ ثناء نے اگر نظریں جھکالیں تو فرحان نے قریب آ کر کہا۔

”بڑی آپا..... ڈاکٹر بننے سے پہلے ہی پہلا مریض مبارک ہو.....“
 ”فرحان.....“ شائلہ بیگم نے فرحان کو پیار سے ڈانٹا۔ ”تم اپنی شرارتوں سے باز نہیں آؤ گے؟“
 ثناء نے محبت بھری نظروں سے فرحان کو دیکھا، پھر کچھ سوچ کر آہستہ آہستہ قدم اٹھائی آگے بڑھی شبانہ بیگم کے سینے سے لپٹ کر سسکنے لگی..... ان آنسوؤں میں خوشیوں کے دیپ جگمگا رہے تھے۔
 پیار کے نغمے چل رہے تھے.....
 نغمے..... جو بھی فنا نہیں ہوتے.....
 ہمیشہ زندہ رہتے ہیں.....!!

